
شرر کے تاریخی ناول

اور

ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

از

ڈاکٹر ممتاز منگلوری

ایم اے (اردو)، ایم اے (تاریخ)، پی ایچ ڈی (پنجاب)

شیخ شوکت علی اینڈ سنز

بندر روڈ - کراچی

مکتبہ خیابان ادب ۳۹ - چیمبرلین روڈ لاہور

کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی

ایڈیشن : اول

سن اشاعت : ۱۹۷۸ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت : اسی روپے 12/-

ناشر : مرزا طارق سمیر بیگ

طابع : مرزا نصیر بیگ

مطبع : جدید اردو ٹائپ پریس، ۳۹ چمبرلین روڈ، لاہور

فہرست مندرجات

پیش لفظ

شـــرر کے تاریخی ناول

عبدالحلیم شـرر کے ناولوں پر اردو ادب کے مورخین میں سے ہر ایک نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ ان کے تاریخی ناولوں پر بھی ضمناً بہت سے نقادوں نے تبصرے کیے ہیں، لیکن اس وقت سرر کے تاریخی ناول کے نام سے ایک خصوصی تصنیف ہمارے سامنے ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر ممتاز منگلوری ہیں جو نقد و نظر کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔

میں اس مختصر پیش لفظ میں تاریخی ناول اور اس کے اصولوں کی گفتگو نہیں کروں گا، اسی طرح، خود سرر کی ناول نگاری (یا تاریخی ناول نگاری) کو بھی موضوع بحث نہیں بناؤں گا، کیونکہ یہ بحثیں دیگر کتابوں کے علاوہ اس کتاب کے اندر بھی بقدر وافر موجود ہیں۔

میں صرف موجودہ کتاب (مصنفہ ڈاکٹر منگلوری) کی بعض خصوصیات فائقہ کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کروں گا۔ میرے نزدیک ڈاکٹر منگلوری کی یہ تنقیدی کتاب، اپنی چار خصوصیتوں کی بنا پر امتیاز کی مالک ہے۔

اس تصنیف کی ممتاز ترین وجہ فوقیت یہ ہے کہ اس میں شرر کے تاریخی ناولوں کے تاریخی مواد کی محققانہ انداز میں چھان پھٹک کی گئی ہے۔ قارئین اس کتاب کے اندر خود ملاحظہ فرمائیں گے کہ ہر تاریخی ناول کے تاریخی کرداروں کی تاریخیت کا سراغ لگانے کے علاوہ، متعلقہ واقعات کی صحت و عدم صحت کا بھی پتہ چلایا گیا ہے اور اس غرض کے لیے مصنف نے بلا مبالغہ صدہا اور مجمل مآخذ کی ورق گردانی کی ہے اور تجزیہ کے اصولوں کی روشنی میں ہر واقعہ پر اپنی تحقیق بھی پیش کی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔۔۔، شرر کے یہ ناول تاریخ کے مختلف ادوار سے متعلق ہیں۔ اور ناول از بسکہ تسلسل واقعات کا نام ہے اس لیے محقق کے لیے معمولی سے معمولی واقعہ سے متعلق یقین وقوع تک پہنچنا لازم تھا۔ اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر منگلوری کو متخالف بیانات میں تطبیق پیدا کرنے کے لیے پلکوں سے کانٹے چننے کے عمل میں کتنی محنت و ریاضت سے گزرنا پڑا ہوگا۔

ملک العزیز ورجنا سے فردوس بریں تک۔۔۔ اور حسن انجلینا سے دلچسپ خرمی تک پھیلی ہوئی تاریخ وسیع زمانی اور مکانی فاصلوں پر پھیلی ہوئی ہے، لیکن مصنف کی جستجو ہر وادی میں یکساں سرگرمی کا ثبوت دے رہی ہے۔ لہٰذا اگر ان وجوہ سے، ناول کی تنقید کے ساتھ ساتھ اس کتاب کو متعلقہ ادوار تاریخ کا ایک تنقیدی تحقیق نامہ کہہ دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

موجودہ کتاب کی دوسری خصوصیت فائقہ، اردو تاریخی ناول پر لکھنے والے نقادوں کے بیانات کی تصحیح و اصلاح ہے۔ چنانچہ یہ کتاب ایک لحاظ سے تنقید تنقید کا درجہ رکھتی ہے۔

ہمارے ملک کی ایک بڑی محرومی یہ ہے کہ یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ خوئے غلامی میں اس درجہ آگے بڑھ گئے ہیں کہ اپنی تاریخ اور اس کے شاندار کارناموں کے بارے میں دشمنوں سے

بھی زیادہ زہرناک رویہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں یورپ کے مورخ بھی سکاٹ کی تاریخی بے انصافیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں وہاں ڈاکٹر احسن جیسے کرم فرما سکاٹ کی طرف سے عذر داری کرکے عبدالحلیم شرر کو گردن زدنی قرار دیتے ہیں۔۔۔، غالباً اس طرح وہ خود کے لیے لبرل، روشن خیال اور آزاد خیال کی سند حاصل کرنے کے درپے ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز منگلوری کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے ان دریوزہ گران اورنگ کی تاریخی پس ماندگی کی جا بجا نشان دہی کی ہے۔۔۔ اور انھیں للکارا ہے۔ کہ اے عزیزو و دوستو! پدرم شیطان بود کا ذلیلانہ نعرہ بلند کرنے سے پہلے تاریخ کے اوراق پر تو کچھ نظر ڈال لو۔

ڈاکٹر منگلوری کی تحقیق کا یہ حصہ، سابق الذکر موضوع سے بھی زیادہ محتاطانہ و ناقدانہ ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ ہماری ادبی تحقیق کے تاریخی ابعاد کے لحاظ سے اس کی افادیت ہمیشہ قائم رہے گی۔

تیسری وجہ امتیاز یہ ہے کہ مصنف نے اپنی اس کتاب میں عبدالحلیم شرر کی غلطیوں کی اصلاح کے علاوہ، ان کے مقاصد تصنیف کے بارے میں بھی ہمیں قطعی معلومات سے مستفید کیا ہے۔

چوتھی وجہ امتیاز یہ ہے کہ ڈاکٹر منگلوری نے اپنے جغرافیائی مطالعہ اور ذاتی سفر و سیاحت کے ذریعے مقامات و امکنہ کے موجودہ محل وقوع اور دیگر تازہ ترین متعلقہ کوائف سے ہمیں آگاہ کیا ہے۔

ان شواہد اربعہ کے علاوہ، قارئین اس کتاب میں خود دیکھ لیں گے کہ مصنف نے تاریخی ناول کے فن سے اپنی کامل آگاہی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اور جہاں جہاں شرر سے تضادات سرزد ہوئے ہیں ان کی نشان دہی کی ہے اور واضح کیا ہے کہ سیاق و سباق قصہ یا امکانات وقوع کے لحاظ سے شرر سے کیا کیا کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں۔ ناول کی تنقید ہمارے ہاں یوں بھی کم رواج ہے اور تاریخی ناول اور اس کی تنقید کے بارے میں حوش اور بھی کم ہے۔

ان حالات میں، اس فن کی طرف متوجہ ہونا بجائے خود حوصلہ طلب بات ہے۔ لیکن ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے نہ صرف یہ کہ اس بیابان نوردی کا حوصلہ دکھایا، بلکہ ایک ایسی تصنیف ہمیں دی جو تاریخ بھی ہے اور تنقید بھی، فن بھی ہے اور ادب بھی۔

یہ سب خوبیاں اس کتاب میں جمع ہیں۔۔۔ اور مجھے یہ رائے دینے میں مطلق کوئی تردد نہیں کہ یہ کتاب تنقیدی شاہکاروں میں شامل ہونے کے قابل ہے۔۔۔ اور آئندہ کے مصنفین کے لیے اس لحاظ سے ایک مثال اور ایک نمونہ ہے کہ، دیدہ ریزی، محنت، جانفشانی، مستقل مزاجی اور ریاضت کے بغیر ایسی محققانہ کتاب وجود میں نہیں آ سکتی۔

(ڈاکٹر) سید عبداللہ
پروفیسر ایمریطس پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۱۷ مئی، ۱۹۷۸ء

پیش لفظ

مولانا عبد الحلیم شرر

پچھلی اور رواں صدی کے مابین مولانا عبدالحلیم شرر کی شخصیت عجیب و غریب اوصاف کی حامل اور علم و ادب میں محیرالعقول کارناموں کی مالک نظر آتی ہے ۔ سر سید احمد خان کے دور میں میدان ادب میں آنے والا یہ ادیب بیسویں صدی کے ربع اول تک، جب تحریک خلافت کی گرم بازاری زمانے کی سرد مہری کی تاب نہ لا کر دم توڑ چکی تھی، داد علم و فن دیتا رہا ۔ شرر نے علم و فن کے جس کوچے میں بھی قدم رکھے وہاں اپنی شخصیت اور علمیت کے گہرے نقوش پا چھوڑے ۔ ادبی صحافت کی طرف آئے تو علم و ادب میں تحقیق و تنقید کا ایک معیار قائم کیا ۔ دل گداز کے پرانے فائل آج بھی اس امر کے شاہد عادل ہیں ۔ اس میں شاعری، ادب، تاریخ، جغرافیہ، معاشرت، تہذیب، تمدن ہر موضوع پر شرر کے خامۂ سحار آفریں نے بلا تکان لکھا ۔ انہوں نے انشائیے بھی لکھے اور نظم معریٰ کی ابتدا بھی کی ۔ اتنے مختلف موضوعات پر لکھنے اور زود نویس کہلانے کے باوجود شرر ایک خوش نوا انشا پرداز تھے ۔ ان کے مزاج میں رومانیت پسندی تھی اور اس کی بدولت وہ سر سید دور کی سپاٹ عقلیت پسندی اور کھردری سادگی سے بچ کر اسلوب کا ایسا انداز وضع کر گئے جس میں سادگی و سلاست کے علاوہ الفاظ و تراکیب کا حسن قاری کو متاثر کرتا ہے ۔

شرر کی شخصیت میں قدامت اور جدت پسندی کا بھی عجیب و غریب امتزاج تھا اور اپنے خیالات کے اظہار میں وہ خاصے بے باک تھے ۔ اپنی زندگی میں بھی اپنی اس افتاد طبع کی وجہ سے انہیں کئی معرکہ آرائیوں سے دو چار ہونا پڑا ۔ اور مرنے کے بعد بھی ان کی شخصیت نقادوں کے تند و تیز حملوں کا ہدف بنی ۔ خصوصاً ان کی تاریخی ناول نگاری تو آج تک ایک الجھا ہوا مسئلہ بنی رہی ہے اور بڑے بڑے نقادوں نے ان کے ناولوں پر ایسے ایسے اعتراضات کیے ہیں کہ جن کے بعد شرر کو علم و فن کی روایت میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں رہتا ۔ عام طالب علم اور قاری فاضل نقادوں کی آرا کو پڑھ کر از حد پریشان ہوتے ہیں ۔ با ایں ہمہ شرر کے تاریخی ناولوں کی اہمیت، ان اشتعال انگیز حملوں کے باوجود کم نہیں ہوئی ۔ البتہ ان کے ٹھوس تاریخی، تحقیقی اور تجزیاتی مطالعے کی ضرورت تھی ۔ یہ از حد اہم کام ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے انجام دے کر شرر کے تاریخی ناولوں کی از سر نو قدر و قیمت متعین کرکے ادب اردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے ۔

شرر نے تاریخی ناول محض تفریحاً نہیں لکھے تھے ۔ ان کا ایک بڑا مقصد تھا اور یہ مقصد قومی تعمیر نو اور اسلامی شوکت رفتہ کی بازیافت کی اس عظیم تحریک کا حصہ ہے جو اورنگ زیب عالمگیرؒ کے بعد جدید زمانے تک مختلف شکلوں میں رونما ہوتی رہی ہے ۔ سرسید نے تہذیب مغرب سے ہم عناں ہو کر بازیافت کی اس تحریک میں نئی روح پھونکی ۔ شبلی نے تاریخ اسلام کو اپنا موضوع بنایا ۔ اور شرر نے تاریخ اسلام کے حوالے سے ناول لکھ کر عام مسلمانوں کے قلب و ذہن

میں اسلاف کے عظیم کارناموں کی سطوت کا سکہ بٹھانا چاہا اور اس میں انھیں خاصی کامیابی ہوئی۔
اس مقصد سے ہمدردی رکھے بغیر شرر کے ناولوں کی صحیح قدر و قیمت متعین ہی نہیں کی جا سکتی۔
لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے اردو کے بعض نقاد، جنھوں نے شرر کے تاریخی ناولوں پر بے سروپا
اعتراض کیے ہیں، اسلام ہی سے منحرف ہیں، انھیں والٹر سکاٹ میں تو مذہبی تعصب کی کوئی بو
نہیں آتی لیکن شرر کا اسلامی جذبہ ان کی نظروں میں کھٹکتا ہے۔ دوسرے انھوں نے مغربی ادب
کا تو کسی حد تک مطالعہ کیا ہوگا، لیکن اپنی ادبی اور تہذیبی روایتوں سے اکثر بے خبر رہے۔
تیسرے یہ کہ وہ محض ادب کے نقاد تھے، تاریخ سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ جب کہ شرر
کا مطالعہ کرنے کے لیے ان سب امور کے جاننے کی ضرورت تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے یہ خدمت بہ احسن طریق انجام دے کر شرر
کے تاریخی ناولوں کی اہمیت کو از سر نو دریافت کیا ہے۔ ادب اور تاریخ دونوں کے وسیع مطالعے
کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے شرر کے ایک ایک ناول کا صحیح تاریخی تناظر میں بے لاگ جائزہ لے کر
ہر ناول کی تاریخی صداقت یا عدم صداقت کو متعین کیا ہے اور پھر فنی لحاظ سے بھی ان کی
خوبیوں کو واضح کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ آراء اردو کے خاص و عام نقادوں کی آراء سے
خاصی مختلف ہوں گی۔ لیکن یہ اطمینان ہے کہ یہ آراء ٹھوس مطالعے کے بعد قائم کی گئی ہیں۔
اس لیے سرسری، سطحی یا بے سروپا ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ ڈاکٹر ممتاز
منگلوری نے فردوس بریں کے جغرافیائی پس منظر کو جاننے کے لیے صرف ان کتابوں پر اکتفا نہیں
کیا جو کتب حوالہ کے طور پر اس کتاب کے آخر میں درج ہیں، بلکہ خود ایران کے ان علاقوں
کی سیاحت کرکے اپنے مشاہدے سے اصل حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے اندازہ
لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے مآخذ سے کتنا گہرا استفادہ کیا ہے اور اپنے نتائج تحقیق کو
بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔

یہ کتاب ہمارے تنقیدی ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ امید ہے اس سے شرر کے تاریخی
ناولوں کو، خصوصاً ان ناولوں کو جنھیں اس کتاب میں تاریخی اور فنی اعتبار سے شرر کے بہترین
ناول قرار دیا گیا ہے، ایک نئی زندگی ملے گی۔

(ڈاکٹر) غلام حسین ذوالفقار
ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی
۱۵ مئی، ۱۹۷۸ء

پیش لفظ

عبدالحلیم شـرر اردو کے پہلے اور سب سے بڑے تاریخی ناول نگار کی حیثت رکھتے ہیں لیکن ان کے بارے میں یہ رائے شدت سے منسہور ہوگئی ہے کہ ان کے تاریخی ناول تاریخی اعتبار سے بہت ناقص ہیں اور بقول شخصے "شـرر نے تاریخ کے چہرے کو از حد مسخ کیا ہے"۔ درحقیقت بعض نقـادوں نے شرر کو دانستہ اور بعض نے نادانستہ بدنام کیا ہے ۔ اکثر کی آراء محض سنی سنائی باتوں پر ہیں ۔ کسی نے کہیں یہ جملہ پڑھ لیا کہ "سـرر کے ناولوں کو پڑھنے کے لیے جاہل مسلمانوں کے سے اعتقاد کی ضرورت ہے،" تو جہالت کے الزام سے بچنے کے لیے، پڑھے بغیر، جہالت کے خلاف جہاد کے کار خیر میں شریک ہونے کے لیے اس جملے کو اس طرح بدل کر اپنا لیا کہ "شرر کے ناولوں کو پڑھنے کے لیے سنی جاہل مسلمانوں کے سے اعتقاد کی ضرورت ہے۔" بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، دہان ہر بت پغارہ جو زنجیر رسوائی کے مصداق ایسے "روسن خیالوں" کے مقلدین کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جو بے جانے پرکھے اور بے سوچے سمجھے ایسی آرا پر مزید حاسیہ آرائی کرتے چلے جاتے ہیں ۔ بعض تو ان معلومات کے باوصف کہ فلورا فلورنڈا میں سے ایک ہیرو اور دوسری ہیروئن تھی، اپنا بنیادی حق تصور کرتے ہیں کہ سرر کے تاریخی ناولوں کو بوچ اور لچر قرار دیں ۔

بعض نقـاد سـرر کی شہرت سے اس قدر خائف ہوئے کہ انھوں نے تاریخی ناول کی ترکیب کو ہی غلط قرار دے ڈالا لیکن حیرت ہے کہ تاریخی ناول کی ترکیب کو غلط قرار دینے والے یہی نقـاد سکاٹ، ڈومـاز اور وکٹر ہیوگو وغیرہ کی مدح میں رطب اللسان نظر آتے ہیں ۔ بہرکیف یہ بدیہی امر ہے کہ شرر کے ساتھ نقادوں نے انصاف نہیں کیا اور اس بے انصافی میں وہ سر فہرست ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ "اگر پشت خدا صلاح الدین اپنے دونوں مورخوں کو طلب کرے تو سکاٹ کو تو شاید چھوڑ دینے کی سفارش کرے مگر مولانا کو سزا دلوائے بغیر نہ مانے"۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اکثر نقـاد خود اسلامی تاریخ سے ناآشنا ہیں اس لیے انھیں شـرر کے بیان کردہ جملہ تاریخی واقعات مافوق الفطرت اور فرضی معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ یہی نقـاد سکاٹ کے دفتر کذب و افترا کو نہ صرف تاریخی ناول نگاری کی معراج تصور کرتے ہیں بلکہ اسلامی تاریخ و تمدن کے ساتھ اس کی چیرہ دستیوں پر مہر سکوت اختیار کرکے اپنی "روشن خیالی" اور "وسیع المشربی" کا ثبوت بہم پہنچانا چاہتے ہیں ۔ یورپی تہذیب و ترقی کی ظاہری چکاچوند نے ان نقـادوں کی نگاہوں کو اس قدر خیرہ کر دیا ہے کہ وہ اپنی تہذیب و ثقافت، تاریخ و ادب ہر چیز کو اپنے ذہنی آقاؤں کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں اور بعض تو اس معاملے میں اس قدر پختہ کار ہیں کہ وہ کسی ایسے آدمی کا ناول نگار کہلانا برداشت نہیں کر سکتے جو ایم۔اے انگریزی اور ایم۔اے نفسیات نہ ہو۔ ان کے نزدیک کسی فرد کا مولانا ہوکر ناول لکھنے کی جسارت کرنا ناقابل معافی گناہ ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ "اہل دانش" اپنے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں، اغیـار کے واسطے سے جانتے ہیں ۔ اسی بنا پر ان سے انتہائی مضحکہ خیز لغزشیں ہوتی

ہیں - ایسے نقاد خلیفہ سوم حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں گریگوری (جرجیر پادری) کے خلاف لڑی گئی جنگ کے حالات کے لیے سینکڑوں مسلمان مؤرخین کی بجائے صرف گبن سے رجوع کرتے ہیں جو بے چارہ خود زبیر اور ابن زبیر کے فرق سے نابلد ہے - اس لیے "فلسانا" میں ابن زبیر کی شخصیت تا کر انہیں شرر گردن زدنی معلوم ہوتے ہیں - یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں شرر سے واقعی تاریخی اور جغرافیائی بیانات میں لغزشیں ہوئی ہیں، وہاں یہ نقاد اپنی بے خبری کی بدولت خاموش دکھائی دیتے ہیں -

شرر کے بارے میں نقادوں کی اسی قسم کی آرا اس مطالعے کا باعث بنیں - زیرنظر تصنیف میں ان کے تاریخی ناولوں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے - کتاب میں ابتدائی دو ابواب شرر کی زندگی اور اس عہد کے سیاسی اور سماجی پس منظر سے متعلق ہیں - ان ابواب میں زیادہ تفصیل سے کام نہیں لیا گیا کیونکہ زیرنظر تصنیف کا موضوع ان دو ابواب میں اس سے زیادہ مواد کا متحمل نہیں تھا، اس لیے بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے - تیسرے باب میں تاریخی ناول نگاری کے فن اور شرر کے نظریئے فن سے بحث کی گئی ہے - چوتھے باب میں تاریخی ناولوں میں بیان کردہ تاریخی اور جغرافیائی واقعات کا تجزیہ اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جب کہ پانچویں باب میں ہر ناول کی الگ الگ فنی بحث ہے - موضوع کے لحاظ سے زیرنظر تصنیف کے آخری دو ابواب بنیادی ہیں -

زیرنظر تصنیف کے شروع کرنے سے پہلے اس پہلو پر بہت غور کیا گیا کہ آیا اس میں مختلف ناولوں میں بیان کردہ تاریخی واقعات کا خلاصہ دیا جائے یا نہ - خلاصہ دینے میں یوں ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی کہ ان ۲۳ ناولوں کا خلاصہ جن میں سے بعض دو دو اور بعض تین تین جلدوں پر مشتمل ہیں، سو ڈیڑھ سو صفحات سے کم جگہ نہیں لے گا جب کہ دوسری طرف ناول میں بیان کردہ تاریخی واقعات کے ذکر کے بغیر ان کی بحث اور تحقیقی جائزہ سیاق و سباق سے کٹی ہوئی بے ربط بحث بن جاتی - نیز یہ امر بھی پیش نظر تھا کہ ضروری نہیں کہ اس تصنیف کے مطالعے کے وقت ہر قاری کو شرر کے سارے ناول بھی دستیاب ہوں جنھیں پہلے وہ اصل واقعات جاننے کے لیے پڑھے اور پھر اس تحقیقی جائزے کو دیکھے - اس لیے احباب اور اساتذہ کرام کے مشورے سے یہی فیصلہ کیا گیا کہ تحقیقی جائزے سے پہلے چوتھے باب میں ہر ناول کے تاریخی واقعات کا مختصر ترین خلاصہ بھی دیا جائے -

زیرنظر تصنیف میں شرر کی ناول نگاری کے بارے میں کچھ عمومی اور مجموعی آراء ہیں اور کچھ بعض ناولوں کے بعض پہلوؤں کے بارے میں خصوصی آراء ہیں - یہ خصوصی آراء پانچویں باب میں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ سرسری طور پر دیکھنے سے خصوصی اور عمومی آراء میں کوئی تضاد محسوس ہو لیکن اسے اس نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے کہ اگر عمومی طور پر شرر کے یہاں کردار نگاری کا عنصر کمزور ہے تو ضروری نہیں ہر ناول میں یہی کیفیت ہو یا اگر مکالمے بالعموم کرداروں کی شخصیت سے پوری مطابقت نہیں رکھتے یا ان کی پوری عکاسی نہیں کرتے تو لازمی نہیں کہ ہر کردار کے بارے میں یہی کیفیت ہو - اس لیے عمومی اور خصوصی آراء کی اس نوعیت کے فرق کو مدنظر رکھا جانا چاہیے - ویسے پانچویں باب میں محاکمے کا اسلوب کم اور توضیحی اسلوب زیادہ اختیار کیا گیا اور حتمی آرا سے گریز کرتے ہوئے قاری کے رائے قائم کرنے کی گنجائش چھوڑی گئی ہے -

تاریخی ناول کی صنف بھی اردو ادب میں اور کئی دیگر اصناف کی طرح مغربی اور

بالخصوص انگریزی ادب سے آئی ہے لیکن انگریزی میں تاریخی ناول نگاری کے ارتقا کا ذکر چونکہ زیرنظر تصنیف کے موضوع سے باہر تھا اس لیے تیسرے باب میں تاریخی ناول کے فن اور تاریخی ناول نگاری سے متعلق شرر کے ہی نظریات کی بحث پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ شرر کی تاریخی ناول نگاری نے اپنے عہد کے اور بعد کے ناول نگاروں کو کس طرح اور کس قدر متأثر کیا یا شرر کی کتنی تقلید ہوئی، یہ بحث بھی زیر نظر تصنیف میں نہیں اٹھائی گئی کیونکہ یہ ایک الگ مستقل موضوع کی حیثیت رکھتی ہے۔

زیرنظر تصنیف میں شرر کے ان تاریخی ناولوں کا جائزہ لیا گیا ہے: (۱) ملک العزیز ورجنا۔ (۲) منصور موہنا۔ (۳) فلورا فلورنڈا۔ (۴) حسن انجلینا۔ (۵) فردوس بریں۔ (۶) ایام عرب۔ (۷) مقدس نازنین۔ (۸) فتح اندلس۔ (۹) یوسف و نجمہ۔ (۱۰) شوقین ملکہ۔ (۱۱) قیس و لبنیٰ۔ (۱۲) ماہ ملک۔ (۱۳) فلپانا۔ (۱۴) زوال بغداد۔ (۱۵) رومۃ الکبریٰ۔ (۱۶) الفانسو۔ (۱۷) مفتوح فاتح۔ (۱۸) بابک خرمی۔ (۱۹) لعبت چین۔ (۲۰) عزیزہ مصر۔ (۲۱) جویائے حق۔ (۲۲) طاہرہ۔ (۲۳) مینا بازار۔ اس جائزے کے اعتبار سے یہ ناول تین قسموں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جن میں شرر نے تاریخی صداقتوں کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ تاریخی ناول کے فن کو بھی عمدگی سے برتا ہے۔ دوسرے وہ جن میں تاریخی واقعات کے سلسلے میں تو کچھ لغزشیں ہوئی ہیں لیکن ناول نگاری کے فن کی عمدگی کی بدولت انھیں قبول عام نصیب ہوا ہے۔ تیسرے وہ جو تاریخی حقیقتوں کے سلسلے میں بہت کمزور ہیں اور ان کا پلاٹ صرف شرر کے تخیل کا مرہون منت ہے۔

جویائے حق، بابک خرمی، رومۃ الکبریٰ اور قیس و لبنیٰ ایسے ناول ہیں جن میں شرر نے تاریخی صداقتوں سے سر مو انحراف نہیں کیا۔ جویائے حق میں شرر نے فن کے سلسلے میں بھی ایک نیا تجربہ کیا ہے جس کی بعد میں اردو ناول نگاری میں تقلید ہوئی۔ فردوس بریں، زوال بغداد، فلورا فلورنڈا، فلپانا، شوقین ملکہ، مقدس نازنین، ایام عرب، ملک العزیز ورجنا، فتح اندلس، مفتوح فاتح اور منصور موہنا ایسے ناول ہیں جنھیں عوام میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ ناول فنی اعتبار سے شرر کے اچھے ناول ہیں لیکن ان کے تاریخی واقعات میں انھوں نے حسب ضرورت تھوڑا بہت رد و بدل کیا ہے۔ عزیزہ مصر، حسن انجلینا، لعبت چین اور ماہ ملک تیسری قسم کے ناولوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ ماہ ملک میں تو تاریخی حقیقتوں کی بجائے تخیل ہی تخیل دکھائی دیتا ہے۔ اسی قبیل کے ناولوں میں یوسف و نجمہ، طاہرہ اور مینا بازار بھی شامل ہیں۔ یوسف و نجمہ اور طاہرہ میں تو تاریخ بالکل ہی برائے نام ہے اور مینا بازار کی ساری اساس ایسے واقعات پر ہے جن کی کتب تواریخ سے کہیں بھی تصدیق نہیں ہوتی۔ زیر نظر تصنیف ان سارے امور سے بحث کرتی ہے اور امید ہے کہ یہ شرر کے تاریخی ناولوں کے بارے میں پیدا شدہ بہت سی غلط فہمیوں کو رفع کرنے میں کامیاب ثابت ہوگی اور اس سے شرر کے بارے میں ایک صحیح نقطہ نگاہ ابھرے گا۔

زیر نظر تصنیف میں اس امر کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ شرر کے ہر تاریخی ناول میں بیان کردہ ہر تاریخی واقعے کا تحقیقی جائزہ لیا جائے اور اس کی صداقت کو پرکھا جائے۔ یہ کوشش کس قدر مشکل تھی اس کے بارے میں کچھ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بعض معمولی

واقعات و جزئیات اور سنین کی تحقیق میں مہینوں مختلف کتب تواریخ کی ورق گردانی کرنی پڑی ۔ بعض واقعات کے بارے میں خود کتب تواریخ میں تضاد تھا، اسے دیکھنا پڑا ۔ ہر واقعے سے متعلق معاصر مآخذ کی تلاش کی گئی ۔ بعض واقعات محض روایات پر مبنی تھے ان کا تجزیہ کیا گیا ۔ ناولوں میں بیان کردہ مقامات، ان کی آب و ہوا، ان کے باہمی فاصلوں اور راستوں سے متعلق جغرافیائی صداقتوں کی جستجو کی گئی جو بڑا صبر آزما کام تھا اور ان سب امور سے پہلے شہرر کے حملہ ناولوں کا حصول ایک مسئلہ تھا ۔ بعض ناول تو ایسے تھے جنھیں حاصل کرنے کے لیے دو تین برس تک پاکستان بھر کے مختلف شہروں کے چھوٹے بڑے، نجی اور سرکاری کتب خانوں کی خاک چھاننی پڑی ۔ مختلف حقیقتوں کی جستجو میں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے مآخذ سے رجوع کرنا پڑا ۔ اس صبرآزما جد و جہد میں اگر محترم اساتذہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر وحید قریشی اور استاد الاساتذہ مخدومی ڈاکٹر سید عبداللہ کی حوصلہ افزائی اور محبی ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، مسز ثریا سفینہ زیب، مرزا نصیر بیگ اور شاگردان عزیز منور ابن صادق اور راجا رشید محمود کی معاونت شامل حال نہ ہوتی تو شاید میں ہمت ہار بیٹھتا ۔ میں ان سب کا انتہائی ممنون ہوں ۔

(ڈاکٹر) ممتاز منگلوری

این ۔ ڈبلیو ۔ ایف ۔ پی ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا باب

عبدالحلیم شرر کے حالات زندگی اور تصنیفات

عبدالحلیم نام اور شرر تخلص تھا ۔ ۲۰ جمادی الثانی ۱۲۷۶ھ (بمطابق ۱۸۶۰ء) کو بروز جمعہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے[1] ۔ اُن کے نانا مولوی قمرالدین دربار اودھ میں ایک معزز مقام رکھتے تھے اور شرر کے خاندان کو شاہی دربار سے خاص وابستگی اور قرب حاصل تھا ۔ شرر کے والد حکیم تفضل حسین عربی اور فارسی میں کامل بصیرت رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک پختہ مغز طبیب بھی تھے ۔ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد جلا وطن معزول بادشاہ نواب واجد علی شاہ جب مٹیا برج میں منتقل ہوئے تو شرر کے خاندان کے اکثر بزرگ جن میں شرر کے والد حکیم تفضل حسین بھی شامل تھے لکھنؤ چھوڑ کر کلکتے چلے گئے ۔ بعد ازاں شرر بھی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء میں ۹ سال کی عمر میں اپنی والدہ کے ساتھ کلکتے چلے گئے اور مٹیا برج میں اپنے والدین کے ساتھ رہنے لگے[2] ۔

شرر کی ابتدائی تعلیم کا آغاز لکھنؤ ہی میں ہو چکا تھا لیکن اسے باقاعدہ تعلیم نہیں کہا جا سکتا ۔ صحیح معنوں میں اُن کی تعلیم کا آغاز مٹیا برج میں ہوا جہاں انھوں نے ابتداً اپنے والد سے عربی فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں ۔ اس کے بعد مولوی سبد علی حیدر ، مولوی محمد حیدر سے عربی و فارسی کی معقولی اور ادبی کتابیں پڑھیں ، مولوی مرزا محمد علی مجتہد سے منطق اور حکیم محمد مسیح سے طب کی کتابوں کا درس لیا ۔ اسی زمانے میں تھوڑی بہت انگریزی بھی پڑھی لیکن انگریزی کی تعلیم ناقص اور بے قاعدہ انداز میں حاصل کی ۔ اخبارات سے دلچسپی بھی اسی زمانے سے شروع ہوئی اور صحافت کا ذوق پیدا ہوا ۔ وہ کلکتے سے بحیثیت نامہ نگار اودھ اخبار کے لیے خبریں بھی لکھ کر بھیجتے تھے ۔

۱۸۷۵ء میں مولوی قمرالدین کو پنشن مل گئی تو عبدالحلیم شرر کا اُن کی جگہ تقرر ہوا ۔ شرر دو سال تک یہ ملازمت کرتے رہے لیکن ۱۸۷۷ء میں کلکتہ سے لکھنؤ چلے آئے اور مستقل طور پر یہیں رہنے لگے ۔ لکھنؤ میں انھوں نے مولوی عبدالحیی سے عربی کی درسیہ کتب کی تکمیل کی ۔ ۱۸۷۸ء میں ماموں کی بیٹی سے شادی ہوئی ۔ شادی کے بعد علم حدیث کے حصول کا شوق پیدا ہوا اور اتنا بڑھا کہ شادی کے دوسرے سال شمس العلماء مولوی محمد نذیر

۱۔ سید وقار عظیم نے فردوس بریں شائع کردہ مجلس ترقی ادب (ایڈیشن اول) کے مقدمے میں ان کی تاریخ پیدائش ۲ جمادی الثانی لکھی ہے لیکن صحیح تاریخ ۲۰ جمادی الثانی ۱۲۷۶ھ ہے ۔

۲۔ سکسینہ ، رام بابو ، تاریخ ادب اردو ، علمی کتاب خانہ لاہور ، ص ۴۸۸ ۔

حسن محدث دہلوی سے علم حدیث سیکھنے دہلی چلے گئے اور ان کے مدرسے میں رہ کر حدیث کی تعلیم کو تکمیل تک پہنچایا - دہلی میں قیام کے دوران شرر نے انگریزی جاننے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور اس کی طرف خاص توجہ دی - پوری لگن اور محنت سے کام لے کر انہوں نے چند روز میں انگریزی میں بھی اچھی دست گاہ پیدا کر لی - ۱۸۸۰ء کے اواخر میں شرر دہلی سے لکھنئو واپس آ گئے -

قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے کہ کلکتے میں قیام کے دوران ہی شرر کو صحافت سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور وہ وہاں سے اودھ اخبار کے لیے نامہ نگاری کا کام کیا کرتے تھے - ۱۸۸۰ء میں دہلی سے لکھنئو واپسی پر منشی احمد علی کسمنڈوی نے اس شوق اور دلچسپی کو اور جلا دی اور انہیں کی ترغیب پر شرر نے اخباروں میں مضمون لکھنے شروع کیے - شرر کے یہ مضامین سیاسیات کی بجائے ادبی چاشنی کے حامل ہوتے تھے اور ان کی انشا پردازی کی رنگینی جلد ہی ان کی مقبولیت کا باعث بن گئی - چنانچہ ۱۸۸۰ء میں ہی منشی نول کشور نے انہیں اودھ اخبار کے ادارتی عملے میں لے لیا - یہ گویا شرر کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز تھا -

اودھ اخبار میں ملازمت کا زمانہ گو شرر کی نو عمری کا زمانہ تھا لیکن چونکہ طبیعت زوروں پر تھی ، ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ اعلیٰ خیال آفرینی اور فلسفیانہ معنی آفرینی کا ملکہ قدرت نے وافر ودیعت کیا ہوا تھا ، اس لیے بہت جلد اُن کی تحریروں کو قبول عام نصیب ہوا اور اُن کی شہرت دور دور تک پھیل گئی - مختصر عرصے میں انہوں نے بے شمار ایسے مضامین لکھے جن کے زور بیان ، بلندیٔ تخیل اور معنی آفرینی کی انہیں بھرپور داد ملی - حیدر آباد اور بعض دیگر چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے بلاوے آئے لیکن شرر نے وہاں جانا پسند نہ کیا - سرسید احمد خاں سے اگرچہ انہیں ذاتی شناسائی نہ تھی لیکن "روح" کے عنوان پر شرر کا ایک مضمون انہیں اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے منشی نول کشور کی وساطت سے بذریعہ خط اس مضمون میں سے کچھ اخذ کرنے کی اجازت چاہی -

اودھ اخبار میں ملازمت کے زمانے میں ہی شرر نے اپنے ایک دوست مولوی عبدالباسط کے نام سے ایک ہفتہ وار رسالہ "محشر" نکالا اور اس میں ایسے مضامین لکھے جو اپنی دلکشی اور عبارت کی رنگینی میں انفرادی حیثیت کے حامل تھے - اسی رسالے میں شرر نے اٹھارہ انیس نمبروں میں صبح کے منظر پر ایک مسلسل مضمون لکھا جس میں صبح کا بیان اس حسن پیرائے میں بیان کیا گیا تھا کہ صاحبان ذوق ورطۂ حیرت میں پڑ گئے - اس مضمون میں قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی کا وہ انداز نہیں تھا جو اس دور کا مروج پسندیدہ انداز تھا لیکن اس کے باوجود فارسی تشبیہوں ، ترکیبوں اور استعاروں اور انگریزی بندشوں کا ایسا پر لطف حسین امتزاج تھا جو اردو ادب میں اس سے پہلے کہیں نہیں ملتا - شرر کا یہ اسلوب نگارش از حد مقبول ہوا اور اسی بنا پر "محشر" کی مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا - غالباً "محشر" کی اسی مقبولیت کے باعث منشی نول کشور نے ۱۸۸۴ء میں انہیں اودھ اخبار کا نمائندہ خصوصی بنا کر حیدرآباد بھیج دیا - شرر نے چھ ماہ تک حیدرآباد میں رہنے کے بعد لکھنئو واپس آنے کی خواہش ظاہر کی لیکن انہیں اس کی اجازت نہ ملی چنانچہ وہ اودھ اخبار کی ملازمت سے مستعفی ہو کر لکھنئو واپس چلے آئے -

حیدرآباد سے واپسی کے بعد لکھنئو میں قیام کا زمانہ شرر کی ادبی زندگی کے آغاز کا دور

ہے ۔ اس زمانے میں انھوں نے اپنا پہلا ناول "دلحسپ" لکھا جس کا پہلا حصہ ۱۸۸۵ع میں اور دوسرا ۱۸۸۶ع میں شائع ہوا ۔ ۱۸۸۶ع ہی میں شرر نے بنکم چندر چٹرجی کے ناول "درگیش نندنی" کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرکے شائع کرایا ۔ اس ترجمے میں ایک اچھے انشا پرداز کی شخصیت صاف نمایاں ہے جس نے ترجمے کو ادبی خوبیوں اور حسن سے متصف کر دیا ہے ۔ ان چند ہی برسوں میں عوام شرر کی تحریروں کے شائق اور گرویدہ ہو چکے تھے ، چنانچہ مولوی بشیرالدین ایڈیٹر "البشیر" اور منشی نثار حسین نثار مالک "پیام یار" کے اصرار سے ۱۸۸۷ع میں شرر نے اپنا مشہور ماہنامہ "رسالہ دلگداز" جاری کیا ۔ شرر اس سال کو اپنی زندگی کا ایک اہم سال قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

ہماری زندگی کو اس سنہ نے (یعنی ۱۸۸۷ع نے) ایک نہایت عمدہ اور کامیاب کرانے والا تغیر دیا ۔ اس سنہ میں ہم کو موقع ملا کہ پبلک سے بلا واسطہ گفتگو کرنے کا ایک سلسلہ وار ذریعہ قائم کریں[1] ۔"

شرر نے ۱۸۸۸ع میں "دلگداز" میں بالاقساط ناول لکھنے شروع کیے ۔ "دلگداز" میں ان کا پہلا ناول "ملک العزیز ورجنا" ہے جو ۱۸۸۸ع میں سائع ہوا ۔ یہ ناول اپنے قبول عام کے علاوہ اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے اردو ناول میں ایک نئی صنف "تاریخی ناول نگاری" کا آغاز ہوا ۔ سرر اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں :

''ناول جو ۱۸۸۸ع کے دلگداز کے ساتھ شائع ہوا غالباً اردو میں اپنی طرز کا پہلا ناول ہے ۔ ہمارے مسلمان دوستوں نے اس ناول کو حد سے زیادہ پسند کیا ۔ اس ناول نے قوم اسلام کے وہ کارنامے دکھائے جو بجھے ہوئے جوشوں اور پژمردہ حوصلوں کو از سر نو زندہ کر سکتے ہیں ۔ اس ناول کو اسلامی پبلک نے شوق کے ہاتھوں سے لیا اور یک بیک ہندوستان میں ایسا شوق پیدا ہوگیا کہ ہم اسے مکرر چھپوا رہے ہیں[2] ۔''

۱۸۸۹ع میں دلگداز میں "حسن انجلینا" اور ۱۸۹۰ع میں "منصور موہنا" شائع ہوئے ۔ ۱۸۸۹ع میں ہی شرر نے اپنا پریس "دلگداز پریس" کے نام سے شروع کیا ۔ ۱۸۹۰ع میں شرر نے "مہذب" نام ایک نیا رسالہ جاری کیا جس میں وہ مشاہیر اسلام کی سوانح عمریاں لکھا کرتے تھے ، لیکن یہ رسالہ مالی مشکلات کی وجہ سے ایک سال کے اندر ہی اندر بند ہو گیا ۔ ۱۸۹۱ع میں انھوں نے ناول "قیس و لبنیٰ" لکھا اور اسی سال اپریل میں وہ دلگداز کو بند کرکے نواب سر وقارالامراء بہادر مدارالمہام دولت آصفیہ حیدرآباد[3] کے یہاں دو سو روپیہ ماہوار کے ملازم ہو کر حیدرآباد چلے گئے ۔ اس طرح شرر کے تصنیف و تالیف کے پہلے دور کا خاتمہ ہوا ۔

سر وقارالامراء کے چھوٹے صاحبزادے نواب ولی الدین خاں بچپن سے اٹین کالج انگلستان میں تعلیم پا رہے تھے اور اس ماحول کی وجہ سے مذہب سے بالکل بیگانہ تھے ۔ نواب وقارالامراء نے شرر کو نواب ولی‌الدین خاں کا اتالیق مقرر کرکے انگلستان بھیجنے کا فیصلہ کیا لیکن تمام تیاری کے باوجود آن کی روانگی دو سال تک نہ ہو سکی ۔ چنانچہ شرر نے حیدرآباد میں قیام پذیر ہوتے

۱۔ شرر ، مضامین ، جلد اول حصہ سوم ''۱۸۸۷ع اور ہم ۔''   ۲۔ ایضاً ۱۸۸۸ع ۔

۳۔ پروفیسر سید وقار عظیم نے فردوس بریں کے مقدمہ (شائع کردہ مجلس ترقی ادب) میں ان کا نام نواب وقارالملک لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے نواب وقارالملک اور نواب وقارالامراء دو الگ الگ شخصیتیں تھیں ۔

ہوئے لکھنؤ سے ۱۸۹۳ء میں پھر سے دلگداز جاری کیا جس کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں :

''ہمیں سفر ولایت کے شوق میں پرچہ اور مطبع بند کرکے مستعد ہو جانا پڑا مگر جب گھوڑے بیچ چکے تو روانگی کا مسئلہ خیر التواء میں پڑ گیا اور ہمارے لیے سوا سونے کے کوئی مشغلہ نہ تھا ۔ اس لیت و لعل میں جب دو سال گزر گئے تو ہم نے نا اُمید ہوکر ۱۸۹۳ء میں لکھنؤ سے پھر دلگداز کو جاری کر دیا ۔ مگر اب یہ حالت تھی کہ ہم حیدر آباد میں تھے اور دلگداز لکھنؤ سے نکل رہا تھا ، لیکن اسے شائع ہوئے صرف نو مہینے گزرے تھے کہ ہمیں یکایک روانگیٔ انگلستان کا حکم ملا ۔ ہم نے حکم ملنے کے پندرہ ہی روز بعد ''بسم اللہ مجریہا و مرسہا'' کہا اور جہاز نے لنگر اٹھایا اور دلگداز کی کشتی بیچ منجدھار کے پڑ کے ڈگمگائی اور ڈوب گئی ۱ ۔''

انگلستان میں شرر نے چودہ پندرہ ماہ قیام کیا اور موسیو کور بین نامی ایک فرانسیسی محقق سے فرنچ زبان کی تحصیل کی ۔ شرر ۱۸۹۶ء میں یورپ کے مختلف ملکوں کی سیاحت کرتے ہوئے حیدرآباد واپس پہنچے ۔

انگلستان روانہ ہونے سے پہلے شرر نے تین ناول ''دلکش'' ''زید و حلاوہ'' (۱۸۹۳ء میں) اور ''یوسف و نجمہ'' (۱۸۹۱ء میں) لکھنے شروع کیے تھے جو ان کی روانگی کے وقت نا مکمل حالت میں تھے ۔ اُن کے انگلستان چلے جانے کے بعد دوسروں نے ان ناولوں کو مکمل کرکے شائع کرا دیا ۔ وطن واپس آ کر بعد میں شرر نے ''یوسف و نجمہ'' اور ''زید و حلاوہ'' کو خود بھی مکمل کیا لیکن ''زید و حلاوہ'' کا نام بدل کر ''فلورا فلورنڈا'' رکھا اور ۱۸۹۸ء میں اسی نام سے یہ شائع ہوا ۔

انگلستان سے واپسی کے بعد شرر نے ۱۸۹۸ء میں دلگداز دوبارہ حیدرآباد سے جاری کیا ۔ اس عرصے میں ''ایام عرب'' کا پہلا حصہ شائع ہوا لیکن دلگداز کو دوبارہ جاری ہوئے ابھی گیارہ ماہ ہی ہوئے تھے کہ شرر اسے بند کرکے لکھنؤ چلے آئے ۔ دلگداز کو بند کر دینے اور حیدرآباد سے لکھنؤ چلے آنے کا محرک ''رسالہ دلگداز'' میں سکینہؓ بنت حسینؓ کے عنوان سے شائع ہونے والے مضامین بیان کیے جاتے ہیں ۔ ان مضامین کی بدولت حیدرآباد کے ایک حلقے میں شرر کی سخت مخالفت شروع ہوئی جس کی وجہ سے انھیں ۱۸۹۹ء میں دلگداز بند کرنا پڑا ۔ ۱۹۰۰ء میں انھوں نے لکھنؤ سے پھر دلگداز جاری کیا اور سب سے پہلے اس میں ''سکینہؓ بنت حسینؓ'' کے بقیہ حصے کو مکمل کیا ۔ شرر نے اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

''ولایت سے واپس آنے کے بعد ہم نے ۱۸۹۸ء سے پھر دلگداز جاری کیا لیکن گیارہ پرچے شائع ہونے پائے تھے کہ جناب سکینہؓ بنت حسینؓ کی سوانح عمری جو دلگداز میں شائع ہو رہی تھی عوام کالانعام میں شورش پیدا ہوئی ۔ اگرچہ گورنمنٹ نظام نے اپنی روشن خیالی سے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی مگر پرائیویٹ طور پر ہمیں یہ مشورہ دیا گیا کہ اس مضمون کے ماتقیٔ حصے کو ہم روک دیں اور اس کے عوض دیگر مضامین شائع کریں مگر ہم اس کے بھی متحمل نہ ہو سکے اور ہم نے یہ کہہ کے دلگداز ہی بند کر دیا کہ جب سکینہؓ بنت حسینؓ کا ماتقی حصہ شائع ہوگا تب ہی دلگداز بھی شائع ہوگا ۔ اس کے بعد پورے ایک برس ہم حیدر آباد میں رہے اور دلگداز بند رہا ۱۹۰۰ء میں ہمیں نواب وقار الامراء بہادر نے کہا کہ جب تک چاہیں لکھنؤ میں رہ کے اُن کی خدمات بجا لائیں ۔ چنانچہ ہم لکھنؤ گئے اور سب سے پہلے وہاں پہنچ کر ۱۸۹۸ء کا بارھواں نمبر شائع کیا جس میں حضرت سکینہؓ بنت حسینؓ کی سوانح عمری

۱- شرر ، مضامین جلد اول حصہ سوم ، ۱۹۰۸ء اور دلگداز ۔

کا باقی ماندہ حصہ تھا اور اس کے بعد جنوری ۱۹۰۰ء سے پھر اشاعت ''دلگداز'' کا سلسلہ لکھنؤ سے جاری ہو گیا''۔

لکھنؤ میں اس قیام کے دوران بھی دولت آصفیہ دکن سے شرر کے تعلقات بدستور قائم رہے اور نواب وقارالامراء مدار المہام و مولوی محمد عزیز مرزا کی عنایات سے انھیں ریاست حیدرآباد سے لکھنؤ میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ ملازمت بدستور جاری رہی اور اُن کی تنخواہ انھیں باقاعدگی سے لکھنؤ میں ملتی رہی ۔ اس عرصہ میں انھوں نے ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ سے ایک اور پندرہ روزہ رسالہ ''پردۂ عصمت'' بھی نکالا ۔ ۱۹۰۱ء میں انھیں دوبارہ حیدرآباد طلب کر لیا گیا چنانچہ وہ ''پردۂ عصمت'' اور ''دلگداز'' کو ایک بار پھر بند کر کے حیدرآباد چلے گئے ۔

۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۱ء کے درمیان لکھنؤ میں قیام کے دوران شرر کی حسب ذیل کتابیں شائع ہوئیں :

تاریخی رسالہ ''حسن بن صباح'' ، ''فردوس بریں'' (۱۸۹۹ء) ، ایام عرب حصہ دوم (۱۹۰۰ء) ، مقدس نازنین (۱۹۰۰ء) ڈاکو کی دلہن ، (ایک انگریزی ناول کا ترجمہ ۱۹۰۰ء) ، بدر النساء کی مصیبت ، (۱۹۰۱ء) ۔

۱۹۰۱ء میں شرر جب دوبارہ حیدرآباد پہنچے تو کچھ زیادہ عرصہ سکون سے نہیں گزرا تھا کہ واقعات کا رخ بدل گیا ۔ نواب وقارالامراء ملازمت سے علیحدہ ہو گئے اور پھر جلد ہی اُن کا انتقال ہو گیا ۔ مولوی عزیز مرزا جو شرر سے خاص ہمدردی رکھتے تھے ہوم سکرٹری کے عہدے سے اضلاع میں ڈپٹی کمشنری کے عہدے پر تبدیل ہو کر حیدرآباد سے چلے گئے ۔ نئے مدارالمہام راجہ کشن پرساد کو شرر سے کوئی ہمدردی نہ تھی اور مالیات کے منتظم مسٹر واکر شرر کا ریاست میں وجود غیر ضروری سمجھتے تھے ۔ غرض اس طرح ریاست سے شرر کے تعلقات کمزور ہو گئے اور بالآخر ۱۹۰۳ء میں وہ ملازمت چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے ۔ ۱۹۰۳ء میں لکھنؤ سے پھر ''دلگداز'' جاری کیا اور علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہوگئے۔ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۷ء تک لکھنؤ میں قیام رہا ۔ اپریل ۱۹۰۳ء میں شرر نے ایک نیا پندرہ روزہ ''اتحاد'' کے نام سے بھی نکالنا شروع کیا جس کی غایت ہندو مسلم تعلقات کو بہتر بنانا تھی ۔ اس عرصے میں اُن کی حسب ذیل کتابیں شائع ہوئیں[۲] :

شوقین ملکہ (تاریخی ناول ، جولائی ۱۹۰۳ء میں شروع ہو کر دسمبر ۱۹۰۶ء میں مکمل ہوا) ، ''یوسف و نجمہ'' (۱۸۹۱ء میں شروع ہوا ، پانچ جز شائع ہو کر ناتمام رہ گیا پھر سولہ برس بعد جنوری ۱۹۰۶ء سے شروع ہو کر دسمبر ۱۹۰۶ء میں مکمل ہوا ۔) ، سوانح حیات حضرت جنید بغدادیؒ ، تاریخ سندھ ، سوانح حیات حضرت ابوبکر شبلی ۔

۱۹۰۷ء میں شرر کو محکمہ تعلیم کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کا عہدہ دے کر پھر حیدرآباد طلب کر لیا گیا ۔ شرر نے ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد سے پھر ''دلگداز'' کا اجرأ کیا اور حیدرآباد کے اس قیام کے دوران ''آغا صادق کی شادی'' (معاشرتی ناول) اور ''ماہ ملک'' (تاریخی ناول) لکھے ۔

۱۔ ایضاً ۔ سکینہؒ بنت حسینؓ کے سلسلے میں ساری بحث ''جواب شرر'' کے عنوان سے کتابی صورت میں ۱۳۱۹ھ میں طبع ہوئی ۔

۲۔ سکسینہ ، رام بابو : تاریخ ادب اردو ، علمی کتاب خانہ لاہور ، ص ۴۹۲ - ۴۹۶ ۔

ناول "فلورا فلورنڈا" کی اشاعت کا سلسلہ جنوری ۱۹۰۷ء کو شروع ہوا تھا جو دسمبر ۱۹۰۸ء میں مکمل ہوا۔ اس عرصے میں انھوں نے "حروف مقطعہ" اور "تاریخ سندھ" کی دو جلدیں اور "آغا خانی صاحب کی لائف" بھی دلگداز کے ذریعے مکمل کیں۔ کچھ عرصے کے بعد نظام کسی بات پر شرر سے ناراض ہوگئے اور انھیں پھر حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔

حیدرآباد سے لکھنؤ واپس آکر ۱۹۱۰ء میں پھر دلگداز نکلا۔ اس سے پہلے دلگداز کے ہر شمارے میں ایک جز (۱۶ صفحات) کی ایک قسط تاریخی ناول کی اور ایک جز کی قسط تاریخ کی ہوتی تھی لیکن اب یہ سلسلہ ختم کر کے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ہر سال کے اختتام تک ایک دس بارہ جز کا ناول اور اتنی ہی ضخامت کی تاریخی کتاب دلگداز کے قارئین کو الگ کتابی صورت میں دی جانے لگی۔ اس مرتبہ انھوں نے دلگداز کا سائز $\frac{22 \times 18}{8}$ سے بدل کر $\frac{26 \times 20}{8}$ کر دیا۔

۱۹۱۱ء کو شرر دلگداز کے لیے مصیبتوں کا سال قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"دلگداز پر اس سال اول سے آخر تک مصیبتیں نازل ہوتی رہیں۔ سب سے پہلی مصیبت یہ تھی کہ محمد فاروق جن کے ہاتھ میں سارا انتظامی کام تھا ایسے بیمار پڑے کہ آج تک صاحب فراش ہیں اور اس قابل بھی نہیں کہ ذرا سا بھی کام کر سکیں۔۔۔ بہر حال فاروق سلمہ کی بیماری دلگداز کی بیماری تھی۔ مجھے بہت سا وقت ان کی تیمارداری میں صرف کرنا پڑا اور دل و دماغ اس قابل نہیں رہے کہ دلگداز کی پوری پوری خدمت کر سکوں۔ ادھر آخر سال میں مجھے بے وقت اور بے موقع اپنے بڑے لڑکے صدیق سلمہ اور اپنی ایک لڑکی کی شادیاں کرنی پڑیں جن سے آخر ذی الحجہ ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء میں مجھے فرصت ملی۔ یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے دلگداز کی اشاعت میں بد نظمی رہی"[1]۔

۱۹۱۲ء شرر کے لیے سب سے زیادہ المناک برس تھا۔ ان کے بیٹے فاروق کا انتقال اس سال فروری کے مہینے میں ہوا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

"دوستو ۱۹۱۲ء گزر گیا اور ہم زندہ ہیں۔ فاروق مرحوم جن کی زندگی سے ہمیں کو نہیں دلگداز کو بڑی بڑی امیدیں تھیں سال مذکور کے ماہ فروری میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ہم ان کی مفارقت کا صدمہ برداشت کرنے کے لیے عالم میں موجود ہیں۔ بیشک ہم فاروق مرحوم کے غم میں مبتلا ہو کے ایسے مغموم ہوئے کہ اپنے فرائض کو بھول گئے۔ یہاں تک کہ دلگداز کو بھی نہ سنبھال سکے۔ ان کی بیماری و صحت کی فکر اور تگ و دو سے جو بد نظمی دلگداز کی اشاعت میں پیدا ہوئی تھی ان کی وفات سے اور بڑھ گئی۔ چند پرچے نہایت مردہ دلی سے ستم زدہ دل کو ابھار ابھار کے نکالے بھی تو بے مزہ تھے یہاں تک کہ ۱۹۱۲ء کے چھ نمبر نکلنے کے بعد دلگداز کی اشاعت کا سلسلہ ایسا رکا کہ زمانے کو خیال ہوا کہ شاید دلگداز نے بھی مرحوم کا ساتھ دیا اور وہ بھی وہیں گیا جہاں وہ گئے ہیں۔ لیکن نہیں دلگداز ان کی زندگی کے ساتھ نہ تھا ہماری زندگی کے ساتھ ہے، بلکہ امید ہے کہ ہمارے بعد بھی باقی رہے گا"[2]۔

۱۹۱۲ء میں جب مولانا محمد علی دہلی سے "ہمدرد" اخبار نکالنے والے تھے تو انھوں نے اس کی ادارت کے لیے شرر کو دہلی بلوایا اور دو سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی لیکن اخبار کے نکلنے سے پہلے ہی بعض وجوہ کی بنا پر شرر دہلی میں چند ماہ قیام کرکے لکھنؤ واپس چلے گئے اس کا ذکر کرتے ہوئے شرر لکھتے ہیں:

"ہم نے بعض احباب کے مجبور کرنے سے اخبار ہمدرد کی چیف ایڈیٹری قبول کر لی تھی اور دہلی چلے

۱- شرر مضامین، جلد اول حصہ سوم، ۱۹۱۱ء اور ہم۔ ۲- ایضاً "۱۹۱۳ء کا آغاز"۔

گئے تھے۔ دفتر دلگداز منشی حکیم سراج الحق صاحب مینیجر دلگداز کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا تھا مگر ہمارے جانے کے دس ہی پندرہ روز بعد سراج الحق صاحب کے والد یکایک ایسے بیمار ہوئے کہ انہیں مجبوراً اُن کی تیمار داری کے لیے چلے جانا پڑا۔ آخر ان کے پدر بزرگوار نے مسلسل دو مہینے بیمار رہ کر سفر آخرت کیا اور سراج الحق صاحب کے چلے جانے سے دفتر دلگداز میں کوئی اتنا بھی نہ رہا کہ معمولی خطوں کا جواب دے سکے۔ ادھر ہم جو دہلی میں گئے تو آفات و حوادث زمانہ کے ایسے شکار بنے کہ خدا یاد آ گیا۔ بندہ زادہ محمد صدیق حسن سلمہ جو علی گڑھ کالج میں پڑھتا تھا یکایک بیمار ہو کے ہمارے پاس دہلی میں آیا اور ایسا بیمار ہوا کہ اگر ڈاکٹر انصاری صاحب جو مسلمانان ہند کی طرف سے ایک طبی مشن لے کر قسطنطنیہ تشریف لے گئے ہیں، ان کا سا حاذق طبیب اور بے نظیر سرجن نہ مل جاتا تو بظاہر اسباب اس کے جانبر ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ ڈاکٹر انصاری نے اس پر ایک نہایت ہی اعلیٰ درجے کا اور نازک آپریشن کیا جس میں داہنی جانب ناف کے نیچے سات آٹھ پردوں کو چاک کر کے اور آنتوں کو درمیان سے ہٹا کر اُن کے پیچھے سے تقریباً آدھ سیر مواد نکالا۔ یہ آپریشن معجز نما طریقے سے کامیاب ہوا کیونکہ اس کے ساتھ ہی تمام شکایتیں جاتی رہیں اور جو کچھ شکایت باقی تھی صرف زخم کے اندمال کی تھی جس میں ڈیڑھ مہینے کے قریب زمانہ صرف ہوا لیکن خدا نے ہم پر بڑا فضل کیا اور ڈھائی مہینے کے بعد ہم صدیق کو لے کر گھر آئے۔

الحاصل ہمیں دہلی میں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا اور جتنے دنوں رہے مایوسیوں اور طرح طرح کی آفتوں میں مبتلا رہے۔ ادھر ہمدرد اخبار جس کے لیے ہم گئے تھے، وہ بھی بیروت سے ٹائپ کے غیر مکمل آنے اور مہینوں تک اس کا تکملہ نہ ہو سکنے کے باعث جاری نہ ہو سکا۔ مسٹر محمد علی نے کوئی کوشش اور کسی قسم کی تگ و دو اٹھا نہیں رکھی لیکن معاملہ ایسا تھا کہ کسی کا زور نہ چل سکتا تھا اور کوئی تدبیر بنائے نہ بنتی تھی۔ آخر یہ دیکھ کے کہ وہاں ہماری موجودگی سے کوئی کام نہیں نکلتا اور دلگداز کا کام بگڑتا جاتا ہے، ۱۳ دسمبر ۱۹۱۲ء کو ہم صدیق سلمہ کے ساتھ لکھنؤ واپس آئے اور بعض ایسی باتیں پیش آئیں کہ ہم نے دہلی جانے کا ارادہ ہی فسخ کر دیا۔"[1]

۱۹۱۳ء میں نظام نے انہیں حیدرآباد میں طلب کر کے اپنی سوانح عمری لکھنے کا حکم دیا لیکن پھر یہ خیال ترک کر دیا اور انہیں لکھنؤ میں رہ کر تاریخ اسلام لکھنے پر مامور کیا۔ اس کام کے لیے انہیں نظام کی طرف سے ایک معقول رقم لکھنؤ میں ماہوار ملتی تھی۔ یہ کتاب تین جلدوں میں مکمل ہوئی۔

۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۶ء تک کا دور شرر کی ادبی زندگی کا سب سے اہم دور ہے، اس زمانے میں اُن کی بہت سی مشہور تصنیفات مکمل ہو کر شائع ہوئیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

فلپانا (تاریخی ناول، ۱۹۱۰ء)، **عیب دار دلہن** (ناول، ۱۹۱۰ء)، **زوال بغداد** (تاریخی ناول، ۱۹۱۲ء)، **تاریخ مصر قدیم** (۱۹۱۲ء)، **رومتہ الکبریٰ** (تاریخی ناول، ۱۹۱۳ء)، **حسن کا ڈاکو** (ناول، حصہ اول ۱۹۱۳ء، حصہ دوم ۱۹۱۴ء) **اسرار دربار حرام پور** (دو حصے ۱۹۱۴ء)، **خوفناک محبت** (ناول، ۱۹۱۵ء)، **الفانسو** (تاریخی ناول، ۱۹۱۵ء)، **مفتوح فاتح** (تاریخی ناول، ۱۹۱۶ء)، **بابک خرمی** (تاریخی ناول، حصہ اول ۱۹۱۷ء)، **جویائے حق** (تاریخی ناول، حصہ اول ۱۹۱۷ء)، **سوانح قرۃ العین** (۱۹۱۷ء)، **تاریخ عزیز مصر** (۱۹۱۷ء)، **تاریخ مسیح و مسیحیت** (۱۹۱۷ء)، **بابک خرمی** (تاریخی ناول، حصہ دوم ۱۹۱۸ء)، **تاریخ عرب قبل اسلام** (۱۹۱۸ء)، **جویائے حق** (تاریخی ناول حصہ دوم ۱۹۱۹ء)،

۱۔ شرر، مضامین، جلد اول حصہ سوم، ۱۹۱۲ء ختم سال اور ہم۔

لعبت چین (تاریخی ناول ، ۱۹۱۹ء) ، **تاریخ ارض مقدس** (۱۹۱۹ء) ، **سوانح خاتم المرسلین**[۲] (۱۹۱۹ء) ، **صقلیہ میں اسلامی تاریخ** (۱۹۱۹ء) ، **عزیزہ مصر** (تاریخی ناول ، ۱۹۲۰ء) ، **اسیر بابل** (ناول ، ۱۹۲۰ء) ، **جویائے حق** (تاریخی ناول ، حصہ سوم ۱۹۲۱ء) ، **طاہرہ** (تاریخی ناول ، ۱۹۲۳ء) ، **مینا بازار** (تاریخی ناول ، ۱۹۲۵ء) ، **شہید وفا** (ڈراما ، ۱۹۲۶ء)، **میوۂ تلخ** (ڈراما ، ۱۹۲۶ء) ، **نیکی کا پھل** (ناول ، ۱۹۲۶ء) -

ان تصنیفات کے علاوہ اس آخری دور میں شرر نے کچھ مزید رسالے بھی تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے جاری کیے جن میں **العرفان** (ماہنامہ)، **دل افروز** (ماہنامہ) ، **ظریف** (ہفت روزہ)، اور **مورخ** (ماہنامہ) شامل ہیں ۔ **دل افروز** کا اجرا اپریل ۱۹۱۵ء میں ہوا ۔ اس میں بیک وقت دو ناول قسطوں میں شائع ہوتے تھے -

شرر کی تصنیفات کی تعداد ۱۰۲ ہے اور مضامین کے مجموعے ان کے علاوہ ہیں جو آٹھ جلدوں میں شائع ہوئے ہیں ۔ مضامین کے مجموعوں کی تفصیل حسب ذیل ہے :

جلد اول : حصہ اول ، شاعرانہ اور عاشقانہ مضامین ۔ حصہ دوم ، شاعرانہ اور عاشقانہ مضامین ۔ حصہ سوم ، آغاز و اختتام سال کے مضامین (یہ دلگداز کے اداریے ہیں) ۔

جلد دوم : حصہ اول ، تاریخی و جغرافیائی مضامین ۔ حصہ دوم ، مختلف ممالک ، شہروں اور قوموں کے حالات اور تذکرے ۔ حصہ سوم ۔ ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ۔

جلد سوم : حصہ اول، سیر النسواں (دنیا کے مختلف ممالک کی مشہور عورتوں کا تذکرہ) ۔ حصہ دوم، سیر النسواں (دنیا کے مختلف ممالک کی مشہور عورتوں کا تذکرہ) حصہ سوم ، سیر رجال (دنیا کے مشہور مردوں کے حالات) ۔

جلد چہارم : ادبی اور تحقیقی مضامین

جلد پنجم : اصلاحی مضامین

جلد ششم : تاریخی واقعات پر خیال آرائی

جلد ہفتم : نظم و ڈراما

جلد ہشتم : مقالات شرر

مولانا شرر ۱۹۲۶ء میں ۴۶ سال تک علم و ادب کی ناقابل فراموش خدمت سر انجام دینے کے بعد ۶۶ برس کی عمر میں وفات پا گئے ۔

دوسرا باب

تاریخی اور معاشرتی پس منظر

سولھویں صدی عسوی سے انگریز تاجروں نے سر زمین ہند کو حصول دولت کے لیے اپنی جولان گاہ بنا رکھا تھا ۔ سلطنت مغلیہ کے زوال اور ملکی انتشار پر شروع ہی سے اُن کی گہری نظر تھی ۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں جب ہندوستان پر مغلوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تو انگریزوں نے پیش قدمی کرتے ہوئے اپنی تجارتی کوٹھیوں کو قلعوں میں تبدیل کرکے اپنی فوجی طاقت کو مضبوط بنانا شروع کر دیا ۔ کیونکہ طوائف الملوکی کے اس دور میں انھیں تجارت سے سیاست زیادہ منفعت بخش نظر آنے لگی تھی[1] ۔ ۱۷۴۸ع میں جب نظام الملک کی وفات کے بعد دکن اور کرناٹک میں اقتدار کی جنگ شروع ہوئی تو انگریزوں اور فرانسیسیوں کو دیسی امراء کے نجی معاملات میں براہ راست مداخلت کا موقع ملا[2] ۔ ان خانہ جنگیوں میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے حریف فرانسیسیوں پر غالب آ گئی اور اس طرح تقویت پا کر انگریزوں نے نواب علی وردی خان مہابت جنگ کے انتقال (۱۷۵۶ع) کے بعد بنگال میں بھی ریشہ دوانیوں کا جال بچھا دیا ۔ سراج الدولہ نے خطرے کی پیس بنی کرتے ہوئے فورٹ ولیم میں انگریزی قلعہ بندیوں کو مسمار کرنے کا حکم دے دیا لیکن کمپنی کی سیاسی حکمت عملی جس میں بقول میجر باسو معاہدے ، سازش ، غداری ، فریب دہی اور ڈپلومیسی کے الفاظ ہم معنی مفہوم رکھتے تھے بالآخر غالب آ گئی اور سراج الدولہ کو سلطنت کے علاوہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے[3] ۔

جنگ پلاسی (۱۷۵۷ع) اور جنگ بکسر (۱۷۶۴ع) میں انگریزوں کی کامرانی نے انھیں بنگال ، بہار اور اڑیسہ کا آئینی حکمران بنا دیا تھا ۔ (کیونکہ جنگ بکسر کے بعد شاہ عالم ثانی نے انگریزوں کو ان صوبوں میں دیوانی کے اختیارات دے دیے تھے) دکن میں وقتی طور پر اُن کی کوششیں کامیاب نہ ہوئیں کیونکہ سلطان حیدر علی کی دور اندیشی اور اس کے اولوالعزم فرزند ٹیپو سلطان کی جرأت و بہادری نے سامراجی خطرے کے خلاف ایک حصار بنا لیا تھا اور اس کے خلاف مصروف پیکار تھے لیکن سرنگا پٹم کی تسخیر (۴ مئی ۱۷۹۹ع) اور سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد یہ حصار بھی ٹوٹ گیا[4] ۔ گویا انیسویں صدی کے آغاز سے کچھ ہی پہلے ہندوستان کے مشرقی صوبوں کے علاوہ بعض دوسرے علاقوں میں بھی برطانوی اقتدار قائم ہو گیا ۔

۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار : اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر ، ص ۸۴ ۔
۲۔ ڈاکٹر یوسف حسین : تاریخ دستور حکومت ہند ، ص ۲۳ ۔
۳۔ Major B.D. Basu . *Rise of Christian power in India* جلد ۱ ، ص ۷۷ ، ۱۰۰ بحوالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ص ۸۴ ۔
۴۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، ایضاً ص ۸۵ ۔

برطانوی فوجیں میسور، حیدرآباد اور اودھ کی ریاستوں میں متعین ہوگئیں اور اس طرح بالواسطہ یا بلاواسطہ ہندوستان کے بہت سے علاقے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط میں آ گئے[1]۔

پانی پت کی تیسری جنگ میں ہندوستانی قوتوں کی کمزوری کے باعث کمپنی کے لیے تسخیر ہند کے دروازے کھل گئے۔ اس جنگ کے دس سال بعد (۱۷۷۲ء میں) شاہ عالم ثانی اگرچہ دہلی واپس آ گیا لیکن اس کی حیثیت دو متحارب گروہوں کے درمیان ایک وظیفہ خوار قیدی کی سی تھی۔ ۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلہ نے دہلی پر قبضہ کرکے شاہ عالم کو اندھا کر دیا اور تیموری شہزادیوں کی بے حرمتی کرکے مغلوں کی عزت و ناموس کو خاک میں ملا دیا۔ مرہٹہ سردار مہادجی سندھیا نے مغل شہنشاہ کو اس ظالم کے پنجۂ ستم سے نجات دلا کر دوبارہ تخت پر بٹھایا اور خود اس کا مختار مطلق بن گیا لیکن ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے مرہٹوں کو شکست دے کر دلی پر قبضہ کر لیا اور مرکز سلطنت کے ساتھ مغل بادشاہ بھی ان کے قبضہ قدرت میں آ گیا۔ اب اودھ کا وزیر کمپنی کا باجگذار اور دہلی کا تاجدار انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا۔ ۱۸۳۵ء تک کمپنی کے سکوں پر مغل بادشاہ کا نام کندہ ہوتا رہا لیکن اس کے بعد یہ نقش بھی ختم ہوگیا اور سکوں پر انگریز شہنشاہوں کی تشبیہیں نظر آنے لگیں۔ ہندوستان کی دولت انگلستان کے صنعتی انقلاب کی تکمیل میں خرچ ہونے لگی اور دیسی مصنوعات کی بیخ کنی کرکے ولایت کے مشینی مال کی کھپت کے لیے یہاں میدان ہموار ہونے لگا۔ گویا ملکی معیشت کی لاش پر اجنبی استبداد کا دیو ناچنے لگا[2]۔

۱۸۳۵ء کے بعد کمپنی نے اپنے سامراجی اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے امن و امان بحال کرکے کچھ اصلاحات کیں، نئے مدرسے اور کالج کھولے اور لارڈ میکالے کی سفارشات پر (۱۸۳۵ء) ملک میں نئی تعلیم کی بنیاد رکھی جس نے آگے چل کر ہندوستانی معاشرے کو بہت متاثر کیا۔ عیسائی مشنریوں کی سرکاری اور غیر سرکاری طور پر حوصلہ افزائی کی جانے لگی۔ عیسائی پادری فوجی چھاؤنیوں اور شاہراہوں پر مذہب کے نام پر تعصب اور تنگ نظری کی تبلیغ کرنے لگے جس نے کمپنی کے خلاف شکوک و شبہات پھیلانے کے علاوہ ہندوستان کی مختلف العقائد فضا میں مذہبی کشیدگی کو ہوا دی۔ پریس قائم ہوئے اور اخبارات کا اجرا ہوا جس سے ملک میں نئے نئے مغربی افکار و خیالات پرورش پانے لگے۔ ان افکار و خیالات کا رد عمل ہندوستان کے مختلف عناصر پر مختلف صورتوں میں ہوا۔ کمپنی کی ڈپلومیسی میں یہ بات اساسی حیثیت رکھتی تھی کہ مختلف عقاید، مختلف مذاہب، مختلف نظریات اور مختلف طبقات کے لوگوں میں اختلاف کی خلیج کو زیادہ سے زیادہ گہرا کیا جائے۔ سقوط بنگال کے بعد وہاں مسلمانوں کو معاشی اعتبار سے پس ماندہ بنانے اور ہندوؤں کو آگے بڑھانے میں بھی یہی حکمت پوشیدہ تھی۔ ہندوؤں نے اجنبی حکومت کی جاری کردہ اصلاحات اور تعلیمات کو اپنے لیے نعمت غیر مترقبہ سمجھا اور ان سے مستفید ہونے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی، لیکن یہ قدرتی امر تھا کہ مسلمان اس نئے نظام سے سراسر عدم مفاہمت کا اظہار کریں جو غیر اسلامی، اجنبی اور ان کے لیے

۱۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، مقالہ در تاریخ ادبیات مسلمانان ہند و پاکستان، جلد ۳ ص ۶، ۷۔

۲۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ص ۸۶۔

معاندانہ بھی تھا ۔ مسلمانوں کی حالت بقول عبداللہ یوسف علی ہر جگہ الم انگیز تھی کیونکہ انھوں نے من حیث القوم اس آشوب ساست سے زیادہ نقصانات اٹھائے تھے اس لیے ان کی حالت مایوس کن تھی ۔ اس کے باوجود اب ان کا اجتماعی شعور مسلسل ناکامیوں کے بعد بیدار ہونے لگا تھا ۔ وہ اس حقیقت سے پوری طرح با خبر ہو چکے تھے کہ ہندوستان سے ان کا اقتدار انگریزوں نے ختم کر دیا ہے اور معاشی طور پر اب وہ بھوک اور افلاس کے مہیب غار کے منہ پر کھڑے ہیں[1] ۔

سید احمد بریلوی (۱۷۸۶ع-۱۸۳۱ع) کی تحریک اصلاح و جہاد نے مسلمانوں میں سنبھلنے کا جوش اور اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کا ولولہ پیدا کر دیا تھا ۔ بقول ایک جرمن سیاح "ہندوستان کے مسلمان باشندوں کی نگاہیں جہاد کی تبلیغ کرنے والوں کی طرف بے ساختہ طور پر اٹھ جاتی ہیں ۔ حرکت و بیداری کی اس لہر کے اثرات دکن کے دور افتادہ دیہات سے لے کر کلکتہ اور دہلی جیسے بڑے بڑے شہروں تک یکساں پھیلے ہوئے ہیں[2] ۔" حرکت و بیداری کی اس ہمہ گیر لہر کے ساتھ ساتھ یاس و نومیدی کے سیاہ بادل بھی مسلمانوں کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے ۔ حقایق اور تعصب العین کے تفاوت و تصادم نے ان کے دل و دماغ کو بے حس کر رکھا تھا ۔ بالا کوٹ میں سید احمد بریلوی کی شہادت کے بعد انھیں کوئی ایسی مرکزی شخصیت نظر نہیں آتی تھی جس سے وہ اپنے آپ کو وابستہ کر سکیں ۔ انگریزی اقتدار کے پنجے ان کے سینے میں پوری طرح گڑ چکے تھے اور مفر کی کوئی راہ نہیں تھی ۔ انگریزوں کی الحاق کی پالیسی کی بنا پر عام لوگوں کے ساتھ ساتھ نوابوں اور راجاؤں میں بھی بے چینی پھیل گئی تھی ۔ اس اجتماعی بے چینی کی فضا سے کمپنی کی دیسی سپاہ کا متاثر ہونا ایک قدرتی بات تھی ۔ ہندوستان میں کمپنی کی باقاعدہ فوج پونے تین لاکھ تھی اور اس میں انگریزوں کی تعداد صرف پینتالیس ہزار، لیکن انگریزی اور دیسی سپاہ میں جو ناروا امتیازی سلوک روا رکھا جاتا تھا اس سے دیسی سپاہ سخت بد ظن تھی ، وہ کئی بار مختلف چھاؤنیوں میں احتجاج اور بغاوت پر بھی اتر آئی تھی ، لیکن اب اجتماعی صبر و شکیب کے پیمانے کو چھلکتا دیکھ کر وہ بھی ایک آخری معرکۂ موت و حیات کے لیے تیار ہوگئے ۔ غرض آتش فشاں تیار تھا فقط لاوا پھٹنے کی دیر تھی ۔ چربی کے کارتوسوں نے میگزین کے فتیلے کو آگ لگا دی اور ۱۸۵۷ع کا خونیں انقلاب برپا ہو گیا جس میں چند در چند وجوہ کی بنا پر ہندوستانی قوتیں ناکام رہیں اور ملک پر اجنبی سامراج کا تسلط ایک تاریخی حقیقت بن گیا[3] ۔

ایل ایس مے (L. S. May) کا خیال ہے کہ تحریک آزادی کے جراثیم جنگ پلاسی (۱۷۵۷ع) سے شروع ہوئے اور ایک سو برس تک پروان چڑھتے رہے ۔ اس کے محرکات محض فوجی نہیں بلکہ مذہبی ، سیاسی اور معاشی بھی تھے ۔ کمپنی نے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کے لیے جو طریق کار اختیار کیا اس کی بدولت پورے ملک میں بے چینی پھیلی ۔ ہندوستانیوں کو مجلس قانون ساز میں جگہ نہ دے کر اور ۱۸۵۰ع کے قانون کے تحت تبدیل مذہب کے باوجود وراثت کے حق کو بحال رکھ کر کمپنی نے ان محرکات کو ہوا دی ۔ ۱۸۵۰ع کا قانون بدیہی طور

۱- بحوالہ ایضاً ص ۸۶ ۔

۲- Capt. Leopold Von Orlich, Travels in India, vol I, p. 241.

۳- ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، ایضاً ، ص ۸۷ ۔

پر عیسائیت کی پشت پناہی اور اس کے فروغ کی راہ ہموار کرتا تھا ۔ عیسائی مشنریوں کی آزادانہ سرگرمیاں بھی ہندوستانیوں میں تحفظ مذہب کا احساس پیدا کرنے کا باعث بنیں ۔ ۱۸۵۲ع کے شروع کے اعداد و شمار کے مطابق اس وقت ہندوستان اور لنکا میں ۲۲ مشنری سوسائیٹیاں، ۳۱۳ مشنری سٹیشن، ۴۴۳ مشنری، ۳۳۱ دیسی گرجے اور ۱۳۴۱ کارندے کام کر رہے تھے۔ مقامی عیسائیوں کی تعداد ۱۱۲۱۹۱ تھی ۔ انگریزوں کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کے متعلق بھی یہی بدگمانی عام تھی کہ وہ عیسائیت کے پرچار اور لادینیت کے فروغ کے لیے قائم کیے جا رہے ہیں ۔ ۱۸۵۵ع کے اعداد و شمار کے مطابق مشنری اس وقت لڑکوں کے لیے ۱۳۴۷ ورنیکلر، ۹۳ اقامتی اور ۱۲۶ انگریزی سکول چلا رہے تھے جن میں علی الترتیب ۴۷۵۰۴، ۲۴۱۴ اور ۱۴۵۶۲ دیسی طلبہ زیر تعلیم تھے ۔ لڑکیوں کے لیے مشنریوں نے ۳۴۷ عام، ۱۰۲ اقامتی سکول قائم کیے ہوئے تھے جن میں علی الترتیب ۱۱۵۱۹ اور ۲۷۷۹ لڑکیاں زیر تعلیم تھیں ۔ عوام کے علاوہ فوج میں بھی عیسائیت پھیلانے کا کام اعلیٰ سطح پر ہو رہا تھا ۔ اعلیٰ فوجی افسر عیسائیت کی تبلیغ کرتے تھے جس سے فوج میں بھی بے چینی اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی[1] ۔

۱۸۵۷ع کے انقلاب کے بعد بدنظمی اور بے چینی کا وہ طویل دور ختم ہو گیا جس میں منزل مقصود کا کوئی پتہ نہ تھا ۔ اگرچہ امن و سکون کا یہ نیا دور بھی گوشۂ قفس کے سکون کے مماثل تھا تاہم اس سے پیشتر کی ربع صدی کی مسلسل غیر یقینی اور غیر محفوظ حالت، پراگندگی اور انتشار کے مقابلے میں اہل ہند نے عام طور پر اسے غنیمت جانا ۔ اس کے ساتھ ہی اب ہندوستانیوں کو یہ تلخ حقیقت بھی تسلیم کرنی پڑی کہ وہ سچ مچ ایک اجنبی گوری نسل کے قبضہ و اختیار میں ہیں اور انھیں اپنی طویل تاریخ میں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اپنے دیس اور اپنے وطن کی فضاؤں میں سانس لینے کے باوجود وہ غریب الوطن اور غریب الدیار ہیں ۔ ۱۸۵۸ع میں کمپنی کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا جو اپنی ڈپلومیسی، دھوکے، فریب اور معاشی استحصال کے لیے ملک میں بہت بدنام ہو چکی تھی ۔ بر عظیم کی عنان اقتدار اب براہ راست تاج برطانیہ کے ہاتھ میں آ گئی جس سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ۔ اس موقع پر ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے ایک اعلان جاری ہوا جس کے ذریعے سرکاری نوکریوں کے لیے رنگ و قومیت کا امتیاز اٹھا دیا گیا، تمام مجاہدین آزادی کو جن پر قتل کا الزام نہیں تھا اور سزا سے ابھی تک بچے ہوئے تھے، معاف کر دیا گیا اور مذہبی آزادی کا اعلان کیا گیا ۔

انقلاب ۱۸۵۷ع کی ناکامی کے بعد کچھ عرصے تک ہندوستانی ذہنوں پر خوف و ہراس طاری رہا کیونکہ فتح کے نشے اور جذبۂ انتقام نے انگریزوں کو دیوانہ بنا دیا تھا ۔ انتقام کے جوش میں انھوں نے سر زمین ہند پر جو خونی کھیل کھیلا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ۔ انتقام کی یہ آگ ہزاروں بے گناہوں کا خون بہانے اور لاکھوں کی عزت و ناموس کو خاک میں ملانے کے باوجود بھی فرو نہ ہو سکی، بلکہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ اس خونیں سانحے کے بعد بھی ایک عرصہ تک نشانہ ستم بنے رہے، کیونکہ اپنی بعض مصلحتوں کی بنا پر انگریز مسلمانوں کو اس جنگ کا بانی مبانی قرار دے رہے تھے اور انھی کو اپنا اصل حریف

۱- L S May The Evolution of Indo Muslim thought after 1857 ص ۵، ۶ -

اور دشمن سمجھتے تھے ۔ بقول سر آک لینڈ کالون "غدر فرد ہو جانے پر انھیں سے سخت انتقام لیا گیا اور دونوں قوموں (انگریزوں اور مسلمانوں) میں مصالحت کی امید جاتی رہی[1]۔" جنگ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد جہاں جہاں انگریزوں کا دوبارہ تسلط قائم ہوتا گیا وہاں مہینوں تک انگریز سپاہی اور ان کے معاون دستے ہتے باشندوں کا شکار کھیلتے پھرے اور تخمیناً ہر انگریز کے بدلے میں کم و بیش ایک ہزار دیسی مارے گئے ۔ یہ حال صرف اہل دہلی کا ہی نہیں تھا بلکہ لکھنئو ، الہ آباد ، آگرہ ، کانپور ، بنارس ، باندہ ، فتح پور ، فرخ آباد ، شاہجہان پور ، بدایوں ، بریلی ، مراد آباد ، اٹاوہ ، علی گڑھ ، بلند شہر ، مین پوری ، مظفر نگر ، جھانسی اور سہارن پور وغیرہ ہر جگہ کم و بیش یکساں کیفیت تھی اور اس انتقام کا مرکزی شکار مسلمان ہی رہے[2] ۔ ملکہ کے شاہی فرمان اور سر سید کے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" کے باوجود مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے شکوک و شبہات اور نفرت و حقارت کا جذبہ بڑھتا ہی گیا ۔ شمالی ہند میں مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ جاری رہی اور ان کے لیے پھانسی سے لے کر کالے پانی تک کی سزاؤں کا لا متناہی سلسلہ بدستور قائم رہا ۔ معمولی معمولی ملازمتوں سے مسلمانوں کا اخلا برابر جاری رہا[3] ۔ کمپنی کی حکمت عملی تو واضح تھی ، لارڈ میکالے کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ کلائیو کسی مسلمان کو بنگال کے دیسی محکمۂ انتظامی کا سردار بنانے کے خلاف تھا اور گورنر جنرل ایلن برا نے ۱۸۴۳ء میں صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ہماری صحیح پالیسی یہی ہے کہ ہم ہندوؤں کی سرپرستی کریں اور انھیں طرفدار بنائیں ۔ کمپنی نے شروع ہی سے اپنی فوجی ، زرعی ، انتظامی ، عدالتی اور تعلیمی پالیسی ایسی بنائی تھی کہ مسلمان گھاٹے میں اور ہندو فائدے میں رہیں ۔ اسی پالیسی کے نتیجے میں انیسویں صدی کے ربع اول میں ہی بنگال میں مسلمانوں کا بالائی طبقہ مفقود ہو گیا اور عام مسلم خاندانوں کے لیے باعزت زندگی گزارنا مشکل ہو گیا ۔ لیکن جنگ آزادی کے بعد ملکہ وکٹوریہ کے ۱۸۵۸ء کے اعلان کے باوجود بقول ڈاکٹر ہنٹر "۱۸۶۹ء میں کلکتے میں مشکل ہی سے کوئی دفتر ہوگا جس میں بجز چپراسی یا چٹھی رساں یا دفتری کے مسلمانوں کو کوئی اور نوکری مل سکے[4]" ۔ ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی رپورٹ میں اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں میں سرکاری ملازمت کی صلاحیت اور قابلیت کے باوجود سرکاری اعلانات کے ذریعے خاص احتیاط کے ساتھ انھیں ممنوع کر دیا جاتا اور "ان کی بے کسی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا اور اعلیٰ حکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہی کسر شان سمجھتے ہیں[5]" ۔

جنگ آزادی کے انتقام کے سلسلے میں ہی انگریزوں نے سید احمد شہید اور ان کے پیروؤں کی تحریک اصلاح و جہاد کو وہابیت کا نام دے کر ان پر جبر و تشدد کی راہ ہموار

۱۔ بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل ، طفیل احمد منگلوری ، ص ۱۵۶ ۔

۲۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ، مقالہ در تاریخ ادبیات مسلمانان ہند و پاکستان ، ج ۴ ص ۲ ۔

۳۔ L.S May نے اپنی کتاب The Evolution of the Indo Pakistan thought after 1857 کے پہلے باب میں ص ۲۰ ، ۲۸ تا ۳۱ پر اس کی تفصیلات دی ہیں ۔

۴۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ، ایضاً ج ۴ ، ص ۴ ۔

۵۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ، ایضاً ج ۴ ، ص ۴ ۔

کر لی حالانکہ اس تحریک کا عرب کی وہابی تحریک سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جب تک انگریزوں کو سکھوں اور مسلمانوں کے آپس میں لڑانے میں سیاسی مصلحت نظر آتی رہی وہ مسلمانوں کو تحریک جہاد میں مدد دیتے رہے لیکن جب سکھوں کا زور ٹوٹ گیا تو پھر انگریزوں نے حریت کے ان دیوانوں اور جہاد کے متوالوں کو کچلنے کے لیے کئی مہمات بھیجیں۔ ان کے مرکز ستھانہ کے در و دیوار بلکہ آس پاس کی پہاڑیاں تک جلا کر خاکستر کر دی گئیں اور پھر ۱۸۶۳ع اور ۱۸۶۸ع میں بڑے پیمانے پر حملے کرکے ان کا تقریباً خاتمہ کر دیا گیا۔ مجاہدین کے معاونین پر بغاوت اور سازش کے مقدمے بنائے گئے اور تمام وہابی فرقے کو دشمن فرنگ قرار دے دیا گیا[1]۔ نہ صرف اہل قلم اور سیاست پیشہ انگریز بلکہ عدالتی اور انتظامی حکام تک علی الاعلان کہنے لگے کہ یہ فرقہ مسلمانوں کو قرآن کی اصل تعلیم سکھاتا ہے اور ان میں قرون اولیٰ کی روح تازہ کرنا چاہتا ہے گویا انہیں کفار کے قتل اور فرنگی سے جنگ و جہاد کی ترغیب دینا چاہتا ہے[2]۔

مسلمانوں کو سیاسی معاشی اور تعلیمی اعتبار سے کچلنا، ذہنی اور نفسیاتی طور پر مفلوج بنا دینا اور ہندوؤں کو ان کا حریف اور مد مقابل بنا کر آگے بڑھانا، انگریزوں کی سیاست کی اساس تھی۔ اس طرح دونوں قوموں کے اختلافات بھی بڑھ گئے اور بقول سر جارج منارڈ "یہ ایک حقیقت ہے کہ دونوں قوموں (ہندو مسلم) کی عام رقابت برطانوی حکومت کے ماتحت شروع ہوئی۔" یو پی میں اردو ہندی قضیے کو بھی اسی حکمت کے ماتحت ہوا دی گئی۔ بقول لارڈ لفسٹن (گورنر بمبئی، مؤلف تاریخ ہند):

"Divide et impera was the old Roman Motto and it shohld be our's"[3]

الغرض انگریزوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی تضعیف و تذلیل کو اپنی پالیسی کا سنگ بنیاد بنا کر انہیں نہ صرف ذرائع معاش اور عزت کی زندگی بسر کرنے کے وسائل سے عاری کر دیا بلکہ انہیں تعلیم سے محروم کرکے ان کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو برباد کر دیا اور ان کی دینی و ملی سرگرمیوں کو کچل کر رکھ دیا۔ ان حالات سے عاجز آ کر بعض مسلمانوں نے سرحد کی طرف ہجرت کر لی لیکن وہاں بھی انہیں چین سے نہ رہنے دیا گیا۔ انگریز مسلمانوں کو قعر مذلت میں گرا کر ہندوؤں کی ہر طرح سر پرستی کرتے رہے، انہیں معاشی اور تعلیمی برتری دلانے کے ساتھ ساتھ ان کے دلوں میں سابقہ محکومی کی یاد جگا کر ان کے سینوں میں مسلمانوں سے نفرت کی ایسی آگ بھڑکا دی جو کبھی نہ بجھی۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کا عام مایوسی اور بد دلی کا شکار ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہندوستان کے تاج برطانیہ کے ماتحت آ جانے کے بعد یہاں طبقاتی تقسیم بھی زیادہ واضح ہو گئی۔ اس کے علاوہ گوروں کا نسلی امتیاز بھی شدت اختیار کرتا گیا۔ البرٹ بل (۱۸۸۰ع) کو ناکام کرانے میں بھی گوروں کا یہی نسلی امتیاز کارفرما تھا البتہ یہ واقعہ ہندوستانی فکر و احساس کے لیے تازیانے سے کم نہ تھا[4]۔

۱۔ ملاحظہ ہو مسعود عالم ندوی کی ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔
۲۔ ملاحظہ ہو مسعود عالم ندوی کی ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، ج ۴، ص ۵۔
۳۔ بحوالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ص ۹۱۔
۴۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ص ۹۳۔

۱۸۷۰ع کے بعد برطانوی حکومت کو اپنی پالسیی میں تبدیلی کا خیال آیا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندو لیڈروں نے انگریزوں پر تنقید شروع کر دی تھی ۔ ہندو مت اور ہندو سماج کے احیا کی کوششیں تیز ہو گئی تھیں ۔ چنانچہ ۱۸۷۰ع میں لارڈ میئو نے ڈاکٹر ولیم ہنٹر کو مسلمانوں کے بارے میں رپورٹ مرتب کرنے کو کہا تا کہ یہ اندازہ بھی ہو سکے کہ آیا مسلمان مذہباً عیسائیوں کی مخالفت پر مجبور ہیں یا اس کی کوئی اور وجوہات ہیں ۔ ہنٹر نے ۱۸۷۱ع میں "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے نام سے ایک مفصل جائزہ پیش کیا ۔ اس رپورٹ کو پڑھ کر بقول میجر باسو "لارڈ میئو نے محسوس کیا کہ تعلیم اور ملازمت سے علیحدگی کی وجہ سے مسلمان ناراض ہیں ۔ چنانچہ ۷ اگست ۱۸۷۱ع کو وائسرائے نے مختلف صوبجات کو احکام بھیجے کہ سکولوں میں مسلمان استاد مقرر کیے جائیں ، مسلمانوں کی قدیم زبان اور دیسی زبانوں کی تعلیم جاری کی جائے ، یونیورسٹیوں میں عربی فارسی کی تعلیم کا اضافہ کیا جائے' ۔ ڈاکٹر ہنٹر کی رپورٹ میں بعض باتیں خلاف حقائق تھیں چنانچہ سر سید نے ڈاکٹر ہنٹر کی اس رپورٹ پر تبصرہ لکھ کر انگریزوں کی بہت سی بدگمانیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ۔ ۱۸۷۰ع سے سر سید کی علی گڑھ تحریک شروع ہوئی اگرچہ اس سے قبل سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آ چکا تھا لیکن در حقیقت "تہذیب الاخلاق" کے اجرا سے ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا ۔ ۱۸۷۷ع میں علی گڑھ کالج قائم ہوا جس کا افتتاح خود وائسرائے نے کیا ۔ اس تحریک نے آگے چل کر مسلمانوں کی فکری ، سیاسی ، سماجی اور معاشی حالت کو بہت حد تک سدھارا اور مسلمانوں کو اپنی ہستی کا احساس ، ماضی کے وقار کی یاد دلا کر ان کے موجودہ مسائل سے انھیں آگاہ کرتے ہوئے ایک ایسی بیداری بخشی جس کے اثرات بیسویں صدی میں رونما ہوئے ۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے ادب ، علوم اور فکر کو متاثر کیا اور عقل و استدلال کی راہیں کھولیں ۔

اودھ

اٹھارہویں صدی عیسوی میں سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوتے ہی سلطنت اودھ کی بنیاد پڑی ۔ اس نئی سلطنت کے پر وقت قیام نے دلی کی صدیوں کی تہذیب کو یک دم تباہ ہونے سے بچا لیا ۔ سلطنت اودھ کا بانی نواب سعادت خان برہان الملک محمد شاہ کے عہد میں اودھ کا صوبے دار مقرر ہوا ۔ نادر کے قیام دہلی کے دوران اس کا انتقال ہوا اور صفدر جنگ اس کا (بھانجا اور داماد) جانشین ہوا ۔ صفدر جنگ مغلیہ سلطنت کا وزیر بھی رہا اور ۱۷۵۳ء میں وزارت سے الگ ہونے کے بعد اس نے اودھ میں خود مختاری کا علم لہرایا ۲ ۔ ۱۷۵۴ء میں صفدر جنگ کا انتقال ہوا اور شجاع الدولہ مسند اقتدار پر بیٹھا ۔ اس کے پاس ایک مضبوط فوج تھی لیکن بکسر کی جنگ (۱۷۶۴ء) میں ناکامی کے بعد اس کی فوجی قوت کا خاتمہ ہو گیا اور اس نے انگریزوں کی بالا دستی تسلیم کرکے عیش و نشاط کے دامن میں پناہ لی ۔ ۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے روہیلوں کی طاقت کو کچل دیا ۔ اسی سال اس کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا آصف الدولہ سریرآرائے سلطنت ہوا ۔ آصف الدولہ کے تخت نشین ہوتے ہی تاجداران اودھ کے مشاغل

۱۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ، مقالہ در تاریخ ادبیات مسلمانان ہند و پاکستان ، ج ۳ ، ص ۵ ، ۶ ۔
۲۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، ص ۸۲ ۔

میں انقلاب عظیم واقع ہو گیا ۔ اس نے فیض آباد کے بجائے لکھنئو کو دارالسلطنت بنایا اور وہاں امور حکومت سے بے نیاز ہو کر داد عیش دینے لگا ۔ آصف الدولہ کا بچپن جس قسم کے عیاش اور آزاد منش لوگوں میں گزرا تھا انھیں کو اس نے عہدے دے کر اپنے گرد جمع کر لیا ۔ اور سیر و شکار ، پتنگ بازی ، مرغ بازی ، بٹیر بازی ، چوسر ، جوئے وغیرہ اشغال میں مصروف رہنے لگا ۔ آصف الدولہ نے اپنے باپ کی بچی کھچی فوج کو منتشر کرکے کمپنی کی سپاہ کو اپنے خرچ پر رکھ لیا ۔ اس کے بعد اودھ کی حالت یہ ہو گئی کہ کمپنی اپنے فوجی اخراجات کے لیے اور نواب وزیر اپنی عیاشیوں کے لیے کاشتکاروں کا خون نچوڑنے اور دولت سمیٹنے لگے ۔ آصف الدولہ کی بد چلنی کی شہرت اس قدر عام ہو گئی تھی کہ قرب و جوار کے ہزاروں لوگوں کے لیے یہ بات ہر وقت کا موضوع گفتگو بن گئی تھی[1] ۔

شجاع الدولہ کے عہد تک تاجداران اودھ کے مشاغل ملک گیری ، فوجی استحکام اور بیرونی حکمت عملی تھے لیکن ملک گیری اور حکمت عملی الہ آباد کے صلح نامے (۱۷۶۴ء) کے بعد ختم ہو گئی کیونکہ عہد معاونت ، جس کا سب سے پہلا شکار اودھ ہوا ، اس امر کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ کمپنی کے مشورہ کے بغیر دوسری ریاستوں کے ساتھ کوئی معاملت کی جائے چہ جائیکہ ملک گیری کا تصور کیا جائے ۔ فوج کا بڑھانا اول تو شرائط صلح کے خلاف تھا ، دوسرے بغیر ضرورت فوج کا رکھنا نہ تو مالی حیثیت سے اور نہ بلحاظ احتیاط مفید تھا ۔ ایسی صورت میں ان مشاغل سے قدرتی طور پر بے توجہی ہونی گئی ۔ آصف الدولہ کے زمانے سے تاجداران اودھ کے لیے شجاع الدولہ کی نصیحت پر کاربند ہونا ہی بہتر تھا کہ ”از صاحبان انگریز در ہیچ حلاف نخواہند کرد ۔“[2] چنانچہ اب سب سے بڑا مشغلہ لکھنئو کی تعمیر و ترقی اور فنون لطیفہ کا مذاق سلیم بھی رہ گیا تھا ، لیکن اس ضمن میں بھی تاجداران اودھ کا دامن افراط و تفریط سے آلودہ نظر آتا ہے[3] ۔ آصف الدولہ کے بیٹے غازی الدین حیدر نے ۱۸۱۸ء میں انگریز گورنر جنرل کی انگیخت پر بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا ۔ اس کے زمانے میں شیعیت کے سلسلے میں عجیب عجیب اختراعیں ہوئیں ۔ امام العصر کی چھٹی کی رسم اور اچھوتیوں کا سلسلہ شروع ہوا ۔ نصیرالدین حیدر نے تو مذہب کو بازیچۂ اطفال بنا رکھا تھا اور بہت سی لغو بدعات اس کے زمانے کی یادگار ہیں ۔ بادشاہ میں زنانہ مزاجی کا یہ حال تھا کہ اس کی گفتگو اور لباس بھی عورتوں ہی کا ہوتا تھا[4] ۔

واجد علی شاہ

اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ (پ ۱۸۲۲ء) ۱۸۴۷ء میں تخت نشین ہوئے ۔ اس وقت سلطنت کی بد انتظامی اور معاملات سلطنت میں کمپنی کی مداخلت اپنے عروج پر تھی ۔ کوئی معاملہ ریذیڈنٹ کی مرضی کے بغیر طے نہیں ہوتا تھا ۔ سلطنت کی انتظامی حالت

۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، ص ۸۲ ، ۸۳ ۔

۲۔ منشی فیض بخش ، چشمۂ فیض بحوالہ محمد تقی احمد ، آخری تاجدار اودھ ، ص ۱۶ ۔

۳۔ محمد تقی احمد : آخری تاجدار اودھ ، ص ۱۷ ، ۱۸ ۔

۴۔ وقائع دلپذیر مصنفہ عبدالاحد رابط اور مرقع خسروی ، مصنفہ عظمت علی میں ان بدعات کی تفصیلات ملتی ہیں ۔

اتنی ہی خراب تھی جتنی کلائیو اور وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں بنگال کی تھی ۔ ایک مرتبہ امین الدولہ وزیر کو سرراہ چند بدمعاشوں نے سواری سے اتار کر گرا لیا اور چھری لے کر سینے پر چڑھ گئے ۔ وزیر کی جان بخشی اس وقت تک نہ ہو سکی جب تک ریذیڈنٹ نے اس کے لیے ۵۷ ہزار روپے ادا نہیں کیے ۔ ابتدا میں واجد علی شاہ نے عوام کی شکایات کو دور کرنے کے لیے "مشغلہ نوشیروانی" کا طریق رائج کیا جس کے مطابق ان کی سواری کے ساتھ دو ترک غلام نقرئی صندوق لیے ہوتے ، لوگ اپنی درخواستیں اس میں ڈالتے جاتے جنھیں واجد علی شاہ خود پڑھ کر احکام صادر کرتے ، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا ۔ کرنل سلیمن (اور جنرل اوٹرم) کی جن رپورٹوں پر ریاست کی ضبطی کا حکم ہوا ان میں بھی واجد علی شاہ پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ رعایا کی داد رسی کے ذرائع بہت ہی محدود ہیں ۔ ۱۸۴۷ء میں لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل نے اپنے دورہ لکھنؤ کے دوران بھی واجد علی شاہ کو یہ دھمکی دی تھی کہ اگر دو برس کے اندر سلطنت کا انتظام درست نہ ہوا تو انھیں معزول کر دیا جائے گا ۔ لارڈ ہارڈنگ نے اسی دورے کے دوران ریذیڈنٹ کے ما تحت شکایات کا ایک نیا محکمہ کھول کر اس کے اختیارات کو مزید وسیع کر دیا ۔ یہ الگ بات کہ اس سعیے سے نظم و نسق کی اصلاح کے بجائے مزید خرابیاں پیدا ہوئیں[1] ۔

۱۸۴۸ء میں ہارڈنگ کی جگہ ڈلہوزی گورنر جنرل ہو کر آئے ۔ ڈلہوزی کا نام دیسی ریاستوں کی تباہی کی تاریخ میں لارڈ ولزلی کی طرح کافی اہمیت رکھتا ہے ۔ ڈلہوزی کا اصول ضبطی اور ولزلی کا عہد معاونت دونوں دیسی ریاستوں کے لیے سم قاتل تھے ۔ ڈلہوزی کے عہد میں کرنل رچمنڈ کی جگہ کرنل سلیمن ریذیڈنٹ مقرر ہوئے ۔ کرنل سلیمن کو جو تقرر نامہ بھجوایا گیا تھا اس سے ڈلہوزی کے ارادے اور اودھ کا مستقبل صاف عیاں تھا ۔ اس تقرر نامے میں کرنل سلیمن کی فراست اور دیگر امور کے ذکر کے بعد لکھا گیا تھا کہ :

"ہم آپ کو یہ مشورہ دینے میں اپنی عزت سمجھتے ہیں کہ آپ لکھنؤ کی ریذیڈنسی خاص کر اس بڑی تبدیلی کے خیال سے جو آیندہ ضرور ہونے والی ہے قبول فرمائیے"[2] ۔

۱۸۴۹ء میں ہی وزیر اور ریذیڈنٹ کرنل سلیمن کے درمیان تصادم کا موقع پیدا ہو گیا کیونکہ کرنل سلیمن نے دانستہ بلا وجہ وزیر علی نقی خاں کے مشیر خاص مرزا وصی علی خاں کو شہر بدر کرنے کا حکم دے دیا ۔ ادھر بادشاہ نے شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں کے اخراج کا جو حکم دیا اس کی تعمیل اس طرح نہ ہوئی کہ اس نے ریذیڈنٹ کے ایما سے چھاؤنی میں قیام کر لیا ۔ بہرکیف حکومت میں دو عملی کیفیت سے تصادم شروع ہو گیا جو انتظامی حالت کو مزید خراب بنانے کا باعث بنا ۔ سر ہنری لارنس نے بد انتظامی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

"اودھ کے تاجدار کسی حالت میں اپنے ایسے حکمرانوں سے جن پر پابندیاں عاید ہوں بدتر نہ تھے ، بلکہ کسی قدر بہتر ہی تھے ۔ وزرا میں چند تو اس درجہ قابل تھے کہ کسی مشرقی ممالک میں ان سے بہتر نہ مل سکیں گے اور ریذیڈنٹ صاحبان میں بھی سچے اور عمدہ لوگوں کی کمی نہ تھی ۔ اصل میں طریقہ حکومت خراب تھا ، نہ کہ وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں حکومت تھی"[3] ۔

۱۔ محمد تقی احمد ، آخری تاجدار اودھ ص ۲۶-۳۰ ۔ ۲۔ ایضاً ص ۵۳ ۔ ۳۔ بحوالہ ایضاً ص ۵۷ ۔

کرنل سلیمن نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت گورنر جنرل سے اجازت حاصل کرکے ۱۲ نومبر ۱۸۴۹ء تا ۲۷ فروری ۱۸۵۰ء سلطنت کا دورہ کیا اور حکومت کے خلاف شکایات وصول کیں، پھر بلیو بک (Blue Book) کے عنوان سے دو جلدوں میں اپنے دورے کی رپورٹ، جو دراصل روزنامچہ تھا، گورنر جنرل کو بھیجی۔ اس رپورٹ میں حکومت کے خلاف عوام کی شکایات اور بد انتظامی کی کیفیت درج کی گئی تھی۔ یہ دورہ اور رپورٹ دراصل اس مشن کی تکمیل کا ایک حصہ تھا جس کی طرف گورنر جنرل نے کرنل سلیمن کے تقرر نامے میں اشارہ کیا تھا۔ سر ارسکن پیری نے بھی اس دورے اور رپورٹ کو بدنیتی پر مبنی قرار دیا ہے۔ اس پورے دورے میں صرف ۲۵ درخواستیں موصول ہوئیں۔ ۱۸۵۴ء میں کرنل سلیمن کے چھٹی پر چلے جانے پر جنرل اوٹرم کا تقرر بحیثیت ریذیڈنٹ ہوا۔ جنرل اوٹرم نے بغیر کسی نجی معلومات کے ریذیڈنسی کے کاغذات کے سہارے ایک رپورٹ مرتب کی جو کرنل سلیمن کی رپورٹ کا ضمیمہ تھی، جنرل اوٹرم نے اس میں اودھ کی بدانتظامی اور ملک کی تباہی کی کیفیت مؤثر الفاظ میں بیان کرکے انتزاع سلطنت کے لیے وجوہ اور جواز فراہم کرنے کی کوشش کی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اودھ کی حکومت کو ناکام بنانے کے لیے بد انتظامی کے ذریعے انتشار اور بے اطمینانی پھیلانے میں پوری طرح مصروف اور اودھ کے خزانے پر نت نئے بوجھ ڈالنے میں کوشاں تھی۔ ۱۸۴۷ء میں جب گورنر ہارڈنگ لکھنؤ آئے تو یہ آمد بھی سلطنت کے لیے ہمیشہ کی طرح زیر باری کا باعث بنی کیونکہ ایسے مواقع پر نئی وردیاں بنتیں اور لاکھوں کے وارے نیارے ہوتے تھے۔ ہارڈنگ کی آمد پر واجد علی شاہ نے معمول سے بھی کچھ زیادہ ہی اسراف سے کام لیا۔ کہا جاتا ہے کہ "حضرت نے زردوزی وردیاں رنگ رنگ کی ہر فرقہ کو بنوائیں— یہاں تک کہ لکھنؤ سے کانپور تک برابر میلہ ہو گیا۔"[1] اس کے علاوہ اودھ کے خزانے پر بے کار پنشن یافتہ اور کبھی کبھی کمپنی کے بدلے ہوئے انگریزوں کی بھاری تنخواہ کا بار بھی ڈالا جاتا تھا۔ فریڈرک جان شور نے اس قسم کے ناجائز بار کی متعدد مثالیں اور تفصیلات دی ہیں۔[2]

انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے علاوہ واجد علی شاہ محلاتی سازشوں کا بھی شکار رہے جس کی بنا پر ریذیڈنٹ اور گورنر جنرل کو بادشاہ کی نااہلیت کا ڈھنڈورا پیٹنے کا موقع ملتا رہا۔ کرنل سلیمن اور جنرل اوٹرم کی رپورٹوں کے بعد اس دور کا سب سے ہیبتناک واقعہ (۱۸۵۵ء میں) رونما ہوا۔ اجودھیا کے بیراگیوں نے ایک مسجد کو شہید کر دیا جس کے نتیجے میں عام مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ مولوی امیر علی (قصبہ امیٹھی) جہاد کے لیے نکلے اور شہید ہوئے۔ یہ واقعہ انتزاع سلطنت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس سانحے کے سلسلے میں کمپنی کی کارگزاریاں عیاں ہیں، عام لوگوں کو بھی اس میں انگریزوں کی سازش صاف نظر آنے لگی تھی۔ بالآخر ۱۸۵۶ء میں انگریز اپنی بیس سالہ پرانی آرزو میں کامیاب ہو گئے اور واجد علی شاہ کو معزول کرکے ریاست براہ راست کمپنی کے حلقہ اقتدارمیں شامل کرلی گئی۔ امپیریل ریکارڈ آفس دہلی کے ریکارڈ کی بعض شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کے انتزاع کی سازش بہت پرانی تھی۔

۱۔ بحوالہ محمد تقی احمد ص ۵۹، ۶۰۔

۲۔ Bengal Political Correspondence (secret) No 94 dated March, 6th, 1837 بحوالہ محمد تقی احمد، ص ۴۷۔

گورنر جنرل کے سکرٹری کی ٦ مارچ ۱۸۳۷ء کی ایک تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ اودھ پر انگریزوں کے دانت مدت سے لگے ہوئے تھے، لیکن بعض حالات کی بنا پر وہ اس کے ادغام کے مسئلے کو ڈھیل دیتے رہے، جب تمام ریاستیں ختم ہو گئیں، پنجاب قبضے میں آ گیا تو انگریزوں کو کسی بڑی طاقت سے تصادم کا خدشہ نہ رہا اور اودھ کی فاصل ریاست کی ضرورت بھی نہ رہی - واجد علی شاہ نے مثنوی حزن اختر میں اپنی معزولی، لکھنئو سے بنارس اور وہاں سے کلکتہ کی روانگی کا ذکر کیا ہے - لکھتے ہیں :

یہ واجد علی ابن امجد علی   سناتا ہے اب داستان رنج کی
کہ جب دس برس سلطنت کو ہوئے   جو طالع تھے بیدار سونے لگے
ہوا حکم جنرل گورنر بہ پیار   کرو سلطنت کو حلا ایک بار
جماکش کا شاہ اودھ نام ہے   حکومت کا آخر یہ انجام ہے
جو وہ لاٹ ڈلہوزی اس وقت تھے   مضامیں انھوں نے یہ خط میں لکھے
رعایا بہت تم سے ناراض ہے   تمھاری ریاست ہے بدنام شے
رعایا نہ دیکھیں گے ہرگز تباہ   فقط نام کو تم رہو بادشاہ
مہینہ ہر اک ماہ اک لاکھ کا   ملے گا تمھیں کچھ نہیں شک ذرا
ریذیڈنٹ جنرل اوٹرم جو تھے   گورنر کا خط مجھ کو وہ دے گئے
ہوا گھر میں کہرام سن کے یہ بات   وہ دن دوپہر ہوگئی ساری رات
وہ لائے تھے اس طرح کی ساتھ فوج   کہ جس طرح دریا کی آتی ہے موج
یہاں جز اطاعت نہ تھا دل میں شر   نہ تھی ایسے دن کی تو ہرگز خبر

بلا کر عزیزوں کو میں نے کہا   کہ رخصت میں ہوتا ہوں، حافظ خدا

واجد علی شاہ کے کلکتہ پہنچ کر چند روزہ قیام کے بعد جنگ آزادی شروع ہو گئی - انھیں مع دیگر ساتھیوں کے ہمراہ بحیثیت قیدی مٹیا برج سے فورٹ ولیم میں منتقل کر دیا گیا - جنگ آزادی کے ختم ہونے پر فورٹ ولیم سے پھر مٹیا برج بھیج دیے گئے -

واجد علی شاہ نے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد اول اول تو بد انتظامی کو دور کرنے کے لیے کچھ سعی کی لیکن جب اُسے سعیٔ نا مشکور پایا تو پھر اپنی توجہ دیگر مشاغل کی طرف مبذول کر لی - ۱۸۴۸ء میں قیصر باغ کی بنا ڈالی جس کی تعمیر ۱۸۵۰ء میں تکمیل پذیر ہوئی - کہا جاتا ہے کہ مع اسباب اور سامان آرائش اس پر (اسی) ۸۰ لاکھ روپے خرچ ہوئے - حرم شاہی کا قیام بھی قیصر باغ ہی میں ٹھہرا اور علی نقی خاں کو بھی منتقل ہونا پڑا تا کہ بادشاہ اور بیگمات سے قریب رہ کر تمام واقعات سے مطلع ہوتے رہیں - قیصر باغ میں سال میں ایک بار بہت بڑا میلہ لگنے لگا جس میں تمام اہل شہر شرکت کرتے اور اس موقع پر ہر شخص کو قیصر باغ میں آنے کی اجازت ہوتی - واجد علی شاہ خود بھی قیصر باغ کے میلوں میں حصہ لینے لگے، چنانچہ کہا گیا ہے کہ "(۱۲٦۸ھ) میں مزاج حضرت کا مصروف تماشائے رہس ایجادی ہوا اور دل لگی سہو سہو ہونے کا سامان بندھا، خود بدولت نے زبان لطافت ترجمان سے مصداق کلام الملوک ملوک الکلام ایک مثنوی چونچلوں بھری کہی، تمام اہل شہر اور چھ چھ کوس کے آدمی دیکھنے آئے -"[1]

۱- محمد تقی احمد : آخری تاجدار اودھ - ص ۴۳، ۴۴ -

واجد علی شاہ کے مذاق اور شعر سے متعلق شرر رقمطراز ہیں :

''واجد علی شاہ کا علمی مذاق نہایت ہی پاکیزہ اور اعلیٰ درجے کا تھا ، دراصل ان میں دو ہی ذوق تھے ، ایک ادب و شاعری کا اور دوسرا موسیقی کا ۔ اس کے سوا اور کسی چیز کا شوق ان میں نظر ہی نہیں آتا ۔ ان کی علمی استعداد بہت بڑھی ہوئی تھی ، عربی کے عالم نہ تھے مگر فارسی میں ان کا درجہ شاید ابوالفضل سے کچھ ہی کم ہوگا ۔ طبیعت اس قدر موزوں پائی تھی کہ شاید ایسا موزوں طبع نہ دیکھا ہوگا۔''[1]

اس کے ساتھ ہی شرر اس امر کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ''واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ عورتوں کے عشق کے دلدادہ ہو رہے تھے اور بعض حسینوں سے اس درجہ محبت تھی کہ قید میں جب ان کے وصل سے محروم تھے تو ہر وقت انھیں یاد کیا کرتے تھے اور بار بار یادگار محبت کے طور پر ان کی خاص خاص چیزیں مانگ بھیجا کرتے تھے . . . دلدار محل سے ان کی مسی مانگی انھوں نے بھیج دی، اختر محل سے ان کی زلفوں کے بال منگائے انھوں نے بھیج دیے، جن کو ہمیشہ سرہانے نظر کے سامنے رکھتے اور بار بار سونگھتے[2]۔'' خود واجد علی شاہ بھی حزن اختر میں اس کا ذکر کرتے ہیں :

یہ اختر محل سے کہا اے قمر ۔۔۔ ذرا بھیج دے اپنے تو موئے سر
کہا حضری سے کہ اے خوش جمال ۔۔۔ مجھے چاہیے تیرے مسی کا خلال

اس مثنوی میں انھوں نے اپنی شادی شدہ محلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا :

کروں ساتھ سب محل کر شمار ۔۔۔ تو ہو جائے پھر یک قلم آشکار
اب ان میں ہیں یہ پانچ چھ نوجواں ۔۔۔ جو کلکتہ میں ساتھ آئیں یہاں

لکھنوی تہذیب و تمدن

قبل ازیں ذکر ہوا کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی سلطنت اودھ معرض وجود میں آئی اور دلی کے ادباء ، شعراء اور دیگر ماہرین فنون لطیفہ کو ایک نئی پناہ گاہ مل گئی ۔ اس طرح دلی کی تہذیب اپنے عروج کے ساتھ لکھنؤ منتقل ہو گئی اور یہاں حالات کے مطابق ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگی ۔ بحیثیت مجموعی لکھنؤ کے لوگ متمدن ، مہذب اور شائستہ تھے ۔ شعر و شاعری کا ہر طرف چرچا تھا اور اس میں نوابی دور کی نازک خیالیاں اور نکات بدرجہ اتم موجود تھا ۔ صرف شعر و شاعری میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ ، آداب معاشرت اور نشست برخاست شائستگی کے ساتھ ساتھ اس تکلف کے رنگ سے گہرے رنگے ہوئے تھے جس کی وجہ سے زندگی میں تصنع کا عنصر غالب تھا ۔ شعر و شاعری کا اس قدر چرچا تھا کہ ہر کوئی طبع آزمائی کرتا حتیٰ کہ گھریلو عورتیں بھی ۔ پھبتیاں اور ضلع جگت عام روزمرہ کی زندگی میں جگہ پا گئے تھے ۔ رنڈیوں اور زبان بازاری کا سماجی زندگی پر بہت گہرا اثر تھا ، طبقۂ امراء اپنے بچوں کو تہذیب و شائستگی اور آداب معاشرت سکھانے کے لیے طوائفوں کے کوٹھوں پر بھیجتے[3] ۔ اسی حقیقت کا پرتو مرزا رسوا کی ''امراؤ جان ادا'' میں دکھائی دیتا ہے ۔ عیش و نشاط اور برسوں کی عیش پرستی کے نتیجے میں آبرو فروش عورتیں مہذب سوسائٹی میں بے دھڑک شامل ہوتی تھیں ۔ عوام کا مزاج تماشہ بینی کا حد درجہ میلان رکھتا تھا چاہے بزرگوں اور سنتوں کے نام

۱- شرر : بحوالہ ایضاً ۔۔۔ ۲- شرر بحوالہ ایضاً ۔۔۔ ۳- ایضاً

کے میلے اور عرس تماشے تفریحات کے علاوہ مذہبی حیثیت بھی رکھتے تھے اور ان میلوں میں لوگ بلا امتیاز مذہب و عقیدہ شامل ہوتے۔ محرم میں لاکھوں روپے روشنی اور دیگر لوازمات کی نذر ہو جاتے۔ مشاعرے، کبوتر بازی، پتنگ بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی، چوسر، شطرنج، موسیقی اور رقص کے مشاغل خواص کے ساتھ ساتھ عوام کی زندگی کا بھی جز بن چکے تھے۔ بٹیروں کے رستم و سہراب نام رکھے جاتے اور ان کی پالیاں بڑے اہتمام اور تزک و احتشام کے ساتھ ہوتیں۔[1] فسانۂ آزاد اسی لکھنؤ کی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

مٹیا برج

واجد علی شاہ کے لکھنؤ سے کلکتہ منتقل ہونے کے ساتھ لکھنؤ کی رنگینیوں کا مرکز بھی مٹیا برج منتقل ہو گیا۔ شرر لکھتے ہیں:

"میں نے بادشاہ جمجاہ کو، ان کے دربار کو، محلات عالیات کی رہنے کی شان کو، شاہزادگان والا تبار کی دلچسپ صحبتوں کو اور سواد بنگالہ میں لکھنؤ کے اجڑے ہوئے گروہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مٹیا برج مٹی میں مل گیا، کلکتے کا وہ گوشہ لارڈ ڈفرن کی بے مہری پر قربان ہو گیا، نہ اب وہ سربفلک کوٹھیاں باقی ہیں نہ وہ مینو سواد باغ و چمن، نہ وہ زندہ مخلوق کا عجائب خانہ نظر آتا ہے نہ وہ بہشت آئیں مرغزار و رمنہ، نہ وہ محلوں کی ڈیوڑھیاں ہیں، نہ وہ شعرا و ادبا کی نکھری صحبتیں، سب خواب و خیال ہو کر دامن فنا میں چھپ گئیں مگر میری آنکھوں کے سامنے آج بھی اسی طرح پھر رہی ہیں، میں نے دنیا میں آنکھ کھول کر اس مشہور لکھنؤ کو تو نہیں دیکھا جو تہذیب کا مرکز، شائستگی کا شمع اور علمی و ادبی برکتوں کا خزانہ بتایا جاتا ہے مگر مٹیا برج کو دیکھا ہے جو شمع اودھ کا آخری شمع دان اور دراصل اس زمانے کا زندہ لکھنؤ تھا، لکھنؤ اجڑ گیا تھا مگر اس کے منتخب صاحبان کمال وہاں پہنچ کر ظل اللہ جہاں پناہ کے سایۂ عاطفت میں دریائے ہگلی کے کنارے بس گئے تھے۔ مٹیا برج نہ تھا بلکہ دربار مغلیہ و دربار اودھ اور ہندوستان کے اسلامی تمدن کی آخری شمع بنگلہ کے ایک گوشے میں روشن ہوئی تھی اور چونکہ بجھنے کو تھی لہذا آخر اوقات چراغ سحری کی طرح بھڑک بھڑک کر زیادہ نورانیت دکھاتی تھی۔[2]"

پہلے ذکر ہوا کہ لکھنؤ میں تفریحات اور مذہبی تہوار ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے اور مذہب کے معاملے میں رواداری نے تقریباً مذہب کی صورت مسخ کر دی تھی۔ لکھنؤ میں مسلمانوں کی آبادی کے دو بڑے جز سنی اور شیعہ تھے جن میں فرقہ وارانہ اختلافات پائے جاتے تھے۔ چونکہ سلطنت کا مذہب شیعہ تھا اور خود بادشاہ بھی شیعت کی مختلف رسومات میں پوری دلچسپی لیتے تھے اس لیے اسے تقویت حاصل تھی یہاں تک کہ علی الاعلان تبرا بھی ہوتا تھا۔ اس کے برعکس سنی المذہب علما کا ایک گروہ المعروف علمائے فرنگی محل کے نام سے موجود تھا جس کی لکھنؤ میں بڑی قابل قدر دینی خدمات ہیں، لیکن علما کا یہ گروہ حد درجہ روادار اور مذہبی اختلافات سے یک سر کنارہ کش تھا۔ صفی پور (اناؤ) اور سلون ضلع رائے بریلی میں اہل تصوف کے دو مسلک موجود تھے۔ رائے بریلی کے قریب ہی نصیر آباد کا مشہور و معروف قصبہ ہے جسے مولوی سید احمد کا مولد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ سید احمد نے سکھوں کے خلاف جہاد کیا اور ان کے پیرو بھی ان کے مسلک کی آبیاری کرتے رہے۔[3] سید احمد کے پیروؤں کو اہل

۱۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو گزشتہ لکھنؤ، شرر۔
۲۔ شرر: بحوالہ محمد تقی احمد۔
۳۔ محمد تقی: آخری تاجدار اودھ۔

حدیث اور عرف عام میں وہابی کہا جاتا تھا۔

انیسویں صدی میں مختلف اسلامی ممالک اور ان کی اہم تحریکات۔

انیسویں صدی صرف ہندوستان ہی کے لیے نہیں بلکہ دنیا بھر کے لیے سخت آویزش اور کشمکش کی صدی تھی۔ یورپ کے صنعتی انقلاب نے سائنس اور ٹکنالوجی کی فتوحات کے ذریعے زندگی کی قدروں میں ایک انتشار اور باطنی بیدا کر دی تھی۔ مشرق مغرب سے، مذہب سائنس سے، قدامت جدیدیت سے، شہنشاہیت جمہوریت سے، جاگیرداری سرمایہ داری سے، سرمایہ محنت سے، افراد افکار سے، روحانیت مادیت سے غرض ہر شے ایک دوسرے سے دست و گریباں اور برسر پیکار تھی۔ روحانیت کے خلاف مادیت کا پلڑا دن بدن بھاری ہوتا جا رہا تھا اور مذہب و اخلاق کی ہستی خاص طور سے خطرے میں تھی۔ مذہبی، اخلاقی اور روحانی قدریں، مادی قدروں کے پیمانے میں ناپی جانے لگی تھیں اور حدث و شوق کے یہ سلسلے عقل و استدلال کے دربار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ زندگی صرف تن کی آسائش کا نام رہ گیا تھا۔

انیسویں صدی میں رونما ہونے والے اس اضطراب و ہیجان، آویزش و پیکار کے طوفان کی ابتدا اٹھارہویں صدی میں ہی ہو چکی تھی اور بعض ممالک بہت جلد اس طوفان کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ اس آویزش و پیکار کا رخ زیادہ تر اسلامی ممالک کی طرف تھا چنانچہ مختلف اسلامی ممالک میں اٹھارہویں صدی میں ہی مختلف اصلاحی تحریکات اور بیرون سے حملہ آور ہونے والے اجنبی نظریات سے نبرد آزما ہونے کی دفاعی کوششیں شروع ہو چکی تھیں۔ ان میں سے بعض تحریکات بڑے دور رس اثرات کی حامل تھیں اور انیسویں صدی میں ان کا حلقہ اثر بہت وسیع اور گرفت بڑی مضبوط دکھائی دیتی ہے۔

ترکی

ترکی مسلمانان عالم کی نظر میں خلافت کی وجہ سے اہم مقام رکھتا تھا لیکن یہ بھی اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں براہ راست یورپ کے سیاسی، فوجی اور نظریاتی طوفانوں کی زد میں تھا۔ ۱۸۷۸ء کی جنگ میں ترکی کی شکست اور اس کی پاداش میں معاہدے کی صورت میں ادا کردہ بھاری قیمت اور ۱۸۸۷ء کی گریکو ترکش جنگ کے بعد ترکوں کو اپنے انداز فکر میں خاص طور پر تبدیلی پیدا کرنی پڑی اور حالات سے نطابق کے علاوہ عمل کی نئی راہیں تلاش کرنی پڑیں۔ اس واضح موڑ کے علاوہ بھی ترکی اس سے قبل پوری ایک صدی تک اصلاحی دور سے گزرتا رہا۔ یہ دور ۱۷۷۷ء سے ۱۸۷۶ء تک کا دور ہے جس میں ترکی میں مشرق و مغرب کی آویزش، مشرقی و مغربی نظریات کا تصادم، روحانیت و مادیت کی کشمکش بدستور جاری رہی۔ اس ایک صدی کے تصادم کے اثرات و نتائج کے بارے میں خالدہ ادیب خانم کہتی ہیں:

In conclusion the conflict of East and West in this reform period (1777-1876) may be summed up in this way The new West had entered the Ottoman world as a method in thought Institutions were changing, but in accordance with the spirit of old tradition The rights of Man were regarded as an interpretation of Moslem Ideals and the state did not now observe any distinction or discriminate infavour of any community in the benevolent institutions it tried to create Now not only outside, but also within the ruling system, the religon of a man was to be respected The constitution was to be a revival of the right of "Meshveret" which Islam had accorded to the man in the

street Thus one by one new western ideas and forms were interpreted, assimilated and incorporated in what Turkey had inherited from the old East without the old or the new upsetting the balance in its favour [1]

مصر

مصر میں اس کشمکش کی صدی میں نظریاتی ، مذہبی اور فکری آویزشوں کے باعث اصلاح و تجدد کی زبردست تحریک چلی ۔ اس تحریک کا مقصد دین اسلام کو تقلید کی جامد زنجیروں سے چھڑا کر اس میں ایسی اصلاحات کو فروغ دینا تھا جو اسے عصر حاضر کی زندگی کے گوناگوں مطالبات سے مطابقت پیدا کرنے کے قابل بنائیں ۔ اس تحریک کی عمومی غایت دینی اصلاح تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ تحریک کے سرخیل محمد عبدہ' نے اسلام کے اساسی خیالات اور مغرب کے سائنسی تصورات کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ محمد عبدہ' پر سید جمال الدین افغانی کی شخصیت اور نظریات کا بڑا گہرا اثر تھا کیونکہ وہ افغانی کے آٹھ سالہ قیام مصر کے دوران ان کے مقرب ترین ہم نشین رہے ۔ مصر میں تحریک تجدد کے سب سے بڑے محرک دراصل سید جمال الدین افغانی ہی تھے اور صرف مصر ہی نہیں ان کی پر عزم اور مسلسل سرگرم عمل شخصیت نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو متاثر کیا[2] ۔

عرب

عرب میں اٹھارہویں صدی کی محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک یوں تو بھی مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان ایک آویزش کا باعث تھی لیکن مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات کی وجہ سے اس کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا ۔ نجدی کی تحریک سے پہلے اٹھارہویں صدی میں عرب کی مذہبی حالت انحطاط کی حد کو پہنچ گئی تھی ۔ اسٹاڈرڈ لکھتا ہے :

''مذہب بھی دیگر امور کی طرح پستی میں تھا ، تصوف کے طفلانہ توہمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا ، مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں ، جاہل عوام ان سے بھاگتے تھے اور تعوید گنڈے اور مالا میں پھنس کر گندے فقیروں اور دیوانے درویشوں پر اعتقاد رکھتے تھے اور بزرگوں کے مزارات پر زیارت کو جاتے جن کی پرستش بارگاہ ایزدی کے شفیع اور ولی کے طور پر کی جاتی کیونکہ ان جاہلوں کا خیال تھا کہ خدا کی برتری کے باعث وہ اس کی اطاعت بلا واسطہ ادا نہیں کر سکتے ۔ قرآن کریم کی تعلیم نہ صرف پس پشت ڈال دی گئی تھی بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی ۔ ۔ ۔ یہاں تک کہ مقامات مقدسہ (مکہ و مدینہ) بد اعمالیوں کا مرکز بن گئے تھے اور حج جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض میں داخل کیا تھا ، بدعات کی وجہ سے حقیر ہوگیا تھا ۔ فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی ، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پھر دنیا میں آتے تو وہ اپنے پیروؤں کے ارتداد اور بت پرستی پر بے زاری کا اظہار فرماتے'' ۔[3]

۱۔ خالدہ ادیب خانم ، Conflict of East and West in Turkey ص ۶۰ ۔

۲۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو چارلس سی آدم کی کتاب (ترجمہ) ''اسلام اور تحریک تجدد مصر میں'' (عبدالمجید سالک مترجم) مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۔

۳۔ اسٹاڈرڈ The new world of Islam بحوالہ مسعود عالم ندوی : محمد بن عبدالوہاب (ایک مظلوم اور بدنام مصلح) ، ص ۱۹ ، ۲۰ ۔

ہوگارتھ لکھتا ہے :

''اٹھارویں صدی میں مسلمانوں کا جوش سرد تھا ، نام نہاد خلیفہ کی ساکھ گر چکی تھی اور مقبوضہ کے جنوب میں اطاعت تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ یمن ایک صدی پہلے یہ جوا اپنی گردن سے اتار چکا تھا ، مکہ کے اشراف عثمانیوں کی نسبت اپنے سردار کی مخالفت میں زیادہ سرگرمی دکھانے کو تیار تھے۔ یہ یک جہتی جو آج دکھائی دیتی ہے اس وقت اس کا احساس بہت کم تھا اور روحانی مرکز عیش و آرام کا شکار ہو چکا تھا اور تقویٰ اور زہد کے علاوہ وہاں ہر چیز کے لیے رواداری موجود تھی حالانکہ ہندوستان میں عیسائیوں کی فتح نگاہوں کے سامنے تھی اور یورپ میں بھی غیر مسلم طاقتیں ترکوں کا پانسہ پلٹ رہی تھیں لیکن عرب میں ان واقعات کا بہت کم احساس تھا اور یہ عام غیظ و غضب جس کا مظاہرہ آج (۱۹۰۴ء) فرانس ، برطانیہ اور روس کے خلاف کیا جا رہا ہے اس وقت بالکل مفقود تھا— اس وقت اسلام کا رخ مشرق کی طرف تھا اور یہ تجدد جس کی لہر انیسویں صدی میں افریقہ اور چین تک پہنچ رہی ہے اس وقت اس کی پس بینی نہیں کی جا سکتی تھی''۔[1]

نجد میں حالت سب سے زیادہ خراب تھی ، اہل نجد اخلاقی انحطاط میں حد سے گزر چکے تھے۔ ان کی سوسائٹی میں بھلائی برائی کا کوئی معیار قائم نہیں رہا تھا۔ جاہلانہ عقیدت قبروں کی پرستش کرانی تھی۔ بلدہ الفدا میں ایک درخت کے ساتھ جوان مرد اور عورتیں اولاد کی تمنا میں ہمکنار ہوتیں۔ درعیہ کے پاس ایک غار تھا جہاں حد درجہ شرمناک برائیاں ہوتی تھیں۔ سیاسی حالت اور بھی خراب تھی ، خانہ جنگی اور بد حالی عام تھی ، نجد کا چھوٹا سا علاقہ متعدد ریاستوں میں بٹا ہوا تھا[2]۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب (م ۱۷۰۳ء) نے انھیں حالات سے متاثر ہو کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا راستہ اختیار کیا۔ اپنے اس 'رفع نصب العین' کے حصول کے لیے شیخ کو بے پناہ تکالیف ، مصائب اور مخالفتیں برداشت کرنی پڑیں لیکن وہ ثابت قدم رہے اور ان کا عزم و استقلال آخر رنگ لایا۔ انھیں محمد بن سعود ، عبدالعزیز بن محمد سعود اور سعود بن عبدالعزیز جیسے اولوالعزم مجاہد اور فرمانروا نصیب ہوئے جنھوں نے شیخ کے مشن کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ شیخ کے پیروؤں میں سے سعود بن عبدالعزیز جب ۳۰ اپریل ۱۸۰۳ء (۸ محرم الحرام ۱۲۱۸ھ) کو ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوا تو اس نے اپنے بیس روزہ قیام کے دوران تمام قبے اور مشاہد مسمار کرا دیے۔ ۱۸۱۹ء میں اگرچہ محمد علی پاشا نے امرائے نجد اور آل سعود کو شکست دے دی لیکن وہ اس تحریک کے اثرات کو نہ دبا سکا۔ نجدیوں کی اس شکست اور درعیہ کی بربادی پر سرکار برطانیہ ہند نے ابراہیم پاشا کو مبارکباد دینے کے لیے جارج فاریسٹر سیڈلر کی سرکردگی میں ایک خصوصی وفد بھیجا[3]۔

مصریوں ، ترکوں اور انگریزوں نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کو بدنام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس تحریک کا نام انھوں نے وہابیت رکھا اور عام فضا کو اس کے خلاف اس قدر مسموم کیا کہ وہابیت کا لفظ گالی کے مترادف ہو گیا۔ انگریز تو ہندوستان میں ہر اس تحریک کو جو انھیں کھٹکتی نجدی وہابیت سے ملا دیتے تھے ، چنانچہ انھوں نے ہندوستان کی تحریک تجدید امامت کو بھی اسی نام سے موسوم کیا ، یعنی شاہ ولی اللہ ، شاہ عبدالعزیز ، سید احمد

۱- ہوگارتھ : Penetration of Arabia بحوالہ ایضاً ص ۲۱ -

۲- مسعود عالم ندوی ، ص ۲۲ ، ۲۳ -

۳- ایضاً ص ۱۱۷ ، ۱۱۸ -

بریلوی اور سید اسمعیل شہید کے پیرو وہابی کے نام سے موسوم ہو کر مطعون ہوئے۔

محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کے سلسلے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائی گئیں ۔ برائجز نے لکھا ہے :

"باب عالی نے مشہور کیا کہ اس نے (سعود بن عبدالعزیز) مدینہ منورہ کی زیارت سے لوگوں کو روک دیا ، لیکن یہ صحیح نہیں ، اس نے صرف روضہ (مطہرہ) کے سامنے مشرکانہ اعمال کے ارتکاب سے منع کیا ہے جیسا کہ دوسرے ولیوں کی قبروں پر سجدے کرنے سے روک چکا ہے ۔ بعض جاہل انہیں کافر سمجھتے ہیں ، افواہوں پر ترکوں نے اعتماد کیا ، اشراف مکہ نے آسے ہوا دی لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ قرآن و حدیث پر پورے عامل ہیں ۔ برک ہارٹ نے صحیح لکھا ہے یہ سب غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا ۔ اصل میں یہ اسلام کے اندر خالص تطہیر Puritanism کی تحریک تھی ۔ ایک بے وقوف فرنچ نے ۱۸۰۸ء میں لکھا ہے کہ یہ کوئی نیا مذہب ایجاد کر رہے ہیں نیز وہ سعود کے "خاص آدمی" کی زبانی حج کی منسوخی کا بھی ذکر کرتا ہے ، یہ سب جھوٹ ہے ، وہاں قرآن کی طرح حدیث کو بھی اصولی (Fundamental) چیز مانتے ہیں البتہ اولیا اور انبیا کو یہ انسان مانتے ہیں ۔ فتح مکہ کے بعد سعود نے جو اعلان کیا تھا وہ آج بالکل کتاب و سنت کے مطابق تسلیم کیا جاتا ہے ۔ تمباکو نوشی مالکیہ کے یہاں ممنوع ہے ، انھوں نے بھی ممنوع کیا ، البتہ قہوہ کے استعمال کی خبر بالکل غلط ہے ۔ آسے ترکوں نے پروپیگنڈے کے طور پر مشہور کیا ۔ جس بے وقوف فرنچ نے حج کے تعطل کا ذکر کیا ہے آسے جاننا چاہیے تھا کہ سعود نے صرف حج کے برے مراسم کو روکا تھا۔ مکہ میں داخل ہونے کے بعد خود آس نے جو سب سے پہلا کام کیا وہ طواف عمرہ کی ادائیگی تھی"۔[۱]

ہندوستان

گزشتہ صفحات میں ذکر ہوا کہ مغلیہ سلطنت کے انحطاط و زوال کے نتیجے میں ملک میں جو معاشی و معاشرتی اختلال پیدا ہوا اس سے عہدہ برا ہونے کے لیے اصلاحی کاوشوں کا آغاز بھی ہو گیا تھا ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳ء - ۱۷۶۲ء) نے عمرانی حالات کے نئے رخ دیکھ کر اس کے نتائج و عواقب کو محسوس کرتے ہوئے اصلاح و تجدید کی شمع روشن کی ۔ شاہ ولی اللہ کے نظریات کے بارے میں سمتھ لکھتا ہے :

"His Islam is therefore more comprehensive and richer than the wahhabi, also more flexible His political ambition was to restore Muslim power in India more or less on the Moghul pattern Pure Islam must be re-enacted, a regenerated Muslim Society must again be mighty "[۲]

شاہ ولی اللہ کی تحریک نے علما کے ایک با عمل گروہ کو معاشرتی اصلاح احوال پر آمادہ کیا ۔ عیسائی مشنریوں کی تبلیغی مہم نے جس کی سرپرستی کمپنی کی حکومت کر رہی تھی ، علماء کے اس گروہ کو مذہبی و معاشرتی خطرے کے علاوہ سیاسی و معاشی خطرے کا احساس بھی دلایا ۔ کمپنی کے انگریز حکام تاج برطانیہ کے سائے میں ہندوستان میں مسیحی اسقفیہ کی حکومت و سیادت کے خواب دیکھ رہے تھے اور مسلمانوں کو اپنی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھ کر انھیں سیاسی و معاشی اعتبار سے زندگی کے ہر شعبے میں پس ماندہ بنا دینا چاہتے تھے ۔ مسلمان علما نے ان جارحانہ منصوبوں کی مدافعت و مقاومت مناظروں سے بھی کی اور داخلی اصلاح و تجدید کے

۱- A brief history of the Wahhabys : Harford Jones Brydges ۱۰۶-۱۱۳ -
بحوالہ ایضاً ص ۱۷۸ ، ۱۷۹ اشارہ Rousseau کی طرف ہے ۔

۲- Wilfred Cantwell Smith Islam in Modern History ص ۵۱ ، ۵۲ -

علاوہ سامراج کے خلاف جہاد کی تیاریوں سے بھی - شاہ عبدالعزیز نے انھیں غایات کے لیے مجلس عمل تشکیل کی جس کے صدر سید احمد شہید اور دوسرے ارکان شاہ اسمعیل شہید اور مولانا عبدالحئی تھے - سید احمد بریلوی (۱۷۸۲ء - ۱۸۳۱ء) کی تحریک جہاد اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی - سمتھ کا خیال ہے کہ :

Even more lasting and more wide spread was the presistence of the movement's impetus and ideal The attempts to oust the infidel could be, and were, supressed. The attempts to refine and renew Muslim Society and to restore its glory must continue, and incidently keep it reminded of its more proper destiny on both scores."[۲]

یہ سلسلہ انقلاب ۱۸۵۷ء تک ایک خاص انداز میں چلتا رہا—انقلاب کے بعد صورت حالات یک لخت بدل گئی - اجنبی سامراج کا تسلط پوری طرح قائم ہو گیا اور ملک میں کوئی قوت بھی ایسی نہ رہی جو اس اقتدار کو چیلنج کر سکے - با عمل علماء کا یہ گروہ جس نے انقلاب میں سرگرم و پرجوش حصہ لیا تھا ، حکومت کی نظر میں خار کی طرح کھٹکتا تھا ، ان کے خلاف سامراج کا استبداد بھی حرکت میں رہا اور ان پر داروگیر کا سلسلہ بھی دراز رہا حتیٰ کہ یہ علما یا تو ملک سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے یا عملی زندگی سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشین ہو گئے -

جب علماء کا یہ با عمل گروہ بھی ہر طرح معتوب ہو گیا اور کوئی مرکزی شخصیت نہ رہی تو ان حالات میں سرسید احمد خاں قوم کی رہنمائی کے لیے میدان میں نکلے - انھوں نے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" لکھا جسے کرنل گریہم نے انگریزی میں ترجمہ کرکے چھاپا اور پانچ سو جلدیں پارلیمنٹ کے ارکان اور انڈیا آفس کو بھیجیں - سرسید نے اس کتاب میں (معذرتی انداز میں) کمپنی کے دور حکومت کی بد عنوانیوں پر تنقید کی تھی - اس کے بعد انھوں نے "لائل محمڈنز آف انڈیا" ایک رسالہ نکالا جس میں سرکار برطانیہ کے وفادار مسلمانوں کے حالات درج ہوتے تھے - انھوں نے عیسائیوں اور مسلمانوں کے مذہب اور معاشرت میں یک رنگی اور ہم آہنگی کے بہت سے پہلو نکالنے شروع کیے - یہ مسلمانان طبع ایک نئی سیاسی حکمت عملی کی اساس تھا -

سرسید مسلمانوں کو مزید تباہی سے بچانے کے لیے حکومت کی خوش نودی حاصل کرکے انھیں تعلیم و ملازمت میں ان کا مقام دلانا چاہتے تھے- ۱۸۶۹ء میں سرسید انگلستان گئے اور وہاں سے یورپ کی جدید ترقیات کے گہرے نقوش و اثرات لے کر واپس آئے اور آتے ہی دسمبر ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق جاری کیا - اس رسالے کے اجرا سے ہی دراصل اس اصلاحی تحریک کا آغاز ہوا جسے عرف عام میں علی گڑھ تحریک کہا جاتا ہے- یہ اصلاحی تحریک سیاسی، مذہبی، تعلیمی، معاشی ، تہذیبی ، علمی و ادبی غرض زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں پر حاوی تھی - اس تحریک نے مسلمانان ہند کے طرز فکر و عمل کو ایک نئے راستے پر ڈال دیا جو ترقی پسندانہ کہا جا سکتا ہے البتہ یہ سچ ہے کہ سرسید نے تعلیم یافتہ طبقے کو مذہب اسلام کے عقاید و تعلیمات سے بیگانہ ہو جانے سے بچانے کے لیے جو تدبیریں کیں وہ کامیاب نہ ہو سکیں -

۱۸۵۷ء کے سیاسی بحران کا رد عمل تو سرسید کی تحریک کی شکل میں ظاہر ہوا لیکن اس رد عمل کا ایک اور پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ مغرب کی نئی مادی توانائیوں کے مقابلے میں مشرق

۲- ایضاً ص ۵۳ -

قدیم روحانی و اخلاقی یعنی مذہبی قلعوں پر دفاعی توپیں چڑھا کر تہذیبی اور ذہنی مورچوں پر قوی و غالب دشمن کے حملوں کو روکے ۔ چنانچہ ادب ، معاشرت ، تہذیب ، تعلیم ، غرض ہر شعبہ فکر و عمل میں قدیم اقدار کی حمایت اور ماضی کی طرف واپسی کا رجحان بھی سر اٹھانے لگا ۔ سہارن پور اور دیو بند میں قدیم تعلیم کے دو نئے مدرسے قائم ہوئے ۔ ادب میں نذیر احمد ، شبلی ، حالی اور شرر وغیرہ نے احیائے ماضی کی کوششیں کیں ۔[1]

۱۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ' مقالہ در تاریخ ادبیات مسلمانان ہند و پاکستان ' ج ۴ ص ۷۴ ' ۴۸ ۔

تیسرا باب

تاریخی ناول نگاری کے فنی مبادیات اور شرر

تاریخی ناول، ناول نگاری کی ایک اہم اور فنی اعتبار سے مشکل ترین صنف ہے۔ اس میں ناول نگار کی ذمے داریاں اور مشکلات عام معاشرتی یا سماجی ناول نگار کی نسبت بدرجہا زیادہ ہوتی ہیں، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ابھی تک صحیح معنوں میں کوئی تاریخی ناول نہیں لکھا گیا اور شاید کبھی نہ لکھا جا سکے[1]۔

تاریخی ناول کیا ہے؟

تاریخی ناول کی تعریف کرتے ہوئے جوناتھن نیلڈ نے کہا ہے کہ ناول ایسی تاریخوں، شخصیتوں اور واقعات کی شمولیت سے تاریخی ناول بن جاتا ہے جن کی آسانی سے شناخت ہو سکے[2]۔ تاریخی ناول کی یہ تعریف اپنی جگہ پر محل نظر ہے اور آرنلڈ بنٹ نے بجا طور پر اس سے اختلاف کیا ہے لیکن اس کے باوجود بعض نقادوں کے اس خیال کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخی ناول کی اصطلاح ہی سرے سے غلط ہے یا تاریخی ناول صنف ناول کی کوئی قسم ہی نہیں[3]۔ یہ نظریہ غالباً ان مشکلات کی بنا پر قائم کر لیا گیا ہے جو اس صنف کی جامع تعریف کی تعیین میں ہمارے بعض نقادوں کو پیش آئیں، لیکن یہ مسئلہ اردو ادب کے بعض نقادوں کے لیے ہی پریشان کن نہیں رہا بلکہ اکثر مغربی نقادوں نے بھی اس کی دشواریوں کو محسوس کیا۔ سیپرڈ کی رائے میں تاریخی ناول کی صحیح تعریف میں لاتعداد مشکلات پیش آتی ہیں اور آسانی سے اس کی واضح تعریف بیان نہیں کی جا سکتی[4]۔

اس میں شبہ نہیں کہ جس طرح تاریخی ناول کی صحیح تعریف مشکل ہے اسی طرح فن کے اعتبار سے بھی تاریخی ناول نگاری، ناول کی اصناف میں مشکل ترین اور نمایاں ترین صنف ہے۔ تاریخ گزشتہ زندگی کے واقعات کا بیان ہے جس میں عموماً اس متعلقہ زمانے کے ماحول اور ان واقعات کے اصل محرکات کا ذکر بہت کم ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر تاریخ میں صرف زندگی کے خارجی

۱- Alfred Tresider Sheppard

There is no great historical novel without obvious and even glaring faults. There have been very great historical novels. The perfect historical novel has never yet been written, and may never be. (The Art & Practice of Historical Fiction page 82)

۲- Jonathan Nield

A Novel is rendered historical by the introduction of dates, personages, or events to which identification can be readily given (Liberary Review 12) بحوالہ الفریڈ ٹریسڈر شیرڈ، آرٹ اینڈ پریکٹس آف ہسٹاریکل فکشن، ص ۱۵)

۳- علی عباس حسینی: ناول کی تاریخ اور تنقید، ص ۳۰۴۔

۴- دی آرٹ اینڈ پریکٹس آف ہسٹاریکل فکشن:

It is not difficult to define fiction, the definition of historical fiction, on the other hand, presents innumerable, and at first unsuspected, difficulties (Page 12)

واقعات سے بحث ہوتی ہے اور یہ محض ناموروں اور فاتحین کے کارناموں کی داستان ہے ، اگرچہ اگسٹائن برل نے اسے زمین پر انسان کی سرگزشت کہہ کر بڑی وسعت دی ہے لیکن عملی طور پر تاریخ میں "انسان" کا مفہوم وسیع عالمگیر انسانی برادری نہیں بلکہ اس سے چند غیر معمولی شخصیتیں مراد ہیں ۔ اگسٹائن برل نے کہا ہے کہ تاریخ زمین پر انسان کی سرگزشت ہے اور جو اس سرگزشت کا کوئی حصہ یا باب ہمارے سامنے پیش کرتا ہے وہ مورخ ہے[1] ۔

شیپرڈ نے اگسٹائن برل کی بیان کردہ اس تعریف میں اضافہ کرتے ہوئے تاریخی ناول نگار کے لیے بھی ایک سادہ سی تعریف وضع کی ہے ۔ شیپرڈ کہتا ہے کہ مورخ جب انسان کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے مسلمہ حقایق اور صداقتوں سے سر مو انحراف کرتا ہے تو وہ مورخ کی بجائے تاریخی ناول نگار بن جاتا ہے[2] ۔ شیپرڈ کی یہ تعریف اس امر کی طرف ایک واضح اشارہ کرتی ہے کہ تاریخی ناول نگار صرف "خشک تاریخی حقائق" تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ ان میں تخیل کی رنگ آمیزی کرتا ہے جو اس کے لیے ناگزیر ہے کیونکہ تاریخی ناول ، تاریخ کے برعکس خارجی اور داخلی زندگی دونوں پر محیط ہوتا ہے ۔ تاریخی ناول نگار ، تاریخ کے بیان کردہ واقعات کو پس منظر یا مناظر کے طور پر استعمال کرتا ہے ۔ شیپرڈ نے تاریخی ناول کے لیے ان تاریخی صداقتوں کے پس منظر کی اہمیت اور اس میں تخیل کے امتزاج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ تاریخی ناول کو لازماً ماضی کی ایسی داستان ہونا چاہیے جس میں تخیل واقعات و حقایق کی تکمیل میں ممد ثابت ہو[3] ۔

اناطول فرانس نے تاریخ کو بھی ایسا ہی فن قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ تاریخ ایک فن ہے جو تخیل کی رہنمائی میں تخلیق ہوتا ہے[4] ۔ لیکن عملی طور پر تاریخ کے ایسے نمونے شاذ ہی ملتے ہیں جو اناطول فرانس کے قول کے معیار پر پورے اترتے ہوں ۔ شیپرڈ نے اس رائے میں بجا طور پر تصرف کیا اور اس تعریف کو قصہ گوئی کے لیے موزوں قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ "تاریخی قصہ گوئی ایک فن ہے جو تخیل کی رہنمائی میں تخلیق ہوتا ہے[5] ۔" گویا تاریخی ناول نگار اپنے تخیل ، زور قلم اور قدرت بیان سے تاریخ کے ان بظاہر خشک ، فرسودہ اور مردہ واقعات میں ایسی جان ڈال دیتا ہے کہ زندگی کا وہ مرقع نہ صرف اپنے متعلقہ زمانے کے دستور کے مطابق ہوتا ہے بلکہ اس میں خود وہ زمانہ چلتا پھرتا اور جیتا جاگتا دکھائی دیتا ہے ۔ یعنی تاریخی

۱- Augustine Birrell ، بحوالہ شیپرڈ :

History is the story of man upon earth, and the historian is he who tells us any chapter or fragment of that story. (page 12)

۲- الفریڈ ٹریسیڈر شیپرڈ ۔

To my mind, the moment any chapter or fragment of that story wanders by a hair's breadth from exact and established fact, the historian ceases to be historian, and becomes an historical novelist.

(The Art & Practice of Historical Fiction, page 12)

۳- ایضاً

An historical novel must of necessity be a story of past in which imagination comes to the aid of fact (page 15)

٤- Anatole France ، بحوالہ ایضاً ، ص ۱۵ ۔

History is an art and should be written with imagination

۵- شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۱۵ ۔

ناول کا مقصد ماضی کی تدوین اور کسی دور کی کامل عکاسی ہے۔ جان بوچان نے تاریخی ناول کی اس اہمیت کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تاریخی ناول وہ ناول ہے جس میں مصنف اپنے عہد کے کسی دور کی زندگی اور ماحول کی از سر نو تدوین و تعمیر کرتا ہے[1]۔ آرنلڈ بینٹ کے الفاظ میں "تاریخی ناول ایک ایسا قصہ ہے جس میں ماضی کا ایک عہد دوبارہ جنم لیتا ہے[2]۔"

تاریخ اور تاریخی ناول

شیفرڈ، اناطول فرانس، جان بوچان اور آرنلڈ بنٹ کی مذکورہ آرا سے کسی حد تک تاریخی ناول کی تعریف اور تاریخ اور تاریخی ناول کا فرق متعین ہوتا ہے۔ ان آرا سے دو باتیں اور بھی واضح ہوتی ہیں، اول یہ کہ تاریخی ناول میں تخیل کی رنگ آمیزی کی گنجائش موجود ہوتی ہے کیونکہ تخیل کی رنگ آمیزی کے بغیر ناول نگار کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں ہوتا کہ وہ ماضی کے کسی عہد کی ایسی تصویر کشی کر سکے جس سے قاری کی نگاہوں میں اس دور کی حقیقی تصویر ابھر جائے۔ تاریخی ناول نگار حقائق تو تاریخ سے لیتا ہے لیکن تخیل کی مدد سے ان کے ساتھ ایسی جزئیات بھی مرتب کرکے شامل کر دیتا ہے جو تاریخی صداقتوں پر اثر انداز ہوئے بغیر تصویر میں زندگی کا رنگ پیدا کر دیں اور ماضی کے متعلقہ عہد کا نقش مکمل ہو جائے۔

دوسرے یہ کہ تاریخ اور تاریخی ناول دونوں کے دائرہ ہائے اثر مختلف ہیں اور تاریخی ناول ہر حال میں اپنی ایک انفرادیت اور اہمیت رکھتا ہے کیونکہ تاریخ کی نسبت اس میں تخیل کی کارفرمائی سے زیادہ جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تاریخی ناول ماضی کی مصوری کرتا ہے، ماضی کے کسی عہد کی داستان کو تخیل کے ذریعے نئی زندگی عطا کرتا ہے۔ ماضی کی وہ حقیقتیں تو تاریخ کے اوراق پر بھی بکھری ہوتی ہیں لیکن ان کے پڑھنے سے ماضی کی زندگی اس طرح رومان پرور اور سحر آفرین بن کر قاری کے سامنے نہیں آتی جس طرح تاریخی ناول اسے پیش کرتا ہے۔ جرمن ناول نگار فریڈرک سپیلھیگن اسی لیے تاریخی ناول کو ایسے عہد کی تصویر کہتا ہے جس پر موجودہ دور کی نسل کی یادداشت کی پوری روشنی نہیں پڑتی[3]۔

جان بوچان نے تاریخی ناول نگار کے منصب کی نشان دہی اس طرح کی ہے کہ وہ ماضی کی زندگی کی از سر نو تعمیر کرتا ہے جو مورخ کے منصب، دائرہ کار اور شاید اختیار سے بھی باہر ہے[4]۔ شیفرڈ نے تاریخ اور تاریخی ناول کے اس فرق پر مفصل بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"موت، انقلاب اور حوادث نے ماضی کی زندگی پر دبیز پردے ڈال کر اسے انسان کی نظر سے اوجھل

۱- John Buchan، بحوالہ ایضاً، ص ۱۵۔

An historical novel is simply a novel which attempts to reconstruct the life, and recapture the atmosphere of an age other than that of the writer

۲- Arnold Bennett، بحوالہ ایضاً، ص ۱۵۔

The first thing about an historical novel is that the au hor recreats in it an age in which he did not live.

۳- Friedrich Spielhagen، بحوالہ ایضاً، ص ۱۷۔

Historical novel is one that portrays a time on which the light of the living generations memory does not fall any longer in its full force.

۴- John Buchan، بحوالہ ایضاً، ص ۱۵۔

کر دیا ہے اور جو چیز نظر سے اوجھل ہے انسانی فطرت کی آرزومندی اسے حد درجہ حسین اور پر کشش سا دیتی ہے ۔ حسن مستور کو بے حجاب دیکھنے کی یہی تمنا اسے تاریخ اور اس کے ماخذوں کی طرف لے جاتی ہے لیکن تمنا ناکام و نامراد لوٹتی ہے کیوں کہ تاریخ ماضی کی جو تصویر دکھاتی ہے وہ نہ حسین ہوتی ہے نہ دلکش ، تاریخ کا دکھایا ہوا ماضی پر شکوہ اور مہیب تو ہوتا ہے لیکن پرحیات ہرگز نہیں ہوتا ۔ اس کی مثال پوست و استخوان کے اس ڈھانچے کی سی ہے جس میں گوشت کی سی نرمی اور خون کی گرمی نہیں ہوتی ۔ حن نظر فروز نظاروں کو دیکھنے اور دلنشین صداؤں کو سننے کی آرزو آن کو ماضی کی طرف دوڑاتی ہے ، تاریخ اُسے محروم لوٹاتی ہے"۔[۱]

تاریخ کا نقطہ نظر عام انسانی نقطہ نظر سے مختلف اور درد مندی اور سوز و گداز سے خالی ہوتا ہے ۔ مورخ کی نظر صرف غیر معمولی سخصیتوں اور بادساہوں پر پڑتی ہے ، عام کوچہ گرد انسانوں کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ، اس لیے تاریخ کے اوراق آن کے ذکر سے خالی ہیں ۔ تاریخ کا درایت پسند ذہن صداقت کے مقابلے میں روایت کو غیر معتبر سمجھ کر رد کر دیتا ہے اور اس طرح اس کا سینہ رومان کے خزینوں سے تہی ہوتا ہے ۔ واقعات کے انتخاب کے سلسلے میں اس کا انداز فکر نفسیاتی یا جذباتی ہونے کی بجائے علمی ، منطقی اور خسک ہوتا ہے ۔ مورخ کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ زندگی کی بظاہر بے حقیقت اور بے معنی چیزیں انسانی زندگی پر کتنا گہرا اور دیرپا اثر ڈالتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی بنائی ہوئی تصویریں ادھوری اور نامکمل ہوتی ہیں[۲] ۔ ایم پی شیل نے تاریخ کی اسی خامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے مشہور ناول کولڈ سٹیل کا آغاز ان الفاظ سے کیا کہ "علمی مورخ اکثر تاریخ کے دلچسپ ترین اور اہم ترین واقعات کی طرف سے اغماض کرتا ہے[۳]۔" یہاں سیشل کے نزدیک اہم ترین واقعات سے وہ واقعات مراد ہیں جو مورخ کو اہم نہیں معلوم ہوتے لیکن اپنے اثر کے اعتبار سے وہ دلچسپ بھی ہوتے ہیں اور اہم بھی ۔ غرض ایسے واقعات سے بے توجہی تاریخ کو غیر دلچسپ بھی بنا دیتی ہے اور وہ ماضی کی از سر نو تعمیر اور اس کی حقیقی تصویر کشی سے بھی قاصر رہتی ہے[۴] ۔

ڈوماز اور ہیوگو نے بھی مختلف پیرایوں میں یہی بات واضح کی ہے کہ مورخ ایک سی بنائی فرسودہ ڈگر پر چل کر حقایق کا مشاہدہ کرتا ہے ، اس لیے اس کی آنکھوں میں زندگی کا بہت محدود حصہ آتا ہے اور وہ تمام تفصیلات اور جزئیات روا روی میں اس کی نظر سے گذر جاتی ہیں جو زندگی کو صحیح معنوں میں زندگی بناتی ہیں ، اسی لیے مورخ جو کچھ لکھتا ہے وہ نہ مکمل حقیقت ہوتی ہے اور نہ ہی قارئین کے لیے موثر، دلچسپ اور جاذب توجہ[۵] ۔

تاریخ کے بارے میں ایک اور اعتراض عام ہے کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت لکھی جاتی ہے ۔ نتیجتاً کہیں پر مورخ ماضی کے چھپے ہوئے دفینے سے اپنے مزاج اور مسلک کی چیزیں نکال کر انہیں اجاگر کرتا ہے اور اس طرح تاریخ کا کوئی ایک پہلو سامنے آتا ہے اور کہیں تاریخ کی یہ مقصد آفرینی یا مورخ کا مخصوص زاویہ نگاہ حسب مقصد نتائج دکھانے کے لیے واقعات میں دراس خراس کا باعث بنتا ہے ، تاویل اور توضیح سے نئے پہلو نکالے جاتے ہیں اور اسی مقصد کے تحت واقعات کے اختراع و ایجاد اور مبالغہ آرائی سے آگے بڑھ کر دروغ بافی تک نوبت پہنچ

۱- شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۲۶۸ -
۲- شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۱۵۷ -
۳- M P Shiel کا ناول Cold Steal بحوالہ شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۱۵۵ -
٤- شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۱۵۵ -
٥- بحوالہ ایضاً ، ص ۱۵۵ -

جاتی ہے - اسی لیے خود مورخوں نے بھی بعض اوقات تاریخ کا ذکر ایسے مضحکہ خیز پیرائے میں کیا کہ تاریخ حقیقت اور صداقت کی دعوے دار ہونے کے باوجود دروغ گوئی اور افترا کا بے معنی انبار معلوم ہونے لگتی ہے[1] -

اس بحث سے یہ ظاہر ہے کہ تاریخ باوجود حقیقت کی ترجمان ہونے کے ماضی کے جو نقشے پیش کرتی ہے ان میں زندگی کی روح موجود نہیں ہوتی ، اور شاید یہ مورخ کے دائرہ عمل اور دائرہ اختیار سے ہے بھی باہر - تاریخی ناول نگار نے تاریخ کے ان خلاؤں کو پر کرکے ماضی کی تعمیر نو کرتے ہوئے اس کے دھندلے نقوش کو جلا دے کر ان میں رنگینی پیدا کی اور انھیں ہمارے لیے دلکش بنایا - علی عباس حسینی نے تاریخی ناول کی اہمیت کے ضمن میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "ناول کی جگہ وہاں ہوتی ہے جہاں تاریخ کے صفحے سادہ اور خاموش ہوں یا امتداد زمانہ کی وجہ سے جو واقعات صاف دکھائی نہیں دیتے یا جو شخصیتیں دھندلی پڑ گئی ہیں انھیں مصفے اور اجالے واضح کرکے دکھاتے ہیں لیکن جہاں تاریخ کا آفتاب عالمتاب خود ہی نصف النہار پر چمک رہا ہو ، وہاں ناول کی شمع جلانا حد درجہ مضحکہ خیز ہے[2]" علی عباس حسینی کی یہ رائے ناول کی ادبیت ، اثر آفرینی ، مقبولیت اور جاذبیت کی صفات سے انکار کے مترادف ہے اور کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں قرار دی جا سکتی -

نیز اس رائے میں تاریخ اور تاریخی ناول کے مختلف دائرہ ہائے عمل کے لطیف فرق کو سمجھنے میں سہل انگاری دکھائی دیتی ہے - تاریخ ماضی کو چند انسانوں کے کارناموں کی رہین منت دکھاتی ہے اور تاریخی ناول یہ دکھاتا ہے کہ اگر ماضی میں واقعی زندگی تھی تو وہ صرف بادشاہوں اور کجکلاہوں کے دم سے نہیں تھی بلکہ اس میں عام انسان بھی برابر کے شریک تھے البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ "جہاں تاریخ کا آفتاب عالمتاب نصف النہار پر ہو" وہاں تاریخی ناول نگار کی ذمے داریاں اور فنی دشواریاں عام حالات سے نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں لیکن یہ کہنا کہ ان حالات میں ناول نگاری "مضحکہ خیز ہے" انسانی فطرت کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے کیونکہ ناول یا قصہ بہر طور تاریخ سے زیادہ پرکشش اور بجا طور پر زیادہ پر اثر بھی ہے - ڈین انگ صحیح حقیقت کو جاننے کے لیے تاریخ میں تخیل کی آمیزش کو ضروری سمجھتا ہے اور اسے سچی تاریخ سے زیادہ موثر قرار دیتا ہے[3] -

تاریخی ناول بنیادی طور پر ناول ہے اور ناول کی اولین صفت یہی ہے کہ وہ اپنے اندر حظ آفرینی کے پہلو رکھتا ہو ، اپنے قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث بن سکے - سڈنی سمتھ نے اسی صفت کو ناول کا بنیادی وصف قرار دیا ہے[4] - لیکن یہ دلچسپی نہ محض تاریخی واقعات کے بیان سے پیدا ہو سکتی ہے اور نہ محض تخیل کی جولانی سے—مورخ کے برعکس تاریخی ناول

١- ایضاً ، ص ١٥٩-١٥٧-

٢- علی عباس حسینی ، ناول کی تاریخ اور تنقید ، ص ٣٠٤ -

٣- Deane Inge بحوالہ شیپرڈ ، ایضاً ، ص ٣١ :

The motives for falsifying history are in exact proportion to the interest of posterity in knowing the truth Falsified history has prehaps had more influence than true history

٤- Sydny Smith بحوالہ شیپرڈ ، ایضاً :

The main question of novel is—did it amuse ?

نگار کا فن بعض رعایتوں کا تقاضا کرتا ہے جس میں تاریخ اور تخیل میں ایک امتزاج اور توازن پیدا کرنا لازم ہے۔ شیپرڈ کا خیال ہے کہ جہاں مورخ کا قلم حقائق کی جستجو میں ناکام ہو جاتا ہے وہاں تاریخی ناول نگار تخیل کی مدد سے ان خلاؤں کو پر کرتا ہے۔ اس اعتبار سے تاریخی ناول نگار کا دائرہ کار مورخ سے زیادہ وسیع ہے[1]۔

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے ہم اس مسئلے کی طرف آتے ہیں کہ تاریخی ناول نگار کہاں تک تاریخی واقعات اور کہاں تک تخیل سے کام لے سکتا ہے؟ کن طریقوں سے وہ ناول میں دلچسپی پیدا کر سکتا ہے؟ اس کی دشواریاں اور ذمے داریاں کیا ہیں؟ ان سوالوں کا جواب ہی عرف عام میں تاریخی ناول کا فن ہے۔

تاریخی ناول کا فن--عہد اور موضوع کا انتخاب

تاریخی ناول نگاری میں سب سے پہلا مرحلہ کسی عہد کے انتخاب کا ہے۔ تاریخی ناول کے نقاد اسے بہت اہم مرحلہ تصور کرتے ہیں۔ نقادوں کا خیال ہے کہ جس طرح ہماری روزمرہ زندگی میں قدم قدم پر کہانی کے لیے مواد موجود ہے اور "ہوا کا ہر جھونکا اور طور کا ہر آوارہ نغمہ کہانی کا نامی ہے" اسی طرح ماضی پر بھی یہ بات صادق آتی ہے کیونکہ تاریخ کے ہر عہد میں قصہ گو کو ہر طرف کہانی کے موضوعات بکھرے ہوئے نظر آئیں گے[2]۔ لیکن ناول نگار کے لیے مشکل مرحلہ یہی ہوتا ہے کہ وہ کسی عہد کے کون سے واقعہ کا انتخاب کرے[3]۔ اس ضمن میں جو چیز رہنما ثابت ہو سکتی ہے وہ کسی عہد کے لیے خاص جذباتی میلان ہے لیکن اس کے لیے لازم ہے کہ فنکار اس عہد سے بھرپور جذباتی وابستگی اور خلوص رکھتا ہو[4]۔

عہد کے انتخاب کے بارے میں مختلف فنکاروں کے ہاں دو طرح کے رجحان پائے جاتے ہیں۔ ایک رجحان تو یہ کہ ناول کے موضوعات کے لیے اس عہد کے واقعات زیادہ موزوں ہوتے ہیں جو تہذیبی اور تمدنی سرگرمیوں کے اعتبار سے زیادہ پر شکوہ اور معروف ہو۔ ایسا عہد چونکہ فنون لطیفہ اور دیگر مجلسی زندگی کے مظاہر کی رنگینیوں سے بذات خود اپنے اندر اپنی

۱- شیپرڈ، ایضاً، ص ۱۵:

Historical Fiction deals imaginatively with the past and can follow the paths where Tresspass Boards confront the pedestrian historian. The novelist has a wider range, he may set the foot in the preserves of history, but on one condition he may not make his habitation there, or may only build if part of his house stands with in the demense of the imaginations

۲- شیپرڈ، ایضاً، ص ۸۹:

The world is so full of a number of things that every way one turns there are novels and short stories for those with eyes to see, and all the world's history offers background

۳- شیپرڈ، ایضاً، ص ۸۵:

The greatest difficulty which any novelist, but especially the historical novelist, has to face is the difficulty of selection. In every period of history, in every episode, in a fragment of stone, in an old weapon, in a name on a desolate grave, in a scrap of verse, is the germ of an historical novel The difficulty is, or should be, selection.

۴- شیپرڈ، ایضاً، ص ۲۷، ۱۲۵:

But it is important above all that the period is one in which the writer himself takes an interest A wide sympathy with humanity is an other essential

جاذبیت اور کشش رکھتا ہے کہ اس کی حقیقی تصویریں بھی قاری کو محظوظ کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں اور اس طرح فنکار کو تاریخی حقائق میں کسی قسم کے تصرف یا ان سے انحراف کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی[1] ، اور دوسرا رجحان یہ ہے کہ ایسے عہد کا انتخاب کیا جائے جس میں تاریخ نے جا بجا خلا چھوڑے ہوئے ہوں اور فنکار انہیں تخیل کے رنگوں سے اس طرح پر کرے[2] کہ وہ رنگ انسانی زندگی سے بھی مطابقت رکھتے ہوں اور قاری کے لیے جاذب نظر بھی ہوں۔ خلاؤں کو پر کرنے کے لیے تخیلی قصوں کا اضافہ ہی تاریخی ناول نگار کا تاریخ میں واحد ممکن تصرف ہے لیکن یہ تصرف بھی گوناگوں پابندیوں سے محدود ہے۔ اس خلا کو پر کرنے والا تخیلی قصہ ایسا ہونا چاہیے کہ وہ اصل کے ساتھ پورے طور پر رچ بس جائے اور خارجی پیوند کاری نہ دکھائی دے۔

اس دوسرے رجحان کے حامل نقادوں کا خیال ہے کہ کسی معروف اور پر شکوہ عہد کو موضوع بنانا فنکار کے لیے خطرے سے خالی نہیں ہوتا کیونکہ ایسے ادوار کے بارے میں مورخین نے اس قدر کثرت سے مواد فراہم کیا ہوا ہوتا ہے کہ فنکار کے لیے تخیل کی جولانی دکھانے کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔ سینٹسبری کا خیال ہے کہ اگر فنکار کبھی ایسے عہد کا انتخاب کر بھی لے تو اسے چاہیے کہ وہ ان حقیقی اور تاریخی واقعات کو کبھی مرکزی حیثیت کا حامل نہ ہونے دے بلکہ اپنے ناول میں دلچسپی کا مرکز تخیلی واقعات کو بناتے ہوئے تاریخی واقعات کو پس منظر کے طور پر استعمال کرے[3]۔

اس دوسرے نظریے کے بارے میں شیپرڈ کا خیال ہے کہ اگرچہ یہ طریقہ کسی حد تک آسان اور محفوظ ہے اور جتنا کوئی ناول نگار اپنے عہد سے دور جائے گا اتنا ہی بعض امور میں اسے سہولت رہے گی[4] کیونکہ عام لوگوں کی معلومات اس عہد کی زندگی اور تاریخ کے بارے میں نہ ہونے کے برابر ہوں گی اور ناول نگار بڑی آسانی سے اپنے تخیل کا تانا بانا بن کر ایک رومانی

۱۔ شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۱۳۲-۱۳۱ ۔

۲۔ شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۱۲۴ :

In one sense an historical novel dealing with unexplored and elastic ages is easy, it is a tale which "goes round without a fiddling stick," as Frolic says of a tale in the old play. But in another sense it is not so easy as it looks. The surest ground is when one deals with human nature primitive then and primitive now—its terrors, loves, jealousies, hatreds, sacrifices, strifes.

۳۔ George Saintsbury بحوالہ شیپرڈ ، ایضاً :

All who have studied the philosophy of novel writing at all closely know that great historical events are bad subjects, or are only good subjects on one condition—a condition the steady observance of which constitutes one of the great merits of Sir Walter Scott. The central interest in all such cases must be connected with a wholly fictitious personage, or one of whom sufficiently little is known to give the romancer free play. When the condition is complied with the actual historical events may be, and constantly have been, used with effect as aids in developing the story and working out the fortunes of the characters.

۴۔ شیپرڈ، ایضاً ، ص ۱۱۵ :

The choice of period before recorded history can pretend to a certain standard of accuracy, or even exist at all. There are more space and more opportunity. You have not centuries only, but thousands and possibly hundreds of thousands of years to choose from.

فضا اور دلچسپ قصہ تیار کرے گا' لیکن یہ خدشہ تو بہر کیف موجود رہے گا کہ کسی وقت نوی ماضی کے بارے میں انسانی علم میں اضافہ ناول نگار کے پلاٹ کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دے[2] - اس لیے شیپرڈ کا خیال ہے کہ کسی فنکار کا یہ اقدام دانشمندانہ قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ کسی ایسے دور کا انتخاب کرے جس کے بارے میں اسے یقین ہو کہ اس کے سوا اور کوئی اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا کیونکہ ممکن ہے اس بھری دنیا میں ایک یا دو اشخاص ایسے بھی نکل آئیں جو اس کی معلومات کا پول کھول کر اس کے سارے وقار کی دھجیاں اڑا دیں—شیپرڈ کا خیال ہے کہ اس انتخاب میں بہت محتاط ہو کر قدم اٹھانا چاہیے اور بہتر یہی ہے کہ اپنے پسندیدہ ادوار میں وہ خلا تلاش کر کے پر کیے جائیں جو تاریخ نے پر کرنے غیر ضروری یا اپنے دائرہ عمل سے خارج تصور کرتے ہوئے درخور اعتنا خیال نہ کیے ہوں[3] - ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ تاریخی ناول اس گذرے ہوئے عہد کے بارے میں لکھا جائے جس میں ناول نگار خود زندگی بسر کر چکا ہو[4] -

مطالعہ — مواد کی فراہمی

تاریخی ناول کے لیے کسی عہد کا انتخاب کرنے کے بعد ایک اور اہم مسئلہ اس عہد یا ناول کے موضوع سے متعلق معلومات فراہم کرنے کا کام ہے - قصہ خواہ کسی انداز یا اسلوب کا ہو قصہ گوئی کے سفر کا مرحلہ اول یہ ہے کہ قصہ گو کو اپنے موضوع کی تفصیلات و جزئیات کا پورا علم ہو اور وہ زندگی کے جس پہلو کو پیش کرنا چاہتا ہے یا جس پس منظر کو اپنے مقصد کے اظہار کے لیے ضروری سمجھتا ہے اس سے پوری طرح واقف ہو ، لیکن ان کا علم عموماً ذاتی علم ہوتا ہے—شخصی تجربے اور مشاہدے پر مبنی علم—جب کہ تاریخی ناول نگار کا مطلوبہ مواد اس کے مشاہدے اور ذاتی تجربے کی حدود سے باہر ہوتا ہے ، اسے لازمی طور پر اپنی کہانی کے لیے ضروری معلومات حاصل کرنے کی خاطر ایک ایسی سر زمین پر قدم رکھنا پڑتا ہے جو اس کی نظر سے اوجھل اور اس کے تجربے سے باہر ہے - اسے زندگی کا وہ عہد چھوڑ کر جس میں وہ خود زندگی بسر کر رہا ہے ایک ایسے عہد میں داخل ہونا پڑتا ہے جس کے زمین و آسمان اس کے لیے بالکل اجنبی ہیں - زمان و مکان کی کئی سرحدوں کو عبور کرکے

۱- شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۱۱۵ :

The historical novelist who goes back to the actual cave man for his hero is almost as free from competition as a polar explorer He is not crowded as man exploring London or Newyork, Paris or Berlin or Rome is crowded and he is not likely to be challanged about his facts where the few scanty facts on which he works are by no means established Some one has said that it is easiest thing in the world to write a notable book about a land which no one has visited but your self

۲- شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۱۴۲-۱۴۳ :

The choice of period very long ago makes the work of a novelist easier in some respects, as where knowledge is incomplete or inexact, he has more latitude and wider scope for the free play of imagination But there is the danger of dulness, of lack of versimilitude, and almost always of being found out ultimately when human knowledge is more complete

۳- شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۱۴۴-۱۴۱ -

٤- شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۱۷ :

We may write about an age, in which we have lived when it becomes shrouded in blue haze of distance, entering it, we tread softly in the enchanted garden of youth, our own dead youth and the world's

تاریکیوں کے دبیز پردوں میں لپٹے ہوئے مقام کو مسکن بنانا پڑتا ہے[1] - اس لیے اسے معلومات کے حصول کے لیے زیادہ فاصلے طے کرنے پڑتے ہیں کیونکہ ناول کو تاریخی ناول بنانے کے لیے اسے اس ماضی کو بھی اپنا ہی حقیقی بنانا پڑتا ہے جو اس کے بڑھے والوں کی یادوں کی حد سے پرے ہو جہاں ان کے حافظے کی روشنی نہ پڑ رہی ہو[2] -

معلومات کی فراہمی کے سلسلے میں شیپرڈ مطالعہ کی اہمیت پر بہت زور دیتا ہے - اس کا خیال ہے کہ کسی عہد اور واقعے کے انتخاب کے بعد تاریخی ناول نگار کا بنیادی اور اہم فرض یہ ہے کہ خود کو منتخبہ عہد کے مطالعے میں غرق کر دے ، اس عہد کے بارے میں اسے جہاں کہیں اور جو کچھ ملے پڑھتا جائے اور مختلف ماخذ کی صداقتوں کو پرکھے ، غور و فکر کے بعد خود نتائج مرتب کرے - اپنے منتخبہ عہد کی معاصر تواریخ ، تذکرے ، مکتوبات ، قانونی اور نجی یادداشتیں اور ہر چیز جو اس کے عہد سے متعلق ہو اس کے مطالعے کا ناگزیر جز ہو[3] - علاوہ ازیں وہ اس متعلقہ علاقے کے متعلقہ جغرافیے سے بھی پوری طرح باخبر ہو اور متعلقہ نقشہ جات ہمیشہ اس کے پیش نظر ہوں -

جزئیات کا انتخاب

مطالعے کے بعد جمع کردہ مواد میں سے جزئیات کے انتخاب کا اہم مرحلہ آتا ہے -

تاریخی ناول کے واقعات کے سلسلے میں ناول نگار پر گونا گوں ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں - اسے بڑی سوجھ بوجھ کے بعد یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ تاریخی ناول کے سلسلے میں کسی مورخ پر کتنا اعتماد کرے کیونکہ تواریخ خود بھی بعض اوقات تضاد کی حامل ہوتی ہیں اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض ضعیف اور بے بنیاد روایات بھی تاریخی صداقتوں کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں - ایسے میں تاریخی ناول نگار ان کے تجزیے کی کوشش کرتے ہوئے درایت کے اصول کو اپنا لے تو اس کے غیر مقبول ہونے کا خدشہ پورے طور پر موجود ہوتا ہے کیونکہ عوام درایت کی نسبت روایت کے زیادہ قائل ہوتے ہیں اور صداقتوں کے بجائے تصورات و جذبات کو پسند آنے والی باتوں پر زیادہ اعتماد رکھتے ہیں -

---

۱- شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۱۶ :

With most fiction it is a sound rule for the write. to deal only with what he knows in his personal experience, but the historical novelist has to go beyond personal experience, and enter another world and another age Like the writer of a present-day novel, he must know something of human nature, but he must also know something of innumerable subjects which can only be learnt from other books "Whatever men do", comes with in his range he should know something of past politics, of war, of law, of medicine, of botany, of heraldry, of theologies, of genealogies, of bygone geography and topography, of dress . and at every step, unless he is cautious, there is a danger of stumble

۲- حاشیہ نمبر ۳ ص ۳۰ -

۳- شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۱۳۵-۱۳۷ :

The historical novelist mu t study book on costumes, on coinage, on the contemporary history of other states, he must read contemporary letters, diaries, despatches, even legal documents and medical works Nothing dealing with his period and locality should be foreign to him He may have to go to works on heraldry, on botany, on etymology, on arboriculture, on agriculture. Picture galleries and museums, cathedrals and churches and castles, all yield their spoils.

بہر کیف تاریخی ناول نگار پر یہ ایک بنیادی ذمے داری ہے کہ وہ تاریخ کے مسلمہ حقائق اور ان کی زمانی ترتیب میں رد و بدل کی جسارت نہ کرے۔ سیپرڈ نے ان امور پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے نہ صرف تاریخی صداقتوں کو من و عن برقرار رکھنے پر زور دیا ہے بلکہ جزئیات کے معاملے میں بھی تاریخ سے انحراف کو بہت کم روا رکھا ہے[1]۔ سیپرڈ[2] اور لٹن اس امر پر اصرار کرتے ہیں کہ تاریخی ناول نگار کو چاہیے کہ وہ واقعات کو حقائق کے رنگ میں پیش کرے اور جو حقائق ناممکن نظر آتے ہوں انہیں یا تو ممکن بنا کر پیش کرے یا ترک کر دے[3]۔ تاریخی ناول کی ان فنی دشواریوں کے باعث تاریخی ناول نگار کو کچھ فنی مراعات حاصل ہیں، وہ یہ کہ جہاں تاریخ خاموش ہو وہ خلا کو تخیل سے پر کر لے اور ان تاریخوں میں تھوڑا بہت حسب ضرورت رد و بدل کر لے جو اہم تاریخی واقعات سے متعلق نہیں[4]۔

پلاٹ

جزئیات کی صحت کے بعد ان کی ترتیب اور واقعات کی کڑیوں کو باہم ملانے کا نازک مرحلہ آتا ہے اور یہی ناول کی جان ہے۔ جزئیات کی احسن ترتیب اور ان میں منطقی ربط کا دوسرا نام پلاٹ ہے۔ ہر ناول نگار کے ذہن میں بنیادی طور پر اپنے ناول کا ایک خمیر موجود ہوتا ہے اور وہ ناول لکھنے سے پہلے اپنے لیے واقعات کی ترتیب کا بنیادی خاکہ ضرور مرتب کر لیتا ہے، جو ناول کی تکمیل تک بسا اوقات کئی صورتیں بدلتا ہے[5]۔ جزئیات کی عمدہ

۱- سیپرڈ، ایضاً، ص ۱۶۱-۱۶۰:

I think, whatever license may be given to an imaginative writer who takes history as his background, no unnecessary departures from fact should be permitted, the more closely facts are followed the better is the book An historical novelist should not play tricks with chronology except when it is absolutely necessary to his plot, and then only in the matter of days or hours where historian himself may often be inaccurate or uncertain He may not alter the great events of history

۲- شیپرڈ، ایضاً، ص ۱۷۱، ۱۸۲ -

۳- لٹن بحوالہ شیپرڈ، ایضاً، ص ۱۲ ، ۱۸۲ -

Lytton was of the view to extract romance from the actual history and, where fact and imagination were at differences to let romance go over board before its graver opponent He was faithful to the out standing facts and played as few tricks as possible with chronology Above all it is necessary to make the story seem true. If fact itself appears impossible, it must be made probable, or be discarded.

٤- شیپرڈ، ایضاً، ص ۲۳۲:

Mr Osborn said that there are two methods by which history may be made to pass into the novel He continues "In the first place it can supply the metal for the novelists mould, provided, of course the fire of imagination is present which changes hard fact into that liquid flow of implied possibilities whence the spark fly upwards The novelist though he may invent all the characters, dialogues and incidents, must be faithful in his invention to the spirit of his period. He need not distort the characters of actual historical people or take liberties with the crhonological table, or in any way alter the great critical episodes of the past The second matter where a plot taken from history is utilized, demands a larger degree of fidelity to documentary evidences.

۵- شیپرڈ، ایضاً، ص ۱۰۹:

Without any pre-arranged plot the story is likely to be loose and ill knit and chaotic with too rigid a plot, or too scrupulous an attention to the plan that has been set before one for guidance there is the danger of being plot mastered and plot ridden As the plot develops from the germs, so the novel, if it is a living thing, must develop from the plot. You cannot keep a tree in a flower pot to its maturity.

ترتیب سے پلاٹ میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے ، حقیقت کا رنگ بھی گہرا ہوتا ہے اور مطلوبہ ماحول بھی بنتا ہے ۔ سٹیونسن نے جزئیات کے اس انتخاب اور ترتیب کو بہت اہم قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ جب ناول نگار یہ جان لیتا ہے کہ اسے کیا لینا ہے اور کیا چھوڑنا ہے تو گویا وہ سب کچھ جان لیتا ہے[1] ۔ ایسا فنکار پلاٹ کے ارتقا کی دونوں رخوں سے پوری طرح باخبر ہوتا ہے اور اچانک حائل ہونے والی الجھنوں سے بھی عہدہ برآ ہو لیتا ہے ۔ وہ ان ذیلی دائروں سے باخبر ہوتا ہے کہ اسے ناول کا اختتام کب کرنا چاہیے ۔ وہ قاری کے جذبات ، احساسات اور توقعات کو اس قدر زیادہ برانگیختہ نہیں کرتا کہ اس کے بعد وہ ناول میں دلچسپی کی کمی محسوس کرے اور نہ تجسس کی کسی ایسی منتہیٰ پر ناول کو ختم کرتا ہے کہ قاری پکار اٹھے —بس ! رچرڈ سٹیل نے ناول کے اختتام کے اس پہلو پر بہت زور دیا ہے اور ناول نگار کو متنبہ کیا ہے کہ قاری کے تجسس کو زیادہ ابھار کر اچانک ناول کو ختم کر دینے سے ناول کا مجموعی اثر زائل ہو جاتا ہے[2] ۔

کردار

تاریخی ناول میں معروف تاریخی شخصیتوں کو کردار کی صورت میں پیش کرنے کے بارے میں ماہرین فن کے دو مختلف نظریات ہیں ۔ بعض کا خیال ہے کہ مشہور تاریخی شخصیتوں کو پیش کرنے سے ناول فنی حیثیت سے کمزور ہو جاتا ہے اور ناول نگار کے لیے حد درجہ دشواریاں پیدا ہوتی ہیں ، کیونکہ کسی تاریخی شخصیت کے بارے میں تاریخ یا روایت نے جو نقشے ذہنوں پر مرتسم کر رکھے ہیں ، ناول نگار جب ان سے ذرا بھی انحراف کرتا ہے—خواہ وہ سچائی پر ہی کیوں نہ ہو—مشکل میں پھنس جاتا ہے اور اس کے قاری اس بات کو صحیح تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے ۔ دوسرا گروہ ناول میں کسی تاریخی شخصیت کی موجودگی کو تقویت کا باعث تصور کرتا ہے ، لزلی سٹیفن اور سمرڈ بھی اس نظریے کے حامل ہیں اور ان کا خیال ہے کہ کسی مشہور شخصیت کی موجودگی سے اس عہد کی فضا سازی میں سہولت ملتی ہے ، لیکن یہ گروہ بھی کسی تاریخی شخصیت کو مرکزی حیثیت دینے کی مخالفت کرتا ہے[3] ۔ جارج سینٹسبری نے مقدس و معروف تاریخی شخصیتوں سے رومانی دلچسپی کی نوعیت کے واقعات منسوب کرنے کی مخالفت کرتے ہوئے تجویز کیا ہے کہ ناول نگار مرکزی دلچسپی اور رومانی نوعیت کے واقعات کے لیے فرضی کردار تخلیق کرے تاکہ تاریخی شخصیتوں کے دامن پر کوئی بدنما داغ نہ لگے ، تاریخی حقائق بھی مسخ نہ ہونے پائیں اور قارئین کی جذباتی تسکین کا سامان بھی فراہم

۱- بحوالہ شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۱۴۴ :

To remember Stevenson's sayings that if he knows how to omit he would know everything

۲- بحوالہ شیپرڈ ، ایضاً ۔

۳- بحوالہ شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۱۳۳-۱۳۴ :

Lesile Stephon wrote once to Thomas Hardy, "I think that an historical character in a novel is almost always a nuisance, but I like to have bit of history in the background, so to speak, to find that George the third is just round the corner though he does not present himself in full front " But if (the young novelist) brings the big folks on the scene against the background of the epical events and forgets the little folks, he is, in a thousand cases to one, inviting disaster

ہو سکے[1] ۔ اوسبورن نے بھی تاریخی کرداروں در رومانی اپیل جسمان کرنے کی سختی سے مخالفت کی ہے اور ناول نگار کو اس ضمن میں بہت محتاط طریق کار اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے[2] ۔

رسکن نے ناول کے کرداروں کو ناول کی دنیا میں جیتے جاگتے انسانوں کے نمائندے قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ ان کا ہر عمل ایسا ہونا چاہیے جیسا کہ گوشت پوست کے انسانوں کا ہمیشہ رہا ، رہے گا اور ہے[3] ۔ اسی طرح ان کے احساسات اور سوچ بچار کو بھی انسانی احساسات اور غور و فکر کی نمایندگی کرنی چاہیے ۔ کردار نگاری کے بارے میں ناول نگار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صرف بیانیہ انداز سے کام لیتے ہوئے ان کے بارے میں اچھی یا بری رائے پیش کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ کردار کی اچھائی ، برائی کا مظاہرہ خود کردار کی حرکات و سکنات اور قول و فعل سے ہونا چاہیے ۔ شیپرڈ اور سر والٹر بیسنٹ نے کرداروں کے متعلق ناول نگار کی رائے زنی کو غیر مستحسن طریق قرار دیا ہے[4] ۔ تاریخی ناول میں کرداروں کے ضمن میں سب سے زیادہ موزوں طریق کار یہی ہے کہ حقیقی تاریخی کرداروں اور بڑے واقعات کو ناول میں چھوٹے اور تخیلی کرداروں کے لیے پس منظر کے طور پر استعمال کیا جائے لیکن یہ احتیاط برتی جائے کہ کردار پس منظر میں دب کر نہ رہ جائیں ۔ ان تخیلی کرداروں کے ساتھ رومانی تخیلی واقعات کو منسوب کرکے تاریخ کو مسخ کیے بغیر ناول میں دلچسپی پیدا کی جا سکتی ہے[5] ۔

فضا سازی اور زبان

تاریخی ناول کے فن کی ایک بڑی مشکل عہد رفتہ کی از سر نو تخلیق ہے ۔ اٹن نے کامیاب تاریخی ناول نگاری کے فن کو مصوری کے فن سے مشابہت دی ہے اور فورڈ میڈاکس فورڈ نے اسے تاریخی ناول نگار کا بنیادی فریضہ قرار دیا ہے[6] کہ وہ اپنے موضوع—عہد رفتہ—کا اس طرح ناول میں احیا کرے کہ اس کا قاری اپنے آپ کو اس عہد میں ان لوگوں کے ساتھ محسوس کر سکے جنھیں ناول نگار پیش کر رہا ہے ۔ شیپرڈ نے اس ذمے داری کی بحث کرتے ہوئے کہا

۱۔ بحوالہ شیپرڈ ، ایضاً ۔ ۲۔ بحوالہ شیپرڈ ، ایضاً ۔

۳۔ بحوالہ شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۸۷ ۔

It is far more essential—a generous supply of flesh and blood

۴۔ بحوالہ شیپرڈ ، ایضاً ص ۹۳-۹۲ :

I think it was Sir Walter Besant who, in some rules to be observed by novelists, said once that an author should be careful not to write about a character, that he should not pause to give a direct and detailed description, but should show man and woman gradually in the course of his narrative—a description might be given indirectly, for instance by comparison with a portrait, or even by reflection in a mirror, I don't think this can be acted upon too literally, though any device which varies a narrative is to be recomended Of course a character's character should be shown in other way than by mere statement that he is good or bad, kind or cruel, generous or mean

۵۔ شیپرڈ ، ایضاً ، ص ۱۰۰ ، ۱۴۴ :

Here the safer course is to take some minor issue, and make the great events a background to smaller characters and issues. One must not let the background eclipse the principle figures, the frame overpower the picture

۶۔ بحوالہ شیپرڈ ، ایضاً ص ۱۹۰ :

Ford Madox Ford has said very truely that it is the business of historical novelist to make his readers think they are actually living in the days and among the people described.

ہے کہ محض بیانات سے کسی ماحول کا تاثر نہیں پیدا ہو سکتا، فن کار کے فن کا کمال تو یہ ہے کہ وہ اسے اس طرح پیش کرے کہ قاری اسے چشم تخیل سے دیکھ سکے[1]۔ اس فضا سازی کے لیے ناول نگار کو اپنے الفاظ اور زبان و بیان پر بھی نگاہ رکھنی پڑتی ہے، اور یہی چیزیں مل کر مجموعی طور پر ایک حسی تاثر پیدا کرتی ہیں۔ شیپرڈ نے اس ضمن میں تفصیلات اور جزئیات کے انتخاب کے بارے میں سخت محتاط رہنے کی تاکید کی ہے، سکاٹ کا خیال ہے کہ معمولی سی غیر ضروری تفصیل بھی مجموعی فضا کو خراب کر سکتی ہے[2]۔ شیپرڈ ایسے مکالموں، کرداروں اور تفصیلات کے شامل کر لینے کو جائز سمجھتا ہے جو خواہ پلاٹ کے ارتقا میں ممد و معاون نہ ہوں لیکن موضوع کی از سر نو تخلیق کر سکتے ہوں[3]۔

سٹیونسن نے تاریخی ناول نگاری کی انھیں فنی دشواریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا ہے کہ ایسے مختلف النوع مشکلات در پیش ہوتی ہیں، نہ صرف نہ کہ کسی عہد رفتہ کو زندگی بخشنی ہوتی ہے اور اس میں اسی طرح کے زندہ انسان تخلیق کرنے ہوتے ہیں، بلکہ ایسے مخلوق، جن کے جسم میں وہ خود اپنی بے قراری اور اپنے دل کی دھڑکنیں پیدا کرتا ہے۔

میکالے نے اسی لیے تاریخی ناول نگار کو مورخ پر ترجیح دی ہے کہ تاریخی ناول نگار ماضی کو حال اور بعید کے قریب تر کر کے پیش کرتا ہے اور ہم اپنے بزرگوں کو ان کی عجیب و غریب وضع میں دیکھتے، عجیب و غریب زبان بولتے سنتے اور خود کو ان کے ساتھ ہم مجلس محسوس کرتے ہیں[4]۔ شیپرڈ نے تاریخی ناول کی صفات اور اس کی مبادیات کو ایک دو جملوں میں سموتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں وقار ہو، فضا سازی ہو جس میں حسن کا رنگ نمایاں ہو، جزئیات کا تناسب اور ڈرامائیت ہو[5]۔

۱- بحوالہ شیپرڈ، ایضاً، ص ۲۱۰ -

۲- بحوالہ شیپرڈ، ایضاً، ص ۱۰۰ :

Scott says, the interest becomes lost in a minute description of events not affecting the progress of tale

۳- شیپرڈ، ایضاً، ص ۱۷ :

The really great historical novelists seems to me, are those who invest and surround their characters —the men and women, "of last, years"—with the haze wistfulness and glamour which is comparable to that gloss or film on prehistoric implements and weapons, times own work, not to be copied by any human tool or process,

۴- بحوالہ شیپرڈ، ایضاً :

To make the past present to bring the distant near, to place us in the presence of a great man, one on the eminence which overlooks the field of a mighty battle, to invest with the reality of flesh and blood beings whom we are too much inclined to consider as personified qualities in an allegory, to call up our ancestors before us with all their peculiarities of language, manners and garbs to show us over their houses, to seat us at their tables, to rummage their old fashioned ward robes to explain the uses of their ponderous furniture, these parts of the duty which properly belongs to the historian have been appreciated by the historical novelist

۵- شیپرڈ، ایضاً، ص ۸۲ :

It must preserve dignity and avoid grandiloquence, preserve atmosphere and avoid the archaic carried to extreems, preserve accuracy of background and avoid the crowding out the human interest, preserve strength and avoid the needlessly coarse and ruthless and morbid, preserve the dramatic without being melodramatic, preserve the proportion without sacrificing detail

شرر کی تاریخی ناول نگاری کے محرکات

علی عباس حسینی سرر کی تاریخی ناول نگاری کی تحریک کے بارے میں لکھتے ہیں :
''تاریخ سے آپ کو خاص ذوق تھا ۔ آپ نے انگلستان اور ممالک یورپ کی سیاحت بھی کی تھی ۔ اس سفر کے سلسلے میں آپ نے وہ آثارالصنادید بھی دیکھے تھے جن سے اُن ایام گزشتہ کی یاد تازہ ہوتی تھی جب عرب کا پرچم صقلیہ اور اندلس پر لہراتا تھا ۔ آپ نے اس دوران میں سکاٹ کے وہ نام نہاد تاریخی ناول بھی دیکھے جن میں اسلام کا مضحکہ اڑایا گیا ہے اور عیسائیت کا فروغ دکھایا گیا ہے ۔ غرض مورخانہ ذوق ، قبولیت عام کی خواہش ، مذہبی جوش اور مسلمانوں کے احیاء کا خیال ، تاریخی ناول لکھنے کا محرک تھا''۔[۱]

ڈاکٹر احسن فاروقی انھیں باتوں کو اپنے مخصوص پیرائے میں ادا کرتے ہوئے لکھتے ہیں :
''ناول کی طرف اُن کی توجہ شاید سرشار کی کامیابی سے مبذول کی ہو مگر یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ۔ جس بات کا یقین ہے وہ یہ ہے کہ جب وہ انگلستان اور ممالک یورپ کی سیاحت کر رہے تھے تو اُن کے ہاتھ سکاٹ کی تاریخی ناول ٹیلسمان لگی جس میں سکاٹ نے کچھ سطحی نقوش عرب کی اسلامی زندگی کے نمایاں کیے ہیں ۔ مولانا کو یہ کتاب پڑھ کر محسوس ہوا کہ اس میں اسلام کا مذاق اڑایا گیا ہے ۔ مذہبی جوش میں آ کر انھوں نے اس ناول کی رد میں ایسی ناولیں لکھنے کی ٹھان لی جن میں اسلامی تاریخ کو زندہ کیا جائے اور عیسائیت کی برائیاں دکھائی جائیں ، چنانچہ یہ جذبۂ مذہبی ان کے ناول نگار ہونے کا محرک ہوا ۔''[۲]

ان مذکورہ دو آرا میں سے علی عباس حسینی کی رائے شرر کے حق میں نہ سہی تاہم ایک تجزیہ ہے اور قدرے وزن رکھتی ہے ۔ وہ سکاٹ کے ناول کو مختلف دیگر محرکات میں سے ایک تصور کرتے ہیں لیکن اس رائے سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ سرر نے یورپ کی سیاحت کے دوران جب سکاٹ کا ناول پڑھا تو تاریخی ناول لکھنے کی تحریک ہوئی[۳] ۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کی رائے کا لب و لہجہ اور الفاظ کسی تجزیے کے محتاج نہیں ۔ دونوں نقادوں میں یہ فرق صاف ظاہر ہے کہ علی عباس حسینی انگریزی ناولوں کی جس خامی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ، احسن فاروقی انگریزی نوازی کے جوش میں حمایت کا نہ روپ اختیار کرتے ہیں کہ گویا وہ نقص انگریزی ناولوں میں فی نفسہ موجود نہیں تھا بلکہ سرر کو اپنی مذہبیت کی بنا پر بلاوجہ محسوس ہونے لگا ، حالانکہ خود اکثر انگریز نقاد بھی سکاٹ کے اس نقص کا اعتراف کر چکے ہیں بلکہ اس پر انھوں نے کڑی تنقید بھی کی ہے[٤] ۔ احسن فاروقی کی رائے کسی ذاتی فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ علی عباس حسینی کی رائے کا ہی ایک بگڑا ہوا رنگ ہے جس میں تاریک اور منفی پہلو کو پوری کوشش سے نمایاں کیا گیا ہے ۔ اس لیے احسن فاروقی صاف طور پر کہہ بیٹھے ہیں کہ شرر جب یورپ کے دورے پر گئے تو اس سفر میں سر راہ سکاٹ کے ناول سے ملاقات ہو گئی اور پھر انھوں نے بدلے کے طور پر اردو میں تاریخی ناول نگاری شروع کر دی[٥] ۔ گویا اردو میں تاریخی ناول نگاری کا آغاز ایک حادثہ تھا ، نہ شرر یورپ جاتے نہ سکاٹ کا ناول پڑھتے

۱۔ علی عباس حسینی ، ناول کی تاریخ اور تنقید ، ص ۳۰۴ ۔
۲۔ احسن فاروقی ، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ، ص ۱۲۸-۱۲۷ ۔
۳۔ شرر نے تاریخی ناول نگاری ۱۸۸۷ع میں شروع کی اور یورپ کا سفر ۱۸۹۲-۱۸۹۵ع میں ہوا ۔
٤۔ شیپرڈ ، دی آرٹ اینڈ پریکٹس آف ہسٹاریکل فکشن ، باب The King of Romance ملاحظہ ہو ۔
۵۔ احسن فاروقی ، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ، ص ۱۳۰ ۔

نہ اردو میں تاریخی ناول نگاری کا آغاز ہوتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ شرر کے تاریخی ناولوں پر انگریزی ناولوں کا اور خصوصاً سکاٹ کا اثر ہے۔ انھوں نے یقیناً اپنا پہلا تاریخی ناول لکھنے سے پہلے سکاٹ کے ناولوں کا مطالعہ کیا لیکن احسن فاروقی کی رائے کے برعکس نہ تو یہ مطالعہ انگلستان کے سفر کے دوران سر راہ سکاٹ کے ناول سے ملاقات کا مرہون منت ہے نہ شرر نے ملک‌العزیز ورجنا میں کسی انتقامی جذبے کا اظہار ہونے دیا ہے اور نہ ہی سکاٹ کی طرح دوسرے مذہب کے بارے میں اپنے ہیرو سے گستاخانہ جملے ادا کرائے ہیں۔ احسن فاروقی سکاٹ کے ان گستاخانہ حملوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رچرڈ کی زبان سے اس نے پیغمبر اسلامؐ کی شان میں گستاخانہ جملے لکھے ہیں[1]۔ لیکن پھر کہتے ہیں معلوم نہیں شرر کو کیوں محسوس ہوا کہ اس ناول میں اسلام اور مسلمانوں کا مذاق اڑایا گیا ہے[2]۔ ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں کہ احسن فاروقی اس اعتراف کے باوجود سکاٹ کو مذہبی تعصب سے کیوں بری الذمہ قرار دیتے ہیں اور شرر کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں کیونکہ ملی غیرت اور دینی حمیت کا معیار ہر کسی کا اپنا اپنا ہے۔ اس بحث سے مقصد صرف یہ ہے کہ شرر پر یہ الزام بے بنیاد ہے کہ انھوں نے انتقامی کارروائی کے طور پر تاریخی ناول نگاری کو اپنایا کیونکہ مذکورہ ناول کی داخلی شہادتوں کے علاوہ ملک العزیز ورجنا پر شرر کا پیش لفظ اس بات کا بہ خوبی ثبوت پیش کرتا ہے کہ وہ سکاٹ اور اس کے فن کا کس قدر احترام کرتے تھے۔ شرر کے ناولوں میں تاریخی غلطیوں کا سہارا کرتے ہوئے یہ لکھنے والے قلم خود تاریخی حقائق کو مدنظر نہیں رکھتے۔ شرر نے یورپ کی سیاحت کے دوران سکاٹ کے ناولوں کا مطالعہ کرکے تاریخی ناول نگاری کے آغاز کا فیصلہ نہیں کیا بلکہ یورپ جانے سے پہلے وہ کم از کم پانچ تاریخی ناول لکھ چکے تھے جن میں ملک العزیز ورجنا (۱۸۸۸ء)، حسن انجلینا (۱۸۸۹ء)، منصور موہنا (۱۸۹۰ء)، قیس ولبنیٰ (۱۸۹۱ء) چھپ چکے تھے اور یوسف و نجمہ اور فلورا فلورنڈا کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔

دنیا کی ادبیات کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ وہ اصناف ادب جو حادثۃً کسی زبان کے ادب میں درآئیں نہ معیاری ادب کا درجہ حاصل کر سکیں اور نہ دیرپا ثابت ہوئیں۔ پیوند کاری کے عمل سے انکار تو ممکن نہیں لیکن پیوند کاری کے لیے خاص قسم کے حالات اور مطابقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اس کا بار آور ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ تاریخی ناول نگاری کے سلسلے میں شرر مغربی ادب اور روایات سے متاثر ہوئے لیکن اس سارے عمل کو محض حادثہ قرار دے دینا قرین انصاف نہیں کیونکہ ادب کے معاملے میں خارج سے ٹھونسی ہوئی چیز کامیاب نہیں ہوتی۔ اس کے لیے سیاسی و سماجی حالات، ماحول، قوم کا مزاج و مذاق، معاشرت اور طرز تمدن کا ایک اجتماعی اثر نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ شرر نے جس سیاسی و سماجی ماحول میں ہوش سنبھالا، قوم کی جو حالت دیکھی اور جیسی افتاد طبع پائی تھی اس کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ سکاٹ کے ناول نہ بھی پڑھتے تو بھی تاریخی ناول ضرور لکھتے اور گمان غالب ہے کہ وہ ناول بنیاد جذباتی عنصر اور سکاٹ کے زیر اثر پیدا ہونے والے مذہبی

۱۔ احسن فاروقی، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ص ۱۳۹۔ ۲۔ ایضاً، ص ۱۴۰۔

تعصب یا غلو سے بھی مبرا ہوئے۔

مذکورہ خیال کی چند در چند وجوہ ہیں۔ سرور نے جب ہوش سنبھالا تو نہ صرف ابھی ہندوستان کے افق پر ۱۸۵۷ء کے خون آشام شفق کی گہری سرخی موجود تھی بلکہ سلطنت اودھ کے انتزاع کے زخم بھی اسی طرح تازہ تھے کہ ان سے اٹھنے والی ٹیسیں ہر لحظہ زیادہ سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی جا رہی تھیں۔ صرف مسلمانان ہند ہی نہیں تمام عالم اسلام مغربی سامراج کے آہنی پنجے میں گرفتار ایک کربناک حالت سے دو چار تھا۔ لیکن یہ حالت ایسی نہیں تھی کہ کہا جا سکے:

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

احساس زیاں موجود تھا، بدحالی اور تباہی کا احساس گہرا تھا اور جتنا یہ شعور گہرا تھا اتنا ہی درد و کرب زیادہ۔ اس لیے اس بدحالی سے نجات حاصل کرنے کی شعوری کوشش اپنی جھلک دکھانے لگی تھیں۔ افغانستان، ایران اور دیگر ممالک اسلام میں قوم کے ارباب فکر و نظر اس بگڑی ہوئی حالت کو سدھارنے کے لیے سر جوڑ کے بیٹھے ہوئے تھے اور مسلمانان ہند کے نباض مسیحاؤں نے بھی قوم کی ڈکھتی رگوں کو جھو لیا تھا۔ اس دور میں ہر صاحب فکر اسی کوشش میں تھا کہ قوم کو اس کے اقتدار اور وقار کی کھوئی ہوئی مسند دوبارہ دلوائی جا سکے اور اس باہمی انتشار کو ختم کیا جائے جو قوم کے مجموعی زوال کا باعث بنا۔

سرور نے اسی سیاسی و سماجی ماحول میں آنکھ کھولی جس میں ۱۸۵۷ء کے معرکۂ قتال نے ہندوستان کی زندگی کے جمود میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی اور بہت سی روایات میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو چلا تھا۔ یہ کشمکش کا دور بلکہ کشمکش کی صدی تھی جس میں مغرب مشرق سے، مذہب مذہب سے، تہذیب تہذیب سے اور افکار افکار سے بر سر پیکار تھے۔ مختلف ذہنی اور مادی قوتیں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھیں۔ مناظرے کا دور تھا، تہذیبوں کے ساتھ ساتھ اسلام اور عیسائیت بھی ایک دوسرے کے سامنے صف آرا تھے۔ ہندوستان میں عیسائی مشنری، سیاسی اقتدار اور وافر سرمائے کی پشت پناہی میں، بڑی سرگرمی سے مصروف کار تھی۔ یہ مشنری عیسائیت کی تبلیغ کے لیے نہ صرف اپنے مذہب کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہی تھی بلکہ دیگر مذاہب پر اوچھے حملے کر کے، حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتی تھی۔ اسلام پر اپنی فضیلت جتانے کے لیے تاریخ اور عقاید کو اپنے رنگ میں رنگ کر پیش کر رہی تھی۔

الغرض سرور نے جو زمانہ دیکھا وہ در حقیقت مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور علمی زوال کا زمانہ تھا، اور قوم کے تمام اہل فکر و نظر مختلف طریقوں سے قوم کو اس کی گرتی ہوئی حالت کا احساس دلا رہے تھے۔ سرسید تحریک کے زیر اثر کہیں شبلی تاریخ کے آئینے میں قوم کو اس کی مٹی ہوئی عظمت کی جھلک دکھا رہے تھے، کہیں حالی اس کی حالت زار پر نوحہ کناں تھے اور کہیں ڈپٹی نذیر احمد سماجی اور تہذیبی اصلاح کے لیے کوشاں۔ ان تمام تحریکات کے نتیجے کے طور پر خواب غفلت میں مدہوش قوم کچھ کچھ بیدار ہو چلی تھی لیکن غنودگی کی کیفیت ابھی باقی تھی جسے مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے ابھی رجز خوانی کی ضرورت تھی۔ ایسی رجز خوانی جس سے قوم کے دل میں پھر سے اپنے ماضی، اپنے اسلاف، اپنی تہذیب، اپنی روایات و اقدار اور عظمت عہد رفتہ سے ایک انس پیدا ہو جائے، جس کے دوبارہ

حصول کے لیے وہ نئے جوش، ولولے اور عزم لے کر اٹھے۔

شرر ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی لیکن ۹ برس کی عمر میں اپنے والد حکیم تفضل حسین لکھنوی کے پاس مٹیا برج (کلکتہ) چلے گئے جہاں واجد علی شاہ اختر اپنی زندگی کے حرماں نصیبی کے آخری دن گذار رہے تھے۔ اس ماحول میں رہ کر جہاں بچپن ہی سے انھیں قوم کے دکھ اور زوال کا احساس ہونے لگا وہاں نظم طباطبائی اور ہدایت اللہ شیرازی سے معقولات کی تعلیم نے ابتدائی عمر ہی میں ان کے ذہن کو عقل پسندی کی ان راہوں پر گامزن کر دیا جن کے ڈانڈے سرسید کی تحریک سے آ ملے تھے۔ کلکتے سے لکھنؤ واپس آ کر مولوی حامد حسین کے زیر اثر تاریخ سے ذوق بھی پیدا ہوا اور تاریخ کے مطالعے سے کماحقہ' استفادہ کیا۔ ان دنوں محمد بن عبدالوہاب کی تحریک ہندوستان کی مذہبی فضا میں نہ صرف اصلاحی بلکہ انقلابی تحریک تصور کی جاتی تھی۔ شرر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے محمد بن عبدالوہاب کے ایک رسالے کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ یہ اس امر کی غماری کرتا ہے کہ شرر کا ذہن شروع ہی سے زندگی کے جمود اور تعطل کے خلاف تھا اور اس میں ایک نئی ہلچل پیدا کرنے کا آرزو مند تھا۔ شرر کی ان ذہنی کیفیات کو سرسید، شبلی اور محسن الملک کے قرب نے اور بھی جلا بخش دی۔ اس حساس اور فعال طبیعت اور درد مند دل پر ان مخصوص سیاسی اور سماجی حالات کا اور سکاٹ کے ان ناولوں کا، جو بقول علی عباس حسینی "نام نہاد تاریخی ناول ہیں اور ان میں اسلام کا مضحکہ اڑایا گیا ہے" جو شدید رد عمل ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے۔ پھر یورپ کی سیاحت اور بالخصوص سسلی اور اندلس کی سر زمین پر اپنے اسلاف کی یادگاریں اور آثارالصنادید دیکھ کر اسلامی عہد کی سطوت کے نقوش اس طرح ذہن پر ابھرے کہ حرز جاں بن گئے۔

ان سب محرکات کے زیر اثر شرر نے محسوس کیا کہ قوم کی اصلاح کے لیے اس میں دینی حمیت اور اپنی تاریخ سے والہانہ لگاؤ پیدا کرنا ناگزیر ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی فکر و نظر کے مطابق اسلامی تاریخ کے اس درخشاں عہد کو موضوع بنایا جسے ان کے دور کا مسلمان فراموش کر چکا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کی تاریخ کے سنہرے اوراق دفتر نسیاں سے نکال کر قوم کے سامنے پیش کیے اور اسلاف کے کارنامے یاد دلا کر اپنے تنزل کے اسباب پر غور کرنے کی طرف مائل کرانا چاہا۔ ظاہر ہے کہ اس اصلاح کے جذبے کے تحت شرر ایک واضح مقصد لے کر اٹھے تھے، ایک خاص خیال کے داعی تھے لیکن وہ کسی سیاسی لیڈر کے روپ میں سٹیج کی بلندیوں پر سے للکارنے کی بجائے ایک ایک کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر اور گد گدا کر اس غنودگی کی کیفیت سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ ناول کی صنف ان دنوں نئی نئی مغرب سے آئی تھی اور لوگ اس کے فن کو نہ سمجھنے کے باوجود اس میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ شرر نے اپنے مورخانہ ذوق، افتاد طبع اور تقاضائے حالات کے تحت احیائے قوم کے لیے اسے ایک مناسب ذریعہ تصور کرتے ہوئے اپنایا اور اس طرح اردو ادب میں تاریخی ناول نگاری کی صنف کی بنا پڑی۔

شرر نے اپنے اصلاحی مقاصد کے لیے ناول کے ڈھانچے کو اس لیے بھی پسند کیا کہ ان کے نزدیک اخلاق اور پند و نصائح کے لیے ادب میں ناول سے زیادہ اور کوئی چیز موزوں نہیں

تھی ۔ ناول کی اس افادیت کے بارے میں وہ واضح نظریات رکھتے تھے جو ان کے درج ذیل اقتباسات سے عیاں ہیں :

ناول کے بارے میں شرر کے نظریات

''اخلاق تعلیم دینے کا اس سے دلچسپ طریقہ آج تک دنیا کو معلوم نہیں ہوا اور ساری قوم نے تسلیم کر لیا ہے کہ ناول ہی اخلاق کے اصلی مصلح ہیں ۔''

''انسان کے لیے ناول سے زیادہ دلچسپ چیز کوئی نہیں ۔''

''پند و نصائح کو ناول کا لباس پہنا کر پیش کیا جائے تو نہایت ہی عمدہ اور مفید اثر پڑتا ہے ۔''

''اصل یہ ہے کہ ناول سے زیادہ کوئی موثر پیرایہ کسی مسئلے یا کسی تہذیب کے ذہن نشین کرنے اور لوگوں کو پابند بنا دینے کا ہو ہی نہیں سکتا ۔ ناول کا اسلوب وہ شکر ہے جو ہر کڑوی دوا کے خوشگوار بنانے کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے ۔''[1]

مندرجہ بالا چار اقتباسات سے یہ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں کہ شرر نے اپنی بات کو موثر بنا کر پیش کرنے کے لیے اور قوم کی اصلاح اور پند و نصائح کے لیے ناول کو ہی ایک ایسا وسیلہ پایا جسے نہ صرف ہر انسان دلچسپی سے پڑھتا ہے بلکہ اس سے اثر بھی قبول کرتا ہے ۔ ان واضح نظریات کے تحت ناول کے اپنانے والے کے بارے میں یہ کہہ دینا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر کسی صنف ادب کا داعی ہوا حقائق سے چشم پوشی ہے اور اسے اس الزام کا مورد بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ اس نے نصف النہار پر چمکتے ہوئے آفتاب عالمتاب کے مقابل ناول کی شمع جلائی ہے ۔ مغربی تنقید کی عینک سے دیکھنے والے نقاد شرر کے ناولوں کو محض ''پوچ'' کہہ کر صرف نظر کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ مغرب کا یہ پودا مشرق کی آب و ہوا میں پروان چڑھا ہے ۔

شرر کا نظریہ فن

شرر نے اپنے مضامین میں تاریخی ناول نگاری سے متعلق اپنے نظریات اور اصول بیان کیے ہیں ۔ ان میں چند چیدہ نظریات یہ ہیں :

''ہمارے ہم وطنوں اور ہم قوموں کو اپنی زندگی کے اس حصے کے واقعات میں مزا آ سکتا ہے جو کامیابی و عروج کا زمانہ تھی اور نصیحت و عبرت کے لیے ہم بھی انہیں ان کے اوج و عروج کے کارنامے دکھائیں تو شاید وہ زیادہ متمتع ہوں ۔''

''ہندوستان کے لیے اہل یورپ کے مذاق کے ناول نہیں چاہییں بلکہ ''رومانس'' چاہییے جن میں انہیں کے اگلے ہم وطن یا ہم مذہب کی اعلیٰ کارگزاریاں دکھائی گئی ہوں اور جن کے ذریعے انہیں اگلا علم و فضل اور اوج و عروج یاد دلایا گیا ہو ۔''

''ناول میں جو واقعات بیان کیے جائیں گے ، مجموعی طور پر سچے اور مطابق واقعہ ہوں گے ہاں ناول کی ضرورت سے تفصیلی صحبتوں اور صحبت کی باتوں میں تصرف اور اضافہ کرنے سے مجبوری ہے کیونکہ بغیر اس کے نہ ناول ناول ہو سکتا ہے اور نہ قصے میں مزا آ سکتا ہے ۔''

''ہم نے بھی دو ایک ناول موجودہ سوسائٹی دکھانے کی غرض سے لکھ کر شائع کیے تھے مگر پبلک کو ان میں ہرگز اتنا مزا نہیں آیا جتنا کہ ملک العزیز ورجنا ، فتح اندلس ، ایام عرب اور فردوس بریں وغیرہ میں آیا اور اسی خیال سے ہم ہمیشہ ناول کے لیے اگلے عہد کا کوئی واقعہ ڈھونڈ لیا کرتے ہیں ۔

۱۔ مضامین شرر۔

اس میں موجودہ لٹریچر کے موافق کچھ مشرقیت ہوتی ہے اور کچھ مغربیت، حتی الامکان دلچسپی پیدا کر دیا کرتے ہیں— اور ہمیں اب یقین ہو گیا ہے کہ جس طرح ہمارا موجودہ لٹریچر مغربی اور مشرقی انشا پردازی کا مجموعہ ہے اسی طرح ہمارے ناولوں کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے کہ ان میں کچھ ایشیائیت ہو کچھ یورپیت، نہ وہ بالکل ایسی بے سر و پا کہانیاں ہوں اور نہ انگلش گھروں کی تصویر دکھانے والے ناول۔''

''یہ سب جانتے ہیں کہ ناول اسی قسم کا لٹریچر ہے جو انتہا سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے، جس کے پڑھنے سے دماغ پر کسی قسم کا بار نہیں پڑتا اور دماغ کی تھکن مٹانے اور فرصت کے اوقات میں دل بہلانے کے لیے اس سے زیادہ موزوں کوئی لٹریچر نہیں ہو سکتا۔''

''ناولوں نے اکثر مختلف اقوام و ممالک کی تاریخ کو ایسے دلچسپ عنوان سے شائع کیا کہ معمولی قابلیت کے لوگ حتیٰ کہ عورتیں تک تاریخ کو ایک نہایت دلچسپ فن خیال کرنے لگیں۔''

''ناول کے لیے سب سے مقدم یہ ہے کہ وہ انتہا سے زیادہ دلچسپ ہو اور دلچسپی بغیر حسن و عشق کے بہت ہی کم آ سکتی ہے۔''

''برے اور بے مزہ ناولوں کا فیصلہ کرنے والے ہم آپ نہیں بلکہ اصل فیصلہ کرنے والی پبلک ہے جو خراب اور ناپسندیدہ ہوں گے وہ خود ہی مٹ جائیں گے۔''

شرر کے ان نظریات میں سے بعض سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے لیکن ان کے مجموعی تاثر سے ان کے ناول نگاری کے اصول بخوبی مدون کیے جا سکتے ہیں۔ شرر بنیادی طور پر رومانی ناول— اور وہ بھی عوامی ذوق کے پس نظر ان کی تاریخ کے کسی درخشاں حصے سے متعلق ناول— کے حق میں ہیں اور اسی کو دلوں کی افسردگی ختم کرکے جوش اور ولولہ پیدا کرتے ہوئے روشن مستقبل کی راہ ہموار کرنے کا واحد کامیاب نسخہ تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تاریخی واقعات کا سچا ہونا ضروری ہے لیکن قصے میں دلچسپی اور رنگ آمیزی کی خاطر تفصیلی صحبتوں کا ذکر اور ان میں تصرف و اضافہ ناگزیر ہے۔

شرر کے فن کا یہ بنیادی وصف ہے کہ وہ تاریخ اور افسانے کے مابین چلتے ہوئے دونوں میں حسین امتزاج اور توازن پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنے قاری کے مطالبات کے مطابق واقعات کے بیان میں استعجاب اور تحیر کے لیے ایک اجنبی اور رومانی ماحول پیدا کر لیتے ہیں جو قاری کی دلچسپی بڑھانے کا باعث بنتا ہے۔ ان کے نزدیک ادب اور خصوصاً ناول کا بنیادی مقصد قاری کی ذہنی تسکین اور حظ آفرینی ہے اور اچھے تاریخی ناول کا معیار یہ ہے کہ قاری نہ صرف ناول میں دلچسپی لے بلکہ تاریخ کے فن کو بھی ایک حسین فن تصور کرتے ہوئے اس سے ایک ذہنی لگاؤ پیدا کر سکے۔ ان کے ناولوں کی موجودہ ہیئت کے پیچھے عوامی ذوق اور ہر ایک کی پسند کا نظریہ پورے طور پر کارفرما ہے جس کے تحت وہ فن کی لطافتوں اور نزاکتوں سے نا آشنا عوام کے ذوق کی خاطر فوری تاثر پیدا کرنے والے ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ اسی بنیادی ضرورت کے تحت حسن و عشق کے قصے بھی ان کے ناولوں کا ناگزیر جزو ہیں۔ بہر کیف ان کا فن انہیں نظریات کے زیر اثر پروان چڑھا اور انھوں نے ناول کے فن میں پیچیدہ مراحل سے جدا، شدید تاثر اور لطیف انبساط پیدا کرنے والا راستہ اختیار کیا جس سے ان کے قاری بغیر کسی دقت کے جذباتی اور ذہنی طور پر ان کے ہمنوا ہو جاتے ہیں۔

چوتھا باب

شرر کے تاریخی ناولوں کا تحقیقی جائزہ

۱۔ ملک العزیز ورجنا

"ملک العزیز ورجنا" شرر کا پہلا تاریخی ناول ہے اور اسے اردو میں تاریخی ناول نگاری کا سنگ میل بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اردو ادب میں اس ناول کو اس لیے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں پہلی بار ناول نگاری کی تمام فنی مبادیات کو سلیقے سے برتا گیا ہے۔ بعض نقادوں[1] کا خیال ہے کہ یورپ کے سفر کے دوران شرر نے سکاٹ کا ناول "ٹلسمان (Talisman)" پڑھا تو انہیں محسوس ہوا کہ سکاٹ نے اسلام اور عربوں کا مذاق اڑایا ہے، اس لیے انتقامی جذبے سے انہیں اس ناول کے لکھنے کی تحریک ہوئی۔

شرر کی تاریخی ناول نگاری کے محرکات کی بحث میں کہا جا چکا ہے کہ ان میں سے ایک محرک سکاٹ کے تاریخی ناول بھی تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ شرر نے "ملک العزیز ورجنا" کی تصنیف سے پہلے سر والٹر سکاٹ کے "ٹیلسمان" کا مطالعہ کیا ہو، لیکن یہ بات قرین انصاف نہیں معلوم ہوتی کہ شرر نے انتقامی جذبے سے تاریخی ناول نگاری کا آغاز کیا۔ شرر جہاں بھی سر والٹر سکاٹ کا ذکر کرتے ہیں، بڑے احترام سے کرتے ہیں۔ "ملک العزیز ورجنا" کے دیباچے میں انہوں نے تاریخی ناول نگاری کی دشواریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "اس قسم کی تصانیف کے لیے ان دنوں آمادہ ہو جانا کچھ انگریزوں ہی کا کام ہے اور انگریزوں میں بھی خاص سر والٹر سکاٹ کا۔[2]" اس لیے شرر کا سکاٹ سے متاثر ہونا کچھ بعید از قیاس نہیں، لیکن یہ بات درست نہیں کہ انگلستان کے سفر کے دوران شرر نے "ٹلسمان" کا مطالعہ کیا کیونکہ "ملک العزیز ورجنا" انگلستان کے سفر سے پانچ برس پیشتر تصنیف ہوا۔

"ملک العزیز ورجنا" ابتداً ۱۸۸۸ء میں دلگداز میں قسط وار شائع ہوا، اور ۱۸۸۹ء میں پہلی بار کتابی صورت میں چھاپا گیا۔ اس کا موضوع تیسری صلیبی جنگ ہے جسے بقول شرر "تمام مہذب دنیا میں بڑی حیرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اور جس میں عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کو پوری دلچسپی حاصل ہوتی ہے[3]۔" اس جنگ کے دونوں بہادر سپہ سالاروں، سلطان صلاح الدین ایوبی اور شاہ رچرڈ کو جو شہرت نصیب ہوئی وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی، حالانکہ تاریخ انسانی بڑے بڑے ناموروں اور بہادروں کے کارناموں سے مزین ہے۔

شرر نے "دلگداز" میں "ملک العزیز ورجنا" کی اشاعت کی تکمیل پر ۱۸۸۸ء کے بارہویں

۱۔ احسن فاروقی: اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ص ۱۲۷۔

۲۔ شرر: ملک العزیز ورجنا، دیباچہ ص ۶۵۔ (ملک العزیز ورجنا کے صفحات کا حوالہ آیندہ بھی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور سن ۱۹۶۴ء کے مطابق ہوگا)

۳۔ ایضاً، ص ۶۴۔

شمارے کے اداریے میں اس ناول کے سلسلے میں اپنی ذمے داریوں اور دائرہ کار کو متعین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "تاریخی حیثیت سے سلطان صلاح الدین کے حالات بتانا ہمارے دوست مولانا شبلی کا کام ہے"۔[1] یہ لکھ کر گویا شرر اپنے آپ کو تاریخی واقعات کی پابندی سے آزاد کرانا چاہتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس ناول کے تاریخی واقعات کی سچائی کا دعویٰ بھی کیا ہے کہ "اردو میں اس وقت تک جتنے اوریجنل (طبعی) ناول لکھے گئے ان سب میں کسی تاریخی واقعے کی مطابقت کی کوشش نہیں کی گئی، صرف فرضی قصے سے کام لیا گیا اور محض خیالی عبارت آرائیوں سے سوسائٹی کے نمونے دکھائے گئے۔ مگر اس ناول میں بہت زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ تاریخ کسی طرح ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ اس وجہ سے اس میں اور اردو کے اور اوریجنل ناولوں میں قریب قریب وہی فرق ہے جو سچ اور جھوٹ میں ہوا کرتا ہے۔ یہ دعویٰ نہیں کہ اس میں جو لکھا ہے، سچ ہے، مگر اس میں بھی شک نہیں کہ جو یہ ناول دیکھے گا تاریخ کے ایک خاص حصے سے بخوبی واقف ہو جائے گا۔"[2]

شرر کے مذکورہ اقتباس سے ان کا دعویٰ عیاں ہے۔ اگرچہ انہوں نے اس دعوے اور اس کے تحت عاید ہونے والی پابندیوں سے گریز کی بھی ایک صورت نکال لی ہے۔ بہر کیف تاریخی ناول نگاری کا فن جس حد تک تاریخ کی پابندی، تاریخی صداقت اور واقعات کی زمانی ترتیب کی صحت کو برقرار رکھنے کا تقاضا کرتا ہے، اسی نقطہ نظر سے یہاں تاریخی واقعات کا جائزہ لیا جائے گا، ان واقعات سے بحث نہیں کی جائے گی جو ضمنی، ذیلی اور روایتی ہیں اور جن کو خود شرر نے بھی تاریخی واقعات قرار نہیں دیا بلکہ یہ کہہ کر کہ "یہ دعویٰ نہیں کہ اس میں جو کچھ لکھا ہے۔ سچ ہے۔" تخیلی اور فرضی واقعات کے لیے جواز پیدا کیا ہے۔ البتہ جو واقعات تاریخی کرداروں سے منسوب ہو گئے ہیں یا جن کی تاریخ (Date) متعین کر دی گئی ہے انھیں تاریخی واقعات کے نقطہ نظر سے ہی دیکھنا پڑے گا۔

ناول میں بیان کردہ تاریخی واقعات کا خلاصہ

"ملک العزیز ورجنا" زمانی اعتبار سے ۵۸۷ھ تا ۵۸۹ھ/۱۱۹۱ء تا ۱۱۹۲ء کے واقعات پر پھیلا ہوا ہے، اگرچہ کہیں کہیں ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء سے پہلے کے واقعات کا حوالہ بھی آ جاتا ہے۔ اس ناول میں بیان کردہ تاریخی واقعات مختصراً یہ ہیں:

۴ جمادی الثانی ۵۸۷ھ کو مسلمان سپاہیوں کی چھوٹی سی جماعت سلطان صلاح الدین ایوبی کے لڑکے بیٹے عزیز نور الدین کی قیادت میں، جس کی عمر اس وقت ۲۱، ۲۲ سال کے لگ بھگ تھی، عکہ سے ناصرہ جا رہی تھی۔ ناصرہ سے پانچ چھ میل دور بحرالحوس کے مقام پر انھیں معلوم ہوا کہ عیسائیوں نے ایک دن پیشتر سوف عامر پر قبضہ کر لیا اور سخت قتل عام کیا۔ انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ چار روز پیشتر عیسائیوں نے سلطان صلاح الدین ایوبی کو دکھا دکھا کر دو ہزار سات سو ترکوں کے سر کاٹ کاٹ کے پھینک دیے۔ شہزادہ یہ سن کر سخت برہم ہوا اور اسی وقت کوچ کر کے شام سے پہلے سوف عامر میں مسیحی فوج پر جا پڑا۔

۱۔ شرر: دلگداز، ختم سال و شروع سال ۱۸۸۸ء۔

۲۔ شرر: ملک العزیز ورجنا، ص ۶۴۔

زبردست جنگ کے بعد رات ہونے سے پہلے ہی عیسائی ایک ہزار نو سو لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے ۔ اس معرکے میں ان کا سردار ڈی فرس ارل آف ڈربی سہزادے کے ہاتھوں قتل ہوا ۔

سہزادہ عزیز جوش میں عیسائیوں کا تعاقب کرتا ہوا ایک ویران مقام پر پہنچا جہاں اس نے ایک یہودی کے ہاتھ سے ایک عیسائی دوسیزہ (شاہ رچرڈ کی بھانجی) کی جان بچائی ۔ وہ سہزادی ورجنا اور مقتول یہودی کی بہن آسیہ کو لیے واپس لوٹ رہا تھا کہ چند عیسائی سواروں کے ہاتھوں زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا ۔ آسیہ بھی قید کر لی گئی ۔ شہزادی ورجنا جو اس وقت خوف کے مارے چھپ گئی تھی دوسری صبح ایک بدوی کے ہاتھ لگی جس نے اسے سوق عام میں لا کر مسلمان افسروں کے پاس سہزادے کے لیے کنیز کے طور پر بیچ دیا ۔ سلطان کو سہزادے کی گمشدگی کی اطلاع دے دی گئی تھی لیکن سپاہیوں سے یہ امر مصلحتاً پوشیدہ رکھا گیا ۔ سہزادہ عزیز کو عکہ کے باہر شاہ رچرڈ کے کیمپ میں قید کر دیا گیا تھا ۔ عکہ کے سامنے مسلمانوں اور عیسائیوں کی جنگ زوروں پر تھی ، شام کو جب التوائے جنگ کے بعد سلطان اپنے خیمے میں پہنچا تو اس کے بھائی ملک العادل کی موجودگی میں ورجنا حاضر ہوئی ۔ اس نے رچرڈ سے اپنا رشتہ چھپاتے ہوئے باقی سب داستان سنا دی اور سہزادے کی رہائی کے لیے ایک تجویز پیش کی جسے ملک العادل کی مخالفت کے باوجود سلطان نے قبول کر لیا اور ورجنا کو مسلمان سپاہی کے لباس میں رچرڈ کے کیمپ میں بھیجا دیا گیا ۔

شاہ رچرڈ بیماری کی وجہ سے بہت ضعف محسوس کر رہا تھا اور عیسائیوں کی ناکامیوں نے اسے چڑ چڑا بنا دیا تھا ، ورجنا جب مسلمان سپاہی کے بھیس میں رچرڈ کے خیمے میں پہنچی تو اسے حیرت آمیز خوشی ہوئی ۔ اسی نشست میں ایک فوجی افسر نے رچرڈ کو یہ خوش خبری سنائی کہ جزیرہ سسلی سے دو سو جہاز دو لاکھ فوج لے کر ان کی کمک کو آ پہنچے ہیں ۔ اس پر رچرڈ نے فخر و مسرت سے کہا کہ عکہ کے دو برس کے محاصرے کا کل ہی خاتمہ ہو جائے گا البتہ اسے یہ معلوم کر کے دکھ ہوا کہ مسلمانوں نے گذشتہ شب اس بیڑے پر اچانک حملہ کر کے تین جہازوں کو ڈبو دیا اور ایک کو پکڑ لے گئے ، اس طرح چھ سات ہزار سپاہی ضائع ہوئے ۔

دوسری صبح جنگ شدید تھی ۔ عیسائیوں کی تعداد چار لاکھ تھی ۔ شاہ رچرڈ خود بھی میدان جنگ میں تھا ۔ اسی اثناء میں ورجنا ایک فرانسیسی افسر کو بہلا پھسلا کر اس خیمے تک پہنچ گئی جہاں سہزادہ عزیز اور آسیہ قید تھے ۔ ورجنا نے خیمے کے باہر کھڑے ہو کر ایک زرد رومال زور زور سے لہرایا اور میدان جنگ سے اچانک کچھ مسلمان عیسائیوں کی صفوں کو درہم برہم کرتے ہوئے اس خیمے کی طرف بڑھے ۔ ان سپاہیوں میں سب سے آگے سلطان کا بھائی ملک العادل تھا ۔ خیمے پر متعین فوجی سپاہی اور افسر بھاگ نکلے ۔ ملک العادل نے سہزادے کو زنجیروں سے آزاد کیا ، اور آسیہ کو بھی ساتھ لیا اور صفوں کو چیرتے پھاڑتے واپس اپنے کیمپ میں پہنچ گئے ۔

اس روز شام تک جنگ میں عیسائیوں کے قدم اکھڑ گئے ۔ مسلمانوں نے ان کے کیمپ پر قبضہ کر لیا لیکن عیسائی بھاگ کر مارتے کاٹتے عکہ میں داخل ہو گئے ۔ سلطان عکہ پر عیسائیوں کے قبضے سے بہت ملول تھا ۔ جب واپس کیمپ میں لوٹا تو ورجنا اس وقت تک

مشرف بہ اسلام ہو چکی تھی ۔ سلطان کے حکم سے شہزادہ عزیز اور ورجنا کی باہمی رضامندی پر ابو طاہر مفتیٔ عسا کر نے دونوں کا نکاح پڑھا دیا ۔

اس شادی کے بعد سلطان نے شہزادہ عزیز اور ورجنا کو ایک سو سواروں کے حفاظتی دستے کے ساتھ مصر روانہ کر دیا ۔ یہ قافلہ بحیرہ روم کے ساحل کے ساتھ ساتھ اطاہری کے گاؤں سے ہو کر وادی الاحل کے سنگستانی درے سے گذرتا ہوا شہر انلط میں پہنچا جو بالکل ساحل سمندر پر آباد تھا ۔ وہاں سے روانہ ہو کر امرطرفون سے کچھ آگے نکلے تو پیغام ملا کہ رچرڈ کنفہ کے اسلامی کیمپ پر قبضہ کر چکا ہے اور اب عسقلان کی طرف بڑھ رہا ہے ۔ اس نے عکہ پر قبضہ کے بعد وہاں کے سب مسلمانوں کو قتل کرا دیا تھا حالانکہ سلطان نے بھی قسم کھائی ہے کہ جو عیسائی ملے گا ، اسے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا ۔ امیر سلطان نے پہلے تو اپنا کیمپ عکہ سے شوف عامر منتقل کر دیا تھا لیکن اب وہ عسقلان کی طرف روانہ ہو گیا ہے ۔

اس صورت حال کے پیش نظر شہزادے نے آگے بڑھنے کی بجائے طرطورہ کی شمالی جانب جزیزہ نما پر بنے ہوئے ویران قلعہ ، قلعۃ العتیق میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا ۔ ساتھیوں کو وہاں ٹھہرا کر شہزادہ خود طرطورہ گیا اور شہریوں کو شہر خالی کرنے کی ہدایت کر کے واپس آ گیا ۔

اسی شب آدھی رات کے بعد عیسائیوں کے پندرہ بیس جہاز ، پندرہ ہزار سپاہی لیے وہاں آ پہنچے ۔ عیسائی خوش تھے کہ سلطان کے پہنچنے سے پہلے وہ طرطورہ پر قبضہ کر لیں گے ۔ چنانچہ پانچ ہزار سپاہی قلعۃ العتیق میں داخل ہو کر اس کی شکستہ دیواروں کی مرمت اور مورچہ بندی میں مصروف ہو گئے ۔ باقی دس ہزار طرطورہ میں داخل ہوئے لیکن شہر کو لوگوں سے خالی پا کر لوٹ مار کر کے متحیر واپس قلعہ میں آ گئے ۔

علی الصباح سلطان صلاح الدین نے لشکر سمیت وہاں پہنچ کر قلعۃ العتیق کا محاصرہ کر لیا ۔ دو ہزار عرب ، کشتیوں کے ذریعے ، عیسائی جہازوں پر جا چڑھے اور جہاز پر موجود عملہ اور سپاہیوں کو سلطان کے حکم سے قلعہ والوں کو دکھا دکھا کر قتل کر کے سمندر میں پھینک دیا ۔ دس ہزار عیسائی یہ منظر دیکھ کر جوش میں مرنے مارنے کے لیے قلعے سے باہر نکل آئے ۔ باقی پانچ ہزار قلعے کے برجوں اور فصیلوں پر کھڑے نگہداشت کرتے رہے ۔ جنگ زور شور سے ہو رہی تھی کہ طرطورہ کے جنوب مشرق کی پہاڑیوں سے "یا نصراللہ ابرل" کی تکبیر بلند ہوئی اور پہاڑوں میں چھپے ہوئے اہل طرطورہ عیسی فرستوں کی طرح عیسائیوں پر ٹوٹ پڑے ۔ اس کے ساتھ ہی قلعے کے اندر سے بھی تکبیر کی آواز بلند ہوئی جس نے سب کو حیرت میں ڈال دیا ۔ یہ شہزادہ عزیز اور اس کے ساتھی تھے جو سر شام سے قلعہ کے تہہ خانوں میں چھپے بیٹھے تھے ۔ اب قلعہ کے اندر بھی جنگ ہو رہی تھی اور اسی دوران سلطان اپنے لشکر سمیت قلعے میں داخل ہو گیا ۔ پھاٹک بند کر دیے گئے اور پورے پندرہ ہزار مسیحی قلعے میں گھیر کر قتل کر ڈالے گئے ۔

شاہ رچرڈ کا خیال تھا کہ اس کے سپاہی طرطورہ پر قبضہ کر کے قساریہ کی طرف بڑھ رہے ہوں گے ، چنانچہ وہ خود بھی خاص جنگی جہازوں کا بیڑہ لے کر دوسری صبح تک قساریہ کے قدیم قلعے کے قریب پہنچ گیا ، لیکن اسے یہ سن کر سخت صدمہ ہوا کہ طرطورہ پر حملے کے لیے بھیجی ہوئی تمام عیسائی فوج قتل ہو چکی ہے ۔ رچرڈ نے قلعے میں پڑاؤ ڈال کر اس کی دیواروں کو مضبوط بنانے اور اس کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیا ۔ اس کے ہمراہ چالیس

ہزار سپاہی تھے جن میں سے دس ہزار نے صبح ہوتے ہی قیساریہ کا محاصرہ کر لیا ۔ اہل شہر بمشکل شہر کے پھاٹک بند کر سکے اور موت کا سامنا کرنے سے پہلے مساجد میں جا کر فریضہ نماز ادا کرنے لگے ۔ اتنے میں مصری فوج کا پہلا نشان نظر آیا ۔ اس فوج میں شہزادہ عزیز کے علاوہ سلطان کا دوسرا بیٹا شہزادہ افضل بھی شامل تھا ۔ فوج کی کمان سلطان کا غلام ایاز الطویل کر رہا تھا ۔ عیسائی قیساریہ کا محاصرہ ترک کرکے ان کی طرف متوجہ ہوئے ، تھوڑی دیر میں سلطان خود بھی بقیہ لشکر کے ساتھ آ پہنچا ۔ ادھر قلعے سے باقی مسیحی لشکر بھی نکل آیا اور زوروں کی جنگ شروع ہو گئی ۔ ایاز الطویل کے مارے جانے سے اس کے ہمراہیوں کے قدم اکھڑ گئے ۔ سلطان نے بہت سنبھالنا چاہا لیکن مسلمان قیساریہ کے مغربی جنگلوں کی طرف پسپا ہو گئے ۔ جنگل میں پہنچ کر سلطان نے منتشر لشکر کو پھر جمع کیا اور پیشتر اس کے کہ عیسائی قلعے میں داخل ہوتے ان کے سر پر جا پہنچا ۔ دوبارہ ایک زبردست معرکہ ہوا اور ڈیڑھ گھنٹے کے اندر عیسائی شکست کھا گئے ۔ بہت سے قتل ہوئے ، کئی جان بچا کر بھاگ نکلنے کی کوشش میں سمندر میں ڈوب گئے ۔ رچرڈ اس نازک صورت حال سے گھبرا کر قلعے کی پچھلی دیوار توڑ کر جہاز میں سوار ہو کے نکل بھاگا ۔

اس جنگ میں قتل ہونے والے عیسائیوں کے علاوہ تیرہ ہزار قید ہوئے جن کو سلطان کی قسم پوری کرنے کے لیے قتل کرکے سمندر میں پھینک دیا گیا ۔ اگرچہ سلطان اس منظر کو دیکھ کر خود آبدیدہ تھا کہ ان بے بسوں کے ساتھ ویسی ہی ہمدردی کی جائے جیسی بیت المقدس کے عیسائیوں کے ساتھ کی تھی مگر رچرڈ کی بربریت نے اسے بھی سنگدل بنا دیا تھا ۔

قیساریہ کے اس معرکے میں جو عورتیں قید ہوئیں ، ان میں کچھ شاہی خاندان کی خواتین بھی تھیں لیکن رچرڈ کی اس بہن کو جس نے رچرڈ کے کہنے کے باوجود ملک العادل سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا ، ورجنا کے سپرد کر دیا گیا کیونکہ ورجنا نے اس کے لیے معافی کی درخواست کی تھی ۔ سلطان بہت بڑی فوج کے ساتھ قیساریہ سے آگے بڑھ گیا لیکن شہزادہ عزیز کچھ فوج کے ساتھ وہیں ٹھہرا رہا ۔ اسی دوران رچرڈ کی بہن نے اپنی لونڈی الویرا کے ذریعے عیسائیوں سے ساز باز کرکے انہیں قیساریہ کے قریب پہاڑیوں پر بلایا اور خود ورجنا اور آسیہ کو سیر کے بہانے ساتھ لے جا کر گرفتار کرا دیا ۔ اسی دن دو قاصد شہزادہ عزیز کے پاس سلطان کا یہ پیغام لائے تھے کہ وہ یافہ پہنچ کر فوج کی کمان سنبھالے کیونکہ سلطان خود یافہ میں عیسائیوں کے ساتھ کئی جھڑپوں کے بعد عسقلان کی حفاظت کے لیے چلا گیا تھا ۔ انہیں قاصدوں کے ذریعہ شہزادہ عزیز کو قیساریہ کی گھاٹیوں میں مسیحی فوجی دستے کی نقل و حرکت اور ورجنا کی گرفتاری کا علم ہوا ۔

یافہ میں پہلے تو سلطان نے عیسائیوں کو مغلوب کر لیا تھا لیکن دوسری لڑائی میں عیسائیوں نے مسلمانوں کو شکست دے دی تھی اور جب سلطان نے یہ سنا کہ عیسائی عسقلان کی طرف بڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو وہ عجلت میں عسقلان کی طرف روانہ ہو گیا ۔ سلطان اس اہم اور آباد شہر کو کسی طرح عیسائیوں کے قبضے میں دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا تھا — یافہ میں کل سولہ ہزار مسلمان فوج تھی جس پر شہزادہ عزیز کو افسر مقرر کیا گیا ۔

شہزادہ عزیز یافہ پہنچ کر بڑی بے جگری سے لڑتا ہوا عیسائیوں کے خیموں میں جا گھسا ۔ ہر طرف تلاش کے باوجود ورجنا نہ مل سکی ۔ اس روز عیسائیوں کو شکست ہوئی ،

پانچ ہزار مرد اور تین ہزار عورتیں بچے زندہ گرفتار ہوئے ، انھیں میں آسمہ بھی تھی -

شاہ رچرڈ اب ان جنگوں سے بہت بد دل تھا اور چاہتا تھا کہ سلطان صلح قبول کر لے تاکہ وہ یورپ میں سرخرو واپس جا سکے لیکن صلح سے پہلے وہ عسقلان کے مقام پر سلطان کے ساتھ ایک بار قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا ، اسی اثنا میں اسے معلوم ہوا کہ سلطان نے اس خیال سے کہ عسقلان کی حفاظت مشکل ہو گی اسے تباہ کرا دیا ہے - اس وقت رچرڈ کا کیمپ یافہ سے دس میل مشرق کی طرف عسقلان جانے والے راستے پر تھا - اسی مقام سے اس نے ورجنا کو سخت پہرے میں دے کر عکہ روانہ کیا اور حکم دیا کہ اسے رچرڈ کی واپسی تک روزانہ پچاس کوڑے لگائے جائیں اور کسی سے ملنے نہ دیا جائے -

شاہ رچرڈ نے اس مقام سے فوج کو رملہ کی طرف کوچ کا حکم دیا اور خود پانچ سو سواروں کے ساتھ رملہ کے لیے وہ راستہ اختیار کیا جہاں ایک چھوٹے سے گاؤں میں پانچ سو مسلمان سپاہیوں کی موجودگی کی خبر ملی تھی - سلطان اس وقت تک عسقلان کو نیست و نابود کر کے بیت المقدس پہنچ چکا تھا اور وہاں حفاظتی انتظامات مکمل کر رہا تھا - رچرڈ کو مسلمانوں کی جس تھوڑی سی فوج کی خبر ملی تھی وہ ملک الافضل کی سربراہی میں رسد جمع کرنے آئی تھی - رچرڈ نے اچانک حملہ کر کے اس فوج کو بھاگنے پر مجبور کر دیا اور ان کا تعاقب کیا حتیٰ کہ سب ایک ایسے محصور میدان میں جا پہنچے جس کے چاروں طرف پہاڑ تھے - رچرڈ نے مسلمانوں کو گھیر کر قتل کر دینے کا حکم دیا لیکن اس سے پہلے ہی مسلمان خود پلٹ پڑے اور تھوڑی دیر میں ساڑھے تین سو عیسائیوں کو قتل کر دیا - باقی ڈیڑھ سو سے مقابلے کے لیے تین سو چونسٹھ مسلمان ابھی زندہ تھے اور اب انھوں نے عیسائیوں کی واپسی کے راستے کو روک کر انھیں محصور کر لیا تھا - رچرڈ اس نازک صورت حال کو بھانپ گیا لیکن وہ بچ کر نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور اپنے چھبیس بقیۃ السیف سپاہیوں کے ساتھ قید ہو گیا -

اس معرکے سے فراغت پا کر یہ گروہ قیدیوں سمیت پھر گاؤں میں گیا اور رسد جمع کر کے یافہ کی طرف روانہ ہوا - ابھی تین چار میل کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ شہزادہ عزیز سے ملاقات ہوئی جو عیسائیوں کی خبر پا کر یافہ سے دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ بھائی کی مدد کے لیے آیا تھا - شہزادہ عزیز نے ملاقات کے بعد قیدیوں کو دیکھے بغیر ان کے قتل کا حکم دیا ہی تھا کہ عیسائیوں کا لشکر جرار آ پہنچا جس نے فدیہ پر اپنے قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا - شہزادہ عزیز تو نہ مان رہا تھا لیکن ملک الافضل کے کہنے سننے پر اس نے دس لاکھ روپے لے کر قیدی واپس کر دیے اور وعدہ کیا کہ رملہ پہنچنے تک ان پر حملہ نہ ہو گا - بعد میں جاسوسوں نے اطلاع دی کہ قیدیوں میں خود رچرڈ بھی تھا ، اس پر سب کو افسوس ہوا لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا -

عکہ میں شہزادی ورجنا کو روزانہ مجوزہ سزا ملتی تھی ، حراستی گارد کے سپاہی اور افسر اس بہیمانہ سزا سے نالاں تھے - آخر گارد کا افسر (جارج) ایک دوسرے افسر کی ایما پر یوشع نامی پادری کو خفیہ طور پر ورجنا کے پاس لے آیا - یوشع کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہر آدمی کو بحث کے ذریعے قائل کر کے عیسائی بنا سکتا ہے - یوشع کی تجویز پر شہزادی کی روزانہ کی سزا موقوف کر دی گئی اور اسے شہزادی کے پاس اسی عمارت میں ٹھہرا دیا گیا - ایک

روز ورجنا کی گفتگو میں عیسائیت کا میلان پا کر جارج نے یوشع کی خواہش کے مطابق ایک خط رچرڈ کے نام لکھ دیا ۔ رچرڈ ساحل رملہ پر خیمہ زن تھا ۔ اس کے اکثر سپاہی بیمار تھے اور اسے افسوس تھا کہ سلطان نے اسے کہیں بھی خشکی پر دس میل بھی اندر نہیں بڑھنے دیا ۔ جب افسروں نے اسے بیت المقدس پر حملے کے لیے آمادہ کرنا چاہا تو اس نے بیت المقدس کا نقشہ سمجھ کر صاف کہہ دیا کہ اس شہر کا محل وقوع ایسا ہے کہ محاصرہ کر کے اسے ہرگز فتح نہیں کیا جا سکتا ۔ یہاں رملہ میں یوسع رچرڈ سے ملا اور دعویٰ کیا کہ وہ رچرڈ کے سامنے ورجنا سے بحث کر کے اسے عیسائی بنا سکتا ہے ۔ نیز سلطان کے بھائی ملک العادل سے اس کی اس زمانے سے رسم و راہ ہے جب کہ ملک العادل طائر کا گورنر تھا ، اس لیے اس کے کہنے پر صلح بھی ہو سکتی ہے ۔ رچرڈ سے اس نے اپنی بھی کچھ شرطیں بیان کر کے وعدہ لیا ۔ چنانچہ ورجنا کو عکہ سے لانے اور یوسع کے آزادی سے لشکر گاہ میں آنے جانے کا حکم دے دیا گیا ۔

ملک الافضل نے ملک العادل کو بتایا کہ شہزادہ عزیز صور پر عیسائیوں کے حملے کی خبر پا کر دس ہزار لشکر کے ساتھ گیا تھا لیکن ابھی تک نہیں لوٹا ۔ یہ دونوں بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ یافہ سے رملہ جانے والی سڑک کی ناکہ بندی کیے ہوئے تھے ، انھیں معلوم ہوا کہ پانچ سو عیسائیوں کا ایک گروہ نہرالارسوف پار کر کے رملہ کی طرف جا رہا ہے ۔ انھوں نے اس گروہ پر اچانک حملے کر کے ڈیڑھ سو مسیحی قتل اور دو سو گرفتار کر لیے ۔ بھاگنے والوں کے تعاقب میں گئے ہوئے مسلمان جب لوٹے تو ایک عیسائی کو ملک العادل کے پاس لائے جو اس کے لیے ایک خط لایا تھا ۔ ملک العادل نے خط پڑھ کر ملک الافضل کو دیا اور بتایا کہ وہ ایک خاص معاملے میں یوسع کا احسان مند ہے اور اب رچرڈ کی صلح کی پیش کش قبول کرنے کے لیے خود ہی سلطان سے بات کرے گا ۔ پھر ملک العادل نے اسی عیسائی کو یوسع کے نام ایک تسلی بخش خط لکھ دیا جس کے مطابق ہفتہ بھر کے اندر صلح ہونے کا یقین دلایا تھا ۔

مقررہ روز یوسع کے خط کے مطابق ملک العادل اور ملک الافضل پانچ ہزار سواروں کے ساتھ رچرڈ کے کیمپ میں گئے ۔ اس نے اپنے خیمے کے باہر ان کا استقبال کیا ۔ صلح نامے پر فریقین کے نمائندوں نے دستخط کیے اور اسی وقت ورجنا دربار میں حاضر ہوئی ۔ یوشع نے بحث کر کے اسے عیسائی مذہب کا قائل کر دیا اور وہ عیسائی ہو گئی ۔ رچرڈ نے حسب وعدہ اس کا یوسع سے نکاح پڑھا دیا ۔ نکاح کی رسم کے فوراً بعد یوسع نے کہا کہ وہ یوسع نہیں ملک العزیز ہے ، ورجنا نے از خود دوبارہ کلمۂ توحید پڑھتے ہوئے کفر سے توبہ کی ۔ معاہدے پر ملک العزیز نے بھی دستخط کیے اور تمام عیسائیوں کو متحیر چھوڑ کر ملک العزیز ، ورجنا ، ملک الافضل اور ملک العادل اپنے لشکر سمیت عیسائی کیمپ سے واپس آ گئے ۔

ناول کے واقعات کا تحقیقی جائزہ

شرر ملک العزیز ورجنا کے پہلے باب "لڑائی" کا آغاز اس فقرے سے کرتے ہیں : "پنج شنبہ ۴ جمادی الثانی ۵۸۷ھ کو اندازاً دن کے تین بجے ایک مختصر فوج اس سڑک پر جا رہی ہے

جو ناصرہ سے عکہ کو گئی ہے۔" (ص ۶۷)۔ شرر کے اس بیان میں سب سے پہلی قابل توجہ بات ۴ جمادی الثانی ۵۸۷ھ کی تاریخ ہے۔ گویا شرر ناول میں اس تاریخ کے بعد کے واقعات قلمبند کر رہے ہیں لہٰذا ہمیں ان واقعات کی زمانی ترتیب کو اسی تاریخ کے حوالے سے دیکھنا پڑے گا۔

۴ جمادی الثانی ۵۸۷ھ کو عیسوی کیلنڈر کے مطابق ۲۹ جون ۱۱۹۱ء تاریخ تھی۔ شرر ۴ جمادی الثانی ۵۸۷ھ کو پنج شنبہ بیان کر رہے ہیں لیکن ۲۹ جون ۱۱۹۱ء کو ہفتہ تھا اور مختلف کیلنڈروں کے مطابق ہفتہ ہی بنتا ہے۔ شرر کے بیان کی تائید میں کہا جا سکتا ہے کہ تاریخوں میں بسا اوقات ایک آدھ دن کا فرق پڑ جاتا ہے لیکن ہمیں ہفتے کے دن پر اس لیے بھی اصرار ہے کہ مختلف دیگر ذرائع بھی اسی بات کی تائید کرتے ہیں مثلاً تمام یورپین مورخ عکہ کی شکست کی تاریخ ۱۲ جولائی ۱۱۹۱ء اور جمعہ کا دن بتاتے ہیں[1]، اور تمام مسلم مورخین بھی تاریخ ہجری سنہ کے مطابق ۱۷ جمادی الثانی ۵۸۷ھ اور جمعہ کا دن بیان کرتے ہیں۔ کیلنڈر کے مطابق یہ بالکل صحیح ہے کہ ۱۲ جولائی ۱۱۹۱ء کو ۱۷ جمادی الثانی اور جمعہ کا دن تھا۔ اس لیے صاف ظاہر ہے کہ ۴ جمادی الثانی ۵۸۷ھ کو پنج شنبہ نہیں بلکہ ہفتہ تھا۔ مذکورہ بالا اقتباس میں شرر نے ناصرہ سے عکہ جانے والی سڑک کی جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ جغرافیائی طور پر درست ہیں[2]۔ نیز ناصرہ کے متعلق حاشیہ (ص ۶۷) میں جو تفصیلات درج ہیں، وہ بھی درست ہیں اور ناصرہ کا عکہ سے فاصلہ تقریباً اتنی میل ہی ہے[3]۔

زیر بحث بیان میں شرر نے جس مختصر سی فوج کا ذکر کیا ہے اس کے سردار کی عمر ۲۱، ۲۲ برس بتائی ہے (ص ۷۱) یہ اندازہ صحیح ہے کیونکہ تیسری صلیبی جنگ کے دوران سلطان صلاح الدین ایوبی کے دونوں بڑے بیٹوں کی عمر ۲۱، ۲۲ برس ہی تھی[4]۔ یہ فوج جب بحرالجوس کے مقام پر پہنچتی ہے تو ایک ترک جو سوف عامر کا باشندہ تھا اس نوجوان سردار سے ملتا ہے۔ اس ترک کے بیان کے مطابق "کل صبح (یعنی ۳ جمادی الثانی ۵۸۷ھ کو) افرنجوں کے ایک گروہ نے اس قصبے پر قبضہ کر لیا اور تمام زن و مرد تہ تیغ ہو گئے (ص ۶۷)"، لیکن یہ بات تاریخی لحاظ سے صحیح نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دوسری صلیبی جنگ سے پہلے سوف عامر پر فرنگیوں کا قبضہ رہا اور چونکہ یہ مقام جنگی اہمیت کا حامل تھا اس لیے انھوں نے یہاں کے قلعے کو خاصا استحکام دے رکھا تھا لیکن دوسری صلیبی جنگ سے پہلے ہی اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور اس پوری جنگ کے دوران عیسائیوں کو کبھی بھی

۱- (i) Stanley Lane Poole *Saladin and the fall of Jerusalem*، ص ۲۹۸ -
(ii) T A Archer *The Crusades*، ص ۳۲۶ -
(iii) ایضاً . *The Crusades of Richard I*، ص ۱۰۱ -
(iv) E Gibbon *The History of the Decline and fall of the Roman Empire*
۲، ۳- لین پول، ٹی اے آرچر وغیرہ کی صلیبی جنگوں سے متعلق کتابوں میں دیے گئے نقشہ جات اور Le-Strange . *Palestine under Moslems* و *Harvard Historical Atlas of the Muslim people*
۴- لین پول، آرچر کی مذکورہ کتب اور ہیرلڈلیم کی کتاب صلاح الدین ایوبی و قاضی بہاء الدین ابن شداد کی کتاب "النوادر السلطانیہ و المحاسن الیوسفیہ" میں دیے گئے سلطان کی اولاد کے شجرے۔

اس پر قبضہ کر لینے کی توفیق نہیں ہوئی ۔ سلطان صلاح الدین نے عیسائیوں کو کہیں بھی ساحل سے دس بارہ میل سے زیادہ خشکی پر اندر بڑھنے نہیں دیا اور رچرڈ یہ حسرت دل ہی میں لیے واپس انگلستان چلا گیا ۔

اسی ترک کی زبانی ایک واقعہ بیان ہوا ہے ، وہ کہتا ہے :

''ترک : حضرت وہ بڑے ظالم بڑے جلاد ہیں ۔ ان میں کہیں نام کو رحم نہیں ، ان کے بڑے سردار نے سلطان صلاح الدین کے ساتھیوں کو دکھا دکھا کر دو ہزار سات سو ترکوں کے سر کاٹ کے پھینک دیے ۔''

نوجوان : (غضبناک ہو کر) یہ کب ؟

ترک : ابھی چار ہی روز تو ہوئے —'' (ص ۷۷)

شرر کے اس بیان کے مطابق گویا ۴ جمادی الثانی ۵۸۷ھ سے چار روز پہلے یہ واقعہ پیش آیا ۔ سلطان ان دنوں (۲۴ ، ۲۵ جون ۱۱۹۱ء کو) عکہ کے سامنے مسیحی محاصرین سے نبرد آزما تھا لیکن کوئی تاریخ بھی جون ۱۱۹۱ء کے آخری ہفتے میں کسی ایسے واقعے کی نشان دہی نہیں کرتی ۔ نیز جون کے آخری ہفتے میں عیسائیوں کو نہ تو عکہ والوں پر اور نہ سلطان کی فوج پر کوئی ایسی بالا دستی حاصل تھی کہ وہ اس قدر دیدہ دلیری کا مظاہرہ کر سکتے اور مسلمان بے بسی سے اس کا تماشا کرتے ۔ شرر نے مقتولین کی جو تعداد بتائی ہے وہ دراصل مقتولین عکہ کی تعداد ہے ۔ اکثر مورخین اور خصوصاً معاصر مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ عکہ پر جب عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا تو اس کے ایک ماہ بعد رچرڈ کے حکم سے ۲۷۰۰ ترکوں کو قلعے سے باہر لا کر قتل کر دیا گیا[1] ، سلطان کی فوج کے سپاہی اس ہجوم کو دیکھ رہے تھے ، جب انھیں اصل بات کا علم ہوا تو وہ اپنے ہم مذہب بھائیوں کی جان بچانے کے لیے دیوانہ وار عیسائیوں پر ٹوٹ پڑے ۔ رات گئے تک معرکہ خیز لڑائی ہوتی رہی لیکن وہ ان بے گناہوں کو اس ظلم کا شکار ہونے سے بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے ۔ شرر نے مقتولین کی یہ تعداد جون ۱۱۹۱ء کے آخری ہفتے سے منسوب کر کے تاریخ میں ایسا زمانی تصرف کیا ہے جو نہ تاریخ روا رکھ سکتی ہے اور نہ تاریخی ناول نگاری کا فن ایسے تصرف کا متحمل ہو سکتا ہے ۔ یہ واقعہ دراصل ۱۶ اگست ۱۱۹۱ء کا ہے[2] ، اور اس تاریخ پر اکثر مورخین کا اتفاق ہے ، اگرچہ بہاء الدین ابن شداد نے ۲۰ اگست ۱۱۹۱ء لکھا ہے[3] جو صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ابن شداد بھی جمعہ کا دن بتاتا ہے اور جمعہ ۲۰ اگست کو نہیں ۱۶ اگست کو تھا ۔ بہرکیف یہ ڈیڑھ ماہ کا زمانی تصرف موزوں نہیں کیونکہ شرر نے اس کے بعد عکہ کی شکست کے بیان تک تین ابواب اور بھی لکھے ہیں اور اس طرح وہ سب بعد از وقت ہو جاتے ہیں، نیز شوف عامر کے مقام پر اس مسلمان فوج کا عیسائیوں سے مقابلہ کرنا اور عیسائیوں کا ایک ہزار نو سو لاشیں چھوڑ کر میدان جنگ سے بھاگ نکلنا تاریخ سے ثابت نہیں ۔

شرر نے اس معرکے میں عیسائی فوج کے سردار کا نام ڈی فرس ارل آف ڈربی لکھا ہے

۱- (I) لین پول ، ص ۲۹۸-۳۰۸ ؛ (II) ٹی اے آرچر ' دی کروسیڈز ، ص ۳۲۶-۳۳۱ ' (III) ایضاً ' دی کروسیڈ آف رچرڈ I ، ص ۱۰۱-۱۲۷ ' (IV) گبن : جلد ۷ ، ص ۴۲۵ -

۲- ایضاً ۔ ۳- ابن شداد ، ص ۱۶۴ -

نیز یہ سردار ملک العزیز کے ہاتھوں قتل ہوتا دکھایا گیا ہے۔ شرر نے اس کے حلیے، لباس اور جنگی ساز و سامان کا ایک مفصل بیان دیا ہے۔ ہم یہاں اس کا اندراج ضروری تصور نہیں کرتے کیونکہ اس میں بہت سی جزئیات خیالی ہیں۔ یہاں صرف یہ امر قابل ذکر ہے کہ شرر نے اس مسیحی کے بارے میں حاشیے میں لکھا ہے "انگلستان سے جو لوگ بیت المقدس کی لڑائی پر رچرڈ کے ساتھ آئے تھے، ان میں سے یہ ایک بہادر شخص تھا اور اسی گاؤں کے قریب مارا گیا۔" اس بیان میں جو باتیں قابل ذکر ہیں وہ یہ کہ یہ ڈی فرس ارل آف ڈربی بلا شبہ انگلستان سے تعلق رکھتا تھا لیکن یہ رچرڈ کی آمد سے پہلے ۱۱۹۰ء میں عکہ پہنچنے والی فوج کے ہمراہ تھا۔ گبن نے عکہ کے محاصرے کے عیسائی مقتولین میں اس انگریز افسر کا ذکر کیا ہے[1]۔ لیکن جیسا کہ شرر نے اسے سوف عامر کے قریب قتل ہوتا دکھایا ہے، درست نہیں اور نہ اس پر غالب آنے والے مسلمان کا نام صحیح ہے نیز ڈی فرس ارل آف ڈربی کے قتل کا بیان کردہ زمانہ بھی صحیح نہیں کیونکہ آرکبشپ نے جو خط عکہ سے کینٹربری ۲۱ اکتوبر ۱۱۹۰ءکو بھیجا اس میں ۲۵ جولائی ۱۱۹۰ء کو مارے جانے والے عیسائی افسروں کے ضمن میں اس افسر کا ذکر بھی بڑے افسوس کے ساتھ کیا ہے[2] لیکن شرر نے اسے جون ۱۱۹۱ء میں قتل ہوتا دکھایا ہے جو صحیح نہیں۔

یہاں یہ امر بھی خاص توجہ کا مستحق ہے کہ سوف عامر کے اس معرکے میں جو نوجوان مسلمان فوج کی قیادت کر رہا ہے وہ عیسائی سالار کو اپنا نام بتاتے ہوئے کہتا ہے: "میں سلطان صلاح الدین کا بڑا بیٹا عزیز نور الدین ہوں" (ص ۸۶)۔ یہی نام سلطان کی زبانی بھی اس نوجوان کے متعلق دہرایا گیا: "یہ سب میرا بیٹا عزیز نورالدین ہی ہوگا" (ص ۱۵۷)۔ پھر پندرھویں باب میں لکھا ہے: "ملک الافضل نہایت ادب سے اپنے بڑے بھائی سے ملا" اور ناول کے اختتام پر بیسویں باب میں یوسف جب اپنی اصلیت ظاہر کرتا ہے تو کہتا ہے کہ "افضل پہلے ایک عمر تھا، اب میرا چھوٹا بھائی ہے، میں پہلے یوسف تھا اب سلطان صلاح الدین کا بڑا بیٹا (عزیز نورالدین) ہوں" غالباً اس ناول کی سب سے بڑی تاریخی غلطی یہی ہے کہ ناول کا ہیرو ملک العزیز نور الدین سلطان صلاح الدین کا بڑا بیٹا اور ملک الافضل سلطان کا چھوٹا بیٹا بیان کیا گیا ہے حالانکہ سلطان کے کسی بیٹے کا نام ملک العزیز نور الدین نہیں تھا۔ سلطان کے بڑے بیٹے کا نام ملک الافضل نورالدین ابوالحسن علی تھا جو ۵۶۵ھ (۱۱۷۱ء) میں پیدا ہوا اور صلیبی جنگوں میں اپنے باپ اور چچا کے ہمراہ پر جوش حصہ لیتا رہا۔ تیسری صلیبی جنگ کے وقت اس کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کا انتقال ۱۲۲۵ء میں دمشق میں ہوا۔ سلطان کے دوسرے بیٹے کا نام ملک العزیز ابوالفتح عثمان عماد الدین تھا جو جمادی الاول ۵۶۷ھ (۱۱۷۲ء) میں پیدا ہوا اور ۲۹ نومبر ۱۱۹۸ء کو انتقال کر گیا[3]۔ ملک العزیز ابوالفتح عثمان تیسری صلیبی جنگ کے زمانے میں مصر میں ہی قیام پذیر رہا اور جنگ میں شریک

۱- گبن: جلد، ص ۲۵۴ بحوالہ Dugda'e, Baronage part I، ص ۲۶۰۔ ۲- بحوالہ آرچر،

۳- لین پول، ص ۲۰۱ و جدول II، آرچر: دی کروسیڈ، ص ۵۶۴ و جدول V، ابوالفدا: تاریخ (ترجمہ) ج ۲، ص ۳۸۷-۳۸۹، محمد صادق حسین صدیقی: تاریخ اسلام، ص ۸۸۷، فصیح الدین احمد: سوانح سلطان صلاح الدین اعظم، ص ۲۹۳، مولوی سراج الدین احمد: حیات صلاح الدین، ص ۲۳۷۔

نہ ہوا ۔ سلطان نے اسے ملک العادل کے ہمراہ مصر بھیج دیا تھا پھر جنگ کے دوران ملک العادل تو سلطان کے بلانے پر آ کر جنگ میں شریک ہو گیا لیکن ملک العزیز ابوالفتح عثمان انتظامی امور کی نگرانی کے لیے مصر ہی میں مقیم رہا ۔ سلطان کی وفات تک وہ نائب کی حیثیت سے کام کرتا رہا اور اس کے بعد مصر کا خود مختار حکمران بن گیا[1] ۔

اس صورت میں یہ کہنا مشکل ہے کہ شرر کے اس ناول کا ہیرو سلطان کا کون سا بیٹا ہے کیونکہ انھوں نے سلطان کے دونوں بیٹوں کے ناموں کا ایک ایک حصہ لے کر ایک نیا نام بنا لیا ہے ۔ حال یہی ہے کہ یہ تسامح ملک الافضل نورالدین کے سلسلے میں ہوا کیونکہ جنگ میں ملک الافضل ہی حصہ لیتا رہا تھا اور شرر اپنے ہیرو کو سلطان کا بڑا بیٹا بتاتے ہیں اس لیے وہ ملک الافضل نورالدین ہو سکتا ہے نہ کہ ملک العزیز ابوالفتح عثمان ۔

ورجنا کا کردار اور شہزادہ عزیز سے اس کی اتفاقیہ ملاقات ، شہزادے کا عیسائیوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر قید ہو جانا اور ورجنا کا بدوی کے ذریعے شہزادے کے کیمپ میں پہنچ جانا ، پھر ورجنا کا سلطان کے پاس پہنچ کر شہزادہ عزیز کی رہائی کی کوشش کرنا اور کامیاب ہو جانا وغیرہ یہ سب واقعات تخیلی ہیں ، اس لیے ان پر تبصرے کی چنداں ضرورت نہیں ، البتہ ان واقعات کے دوران بعض باتیں تاریخی بیان ہوئیں اور قابل ذکر ہیں ۔ مثلاً شہزادہ عزیز جب ورجنا کے یہودی غلام کو قتل کر کے ورجنا کو بچا لیتا ہے تو اس یہودی کی بہن آسیہ شہزادے کو اصل بنائے مخاصمت بتاتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ انگلستان کی رہنے والی ہے اور "فی الحال بیت المقدس پر حملہ کرنے کے لیے جب وہاں سے فوج آنے لگی ، اس وقت تمام رعایا سے ٹیکس طلب کیا گیا ۔ غریب یہودی چونکہ اس کام میں دل سے مدد نہیں دے سکتے تھے اس وجہ سے ان پر بڑا ظلم کیا گیا ۔ تیس چالیس ہزار یہودی اس بے کسی سے قتل کیے گئے کہ ان کی آہ و زاری سننے والا بھی کوئی نہ تھا ۔ اے صاحب ! ہماری قوم کی بڑی بے عزتی کی گئی ۔ ہمارے مرد تہ تیغ ہوئے ، ہماری عورتیں لونڈیاں بنا لی گئیں ۔" (ص ۱۰۲) ۔

شرر نے اس بیان میں اگرچہ تھوڑا سا مبالغہ کیا ہے لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ صرف انگلستان میں ہی نہیں بلکہ یورپ میں سلطان صلاح الدین سے مقابلہ کے "جنگی اخراجات کے لیے 'صلاح الدین ٹیکس' کے نام سے ہر شخص کی دولت کا دسواں حصہ ٹیکس وصول کیا گیا ۔" اس ٹیکس کا ذکر کرتے ہوئے گبن کہتا ہے : "صلاح الدین نے یورپ سے اپنی عظمت کا جو خراج اس ٹیکس کی شکل میں لیا وہ آج تک کسی تاجدار کو نصیب نہ ہو سکا[2] ۔" اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ عیسائیوں نے یہودیوں پر اس ٹیکس کی وصولی کے سلسلے میں بہت زیادہ سختیاں کیں ۔

تیسرے باب میں ایک عیسائی عورت کے بچے کی گمشدگی کا واقعہ ضمنی طور پر بیان ہوا ہے (ص ۱۱۸-۱۱۹) جس کا مقصد سلطان صلاح الدین کی رحمدلی اور انصاف پسندی کا اظہار ہے ۔ شہزادہ عزیز کی گمشدگی پر جب اس کے ماتحت افسر مشاورت کرتے ہیں تو سلطان کی نرم دلی کا بھی ذکر چھڑ جاتا ہے اور مذکورہ واقعہ ایک افسر دوسرے افسر کو سناتا ہے ۔

۱- ایضاً ۔
۲- لین پول ، ص ۲۵۲ ۔

شرر نے یہ واقعہ جلال الدین سیوطی (حسن المحاضرہ فی اخبار المصر والقاہرہ) کے حوالے سے بیان کیا ہے اور تاریخی اعتبار سے درست ہے ، سٹینلے لین پول نے بھی واقعہ بہاء الدین ابن شداد کے حوالے سے بیان کیا ہے[1] ۔

اسی باب میں ایک اور بیان بھی تاریخی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے ۔ شہزادہ عزیز کی عدم موجودگی میں جب ایک افسر ورجنا سے یہ کہتا ہے کہ شہزادے کی بیوی بننا اس کے لیے باعث فخر ہوگا تو سوال جواب یوں ہوتا ہے ۔

نازنین : مگر میں ان باتوں کو اپنی بے عزتی سمجھتی ہوں ۔
ترکی افسر : تم سمجھا کرو ، مگر یہ وہ امر ہے جس کی تمہارے بادشاہ رچرڈ کو تمنا ہے ۔
نازنین : نہیں ہرگز نہیں ۔ ہمارا شیر دل بادشاہ اس قسم کی ذلت کو ہرگز نہ گوارا کرے گا ۔
ترکی افسر : تو تمہیں معلوم نہیں ، خود اس کی درخواست ہے کہ اس کی بہن کی شادی سلطان کے بھائی سے ہو جائے ۔ (ص ۱۲۵)

شرر اس واقعے کی تاریخی صداقت بیان کرنے کے لیے حاشیے میں لکھتے ہیں :

"اس امر کو تمام مورخین تسلیم کرتے ہیں انگریزی مشہور مورخ گبن نے اپنی ہسٹری آف رومن ایمپائر میں اس کا اعتراف کیا ہے اور عربی مورخ بھی اس واقعے کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔ ابن اثیر ، ابوالفداء اور اور مورخوں نے بہ وضاحت لکھا ہے ۔ یہ عجیب واقعہ ہے کیوں کہ رچرڈ سا بہادر بادشاہ جس پر انگلستان و آج تک ناز ہے ، آیا تو لڑنے کو اور شام میں پہنچ کر مسلمانوں کے ساتھ بہن کی شادی ٹھہرانے لگا ۔ ۔ ۔ یہ نکاح خاص اس وجہ سے نہ ہو سکا کہ رچرڈ کی بہن صلاح الدین کے بھائی سے یہ اقرار لیا چاہتی تھی کہ وہ دوسری شادی نہ کرے اور نہ کوئی حرم رکھے مگر اس زمانے کے کسی مسلمان رئیس کو بھلا یہ کب منظور ہو سکتا تھا ۔"[2]

اس واقعے کے نوٹ میں شرر نے ابوالفدا اور ابن الاثیر کے مستند حوالے پیش کر دیے ہیں اس لیے ہم تفصیل میں جانا نہیں چاہتے ، دیگر مورخین بھی اس سے متفق ہیں[3] ۔ البتہ شرر کے اس تبصرے کا آخری فقرہ قابل غور ہے کہ یہ شادی محض اس بنا پر رہ گئی کہ رچرڈ کی بہن کوئی دوسری شادی نہ کرے اور حرم نہ رکھنے کا وعدہ لینا چاہتی تھی جسے ملک العادل نے نہیں مانا ۔ بہاء الدین ابن شداد جو اس سارے واقعہ کا چشم دید گواہ ہے لکھتا ہے کہ پہلے خود شاہ رچرڈ نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ملک العادل کی شادی رچرڈ کی بیوہ بہن جونا ملکہ سسلی سے ہو جائے ، ساحلی علاقے عکہ ، یافہ ، عسقلان وغیرہ رچرڈ اسے جہیز میں دے اور وہ بیت المقدس میں رہے ۔ سلطان اپنے بھائی کو فلسطین کی حکومت عطا کرے اور ملکہ اور ملک العادل مشترکہ طور پر اس کے حکمراں ہوں ۔ ملک العادل نے یہ تجویز ابن شداد اور امراء کی ایک جماعت کے ذریعے ۲۹ رمضان کو سلطان کی خدمت میں بھجوائی ۔ امراء کی اس

۱۔ لین پول ، ص ۱۷۳ ، اس کے الفاظ یہ ہیں :

There is a touchy story of the woman who came from the crusader's camp at Acre seeking her baby, who had been carried of by the saracen soldiery The pickets let her pass and led her to the Sultan, to whom she had appealed "for he is very merciful," they said Saladin was touched by her anguish, the tears stood in his eyes, and he had the camp searched *till the little girl was safely restored to her mother*, and both were led back to the enemy's lines

ابن شداد نے بھی النوادر السلطانیہ و المحاسن الیوسفیہ میں ص ۲۶ پر یہ واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے ۔

۲۔ شرر : ملک العزیز ورجنا ، ص ۱۲۵ ، ۱۲۶ ۔

۳۔ (i) فلپ کے حتی (ii) ہیرلڈلیم : صلاح الدین ایوبی ، (ترجمہ) ص ۲۴۱-۲۴۴ (iii) لین پول : ص ۳۲۹ ۔

جماعت میں علم الدین سلیمان ، سابق الدین عزالدین بن المقدم اور حسام الدین شامل تھے ۔ سلطان صلاح الدین اس تجویز پر اگرچہ حیران ہوا اور اسے یقین تھا کہ یہ سب رچرڈ کی چال ہے اور ایسا ہوگا نہیں لیکن اس کے باوجود اس نے تین بار اپنی منظوری کا اعلان کیا ۔ بقول ابن شداد ۲ شوال (۲۴ اکتوبر ۱۱۹۱ء) کو ابن النحال جب قاصد کی حیثیت سے اس منظوری کی خبر لے کر عیسائی کیمپ میں گیا تو رچرڈ نے جواباً کہا کہ اس کی بہن نے ایک مسلمان سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے[1] ۔

ابن شداد کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شادی کے سلسلے میں خارج ہونے والی شرط تبدیلی مذہب کی شرط تھی ، اگرچہ اس شادی کے نہ ہو سکنے کی وجوہات کے سلسلے میں مورخین کی آرا میں اختلاف ہے ۔ بعض کا خیال ہے کہ رچرڈ کی بہن نے جو شرائط رکھی تھیں العادل نے انہیں مانا نہیں اور بعض کی رائے میں جونا نے ایک مسلمان سے شادی کرنے سے انکار کر دیا جب کہ العماد الکاتب کے بیان کی رو سے خود جونا نے اس شادی کے لیے اپنی آرزو رچرڈ کے سامنے بیان کر کے اس سے التجا کی تھی ۔ بہر کیف رچرڈ کا جو آخری پیغام ملک العادل کے نام آیا اس کا ذکر کرتے ہوئے ابن شداد کہتا ہے کہ اس نے کہا تھا کہ تمام عیسائی اسے اس پر لعن طعن کر رہے ہیں کہ وہ اپنی بہن کو ایک مسلمان سے بیاہ دینا چاہتا ہے لیکن پھر بھی وہ پوپ کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور اگر ناکام رہا تو اپنی بھتیجی سے ملک العادل کی شادی کر دے گا[2] ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رچرڈ کا یہ آخری پیغام ہی سرر کے لیے ورجنا کے کردار کی تخلیق کا ذریعہ بنا اور انھوں نے اسے رچرڈ کی بھانجی کے روپ میں پیش کر دیا ۔ یہاں یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رچرڈ نے اپنی بھانجی نہیں بھتیجی کا رشتہ پیش کیا تھا جس سے بقول ابن شداد سلطان صلاح الدین نے انکار کر دیا تھا ۔ سرر کے مآخذ انگریز مورخین ہیں اور انگریزی میں چونکہ بھانجی اور بھتیجی کے لیے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے اس لیے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ۔ رچرڈ نے اس دوسری پیش کش کے لیے یہ جواز نکالا تھا کہ اس کی بھتیجی چونکہ کنواری ہے اس لیے اس کی شادی کے سلسلے میں وہ مختار کل ہے جب کہ بیوہ بہن کے لیے وہ پوپ کی اجازت کا محتاج ہے[3] ۔

۱۔ ابن شداد ، ص ۱۸۹ : أخوها النكاح فسخط من ذالک و غضب سیه و أنکرت ذالک انکاراً عظیما و حلفت بدینها المغلظ و یمینها انها لا تفعل ذلک و کیف تمکن مسلما من غشیانها ثم قال أخوها ان الملک العادل یتنصرو أنا أتمم ذلک و ترک باب الکلام مفتوحا ۔

۲۔ ابن شداد ، ص ۱۹۷-۱۹۸ : آخر الرسائل من الملک فی المعنی ان قال ان معاشر دین النصرانیه قد أنکروا علی وضع أختی تحت مسلم بدون مشاوره البابا وهو کبیر دین النصرانیه و مقدمه و ها أنا أسیر الیه رسولا یعود فی سته أشهر فأن اذن فبها و نعمت و الا زوجتک ابنه اخی و ما أحتاج الی اذنه فی ذلک ۔ و لین پول ، ص ۳۳۱ ۔

۳۔ ابن شداد ، ص ۱۹۸ : و کان من حملة رسالتهم ان البابا ان أذن فی هذا العقدتم و أن لم یأذن زوجنا الملک العادل بابنه أخی الملک و هی بکر و ذکروا ان من دینهم ان البابا انما یحتاج الی اذنه فی تزویج الثیب من بنات الملوک و أما الابکار فیزوجها أهلها و انفصل الحال علی ذلک ۔

یہاں انگریزوں کے مشہور تاریخی ناول نگار کا ذکر غیر ضروری نہ ہوگا جس کے بارے میں ہمارے بعض نقادوں کے حسن ظن کی یہ کیفیت ہے کہ لکھتے ہیں : "اگر پیش خدا صلاح الدین اپنے دونوں مورخوں کو طلب کرے تو سکاٹ کو تو شاید چھوڑ دینے کی سفارش کرے مگر مولانا کو سزا دلوائے بغیر نہ مانے -"[1] ان نقادوں کے ذہن میں سکاٹ کی معافی کے لیے پتہ نہیں کیا جواز ہے لیکن ہم یہاں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سکاٹ نے "ٹیلسمان" میں صلاح الدین کے کردار کو گھٹا کر پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور رچرڈ کی اس پیش کش کو جو اس نے ملک العادل سے اپنی بہن جونا کی شادی کے لیے کی تھی اس طرح "مغربی طرز کی ملمع سازی" کے ساتھ توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے کہ سلطان صلاح الدین کو Edith Plantagenent کے عشق میں مبتلا دکھایا ہے اور اسے دیکھنے کے لیے سلطان بھیس بدل کر رچرڈ کے دربار میں پہنچتا ہے حالانکہ تیسری صلیبی جنگ کے دوران رچرڈ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود سلطان سے ملاقات کرنے سے محروم رہا - اسی واقعے کو لیسنگ نے Nathan der weise میں صحیح صورت میں پیش کیا ہے - سٹینلے لین پول نے اس ضمن میں سکاٹ کے تعصبات اور ٹیلسمان میں تاریخی غلطیوں کا بڑا غیر جانبدارانہ محاکمہ کیا ہے[2] - ٹی اے آرچر نے بھی سکاٹ کی اس زیادتی کا ناپسندیدگی سے ذکر کیا ہے[3] -

یہاں شرر کی ایک فنی غلطی کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے - ورجنا اور ترک افسر کے درمیان یہ گفتگو عکہ کی فتح سے پہلے ہو رہی ہے یعنی جولائی ۱۱۹۱ء کے پہلے ہفتے میں - لیکن رچرڈ نے صلح کی درخواست اور ملک العادل سے جونا کی شادی کی پیش کش اس زیر نظر تاریخ سے کوئی ساڑھے تین ماہ بعد ۲۰ اکتوبر ۱۱۹۱ء کو کی تھی[4] - اس لیے یہ زمانی تصرف تاریخی نقطہ نظر سے مناسب نہیں معلوم ہوتا -

عکہ کے سامنے لڑی جانے والی لڑائیوں میں سے ایک کا حال بیان کرتے ہوئے شرر نے (ص ۱۴۵) عکہ والوں کی جرأت اور جواںمردی کی جو تفصیل دی ہے ، مغربی مورخوں کے یہاں بھی اس کا ذکر ہے - سٹینلے لین پول اس جنگ کی تفصیلات ایٹیریری کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے ترکوں کی بہادری کی دل کھول کر داد دیتا ہے[5] - ایٹیریری کے مطابق "جب شہر بالکل تباہ ہونے کو تھا تو ترک سپاہی شہر سے نکل کر ان پر ٹوٹ پڑے .... ایسے جنگجو لوگ کبھی کسی نے نہ دیکھے ہوں گے - وہ دیوانہ وار دشمنوں پر ٹوٹ پڑے تھے -"[6]
شرر اس معرکے میں عیسائیوں کی پسپائی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "اس وقت ممکن تھا کہ سلطان صلاح الدین مع اپنی فوج کے شہر عکہ میں داخل ہو جاتا مگر یہ امر

۱- محمد احسن فاروقی : اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ، ص ۱۴۳ ، ۱۴۵ - ۲- لین پول ، ص ۳۹۲-۳۹۶ -

۳- آرچر : دی کروسیڈز ، ص ۳۳۸ -

He (Richard) suggested a marriage between El Adel the Sultan's brother, and his own sister, Joanna, this probably gave Sir W Scott the hint for the proposed marriage of Saladin himself to Edith Plantagenet (a purely fictious character) in "The Talisman"

۴- لین پول ، ص ۳۲۹ ، ابن شداد ، ص ۱۸۸ ، ٹی اے آرچر : دی کروسیڈز ، ص ۳۳۸ -

۵- لین پول ، ص ۲۹۳-۲۹۴ -

۶- Itin., Ric, iii, C 12, بحوالہ آرچر : The Crusade of Richard I ، ص ۹۷ -

غلطی سے صبح پر اٹھا رکھا گیا . . . ." (ص ۱۵۰) عیسائی ساٹھ ہزار تین سو پینتالیس لاشیں صرف اپنے ساتھیوں کی عرصہ رزم میں چھوڑ گئے تھے - پندرہ ہزار مسلمانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا اور فنا کی چادر اوڑھ کر لسٹ رہے -" (ص ۱۵۱)

تمام معاصر مورخین اور سلطان صلاح الدین کے سوانح نگار اس امر پر یک زبان متفق ہیں کہ عکہ کے دو برس کے مسیحی محاصرے کے دوران ایک موقع ایسا بھی آیا تھا کہ عیسائی بالکل شکست کھا چکے تھے اور اگر شام کے بعد بھی تھوڑی دیر جنگ جاری رہتی تو آج تاریخی واقعات کی صورت قطعاً مختلف ہوتی - عیسائی شکست کھا کر پسپا ہو گئے تھے لیکن سلطان نے اپنے سپاہیوں کی تھکاوٹ کے پیش نظر التوائے جنگ کا اعلان کر دیا - لیکن یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ سرر نے یہ واقعہ ڈیڑھ برس کی زمانی تاخیر سے یعنی ۴ اکتوبر ۱۱۸۹ء کے بجائے جولائی ۱۱۹۱ء کا بیان کیا ہے - اس معرکے میں کئی نامور نائٹ قتل ہوئے تھے جن میں Andrew of Brienne اور Gerard of Rideford بھی شامل تھے - جولائی ۱۱۹۱ء میں تو عیسائیوں کی قوت اور تعداد کافی بڑھ چکی تھی اور شاہ فرانس اور شاہ انگلستان بھی اپنی کمر فوج کے ساتھ عکہ کے سامنے خیمہ زن تھے -

سٹینلے لین پول اس ۴ اکتوبر ۱۱۸۹ء کے معرکے کا، جسے سرر جولائی ۱۱۹۱ء سے غلط طور پر منسوب کرتے ہیں، ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے :

"اس کے بعد صلاح الدین سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے فوری تعاقب نہ کیا ورنہ کامل فتح ہوتی اور دشمنوں کو مورچے مضبوط کرنے کا موقع نہ ملتا - سلطان نے سپاہیوں کو آرام کا موقع دیا اور ایک ہفتہ بعد جنگی کونسل سے خطاب کیا - بڑی بحث کے بعد کونسل نے فوج کو واپس پہاڑوں پر لے جانے کا فیصلہ کیا - اس بار پھر سلطان نے کونسل کا فیصلہ تسلیم کر کے غلطی کی - یہ دراصل اس کی مجبوری تھی، اپنے مختلف قوموں کے لوگ اس کے جھنڈے تلے جمع تھے اور ان کی باہمی رقابتوں کا یہ عالم تھا کہ انہیں متحد رکھنا مشکل تھا اور پھر سلطان سخت بیمار بھی تھا - گزشتہ دو سال کی مسلسل جد و جہد اور پریشانیوں نے سلطان کی صحت خراب کر دی تھی - وہ پچاس برس کے سن میں بھی اپنے ہر ساتھی سے زیادہ محنت کرتا تھا - مختلف موسموں میں بھاری زرہ تلے گھوڑے کی پیٹھ پر مسلسل سفر اور کئی کئی دن مسلسل جنگ و جدل میں مصروف رہ کر کھانے پینے میں کوتاہی کا اثر صحت پر ہوا لیکن پھر بھی اگر سلطان اس وقت کونسل کے فیصلے کے برعکس حملے کا فیصلہ کرتا تو شکستہ دل مسیحیوں کی شکست ناگزیر تھی لیکن تائر (صور) کے محاصرے میں کی گئی غلطی کا یہاں بھی اعادہ ہوا اور صلیبیوں کو قدم جمانے اور مورچے مضبوط کرنے کا موقع مل گیا ورنہ ۵ اکتوبر ۱۱۸۹ء کو عکہ کا محاصرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا جو بعد میں دو سال تک جاری رہا اور بالآخر عیسائیوں کی فتح پر منتج ہوا -"[1]

سید امیر علی نے بھی اس معرکے کا ذکر کرتے ہوئے ابن الاثیر کے حوالے سے یہی بات لکھی ہے[2] اور ابن شداد کے یہاں بھی ۴ اکتوبر ۱۱۸۹ء (۲۱ شعبان ۵۸۵ھ) کی اس بڑی جنگ کی تفصیلات اسی نوعیت کی ہیں[3] -

سرر نے زیر بحث بیان میں مقتولین کی جو تعداد بتائی ہے وہ کافی مبالغہ آمیز اور مغالطہ انگیز ہے - سید امیر علی نے مذکورہ بالا لڑائی میں عیسائی مقتولین کی تعداد دس ہزار[4] اور

۱- لین پول، ص ۲۶۱-۲۶۲ -
۲- سید امیر علی : A Short History of the Saracen، ص ۳۶۰ -
۳- ابن شداد، ص ۹۲-۹۸ -
۴- سید امیر علی، ص ۳۶۰ -

معاصر مورخین نے سات ہزار بتائی ہے لیکن بہاء الدین ابن شداد نے اسی سات ہزار کی تعداد کے بارے میں دو مختلف بیانات دیے ہیں[1] ۔ سٹینلے لین پول نے ابن شداد کے حوالے سے عیسائی مقتولین کی تعداد چار ہزار بیان کی ہے[2] جب کہ ابن شداد یہ تعداد عیسائی فوج کے میسرہ کے مقتولین کی بتاتا ہے ۔ عیسائی جب میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ نکلے اور اپنے مورچوں میں جا کر دبک رہے تو اس کے بعد لاشوں کے تعفن سے بیماری پھیلنے کا خطرہ لاحق ہو گیا ، چنانچہ سلطان نے عیسائیوں کی لاشوں کو سمندر میں پھنکوا دینے کا حکم دیا۔ ابن شداد لکھتا ہے :

و أما العدو المخذول فانه عاد الى خيمه و قد قتل شجعانهم و طرحت مقدموهم و فقدت ملوكهم فامر السلطان ان حرج من عكا عجل يسحبون عليه القتلى منهم الى طرف النهر ليلقوا فيه ۔ و لقد حكى لى بعض من ولى أمر العجل ان أحدخيطا و كان كلما أخذ قتيلا عقد عقدة فبلغ عدد عقده قتلى الميسرة أربعة آلاف و مائة و كسور و بقى قتلى الميمنة و قتلى القلب لم يعدهم فانه ولى أمرهم غيره و بقى من العدو بعد ذالك من حمى نفسه و أقاموا فى مخيمهم لم يكثر ثوا يحاول المسلمين و عساكرهم ۔[3]

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ چار ہزار ایک سو مقتول صرف عیسائی میسرہ کے گنے جا سکے ۔ میمنہ اور قلب میں قتل ہونے والوں کو پھنکوانے کا کام دوسرے افسروں کی نگرانی میں تھا اس لیے ابن شداد کو ان کی تعداد نہیں معلوم ہو سکی ۔ بہر کیف اس حساب سے سات ہزار سے کچھ زیادہ سپاہی اس معرکے میں قتل ہوئے ۔ یہی کیفیت اس معرکے کے مسلمان شہدا کے ضمن میں ہے ۔ بہاءالدین نے ان مسلمانوں کی تعداد جو شناخت نہیں کیے جا سکے ڈیڑھ سو بتائی ہے اور جملہ شہدا کی تعداد کے بارے میں وہ خاموش ہے[4] ۔ عیسائی مورخین نے مسلمان شہدا کی تعداد پندرہ سو بتائی ہے ۔ بہر کیف یہ بات خاصی چونکا دینے والی ہے کہ سرر نے چار یا سات ہزار عیسائیوں کے بجائے ساٹھ ہزار دس سو ستاسی عیسائی اور پندرہ سو کے بجائے پندرہ ہزار مسلمان مقتولین بتائے ہیں ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کتابت کے کرشمے نے سات ہزار کو ساٹھ ہزار اور پندرہ سو کو پندرہ ہزار بنا دیا ہے ۔ ایک معرکے کے مقتولین کی یہ تعداد قابل تسلیم نہیں ، اگر سرر عکہ کی دو برس کی صبر آزما جنگ کے کل مقتولین کی یہ تعداد بتاتے تو کسی حد تک قرین قیاس بھی کیونکہ ان دو برسوں میں ایسے تو معرکے ہوئے ۔ ایک معرکہ تو ۲۵ جولائی ۱۱۹۰ء کو اسی نوعیت کا ہوا جس میں عیسائیوں کا بے شمار جانی نقصان ہوا جس کا اعتراف عیسائیوں نے بھی کیا ۔ آرکبشپ آف کنٹربری اپنے ۲۱ اکتوبر ۱۱۹۰ء کے خط میں اسی معرکے کا ذکر کرتے ہوئے بڑے افسوس کے ساتھ لکھتا ہے کہ ان کے چار ہزار سے زیادہ منتخب سپاہی اور کئی سردار قتل ہوئے[5] ۔ بہاء الدین ابن شداد لکھتا ہے :

''ملک العادل کے کیمپ سے دشمن کے کیمپ تک ایک فرسنگ سے زیادہ فاصلے کا میدان لاشوں سے اٹا پڑا تھا ، میں اپنے خچر پر سوار ہو کر اس خون کے سمندر سے گزرا اور لاشوں کا شمار کرنا چاہا لیکن ان کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ میں گننے سے قاصر رہا ۔ ۔ ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس دن آٹھ ہزار اور بعض کہتے ہیں سات ہزار عیسائی قتل ہوئے ۔ میں نے خود دیکھا کہ ملک العادل کے کیمپ سے

۱۔ ابن شداد ، ص ۹٦ ۔ و أما من العدو المخذول فحزر قتلاهم بسبعة آلاف نفر و رأيتهم و قد حملوهم الى شاطئ النهر ليلقوا فيه فحزرتهم بدون سبعة آلاف ۔ ۲۔ لین پول ، ص ۲٦۴ ۔

۳۔ ابن شداد، ص ۹٦ ۔ ۴۔ ابن شداد، ص ۹٦ ۔ ۵۔ بحوالہ ٹی اے آرچر : The Cursades، ص ۱۸ ۔

دشمنوں کے کیمپ تک مقتولین کی پانچ طویل قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے ایک ذہین سپاہی کو دیکھا کہ وہ ان قطاروں میں ایک سرے سے دوسرے تک آ جا رہا تھا اور مقتولین کو گن رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کتنی گنی ہیں، اس نے بتایا کہ ابھی صرف دو قطاروں کی لاشیں گنی ہیں جو چار ہزار ساٹھ ہیں اور مزید تین قطاریں باقی ہیں جن میں لاشوں کی تعداد پہلی دو قطاروں سے بھی اوسطاً زیادہ دکھائی دیتی ہے[1]۔"

بہر کیف اس واقعے کے بیان کا مقصد صرف یہ تھا کہ اگر شرر یہ تعداد جنگ عکہ کے کل مقتولین کی بتاتے تو درست ہوتی لیکن موجودہ صورت میں صحیح نہیں۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ سرر نے ناول میں اس معرکے کے وقت سلطان کے بڑے بیٹے ملک العزیز نور الدین (بقول سرر) کو مسیحی کیمپ میں گرفتار دکھایا ہے جب کہ تاریخی اعتبار سے سلطان کا بڑا بیٹا ملک الافضل نور الدین اس معرکے میں سلطان کے دوش بدوش ایک حصہ فوج کی کمان کرتے ہوئے داد سجاعت دے رہا تھا اور ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہاں سرر نے تاریخ کی زمانی ترتیب میں ڈیڑھ برس کی تقدیم و تاخیر کر دی ہے۔ در اصل یہ معرکہ شاہ رچرڈ کے عکہ پہنچنے سے ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے۔

پانچویں باب بعنوان "یورپین کیمپ" میں شرر نے رچرڈ کو بیمار دکھایا ہے، وہ لکھتے ہیں "ملک شام کی گرم آب و ہوا بے سبب ہی لوگوں کو مضمحل کر دیتا ہے مگر بہادر اور سیر دل رچرڈ کے حق میں یہاں کی آب و ہوا زیادہ نا موافق ثابت ہوئی، کچھ تو لڑائی اور کچھ گذشتہ لڑائی کے چند زخموں نے سست کر دیا ہے۔"

شاہ رچرڈ ۸ جون ۱۱۹۱ء کو عکہ پہنچا تھا۔ رچرڈ کے سوانح نگاروں اور صلیبی جنگوں کے وقائع نگاروں کا بیان ہے کہ عکہ پہنچنے کے بعد جلد ہی رچرڈ بخار میں مبتلا ہو گیا، اسے ملک شام کی آب و ہوا راس نہیں آئی تھی۔ اس اعتبار سے رچرڈ کی بیماری سے متعلق سرر کا بیان صداقت پر مبنی ہے۔ رچرڈ کے رفیق وقائع نگار نے بھی لکھا ہے کہ جون ۱۱۹۱ء کے دوسرے ہفتے سے جولائی کے پہلے ہفتے کے اختتام تک رچرڈ بیمار رہا[2]۔ ارنول اور دیگر معاصر مورخین کے حوالے سے ٹی۔ اے آرچر لکھتا ہے کہ شاہ فرانس تو جلد صحت یاب ہو گیا اور اس نے ۳ جولائی سے عکہ پر قبضہ کرنے کی ایک بڑی مہم چلائی، مگر وہ پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکی۔ رچرڈ ابھی صحت یاب نہیں ہوا تھا تاہم اس نے جلد ہی انجنیروں کے کام کی نگرانی اپنے ذمے لے لی[3]۔ سٹینلے لین پول بھی مستند حوالوں سے یہی امور بیان کرتا ہے اور ایک معرکے میں رچرڈ کے معمولی زخمی ہونے کا ذکر بھی کرتا ہے[4]۔ بہاء الدین ابن شداد ۳ جمادی الثانی ۵۸۷ھ (۲۸ جون ۱۱۹۱ء) کے واقعات کے ضمن میں لکھتا ہے: "و اشتد مرض الانکتار بحیث شغل الافرنج شدته عن الزحف[5]۔"

اسی باب میں شرر لکھتے ہیں کہ اس بیماری اور مایوسی کے عالم میں رچرڈ کو خوش خبری ملی کہ "دو سو جہاز جزیرہ سسلی سے آ گئے ہیں . . . انھوں نے عکہ کے شمالی طرف

۱- ابن شداد، ص ۱۱۳-۱۱۴ - ۲- Itin, Ric, III, 1, 210 بحوالہ آرچر، ص ۸۴-۹۴ -
۳- ٹی اے آرچر: The Crusades، ص ۳۲۵ - ٤- لین پول، ص ۲۸۷-۲۹۴ -
۵- ابن شداد، ص ۱۵۳ -

لنگر ڈالا ہے" اور رچرڈ کے دریافت کرنے پر بتایا گیا کہ ان جہازوں پر "دو لاکھ سے کچھ کم فوج ہے۔ شاہ رچرڈ مارے خوشی کے اچھل پڑا اور ایک دعوے کی وضع اور طرز سے کہنے لگا 'کل البتہ عربوں کی بہادری کا امتحان لوں گا' اب تو شاید عکہ والے بے لڑے شہر ہمارے حوالے کر دیں گے۔ دو برس کے محاصرے کا کل ہی خاتمہ ہو جائے گا۔" اس موقع پر ایک افسر یہ بھی بتاتا ہے کہ "ہمارے جاسوسوں نے یہ خبر پہنچائی ہے کہ عکہ والوں نے سلطان صلاح الدین کو اطلاع دی تھی کہ اب ان میں لڑنے کی تاب نہیں، نہ کچھ کھانے پینے کو رہا ہے۔ کل یا پرسوں ہم شہر ان لوگوں کے سپرد کر دیں گے مگر سلطان نے بہت برہم ہو کے نیز ان کی بزدلی اور بے صبری کی مذمت کرکے اس خیال سے باز رکھا ہے۔" اسی نشست میں نئے آنے والے جہازوں کا افسر حاضر ہو کر روداد سفر سناتا ہے اور رچرڈ یہ سن کر برہم ہوتا ہے کہ "کل رات . . یکایک عربی جہاز ہمارے جہازوں پر آ پڑے۔ ایک جہاز کو تو وہ گرفتار کر لے گئے اور کوئی تین جہاز انہوں نے ڈبو دیے۔ قبل اس کے کہ ہم اچھی طرح ہوشیار ہوں وہ اپنا کام کرکے ساحل افریقہ کی طرف چلے گئے۔ ہمارے ساتھ پوری دو لاکھ فوج تھی، اس حملے نے چھ سات ہزار آدمی ہمارے ہاتھ سے کھو دیے۔" (ص ۱۶۳-۱۶۶)

شرر کے اس سارے بیان میں بہت سی باتیں صحیح ہیں لیکن ان کی ترتیب میں انہوں نے ایسی ڈرامائیت پیدا کر دی ہے کہ یہ سب واقعات ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہو گئے ہیں گویا سب ایک ہی دن اور ایک ہی وقت رونما ہوئے ہیں، حالانکہ یہ مختلف اوقات کے واقعات ہیں جنھیں شرر نے یک جا جوڑ لیا ہے۔

جہاں تک جہازوں کی تعداد کا تعلق ہے، رچرڈ کا وقائع نگار لکھتا ہے کہ رچرڈ جب ۱۰ اپریل ۱۱۹۱ء کو سسلی سے روانہ ہوا تو اس کے بحری بیڑے کی ترتیب اس طرح تھی کہ سب سے آگے کی قطار میں تین جہاز تھے جن میں رچرڈ کی منگیتر (جوانا) ملکۂ سسلی، رچرڈ کی ہونے والی دلہن برنگیریا، شاہی خزانہ، اسلحہ و خوراک اور حفاظتی دستہ تھا۔ ان کے پیچھے دوسری قطار میں تیرہ، تیسری میں چودہ، چوتھی میں بیس، پانچویں میں تیس، چھٹی میں چالیس، اور ساتویں میں ساٹھ جہاز تھے اور ان سب کے پیچھے رچرڈ اپنے جنگی جہازوں کے حلقے میں سفر کر رہا تھا۔ ان قطاروں کا درمیانی فاصلہ اس قدر تھا کہ ایک قطار کے جہازوں پر بجنے والے طبل دوسری قطار کے جہازوں پر سنے جا سکتے تھے اور ہر قطار کے جہازوں کا باہمی فاصلہ ایسا تھا کہ ایک پر سے پکار کر دوسرے تک پیغام پہنچایا جا سکتا تھا[1]۔ روجر آف ہوڈن لکھتا ہے کہ رچرڈ کے بحری بیڑے میں ۵۳ مسلح جنگی جہاز اور ۱۵۰ دیگر جہاز شامل تھے[2]۔ راستے میں یہ بیڑہ سمندر کی طوفانی موجوں میں گھر کر بکھر گیا، ملکہ کے جہاز کے دو ہمراہی جہاز تباہ ہو گئے اور ملکہ کا جہاز قبرص کے سواحل پر جا پہنچا جب کہ رچرڈ ان سے بے خبر جزیرہ کریٹ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ بعد ازاں شاہ رچرڈ ۶ جون ۱۱۹۱ء کو از سر نو اس بیڑے کو ترتیب دے کر قبرص سے روانہ ہوا[3]۔ ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا تعداد میں سے دو چار جہاز کم ہوں گے لیکن عیسائی مورخین اس ضمن میں خاموش ہیں کہ رچرڈ کی معیت

۱- Ric of Devizes, 46 بحوالہ آرچر، ص ۵۸۔
۲- Roger of Howden بحوالہ آرچر، ص ۵۸۔
۳- Itin., Ric., III, C. 42 بحوالہ آرچر، ص ۶۹۔

میں کتنے جہاز عکہ پہنچے اور کسے اس سے پہلے یا بعد پہنچے ۔

رچرڈ کے ایک وقائع نگار کے ایک سرسری بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رچرڈ کی بہن اور ہوی حند جہازوں اور محافظوں کی معیت میں یکم حون ۱۱۹۱ء کو عکہ پہنچ چکی تھیں جب کہ رچرڈ خود ۸ جون ۱۱۹۱ء کو عکہ پہنچا[1] ۔ بہاء الدین ابن شداد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رچرڈ کا سارا بحری بیڑا ایک وقت میں عکہ نہیں پہنچا اور ۸ جون کو رچرڈ کے ہمراہ آنے والے جہازوں کی تعداد صرف ۲۵ تھی[2] ۔ ابن شداد کے بیان سے گمان گزرتا ہے کہ رچرڈ کے بیڑے کے دیگر جہاز ۸ جون کے بعد کسی وقت عکہ پہنچے اور غالباً انہیں بقیہ جہازوں کے پہنچنے سے سرر نے ناول کے لیے یہ ڈرامائی واقعہ مستعجب کیا ہے ، لیکن یہاں یہ یاد رہے کہ سرر جس دن ان جہازوں کے پہنچنے کا واقعہ بیان کرتے ہیں اس کے دوسرے دن وہ عکہ پر عیسائیوں کی فتح و قبضہ دکھاتے ہیں اس طرح گویا یہ بقیہ جہاز ۱۱ جولائی ۱۱۹۱ء کو عکہ پہنچے تھے ۔ اگرچہ مورخین ۸ جون اور ۱۱ جولائی کے درمیان کسی اتنے بڑے بیڑے اور فوج کے عکہ پہنچنے کے سلسلے میں خاموش ہیں تاہم قیاس یہی ہے کہ رچرڈ کے بیڑے کے بقیہ جہاز قبرص سے روانہ ہونے کے بعد اسی دوران میں کسی وقت عکہ پہنچے ہوں گے ۔

رچرڈ کے وقائع نگار نے اس دوران میں ایک کمک کی آمد کا ذکر کیا ہے ۔ وہ رچرڈ اور شاہ فرانس کی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے : "عیسائی کیمپ میں مایوسی پھیلی ہوئی تھی کیونکہ اب کوئی بادشاہ میدان جنگ میں فوج کی قیادت کے قابل نہیں تھا ، دریں اثنا قبرص کی طرف سے کئی جہازوں کا ایک بیڑہ ، نادربوں ، امراء ، لارڈز اور جنگجوؤں کو لے کر آ پہنچا[3]۔" رچرڈ کے وقائع نگار نے اس بیڑے کی پہنچنے کی صحیح تاریخ تو نہیں لکھی تاہم اسے ۱۷ جون اور ۳ جولائی کے درمیان رونما ہونے والے واقعات کے ذیل میں بیان کیا ہے ۔ قیاس یہی ہے کہ سرر نے اسی کمک کی آمد کو اپنے ناول کے پلاٹ کا حصہ بنایا ہے اگرچہ ۱۱ جولائی کو اس کا عکہ پہنچنا پلاٹ میں تجسس پیدا کرنے کے لیے سرر کا ذاتی زمانی تصرف ہے ، جہاں تک اس دوران میں مسیحی بیڑے پر مسلمانوں کے کسی اچانک حملے اور تاخت کا تعلق ہے کتب تواریخ اس ضمن میں خاموش ہیں ، صرف بہاء الدین ابن شداد کے یہاں ایک بیان ایسا ملتا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ۲۶ مئی ۱۱۹۱ء کو سلطان کو بیروت سے ایک خط ملا جس میں بتایا گیا تھا کہ مسلمانوں نے شاہ انگلستان کے بیڑے کے پانچ جہاز گرفتار کر لیے ہیں ، یہ جہاز جنگی ساز و سامان رسد اور عورتوں مردوں سے لدے ہوئے تھے اور ان میں چالیس گھوڑے بھی تھے[4] ۔ ابن شداد کے اس بیان کے علاوہ اس دوران میں مسیحیوں کے جہازوں

۱۔ ایضاً ۔

۲۔ ابن شداد ، ص ۱۴۸ : "و لما کان یوم السبت ثالث عشرہ الشہر قدم ملک الانکتار بعد مصالحتہ لصاحب جزیرہ قبرص والاستیلاء علیہا و کان لقدومہ روعہ عظیمہ و وصل فی خمس و عشرین شانیہ مملوءہ بالرجال والسلاح و العدد و أظہر الافرنج سرورا عظیما" ۔ ۳۔ Itin , Ric , iii, c, 6 بحوالہ آرچر ، ص ۸۶ ۔

۴۔ ابن شداد ، ص ۱۴۴-۱۴۵ : و فی سلخ ربیع الآخر وصلت کتب من بیروت ان قد أخذ من مراکب الانکتار القاصدہ نحو عسکر العدو خمس مراکب و طرادہ فیہا خلق عظیم رجال و نساء میرہ و أخشاب و آلات و غیر ذالک و فیہا أربعون فارساً و کان ذلک فتحاً عظیما۔

کی گرفتاری کا اور کہیں کوئی بیان نہیں ملتا ۔ خیال ہے کہ شرر نے اپنے ناول کے پلاٹ کے اس حصے کے لیے اسی واقعے کا سہارا لیا ہے ۔ غالباً یہ پانچ جہاز رچرڈ کے بیڑے کے ان جہازوں میں سے تھے جو سسلی سے روانہ ہونے کے بعد اپریل ۱۱۹۱ء میں طوفانی موجوں میں بکھر گئے تھے ۔ ان میں سے کچھ قبرص ، کچھ جزیرہ کریٹ اور کچھ مختلف دیگر علاقوں کی طرف نکل گئے تھے ۔ لیکن یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ شرر نے یہ واقعہ ۱۰ جولائی ۱۱۹۱ء کا بیان کیا ہے حالانکہ یہ مئی کے تیسرے ہفتے کا واقعہ ہے اور اس کا اطلاعی خط بھی بیروت سے روانہ ہو کر ۲۶ مئی کو سلطان صلاح الدین کو عکہ کے اسلامی کیمپ میں موصول ہو گیا تھا ۔

اسی مذکورہ بالا بیان میں شرر نے عیسائیوں کے جاسوسوں کی لائی ہوئی جو خبر سنائی ہے وہ بذات خود تو صحیح ہے لیکن اس کا انداز بیان تاریخی طور پر درست نہیں ۔ در حقیقت شاہ فرانس اور شاہ رچرڈ کے آ جانے کے بعد عکہ کا محاصرہ سخت ہو گیا تھا ، اور عکہ میں مسلمان فوج کو پہنچائی جانے والی رسد کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے ۔ عکہ کے سامنے خشکی پر عیسائیوں کا ٹڈی دل لشکر محاصرہ کیے پڑا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ سلطان صلاح الدین پہلے کی طرح (فروری ۱۱۹۱ء) اس لشکر کو مارتا کاٹتا شہر میں داخل ہو جائے اور وہاں کے سپاہیوں کو تازہ دم فوج سے تبدیل کر سکے یا انھیں رسد پہنچا سکے ۔ سمندر کی طرف سے مسیحی بیڑے نے سخت محاصرہ کر رکھا تھا اور بندرگاہ کے راستے محصورین کو رسد پہنچانا بھی ناممکن ہو گیا تھا ۔ اب نامہ و پیام صرف کبوتروں یا مشاق تیراکوں کے ذریعے ہوتا تھا ۔ سلطان صلاح الدین نے ۱۴ اور ۱۷ جون کو زبردست حملے کر کے مسیحی لشکر اور کیمپ کا بڑا حصہ برباد کر دیا لیکن پھر بھی وہ محصورین عکہ کو رسد پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکا ۔ ۲ جولائی کو سلطان صلاح الدین نے پھر زبردست حملہ کیا اور بقول ابن شداد اسی دن (۷ جمادی الثانی ۵۸۷ھ) عکہ والوں کی طرف سے مایوس کن خط ملا تھا ، جس میں لکھا تھا کہ اگر کل تک ان کی کوئی مدد نہ کی گئی تو وہ صرف اپنی جان کی امان کی شرط پر شہر عیسائیوں کے سپرد کر دیں گے [1] ۔ سلطان کو اس مایوس کن خبر سے انتہائی صدمہ ہوا تھا اور اس نے دوسرے دن پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ حملہ کیا تھا اور اس روز شہر پر نظر ڈالتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے ۔ بقول ابن شداد اس تمام دن سلطان کے حلق سے ڈاکٹروں کی زبردستی دی ہوئی دوا کے سوا کوئی چیز نہیں اتری تھی [2] ۔ اس روز عکہ کے سپاہیوں نے بھی بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا اور جب دیواریں بالکل منہدم ہونے کو تھیں ، وہ دیوانہ وار شہر سے نکل کر دشمن پر ٹوٹ پڑے تھے ۔ ان کی اس بے مثال شجاعت کا اعتراف عیسائی مورخین نے بھی بطریق احسن کیا ہے لیکن جب اس بے جگری سے لڑنے کے باوجود مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی تو محصورین کے حوصلے پھر پست ہونے لگے ۔ اس کے بعد عکہ کی فوج کے دونوں امیر المشتاب اور قراقش رچرڈ کے کیمپ میں گئے اور صلح کی شرائط پر گفتگو ہوئی ۔ فلپ شاہ فرانس اس امر پر آمادہ تھا کہ محصورین اپنے اسلحہ اور آل و عیال سمیت شہر سے نکل جائیں لیکن شاہ رچرڈ خالی شہر پر قبضہ کرنا حماقت تصور کرتا تھا اس لیے یہ گفتگو

۱۔ ابن شداد ، ص ۱۵۵-۱۶۰ ۔ ۲۔ ایضاً ۔

نا کام رہی۔ رچرڈ کا وقائع نگار اسے ۵ جولائی ۱۱۹۱ء (۱۰ جمادی الثانی ۵۸۷ھ) کا واقعہ قرار دیتا ہے[1] جب کہ ہودن اسے ۱۲ جولائی کا واقعہ لکھتا ہے[2]، لیکن رچرڈ کے وقائع نگار کی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ ابن شداد ۱۲ جمادی الثانی (۷ جولائی) سے پہلے کے واقعات کے ضمن میں اس واقعے کے متعلق اپنی معلومات بیان کرتا ہے۔ اس گفتگو کی ناکامی کی وجہ سے ۷ جولائی کو شہر والوں نے پھر سلطان کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ آخر دم تک لڑیں گے[3]۔ اس واقعے کے بیان سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ شرر نے اس بیان میں جس طرح ایک افسر کے ذریعے جاسوسوں کی لائی ہوئی اطلاع سنائی ہے وہ حقائق سے متصادم ہے کیونکہ رچرڈ اس سے پہلے ہی ان امور سے باخبر تھا بلکہ ایک بار تو وہ افسران عکہ سے اس امر پر گفتگو بھی کر چکا تھا۔

عکہ کی شکست کے دن عیسائی فوج کی ترتیب و جنگ کا ذکر کرتے ہوئے (ص ۱۷۵-۱۷۶) شرر نے فوج کو چار حصوں میں منقسم دکھایا ہے، ہر حصے میں دس دس صفیں تھیں۔ موبرے، ڈی میڈول، اسکروپ اور ٹالبوٹ ان چار حصوں کے سالار تھے، آدھی فوج صلاح الدین کے خلاف اور آدھی عکہ والوں سے لڑنے پر مامور ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں اسی ہزار سوار دو فرانسیسی افسروں کی کمان میں تھے۔ سلطان کی فوج کی ترتیب اور اس معرکے میں ان کی شجاعت کی داستان بھی شرر نے پر زور انداز میں بیان کی۔ میدان کار زار کا نقشہ کھینچتے ہوئے انہوں نے دکھایا ہے کہ (ص ۱۷۸-۱۸۱) عیسائیوں کے ٹالبوٹ، موبرے اور ڈی میڈول جیسے نامور سالار اس معرکے میں مارے گئے (ص ۱۹۱-۱۹۴) شرر نے (ص ۱۹۵ تا ۱۹۸) عکہ والوں کی مدافعت، عکہ میں عیسائیوں کے داخلے، مسلمانان عکہ کے قتل عام اور اس پر سلطان صلاح الدین کی بے چینی کیفیت کا بھی تفصیلی نقشہ پیش کیا ہے۔ لیکن عکہ کی جنگ کے آخری دن کا یہ بیان خیالی اور تاریخی واقعات کا امتزاج ہے۔ تاریخی حصے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ ۱۲ جولائی ۱۱۹۱ء یعنی یوم سقوط عکہ سے متعلق نہیں بلکہ اس سے قبل دو برس کے دوران عکہ کے باہر جو جنگیں لڑی گئیں ان کی تفصیلات ہیں۔ مثلاً اس جنگ میں مسیحی فوج کی ترتیب و تقسیم کی جو تفصیلات ہیں وہ ماسوائے ناموں کے بہت سی ۴ اکتوبر ۱۱۸۹ء کی جنگ کی ہیں جو رچرڈ کے عکہ پہنچنے سے پونے دو سال پہلے لڑی گئی اور بہت سی ۷ ستمبر ۱۱۹۱ء کو ارسوف کے مقام پر لڑی جانے والی جنگ کی ہیں جو سقوط عکہ کے دو ماہ بعد کی بات ہے۔ سٹینلے لین پول نے ۴ اکتوبر ۱۱۸۹ء کی جنگ کی[4] اور رچرڈ کے وقائع نگار نے ۷ ستمبر ۱۱۹۱ء کی جنگ ارسوف کی جو تفصیلات دی ہیں[5]، شرر کے بیان کی اکثر جزئیات ان سے ملتی ہیں۔ جہاں تک موبرے، ٹالبوٹ، ڈی میڈول اور اسکروپ وغیرہ کا تعلق ہے، گبن نے ان سرداروں کے نام مختلف حوالوں سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ نامور لوگ عکہ کے سامنے مارے گئے[6]۔ لیکن عکہ کی جنگ تو دو برس جاری رہی اس

۱- Itin , Ric , 224, iii, c. 12 بحوالہ آرچر، ص ۹۸ - ۲- بحوالہ ایضاً۔
۳- ابن شداد، ص ۱۵۵-۱۶۰ - ۴- لین پول، ص ۲۶۱ -
۵- Itin., Ric., iv, c 14 بحوالہ آرچر، ص ۱۶۲ - ۶- گبن، جلد ۷، ص ۳۲۵ (لندن ۱۸۲۸ء)

"Among the Christians who died before St John d'Acre, I find the English names of De Ferrers earl of Derby (Dugdale, Baronage, part i p 260,) Mowbrey, (idem, p 124) De Mandevil, De Fiennes, St John, Scrope, Bigot Talbot, & c.

لیے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ کسی ایک دن مارے گئے اور خصوصاً ۱۲ جولائی ۱۱۹۱ء کو ، اور اس ضمن میں کوئی تاریخی ثبوت بھی نہیں ملتا۔

شرر نے اس روز عکہ کے شہر کی فوج کا باہر نکل کر مقابلہ نہ کر سکنے کا جو ذکر کیا ہے یہ در اصل ۵ جولائی ۱۱۹۱ء کا واقعہ ہے ۔ اس دن سلطان نے شہر والوں کو پیغام بھیجا تھا کہ جب باہر سے اسلامی لشکر حملے کے لیے تیار ہو تو وہ بھی شہر کی جانب سے عیسائیوں پر حملہ کریں لیکن اس دن محصورین عکہ کوئی ہمت نہ کر سکے اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھے رہے[1] ۔

جہاں تک ۱۲ جولائی ۱۱۹۱ء کو کسی زبردست جنگ کے ہونے کا تعلق ہے ، یہ شرر کی تخلیق ہے ۔ اس ضمن میں تمام عیسائی اور مسلمان مورخین خاموش ہیں ۔ نیز شرر نے جس طرح عیسائی فوج کا قوت سے غلبہ پا کر عکہ پر قابض ہونا دکھایا ہے وہ بھی تاریخ کی رو سے صحیح نہیں ۔ دراصل ۹ جولائی سے ہی سرداران شہر اور مسیحی افسروں کے درمیان صلح کی گفت و شنید ہو رہی تھی اور ۱۲ جولائی کو سلطان کو ایک تیراک کے ذریعے پیغام ملا کہ شہر کی فوج نے عیسائیوں سے صلح کر لی ہے[2] ، تو سلطان کو سخت رنج ہوا اور اس کے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ تھی ۔ سلطان صلاح الدین نے فوراً مجلس شوریٰ طلب کی ، وہ چاہتا تھا کہ مشورہ کر کے اسی تیراک کے ذریعے عکہ کی اسلامی فوج کے لیے یہ جواب بھیجے کہ سلطان اس صلح کو نامنظور کرتا ہے لیکن ابھی سردار اس کے خیمے میں جمع بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ اس نے دیکھا عکہ کی فصیل اور قلعے پر مسیحی علم اور صلیبیں نصب ہو چکی ہیں[3] ۔ محصورین نے ان شرائط پر ہتھیار ڈال کر شہر عیسائیوں کے سپرد کر دیا تھا کہ (۱) عکہ تمام جنگی ساز و سامان اور جہازوں سمیت عیسائیوں کی ملکیت ہوگا ۔ (۲) دو لاکھ اشرفیاں تاوان جنگ کے طور پر مسیحیوں کو دی جائیں گی ۔ (۳) پندرہ سو مسیحی قیدی سپاہی اور ایک سو نامزد مسیحی قیدی افسر رہا کیے جائیں گے ۔ (۴) مقدس صلیب (صلیب الصلبوت) عیسائیوں کو واپس کی جائے گی (۵) چار ہزار اشرفیاں مارکوئیس کو دی جائیں گی اور ان کے بدلے محصورین عکہ کی جان بخشی کر دی جائے گی[4] ۔

ابن شداد لکھتا ہے کہ سلطان صلاح الدین اس واقعے سے انتہائی مغموم تھا اور اس کے ندماء اور خود ابن شداد بھی اسے تسلی دیتے رہے لیکن اس کا غم ایک شفیق والدہ کا غم تھا جس کا بچہ اس سے بچھڑ گیا ہو[5] ۔ رچرڈ کے وقائع نگار نے سلطان صلاح الدین پر الزام لگایا ہے کہ اس نے محصورین عکہ کو صلح کی اجازت دے دی تھی اور شرائط صلح مان لی تھیں لیکن سٹینلے لین پول نے اس الزام کی پر زور تردید کی ہے اور اس بات کو بھی ارنول کے مستند حوالوں سے غلط ثابت کیا ہے کہ امراء اور شرفا کو یرغمال کے طور پر رکھ لیا گیا تھا اور باقی لوگوں کو عکہ سے نکل جانے کی اجازت دے دی گئی تھی[6] ۔ رچرڈ کے وقائع نگار کے سوا سب معاصر مورخین کا یہی بیان ہے کہ شہر میں داخل ہونے کے بعد عیسائیوں نے شہر کے تمام مکینوں اور فوجی سپاہیوں کو قیدی بنا لیا تھا ۔ مذکورہ بالا بحث سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ شرر کا

۱- لین پول ، ص ۲۹۷ - ۲- ابن شداد ، ص ۱۶۱ - ۳- ایضاً ، ص ۱۶۲ -

۴- لین پول ، ص ۳۰۲ - ۵- ابن شداد ، ص ۱۶۲ - ۶- لین پول ، ص ۲۹۷-۲۹۸ -

بیان کردہ یہ سارا واقعہ محض خیالی ہے اگرچہ اس میں کچھ تاریخی جزئیات ہیں لیکن وہ زمانی اعتبار سے صحیح نہیں ۔ وہ تاریخی جزئیات اس سے پہلے یا بعد کے واقعات کی ہیں ۔

شرر ساتویں باب "اطمینان کی ملاقات" میں ہیرو اور ہیروئین کو اسلامی کیمپ میں راز و نیاز میں مصروف دکھاتے ہیں اور اس موقع پر ایک خواجہ سرا آ کر کہتا ہے "حضور ! سلطان نے آپ کو یاد فرمایا ہے" ۔ عزیز : "کیا میدان جنگ سے واپس آ گئے ؟" خواجہ سرا : "لڑائی تو کب کی ختم ہو گئی ، عیسائیوں نے ادھر سے شکست کھا کر شہر عکہ پر قبضہ کر لیا ، شہر ہی میں انھوں نے پناہ لی اور متحصن ہو گئے ۔ مسلمانوں نے نصاریٰ کے خیموں اور خاص شاہی خیمے پر قبضہ کر لیا مگر شاہ رچرڈ نکل کے عکہ میں داخل ہو گیا ۔" عزیز (متفکر ہو کر) : "یہ تو بہت برا ہوا ، گو ہم نے شکست دے دی مگر ایک محفوظ مقام پر ان کا قدم جم گیا — خیر ، اور مجھے اس امر کی خبر ہی نہ ہوئی ، اسے کتنی دیر ہوئی ؟" (ص ۲۰۷ ، ۲۰۸) اس کے بعد شاہزادہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے لیکن وہاں عکہ کی شکست کی کسی گفتگو کی بجائے ملک العزیز اور ورجنا کی شادی کی گفتگو ہوتی ہے اور تھوڑی دیر بعد شام کے وقت سلطان کے حکم سے دونوں کی باہمی رضامندی پر نکاح پڑھوا دیا جاتا ہے ۔

اس ساتویں باب نے عکہ کے معرکے کا سارا دفتر ختم کر دیا ہے ۔ بہت سی تفصیلات ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ۔ عکہ کی دیواروں پر صلیبی پرچم دیکھ کر ہر مسلمان انا للہ و انا الیہ راجعون پکار اٹھا اور اسلامی کیمپ میں ہر طرف صف ماتم بچھ گئی تھی ، ہر سپاہی اشکبار اور دل گرفتہ تھا ، ایسے میں شرر کے ہیرو کی بے خبری دیدنی ہے اور پھر وہ شب جو بقول ابن شداد سلطان نے ملک جھکائے بعمر اپنے خیمے میں ٹہلتے ہوئے گزاری[1]، شرر نے شادی بیاہ کے ہنگاموں کی نذر کر کے تاریخ سے کچھ اچھا سلوک نہیں کیا ۔

آٹھویں باب "عاشقوں کو ایسی ہی جگہ چاہیے" میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہیرو ہیروئین سقوط عکہ کے دوسرے دن (۱۳ جولائی) عکہ سے مصر کے لیے روانہ ہوئے تھے اور عکہ کے مسلمانوں کا ۱۶ اگست کو مسیحیوں کے ہاتھوں قتل عام ہوا ۔ اس طرح شہزادے تک اس قتل عام کی خبر کے پہنچنے کا صحیح زمانہ ۲۲ ، ۲۳ اگست ہو سکتا ہے ، لیکن یہ بات حیرت انگیز ہے کہ اس چالیس دن کے عرصے میں اس جوڑے نے مسلسل مسافت طے کرنے کے باوجود صرف ساٹھ میل کا سفر کیا ۔ نیز یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس بیان میں عکہ کے قتل عام کو اس قدر معمولی انداز میں پیش کیا گیا ہے جیسے کوئی خاص بات ہی نہیں ہوئی ۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شرر نے ۱۶ اگست کے اس واقعے کی تفصیلات جون ۱۱۹۱ء کے آخری ہفتے کے واقعات کے ذیل میں بیان کر دی تھیں اس لیے اب صحیح جگہ پر انھیں تفصیلات کی تکرار سے بچنے کی کوشش کی ہے ۔ جون ۱۱۹۱ء کے اواخر کے واقعات میں ان تفصیلات کی موجودگی کی بحث پہلے ہو چکی ہے ۔

رچرڈ کے وقائع نگار نے عکہ کے بے گناہ مسلمانوں کے قتل عام کا جواز پیش کرنے کی بڑی ناکام کوشش کی ہے ۔ اس ضمن میں متعصب عیسائی مورخین رچرڈ کی اس بربریت کے داغ دھونے کے لیے کبھی سلطان پر وعدہ خلافی کا الزام دھرتے ہیں کہ اس نے معاہدے کی شرائط کی

۱- ابن شداد ، ص ۱۶۲ ۔

تکمیل سے انحراف کیا اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ سلطان نے عکہ کے قتل عام سے دو دن پہلے کئی سو عیسائی قیدیوں کو قتل کر دیا تھا ۔ وہ ایک عجب و غریب کھو کھلا سا جواز بھی پیش کرتے ہیں کہ اتنے کثیر التعداد قیدیوں کو سنبھالنا مشکل تھا ، اس لیے قتل کرا دیا گیا ۔ چونکہ اکثر یورپین مورخین نے بھی ان الزامات کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے ان کی تردید کر دی ہے اور رچرڈ کے اس فعل کو انتہائی ظالمانہ اور انسانیت سوز قرار دیا ہے کہ اس نے نہتے سپاہیوں کو رسیوں میں بندھوا کر ایک ہی وقت میں قتل کروا دیا اور طرہ یہ کہ انھیں پہلے خود ہی امان دے چکا تھا اس لیے ہم ان الزامات کی تردیدی بحث کو تکرار بے جا سمجھتے ہوئے نظر انداز کر رہے ہیں ۔ اس قتل عام کی صحیح صورت یہ ہے کہ جب عکہ نے ہتھیار ڈال کر شہر عیسائیوں کے سپرد کر دیا تو اگرچہ وہ شرائط صلح سلطان کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور ناقابل قبول تھیں لیکن پھر بھی اس نے اپنے قیدی سپاہیوں کی سلامتی کے لیے انھیں قبول کر لیا اور عیسائیوں کے ساتھ گفت و شنید کے بعد طے پایا کہ شرائط کی تکمیل تین قسطوں میں تین ماہ میں ہو ۔ ۲ اگست کو یہ سمجھوتا ہو گیا اور ۱۱ اگست کو جب عیسائی افسر سلطان کے کیمپ میں پہنچے تو پہلی قسط کا سامان اور قیدی موجود تھے لیکن سلطان نے یہ شرط عائد کی کہ یا تو عیسائی عکہ کے مسلمان قیدیوں کو رہا کر دیں اور پہلی قسط لے جائیں ، بقیہ دو قسطوں کی ادائی کی ضمانت کے لیے مسلمان چند افسر یرغمال کے طور پر ان کے سپرد کر دے گا ۔ بصورت دیگر عیسائی پہلی قسط کا سامان وصول کر لیں لیکن اس ضمانت کے لیے کہ قسطوں کی تکمیل تک مسلمان قیدی حفاظت سے رکھے جائیں گے اور پھر رہا کر دیے جائیں گے ، عیسائی اپنے افسر یرغمال میں دیں ۔ لیکن عیسائیوں نے دونوں صورتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا وہ صرف زبانی وعدہ کر سکتے ہیں کہ شرائط کے پورا ہو جانے پر مسلمان قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا ۔ سٹینلے لین پول لکھتا ہے کہ سلطان کو اس امر کا وسیع تجربہ اور مشاہدہ تھا کہ عیسائیوں کے وعدے اور قسمیں کس قدر بے وقعت ہوتی ہیں اس لیے اس کا مطالبہ جائز تھا[1] ۔ عیسائی مورخین کا خیال ہے کہ سلطان صلاح الدین کے اس رویے سے رچرڈ بد دل ہو گیا تھا اور اسے یقین تھا کہ سلطان شرائط صلح پوری نہیں کرے گا لیکن بقول سٹینلے لین پول اس بنا پر قیدیوں سے انتقام لینا کوئی وجہ جواز نہیں ۔ چنانچہ رچرڈ نے ۱۶ اگست کو (بقول ابن شداد ۲۰ اگست کو) ۲۷۰۰ ترکوں کو شہر سے باہر لا کر رسیوں میں بندھوا کر قتل کروا دیا ۔ مسلمانوں کا لشکر دور کھڑا اس ہجوم کو دیکھ رہا تھا اور جب اصل صورت حال سے آگاہ ہوا تو سر دھڑ کی بازی لگا کر عیسائیوں پر ٹوٹ پڑا لیکن اپنی جانوں کی قربانی دینے کے باوجود مسلمان سپاہی ان بے گناہ قیدیوں کو اس ظلم سے نجات نہ دلوا سکے ۔ اس کے بعد رچرڈ نے شہر میں ضعیفوں ، بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کروا دیا ۔ لین پول نے رچرڈ کے اس بہیمانہ رویے کی سخت مذمت کی ہے[2] ۔ فرانسیسی مورخ میچاڈ نے بھی اس واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے رچرڈ کی پر زور مذمت کی ہے ۔

۱۔ لین پول ، ص ۳۰۵-۳۰۶ ۔

۲۔ ایضاً ، ص ۳۰۸ ۔

After Saladin's almost quixotic act of clemency and generosity, the king of England's cruelty will appear amazing. But the students of the crusades do not need to be told that in this struggle the virtues of civilisation, magnanimity, toleration, real chivalry, and gentle culture, were all on the side of Saracens.

شرر نے زیر بحث بیان میں سلطان صلاح الدین کی قسم کھانے والی بات لکھ کر ناول کے آئندہ حصے میں قارئین کے جذبات کی تسکین کے لیے عیسائیوں کا مسلسل قتل عام دکھانے کا جواز پیدا کیا ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے اس کے لیے ابن الاثیر کی سند کا سہارا لیا ہے لیکن سلطان کے قریبی حلقے کے لوگ العماد الکاتب اور ابن شداد ایسی کسی قسم کا ذکر نہیں کرتے ۔ ابن شداد کے یہاں اس کے بعد کے واقعات کے ذکر سے یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ سلطان کو عکہ کے مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں کے ظلم کا سخت صدمہ تھا اور وہ اس قدر متاثر تھا کہ بعد ازاں جو بھی عیسائی جنگی قیدی اس کے سامنے لائے جاتے رہے وہ ان کے قتل کا حکم دیتا رہا[1] ۔

عکہ کے بعد رچرڈ کا کیفہ پر قبضہ ، عسقلان کی طرف پیش قدمی اور سلطان کا سوف عامر سے کیمپ اٹھا کر عسقلان کی طرف بڑھنا وغیرہ ، شرر کے بیان کردہ یہ واقعات (ص ۲۲۳ ، ۲۲۴) تاریخی صداقت پر مبنی ہیں۔ رچرڈ مسلمانان عکہ کے قتل عام کے تیسرے دن عکہ سے باہر نکل آیا اور سمندر کے کنارے پڑاؤ ڈالا ۔ سلطان نے اپنی فوجیں اگرچہ ۱۳ جولائی سے عکہ سے سوف عامر منتقل کر دی تھیں لیکن خود اس عرصے میں وہیں قیام پذیر رہا اور اس کے ساتھ صرف ۱۷ باڈی گارڈ تھے ۔ رچرڈ کے باہر نکل آنے پر سلطانی لشکر نے ایک بار بھر حملہ کیا ۔ ۲۵ اگست کو رچرڈ کی قیادت میں مسیحی فوج عکہ سے روانہ ہوئی ، فوج کے داہنے ہاتھ پر سمندر تھا اور بائیں طرف کوہ کارمل تھے۔ ان پہاڑوں میں اسلامی لشکر بھی کچھ فاصلے پر اسی جانب گامزن تھا جدھر عیسائی بڑھ رہے تھے ۔ مسلمان فوج کا ایک حصہ عیسائی فوج کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی بھی کر رہا تھا ، جونہی مسیحی لشکر ایک تنگ درے سے گزرنے لگا ، مسلمان اس کے عقب پر ٹوٹ پڑے اور ایک گھمسان کا رن پڑا ۔ اس کے بعد مسیحیوں نے کیفہ[2] پر پڑاؤ ڈالا اور دو دن کے قیام کے بعد ۲۷ اگست کو وہاں سے آگے روانہ ہوئے۔ عیسائیوں نے مصلحتاً ساحل کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کی کیونکہ اس طرح انھیں اپنے بیڑے کی مدد اور دست یابی حاصل رہی اور اسی خاطر انھوں نے سوف عامر کا رخ نہیں کیا تھا جہاں سلطان ان کی آمد کی توقع میں خیمہ زن تھا[3] ۔

نویں باب "ارے یہ کدھر سے نکل پڑے" میں شرر کا شہر تخیل بہت بلند پروازی پر ہے ۔ انھوں نے طرطورہ کے معرکے کے سلسلے میں بڑی ڈرامائیت پیدا کی ہے (ص ۲۲۹ - ۲۴۴) لیکن تقریباً سارا بیان بے بنیاد ہے۔ شرر نے اس لڑائی کے وقت رچرڈ کو عکہ میں قیام پذیر دکھایا ہے اور اس کے بھیجے ہوئے صرف پندرہ ہزار عیسائی سپاہی جہازوں پر طرطورہ آئے تھے لیکن اسی صبح سلطان نے انھیں اچانک آ لیا اور جنگ کے بعد سب عیسائی سپاہی قتل ہوئے ، جہاز مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے ۔ مسلمان مورخین اس معرکے کے بارے میں خاموش ہیں لیکن رچرڈ کا وقائع نگار لکھتا ہے کہ رچرڈ اپنی فوج سے بھی ایک دن پہلے طرطورہ (Merle) پہنچ گیا تھا ، دوسرے دن مسیحی فوج بھی طرطورہ (طنطورہ) میں داخل ہوئی لیکن انھیں ہر دم ترکوں کے حملے کا

۱- ابن شداد ، ص ۱۶۵-۱۷۲ - ۲- آج کل یہ شہر حیفہ کہلاتا ہے -

۳- ابن شداد ، ص ۱۶۵ - لین پول ، ص ۳۰۸ :

Immediately after the massacre Richard prepared to march down the coast to Ascalon, on his way to the Holy city where Saladin had so conspicuously taught the lesson of mercy.

خطرہ لاحق تھا ، بالآخر ترکوں نے حملہ کیا لیکن ایک سخت جنگ کے بعد پسپا ہو گئے[1] -
ابن شداد کے یہاں معمولی جھڑپوں کا ذکر تو ملتا ہے لیکن زیادہ تفصیلات نہیں باوجودیکہ اس
نے عکہ سے قیساریہ تک عیسائیوں اور مسلمانوں کی ساتھ ساتھ پس قدمی کی منزل بہ منزل روداد
لکھی ہے، شرر نے قلعہ العتیق کے بارے میں حواشی میں (ص ۲۲۷) جو تفصیلات دی ہیں ٹی-اے
آرچر اور رچرڈ کے وقائع نگار کے یہاں بھی ان سے ملتی جلتی تفصیلات پائی جاتی ہیں[2] -

نویں باب میں طظورہ کے مقام پر عیسائیوں کے قتل عام کا منظر دکھاتے ہوئے شرر نے
پھر اس واقعے کو اچھالا ہے کہ سلطان نے عکہ کے مظلوم شہدا کے خون کا بدلہ لینے کی قسم
کھا رکھی تھی - وہ یہ دکھاتے ہیں کہ سلطان عیسائیوں کے قتل عام کا منظر دیکھ کر بہت متاثر
تھا لیکن اس حواشی کے باوجود کہ ان کے ساتھ بھی بیت المقدس کے عیسائی قیدیوں کا سا سلوک
کرے ، اپنی قسم سے مجبور تھا - بیت المقدس کے عیسائیوں کے ساتھ سلطان کے حسن سلوک کا
یہ اشارہ ایک تاریخی پس منظر رکھتا ہے - ۲ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو جب سلطان نے بیت المقدس پر
قبضہ کیا اور نوے ۹۰ سال سے اس پر لہراتے ہوئے صلیبی جھنڈے کو اتار کر اسلامی پرچم
نصب کیا تو وہاں کے عیسائی قیدیوں کے ساتھ اس قدر رحم دلی کا سلوک کیا کہ متعصب
عیسائی مورخین بھی اس کی عظمت کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو گئے - لین پول نے اس موقع
پر سلطان صلاح الدین کی عالی ہمتی، دریا دلی، سخاوت ، فیاضی ، انسانی ہمدردی اور حسن سلوک
کی دل کھول کر داد دی ہے[3] -

دسویں باب میں شرر نے رچرڈ کو عکہ سے قیساریہ کے لیے بحری سفر کرتا دکھاتا ہے
اور لکھا ہے کہ اس کی فوج اس سے پہلے طظورہ بھیج گئی تھی ، لیکن یہ بات صحیح نہیں -
تاریخ کے مطابق رچرڈ ساحل کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کی اس پس قدمی میں لشکر کے ہمراہ
بلکہ پس پس تھا - عیسائی بیڑا بلاشبہ لشکر کے ساتھ ساحل کے قریب اسی سمت میں سفر کر
رہا تھا لیکن رچرڈ نے اس بیڑے میں سوار ہونے کی بجائے گھوڑے کی پیٹھ پر لشکر کے ہمراہ
سفر کرنا پسند کیا تھا - نیز تاریخی اعتبار سے سلطان صلاح الدین ، رچرڈ سے پہلے قیساریہ پہنچا
تھا اور اس نے قیساریہ کے برج ، فصیل وغیرہ مسمار کر دینے کا حکم دے دیا تھا تاکہ عیسائی
اس پر قبضہ کرکے اسے اپنے لیے مضبوط مورچہ نہ بنا سکیں -

شرر نے قیساریہ سے رچرڈ کے بھاگ نکلنے کا جو قصہ سنایا ہے وہ سب خیالی ہے - درحقیقت
قیساریہ میں ایک دن کے قیام کے بعد جب عیسائیوں نے پھر پس قدمی شروع کی تو یکم ستمبر
۱۱۹۱ء کو مسلمانوں نے پھر ان پر حملہ کیا اور اسی روز ارناز الطویل شہید ہوا جس کی بہادری

۱- Itin , Ric , iv, c, 7 بحوالہ آرچر ، ص ۱۳۱ - ۲- ایضاً ، ص ۲۷۳ ، ۲۷۶ و تتمہ نوٹ F -
۳- لین پول ، ص ۲۳۳-۲۳۴ -

Never did Saladin show himself greater than during this memorable surrender. His guards, commanded by responsible emirs kept order in every street, and prevented violence and insult, in so much that no ill usage of christians was ever heard of . (p 230) It was left for the Muhammaden king to teach the Christian Priest the meaning of charity, (p 231) Such was the charity which Saladin did, of poor people without number. If the taking of Jerusalem were the only fact known about Saladin, it were enough to prove him the most chivalrous and great hearted conqueror of his own, and perhaps of any, age (p. 233-34)

کا ذکر رچرڈ کا وقائع نگار بھی کرتا ہے[1] - ابن شداد نے لکھا ہے کہ ایاز الطویل کے مارے جانے کا سلطان اور نوری فوج کو سخت صدمہ ہوا[2] -

شرر نے قیساریہ کے مقام پر جنگ کا نقشہ کھینچنے کے لیے اس میں ارسوف کی جنگ کی تفصیلات و جزئیات بھی شامل کر دی ہیں اور مختلف دنوں کے واقعات کی جزئیات کو یک جا کرکے ایک دن کی داستان بنا دی ہے - ۲ ستمبر سے ۷ ستمبر تک اگرچہ عیسائی حسب معمول تین چار میل روزانہ کے حساب سے ساحل کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتے رہے لیکن اس دوران میں ان پر مسلمانوں کا دباؤ اس قدر زیادہ رہا کہ وہ سخت بد دل ہو رہے تھے - مسلمانوں کے اس دوران کے حملوں نے انھیں سخت جانی نقصان پہنچایا - James d'Avesnes اسی جنگ میں مارا گیا جس کا عیسائیوں کو بہت دکھ ہوا - صلیبی وقائع نگاروں نے عیسائیوں کی ابتر حالت اور مسلمانوں کے غلبے کی تفصیلات دی ہیں[3] -

ملک العزیز ورجنا میں نصف کے بعد کا بہت سا حصہ فرضی اور خیالی ہے - اس حصے میں بیان کردہ تاریخی واقعات کی صحیح صورت مختصراً بیان کی جاتی ہے جس سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ شرر نے اس حصے میں تاریخی صداقتوں سے کس قدر انحراف کیا ہے - ستمبر ۱۱۹۱ء میں ارسوف کی جنگ کے بعد عیسائیوں نے یافہ کا رخ کیا - سلطان نے اپنے بھائی ملک العادل کو فوج کا ایک بڑا حصہ دے کر عیسائیوں کے مقابلے پر مامور کیا اور خود عسقلان کی طرف بڑھ گیا تاکہ اسے برباد کرکے اس قابل نہ رہنے دے کہ وہاں عیسائی مضبوطی سے قدم جما سکیں - عیسائیوں نے یافہ میں پناہ لیتے ہی اس کے استحکام کی طرف توجہ دی اور دو ماہ تک وہیں پڑے رہے - اسی زمانے میں رچرڈ نے از سر نو ملک العادل کے ساتھ صلح کا نامہ و پیام شروع کیا - ادھر سلطان عسقلان کو برباد کرنے میں ہمہ تن مصروف رہا - ابن شداد کہتا ہے کہ عسقلان کو برباد کرتے ہوئے سلطان کو انتہائی دکھ ہو رہا تھا اور اس نے کہا بھی کہ اگر اس کے سارے بیٹے مر جاتے تو اسے اتنا دکھ نہ ہوتا جتنا عسقلان کے ایک پتھر کو ہٹاتے ہوئے ہو رہا ہے ، لیکن یہی رضائے الٰہی ہے اور مسلمانوں کی سلامتی کے لیے ناگزیر ہے[4] -

عسقلان چونکہ مصر کے قریب واقع تھا اور ایک مضبوط بندرگاہ کی حیثیت سے بحری اور بری حملوں کے لیے ایک زبردست اڈے کا کام دے سکتا تھا اس لیے سلطان کی یہ احتیاطی تدبیر بڑی حکمت اور دانشمندی پر مبنی تھی[5] - سلطان کو عسقلان کے مکمل برباد و مسمار کرنے میں پورا ایک ماہ صرف کرنا پڑا - عیسائیوں کو جب عسقلان کی بربادی کی اطلاع ملی تو انھیں بیت المقدس کا حصول مزید مشکل نظر آنے لگا کیونکہ انھیں اندازہ ہو گیا کہ سلطان بیت المقدس کی حفاظت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا[6] -

ادھر یافا میں عیسائیوں نے اس دوران میں ملک العادل سے صلح کی گفتگو شروع کر رکھی تھی ، بعض مورخین کا خیال ہے کہ ملک العادل قصداً اس گفتگو کو طول دے رہا تھا

۱- Itin , Ric , iv , c, 7 بحوالہ آرچر ، ص ۱۴۴ -
۲- ابن شداد ، ص ۱۷۲ -
۳- Itin , Ric , iv, c 7 بحوالہ آرچر ، ص ۱۴۴-۱۶۲ -
٤- ابن شداد ، ص ۱۷۹ -
٥- لین پول ، (ترجمہ) ص ۲۶۵ -
٦- ایضاً

تاکہ سلطان کو عسقلان کے مسمار کرا دینے کا پورا وقت مل جائے۔ اسی زمانے میں (۲۰ اکتوبر ۱۱۹۱ء) رچرڈ نے ملک العادل سے اپنی بیوہ بہن کی شادی کی پیش کش کی تھی جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، اور جسے شرر نے چار ماہ پہلے کے واقعات میں شامل کر کے ناگوار زمانی تصرف کیا ہے[۱]۔

سلطان صلاح الدین نے عسقلان کو برباد کر کے رملہ میں اپنا کیمپ لگایا اور اس کے بعد یروشلم منتقل ہو گیا تاکہ وہاں کے حفاظتی انتظامات کو مستحکم بنا سکے[۲]۔ دسمبر ۱۱۹۱ء میں عیسائیوں نے یافا سے بیت المقدس کا رخ کیا اور بمشکل گیارہ میل پیش قدمی کر کے رملہ پہنچے اور اس تباہ شدہ شہر میں چھ ہفتے قیام کیا[۳]۔ شرر نے یافا سے رچرڈ کے شکست کھا کر رملہ کی طرف بھاگنے کا واقعہ بیان کیا ہے جو درست نہیں ہے۔ رملہ میں چھ ہفتے کے قیام کے بعد رچرڈ اپنے لشکر کے ساتھ مزید سات آٹھ میل بیت نوبہ تک آگے بڑھا اور وہاں مختصر قیام کے بعد لشکر سمیت واپس لوٹ پڑا[۴]۔ اس زمانے میں مختلف عیسائی گروہوں میں اس صلیبی جنگ اور اس کی منصوبہ بندی کے بارے میں اس قدر مختلف نظریات ابھر آئے تھے کہ ان میں انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ رچرڈ کو اس انتشار اور مایوسی کی بدولت واپس لوٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔ رملہ پہنچ کر بعض عیسائی سپاہی یافا اور بعض عکہ چلے گئے۔ فوج کے بے کار لڑتے رہنے سے ان میں پیدا ہونے والی مایوسی، بے راہ روی اور تن آسانی کو رچرڈ محسوس کر رہا تھا اس لیے اس نے باقی فوج کو لے کر عسقلان کی طرف کوچ کیا اور برسات کے موسم میں اس دلدلی علاقے سے بدقت تمام گزر کر عسقلان پہنچا[۵]۔ رچرڈ چار ماہ تک عسقلان میں قیام پذیر رہا اور عیسائی مورخین کہتے ہیں کہ اس قیام کا منظر عجیب تھا کہ وہ فوج جو دور دراز سے بیت المقدس کو آزاد کرانے آئی تھی خود یہاں ایک شہر کی تعمیر میں روز و شب مصروف تھی[۶]۔ رچرڈ کا لشکر عسقلان کی تعمیر میں مصروف رہا اور ملک العادل ان کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتا رہا۔ عسقلان میں قیام کے دوران رچرڈ نے پھر ملک العادل سے صلح کی گفتگو شروع کی اور ملک العادل رچرڈ کے پیغامات سلطان تک بیت المقدس پہنچاتا رہا لیکن سلطان کو وہ شرائط منظور نہیں تھیں جن پر عیسائی صلح کرنا چاہتے تھے۔

مئی ۱۱۹۲ء میں رچرڈ نے پھر بیت المقدس پر حملے کا ارادہ کیا اور داروں پر قبضہ کرنے کے بعد وہ بیت جبران تک بڑھا، پھر بیت نوبہ پر کیمپ لگا کر ایک ماہ تک وہاں ٹھہرا رہا[۷]۔ اس زمانے میں بھی قاصد اس کی طرف سے صلح کے پیغام و شرائط لے جاتے رہے۔ رچرڈ اب ہر طرح مایوس ہو گیا تھا۔ مجبوراً اس نے انگلستان واپس چلے جانے کا ارادہ کیا اور بیت نوبہ سے کیمپ اٹھا کر واپس عکہ چلا گیا[۸]۔ اسی اثنا میں جب کہ رچرڈ عکہ سے جہازوں پر سوار ہو کر انگلستان کی واپسی کا ارادہ کر رہا تھا سلطان کو معلوم ہوا کہ وہ کسی اسلامی شہر پر تاخت کا ارادہ رکھتا ہے چنانچہ سلطان ۲۷ جولائی ۱۱۹۲ء کو علی الصباح

۱- شرر: ملک العزیز ورجنا، ص ۱۲۵، ۱۲۶، ۲۶۳۔
۲- ابن شداد، ص ۱۸۲۔
۳- لین پول، (اردو ترجمہ) ص ۲۷۰، ۲۷۱۔
۴- ایضاً۔
۵- ایضاً، ص ۲۷۱، ۲۷۳
۶- ایضاً۔
۷- ابن شداد، ص ۲۰۴، ۲۰۸۔
۸- ایضاً و لین پول، ص ۲۷۶، ۲۷۸۔

فوج کے ساتھ بیت المقدس سے روانہ ہوا اور اسی شام اس نے یافا پہنچ کر محاصرہ کر لیا[1] ۔ سلطان کے یافا پہنچ جانے کی خبر سن کر رچرڈ عین اس وقت جب کہ وہ انگلستان روانہ ہو رہا تھا[2] ، یافا کی طرف بڑھا ، لیکن سلطان نے دو دن کے اندر اندر یافا کو فتح کر لیا تھا ۔ رچرڈ جب یافا پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہاں صلیبی پرچم کی بجائے اسلامی پرچم لہرا رہا تھا[3] رچرڈ نے اپنی حیرت اور سلطان کی بہادری کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ سلطان نے معجزانہ طور پر اس شہر کو دو دن میں فتح کر لیا جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ سلطان کو کم از کم دو ماہ کا عرصہ لگے گا[4] ۔ بہر کیف رچرڈ نے بھی وہاں پہنچ کر اپنی ہی سرعت سے بساط الٹ دی جتنی سرعت سے سلطان نے یافا کی قسمت کا پانسہ پلٹا تھا ۔ گویا یافا تین دن میں دو بار دو مختلف قوتوں کے ہاتھوں مفتوح ہوا[5] ۔

اس کے بعد رچرڈ کی طرف سے صلح کی گفتگو ہوتی رہی اور ۵ اگست ۱۱۹۲ء کو ایک معرکے کی جنگ ہوئی ۔ یہی وہ معرکہ تھا جس میں رچرڈ کا گھوڑا مارا گیا تھا اور وہ پیدل جنگ لڑ رہا تھا ۔ سلطان نے رچرڈ کو میدان کار زار میں پیدل جنگ آزما دیکھ کر فوراً دو اعلیٰ عربی گھوڑے بھجوائے جو رچرڈ نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیے[6] ۔ سلطان اس جنگ کے بعد پھر بیت المقدس لوٹ گیا اور ملک العادل کے ساتھ رچرڈ کی صلح کی بات چیت ہوتی رہی ۔ رچرڈ شدید بیمار تھا اور اس بیماری کے دوران ۲ ستمبر ۱۱۹۲ء کو صلح نامے پر فریقین نے دستخط کیے ۔ ۹ اکتوبر ۱۱۹۲ء کو رچرڈ عکہ سے انگلستان روانہ ہو گیا[7] ۔

ان مذکورہ بالا تفصیلات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شرر نے ملک العزیز ورجنا کے گیارہویں باب سے آخر تک کس قدر تخیل کی رنگ آمیزی کی ہے ۔ صلح میں تو انھوں نے خاص طور پر ڈرامائیت پیدا کی ہے ۔ اس میں تاریخی صداقت صرف اس قدر ہے کہ سلطان صلح کے وقت بہ نفس نفیس موجود نہیں تھا اور ملک العادل نے دیگر عمائدین کے ساتھ صلح نامے پر دستخط کرکے حلف اٹھایا لیکن رچرڈ نے حلف نہیں اٹھایا تھا ۔

شرر نے پندرہویں باب میں رچرڈ کی گرفتاری اور رہائی کا واقعہ بیان کیا ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس واقعے کے لیے تھوڑی سی تاریخی بنیاد موجود ہے لیکن شرر نے اس میں بہت زیادہ تصرف کیا ہے ۔ اصل واقعہ صرف اس قدر ہے کہ نومبر ۱۱۹۱ء میں جب عیسائی لشکر یافا میں بے کار پڑا ہوا تھا ، ایک دن رچرڈ چند افسروں کی معیت میں شکار کھیلنے نکلا ۔ شکار کھیلنے کے بعد وہ سب سستانے کے لیے ایک درخت کے نیچے اتر پڑے اور تھکاوٹ کی وجہ سے رچرڈ سو گیا ۔ اسی اثنا میں ترکوں کی ایک جماعت ان پر آ پڑی اور گھیرے میں لے لیا ۔ رچرڈ کا اس گھیرے سے بچ نکلنا مشکل تھا لیکن اتفاق سے اس نے کوئی شاہی نشان لباس پر نہیں لگا رکھا تھا ۔ اس کے ساتھیوں میں سے ایک فرانسیسی سردار ولیم دی پیرو (William de Preaux) نے جب یہ نازک صورت حال دیکھی تو عربی میں چلا اٹھا میں بادشاہ ہوں ، مجھے چھوڑ دو

۱۔ ابن شداد ، ص ۲۲۰ ۔
۲۔ لین پول ، ص ۳۸۱ ۔
۳۔ ابن شداد ، ص ۲۲۲-۲۲۳ ۔
۴۔ ایضاً ۔
۵۔ ابن شداد ، ص ۲۲۴-۲۲۶ ۔
۶۔ ایضاً ، و لین پول ، ص ۳۸۷ ۔
۷۔ ابن شداد ، ص ۲۳۵-۲۳۶ ۔

تمھیں فدیہ دے دوں گا ۔ یہ سنتے ہی ترک ہر طرف سے بے نیاز ہو کر ولیم کو گرفتار کر لینے کی کوشش کرنے لگے اور اس میں کامیاب ہو گئے لیکن رچرڈ کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا ۔ اس طرح ایک سردار کی حاضر دماغی اور قربانی نے رچرڈ کی جان بچا دی ۔ اس واقعے پر تمام عیسائی اور مسلمان مورخین متفق الرائے ہیں[1] ۔ شرر نے اسی واقعے کو توڑ مروڑ کر بیان کیا ہے ۔

۲۔ حسن انجلینا :

یہ شرر کا دوسرا تاریخی ناول ہے جو ملک العزیز ورجنا کے بعد ۱۸۸۹ء میں "دلگداز" میں قسط وار شائع ہوا ۔ شرر کے مطابق اس ناول کا زمانہ جنگ کریمیا کے بعد ۱۸۷۲ء کا ہے جب روس نے صلح نامہ پیرس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بحر اسود میں اپنے بحری بیڑے کا عمل دخل بڑھانا شروع کیا تھا ۔

حسن انجلینا میں مقصد کے اعتبار سے بیک وقت تین مختلف لہریں جاری دکھائی دیتی ہیں ۔ ایک مقصد تو حسن اور انجلینا کی داستان ہجر و وصال کا بیان ہے ، دوسرا ایرانیوں اور ترکوں کے سنی شیعہ اختلافات کے باعث مسلمانوں میں مجموعی طور پر انتشار کی کیفیت کا اظہار اور تیسرے رومیوں کے خلاف چند محاذوں پر ترکوں کی شجاعانہ جنگ کا مذکور — اس ناول میں شرر نے خلاف توقع دوسرے اور تیسرے مقصد کو زیادہ اہمیت دی ہے ۔ غالباً ان کا مقصد سنی شیعہ اختلافات کے برے نتائج کو اجاگر کرکے قوم کو فروعی اختلافات سے اجتناب اور باہمی اتحاد کا درس دینا تھا ۔ اس ضمن میں شرر نے لکھا ہے :

"دلگداز کے ساتھ اس سال جو ناول شروع کیا گیا تھا وہ بھی اب پورا ہوگیا جس کا نام "شاہزادہ حسن اور انجلینا" ہے ۔ اس ناول کے ذریعے سے زیادہ اسی امر پر زور دینا مقصود تھا کہ شیعوں اور سنیوں کے باہمی تعلقات کا نمونہ دکھایا جائے اور ان کی خرابیاں ظاہر کرکے موقع دے دیا جائے کہ ہر شخص اس ناول کے ملاحظہ کے بعد اپنے باہمی مذہبی تعلقات کو عمدہ اور شائستہ بنائے ۔ اس امر میں ہم کو بے شک کامیابی ہوئی اور ہم نے بتا دیا کہ ایک دوسرے کی عداوت سے کیسے خراب نتیجے پیدا ہوتے ہیں[2] ۔"

تاریخی واقعات کا خلاصہ

حسن انجلینا میں بیان کردہ تاریخی واقعات مختصراً یہ ہیں کہ شہر باطوم سے دس میل شمال کی طرف کوہ قاف کے دامن میں عین ساحل پر ایک قلعہ نما شکستہ عمارت پر روسی جھنڈا لہرا رہا تھا ، رات کے وقت اس عمارت کے اندر اچانک آگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور جب روسی فوجی عمارت سے باہر نکلے تو ساحل کی طرف سے ترکی جہازوں نے ان پر شدید گولہ باری کی جس کی تاب نہ لا کر روسیوں نے طفلس کے اہم روسی فوجی مرکز کا راستہ لیا ۔ اس دوران ایک ترک فوجی دستہ جس کا سردار محمود پاشا نامی ایک معمر ترک تھا اسی مقام سے باطوم کی طرف روانہ ہوا ۔ یہ دستہ حسن پاشا کو روسیوں کی قید سے چھڑانے آیا تھا اور انھیں نے قلعے میں آگ لگائی تھی ، لیکن باطوم پہنچنے سے پہلے ہی حسن پاشا پھر راستے میں غائب ہو گیا ۔

مذکورہ بالا واقعے کے دوسرے دن علی الصباح حسن پاشا اسی آتش زدہ عمارت سے نکل کر مشرقی پہاڑوں کی سمت روانہ ہوا ۔ راہ میں اسے گھوڑ سوار عورتوں کا ایک گروہ ملا جن

۱۔ لین پول ، ص ۳۲۵ ۔
۲۔ اداریہ دلگداز ، اختتام سال ۱۸۸۹ء

میں ایک کو سب ملکہ کہہ کر مخاطب کرتی تھیں ۔ اچانک دو ایرانی وہاں نمودار ہوئے اور ملکہ کو زبردستی اغوا کرنا چاہا لیکن وہ دونوں حسن پاشا کے ہاتھوں مارے گئے اور ملکہ ممنون ہو کر حسن پاشا کو ہمراہ لے گئی ۔ راستے میں انہیں بارہ ہزار روسی سپاہ دو توپخانوں کے ساتھ اسی آتش زدہ عمارت کی طرف بڑھتی نظر آئی اور پھر اچانک چار ترکی جہازوں نے ساحل کی طرف سے ان پر گولہ باری شروع کر دی ۔ دو گھنٹے بعد مزید ترکی جہاز بھی اس کارروائی میں شریک ہو گئے ۔ پھر ان جہازوں سے دو ہزار ترکوں نے ساحل پر اتر کر شدید مقابلے کے بعد روسیوں کو مار بھگایا ۔ عورتوں کے اس گروہ نے یہ جنگ چھپ کر دیکھی اور پھر روانہ ہو کر بحر اسود کے کنارے ایک خوبصورت عمارت میں پہنچیں جو ملکہ یعنی انجلینا کی رہائش گاہ تھی ۔

انجلینا ، حسن پاشا کو ہمراہ لے آئی تھی ، لیکن متفکر تھی کہ اگر روسیوں کو علم ہو گیا تو خود اس کے جان و مال بھی محفوظ نہ ہوں گے ، ویسے بھی یہ مقام جنگ کی وجہ سے مخدوش تھا ، کسی بھی وقت ترک یا روسی اس کوٹھی پر قبضہ کر سکتے تھے ۔ انجلینا کی خاص خادمہ مریم سے حسن پاشا کو معلوم ہوا کہ انجلینا کا نانا ٹامس پولینڈ کا باشندہ تھا اور جب روسیوں نے پولینڈ کے مفتوح باشندوں پر دست ستم دراز کیا تو وہ اپنی بیوی کے ہمراہ آسٹریا چلا گیا جہاں کے بادشاہ نے اس کی قدر دانی کی اور کچھ عرصہ بعد وہ گلشیا کے صوبے کا گورنر بنا دیا گیا ۔ گلشیا میں ٹامس کا خاندان اس کی بیوی، بیٹی سوفیا اور بیٹی کی خادمہ جین پر مشتمل تھا ، جین کو ٹامس نے ویانا میں ایک غریب عیسائی سے لے کر پالا تھا ۔ سوفیا ایک دن حسب معمول پہاڑوں پر سیر و شکار کے لیے گئی ہوئی تھی کہ وہاں سلیمان نامی ایک شخص سے ملاقات ہوگئی ، وہ اسے اپنے ہمراہ لے آئی اور خفیہ طور پر اپنے باغ میں ٹھہرا دیا ۔ سوفیا کے دل میں سلیمان کی محبت گھر کر گئی ۔ سلیمان کو حکومت آسٹریا نے سرویا کے ایک پادری کو اسلام کا قائل کر لینے اور ویانا میں تبلیغ اسلام کے جرم میں سرکاری مجرم اور باغی قرار دے رکھا تھا ۔ وہ قسطنطنیہ کے سلطان کے چچا کا پوتا تھا ۔ جین سوفیا کے ہمراہ تھی اس لیے سلیمان کی اصلیت کا اسے بھی علم ہو گیا ۔ وہ اپنی خالہ سے ملاقات کے بہانے ویانا گئی اور وزیر جنگ کے بیٹے سے شادی کا وعدہ لے کر سلیمان کے بارے میں معلومات فراہم کر دیں ۔ شہنشاہ آسٹریا نے ٹامس ، سوفیا اور سلیمان تینوں کی گرفتاری کے لیے فوج روانہ کی لیکن قبل از وقت اطلاع ہو جانے کے باعث سوفیا اور سلیمان ایک راستے سے اور ٹامس دوسرے راستے سے فرار ہو گئے ۔ روسی عملداری میں پہنچ کر سلیمان کو معلوم ہوا کہ ٹامس گرفتار ہو کر شہنشاہ کے سامنے پیش ہوا اور قتل کر دیا گیا ۔ اب سوفیا اور سلیمان نے شادی کرکے شہر کمور کے قریب دریائے ڈسنا اور ڈنائیپر کے سنگم پر عمارت بنا کر رہائش اختیار کی ۔ سلیمان کی تجارت کو جلد ہی فروغ حاصل ہوا ، ایک برس بعد انجلینا پیدا ہوئی جسے سلیمان نور الصباح کہہ کر پکارتا تھا ۔ کچھ عرصہ بعد سلیمان اڈیسہ میں روس کے کمانڈنگ افسر سے مل کر روسی فوج میں کرنل بھرتی ہو گیا ۔ یہاں ایک شہزادہ میرزا عباس بھی روسی فوج میں افسر تھا ۔ دونوں میں اول اول دوستی اور پھر مذہبی اختلافات کی بنا پر رنجش پیدا ہو گئی ۔ ایک دن ماسکو کے بازار میں دونوں میں تصادم ہو گیا ۔ عباس سلیمان کی تلوار سے زخمی ہوا اور سلیمان عباس کے پستول سے مارا گیا ۔ سوفیا صدمے کی تاب نہ لا کر چار پانچ دن میں چل بسی ۔ اس وقت انجلینا چار برس کی تھی ۔

روسی وزیر جنگ کے فیصلے کے مطابق انجلینا کو اختیار دیا گیا کہ وہ چاہے تو ترکستان چلی جائے یا جارجیا میں اپنی کسی پسند کے مقام پر قیام کرے اور حکومت سے چار ہزار ماہانہ وظیفہ لے ۔ علاوہ ازیں اس کی جائیداد بیچ کر اس کے نام سے رقم بنک میں جمع کر دی جائے ۔ انجلینا نے دوسری صورت قبول کی جس کے مطابق جائیداد کی رقم نو لاکھ روپے بنک میں جمع کر دی گئی جس سے اسے وظیفے کے علاوہ ماہانہ تین ہزار چھ سو روپے سود بھی ملتا رہا ۔ حسن پاشا سے ملاقات تک انجلینا اس مقام پر بارہ برس ایک روسی اتالیق کی نگرانی میں گزار چکی تھی ۔

حسن پاشا نے انجلینا کو اپنی اصلیت سے آگاہ کیا اور چاہا کہ وہ اس کے ساتھ ترکی چلی جائے لیکن شہزادی نے وقتی طور پر اس فیصلے کو ملتوی رکھنے پر اصرار کیا ۔

ادھر محمود پاشا کو مصطفے پاشا کی طرف سے حکم ملا کہ جس طرح بھی ہو حسن پاشا کو تلاش کرکے لائے چنانچہ اسی جستجو میں محمود پاشا انجلینا کی کوٹھی تک جا پہنچا جہاں اسے روسی پہریداروں نے گھیر لیا لیکن وہ دو کو زخمی کرکے پہاڑوں میں جا چھپا ۔ حسن پاشا نے اسے رات کو ڈھونڈ نکالا اور ہمراہ لے گیا ۔ اسی رات حسن پاشا کی ملاقات چھ ایرانیوں سے بھی ہوئی جنہیں روسی سپاہیوں نے لوٹ لیا تھا اور وہ وہاں پناہ کے لیے پہنچے تھے ۔ ان میں سے ایک، میرزا عباس، کے ساتھ حسن پاشا نے بحث کرکے اسے آمادہ کیا کہ وہ ایرانیوں کو بھی ترکوں کی مدد کے لیے تیار کرے اور اس وقت سنی شیعہ اختلافات کو اسلام کے مفاد کی خاطر بھلا دیا جائے ۔ اس دوران میں مصطفے پاشا اسی آتش زدہ عمارت میں فوج کے ساتھ مقیم تھا کہ رات کو اٹھارہ ہزار روسی فوج نے دو توپخانوں کے ساتھ حملہ کرکے اس قلعے پر قبضہ کر لیا لیکن طاطوم سے دس ہزار کی ترکی کمک آ جانے پر مصطفے پاشا نے بحری بیڑے کی مدد سے دوبارہ قلعے پر قبضہ کر لیا ۔

میرزا عباس طہران کا باشندہ تھا ، حسن پاشا سے وعدہ کرکے آذربیجان پہنچا جہاں ان دونوں طفلس وغیرہ کے روسی علاقے کے مسلمان پناہ گزین تھے ۔ میرزا عباس نے جب ان لوگوں میں جہاد کی تبلیغ شروع کی تو والیٔ آذربیجان میرزا کاظم نے اسے طلب کیا اور پھر باہمی مشورے سے طے پایا کہ ایسے حالات نہ پیدا ہونے دیے جائیں کہ روس سے حکومت ایران کا براہ راست تصادم ہو بلکہ نخچوان ، اروان ، طفلس وغیرہ سے آئے ہوئے مسلمانوں کو جہاد کے لیے تیار کیا جائے ۔ چنانچہ میرزا عباس اور اس کے ساتھیوں نے پندرہ دن میں تیرہ ہزار جلا وطن مسلمانوں کو جمع کر لیا ۔ حسن پاشا اور مصطفے پاشا کو مطلع کیا گیا چنانچہ جلد ہی دو سو ترک افسر اسلحہ سمیت ایران کی سرحد پر پہنچ گئے جہاں کوہ ارارات کے دامنوں میں پندرہ دن میں مجاہدین کو قواعد سکھائی گئی اور پھر یہ فوج میرزا عباس سمیت علی پاشا کی کمان میں پینتالیس میل کا سفر کرکے دریائے آرس کے پار اتر گئی ۔ مجاہدین نے شہر اروان میں مقیم دو ہزار روسی فوجیوں کو تہ تیغ کرکے ان کے ایک توپخانے پر قبضہ کر لیا اور پھر وہاں سے دس میل آگے شہر اشپاوزین پر حملہ کیا جہاں چار ہزار روسی فوج اور دو توپخانے تھے ۔ اشپاوزین میں نصف روسی قتل ہوئے باقی اسکندرو پول کی طرف بھاگ نکلے ۔ یہاں آٹھ توپیں بھی مجاہدین کے ہاتھ لگیں ۔

اسکندرو پول میں جو اشپاوزین سے ساٹھ میل کے فاصلے پر تھا پندرہ ہزار روسی فوج اور

ستر توپیں تھیں۔ اسپاوزین کے مفروروں اور مزید کمک کے پہنچ جانے سے وہاں ستائیس ہزار فوج اور توپیں ہو گئیں۔ روسیوں نے بیس ہزار سپاہیوں اور چھ توپخانوں کے ساتھ اسکندرو پول سے پندرہ میل اسپاوزین کی طرف بڑھ کر ناکہ بندی کر لی۔ مصطفٰے پاشا نے اسپاوزین کی فتح اور اسکندرو پول کی طرف علی پاشا کی پیش قدمی کی خبر سن کر حمید پاشا کی سرکردگی میں دس ہزار ترک اور دو توپخانے مدد کے لیے بھیجے۔ اس اثنا میں پندرہ ہزار مزید ایرانی بھی تربیت حاصل کرکے میرزا عباس سے جا ملے۔ اسکندرو پول کے راستے میں مورچہ بند فوج سے پہلے دن کے مقابلے میں آٹھ ہزار تین سو چوبیس روسی اور پانچ ہزار مجاہد ہلاک ہوئے۔ دوسرے دن روسی نو ہزار لاشیں چھوڑ کر اسکندرو پول کی طرف بھاگے۔ ادھر مصطفٰے پاشا نے سینٹ نکولس پر بھرپور حملہ کرکے اسے فتح کر لیا جہاں ایک لاکھ روسی فوج مقیم تھی۔ اس قلعے کو فتح کرنے میں ساڑھے چار ہزار ترکوں نے جام شہادت پیا۔ مصطفٰے پاشا نے خلیل پاشا کو قلعے کا سردار مقرر کرکے خود اسکندرو پول کا رخ کیا جہاں علی پاشا، حمید پاشا اور میرزا عباس روسیوں کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ مصطفٰے پاشا کے پہنچ جانے پر مسلمانوں نے مختلف اطراف سے زبردست حملہ کرکے اسکندرو پول فتح کر لیا، صرف دو تین ہزار روسی جان بچا کر بھاگ سکے باقی سب قتل ہوئے۔

اسکندرو پول میں مصطفٰے پاشا نے میرزا عباس سے اس خدشے کا اظہار کیا کہ ایرانی موذن کی اذان میں اشھد ان علیا ولی اللہ خلیفہ بلافصل کا کلمہ باعث فساد بن سکتا ہے۔ پھر اخل کلاکی کی طرف عباس کی پیش قدمی کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے ہر ممکن مدد کا یقین دلایا اور سینٹ نکولس واپس چلا گیا۔ وہاں محمود پاشا نے اسے مطلع کیا کہ وہ حسن اور انجلینا کے مشورے سے ایک جہاز لے کر انہیں لانے گیا تھا لیکن جہاز کے پہنچنے سے پہلے ہی شہزادی اچانک لا پتہ ہو گئی تھی۔ حسن پاشا کو بڑی منت سماجت سے لایا گیا تھا۔ مصطفٰے پاشا کو یہ بھی معلوم ہوا کہ روسیوں نے تمام شہروں کی مضبوط قلعہ بندیاں کرکے طفلس سے بیس میل کے فاصلے پر پچاس ہزار فوج اور ساٹھ توپوں سے ناکہ بندی کر لی تھی اور اسکندرو پول سے پچاس میل دور اخل کلاکی پر بھی ان کی اسی ہزار فوج موجود تھی، مصطفٰے پاشا نے رشید پاشا کو بیس ہزار فوج کی کمان دے کر اخل زک روانہ کیا اور خود حسن پاشا سے مل کر اسے تسلی دی اور اسے کوہ قاف کے پہاڑوں میں جنگ میں حصہ لینے پر آمادہ کیا جہاں شہزادی کے ملنے کا بھی امکان ہو سکتا تھا۔ حسن پاشا دس ہزار سوار لے کر جلد ہی رشید پاشا سے جا ملا۔ دونوں نے مل کر اخل زک کا محاصرہ کیا جہاں چالیس ہزار روسی فوج اور چوبیس توپیں تھیں۔ پہلے دن کی جنگ میں دس ہزار روسی طفلس کی طرف بھاگ گئے اور دوسرے دن سات ہزار چھ سو باون گرفتار اور باقی قتل ہوئے۔ اس معرکے میں گیارہ ہزار ترک بھی شہید ہوئے۔ قیدی دو ہزار ترکوں کی نگرانی میں سینٹ نکولس بھیج دیے گئے۔

میرزا عباس نے اخل کلاکی پر تابڑ توڑ حملے کرکے اسے فتح کر لیا۔ یہاں دس ہزار ایرانی اور پینتیس ہزار روسی مارے گئے۔ اس فتح کے دوسرے روز عباس دس ہزار سپاہیوں کے ہمراہ مصطفٰے پاشا کے پاس سینٹ نکولس گیا جہاں سے ایک جنگی جہاز کریمیا میں عمر پاشا سے مزید پیش قدمی کی اجازت حاصل کرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ یہاں قیام کے دوران عباس

کو معلوم ہوا کہ روسوں نے طفلس سے بڑھ کر اخل کلاکی سے دس میل پر مورچہ بندی کر لی ہے۔ نیز اخل کلاکی میں کئی بار سنی شیعہ فساد ہوتے ہوتے بچا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ حسن پاشا اخل زک کے معرکے میں موجود تھا لیکن پھر لا پتہ ہو گیا۔ عباس پھر اخل کلاکی پہنچا تاکہ ترکوں اور ایرانیوں کو ایک جگہ جمع نہ ہونے دے۔ یہاں سے اس نے چند سپاہیوں کو فقیروں کے بھیس میں حسن اور انجلینا کی تلاش میں کوہ قاف کی طرف روانہ کیا اور خود فوج کے ہمراہ طفلس کی طرف بڑھا لیکن تمام اونچی پہاڑیوں پر روسی مورچے سد راہ ہوئے۔ علی پاشا نے دو دن کی مسلسل کوششوں سے ایک مورچے پر قبضہ کر لیا۔

ادھر شمال کی طرف پہاڑوں میں ایک طے شدہ پروگرام کے تحت حسن اور مریم کی ملاقات ہوئی اور حسن کو معلوم ہوا کہ انجلینا کو طفلس کے گورنر نے زبردستی اغوا کرایا تھا اور ہر طرح سے ڈرا دھمکا کر یہ اعتراف کرانا چاہا کہ اس کا ترکوں سے کوئی رابطہ تھا۔ پھر انجلینا کو کامروف نامی ایک روسی افسر کے سپرد کر دیا گیا جو اب خود بھی اس کی زلف کا اسیر تھا۔ مریم بھی کسی طرح خود ہی کامروف تک جا پہنچی تھی، اب شہزادی کو کامروف اپنے ہمراہ میدان جنگ کی طرف لے جا رہا تھا اور شہزادی کے ایما پر ہی مریم ان پہاڑوں میں حسن سے ملنے کے لیے پہنچی تھی۔ کچھ دیر بعد انجلینا روسی فوج کے ہمراہ اس علاقے سے گذری اور مریم بھی حسن سے یہ وعدہ کر کے رخصت ہو گئی کہ وہ اسے میدان جنگ میں انجلینا کے مورچے کے بارے میں مطلع کرے گی۔

علی پاشا اور میرزا عباس کی فوج دس دن سے روسوں کے ساتھ ان پہاڑوں میں نبرد آزما تھی۔ چالیس ہزار ترک کمک پر آ چکے تھے اور حسن پاشا بھی میدان جنگ میں پہنچ چکا تھا۔ ایک روز ترکوں نے بہت زور مار کر ایک روسی مورچے پر قبضہ کر لیا، ایرانی بھی پیچھے اور ان کے ایک سردار حیدر نے وہی متنازعہ نعرہ لگایا جس پر ایک ترک نے فوراً مشتعل ہو کر اسے گولی سے اڑا دیا۔ اس پر فساد پھیل گیا اور بمشکل ایرانیوں کو ان کے مورچے پر واپس بھیجا گیا۔

حسن پاشا کو مریم کی طرف سے متعلقہ مورچے کی نشاندہی ہوئی تو اس نے اس مورچے پر اپنے حملے کے ارادے سے عباس کو بھی مطلع کیا۔ دوسرے دن حسن نے بیس ہزار ترکوں سے مذکورہ مورچے پر حملہ کر دیا۔ عباس نے دیکھا کہ ایرانی مدد کرنے میں پس و پیش سے کام لے رہے ہیں تو اکیلا چل پڑا، یہ دیکھ کر چالیس ہزار ایرانیوں نے ساتھ دیا۔ مورچے پر قبضہ ہو گیا، کامروف مارا گیا اور انجلینا اور مریم حسن پاشا سے ملیں لیکن چند لمحوں بعد پھر ترکوں اور ایرانیوں میں کشت و خون شروع ہو گیا۔ روسوں نے موقع غنیمت جان کر پھر مورچے پر حملہ کر دیا۔ حسن نے مریم اور انجلینا کو مردانہ کپڑے پہنائے اور مسلمان بےجگری سے لڑتے مرتے روسی نرغے سے نکلنے کے لیے پیچھے ہٹے۔ اس کارروائی میں آدھے ترک اور ایرانی کٹ گئے، علی پاشا بھی مارا گیا۔ حسن پاشا اس کے لیے سخت مغموم تھا۔

مصطفیٰ پاشا کو اطلاع ہوئی تو اس نے علی پاشا کی جگہ ایک متعصب افسر جمیل پاشا کو متعین کیا جس نے حسن پاشا کی رائے کے برعکس ایرانیوں کو میدان جنگ میں تنہا چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور رات کو خاموشی سے اپنی فوج سمیت اخل کلاکی روانہ ہو گیا۔ راستے میں سے میرزا عباس کے نام ایک خط دیا کہ ایرانی یہ علاقے خالی کر کے آذر بیجان چلے جائیں۔

علی الصباح ایرانیوں نے ترکوں کے مورچے خالی دیکھے ۔ عباس نے افسروں کو جمع کر کے ان کی حماقت پر برا بھلا کہا اور جمیل پاشا کا خط بھی سنایا ۔ ایرانی سرداروں نے میرزا عباس کی رائے کے خلاف مفتوحہ علاقوں پر اپنے قبضے کا دعویٰ کیا اور میرزا کاظم کو افسر بنا کر اسی طرح رات کو مورچے خالی کر کے اخل کلاکی کا رخ کیا ۔ میرزا عباس ان سے الگ ہو کر اخل زک چلا گیا ۔

ایرانی جب اخل کلاکی کے سامنے پہنچے تو جمیل پاشا ان کا منشا دریافت کر کے انتہائی برہم ہوا ۔ فریقین میں اخل کلاکی کے باہر جنگ چھڑ گئی ۔ اسکندرو بول سے مزید ترک کمک بھی آ گئی ۔ ایرانیوں کا گولہ بارود پہلے ہی ختم ہو رہا تھا ، قریب تھا کہ بری طرح شکست کھا جائیں کہ اتنے میں اخل زک سے حسن پاشا آ پہنچا ۔ اس نے سفید جھنڈی ہلا ہلا کر جنگ رکوائی ۔ جمیل پاشا اور کاظم دونوں کو سمجھایا ، اتنے میں روسی توپوں نے ان پر گولہ باری شروع کر دی ۔ ترک اخل کلاکی کے قلعے میں گھس گئے ، حسن پاشا نے چاہا کہ ایرانیوں کو بھی قلعہ میں پناہ دی جائے لیکن جمیل پاشا نہ مانا اور بالآخر ایرانی اسی گولہ باری میں ایران کی طرف روانہ ہو گئے ۔

اخل کلاکی میں ترکوں اور روسیوں کے درمیان شدید جنگ ہوئی ۔ دو گھنٹے کے معرکے کے بعد جب ترک غالب آ رہے تھے تو اچانک دونوں طرف سے صلح کے جھنڈے بلند ہوئے ، معلوم ہوا کہ تار آیا تھا کہ صلح ہو گئی ہے ۔

ناول کے آخر میں مصطفے پاشا ایک خصوصی تقریب کے لیے اخل کلاکی پہنچا ۔ روسی افسر بھی مدعو تھے ۔ قاضی نے اس دعوت میں حسن اور انجلینا کا نکاح پڑھوایا ۔ روسی افسروں نے مبارکباد دی لیکن جب انھیں دلہن کی اصلیت کا علم ہوا تو اس حرکت پر دربار زار سے باز پرس کا خوف دامنگیر ہوا ۔

تحقیقی جائزہ

حسن انجلینا کو اگر تاریخی ناول کے فن کے اصولوں پر پرکھا جائے تو اسے شرر کے کمزور ترین تاریخی ناولوں میں شمار کیا جائے گا ۔ اس ناول میں شرر نے مختلف اوقات میں رونما ہونے والے واقعات کو ان کی زمانی ترتیب اور تقدم و تاخر کا خیال رکھے بغیر ایک لڑی میں پرو دیا ہے اور مختلف‌الوقت واقعات کو ایک ایسے تسلسل میں پیش کیا ہے کہ ترک افواج کی مسلسل فتوحات کا تصور پیدا ہوتا ہے ، جو تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں ۔ شرر نے اس ناول میں تاریخی واقعات میں بھی ازحد تصرف کیا ہے جس کا غالباً انھیں خود بھی احساس تھا کیونکہ ۱۸۸۹ء کے آغاز پر دلگداز کے اداریے میں انھوں نے اس کا واضح طور پر اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے :

"۱۸۸۹ء میں ہم دوسرا ناول پیش کرتے ہیں ۔ یہ ناول اگرچہ ان اصول پر نہیں شروع کیا گیا ہے جن اصول پر ملک العزیز ورجنا والا ناول لکھا گیا تھا ۔ یہ ایک اور ضروری اور واجبی اصول پر شروع کیا گیا ہے ۔"[1]

یہاں یہ بیان کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ ملک العزیز ورجنا کا ذکر کرتے ہوئے

۱۔ اداریہ دلگداز ، شروع سال ۱۸۸۹ء ۔

انھوں نے دلگداز میں تاریخی ناول نگاری سے متعلق اپنے اصولوں کا ذکر کیا تھا جن کے مطابق وہ تاریخی ناولوں میں تاریخی واقعات کو کچھ رد و بدل کے ساتھ دلچسپ پیرائے میں بیان کر دینا روا رکھتے تھے۔ یہاں ان اصولوں سے انحراف کا مطلب یہ ہوا کہ شرر "حسن انجلینا" میں تاریخی واقعات کی صداقت اور ان کی زمانی ترتیب کی صحت کو برقرار رکھنے پر سختی سے کاربند نہیں ہوئے۔

شرر نے "حسن انجلینا" کا آغاز ۱۸۷۲ء کے واقعات سے کیا ہے اور بحر اسود میں ترکی بیڑے کی نقل و حرکت اور بحر اسود کے مشرقی ساحلی مقامات (باطوم سے صرف دس میل) پر روسی قلعوں پر ترکی بیڑے کے حملے بیان کیے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جنگ کریمیا کے پندرہ برس بعد روس نے موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معاہدہ پیرس کی رو سے بحراسود کی غیر جانبدارانہ حیثیت والی شق کو ختم کر دیا[1] لیکن اس سے ایسی صورت حال ہرگز نہیں پیدا ہوئی تھی کہ فوری طور پر روس اور ترکی کے مابین جنگ چھڑ گئی ہو اور کوہ قاف کے دامن میدان کارزار بن گئے ہوں۔ نیز جنگ کریمیا (۱۸۵۳-۵۶ء) سے ۱۸۷۷-۷۸ء کی جنگ تک ترکی اور روس کی سرحدیں برقرار رہیں اور اس دوران کسی بھی وقت ایسی صورت حال پیدا نہیں ہوئی کہ بحر اسود کے مشرقی ساحل پر باطوم سے چالیس میل کے اندر اندر روسیوں کا کسی قلعہ پر قبضہ رہا ہو جب کہ شرر نے پہلے باب میں ۱۸۷۲ء میں باطوم سے دس میل پر لب ساحل اور مشرق کی طرف حسن میں روسی فوجوں کی نقل و حرکت دکھائی ہے۔ معاصر کتب تواریخ میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ ۱۸۷۲ء میں روس اور ترکی کے درمیان کوہ قاف کے دامنوں میں وسیع پیمانے پر جنگ ہوئی ہو۔ اس لیے ناول کا بیان کردہ زمانہ صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا۔

"حسن انجلینا" میں شرر کے بیان کردہ سنہ کے قریب قریب روس اور ترکی میں دو جنگیں ہوئیں، ایک تو جنگ کریمیا (۱۸۵۳-۵۶ء) اور دوسری ۱۸۷۷-۷۸ء کی جنگ۔ ان دونوں جنگوں کے دوران یورپی ترکی کے علاوہ کوہ قاف کے دامن اور بحر اسود کے کنارے میدان کارزار بنے رہے۔ زیر نظر ناول میں بیان کردہ واقعات انہیں جنگوں سے متعلق ہیں لیکن کسی ایک جنگ سے متعلق نہیں۔ سطور بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ شرر نے اس ناول میں مختلف اوقات میں پیش آنے والے مختلف واقعات منتخب کرکے انہیں رد و بدل کے بعد اپنے تخیل کے رنگ میں رنگ کر یک جا کر دیا ہے اس لیے جس زمانی ترتیب سے واقعات اس ناول میں پیش ہوئے ہیں، اس تسلسل کے ساتھ ان کی صداقت کی جستجو ایک سعی بے سود ہے۔

"حسن انجلینا" کے پہلے باب میں بیان کردہ واقعات زمانی اور اسی نسبت سے تاریخی جغرافیائی اعتبار سے صحیح نہیں ہیں۔ ۱۸۷۲ء میں روس کا ترکی پر اس قدر غلبہ ہرگز نہیں تھا کہ باطوم سے دس میل پر ترک علاقے میں اس کی فوجیں موجود ہوں اور کسی ترک فوجی دستے کو رات کے وقت سفر کرنے میں بھی جان کا خدشہ لاحق ہو، جیسا کہ شرر نے پہلے باب

۱۔ Lord Eversley The Turkish Empire its growth and decay، ص ۳۳۳:

"Another important event was the repudiation by Russia on Oct 31, 1870, during the Franco-German war, of the clause in the treety of Paris 1856, which interdicted the Black sea to Russian and Turkish vessals of war and forbade both powers the creation or maintenance of naval arsenals on the coasts of the sea"

نیز Caucasian Battle fields، ص 106 و Skrine Expansion of Russia، ص 226

میں محمود پاشا اور اس کے ساتھیوں کو خائف دکھایا ہے[1] - دوسرا ، تیسرا ، چوتھا اور پانچواں باب بھی زیادہ تر شرر کے زور تخیل کا مرہون منت ہے - ان ابواب میں صرف یہ امور تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے صداقت پر مبنی ہیں کہ پولینڈ پر روس کے غلبے کے بعد اہل پولینڈ کو سخت مظالم برداشت کرنے پڑے- گلیشیا کا بیان کردہ محل وقوع اور روسی عملداری میں سلیمان کے قیام کے سلسلے میں بیان کردہ مقامات، شہروں اور دریاؤں کا محل وقوع جغرافیائی اعتبار سے درست ہے[2]- لیکن بحر اسود کے کنارے شہزادی انجلینا کی کوٹھی کا محل وقوع اور شہزادی کا سہیلیوں اور خادماؤں کے ساتھ سیر و شکار کے لیے کوہ قاف میں گھومتے پھرنا محض تخیل پر مبنی ہے- ۱۸۵۳ء اور ۱۸۷۷ء کی جنگوں کے آغاز کے وقت بحر اسود کے مسرقی کنارے شمالی جانب سینٹ نکولس تک ترکی کا علاقہ تھا - سینٹ نکولس باطوم سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے[3] - قلعہ سینٹ نکولس سے جنوب کی جانب شہزادی کی کوٹھی کا وجود ناقابل تصور ہے اور اگر کوٹھی سینٹ نکولس کی شمال کی طرف ہے تو شہزادی کا دوران جنگ باطوم سے دس میل کے فاصلے پر یعنی ترکوں کے علاقے میں تیس پینتیس میل تک سیر و تفریح کے لیے نکل آنا ناقابل قیاس ہے - البتہ گرجستان کے علاقے میں رہبری اور اغوا کی وارداتوں کا جو ذکر ہوا ہے وہ تاریخی صداقت رکھتا ہے -

پانچویں باب میں شرر نے مصطفیٰ پاشا کو کوہ قاف کے علاقے میں ترک فوجوں کا سپہ سالار دکھایا ہے - کتب تواریخ میں انیسویں صدی میں کوہ قاف کے محاذوں پر مصطفیٰ ظریف پاشا کا نام ملتا ہے - مصطفیٰ ظریف پاشا بحر اسود کے مسرق علاقے میں ترک افواج کا سپہ سالار تھا لیکن جنگ کریمیا کے خاتمے سے پہلے ہی دوران جنگ ۱۸۵۵ء میں اسے برطرف کر دیا گیا تھا[4] - اس لیے یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ شرر کے پیش نظر مصطفیٰ ظریف پاشا کا کردار یا جنگ کریمیا کے محاذ تھے - اس طرح یہ تصور کرنے کی ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ واقعات ۷۸-۱۸۷۷ء کی جنگ سے متعلق ہیں - ۷۸-۱۸۷۷ء کی جنگ کے دوران مصطفیٰ نعیم پاشا باطوم کے سول گورنر تھے - معلوم ہوتا ہے کہ شرر کے پیش نظر انھی کا کردار تھا لیکن اس صورت میں شرر نے احمد مختار پاشا کی جگہ مصطفیٰ پاشا کو کوہ قاف کے محاذوں پر ترک افواج کا سپہ سالار بنا کر پیش کرتے ہوئے تاریخی حقائق میں تصرف کیا ہے -

مصطفیٰ نعیم پاشا کے بارے میں کتب تواریخ اور معاصر اخبارات میں کافی مواد موجود ہے- اخبار انجمن پنجاب کے ۱۸۷۷ء اور ۱۸۷۸ء کے شماروں میں مصطفیٰ نعیم پاشا کے بارے میں جو خبریں چھپتی رہی ہیں ان میں سے ایک دو اقتباسات درج ذیل ہیں :

''مصطفیٰ نعیم پاشا سول گورنر تھی ایک نہایت خلیق اور متواضع آدمی ہیں اور نہایت ہوشیار اور مدبر ہیں -''

''۱۳ جون ۱۸۷۷ء کی قسطنطنیہ کی خبر کے مطابق مصطفیٰ پاشا گورنر باطوم مقرر ہوئے -''[5]

''احمد پاشا نے جنگ ڈلی بابا کے دوسرے روز فوج مفرورہ روسیہ کی خبر لینے کو مصطفیٰ پاشا کو بھیجا اور کہا کہ ڈلی بابا کے قریب روسیوں کی جمعیت زیادہ ہو جائے گی، وہاں سے ان کو ہٹاؤ اور حروی فوج

۱- لارڈ ایورسلے : ٹرکس ایمپائر ، ص ۳۳۴-۳۳۳-

۲ و ۳- ملاحظہ ہو اٹلس -

۴- Caucasian Battlefields W E D. Allen & Paul Muratoff ، ص ۸۱ -

۵- بحوالہ سول اینڈ ملٹری گزٹ ، اخبار انجمن پنجاب ، لاہور ، ۲۲ جون ۱۸۷۷ء ، شمارہ ۲۵ ، جلد ۸-

آن کے ساتھ کی ، چونکہ مصطفیٰ پاشا بھی بہت ہوشیار آدمی ہیں ، انہوں نے حاجی حسینی کماندر توپ خانہ کو بھی اپنے ساتھ لیا — پھر آن کے پاس بارہ پلٹن پیدل اور ایک دستہ سواروں کا اور نو توپیں ہو گئیں۔ مقام ٹھارہ پر آن سے اور فوج روسیہ سے مقابلہ ہوا ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں گوالے مویشی چراتے چراتے بیٹھ رہا کرتے ہیں۔ ترک اور روسی ایسے لڑے جیسے دیو لڑتے ہیں ، آخر کار روسی بھاگ گئے [۱]۔"

"مصطفیٰ پاشا جنرل بریگیڈ و ناظر باطوم میرے دوست ہیں۔ یہ پاشا کچھ ایسے بہادر تو نہیں لیکن محنتی بہت ہیں اور تمام کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ جب سے تیمور پاشا سول گورنر باطوم یعنی متصرف باطوم یہاں سے چلے گئے ہیں ملکی کام بھی مصطفیٰ پاشا کو علاوہ اپنے جنگی کاموں کے کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ شخص بڑا باہمت ہے ، سب کام خود ہی انجام دیتا ہے اور شب و روز اپنے فرائض انجام دینے میں مصروف رہتا ہے۔ (خصوصی نامہ نگار پائنیر) [۲]۔"

ان اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ "حسن انجلینا" میں مصطفیٰ پاشا کا کردار مذکورہ بالا شخصیت سے ہی اخذ کیا گیا ہے لیکن شرر نے اس کی شخصیت کی تخلیق اپنے تخیل کے سانچے میں کی ہے اور پلاٹ میں ربط اور دلچسپی کی خاطر اس کردار کو بہت سے واقعات کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔

"حسن انجلینا" کے ہیرو حسن پاشا کے کردار پر بھی شرر کی فنکارانہ تخلیقی صلاحیتوں کا گہرا اثر ہے۔ حسن پاشا کے بارے میں معاصر اخبارات اور کتب تواریخ میں جو بیانات ملتے ہیں آن سے یہ نہیں ثابت ہو تا کہ وہ شہزادہ سلطان ترکی کا بھیجا تھا۔ ۱۸۷۷ء کی جنگ کے دوران ہی ٹائمز کے نامہ نگار خصوصی نے ایک اخباری مراسلے میں لکھا تھا "حسن پاشا سپہ سالار باطوم کو میں نے دیکھا ، وہ ایک نہایت عمدہ کماندر ہیں اور نہایت شجاع اور مدبر شخص ہیں۔ موقع ہائے جنگ کو بخوبی سمجھتے ہیں۔" پائنیر کے نامہ نگار خصوصی نے اسی مراسلے میں ایک قلعے پر حسن پاشا کے بڑی جواں مردی سے قبضہ کرنے کا ذکر بھی کیا ہے اور لکھا ہے :

"شہزادہ حسن پاشا خلف الرشید خدیو مصر جو سپاہ امدادی مصر کی کمان افسری میں ترکی تشریف لائے ہیں ، آٹھ سال ہوئے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک طالب علم تھے۔ یہ نہایت لائق اور روشن ضمیر نوجوان ہیں [۳]۔"

ساتویں باب میں شرر نے ایران کی طرف سے مجاہدین کو جمع کرکے جنگ میں شریک کر دیا ہے۔ کتب تواریخ اور اخبارات میں مجاہدین کی شرکت سے متعلق خبر ملتی ہے لیکن مزید تفصیلات شرر کے تخیل کا کرشمہ ہیں۔ ۱۸ مئی ۱۸۷۷ء کے اخبار انجمن پنجاب لاہور کے مطابق اس جنگ میں "عرب سے دو لاکھ مجاہدین آئے ہیں اور کردستان واقع فارس سے ایک لاکھ۔ ان مجاہدین کو بطور والنٹیر کے فن سپہ گری سکھایا گیا ہے [۴]۔" اسی اخبار کی ایک اور خبر کے مطابق "ہزارہا بدو اور دیار بکر کے باشندے مقام اناطولیا میں اپنے اپنے شیخوں کے ماتحت سپاہ سلطانی میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ یہ لوگ جہاد کے لیے آئے ہیں۔ گورنمنٹ سلطان کی طرف سے ان کو صرف خوراک ملتی ہے اور دس سال کا محصول ان پر معاف کر دیا گیا ہے [۵]۔"

۱۔ ایضاً ، ۳ اگست ۱۸۷۷ء ، شمارہ ۳۱ ، جلد ۸ ۔
۲۔ ایضاً ، ۲۴ اگست ۱۸۷۷ء ، شمارہ ۳۴ ، جلد ۸ ۔
۳۔ ایضاً ، ۲۲ جون ۱۸۷۷ء ، شمارہ ۲۵ ، جلد ۸ ۔
۴۔ اخبار انجمن پنجاب ، لاہور ، ۱۸ مئی ۱۸۷۷ء ، شمارہ ۲۰ ، جلد ۸ ۔
۵۔ ایضاً ، ۲۲ جون ۱۸۷۷ء ، شمارہ ۲۵ ، جلد ۸ ۔

اس ناول میں ایرانیوں کو جنگ میں سریک کرنے کے لیے گویا سرر کے داس ایک تاریخی بنیاد ضرور تھی - در حقیقت روس کو اٹھارہویں صدی میں ہمیشہ یہ خدشہ رہا کہ سب مسلمان قوتیں اس کے خلاف مجتمع نہ ہو جائیں - جنگ کریمیا سے پہلے کے معرکوں میں بھی اسلامی ریاستوں کا رویہ ایسا رہا تھا کہ اس کے خدسات بجا تھے - جنگ کریمیا کے دوران بھی طفلس کے کمانڈر جنرل رِڈ (General Read) کو یہ خدسہ رہا تھا کہ ایران کی طرف سے بھی مسلمان مجاہدین جنگ میں شریک ہوں گے[1] - چنانچہ اس بنیادی تاریخی حقیقت پر سرر نے ناول کے پلاٹ کا بڑا حصہ تعمیر کیا ہے -

سرر نے ایرانیوں کی پیش قدمی کے لیے کوہ ارارات ، دریائے آرس ، دریائے آرس کے پار ایرانی سرحد کے ۴۵ میل در سہر اروان اور وہاں سے اسکندرو پول اور احل کلاکی وغیرہ کا جو راستہ بیان کیا ہے جغرافیائی اعتبار سے ان مقامات کا محل وقوع اور یہ راستہ صحیح ہے لیکن سرر نے اروان میں روسی فوج کی جو تعداد بیان کی ہے—دو ہزار فوج اور ایک توپ خانہ— وہ ۱۸۷۷ء کی جنگ کی نہیں بلکہ ۱۸۵۴-۵۵ء میں جنگ کریمیا کے دوران اروان میں مقیم فوج کی ہے[2] - سرر نے اس باب میں ایرانیوں کو اروان پر فتح حاصل کرتے اور وہاں تمام روسی سپاہیوں کو قتل ہوتے دکھایا ہے ، لیکن تاریخی سواہد اس کی تائید نہیں کرتے ، نیز ۱۸۷۷ء کی جنگ میں اروان میں روسیوں کی حالت اتنی محدوس نہیں تھی جتنی کہ جنگ کریمیا کے دوران تھی اور اس جنگ میں اروان پر ترکوں نے سدید حملے کیے تھے[3] -

ساتویں باب میں اسکندرو پول کے راستے میں ترکوں اور روسیوں کی جنگ بیان ہوئی ہے - یہ معرکہ آرائی تاریخ سے ثابت ہوتی ہے لیکن مقتولین کی تعداد کے بارے میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے اور فوج کے سربراہوں کے نام بھی سرر کی تخلیق ہیں - معاصر اخبار کے مطابق :

"۴ ، ۵ اکتوبر کو احمد مختار پاشا نے دو بار الیگزنڈروپول کے قریب روسیوں کو شکست دی - ترکوں کے مطابق روسیوں کے پانچ ہزار آدمی مارے گئے جب کہ روسی ۸۳ افسر اور ۳۳۹۰ آدمیوں کا مارا جانا تسلیم کرتے ہیں[4] -"

آٹھویں باب میں شرر نے سینٹ نکولاس کی فتح کا منظر بیان کیا ہے - اس قلعہ پر ۱۶ ستمبر ۱۸۷۷ء کو ترکوں کے قبضے کی تصدیق ہوتی ہے اور اس کا فاتح مصطفیٰ پاشا نہیں بلکہ سلیمان پاشا تھا لیکن ترک اس قلعے کو زیادہ عرصے تک اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکے تھے[5] - سرر نے بیان کیا ہے کہ قلعہ سینٹ نکولاس کی تمام روسی فوج گرفتار کر لی گئی تھی لیکن یہ واقعہ ۱۸۷۷ء کی جنگ کے بجائے جنگ کریمیا سے متعلق صحیح ہے - جنگ کریمیا کے دوران ۲۷ ، ۲۸ اکتوبر ۱۸۵۳ء کو احمد پاشا نے اس قلعہ پر اچانک حملہ کرکے اس کی تمام سپاہ کو قید کر لیا تھا[6]- اسی طرح بعد کے ابواب میں اسکندرو پول ، احل زک ، اخل کلاکی وغیرہ کی فتح اور ان سے متعلق تفصیلات بھی ۱۸۷۷ء کی جنگ کے بارے میں صحیح نہیں - یہ صحیح

۱- ایلن و موروٹوف ، Caucasian Battlefields ، ص ۶۶ ، ۶۷ -

۲- ایضاً ، ص ۷۲ - ۳- ایضاً ، ص ۱۰۷ -

٤- اخبار انجمن پنجاب ، لاہور ، ۱۲ اکتوبر ۱۸۷۷ء ، شمارہ ۴۱ ، جلد ۸ -

۵- سکرائنیں ، Expansion of Russia ، ص ۲۵۲ ، ۲۵۳ و اخبار انجمن پنجاب ، لاہور ، ۲۱ ستمبر ۱۸۷۷ء ، شمارہ ۳۸ ، جلد ۸ - ۶- ایلن و موروٹوف ، ص ۶۱ -

ہے کہ اس جنگ میں ان شہروں کے ارد گرد روسی اور ترک افواج میں زبردست معرکے ہوئے نیز اسکندرو پول ، اخل کلاکی وغیرہ کا فاتح علی پاشا بھی ۱۸۷۷ء کی بجائے جنگ کریمیا سے متعلق ہے ۔ علی پاشا نے جنگ کریمیا کے دوران اخل زک اور اخل کلاکی وغیرہ پر بھرپور حملے کیے اور ۱۳ نومبر ۱۸۵۳ء کو اخل زک سے تین میل پر ایک جنگی اہمیت کے مقام طفلس پر قبضہ کر لیا جہاں سے اس نے روسیوں کے خلاف زبردست کارروائیاں کیں[1] ۔ طفلس کے اہم روسی فوجی مرکز ہونے کی بات درست ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ۱۸۷۷ء کی جنگ کے ابتدائی دنوں میں روسیوں کو طفلس کی سلامتی کے بارے میں خدشہ لاحق ہو گیا تھا ۔

ناول میں یہ تاثر بھی دیا گیا ہے کہ عمر پاشا ترک افواج کا سپہ سالار اعظم ہے اور کریمیا میں متعین ہے لیکن یہ بات جنگ کریمیا سے متعلق صحیح ہے نہ نسبت ۱۸۷۷ء کی جنگ کے ۔ جنگ کریمیا کے دوران عمر پاشا نے خود بھی کوہ قاف کے محاذوں پر جنگ کی قیادت کی تھی[2] ۔ ناول میں ایک روسی افسر کامروف کا کردار بھی پیش کیا گیا ہے جو طفلس کے راستے میں روسی مورچوں کے دفاع میں ہلاک ہوا ۔ تاریخ روسی افسر کامروف کا وجود تسلیم کرتی ہے جس نے ۱۸۷۷ء کی جنگ میں کوہ قاف کے مختلف محاذوں پر روسی فوج کی کمان کی لیکن یہ افسر اسی جنگ میں ہلاک نہیں ہوا بلکہ بعد میں ترقی کر کے جنرل بنا اور اس کے بعد بھی اس نے جنگوں میں حصہ لیا[3] ۔

اس ناول کے انداز بیان اور آخری ابواب سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ترکوں نے بہت سے شہروں پر قبضہ کر لیا تھا لیکن اچانک صلح ہو گئی حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ۔ ترک صلح پر مجبور ہو گئے تھے کیونکہ روس نے ترکی کے بیشتر علاقوں اور اہم شہروں پر قبضہ کر لیا تھا ۔

۳۔ منصور موہنا :

منصور موہنا شرر کا تیسرا تاریخی ناول ہے جو دلگداز میں ۱۸۹۰ء میں قسط وار شائع ہوا ۔ یہ ناول سرزمین سندھ پر سلطان محمود غزنوی کی یلغاروں سے متعلق ہے ۔ ناول کا اصل موضوع سلطان کے دو حملوں کے دوران کے واقعات پر مبنی ہے ، اگرچہ ضمنی تاریخی واقعات کے لیے شرر نے محمد بن قاسم کے عہد کے واقعات کو بھی پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے ۔ ناول میں بیان کردہ تاریخی واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ :

۳۹۵ھ (۱۰۰۴ء) میں سلطان محمود غزنوی نے راجا بجے رام کو اس کی سرکشی کی سزا دینے کے لیے لشکر کشی کی ۔ بجے رام پانچ سو ہمراہیوں کے ساتھ بھاگ نکلا ۔ سلطان کے ایک نوجوان سردار منصور نے پانچ سو سواروں کی معیت میں تعاقب کیا ۔ منصور اپنی جرأت و ہمت کے علاوہ خاندان انصار سے ہونے کی بدولت سلطان کو بہت عزیز تھا ۔ منصور نے دریائے اٹک کے کنارے سندھ کی طرف جانے والے راستے پر بجے رام کا تعاقب کیا ، ایک مقام پر بجے رام نے منصور کا مقابلہ کیا لیکن شام ڈھلے راجپوت بھاگ نکلے ، بجے رام گرفتار ہو گیا اور منصور تنہا بھگوڑوں کے تعاقب میں نکل گیا ۔ دوسری صبح تک منصور واپس نہ لوٹا تو یہ دستہ بجے رام کو لیے ہوئے واپس سلطانی کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا ۔

۱۔ ایضاً ، ص ۶۲ ۔ ۲۔ ایضاً ، ص ۸۵ ، ۸۶ ، ۸۹ ۔ ۳۔ ایضاً ، ص ۱۲۰ ۔

منصور بجے رام کے سپاہیوں کا تعاقب کرتا ہوا دور نکل گیا تھا کہ ایک جگہ اچانک گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا اور تلوار بھی ہاتھ سے نکل گئی ۔ ہندو سپاہیوں نے گھیر کر قید کر لیا اور سندھ کی طرف چل پڑے ۔ ان کا خیال تھا کہ بجے رام بھی بھاگ کر وہیں پہنچے گا اور وہ منصور کو وہاں اس کے سامنے پیش کریں گے ۔ سندھ کی شمالی سرحدوں کے قریب ان ہندو سپاہیوں کی مسلمانوں کے ایک گروہ سے مڈ بھیڑ ہو گئی جو اس علاقے میں خانہ بدوشی کی زندگی گذار رہے تھے ۔ مسلمانوں نے انھیں گھیر کر قتل کرنا شروع کر دیا ، منصور نے بھی آزاد ہو کر ان کا ہاتھ بٹایا اور سب ہندو سپاہیوں کا صفایا ہو گیا ۔

مسلمانوں کا یہ خانہ بدوش گروہ انصاری خاندان سے تعلق رکھتا تھا، ان کا جد امجد یوسف انصاری عبداللہ بن ابو ایوب انصاری کا پوتا تھا ۔ عبداللہ بن ابو ایوب انصاری حضرت معاویہ کے عہد میں قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے شہید ہوئے تھے جس کے بعد اس خاندان پر مصائب کا دور آیا ، انصار نے مدینہ منورہ کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر کی راہ لی ۔ یوسف کے والد نے کوفہ کو مسکن بنایا ۔ یوسف کا بھائی یعقوب خراسان جا کر عدم پتہ ہو گیا ۔ یوسف نے ایک دن کوفہ کے نواح میں محمد بن قاسم کو زخمی حالت میں کچھ لوگوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا جو اس سے حجاج بن یوسف کے مظالم کا بدلہ لینا چاہتے تھے ۔ کوفہ میں یوسف کی تیمار داری سے محمد بن قاسم جلد صحت یاب ہو گیا اور پھر محمد بن قاسم کے اصرار پر یوسف ہمیشہ اس کے ساتھ رہا اور ۸۹ھ (۷۰۷ء) میں اپنی بیوی سمیت محمد بن قاسم کے ہمراہ سندھ چلا آیا ۔

محمد بن قاسم سے پہلے اسلامی لشکر نے دو بار ہندوستان پر لشکر کشی کی تھی پہلی بار ۴۴ھ (۶۶۴ء) میں خلیفہ ثالث کے حکم سے مہلب بن ابی صفرہ نے سواحل ہند پر فوج کشی کی لیکن مہلب ملتان تک پہنچا تھا کہ اسے حکم بن عمرو والیٔ خراسان کی مدد کے لیے واپس جانا پڑا ۔ دوسری بار ۷۵ھ (۶۹۴ء) میں ایک عرب سردار نے کچھ فتوحات کی تھیں ۔ ۸۹ھ (۷۰۷ء) میں محمد بن قاسم نے سندھ کو زیر و زبر کر دیا ۔ ۹۵ھ (۷۱۳ء) میں محمد بن قاسم ملتان پہنچا تھا کہ حجاج بن یوسف مر گیا ۔ فتوحات کا سلسلہ جاری تھا کہ ۹۶ھ (۷۱۴ء) میں یوسف انصاری بھی کئی اولادیں چھوڑ کر ہندوستان میں مر گیا اور اُدھر خلیفہ ولید بن عبدالملک بھی انتقال کر گیا ۔ سلیمان بن عبدالملک نے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی محمد بن قاسم کو معزول کرکے یزید بن ابی کبشہ کو والیٔ سندھ مقرر کر دیا ۔ یزید نے ہندوستان پہنچ کر محمد بن قاسم کو گرفتار کرکے خلیفہ کے پاس بھیج دیا لیکن یزید خود بھی اٹھارہویں دن چل بسا ۔ سلیمان نے سندھ کے بجائے فاتح مہلب کے بیٹے حبیب کو سندھ کا گورنر مقرر کر دیا ۔

یوسف انصاری کا خاندان سندھ میں پھلتا پھولتا رہا ، لیکن بنو امیہ کے آخری دور میں جب اسلامی سلطنت صرف سواحل تک محدود ہو کر رہ گئی تو مسلمان خاندانوں کے لیے مصائب کا دور شروع ہو گیا ۔ بعض لوگ واپس چلے گئے ۔ عباسی دور میں عربوں کو سندھ کی حکومت سے دست بردار ہونا پڑا اور جب اسلامی جہازوں کی ساحلوں تک رسائی بھی مشکل ہو گئی تو سختیوں میں مزید اضافہ ہو گیا، متعدد خاندان نیست و نابود ہو گئے، دو تین خاندان شہری زندگی ترک کرکے پہاڑوں میں نکل گئے اور سبکتگین کے ہندوستان پر حملے تک مصائب کا مردانہ وار

مقابلہ کرتے ہوئے زندگی بسر کرتے رہے۔ انہی میں ایک خاندان یوسف انصاری کا بھی تھا۔
یوسف انصاری کے خاندان نے سندھ کی شمالی سرحد پر جہاں سے جسلمیر کا ریگستان شروع ہوتا ہے، داس کوہ میں ایک گاؤں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ گاؤں کے نیچے دریائے اٹک بہتا تھا۔ کئی بار سو دو سو ہندو جوانوں کے گروہ نے ان کی بستی پر تاخت کی لیکن شکست کھائی۔ ایک دو بار راجاؤں نے دو تین ہزار فوج بھیجی لیکن یہ خاندان مع آل و عیال اٹک کے پار ان پہاڑوں میں جا چھپا جو ہندوستان کو بلوچستان سے جدا کرتے ہیں یا راجپوتانہ کے ریگستان میں پناہ کے لیے نکل گیا۔
سبکتگین نے جب ہندوستان پر دوبارہ حملے شروع کیے اور جے پال کو شکستیں ہوئیں تو ہندوستان میں عداوت اسلام کا جوش پھر سے تازہ ہو گیا۔ محمود غزنوی کے دور میں اس انصاری خاندان کے سربراہ محمد بن صالح کی عمر اسی برس سے زیادہ تھی اور اس کے آٹھ بیٹے اور بیس پوتے تھے۔ تیسرا بیٹا چالیس سالہ قاسم بن محمد دوسروں سے زیادہ مقبول تھا۔ قبیلے میں سو اسی مرد اور اتنی ہی عورتیں تھیں۔ ہندوستان کے بڑھتے ہوئے فتنوں سے بچنے کے لیے اس خاندان نے شمال مشرق کی طرف کوچ شروع کر دیا اور اسی دوران انہوں نے منصور کو ہندو سپاہیوں کے ہاتھ سے چھڑایا تھا۔ جس روز منصور وہاں پہنچا اس رات سرداروں پر ایک شیر نے حملہ کیا لیکن منصور نے بروقت شیر پر حملہ کرکے اسے ہلاک کر دیا۔ قبیلے کے سردار کی دو پوتیاں عذرا اور لیلیٰ اس نوجوان کی بہادری سے بہت متاثر تھیں اور عذرا خصوصاً اپنے دل میں اس کے لیے محبت کا جذبہ محسوس کرنے لگی لیکن خود کو سنبھالے رہی۔
منصور جب جے رام کے تعاقب میں گیا تھا سلطان پنجاب و افغانستان کی سرحد پر لشکر سمیت خیمہ زن تھا، فردوسی، عصائری، منوچہر بلخی، دقیقی، حکیم عنصری اور دیگر شعراء و نکتہ رس بھی ہمراہ تھے۔ اس دفعہ وزیر احمد بن حسن میمندی بھی ساتھ آیا تھا۔ جے رام نے وہاں پہنچ کر خود کشی کر لی تھی، سلطان کو منصور کی گمشدگی کا سخت رنج تھا، ترک سپہ سالار التونتاش اور عرب سردار عبداللہ طائی سے مشورہ کرکے سلطان نے واپسی کی بجائے پیش قدمی کا فیصلہ کیا۔ ہندوستان میں اس وقت سخت انتشار کی کیفیت تھی، کوہ اراوی (اجمیر) سے وندھیا چل کے دامن تک متعدد سلطنتیں تھیں، اودے پور، اوجین، اندورا، اجمیر وغیرہ۔ اجمیر اور اوجین میں اتفاق تھا۔ اجمیر کے راجا کی بیٹی اوجین کے نوجوان راجا کے عقد میں تھی اور دونوں خاندانوں کی رگوں میں شریف آریائی خون تھا۔ دریائے چمبل کے کنارے دونوں کی سرحد ملتی تھی۔ اجمیر کے راجا کی ایک اور بیٹی موہنا حسین و جمیل اور فن سپہ گری میں طاق تھی۔ اٹھارہ سالہ موہنا کے لیے کئی شہزادے بے تاب تھے لیکن اجمیر کے وزیر کا بیٹا جے رام بالخصوص اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر تھا لیکن موہنا نے جے رام کو اس کی دلیری کے باوجود ناپسند کر دیا تھا۔ اجمیر کے راجا نے بھی جے پال کی مدد کے لیے فوج بھیجی تھی لیکن کئی نامور افسر لقمہ اجل ہوئے اور فوج شکست کھا کر پسپا ہوئی تھی۔ سلطان کے دوبارہ حملے کی خبر نے پھر ہلچل مچا دی تھی۔ والیٔ اجمیر نے اپنے سپہ سالار، وزیر، جے رام اور موہنا کے مشورے سے جے رام کی سرکردگی میں بیس ہزار فوج سلطان کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے بھیجی جس میں موہنا بھی باصرار شریک ہو کر چلی گئی تھی۔

منصور کی معیت میں جب انصاری خاندان کا قافلہ ہندوستان اور بلوچستان کی سرحد پر پہنچا تو والیٔ اجمیر کی مذکورہ فوج سے سامنا ہو گیا - عرب سجاعت سے لڑے ، جے رام نے مایوس ہو کر ان پر ہاتھی چڑھا دیے جس کے جواب میں مسلمان عورتیں بھی تلواریں لیے محملوں سے کود پڑیں - اس معرکے میں دو ہزار ہندو اور تین سو پچاس مسلمان مارے گئے باقی گرفتار ہوئے - موہنا اس سجاعت سے بہت متاثر ہوئی - وہیں کیمپ کیا ، قیدیوں کو با سہولت رکھنے کا حکم دیا - منصور بھی زخمی تھا یہاں اس نے پہلی بار عذرا اور لیلیٰ کو دیکھا اور عذرا پر فریفتہ ہو گیا - اس نے محسوس کیا کہ عذرا بھی اس کے لیے محبت رکھتی ہے - موہنا نے فرداً فرداً قیدیوں سے ملاقات کی ، منصور پر پہلی ہی نظر میں وارفتہ ہو گئی، عذرا کے حسن نے بھی اسے متاثر کیا، اس نے عذرا کو بہن بنا لیا، سب قیدیوں کی دعوت کی اور عذرا ، لیلیٰ اور منصور کو اپنے خیمے میں ٹھہرایا - عذرا قاسم بن محمد کی بیٹی اور لیلیٰ محمد بن صالح کے بھتیجے حسن بن صالح کی بیٹی تھی - موہنا کو عذرا اور منصور میں باہمی کشش کا اندازہ ہو گیا اور اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ منصور سلطان محمود کی فوج کا ایک افسر ہے - اسی دوران جے رام نے منصور کی پشت کی طرف سے خنجر سے حملہ کیا لیکن وار کرنے سے پہلے عذرا اور لیلیٰ نے اسے پکڑ لیا - موہنا تلوار کھینچ کر جے رام کو قتل کرنا چاہتی تھی کہ منصور نے اس کی جان بخشی کرا دی - اتنے میں پتہ چلا کہ سلطان کا لشکر آ پہنچا ہے ، تھوڑی دیر پہلے جس فوج کی آمد کی خبر ملی تھی وہ والیٔ اجمیر کی نہیں بلکہ سلطان کی تھی ، جے رام اور موہنا نے جلد جلد صفیں درست کرائیں اور جنگ سروع ہو گئی -

جنگ کے دوران سلطان نے ایک نو عمر لڑکی کو دلیری کے ساتھ ہندو فوج کی قیادت کرتے ہوئے حیرت سے دیکھا - جے رام اور عبداللہ طائی میں نبرد آزمائی ہوئی اور عین اس وقت جب عبداللہ جے رام کو قتل کرنے لگا تھا منصور نے مداخلت کرکے بچا لیا - عبداللہ منصور سے مل کر خوش ہوا ، دونوں سلطان کے حضور پہنچے ، منصور نے مختصراً روداد سنائی ، اسی اثنا میں ہندو سکست کھا کر بھاگ نکلے تھے ، تعاقب اور گرفتاری کا عمل شروع ہو گیا تھا - منصور بھی اجازت لے کر گیا اور تھوڑی دیر کے بعد عذرا ، لیلیٰ اور دیگر انصاریوں کے ہمراہ موہنا سمیت حاضر ہوا - عبداللہ جے رام کو گرفتار کر لایا تھا - منصور کی درخواست پر جے رام ، موہنا وغیرہ کی جان بخشی کرکے انھیں منصور ہی کے سپرد کر دیا گیا -

سلطانی لشکر واپس غزنین کی طرف روانہ ہو کر افغانستان کی سرحد میں ایک جگہ دو تین دن کے لیے رکا - وہاں منصور کے مشورے سے سلطان نے فیصلہ کیا کہ موہنا اور جے رام کو کچھ اور قیدیوں کے ساتھ سلطانی فوج کا سردار بلدیو سنگھ دس ہزار سپاہیوں کی معیت میں والیٔ اجمیر کے پاس پہنچا آئے - موہنا کے لیے منصور کی جدائی نا قابل برداشت تھی لیکن اس نے محسوس کیا کہ منصور خود اسے اپنے اور عذرا کے راستے سے ہٹانے کے لیے اجمیر بھیجنا چاہتا ہے چنانچہ وہ عذرا لیلیٰ کی موجودگی میں اپنی محبت کا برملا اظہار کرکے تصویر غم بنی ہوئی رخصت ہو گئی -

مذکورہ واقعہ کے ایک برس بعد اجمیر کے ایک مندر میں مہاراج کرشن نام ایک پنڈت بہت مشہور تھا - وہ در اصل مسلمان عالم یحییٰ بن زکریا تھا جو ہندوستانی معاشرت اور زبانوں کے مطالعے کے لیے کئی برس ہندوستان کے سرحدی شہروں میں رہ کر اس روپ میں اجمیر

پہنچا تھا۔ مہاراج کرشن کو ایک دن اس کے چیلے نے عربی لکھتے ہوئے دیکھ لیا اور اس کے متعلق شکوک و شبہات عوام میں پھیلتے گئے تا آنکہ راجا اجمیر تک بات جا پہنچی۔ موہنا ان دنوں دل برداشتہ زندگی گزار رہی تھی۔ ایک رات سادہ لباس میں چھپ چھپا کر مندر میں پہنچی اور مہاراج کرشن سے ملی۔ اسے بھی سب گزرا اور مہاراج کرشن کے دو چیلوں نے جو در اصل مسلمان تھے موہنا کو پہچان لیا۔ اس طرح یحییٰ اور موہنا ایک دوسرے کے ہم راز ہو گئے۔ یحییٰ نے اسے بتایا کہ سلطان کا لشکر ہندوستان میں داخل ہو چکا ہے۔ یحییٰ نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ موہنا کا پیغام منصور تک پہنچا دے گا۔ اس کے بعد موہنا روز مندر میں آتی اور یحییٰ سے عربی سیکھتی۔

اس دوران سلطان محمود غزنوی نے متھرا پر حملہ کرکے اسے فتح کر لیا۔ فتح کے بعد سلطانی لشکر وہیں قیام پذیر تھا کہ رات کو ایک مسلمان درویش منصور کو ایک جوگی سے ملانے کے بہانے بہلا پھسلا کر لے گیا اور جمنا کے کنارے ایک جھٹ میں قید کر دیا۔ ادھر ایک رات جب کہ موہنا مندر میں موجود تھی جے رام نے کچھ سپاہیوں کے ہمراہ آ کر مہاراج کرشن اور اس کے دونوں چیلوں کو گرفتار کر لیا اور موہنا کے احتجاج پر اسے دھمکی دی۔ دوسری صبح جے رام کو پتہ چلا کہ تینوں جوگی رات کو فرار ہو گئے تھے۔ وہ ندامت کے ساتھ راجا کے سامنے پیش ہوا اور بجائے اس کے کہ موہنا کی شکایت کرتا خود ڈانٹ کھائی۔

موہنا کی ماں رانی کنولا اجمیر کے باہر ایک پر فضا مقام پر ایک محل میں رہتی تھی۔ راجا منگل کا دن خصوصیت سے وہاں گزارتا تھا۔ ایک دن موہنا بھی وہیں تھی کہ راجا کی آمد پر رانی نے موہنا کی شادی کا ذکر چھیڑا۔ راجا نے موہنا کی مرضی کے بغیر کوئی قدم اٹھانے سے انکار کیا تو رانی نے کہا کہ وہ موہنا کو جے رام سے شادی کے لیے آمادہ کر لے گی۔ پھر وہیں وزراء اور افسروں کی کانفرنس شروع ہوئی اور راجا کو یہ چلا کہ سلطان نے اپنے ایک افسر منصور کے مارے جانے کے غم میں واپسی کا ارادہ ترک کرکے اجمیر کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کیا ہے۔ موہنا منصور کے مارے جانے کی خبر سن کر فرط غم سے چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ راجا نے غم ہلکا کرنے کی کوشش کی، تسلی دی۔ کانفرنس کے مشورے سے فیصلہ ہوا کہ اجمیر کی فوجیں شہر سے باہر نکل کر سلطان کا راستہ روکیں۔

اجمیر سے کچھ فاصلے پر ایک ویرانے میں ایک جوگی اور اس کے چیلے ایک جھونپڑے میں رہتے تھے۔ ایک چیلا گا رہا تھا کہ ایک نو عمر جوگی بھی ادھر آ نکلا۔ کچھ دیر گانا سنتا رہا اور پھر روکنے کے باوجود متھرا کی جانب چل پڑا۔ چند لمحے بعد فوجی نقاروں کی آواز آئی۔ جوگیوں نے جھونپڑے میں گھس کر ایک صندوق سے ایک قیدی کو نکال کر کھانا کھلانا شروع کیا، اتنے میں وہی نو وارد جوگی بچاؤ بچاؤ کا شور مچاتا اندر آ گھسا۔ سلطانی فوج کے سپاہی اسے دریافت حال کے لیے کیمپ میں لے جانا چاہتے تھے۔ نووارد جوگی نے کھانا کھانے والے قیدی کو حیرت سے دیکھا۔ سپاہیوں کے آ جانے پر معمر جوگی خود ان کے ہمراہ لشکر گاہ میں چلا گیا جہاں افسروں سے کچھ باتیں کرکے لوٹ آیا۔ اسی شام راجا اجمیر بھی اپنا لشکر لیے اسی نواح میں آ پہنچا۔ پہلے دن التونتاش نے چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ پرتاب سنگھ کے چار ہزار سپاہیوں سے نبرد آزمائی کی۔ دوسرے دن عبداللہ طائی رنجیت سنگھ کے مقابلے کو نکلا، جب عبداللہ طائی کی تلوار ٹوٹ گئی تو اس نے نیزہ اور رنجیت سنگھ نے تیر کمان

سنبھال لیا ، اس پر جنگ مغلوبہ شروع ہو گئی ۔ جے رام اس سے پہلے ہی دس ہزار سپاہیوں کو لے کر چپکے سے الگ ہو گیا تھا اور لمبا چکر دے کر ایک بازو سے تازہ کمک کے طور پر حملہ آور ہوا لیکن اس کے باوجود شام ہوتے ہوتے راجپوتوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بھاگ نکلے ۔ سلطان نے اپنی فوج کو تعاقب میں جانے سے روک دیا ۔

اس رات جب یہ شکست خوردہ فوج اپنے کیمپ میں پہنچی تو والیٔ اجمیر نے سب افسروں کو جمع کر کے بزدلی پر لعن طعن کی اور حسرت سے کہا کہ اگر موہنا موجود ہوتی تو ایسی بزدلی کا مظاہرہ ہرگز نہ کرتی ۔ سب افسروں نے قسمیں کھائیں کہ وہ میدان جنگ سے صرف فاتح کی حیثیت سے زندہ لوٹیں گے ۔ اجمیر میں جب اس شکست کی خبر پہنچی تو عورتیں بھی شہر سے کیمپ میں آ پہنچیں اور سپاہیوں کو بزدلی پر ملامت کیا ۔ دوسری صبح پھر جنگ شروع ہوئی ۔ جے رام پھر چپکے سے کچھ فوج لے کر الگ ہو گیا اور ایک جگہ پہنچ کر اسے تین حصوں میں تقسیم کر کے دو حصوں کو مختلف جگہوں پر پہنچ کر حملے کے لیے سنکھ کی آواز کا منتظر رہنے کا حکم دیا ۔ تیسرے حصہ فوج کو وہیں ٹھہرا کر خود مناسب مقام سے میدان جنگ کا نقشہ دیکھنے کے لیے بڑھا ۔ یہ جگہ جوگیوں کے مذکورہ جھونپڑے کے قریب ہی تھی ۔ دس سپاہی اس کے پیچھے پیچھے کچھ فاصلے پر چل رہے تھے ۔

مسلمانوں کو جے رام کے پہلے دن کی کارروائی کا علم ہو چکا تھا اس لیے انہوں نے اس کی حرکات کی خفیہ طور پر کڑی نگرانی کی تھی اور جس وقت وہ اپنے لشکر سے سپاہیوں کے ساتھ علیحدہ تھا التونتاس بھی چپکے سے دس ہزار سپاہی لے کر اسی طرف نکل گیا تھا ۔ جے رام ایک جھاڑی کے قریب بیٹھا ہی تھا کہ کسی نے پشت پر تلوار کا کاری وار کیا ۔ جے رام نے مڑ کر گرتے گرتے بھی حملہ آور کو ہلاک کر دیا ۔ ابھی جے رام تڑپ ہی رہا تھا کہ دو نو عمر جوگی روتے پیٹتے آئے اور چھوٹی چھوٹی تلواریں نکال کر جے رام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ۔ اتنے میں جے رام کے دس محافظ سپاہیوں نے پہنچ کر دونوں جوگیوں کو ہلاک کر دیا ۔ اسی وقت ایک اور نو عمر جوگی آہ و پکار کرتا آیا اور جے رام کی تلوار اٹھا کر اپنا خاتمہ کر لیا ۔ اس رونے پیٹنے کی آواز سن کر قریب ہی چھپے ہوئے التونتاش کے سپاہی اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے ۔ ان دس راجپوتوں نے گھبراہٹ میں سنکھ بجا دیا جس کے نتیجے میں جے رام کے بھیجے ہوئے دو گروہ سلطانی لشکر پر ٹوٹ پڑے اور تیسرے گروہ کو التونتاش کے سپاہیوں نے گھیر لیا ۔

التونتاس کی کمک کے بجائے جے رام کے سپاہیوں کے آ جانے سے سلطان فکر مند تھا ، راجا کو خبر ملی کہ جے رام کی حالت مخدوش ہے وہ خود دس ہزار سوار لے کر ادھر پہنچا ، اس نئی کمک نے التونتاش کے ساتھیوں کو وہاں سے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا ۔ جے رام کو مردہ دیکھ کر راجا رو پڑا لیکن جوگیوں کی اس حرکت کا مقصد اسے سمجھ نہ آیا ۔ قریب کے جھونپڑے سے معمر جوگی کو طلب کیا گیا لیکن اس نے سلطان کی عدم موجودگی میں حقیقت حال بیان کرنے سے انکار کر دیا پھر اسی کے مشورے پر راجا کے سپاہی اس کے ہمراہ سلطان کے کیمپ تک گئے ۔ سلطان کو میدان کارزار سے پیچھے بلوایا گیا ۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ سلطان جوگی کا بہت احترام کرتا تھا ۔ جوگی کے مشورے سے اس وقت جنگ موقوف کر دی گئی ۔ سلطان اس کے ہمراہ اس مقام تک گیا ، راجا سے جے رام کی موت کی خبر سن کر سلطان

نے افسوس کا اظہار کیا - جوگی نے بتایا کہ جے رام پر منصور نے حملہ کیا تھا جسے جوگی نے ایک مصلحت کے تحت اپنے پاس قید رکھا تھا - جے رام کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے جوگی عذرا اور لبابہ تھیں جن کا واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے ، یہ دونوں منصور سے محض اس لیے خفا ہو کر چلی گئی تھیں کہ منصور نے موہنا کا دل توڑ دیا تھا - دونوں نے جوگی بن کر موہنا کی تلاش میں ہندوستان کا رخ کیا اور وہاں اس کے پاس اجمیر میں ٹھہریں ، معمر جوگی وہی مہاراج کرشن یعنی یحییٰ بن زکریا تھا - عذرا اور لبابہ اس مندر میں اس کے چیلوں کی حیثیت سے قیام پذیر تھیں اور پھر تینوں جے رام کی قید سے فرار ہوئے تھے - تیسرا جوگی جس نے خود کشی کی تھی موہنا تھی جو گھر سے جوگیوں کے روپ میں بھاگ نکلی تھی اور یحییٰ کے پاس منصور کو دیکھ کر وہیں رہ گئی تھی - عذرا اور لبابہ یوسف انصاری کی اولاد تھیں اور منصور یوسف کے بھائی یعقوب کی اولاد سے تھا - یہ غم انگیز داستان سن کر دونوں فرماں رواؤں کو سخت دکھ ہوا اور یحییٰ کی درخواست پر دونوں نے صلح کرکے اپنے اپنے علاقے کی طرف واپسی اختیار کی -

تحقیقی جائزہ

منصور موہنا میں بیان کردہ تاریخی واقعات کی صحت کی بحث میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ناول کے دوسرے باب کا ذکر کیا جائے جسے شرر نے ناول میں تاریخی پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے ، شرر نے اس باب کے آغاز میں لکھا ہے کہ خلیفہ ثالث کے حکم سے ۴۴ھ میں مہلب بن ابی صفرہ نے سواحل ہند پر فوج کشی کرکے ملتان تک پیش قدمی کی اور پھر والیٔ خراسان حکم بن عمرو کی مدد کے لیے جسے ترکستان کے پہاڑوں میں ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا مہلب کو واپس لوٹ جانا پڑا - شرر کا یہ بیان بعض پہلوؤں سے محل نظر ہے - ۴۴ھ خلیفہ ثالث کا نہیں بلکہ حضرت امیر معاویہ کا دور خلافت تھا[1] - اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ ثالث کے عہد میں ۳۴ھ میں بھی ہندوستان پر مسلمانوں نے فوج کشی کی ، اس مہم کے سردار ربیع بن زیاد تھے[2] - لیکن ۳۴ھ کا حملہ اور مہلب بن ابی صفرہ کا ۴۴ھ کا حملہ ، دونوں ہی خشکی کے راستے ہوئے تھے[3] - ربیع بن زیاد سے پہلے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں مغیرہ بن ابی عاص نے سندھ پر بحری راستے سے حملہ کیا تھا[4] -

شرر کے مذکورہ بیان میں کہا گیا ہے کہ مہلب ہندوستان کی مہم کو ادھوری چھوڑ کر حکم بن عمرو والیٔ خراسان کی مدد کے لیے واپس چلا گیا تھا - یہ امر اس اعتبار سے درست نہیں کہ اس وقت خراسان کا حاکم اعلیٰ حکم بن عمرو نہیں بلکہ زیاد تھا اور مہلب کو سیستان کے گورنر عبدالرحمن بن سمرہ نے درۂ خیبر کے راستے ہندوستان پر حملے کے لیے بھیجا تھا[5] - البتہ زیر بحث باب میں اس دور میں اسلامی سلطنت کی وسعت اور فتوحات کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ تاریخی اعتبار سے درست ہے ، نیز ۷۵ھ میں ہندوستان پر حملے کا ذکر بھی صحیح ہے اگرچہ شرر نے اس حملہ آور عرب سردار جاعہ بن سعر تمیمی کا نام نہیں لکھا جسے حجاج نے سعید بن

۱- ابن اثیر ، جلد ۳ ، ص ۳۷۰ -
۲- ایضاً ، جلد ۳ ، ص ۱۰۱ -
۳- ایضاً و بلاذری ، ص ۴۳۲ لیڈن -
۴- بلاذری ، ص ۴۳۲ لیڈن -
۵- ایضاً -

اسلم کلابی کے بعد مکران اور سرحد سندھ کا گورنر مقرر کیا تھا[1]۔

شرر نے ناول میں محمد بن قاسم کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی تاریخ ۸۹ھ لکھی ہے جو درست نہیں۔ اگرچہ ابن اثیر کے یہاں یہ سنہ ۸۵ھ بیان کی گئی ہے لیکن حملے کی صحیح سنہ ۹۲ھ ہے[2]۔ یہ بات درست ہے کہ محمد بن قاسم ثقفی حجاج بن یوسف ثقفی کا چچا زاد بھائی اور داماد بھی تھا، اگرچہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ان دونوں رشتوں کے بارے میں اختلاف رائے رکھتے ہیں[3]۔ محمد بن قاسم کی ابتدائی زندگی کے حالات جس طرح شرر نے بیان کیے ہیں ان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سندھ پر حملے سے پہلے محمد بن قاسم کی کوئی ذمہ دارانہ حیثیت تھی، حالانکہ چودہ سال کی عمر میں ہی محمد بن قاسم اپنی صلاحیتوں کے باعث فوج میں اعلیٰ عہدہ حاصل کر چکا تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں اس نے ایران میں کردوں کو شکست دے کر بغاوت فرو کی۔ شہر شیراز کی خاص طرز پر بنا ڈالی اور اس کا گورنر مقرر ہوا۔ منصور موہنا میں شرر کا یہ بیان درست ہے کہ محمد بن قاسم نے ۹۵ھ میں ملتان فتح کر لیا تھا اور اسی سال شوال میں حجاج بن یوسف انتقال کر گیا[4]۔ لیکن اس کے باوجود محمد بن قاسم نے اپنی مہمات جاری رکھیں اگرچہ اسے احساس تھا کہ نیا والیٔ عراق پالیسی میں کوئی تبدیلی کرے گا جس سے محمد بن قاسم بھی متاثر ہوگا کیونکہ والیٔ سندھ براہ راست عراق کے حاکم اعلیٰ کے ماتحت ہوتا تھا۔ حجاج بن یوسف کے انتقال کے آٹھ ماہ بعد جمادی الثانی ۹۶ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا اور سلیمان بن عبدالملک تخت خلافت پر متمکن ہوا، اس نے یزید ابن مہلب کو عراق کا گورنر مقرر کیا جو حجاج کے خاندان کا جانی دشمن تھا۔ یزید ابن مہلب نے یزید بن ابی کبشہ سکسکی کو والیٔ سندھ نامزد کرکے بھیجا جس نے ہندوستان پہنچتے ہی محمد بن قاسم کو گرفتار کرکے معاویہ ابن مہلب کی حراست میں عراق بھجوا دیا[5]۔ یہ امر بھی درست ہے کہ یزید بن ابی کبشہ صرف اٹھارہ دن اس عہدے پر فائز رہ کر مر گیا اور اس کی جگہ حبیب بن مہلب والیٔ سندھ مقرر ہوا[6]۔ محمد بن قاسم کی سندھ میں مقبولیت کے بارے میں کتب تواریخ میں کافی تفصیلات موجود ہیں۔

"منصور موہنا" کے اس دوسرے باب کے یہ بیانات بھی تاریخی اعتبار سے درست ہیں کہ رفتہ رفتہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی حدود کم ہوتی گئیں اگرچہ سندھ کی معاشرت اور اخلاقیات پر اسلام کا کافی اثر پڑا حتیٰ کہ عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت میں سندھ کا ایک قدیم راجا بھی مسلمان ہو گیا، لیکن یہ بیان محل نظر ہے کہ بنو امیہ کے خاتمے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت یکسر ختم ہو گئی۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ سبکتگین کے حملے تک ملتان مسلمانوں کے زیر نگیں چلا آ رہا تھا[7]۔ یوسف انصاری کے آباواجداد کے سلسلے میں بیان کردہ امور درست ہیں مثلاً عبداللہ بن ابو ایوب انصاری کا قسطنطنیہ کی دیواروں تلے شہید ہونا، اس کے بعد خاندان انصار پر مصائب کا آغاز اور ان کی اکثریت کا مدینہ منورہ کو چھوڑ کر

۱۔ ابن اثیر، جلد ۴، ص ۳۰۸ و بلاذری، ص ۴۳۵۔ ۲۔ یعقوبی، جلد اول، ص ۳۴۶۔
۳۔ ملاحظہ ہوں توضیحات حج نامہ سندھی از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ص ۴۴۔
۴۔ بلاذری، ص ۴۳۹، ۴۴۰۔ ۵۔ بلاذری، ص ۴۴۰ و یعقوبی، جلد اول، ص ۳۵۶۔
۶۔ بلاذری، ص ۴۴۱۔ ۷۔ ابو ظفر ندوی، تاریخ سندھ، ص ۱۴۷ و ببعد۔

مختلف شہروں میں نکل جانا وغیرہ لیکن ہندوستان میں اس انصاری خاندان سے متعلق ناول میں بیان کردہ واقعات کا بیشتر حصہ شرر کے تخیل کا تخلیق کردہ ہے۔

اب سطور ذیل میں ناول کے پلاٹ سے متعلق تاریخی واقعات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ شرر نے ناول کا آغاز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۳۹۵ھ میں سلطان محمود غزنوی کا لشکر ہندوستان کی شمالی سرحدوں کے قریب خیمہ زن تھا اور منصور کی سرکردگی میں پانچ سو سپاہیوں پر مشتمل ایک فوجی دستہ بجے رام اور اس کے ساتھیوں کے تعاقب میں تھا۔ راجا بجے رام سے متعلق پہلے، دوسرے اور چوتھے باب میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان کا بیشتر حصہ تاریخی اعتبار سے درست ہے۔ مثلاً ۳۹۵ھ کی سنہ، اس سال سلطان محمود غزنوی نے راجا بجے راؤ پر حملہ کیا تھا[1]۔ شرر نے ناول میں اس راجا کا نام بجے رام لکھا ہے۔ شاید یہ سہو کتابت ہو، کتب تواریخ راجا کا نام بجے راؤ بیان کرتی ہیں۔ راجا بجے راؤ کی ریاست کے حدود ملتان سے ملے ہوئے تھے اور اس کا دارالحکومت بھٹیر میں تھا۔ بھٹیر (بھاٹیہ) کی شہر پناہ نہایت مضبوط اور مستحکم تھی، قلعہ شہر کے اندر تھا۔ شہر پناہ کے گرد ناقابل عبور گہری خندق تھی۔ بعض کتب تواریخ کی رو سے بجے راؤ نامی راجے کا قلعہ بھاٹیہ، لاہور کے راجا کے تحت تھا لیکن بجے راؤ خود کو خود مختار تصور کرتا تھا اور لاہور کے راجا کو کبھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ شاید لاہور کے راجا کے مقابلے میں وہ خود کو زیادہ طاقتور محسوس کرتا تھا اور غالباً اسی قوت کے نشے میں اس نے غزنہ کے حکام سے بھی کسی سرحدی معاملے میں بدعنوانی کی تھی۔ شرر نے غالباً اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ناول میں لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے بجے راؤ کو سرکشی کی سزا دینے کے لیے فوج کشی کی تھی۔

تاریخی شواہد کے مطابق جب بجے راؤ کو سلطان محمود غزنوی کے حملے کا علم ہوا تو وہ بھی مقابلے کے لیے شہر (بھاٹیہ) سے باہر آیا۔ تین روز تک زبردست لڑائی ہوتی رہی۔ چوتھے دن بجے راؤ شکست کھا کر بھاٹیہ کے قلعہ کے اندر گھس گیا اور قلعہ بند ہو کر لڑنے لگا۔ سلطان نے صورت حال کا جائزہ لے کر ایک حصہ فوج کو لڑائی پر اور دوسرے حصہ فوج کو لکڑیوں پتھروں سے خندق پاٹنے پر مامور کیا۔ بجے راؤ نے محسوس کیا کہ اس طرح اگر لڑائی جاری رہی تو سلطان لڑتے لڑتے بہت جلد خندق پار کر آئے گا۔ چنانچہ اس خوف کی بدولت بجے راؤ اپنے مصاحبوں اور ملازموں کو ہمراہ لے کر رات کے وقت محاصرے سے نکلا اور قریبی پہاڑوں کی دشوار گزار گھاٹیوں میں روپوش ہو گیا۔ سلطان کو بجے راؤ کے فرار کا علم ہوا تو اس نے اپنے سپاہیوں کا ایک دستہ بجے راؤ کی گرفتاری پر مامور کیا۔ شرر نے ناول میں اس دستۂ فوج کے سردار کی جگہ اپنے ہیرو منصور کا کردار تخلیق کرنے کی گنجائش پیدا کی ہے۔ تاریخی واقعات یہ ہیں کہ سلطان کے مرسلہ دستے کے سپاہیوں نے ان گھاٹیوں کو گھیر لیا جہاں بجے راؤ روپوش ہوا تھا اور اس کے مصاحبوں اور ہمراہیوں کو گھیر گھیر کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ بجے راؤ نے فرار کے تمام راستے مسدود دیکھ کر اور جان بری سے مایوس ہو کر اپنے ہی خنجر سے خود کشی کر لی۔ سلطانی سپاہی بجے راؤ کا سر کاٹ کر سلطان کے حضور لے گئے جسے دیکھنے کے بعد سلطان لشکر سمیت بھاٹیہ میں داخل ہوا[2]۔

۱۔ تاریخ فرشتہ، جلد اول، ص ۲۴، ۲۵ نولکشور و ابن اثیر، جلد ۹ ص ۷۷۔

۲۔ تاریخ فرشتہ، جلد اول، ص ۲۴، ۲۵ نولکشور و ابن اثیر، جلد ۹، ص ۷۷ و بعد۔

شرر نے انھیں تاریخی واقعات میں تصرف کرکے انھیں ناول کے پلاٹ میں کھپایا ہے اور اس کوشش میں بعض اوقات وہ تاریخی واقعات کی صداقتوں سے دور نکل گئے ہیں ۔ مثلاً انھوں نے بجے راؤ کے تعاقب میں جانے والے دستے کے سردار کو سندھ بھیجا دیا ہے اور اسی پر ان کے سارے پلاٹ کا تانا بانا ہے ۔ شرر نے بجے راؤ کی خود کشی کا ذکر تو کیا ہے لیکن یہ خود کشی سلطان کے لشکر گاہ میں پہنچ کر ہوئی حالانکہ تاریخی اعتبار سے اس کا زندہ گرفتار کیا جانا اور کیمپ تک لایا جانا ثابت نہیں ہوتا ۔ شرر نے ناول میں سلطان کے لشکر گاہ کا جو مقام بیان کیا ہے وہ بھی محل نظر ہے ، اس ضمن میں تاریخی حقیقت سطور بالا میں بیان ہو چکی ہے ۔

شرر نے ناول میں یہ بھی دکھایا ہے کہ بجے راؤ کی شکست اور خود کشی کے بعد بھی سلطان کو پیش قدمی جاری رکھنی پڑی اور اجمیر کے راجا کی فوج سے لڑائی ہوئی جس میں موہنا اور والئ اجمیر کے وزیر کا بیٹا جے رام شکست کھا کر گرفتار ہوئے ۔ لیکن یہ امر تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا ۔ سلطان بھاٹیہ کا انتظام درست کرکے وہیں سے غزنین واپس چلا گیا تھا ۔ فرشتہ اور ضیا برنی کے مطابق اس لڑائی میں بے شمار زر و مال کے علاوہ ۲۸۰ زنجیر فیل سلطان کے ہاتھ لگے اور قیدیوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ ہر شخص کے پاس پانچ پانچ چھ چھ لونڈی غلام تھے[1] ۔

چوتھے باب میں شرر نے سلطان محمود غزنوی کے دربار میں جن حکماء و شعرا کو جمع کیا ہے ان کا وجود بھی تاریخی اعتبار سے ثابت ہے مثلاً فردوسی ، عصائری ، منوچہر بلخی ، دقیقی ، حکیم عنصری وغیرہ اور ان کی نظموں کا اندراج بھی صحیح ہے اگرچہ یہ نظمیں سلطان کے دربار میں کسی ایسے موقع پر نہیں پڑھی گئیں جیسا کہ شرر نے بیان کیا ہے ، اس دربار میں شرر نے شعرا وغیرہ کے علاوہ وزیر احمد بن حسن میمندی، التونتاش اورعبداللہ طائی کو بھی موجود دکھایا ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ مذکورہ دور میں سلطان کے وزیر احمد بن حسن میمندی ہی تھے ، التونتاش سپہ سالار افواج و وزیر جنگ اور عبداللہ طائی عرب سپاہ کے سالار تھے اور موخرالذکر دونوں سالاروں کا موجود ہونا بدیہی امر ہے[2] ۔

پانچویں باب میں یہ ذکر کہ اس سے پہلے دیگر راجاؤں کے ساتھ اجمیر نے بھی جے پال کی مدد کے لیے فوج بھیجی تھی درست ہے اور اس کا واقعی وہی حشر ہوا جو شرر نے بیان کیا لیکن جس جنگ میں جے پال نے دہلی ، قنوج ، کالنجر اور اجمیر کے راجاؤں کی فوجیں جمع کی تھیں وہ جے پال کی سلاطین غزنہ کے خلاف دوسری جنگ تھی اور سلطان محمود کے بجائے سبکتگین سے لڑی گئی تھی اور اس میں بھی سبکتگین کے ہاتھوں جے پال کو پہلے کی طرح شکست فاش ہوئی تھی ۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس جنگ میں محمود بھی اپنے باپ کے ساتھ پابہ رکاب تھا اور میدان جنگ میں اس نے جرأت اور دلیری کے نمایاں کارنامے انجام دیے تھے[3] ۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ناول میں اجمیر کا وزیر اپنے راجا کے دربار میں بجے راؤ کی شکست کا ذکر کر رہا ہے اور بتاتا ہے کہ جے پال نے دو بار کی شکست سے بد دل ہو کر اپنے

۱- تاریخ فرشتہ ، جلد اول ، ص ۲۵ و ابن خلدون ، جلد ۶ ، ص ۲۲۰ ، ۲۲۱ -

۲- ابن خلدون ، جلد ۶ ، ص ۲۵۷ و بیعد - ۳- ابن اثیر ، جلد ۹ ، ص ۷۰ -

بیٹے انند پال کو تخت پر بٹھا کر خود علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ گویا یہ گفتگو ناول کے آغاز یعنی ۳۹۵ھ کے بعد ہو رہی ہے، لیکن تاریخ کی رو سے اس وقت تک جے پال تین جنگوں میں شکست کھا چکا تھا، دو بار سبکتگین سے اور آخری بار ۳۹۲ھ میں سلطان محمود غزنوی سے۔ یہ جنگ ۸ محرم ۳۹۲ھ کو بروز دوشنبہ پشاور کے قریب لڑی گئی۔ جے پال کے ساتھ بارہ ہزار سوار بیس ہزار پیادے اور تین سو زنجیر فیل تھے۔ دوپہر تک پانچ ہزار ہندو مارے جا چکے تھے اور جے پال اپنے پندرہ اعزا و اقارب کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا تھا۔ بعد ازاں جے پال نے پچاس زنجیر فیل فدیہ دے کر خود کو رہا کرایا تھا۔ قید سے رہا ہو کر آتے ہی اس نے حکومت اپنے بیٹے انند پال کے حوالے کر دی اور خود ۳۹۳ھ میں آگ میں جل مرا[1]۔ اس لیے والیٔ اجمیر کے وزیر کی زبان سے بیان ہونے والی گفتگو سے یہ غلط تاثر پیدا ہوتا ہے کہ جے پال ابھی زندہ ہے۔

”منصور موہنا“ میں چھٹے، ساتویں اور آٹھویں باب کی اساس محل نظر ہے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ سلطان محمود غزنوی ۳۹۵ھ میں بجے راؤ کی سرکوبی کے بعد وہیں (بھاٹیہ) سے واپس غزنین چلا گیا تھا اس لیے والیٔ اجمیر سے کسی تصادم کا اس موقع پر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شاید شرر نے راجپوتوں کے اس دس ہزار لشکر سے سلطان کی جنگ کو پلاٹ میں جگہ دی ہے جو پٹن گجرات کے قریب لڑی گئی۔ لیکن یہ واقعہ ۴۱۶ھ کا ہے جب سلطان سومنات کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا اور راجپوتوں نے دس ہزار کے لشکر سے سلطان کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی[2]۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اس واقعے سے پہلے والیٔ اجمیر سلطان کی آمد کی خبر سن کر بغیر لڑے بھڑے بھاگ گیا تھا[3]۔

دسویں اور گیارہویں باب میں متھرا کی فتح کا ذکر ہے۔ ہندوؤں کی نظروں میں اس شہر کی عظمت، اس سے ان کی عقیدت، اس کا محل وقوع اور سلطان کو متھرا کی فتح سے حاصل ہونے والی دولت کا شرر نے جو ذکر کیا ہے وہ بہت حد تک صحیح ہے۔ تاریخ میں بیان کردہ حقائق کے مطابق یہ شہر نہایت آباد اور خوش منظر تھا۔ اس شہر کی تمام عمارتیں سنگی تھیں۔ شہر پناہ کے دو دروازے دریا کی طرف تھے۔ شہر ایک بلند مقام پر آباد تھا۔ اندرون شہر ایک ہزار محل آسمان سے باتیں کر رہے تھے جو بتوں کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ ان محلات کے وسط میں ایک بہت بڑا بت خانہ تھا جس میں پانچ بت خالص سونے کے اور پانچ پانچ ہاتھ لمبے تھے۔ ان کی آنکھیں یاقوت سرخ کی تھیں جن کی اس وقت کی اندازاً قیمت پچاس ہزار تھی۔ ایک اور بت کی آنکھوں میں یاقوت ازرق (نیلم) کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے جن کا وزن ساڑھے چار سو مثقال تھا۔ اس بت کو جب توڑا گیا تو صرف پاؤں سے چار ہزار چار سو مثقال اور پیٹ اور سر سے اٹھانوے ہزار مثقال خالص سونا برآمد ہوا۔ ان بڑے بتوں کے علاوہ سو سے زیادہ دوسرے بت بھی سلطان کے ہاتھ لگے جن کا بوجھ سو اونٹوں کا تھا[4]۔ لیکن متھرا کی فتح کے سلسلے میں ناول میں جو بات تاریخی اعتبار سے غلط ہے وہ یہ کہ سلطان نے بجے راؤ کی سرکوبی (یعنی ۳۹۵ھ) کے دو سال بعد متھرا پر حملہ کیا تھا، شرر نے اسے ہندوستان پر سلطان کا دوسرا

۱- ابن اثیر، جلد ۹، ۰۷، ص ۷۱۔
۲- ابن خلدون، جلد ۶، ص ۳۴۰۔
۳- ایضاً، ص ۲۳۹۔
۴- ایضاً، ص ۲۳۴۔

حملہ قرار دیا ہے ۔ گویا ناول میں بیان کردہ زمانے کے مطابق متھرا پر ۳۹۷ھ میں حملہ ہوا لیکن یہ بات درست نہیں ۔ تاریخ کی رو سے متھرا پر ۴۰۹ھ میں حملہ کیا گیا تھا اور اس حملے کا سلسلہ کشمیر پر فوج کشی کے بعد شروع ہوا تھا ۔ اس مہم میں راجا ہردت (قلعہ میرٹھ کا حاکم) مشرف بہ اسلام ہو گیا اور قلعہ مہابن کا راجا کلچند شکست کھا کر بھاگ نکلا ، اس کے بعد متھرا کا نمبر آیا ۔ متھرا اگرچہ راجا دہلی کے قبضے میں تھا مگر کوئی بھی سلطان کے مقابلے میں نہ آیا ۔ متھرا فتح کرنے کے بعد سلطان راستے میں آنے والے تمام قلعوں کو مسمار کرتا ہوا شعبان ۴۰۹ھ میں قنوج پہنچا، راجا راج پال اور لوگ شہر سے بھاگ گئے ۔ پھر سلطان قلعہ براہمہ کی طرف بڑھا ، جنگ ہوئی ، قلعہ فتح ہوا تو پھر آگے راجا چند پال کے قلعے کا رخ کیا لیکن راجا چند پال سلطان کی آمد کی خبر سن کر بھاگ نکلا ، اس کے بعد راجا چندر رائے کے قلعے کا نمبر آیا ۔ چندر رائے پہلے تو مقابلے پر آیا لیکن پھر خائف ہو کر بھاگ نکلا ۔ اس قلعے کی فتح کے بعد سلطان غزنین واپس رواں ہوا[۱] ۔

مذکورہ بالا تاریخی واقعات کے سلسلے میں کہیں بھی والیٔ اجمیر کی فوج سے سلطان کے مقابلے کا موقع نہیں آیا جس پر شرر نے ناول کے آخری پانچ ابواب کی بنیاد رکھی ہے ۔ اس لیے ان ابواب کو محض شرر کے تخیل کی تخلیق تصور کیا جا سکتا ہے ، ان میں تاریخی حقیقت نہیں ہے ۔

سطور ما قبل میں بیان کیا جا چکا ہے کہ شعبان ۴۱۶ھ کے بعد سلطان محمود سومنات جاتے ہوئے اجمیر سے گزرا لیکن اجمیر کا راجا جنگ کے خوف سے پہلے ہی شہر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا ۔ لشکر اسلام نے شہر کو تاخت و تاراج کیا لیکن چونکہ سومنات کی مہم درپیش تھی اس لیے قلعے کی طرف توجہ نہ دی گئی ۔

اس بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ منصور موہنا کے پلاٹ میں شرر نے تاریخ کے عنصر کو کم اور تخیل کو زیادہ جگہ دی ہے ۔ نیز جو تاریخی واقعات بیان کیے ہیں ان میں بھی بہت کچھ زمانی تقدیم و تاخیر کی ہے ۔

۴- فردوس بریں :

"فردوس بریں" شرر کے تاریخی ناولوں میں شاہکار تصور کیا جاتا ہے ۔ اس کی مقبولیت اور شہرت کی فنی وجوہات کا جائزہ اگلے باب میں لیا جائے گا ۔

شرر نے یہ ناول ۱۸۹۸ء میں لکھا ، اس کا موضوع فرقہ باطنیہ کے عروج کا آخری دور ہے۔ اس میں شرر نے فرقہ باطنیہ کی مختصر تاریخ اور عقاید کے بیان کے علاوہ ان کی سازشوں اور طریق کار پر روشنی ڈالتے ہوئے اس گروہ کے استیصال کی داستان بیان کی ہے :

مختصراً فردوس بریں کا قصہ یہ ہے کہ شہر آمل کا ایک نوجوان — حسین ، اپنی منگیتر زمرد کے ساتھ فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے گھر سے روانہ ہوا ، ان کا ارادہ تھا کہ قزوین پہنچ کے دونوں عقد بھی کر لیں گے ۔ جبال طالقان میں پہنچ کے زمرد نے اصرار کیا کہ وہ اپنے بھائی موسیٰ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جائے گی جو اس گھاٹی میں پریوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا

۱- ابن خلدون : جلد ۶ ، ص ۲۳۳ تا ۲۳۵ و ابن اثیر : جلد ۹ ، ص ۱۱۹ و بعد ۔

اور اس کے ساتھی نے وہاں اس کی قبر بنا دی تھی ۔ دونوں وہاں پہنچے، قبر ڈھونڈ نکالی اور فاتحہ پڑھی ۔ شام ڈھل چکی تھی اور وہ قبر پر موجود تھے کہ انھیں پریوں کا ایک غول نظر آیا اور دونوں بے ہوش ہو گئے ۔ حسن کو ہوش آیا تو صبح ہو چکی تھی لیکن زمرد موجود نہ تھی ، اِدھر اُدھر ڈھونڈا مگر کہیں نہ پایا ، موسیٰ کی قبر پر نظر پڑی تو کچھ تبدیلی نظر آئی اور ساتھ ہی کتبے پر موسیٰ اور زمرد لکھا نظر آیا ۔ زمرد کی یہ ناگہانی موت حسین پر غموں کا پہاڑ بن کر گری اور اسے اسی میں سکون قلب نظر آیا کہ وہ اس تربت کا مجاور بن کر وہیں بیٹھ رہے ۔ اسی عالم میں چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا اور وہ اس امر کا منتظر رہا کہ پھر کبھی پریوں کا ادھر گزر ہوگا اور وہ اسے بھی زمرد کے پاس پہنچا دیں گی لیکن یہ انتظار بے سود رہا ۔ آخر ایک دن اسے زمرد کی قبر پر ایک خط ملا جو زمرد کی طرف سے تھا اور اس میں ہدایت تھی کہ وہ اپنے وطن واپس جائے اور عزیزوں کو اس کی معصومیت اور موت کی خبر سنا کر اس کی پاکدامنی کا یقین دلائے کیونکہ ان لوگوں کے الزامات دوسری دنیا میں بھی اسے چین نہیں لینے دیتے ، سبز جس جگہ وہ بیٹھا ہے وہ پریوں کی تفریح گاہ ہے لیکن ابھی چونکہ اس کی زندگی کے دن باقی ہیں اس لیے وہ اپنی تفریح گاہ خالی کرانے کے لیے اسے قتل بھی نہیں کر سکتیں ، لہذا انھوں نے خود ہی ادھر آنا موقوف کر دیا ہے ۔ حسین اس کے باوجود وہیں قیام پذیر رہا ۔

ایک ماہ بعد دوسرا خط ملا جس میں زمرد نے حسن سے شکایت کے بعد یہ ہدایت کی تھی کہ اگر وہ اسے ملنے کا ایسا ہی زیادہ آرزو مند ہے تو اس کے لیے بڑی کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا ۔ قبر کا مجاور بن کر بیٹھنے سے وہ اپنی مراد نہیں پا سکتا بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے کوہ جودی کے اس مقدس غار میں جا کر چلہ کشی کرے جہاں حضرت ابراہیم[4] نے ریاضت سے خدا کو پہچانا ۔ اس کے بعد شہر خلیل[4] کے تہہ خانوں میں جا کر چلہ کھینچے جہاں حضرت یعقوب[4] اور حضرت یوسف[4] کے جنازے رکھے ہیں اور پھر شہر حلب میں جا کر شیخ علی وجودی کے مریدوں میں شامل ہو اور ان کے حکم کی تعمیل کرے ۔

حسن نے زمرد کے خط کی ہدایت پر عمل کیا اور ان سب مراحل سے گزر کر شیخ علی وجودی تک جا پہنچا ۔ گیارہ ماہ شیخ کی خدمت میں رہا جس نے اسے ہر طرح قائل کرکے فرقۂ باطنیہ کا معتقد اور پیرو بنا لیا ۔ جب حسین نے اپنی فرمانبرداریوں کے ذریعے فنافی الشیخ کا درجہ حاصل کر لیا تو اسے اپنے عہد اور اس عہد کے مشہور عالم باعمل شیخ امام نجم الدین نیشاپوری کے قتل کا حکم دیا گیا ۔ اس کام کی تکمیل پر حسین کو (فرقہ باطنیہ کی) جنت کی سیر کرائی گئی جہاں وہ زمرد سے بھی ملا اور اس طرح اپنے مذہبی رہنماؤں پر اس کا اعتقاد اور بھی راسخ ہو گیا ۔

فرقہ باطنیہ کی جنت کی سیر کے بعد جب وہ دوبارہ حلب پہنچا تو امام نصر بن احمد کے قتل کا حکم ملا ، اس کی بھی اس نے تعمیل کی اور پھر زمرد سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ۔ شیخ علی وجودی نے اسے ایک سفارشی خط دے کر قلعہ الموت میں رکن الدین خور شاہ کے پاس بھیجا جس سے ایک بار پہلے بھی حسین جنت میں داخلے سے چند لمحے پہلے مل چکا تھا ۔ اب کی بار اس کی بیتابی اور بے قراری نے خور شاہ کو برہم کر دیا اور اسے قلعے سے باہر نکال

دیا گیا۔

مایوسی کے عالم میں حسین پھر زمرد کی قبر پر پہنچا۔ ایک ماہ تک وہاں ٹھہرا رہا۔ ایک دن اسے زمرد کے دو خط ملے، ایک کھلا تھا اور حسین کے نام تھا جس میں ہدایت تھی کہ دوسرے بند خط کو کھولے بغیر تاتاریوں کی شہزادی بلغان خاتون کو قراقرم میں پہنچائے اور اس کے حکم کی تعمیل کرے۔ حسین نے ایسا ہی کیا اور دوسرا خط بلغان خاتون کو پہنچایا جو اپنے باپ چغتائی خان بن چنگیز خان کے فدائیوں کے ہاتھوں قتل ہونے کی بنا پر مغموم تھی۔ زمرد نے بلغان خاتون کے نام خط میں لکھا تھا کہ اس کے باپ کا قاتل الموت میں باطنیوں کی جنت میں عیش لوٹ رہا ہے، اگر شہزادی، زمرد کی ہدایات پر عمل کرے تو اپنے باپ کے قتل کا انتقام لے سکتی ہے۔ شاہزادی اپنے چچا زاد بھائی منقو خاں سے، جو تاتاریوں کا بادشاہ تھا، اجازت لے کر پانچ سو سواروں کے ساتھ رودبار الموت میں پہنچ گئی۔ پھر زمرد کی ہدایت کے مطابق ۲۷ رمضان کو تین آدمیوں کے ہمراہ حسین کی رہنمائی میں اس کی قبر پر گئی، جہاں اسے حسب وعدہ دوسرا خط ملا جس میں فرقہ باطنیہ کی جنت تک پہنچنے کا راستہ دکھایا گیا تھا، بلغان خاتون اس خط کی ہدایات پر عمل کرتی ہوئی حسین کے ساتھ جنت میں جا پہنچی جہاں زمرد اس کی منتظر تھی، شاہزادی مختلف مقامات سے اپنے تین ساتھی سپاہیوں کو واپس بھیجتی رہی تھی تاکہ وہ بقیہ لشکر کی رہنمائی کر سکیں۔

زمرد نے وہاں حسین کو فرقہ باطنیہ کے تمام فریب اور اس مصنوعی جنت کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اسی اثنا میں ہلاکو خاں بھی جسے بلغان خاتون نے قراقرم سے روانہ ہونے سے پہلے اپنے پروگرام سے مطلع کرکے مدد کے لیے بلایا تھا، زبردست تاتاری لشکر کے ساتھ آ پہنچا۔ تاتاریوں کے بڑے لشکر نے قلعے کو باہر سے گھیر لیا اور پانچ ہزار سپاہی جو ہلاکو خاں کے ساتھ جنت میں داخل ہو آئے تھے وہ زمرد کی رہنمائی میں محل سرا کے راستے قلعے میں داخل ہو گئے۔ قلعے میں چونکہ جشن عید منایا جا رہا تھا اس لیے وہ تاتاریوں کے اس محاصرے اور ان کے قلعے میں داخل ہو آنے سے بے خبر تھے۔ ان کے اچانک حملے سے قلعہ بغیر کسی مزاحمت کے فتح ہو گیا۔ اس کے بعد ہلاکو خاں کے حکم سے باطنیہ کے تمام قلعے مسمار کر دیے گئے، رکن الدین خورشاہ کو گرفتار کرکے بحر خزر کے اس پار علاقہ ترکستان میں بھجوا دیا گیا اور اس طرح اس عظیم فتنے کا خاتمہ ہو گیا۔ زمرد اور حسین کی شادی کر دی گئی اور پھر وہ دونوں فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد اپنے وطن میں کچھ عرصہ قیام کرکے بلغان خاتون کے پاس قراقرم چلے گئے۔

"فردوس بریں" میں بیان کردہ تاریخی واقعات کے تحقیقی جائزے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ باطنیہ کی تاریخ اور اس کے عقاید پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے تاکہ ناول کے بیشتر حصوں کو سمجھنے میں سہولت رہے۔

فرقہ باطنیہ——تاریخ و عقاید

فرقہ باطنیہ دراصل فرقہ اسماعیلیہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ فرقہ اسماعیلیہ کو خلفائے فاطمین مصر کی سرپرستی حاصل تھی اور ابتداً اس فرقے کے عقاید کی تلقین خفیہ طریق پر ہوتی تھی۔ نو معتقدین کی تربیت کے نو مختلف مدارج تھے۔ پہلے درجے میں دین اسلام کے بارے میں کچھ

شبہات پیدا کیے جاتے تا کہ معتقد کے دل میں ان کے دور کرنے کا شوق پیدا ہو اور ساتھ ہی مذہب اسماعیلیہ کے چند معمولی اصول بتائے جاتے۔ دوسرے درجے میں مسئلہ امامت اور امامت سے متعلق رموز ربانی کی تعلیم دی جاتی، تیسرے درجے میں خاص خاص اسماعیلی عقائد کی تعلیم ہوتی اور سات اماموں میں سے اسماعیل بن جعفر صادق کے سب سے بڑے امام ہونے کا اعتقاد پیدا کیا جاتا۔ چوتھے درجے میں بتایا جاتا کہ صرف سات صاحب شریعت پیغمبر ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر بعد میں آنے والے نے پہلے کی شریعت میں ضروری ترمیم کو روا رکھا۔ وہ سات صاحب شریعت پیغمبر آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمد مصطفےٰؐ اور اسماعیل بن جعفر صادق ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک ایک خاموش پیغمبر بھی تھا، جو ان کی شریعت کو استحکام بخشتا رہا۔ وہ سات پیغمبر سیت، سام، اسماعیل، ہارون، سمعون، علی کرم اور محمد بن اسماعیل بن جعفر صادق ہیں۔ پانچویں درجے میں یہ بتایا جاتا تھا کہ بارہ کا عدد فضیلت میں سات کے عدد سے افضل ہے اس لیے ہر خاموش پیغمبر نے دین کی ترویج کے لیے اپنی طرف سے بارہ داعی مقرر کیے تھے۔ ان پانچ درجوں میں مرید کو پوری طرح معتقد بنا کر اور ہر امر میں داعی اور شیخ کی اطاعت کا درس دے کر چھٹے درجے میں خاص تربیت کے لیے داخل کیا جاتا جس میں یہ تعلیم دی جاتی کہ تمام احکام شرع عقل اور فلسفے کے تابع ہیں۔ ساتویں درجے میں علم جفر، آٹھویں میں حرکات و افعال انسانی اور روح کے باہمی تعلق اور نویں درجے میں ہر شے کے بارے میں بے یقینی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

اسی دور میں جب کہ اسماعیلیہ فرقے کی تبلیغ خفیہ طریق پر ہو رہی تھی حسن صباح نے آنکھ کھولی۔ اس کے ہم جماعتوں میں نظام الملک طوسی بھی تھے۔ تحصیل علم کے بعد حسن صباح کافی عرصہ اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ چند برسوں بعد اسے معلوم ہوا کہ اس کا ہم جماعت نظام الملک، ملک شاہ کا وزیر ہے چنانچہ وہ نظام الملک سے ملنے گیا جہاں اس کا پرتپاک اور پر خلوص استقبال ہوا۔ نظام الملک کے ذریعے ملک شاہ کے دربار تک اس کی رسائی ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد حسن صباح نے نظام الملک کا عہدہ خود حاصل کرنے کے لیے ایک سازش کی لیکن ناکام رہا۔ ملک شاہ اس کی بدباطنی پر برہم ہوا لیکن صرف ملک بدر کرنے پر اکتفا کیا۔

حسن صباح ملک شاہ کے دربار سے نکالے جانے کے بعد اصفہان گیا اور وہاں کے ایک رئیس ابوالفضل کا مہمان ہوا۔ ایک دن اس نے ابوالفضل سے کہا کہ اگر اسے دو تین سچے دوست مل جائیں تو وہ سلجوقی سلطنت کو تہس نہس کر دے۔ ابوالفضل نے اسے حسن صباح کا خلل دماغ محمول کر کے ایک طبیب سے اس کا باقاعدہ علاج شروع کرا دیا۔ حسن صباح نے ابوالفضل کی اس حرکت پر بہت احتجاج کیا لیکن جب کوئی شنوائی نہ ہوئی تو وہاں سے بھاگ نکلا۔ اسی زمانے میں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہو گئی جو اسماعیلی عقائد رکھتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ان نئے عقاید کا قائل ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد حسن صباح بیمار پڑ گیا تو دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر مذہب اسماعیلیہ اختیار کیے بغیر مر گیا تو عاقبت میں نجات نہ ہوگی۔ یہ خیال اس قدر راسخ ہوا کہ صحت یاب ہوتے ہی ایک داعی سے مل کر اس گروہ میں شامل ہو گیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد خود اسے بھی تبلیغ و دعوت کی اجازت مل گئی اور وہ چند ہی دنوں میں اسماعیلیوں میں کافی مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد حسن صباح جب مصر

میں خلیفہ المستنصر (جسے اسماعیلی امام زمانہ سمجھتے تھے) سے ملنے گیا تو اس کا پرتپاک استقبال ہوا لیکن خلیفہ کی نظروں میں اس کی قدر و منزلت جلد ہی درباریوں کو کھٹکنے لگی اور ایک دن انھوں نے موقع پا کر حسن صباح کو پادریوں کے ایک جہاز پر پھنکوا دیا جو افریقہ کی طرف جا رہا تھا ۔ یہ جہاز راہ میں ایک طوفان بلا خیز میں گھر گیا ، تمام مسافر زندگی سے نا امید ہو چکے تھے لیکن حسن صباح اس تمام ہنگامے سے بے نیاز مطمئن تھا حتیٰ کہ دیگر مسافروں کو اس کا یہ اطمینان کھلنے لگا ۔ حسن صباح نے بڑے اعتماد سے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں خدا نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ جہاز نہیں ڈوبے گا ۔ اتنا بڑا دعویٰ اس نے یہ سوچ کر کیا تھا کہ اگر جہاز ڈوب گیا تو اس کی تکذیب کرنے والا کوئی نہیں بچے گا اور اگر جہاز بچ گیا تو کیا کہنے ! اتفاق سے تھوڑی دیر بعد طوفان تھم گیا اور سب مسافر اس کے مقبول بارگاہ الٰہی ہونے پر ایمان لے آئے ۔ اس کی دعوت پر ان سب نے اسماعیلیہ مذہب قبول کر لیا ۔

اس کے بعد حسن صباح اسی طرح مہینوں برسوں مختلف علاقوں میں پھرتا پھراتا تبلیغ کرتا ہوا قزوین کے شمال میں علاقہ رودبار کے قلعہ الموت میں جا پہنچا جہاں مہدی نامی قلعدار تھا ۔ الموت میں کچھ ہی دنوں کے قیام کے بعد حسن صباح نے اپنی حکمت عملی سے قلعے پر قبضہ کر لیا ۔ اس قبضے کے ضمن میں دو مختلف روایات ہیں ۔ ایک روایت یہ ہے کہ حسن صباح نے دوران قیام قلعے کے بہت سے لوگوں کو اپنے زہد و تقویٰ سے متاثر کرکے اپنا معتقد بنا لیا ، جب کہ خود مہدی بھی اس کے معتقدین میں شامل تھا ۔ ایک دن حسن صباح نے مہدی سے کہا کہ یہ کنج تنہائی اسے بہت پسند آیا لہٰذا تین ہزار درہم کے عوض اسے ایک بیل کی کھال کے برابر یہاں جگہ دے دی جائے تاکہ وہ سکون سے یاد الٰہی میں مصروف رہ سکے ۔ مہدی نے اس بات کو قبول کر لیا اور جب بیع نامہ ہو گیا تو حسن صباح نے بیل کی کھال کی باریک باریک تاریں بنا کر جوڑیں جن کی طوالت سارے قلعے کو محیط تھی ۔ مہدی کو مجبوراً حسب معاہدہ قلعہ چھوڑنا پڑا ۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حسن صباح نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کے زور سے مہدی کو زبردستی قلعے سے نکال باہر کیا ۔

قلعہ الموت اپنے محل وقوع کے اعتبار سے انتہائی محفوظ مقام پر تھا ۔ "الہ موت" کے لغوی معنی عقاب کا گھونسلا ہیں ۔ روایت ہے کہ یہ قلعہ سلاطین دیلم میں سے کسی نے تعمیر کرایا تھا ۔ اس بادشاہ کو شکار کا شوق تھا اور ایک بار اس کا عقاب جب شکار پر جھپٹا تو اسے دبوچ کر اس جگہ آ بیٹھا ۔ بادشاہ کے ہمراہی "الموت ، الموت" پکارتے ہوئے لپکے کیوں کہ دیلمی زبان میں اس کلمے سے عقاب سدھائے بھی جاتے تھے ۔ بادشاہ جب وہاں پہنچا تو اتنی بلندی پر اتنا بڑا مسطح تختہ زمین دیکھ کر اسے پسند کیا اور وہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کروایا جو اس کے بعد سے 'الموت' ہی کے نام سے مشہور ہوا ۔

حسن صباح نے ۶ رجب سنہ ۴۸۳ھ کو الموت پر قبضہ کیا ۔ الموت کے لفظ سے قبضے کی یہ تاریخ بھی نکلتی ہے ، حسن صباح نے قبضے کے بعد قلعے کے استحکام کی طرف پوری توجہ دی اور اسے ہر اعتبار سے ناقابل تسخیر بنا دیا ۔ اس نے قلعے سے متصل پہاڑوں میں گھری ہوئی وادی میں باغات لگوائے ۔ پانی کی قلت کو دور کرنے کے لیے رود الموت سے ایک نہر

کاٹ کر لائی گئی جو ہر طرف قلعے اور باغات کو سیراب کرتی تھی۔ پانی کے ذخیرے کے لیے چٹانوں میں بڑے بڑے حوض تعمیر کرائے گئے۔

ان انتظامات کے علاوہ حسن صباح نے اپنی عسکری قوت کو بڑھانے کے لیے بھی مختلف طریقے اختیار کیے اور رودبار الموت کے بہت سے دیگر نواحی قلعوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ حسن صباح کے پیروکاروں اور معتقدین کا گروہ فرقۂ باطنیہ کہلانے لگا اور اس فرقے کے لوگ نہ صرف ایران بلکہ دور دراز ملکوں اور علاقوں میں بھی پھیل گئے تھے۔ یہ گروہ عام معتقدوں کے علاوہ داعی، رفیق اور فدائی اس مختلف جماعتیں بھی رکھتا تھا۔ "فدائی" تنظیم دراصل حسن صباح کی انتہائی خطرناک عسکری تنظیم تھی جو قضائے مبرم کی طرح اٹل تھی۔ حسن صباح نے پہلے پہل حشیش (بھنگ) کی نشہ آور صفت معلوم کی۔ اس نے قلعے سے متصل خفیہ سبزہ زار میں جہاں نہریں اور باغات بڑے سلیقے سے بنوائے گئے تھے ایک جنت بنائی۔ سادہ لوح عوام کو جب اس کے داعی اپنے جال میں پھانس کر قلعہ الموت لاتے تو وہ اپنی کرامات سے مسحور کرنے کے لیے سرنگ میں انہیں بھنگ پلواتا اور اسی مدہوشی کی کیفیت میں اس شخص کو اس سبزہ زار میں بھیجا دیا جاتا، جہاں ہوش میں آتے ہی وہ اپنے گرد حسین و نازنین حوریں رقصاں دیکھتا جو ہر طرح اس کا دل بہلاتیں اور یہ باور کراتیں کہ وہ فردوس بریں کی سیر کر رہا ہے اور ملاء اعلیٰ پر ہے۔ ہفتہ عشرہ کے قیام کے بعد اس معمول کو پھر اسی "شراب طہور" (بھنگ) کا ایک جام پلا کر قلعے میں بھیجا دیا جاتا۔ دوبارہ اس جنت میں پہنچنے کے لیے یہ لوگ مرشد کا ہر حکم بلا چوں و چرا بجا لاتے خواہ اس میں انہیں جان سے ہی کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑے۔

اب حسن صباح جس مذہب کی طرف دعوت دے رہا تھا، اس کا تعلق برائے نام اسماعیلیہ مذہب سے تھا۔ جس طرح قرامطہ نے اسماعیلیہ عقاید میں حسب منشا تبدیلیاں کر لی تھیں اسی طرح حسن صباح نے بھی مفاد کی خاطر ظاہری نام تو اسماعیلیہ کا ہی رکھا لیکن اس کے اصل عقاید میں اپنی ضرورت اور مرضی کے مطابق بنیادی تبدیلیاں کر لیں۔ یہاں ان عقاید کی تفصیلی بحث سے اجتناب کرتے ہوئے دو تین بنیادی باتوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے یہ عقیدہ پھیلایا کہ اصل اسمعیلیہ وہ خود ہیں اور یہ بات درست نہیں کہ امام صرف بارہ ہو سکتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق اماموں کا سلسلہ سات سات کے کئی سلسلوں میں ہو سکتا ہے البتہ بارہ کی قید صرف نقیبوں کے لیے ہے کہ ہر امام کے بارہ نقیب ہونے چاہییں۔ ان لوگوں نے حکومت کی بعض مداخلتوں سے بچنے کے لیے اور معتقدوں کے سامنے خفیہ تبلیغ کا جواز پیش کرنے کے لیے یہ خیال پیدا کیا کہ جب تک امامت مخفی رہتی ہے، اس کی دعوت اور نقابت ظاہر ہوتی ہے اور جب امامت خود ظاہر ہو جائے تو اس کی نقابت اور دعوت مخفی ہونے لگتی ہے۔ ان لوگوں نے خدا کو معریٰ اور معطل بنا دیا، وہ یہ تسلیم نہیں کرتے تھے کہ اس کی جملہ صفات عین ذات ہیں بلکہ انہوں نے یہ عقیدہ پھیلایا کہ اس میں کوئی صفت ہی نہیں۔ اگر صفات ہوں تو وہ مخلوق کی طرح ہو جائے اور تشبیہ لازم آئے اس لیے اس کی جانب کوئی صفت منسوب نہیں کی جا سکتی، جو صفات منسوب کی جاتی ہیں ان کا یہ مقصد نہیں کہ وہ خود اس میں موجود ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس نے وہ صفات مخلوق کو عطا کیں۔ وہ قادر اس معنی میں نہیں کہ وہ خود قدرت رکھتا ہے بلکہ اس معنی میں ہے کہ اس

نے دوسروں کو قدرت عطا کی ۔ اس لیے فرقہ باطنیہ کے لوگ ہر صفت کے ساتھ نفی کا صیغہ استعمال کرتے اور خدا کو نور کہنے کی بجائے نور لا نور ، حی لا حی وغیرہ کہتے ۔

یہ فرقہ بنیادی طور پر اس عقیدہ کی بنا پر باطنیہ کہلایا کہ ہر حکم ظاہری کا ایک باطن ہے جو عام آدمی کی نظر میں نہیں آ سکتا ۔ یہ عقیدہ سب سے زیادہ خطرناک تھا کیونکہ اس کی رو سے ان کے داعی احکام شرعیہ میں ہر قسم کا تصرف کر لیتے تھے اور اس کا جواز یہ ہوتا تھا کہ تنسیخ شریعت کے اس حکم ظاہری کے باطن سے مرید بےخبر ہے اور اس کی مصلحتوں اور رموز کو نہیں سمجھ سکتا ۔ اس طرح اس فرقے کے داعی اپنے پیرووں کو بے تکلف برخلاف شرع کام کا حکم دیتے جسے مرید عاقبت کی بہتری سمجھ کر بخوشی بجا لاتا ۔

حسن صباح کے گروہ فدائین کا ذکر ہو چکا ہے ۔ وہ اس گروہ کی تنظیم پر پوری توجہ دیتا تھا ۔ انھیں خنجر زنی کی خصوصی مشق کرائی جاتی تھی ۔ خود حسن صباح نے ان لوگوں کو اپنی روحانیت سے متاثر کرنے کے لیے تنہائی اختیار کر لی تھی اور قصر الموت کے بالا خانے پر اس طرح بیٹھا کہ تیس برس میں صرف دو بار نیچے اترا ۔ وہ مخصوص لوگوں کے سوا کسی سے نہ ملتا تھا اور اپنی شریعت پر اس سختی سے عمل پیرا تھا کہ اس کے نفاذ میں کسی سے رو رعایت روا نہ رکھتا ، حتیٰ کہ اس کے اپنے دونوں بیٹے خلاف شریعت عمل کرنے کے جرم میں اس کے حکم سے قتل ہوئے ۔

حسن صباح کی بڑھتی ہوئی قوت کا سدباب کرنے کے لیے ملک شاہ نے فوج کشی کا ارادہ کیا اور اتمام حجت کے لیے حسن صباح کے پاس اپنا سفیر روانہ کیا ۔ سفیر کو متاثر اور مرعوب کرنے کے لیے حسن نے ایک فدائی کو خنجر سے خود کشی کر لینے کا حکم دیا ، فوری تعمیل ہوئی ۔ پھر اس نے دوسرے فدائی کو بلا کر قلعے کے اونچے برج سے چھلانگ لگانے کا حکم دیا ، اس نے بھی فوری تعمیل کی ۔ سفیر یہ بھیانک منظر دیکھ کر لوٹا تو ملک شاہ کے حکم سے نظام الملک طوسی نے الموت کے محاصرے کے لیے فوجیں بھیج دیں ۔ حسن صباح اس محاصرے سے بالکل خوفزدہ نہ ہوا کیونکہ اسے یقین تھا کہ الموت ناقابل تسخیر ہے ۔ البتہ زراعت موقوف ہو جانے کی بنا پر قحط کا اندیشہ لاحق ہوا ، چنانچہ اس نے اپنے جانبازوں سے پوچھا کہ نظام الملک کے فتنے سے دنیا کو پاک کرنے کا ذمہ کون لیتا ہے ، ایک فدائی نے خود کو پیش کیا اور چند دنوں بعد جب کہ نظام الملک ، ملک شاہ کے ساتھ زند میں قیام پذیر تھا لشکر گاہ میں اس فدائی کے ہاتھوں قتل ہوا ، فدائیوں کے ہاتھوں یہ پہلا قتل تھا اور پھر یہ سلسلہ ایک نہ تھمنے والے طوفان کی صورت اختیار کر گیا۔ حسن صباح کے بعد اس کے جانشین بھی اسی طریق کار کو اپناتے رہے[1] ۔

سلطان سنجر نے بھی ایک بار الموت کا محاصرہ کیا لیکن ایک صبح جب وہ لشکر گاہ کے وسط میں نصب اپنے خیمے میں جاگا تو اس کے سرہانے زمین میں ایک خنجر گڑا ہوا تھا اور

۱- قاضی رشید الدین فضل اللہ نے نظام الملک طوسی کے قتل کا ذکر کرنے کے بعد لکھا کہ : و بعد ازان امراء و وزراء و سپہ سالاران و معاریف و اشراف را بردست فدائیان متواتر و متوالی می کشت و ہر کہ با او تعصبی می کرد اورا از دست برمیگرفت . . . ظالمان دست تطاول بھر طرف دراز کردند و پای تعدی بکشیدند ۔'' جامع التواریخ مرتبہ دبیر سیاقی ، ص ۲۵ ، ۲۶ ۔

ساتھ ہی حسن کی طرف سے یہ تنبیہہ بھی کہ وہ سلطان کو اچھا سمجھتا ہے ورنہ یہ خنجر تکیے کی بجائے اس کے سینے میں اترا ہوتا۔

حسن صباح پینتیس برس اس قلعہ پر قابض رہا اور مرنے سے پہلے اس نے قلعدار الموت کیا بزرگ امید کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ اس کی معاونت کے لیے تین اور سردار مقرر کیے اور کہا اس وقت تک نظام چلائیں جب تک نیا امام ظاہر نہ ہو جائے۔

فدائیوں کے ہاتھوں ڈیڑھ سو برس کے عرصے میں لاتعداد فقیہہ، علماء، فضلاء، امراء، وزراء، حتیٰ کہ سپہ سالار، سلاطین اور خلفاء بھی قتل ہوئے۔ محمد ثانی جب باطنیوں کا بادشاہ تھا، امام فخرالدین رازی باطنیوں کے خلاف وعظ کیا کرتے تھے۔ ان کے تلامذہ میں سے ایک (جو فدائی تھا) ایک دن تنہائی میں موقع پا کر ان کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور گلے پر خنجر رکھ کر کہا کہ یہ باطنیہ کے خلاف وعظ کی سزا ہے۔ امام نے جان بخشی کے لیے منت سماجت کی اور آئندہ ان کے خلاف کچھ نہ کہنے کا وعدہ کیا۔ فدائی نے گلے سے خنجر ہٹاتے ہوئے کہا، "امام یہ نہ سمجھیں کہ اس نے ان کی منت و زاری سے متاثر ہو کر یا وعدے پر یقین کر کے چھوڑ دیا ہے بلکہ اسے قتل کا حکم نہیں دیا گیا تھا صرف اتنا ہی حکم تھا جس کی تعمیل کی گئی" پھر دو قیمتی تھان اور تین سو اشرفی نذر کرتے ہوئے کہا، "یہ شاہ الموت کی طرف سے ہے اور یہ تنخواہ ہر سال باقاعدگی سے ملتی رہے گی۔" اس کے بعد امام فخر الدین رازی نے عمر بھر ان کے خلاف کچھ نہ کہا۔ ایک مرتبہ ایک شاگرد نے اس بدلے ہوئے رویے کے بارے میں استفسار کیا تو کہا "ایشاں برہان قاطع دارند"۔

حسن صباح کے بعد کیا بزرگ امید، اس کے بعد محمد بن کیا بزرگ اور پھر حسن بن محمد بن کیا بزرگ تخت پر بیٹھا، اس نے امامت کا دعویٰ کیا، خود کو نزار کی اولاد میں سے بتایا اور کہا اس میں دو امامتیں جمع ہو گئی ہیں۔ ۲۷ رمضان کو اس نے جشن کیا، روزے تڑوا دیے، تمام دن سب لوگوں نے عیش و نشاط اور شہوت پرستیوں میں بسر کیا۔ اس دن سے باطنیوں کے لیے تمام تکلفات سرے سے اٹھا دی گئیں اور شراب حلال قرار دے دی گئی، عبادات موقوف قرار پائیں اور اسی زمانے سے عام مسلمانوں نے باطنیوں کو ملاحدہ کے لقب سے یاد کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد ثانی تخت نشین ہوا جسے اس کے بیٹے جلال الدین حسن ثالث نے زہر دے کر خود تخت حاصل کر لیا۔ حسن ثالث اپنے عقاید کی بنا پر نو مسلم کہلاتا تھا۔ اس نے اپنے عہد میں باطنیہ مذہب کی تلقین بند کرا دی اور سب خلاف اسلام رسوم ترک کر کے شرع اسلامی کی پابندی اختیار کی اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ اس زمانے میں باطنیوں کے تعلقات عامہ المسلمین کے ساتھ درست ہو گئے لیکن اسے جلد ہی زہر دے دیا گیا اور اس کا بیٹا محمد ثالث علاء الدین تخت نشین ہوا جو آخری فرمانروائے الموت رکن الدین خور شاہ کا باپ تھا۔ ساتویں صدی ہجری میں باطنیہ کے داعی، نقیب، معتقد اور فدائی تمام اسلامی ممالک میں موجود تھے۔ علاقہ رودبار میں کم و بیش ڈیڑھ سو اور ارض روم و شام و فلسطین و عراق میں ساڑھے تین سو سے زیادہ قلعے ان کے قبضے میں تھے۔ رکن الدین خور شاہ نوجوانی کی عمر میں شوال ۶۵۳ھ میں باطنیوں کا امام اور فرمانروائے الموت بنا لیکن ایک ہی برس حکومت کر سکا تھا کہ شوال ۶۵۴ھ میں تاتاریوں کے

ہاتھوں اس فرقے اور ان قلعوں کا استیصال ہوا اور وہ فتنہ جسے متعدد سلاطین مسلسل حملے کرنے کے باوجود ختم نہ کر سکے ، صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔[1]

تحقیقی جائزہ

"فردوس بریں" کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے :

"اب تو سن ۶۵۱ھ ہے مگر اس سے ڈیڑھ سو سال پیشتر سیاحوں اور خصوصاً حاجیوں کے لیے وہ کچی اور اونچی سڑک نہایت ہی اندیشہ ناک اور پر خطر تھی جو بحر خزر (کیسپین سی) کے جنوبی ساحل سے شروع ہوتی ہے اور شہر آمل میں ہوتی ہوئی شاہسامے کے قدیم دبوستان یعنی ملک مازندران اور علاقے رودبار سے گزرتی اور کوہسار طالقان کو شمالاً جنوباً قطع کرتی ہوئی شہر قزوین کو نکل گئی ہے۔ مدتوں سے اس سڑک کا یہ حال ہے کہ دن دھاڑے بڑے بڑے قافلے لٹ جاتے ہیں . . . "[2]

یہ بیانات تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے بالکل درست ہیں۔ مسعود کیہان نے مازندران کے ذکر میں لکھا ہے :

"در کتب قدیمی آنرا طبرستان نامیدہ اند . . . . حدود مازندران از شمال بحر خزر و از جنوب برشتہ ہای مرکزی البرز و از مشرق استراباد و از مغرب گیلان است . . حبال البرز در جنوب مازندران قوس عظیمی تشکیل میدہد کہ عرض آن پنجاہ کیلومیتر و مانند سدی قسمت شمالی از مرکز ایران جدا میکند۔"[3]

کوہ طالقان البرز کے عظیم سلسلے کی ایک مغربی شاخ ہے اور قزوین اسی پہاڑی سلسلے کے جنوب میں واقع ہے[4]۔ زیر بحث بیان میں جو سڑک مذکور ہوئی ہے مختلف جغرافیوں اور نقشہ جات میں اس کی نشان دہی کی گئی ہے[5]۔ مسعود کیہان نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور اس کے دشوار گزار اور پر خطر ہونے کے بارے میں لکھا ہے :

"الموت چون در ناحیہ کوہستانی محصوری واقع شدہ دارای موقعیت مہم طبیعی و راہہای آن بسیار سخت و محدود و رسیدن بان مشکل است و بہمین واسطہ اسمعیلیہ از آن استفادہ نمودند و بواسطہ آنہا الموت مشہور است۔"[6]

فردوس بریں کے زیر بحث اقتباس میں "ڈیڑھ سو برس پہلے" سے شرر کی مراد حسن صباح کا دور اقتدار ہے جس نے جبال طالقان میں الموت کے قلعے پر ۶ رجب ۴۸۳ھ کو قبضہ

۱۔ فرقہ باطنیہ کے عقاید اور الموت و حسن صباح کی تاریخ و سوانح سے متعلق مندرجہ بالا مواد ان مآخذ سے ایا گیا۔ (ا) فصلی از جامع التواریخ ، رشید الدین مرتبہ محمد دبیر سیاق ، بالخصوص ص ۹۹-۱۰۱ (ب) تاریخ جہانکشای جوینی مرتبہ قزوینی ، ص ۱۴۳، ۱۴۹، ۱۸۰، ۱۹۵ تا ۱۹۸ ، جلد ۳۔ (ج) تاریخ گزیدہ ، حمداللہ مستوفی مرتبہ ایڈورڈ براؤن ، ص ۵۱۷ تا ۵۲۷ (د) تاریخ اسلام ، شاہ معین الدین احمد ندوی بذیل فرقہ اسماعیلیہ ، قرامطہ و باطنیہ۔ (ہ) تاریخ ابن خلدون۔ (و) تاریخ الکامل ابن الاثیر (ز) الملل والنحل۔

۲۔ شرر : فردوس بریں ، مکتبہ خیابان ادب لاہور ، ص ۸۱۔

۳۔ مسعود کیہان : جغرافیہ مفصل ایران ، ج ۲ ، ص ۲۸۱ ، ۲۸۲۔

٤۔ ایضاً ، جلد ۱ ، ص ۷۳ و جلد ۲ ، ص ۳۶۷۔

۵۔ ایضاً ، ج ۲ ، ص ۳۶۸ و نقشہ بمقابل ص ۲۸۲ ، ج ۲ و نقشہ جات فرہنگ جغرافیہ ایران ج ۲ ، و نقشہ در کتاب The Castles of the Assassins از Peter Willey ، بمقابل ص ۲۱۴ ، ۲۹۶۔

٦۔ مسعود کیہان : جغرافیہ مفصل ایران ، ج ۲ ، ص ۳۷۲۔

کیا تھا[1] ۔ اس پر قبضہ کے بعد اس نے فدائی تنظیم قائم کی جن کی دہشت گردی کا پہلے ذکر ہو چکا ہے ۔ شرر نے اس علاقے کو شاہنامے کے قدیم دیوستان کا علاقہ بھی صحیح طور پر قرار دیا ہے ۔ اس علاقے کے بارے میں قدیم کتب تواریخ ایران میں طرح طرح کی روایات ملتی ہیں[2] ۔ اس علاقے کو زمانہ ہائے قدیم میں دیووں کا مسکن تصور کیا جاتا تھا جنھیں روایات کے بموجب رستم ، جمشید و فریدوں وغیرہ نے اپنی قوت بازو سے نست و نابود کر دیا تھا ۔ مسعود کیہان لکھتا ہے :

”در تاریخ قدیم ایران افسانہ ہای تاریخی زیادہ راجع بہ آن دیدہ میشود آن در روح ساکنین اطراف اثر مخصوصی داشتہ و در افسانہ ہا آنرا ہم مظہر عظمت و ہم مظہر خوف و خطر دانستہ اند ، چنانکہ شاہنامہ آنرا سرزمین فتح و فیروزی رستم و جمشید و فریدون و سام و زال و مسکن سیمرغ و در ہماحال جائے گاہ ضحاک ظالم و دیوان بدکار میخواند .“[3]

پہلے باب کے مذکورہ آغاز کے بعد شرر لکھتے ہیں :

”ان دنوں ابتدائے سرما کا زمانہ ہے سال گزشتہ کی برف پوری طرح پگھلنے نہیں پائی تھی کہ نئی تہ جمنا شروع ہو گئی ، مگر ابھی تک جاڑا اتنے درجے کو نہیں پہنچا کہ موسم بہار کے نمونے اور فصل گل کی دلچسپیاں بالکل مٹ گئی ہوں ۔ آخری موسم کے دو چار پھول ابھی باقی ہیں اور .. ہر طرف سایہ دار درختوں اور گھنی جھاڑیوں نے . خلوت نشین بنا رکھی ہیں ۔“[4]

شرر کے ان بیانات کو فرضی یا خیالی نہیں قرار دیا جا سکتا ، یہ جغرافیائی صداقتوں پر مبنی ہیں ۔ جغرافیہ مفصل ایران میں ان پہاڑوں کی بلندی ، اس علاقے کی آب و ہوا اور یہاں کے موسموں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے ۔ ان تفصیلات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں مختلف بلندیوں پر مختلف قسم کے جنگلات پائے جاتے ہیں ، کم بلندی پر جھاڑیاں اور زیادہ بلندی پر گھنے جنگلات ہیں نیز خود رو پھولوں کی یہاں بہتات ہے ۔ پہاڑوں کی مختلف چوٹیوں پر سارا سال برف پڑی رہتی ہے[5] ۔ غرض شرر کے مذکورہ بیانات کو محض تخیل کا مرہون منت نہیں قرار دیا جا سکتا[6] ۔

موسم اور آب و ہوا کے ذکر کے بعد اسی باب میں شرر لکھتے ہیں :

یہاں شہر رکن آباد کے بدلے شہر ویرجان موجود ہے جو شاید ابھی پوری ڈیڑھ صدی بھی نہیں گزری

۱۔ حمد اللہ مستوفی قزوینی : نزہۃ القلوب ، ص ۶۰ ، ۶۱ و محمد دبیر سیاقی مرتب فصلی از جامع التواریخ رشید الدین فضل اللہ ، ص ۱۳۵ ۔

۲۔ ابن اسفند یار : تاریخ طبرستان ۔

۳۔ مسعود کیہان : ج ۱ ، ص ۳۰ ۔

۴۔ فردوس بریں ، ص ۸۱ ۔

۵۔ مسعود کیہان : ج ۱ ، ص ۳۶ تا ۴۰ ۔

۶۔ نقادوں نے اس منظر پر تنقید کرتے ہوئے اسے جغرافیائی صداقتوں کے خلاف بیان کیا ہے حالانکہ نزہۃ القلوب میں حمد اللہ مستوفی لکھتے ہیں ۔ (ترجمہ از لی سٹرینج)

The Rudbar district, although for the most part of the hot country, still has so much of its adjacent lands of the cold country, that in two places which are so near together as to be with in call of each other, in one they will be reaping the barely, while at the same time in the other it will be the season of barely sowing ص ۶۶-۶۷

اور راقم نے خود اس علاقے میں جولائی میں یہ منظر دیکھا ہے ۔

کہ رود سفید کو کاٹ کے پہاڑوں کے اندر ہی اندر مختلف گھاٹیوں میں گھمائی اور آخر شہر خرم آباد کے قریب بحر خزر میں گرائی گئی ہے۔[1]

مذکورہ بیان کی کچھ باتیں تو صحیح ہیں اور بعض کی صحت مشکوک ہے۔ نہر کے نام کے بارے میں اکثر قدیم و جدید کتب جغرافیہ خاموش ہیں۔ بحر خزر کے کنارے خرم آباد کے قریب سے نہر کے گزرنے کے بارے میں بھی سکوت ہے۔ کتب جغرافیہ میں خرم آباد نامی صرف دو شہر ملتے ہیں، ایک کرمان شاہ کے جنوب مشرق میں اور دوسرا خرم آباد ساوہ۔ مسعود کیہان کے یہاں ایک تیسرے خرم آباد کا ذکر "در مازندران" ملتا ہے[2] جو کتاب کے متعلقہ نقشے میں بحر خزر کے کنارے واقع دکھایا گیا ہے اور جبال طالقان کی طرف سے آتی ہوئی ایک نہر بھی اس کے قریب سے گزر کر بحر خزر میں گرتی ہوئی نظر آتی ہے[3] لیکن یہ اس علاقے میں بہنے والی مشہور نہروں میں سے ایک—رود سہ ہزار ہے۔ ممکن ہے شرر نے جس نہر کا ذکر کیا ہے وہ کوئی چھوٹی سی نہر ہو جو جبال طالقان سے گزر کر نشیبی علاقے میں اسی رود سہ ہزار میں جا ملتی ہے، کیونکہ شرر کی بیان کردہ نہرویرنجان اور مسعود کیہان کی رود سہ ہزار کی گزرگاہ ایک ہی ہے اور ویرنجان اپنی کوئی انفرادی گزرگاہ نہیں رکھتی۔

مذکورہ نہر کے نکالے جانے کے زمانے اور اس کے وجود کے بارے میں شرر کا بیان صداقت رکھتا ہے۔ شرر کے بیان میں ڈیڑھ صدی پیشتر سے وہ زمانہ مراد ہے جب چھٹی صدی ہجری کے آغاز میں حسن صباح الموت پر قابض تھا۔ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے مورخین کے بیانات سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ حسن صباح نے الموت تک ایک نہر بنوائی تھی جو پہاڑی سلسلوں کو کاٹ کر مختلف وادیوں سے گھما پھرا کر لائی گئی تھی۔ خواجہ رشید الدین فضل اللہ نے لکھا ہے:

"الموت قلعہ یست بغایت مستحکم و اگرچہ عمارت او کہن و مندرس شدہ بود، و ہوائے عفن داشت، سبب بی آبی، مگر چشمۂ خرد کہ آب روز بخرج وفا نکردی، سیدنا (حسن صباح) فرمود کہ از کوہ اند جرود و از ماہروب (شاہرود) جوی بالموت آوردند و بسیار دیہہا از حدود الموت برآن چشمہ نکردند و پیرامون زراعتہا بیدہای بسیار بکاشتند، باین سبب ہوای الموت خوش شد و بالای دز عمارات فراوان فرمود کردن و بعد ازآن بایام کیا بزرگ امید آب بدر آوردند، اکنون دائما جوی آب روان بمیان الموت میگزرد۔"[4]

علاء الدین عطا ملک جوینی نے لکھا ہے:

"و از رود خانہ ماہرو (شاہرود) جوی آب آوردہ اند تا بپای قلعہ و از آنجا بر مدار نیمہ قلعہ جوی درسنگ بریدہ و در شیب آن حوضہای دریا آساہم از سنگ ساختہ کہ آب بپای خویش جہت ذخیرہ در آنجا می رفتی و پیوستہ ازآن جا روان بودی۔"[5]

۱۔ فردوس بریں، ص ۸۲۔
۲۔ مسعود کیہان: جغرافیہ مفصل ایران، ج ۲، ص ۳۰۱۔
۳۔ ایضاً، بمقابل، ص ۲۸۲۔
۴۔ بحوالہ فصلی از جامع التواریخ، مرتبہ محمد دبیر سیاق، ص ۱۲۔
۵۔ عطا ملک جوینی: تاریخ جہانگشای، مرتبہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی و شائع کردہ گب میموریل سیریز، ج ۳، ص ۲۷۲۔

مندرجہ بالا حوالوں سے ان باتوں کی تصدیق تو ہو جاتی ہے کہ ایک نہر نکالی گئی تھی اور وہ چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں نکالی گئی تھی لیکن اس امر کی تردید ہوتی ہے کہ یہ نہر سفید رود کو کاٹ کر بنائی گئی تھی۔ رشید الدین فضل اللہ کے بقولہ بالا اقتباس میں "ماہروت" ہے لیکن اس نسخے کا مرتب محمد دبیر سیاق بھی اس لفظ کے بارے میں مشکوک ہے اور حاشیے میں ماہروت ، ماہراب ، بامرود اور شاہرود چار نام لکھ کر سوالیہ نشان لگایا ہے[1]۔ جوینی کیفیت عطا ملک جوینی کے بیان میں لفظ "باہرو" کی ہے۔ تاریخ جہانگشای کے اس نسخے کے مرتب محمد بن عبدالوہاب قزوینی بھی حاشیے میں اس لفظ کے بارے میں شک کا اظہار کرتے ہوئے اسے "شاہرود" قرار دیتے ہیں[2]۔ اس سے قطع نظر جغرافیائی اعتبار سے بھی سفید رود آذربیجان اور گیلان کے علاقوں میں مغرب سے جنوب مشرق کی طرف بہتی ہوئی آتی ہے اور الموت سے پچھتر میل کے فاصلے پر منجیل کے مقام پر اپنا رخ جنوب مشرق کی بجائے شمال مغرب کی طرف موڑ لیتی ہے۔ اس طرح یہ علاقہہائے طبرستان یا مازندران کے اس جنوب مشرقی حصے تک نہیں پہنچ پاتی ، نیز الموت کے علاقے کی نسبت اس کی گزرگاہ کافی نشیبی ہے بلکہ دونوں مقامات کی سطح میں دو ہزار فٹ کی بلندی سے بھی زیادہ فرق ہے۔ اس لیے اس سے الموت کے بلند حصے کے لیے نہر نکالنے کا خیال ہی خارج از بحث ہے[3]۔ الموت کے علاقے سے شاہرود گزرتی ہے جس کا بہاؤ البرز کے سلسلے کے متوازی شرقاً غرباً ہے اور یہ الموت کے علاقے سے گزر کر منجیل کے قریب قزل اوزن (سفید رود) میں جا ملتی ہے جہاں سے بحر خزر تک اس سارے دریا کا نام سفید رود ہے[4]۔

محمد بن عبدالوہاب قزوینی لکھتے ہیں :

"از وسط بلوک الموت شعبہ از رود معروف شاہرود کہ عبارت از شعبۂ شمالی از دو شعبہ عمدۂ رود مذکور باشد جاری است (شعبہ جنوبی شاہرود آب طالقان است) و این رود الموت کہ مابین اہالی معروف برود خانہ بزرگ میباشد خود نیز مرکب از شعبہ چند است کہ از چہار ناحیہ الموت سرازیر شدہ و در وسط درہ الموت بیکدیگر پیوستہ رود خانۂ الموت را تشکیل میدہند، ملتقای رود الموت بآب طالقان در درۂ شیرکوہ است وپس از التقا دو رود مذکور بایکدیگر رود شاہرود تشکیل می یابد ، وسپس شاہرود از وسط بلوک رودبار قزوین و بلوک عمارلو مابین کوہ تخت سلیمان از شمال وکوہ میلدار از جنوب عبور نمودہ در مغرب منجیل برود خانہ قزل اوزن میریزد و ازین جا ببعد موسوم بہ سفید رود میگردد . . شعبۂ جنوبی شاہرود کہ درمیان اہالی ہمین شعبہ باسم شاہرود معروف است از وسط این ناحیہ (طالقان) میگذرد، رود مذکور از بالا طالقان شروع شدہ از تمام بلوک طالقان عبور کردہ و در درۂ شیرکوہ بارود الموت کہ شعبہ شمالی شاہرود است یکی میشود و شاہرود حقیقی تشکیل می یابد۔"[5]

۱۔ فصلی از جامع التواریخ ، محمد دبیر سیاق ، ص ۱۲ ۔

۲۔ تاریخ جہانگشای ، ج ۳ ، ص ۲۷۲ ، ۲۷۳ ۔

۳۔ بحوالہ نقشہ جات در جغرافیہ مفصل ایران، ج ۲ ' فرہنگ جغرافیہ ایران، ج ۲ ؛ لی سٹرینج : خلافت بلاد مشرقی' و Historical Atlas of the Muslim people ۔

۴۔ ایضاً و اردو انسائیکلوپیڈیا اسلام ، ج ۳ ، کراسہ ۱ ، ص ۳۰-۳۵ و سرولیم اوزلے ، Travels in the Countries of the East ، ج ۳ ، ص ۳۹۲

۵۔ تاریخ جہانگشای ، اضافات از قزوینی ، ج ۳ ، ص ۳۹۴-۳۹۵ ۔

ان تمام تفصیلات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ سفید رود کی گزرگاہ الموت سے بہت دور ہے اور اس کا رخ اور سطح بھی مختلف ہے۔ جبال طالقان کے مذکورہ حصے سے سفید رود نہیں بلکہ شاہرود گزرتی ہے۔ محمد بن عبدالوہاب قزوینی کے مندرجہ بالا اقتباس کے آخری حصے میں ساہ رود کی شمالی شاخ رود الموت کا ذکر موجود ہے جو پیٹرولی کی کتاب میں دیے گئے نقشے کے مطابق[1] قلعہ الموت سے بہت قریب ہے جب کہ شاہرود کا الموت سے فاصلہ دس میل ہے۔ ساہرود کی یہ معاون رود، رود الموت، جو کہ قلعہ کے بہت قریب ہے کل بارہ میل لمبی ہے اور پھر شاہرود میں مل جاتی ہے۔ حسن صباح نے قلعہ تک لائی جانے والی نہر اسی معاون رود سے نکلوائی تھی۔ پیٹرولی کی کتاب حشیشین کے قلعوں کے بارے میں دور حاضر کی نہایت مستند سروے رپورٹ ہے جس میں حسن صباح کی تیار کردہ نہر کی گہرائی چوڑائی وغیرہ کی تمام تفصیلات دی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہر انسانی صناعی کا کمال تھی۔ شرر نے نہر کے بارے میں جتنی تفصیلات دی ہیں پیٹرولی کی کتاب سے ان کی مکمل تصدیق ہوتی ہے[2]۔

نہر اور موسم وغیرہ کے ذکر کے بعد شرر لکھتے ہیں :

"مگر پریوں اور قدیم دیووں سے زیادہ ظالم ملاحدہ اور باطنیہ لوگ ہیں جو اس تمام علاقے میں آباد اور پھیلے ہوئے ہیں اور جو پرانے اصول و عقاید کا مسلمان ان کے ہاتھ پڑ جاتا ہے کسی طرح جان بر نہیں ہو سکتا، خصوص جمادی الاول، جمادی الثانی اور رجب کے مہینوں میں ان کے مظالم کی دھوم مچ جاتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ علاقہائے ترکستان، کرغیز اور استراخان کے مسلمان جب حج کو جاتے ہیں تو جہازوں پر بحر خزر سے پار ہو کر اس علاقے میں اترے اور اسی کوہسار طالقان کو طے کرتے ہوئے ارض عراق کو جاتے ہیں اور پھر وہاں سے خاک پاک حجاز کا ارادہ کرتے ہیں . . یہاں کے مظالم کی ہر جگہ شہرت ہو گئی ہے اور بہت سے لوگوں نے یہ راستہ چھوڑ دیا ہے مگر علی الخصوص آمل اور اس کے مضافات کے لیے تو اور کوئی راستہ نہیں۔"[3]

اس بیان کا ابتدائی حصہ صحیح ہے۔ ملاحدہ کے مظالم کا ذکر قبل ازیں رشید الدین فضل اللہ کے حوالے سے آ چکا ہے، جغرافیائی اعتبار سے ترکستان، کرغیز اور استرا خان کے علاقے بحر خزر کے شمال مشرق، شمال اور شمال مغرب میں واقع ہیں اور مازندران کا علاقہ جیسا کہ پہلے مذکور ہوا بحر خزر کے جنوب میں ہے۔ مذکورہ بالا علاقوں کے مسلمان اس جنوبی علاقے تک پہنچنے کے لیے خشکی کے طویل اور پہاڑی علاقے کے سفر کی بجائے بحری سفر کو پسند کرتے تھے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ناول کے مذکورہ منظر کے علاقے میں فرقہ باطنیہ کے لوگ ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور صرف اسی علاقے میں ان کے ڈیڑھ سو سے زیادہ قلعے تھے جن میں الموت، میمون دز، گرد کوہ اور لمسر کے قلعے بہت مضبوط و مشہور تھے لیکن شرر کے اس بیان کا یہ حصہ محل نظر ہے کہ آمل اور مضافات آمل سے عراق و عرب کے لیے اس کوہسار کو طے کرنے اور رودبار الموت سے گزرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ جغرافیائی حقائق شرر کی اس بات کی تائید نہیں کرتے، آمل سے عراق و عرب کے لیے دو دوسرے راستے بھی موجود

۱- پیٹرولی : The Castles of the Assassins، نقشہ بمقابل ص ۲۹٦ -

۲- ایضاً، ص ۲۲۰ -

۳- فردوس بریں، ص ۸۲-۸۳ -

تھے[۱]۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ الموت کی طرف سے گزرنے والا راستہ ان دوسرے دونوں راستوں کی نسبت زیادہ قریبی راستہ تھا۔

دوسرے باب میں شروع سے کوہ البرز کی گھاٹی سے شہر تبریز اور کوہ جودی تک حسین کے سفر کا جو راستہ اور وقت بیان کیا ہے وہ جغرافیائی نقطہ نظر سے اور مسافت کے اعتبار سے درست ہے۔ علاوہ ازیں شہر تبریز اور کوہ جودی کا بیان کردہ محل وقوع اور دیگر تفصیلات بھی بہت حد تک صداقت پر مبنی ہیں۔ نقشوں اور مستند جغرافیوں سے ان کی تصدیق ہوتی ہے۔

کوہ جودی کے غار میں چلہ کشی کرنے کے بعد حسین شام کی راہ لیتا ہے اور تین ماہ کے سفر کے بعد شہر خلیل میں جا پہنچتا ہے۔ اس کے بعد شرر لکھتے ہیں:

''سیدھا اس تہ خانے تک پہنچا مگر جہاں نیچے اترنا بہت دشوار تھا اس لیے کہ ہر وقت لوگوں کا مجمع رہتا اور حراست یہ تھی کہ جو کوئی اس مقدس غار میں اترنے کا ارادہ کرے عام مجاوروں کے عقیدے میں واجب القتل تھا۔ . (حسین چوری چھپے تہ خانے میں اتر گیا) اسے کئی لاشیں چبوتروں پر رکھی نظر آئیں جن میں سب سے بیچ درمیان حضرت یعقوبؑ و یوسفؑ کے جسم تھے۔ ان کا انتقال چونکہ مصر میں ہوا تھا لہٰذا قدیم مصریوں کے مذاق کے مطابق ان کی ممیاں بنائی گئی تھیں۔ جسم آئینے کے تابوتوں میں تھے مگر چہرے کھلے ہوئے تھے جن میں اس تاریکی میں بھی ایک عجیب رعب و جلال برستا نظر آتا تھا . . . وہ دونوں تابوتوں کے درمیان میں جا کے جھکنے سے بیٹھ گیا جہاں دونوں ناہیب چہرے ہر وقت اس کے پیش نظر رہتے''۔[۲]

بظاہر اس تہ خانے کا ذکر، اس میں پیغمبروںؑ کی نعشوں کی موجودگی، کسی آدمی کا وہاں اتر جانا اور ان مقدس چہروں کو دیکھ لینا اس قدر عجیب ہے کہ سراسر خیالی معلوم ہوتا ہے لیکن اس سارے بیان میں سوائے حسین کے کردار کے اور چند جزئیات کے فرق کے اور کوئی بات فرضی یا خیالی نہیں۔ ذیل کے اقتباسات ان امور پر خاطر خواہ روشنی ڈالیں گے۔

اٹھویں صدی میں اصطخری اور ابن حوقل نے اس کی نسبت تحریر کیا ہے کہ: ''مسجد ابراہیم[۳] بیت اللحم کے جنوب میں واقع ہے۔ اس قصبے کی بڑی مسجد میں، جہاں جمعہ ہوتا ہے، حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی قبریں ہیں۔ یہ ایک قطار میں بنی ہوئی ہیں اور ہر صاحب کی قبر کے برابر ان کی بیوی کی قبر ہے۔ یہ بستی پہاڑوں کے درمیان وادی میں واقع ہے گرد بہت سے درخت ہیں۔''[۴]

مقدسی کی ۹۸۵ء کی تحریر حسب ذیل ہے:

''حبرا، حضرت خلیل اللہؑ کا گاؤں ہے۔ اس کے اندر ایک مضبوط قلعہ ہے اور اس میں بڑے بڑے چوکور پتھر چنے ہوئے ہیں جس کے باعث لوگ اسے جنات کا تعمیر کردہ بتاتے ہیں۔ اس مقام کے وسط میں پتھر کا گنبد آغاز اسلام کے وقت سے بنا ہوا ہے جس کے نیچے حضرت ابراہیمؑ کی لحد ہے۔ حضرت اسحاقؑ کا مقبرہ آگے کے رخ مسجد کی عمارت اصلی کے اندر اور حضرت یعقوبؑ کا مزار مسجد کے احاطے میں عقب کی طرف واقع ہے۔ ان میں سے ہر نبی کے پہلو میں ان کی بیوی کا مزار ہے۔ عمارت کے گرد کا چمن مسجد کا صحن ہو گیا ہے اور اسی میں زائرین کے ٹھہرنے کے مکانات بنے ہوئے ہیں جو حرم شریف سے متصل

۱۔ لی سٹرینج: بلاد خلافت مشرق و مسعود کیہان: نقشہ در جلد ۲، بمقابل ص ۲۸۲۔
۲۔ فردوس بریں، ص ۱۰۶ تا ۱۰۸۔
۳۔ لی سٹرینج نے فلسطین پر اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ''عرب اس قصبے کو مسجد ابراہیم پکارتے ہیں اور حبراً یا حبروں کے نام سے بھی جانتے ہیں۔''
۴۔ اصطخری: ص ۵۷ و ابن حوقل: ص ۱۱۳۔

ہو گئے ہیں ۔"

ناصر خسرو نے ۱۰۴۷ء میں حبرون کی سیاحت کی ۔ اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ :

"حبرون ، بیت المقدس سے ۶ فرسخ ہے اور راستہ جنوب کی طرف جاتا ہے ۔ راستے میں بہت سے گاؤں ، باغ اور مزروعہ کھیت ملتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ شام اور بیت المقدس کے لوگ اس مبارک شہر کو مشہد خلیل کہتے ہیں اور گاؤں کا اصلی نام ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی استعمال نہیں کرتے ۔ ۔ ۔ ۔ مشہد کی عمارت قصبے کے جنوبی کنارے سے جنوب مشرق تک وسیع ہے ۔ اسے چار دیواری سے محدود کر دیا ہے اور دیواروں میں چوکور پتھر چنے ہیں ۔ احاطے میں شمالی حصہ ۸۰ × ۴۰ درع عریض ہے [درع = ۲ فٹ] ۔ ۔ ۔ ۔ نماز کے بڑے دالان [مقصورہ] کی محراب عمارت کے عرض میں [جنوبی کنارے پر] بنی ہوئی ہے ۔ مقصورہ کے اندر کئی خوبصورت محرابیں ہیں اور دو قبریں اس طرح واقع ہیں کہ ان کا سرہانہ [جنوب] کی طرف ہے ۔ قبروں کے اوپر چوکور پتھر کی چنائی اور قد آدم بلندی کے تعویذ ہیں ۔ ان میں سے دائیں ہاتھ کو جو تعویذ ہے اس میں حضرت اسحاق؏ ابن ابراہیم؏ کی قبر ہے اور دوسرے کے اندر ان کی بیوی (حضرت رابقہ) آسودہ ہیں علیہا السلام ۔ ان قبروں کے درمیان دس درع کا فاصلہ ہوگا ۔ مقصورہ سے باہر آئیے تو صحن حرم میں دو عمارتیں ہیں ، دائیں ہاتھ کی قبلہ رو عمارت میں حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوہ والسلام کی قبر ہے ۔ یہ عمارت اتنی بڑی اور اونچی ہے کہ اس کے اندر ایک چھوٹا حجرہ تعمیر ہے جس کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں لیکن اس کی چار دیواری میں چار دریچے ہیں جن سے زائرین حجرہ سے باہر رہ کر قبر کی زیارت کر سکتے ہیں ۔ اس حجرہ کے فرش اور دیواروں پر زری کپڑے چڑھے ہوئے ہیں اور قبر کا تعویذ ۳ درع طول میں بنا ہے اور اس کے اوپر چاندی کے فانوس اور قندیلیں آویزاں ہیں ۔ دوسری عمارت قبلہ رو کھڑے ہوں تو آپ کے بائیں ہاتھ ہوگی ۔ اس کے اندر حضرت ابراہیم؏ کی بیوی سارہ کی قبر ہے ۔ ان دونوں عمارتوں کے درمیان مسقف راستہ ہے جو بجائے خود ایک ایوان معلوم ہوتا ہے اور یہاں بھی بہت سے فانوس اور چراغ آویزاں ہیں ۔ ان دو عمارتوں سے آگے بڑھیں تو دو اور مقبرے ایک دوسرے کے پاس پاس بنے ہوئے ملتے ہیں ۔ ان میں سے دائیں کے اندر حضرت یعقوب؏ کی قبر ہے اور دائیں کے اندر ان کی بیوی ہیں ، علیہا السلام ۔ ۔ ۔ حرم کے اندر صرف یہی چھ قبریں ہیں ۔ حرم کی چار دیواری کے باہر ڈھلان آتا ہے اور اسی پر مغرب کی جانب حضرت یوسف؏ ابن یعقوب؏ کا مزار ہے جس پر بہت خوشنما گنبد تعمیر کر دیا گیا ہے ۔ اس مزار سے آگے بڑھیں تو مسطح زمین ہے جہاں ایک وسیع گورستان ملتا ہے ، اس میں دور دور سے لوگ دفن کرنے کے لیے جنازے لاتے ہیں ۔ حرم شریف میں مقصورہ کی چھت کے اوپر لوگوں نے زائرین حرم کے واسطے حجرے بنا دیے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کہتے ہیں زمانہ سابقہ میں حرم حبرون کا کوئی دروازہ نہ تھا اور باہر کی ڈیوڑھی میں سے کوئی اندر نہیں جا سکتا تھا بلکہ وہیں سے کھڑے ہو کر لوگ زیارت کر لیتے تھے ۔ لیکن جب [۹۱۸ء میں فاطمی خلیفہ] مہدی مصر کا فرماں روا ہوا تو اس نے حکم دیا کہ ایک دروازہ بنا دیا جائے ۔ اس نے حرم کے لیے ظروف ، قالین ، غالیچے وغیرہ بھی مہیا کر دیے اور نیز بہت سی ضروری عمارتیں بنوا دیں ۔ حرم شریف میں اندر جانے کا یہ دروازہ شمالی دیوار کے وسط میں ہے ۔ زمین سے چار درع اونچا ہے ، اس کے دونوں پہلوؤں پر سیڑھیاں ہیں ۔ ان میں ایک زینہ نیچے اترنے کے لیے ہے اور دوسرا اوپر چڑھنے کے لیے اور دروازہ ایک چھوٹے سے کواڑ سے بند رہتا ہے ۔"[1]

علی ہروی ۱۱۷۳ء میں لکھتا ہے :

"۵۷۰ھ میں جب کہ میں سکندریہ میں تھا ، میں نے شیخ حافظ ابو طاہر السلفی کے سامنے لوگوں کو ایک کتاب پڑھتے ہوئے سنا ، جس میں مصنف نے بیان کیا تھا کہ ایک شخص حبرون میں زیارت کے لیے آیا اور اس نے حرم کے محافظوں کو بہت کچھ روپیہ دیا اور ان میں سے ایک سے [جو یونانی تھا] دریافت

۱۔ ناصر خسرو : ص ۴۸ تا ۵۳ ۔

کیا : 'کیا یہ بھی ممکن ہے کہ میں ان انبیاء علیہم السلام کی نعشیں دیکھوں؟' محافظ نے جواب دیا :
'ابھی تو ممکن نہیں مگر تم اس وقت تک ٹھہرو کہ زائرین کا ہجوم کم ہو جائے، اس وقت یہ ممکن ہوگا۔'
چنانچہ جب زیارت کا زمانہ گزر گیا، تو اس محافظ نے پتھر کا ایک چوکا فرش مسجد میں سے اٹھایا اور
چراغ لے کر اندر چلا اور تقریباً ستر سیڑھیاں اترنے کے بعد یہ دونوں ایک وسیع غار میں پہنچ گئے۔ یہاں
ہوا نے روک چل رہی تھی اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جسد مبارک سبز لباس میں ایک
چبوترے پر دھرا ہوا تھا اور جب ہوا چلتی تھی تو آنحضرت کے سفید کاکل لہراتے تھے۔ آنحضرت کے
پہلو میں حضرت اسحاق و یعقوب کی نعشیں تھیں۔ پھر رہنما زائر کو لیے ہوئے غار کی دیوار تک بڑھا اور
اسے بتایا کہ اس کے پیچھے حضرت سارہ کی نعش ہے اور اس کا قصد تھا کہ وہ دیوار کے پیچھے بھی زائر
کو لے جائے کہ اتنے میں ایک آواز آئی کہ 'خبردار یہ حرم ہے' راوی کا بیان ہے کہ تب وہ الٹے
پھرے اور جس راستے سے پیچھے گئے تھے اسی سے واپس چلے آئے ۔۔۔ اور میں علی ہروی، اللہ تعالیٰ
میرے گناہوں کو معاف فرمائے جو کچھ خود مجھے معلوم ہوا اسے ذیل میں نقل کرتا ہوں : ۵۶۷ھ
۱۱۷۲ء میں میں بیت المقدس گیا اور وہاں اور حبرون دونوں جگہ کے بعض شیوخ سے واقفیت بہم پہنچائی۔
ان لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ ۵۱۳ھ ۱۱۱۹ء میں فرنگی بادشاہ بردول (بالڈون ثانی) کی حکومت
تھی، غار ابراہیم کا ایک حصہ اوپر سے دھنس گیا تھا۔ بادشاہ کی اجازت سے بعض فرنگی اس کے اندر داخل
ہوئے جہاں انہیں حضرت ابراہیم، اسحاق و یعقوب علیہم السلام کی نعشیں ملیں۔ یہ دیوار کے سہارے
ٹھہری تھیں اور ان کے کفن پارہ پارہ ہو چکے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے سر پر رومال (یا فانوس) پڑا
ہوا تھا مگر سر کے بال کھلے ہوئے تھے۔ تب بادشاہ نے نئے کفن مہیا کرائے اور اس جگہ کو دوبارہ
بند کر دیا گیا۔ سردار بادون (برون) نے جو بیت اللحم میں رہتا تھا اور اپنی دلیری اور سپاہیانہ کارناموں
کے باعث فرنگیوں میں بہت دی رتبہ مانا جاتا تھا، مجھ سے بیان کیا کہ وہ ایک مرتبہ اپنے باپ کی
معیت میں اس غار کے اندر گیا اور وہاں اس نے حضرت ابراہیم خلیل اور اسحق و یعقوب علیہما السلام کی
نعشوں کو دیکھا اور ان کے سر کھلے ہوئے تھے۔ تب میں نے پوچھا : 'اس وقت تمہاری عمر کیا تھی؟'
اس نے کہا تیرہ سال کی۔ پھر اس نے یہ بھی مجھے بتایا کہ شاہ جفری ابن جرج (Geofrey son of George)
بھی ان میں تھا جنہیں بادشاہ (بالڈون) نے انبیاء کو نئے لباس پہنانے اور جو عمارت ٹوٹ گئی تھی اس کی
مرمت کروانے پر مامور کیا تھا۔ ۔۔ اب میں علی ہروی کہتا ہوں کہ میں نے اس طرح ایک ایسے
شخص کو دیکھا جس نے حضرت ابراہیم و اسحق و یعقوب علیہم السلام کی زیارت کی تھی۔'' [1]

کہف مکفیلہ کے کھولے جانے کی نسبت علی ہروی کی مذکورہ بالا روایت کی تصدیق
"تاریخ ابن الاثیر" کے ایک حاشیے سے بھی ہوتی ہے جو ۵۱۳ھ کے احوال کے ضمن میں تحریر
ہے اور یہ سال بھی وہی ہے جو علی ہروی نے بیان کیا ہے۔ ابن الاثیر لکھتا ہے :

''اس سال حضرت ابراہیم اور آنحضرت کے دو بیٹوں اسحق و یعقوب علیہم السلام کے مقابر بیت المقدس
کے قریب ایک جگہ کھولے گئے اور بہت سے لوگوں نے ان پیغمبروں کی زیارت کی۔ ان کے اعضا میں کسی
قسم کا خلل نہ تھا اور ان کے پاس سونے چاندی کے چراغ رکھے ہوئے تھے۔''

یاقوت، علی ہروی کے مذکورہ بالا بیانات کا بڑا حصہ نقل کرکے حبرون کی گزشتہ تاریخ
کے متعلق حسب ذیل روایات کا اضافہ کرتا ہے :

''حضرت سلیمان نے وحی ربانی کے ذریعے اور ایک آسمانی روشنی کی ہدایت کے مطابق الرامہ
میں عمارت بنانی شروع کی تھی جو اسی بلندی پر واقع ہے کہ جبرا اس کے زیر قدم ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے
فرمایا : 'یہاں نہیں کیونکہ آسمان میں روشنی کو دیکھو۔ کیا وہ جبرا در غار کے اوپر نہیں پڑ رہی ہے؟'
تب حضرت سلیمان نے غار کے اوپر وہ احاطہ تیار کرایا جو ابھی تک موجود ہے اور اس غار میں

۱۔ علی ہروی، ص ۴۳-۴۵۔

حضرت آدم کی قبر تھی اور احاطے کے عقب میں حضرت یوسف؂ کی قبر ہے ۔ حضرت یوسف؂ کی نعش پہلے نیل کے وسط میں دفن تھی ۔ وہاں سے حضرت موسیٰ؂ اسے یہاں لائے تھے ۔ غار زمین کے اندر ہے اور احاطہ اس کے اوپر بشکل دائرہ نہایت استحکام سے بنایا گیا ہے ۔''[1]

سیاح ابن بطوطہ ۱۳۵۵ء میں جبرون گیا ۔ اس کے سفر نامے میں اس مقام کا یہ حال لکھا ہے :

''حبرون کی مسجد (حرم) تراشیدہ پتھروں سے بنی گئی ہے اور ایک ایک پتھر ۲۷ بالشت (شبر) طول میں ہے ۔ کہتے ہیں حرم شریف کو حضرت سلیمان؂ نے جنات کی مدد سے بنوایا تھا ۔ اس کے اندر مقدس غار ہے جس میں حضرت ابراہیم ، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی ازواج کی قبریں ہیں ۔ منبر کی دائیں جانب اور باہر کی جنوبی دیوار سے ملی ہوئی ایک جگہ ہے کہ سنگ مرمر کی مستحکم بنی ہوئی سیڑھیوں سے اس میں پہنچتے ہیں اور وہاں سے ایک تنگ مسقف راستہ جاتا ہے جو ایک سنگ مرمر کے فرش والے کمرے میں نکلتا ہے اس میں تین قبروں کے تعویذ ہیں ۔ سنا ہے ان کے نیچے قریب ہی اصلی قبریں بھی [زمین کے اندر] ہیں ۔ یہ مسقف راستہ ابتدا میں اسی مقدس غار کے اندر تک پہنچتا تھا لیکن اب اسے بند کر دیا گیا ہے ۔ رہا اوپر کا کمرہ تو اس میں خود میں کئی بار اترا ہوں ۔''[2]

الحافظ ابن عساکر ''التاریخ الکبیر'' میں تحریر کرتا ہے :

''احادیث کی ایک کتاب میں میں نے حسب ذیل عبارت دیکھی اور اسے نقل کرتا ہوں : 'محمد ابن بکران ابن محمد الخطیب ، حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی مسجد مبارک کا واعظ' روایت کرتا ہے ، محمد ابن احمد بن علی ابن جعفر العنبری سے جس نے خود سنا اسے ابوبکر الاسکاف سے ، وہ کہتا تھا کہ حضرت ابراہیم؂ کا مزار جس جگہ دیکھا جاتا ہے ، مجھے حق الیقین حاصل ہے کہ یہ انھیں کی قبر ہے کیونکہ میں نے اسے اور آنحضرت کے جسد مبارک کو بچشم خود دیکھا ہے ۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ میں نے زرکثیر ، بقدر ۴ ہزار دینار اس مقدس مقام اور اس کے محافظوں پر خرچ کیا ، اس امید میں کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کی رضامندی حاصل ہو اور میں یہ بھی چاہتا تھا کہ حضرت ابراہیم؂ کی قبر کے متعلق جو کچھ سنا تھا اس کی پوری طرح تصدیق ہو ۔ چنانچہ جب میرے تقویٰ اور فیاضی اور ان لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق اور مدارات وغیرہ سے ان [محافظین حرم] کے دل مٹھی میں آ گئے تو میں نے اس شے کی حقیقت معلوم کرنے کی تدبیر کی جو میرا دلی مقصد تھا اور ایک دن جب ہم سب ایک جگہ جمع تھے ، میں نے ان محافظوں سے کہا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ تم سے اس غار کے دروازے پر مجھے لے چلنے کی درخواست کروں تاکہ میں اندر اتر سکوں اور اپنی آنکھوں سے ان انبیاء علیہم الصلوٰہ والسلام کی قبور کا مشاہدہ کروں ۔ محافظوں نے جواب میں کہا کہ ہم تمھارے واسطے ضرور ایسا کرنے پر آمادہ ہوں گے کیونکہ ہم تمھارے بہت زیر بار احسان ہیں لیکن اس وقت باہر کے زائرین برابر آ رہے ہیں اور یہ بات ممکن نہیں ہے ۔ تم جاڑے کے آنے تک صبر کرو ۔ چنانچہ جب کانون ثانی [جنوری] کا مہینہ آیا تو میں پھر ان کے پاس گیا لیکن انھوں نے کہا کہ ابھی ہمارے پاس ٹھہرو تاآنکہ برف گرنے لگے ۔ پس میں ان کے پاس برف باری کے زمانے تک رہا اور جب زائرین و مسافرین کی آمد موقوف ہو گئی تو محافظ مجھے ایک پتھر کے پاس لے گئے جو حضرت ابراہیم خلیل اور حضرت اسحٰق علیہما السلام کی قبروں کے تعویذوں کے درمیان رکھا ہوا تھا ۔ اسے انھوں نے الگ اٹھا لیا اور ان میں سے ایک شخص صعلوک جو بہت اچھا آدمی تھا اور صاحب اعمال حسنہ تھا ، میری رہنمائی کے لیے اترنے پر تیار ہوا ۔ پھر وہ نیچے اترا اور میں اس کے پیچھے پیچھے اترا ۔ ہم ۲۷ زینے اترے ، یہاں تک کہ دائیں طرف ایک جگہ پہنچے جہاں کالے پتھروں کی ایک بڑی چبوتری سی بنی ہوئی نظر آئی ۔ ۔ ۔

۱- یاقوت : معجم البلدان ، ج ۲ ، ص ۱۹۴ -

۲- ابن بطوطہ : ''رحلہ'' ، ج ۱ ، ص ۱۱۴-۱۱۵ -

اس پر ایک کمر السن مرد کا جسم تھا جو چت لیٹا ہوا تھا ۔ اس کی ڈاڑھی لمبی اور رخساروں پر گونی تھی اور سبز رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے ۔ صعلوک نے مجھ سے کہا: 'یہ اسحاق ہے' [علیہ السلام] پھر ہم کسی قدر اور آگے چلے اور ہم نے بھی بڑی چبوترے کے پاس آئے جس پر اسی طرح ایک مرد بزرگ چت لیٹا ہوا تھا ۔ درازی ... سے اس نے سینے کے بال تک سفید تھے ۔ سر ، ڈاڑھی ، ابرو کے بال اور پلکیں بھی سفید تھیں ۔ وہ بھی سبز لباس میں تھا جس نے اس کے جسم اور تابوت کے بڑے حصے کو ڈھانک رکھا تھا ۔ ہوا سے اس کے سفید بال کل ادھر ادھر اڑے لگے تھے ۔ صعلوک نے مجھ سے کہا: 'یہ ابراہیم خلیل ہے' [علیہ الصلوٰۃ والسلام] میں خدائے عزوجل کی حمد و ثنا کرتا ہوا سجدہ میں گر پڑا کہ اس نے مجھے ایسی چیز دکھائی ۔ پھر ہم آگے بڑھے اور دوسرے تابوت کے پاس جو پہلے سے قدرے چھوٹا تھا ، پہنچے جس پر ایک مرد ضعیف لیٹا ہوا تھا ۔ تمازت آفتاب سے اس کا رنگ سولایا ہوا تھا اور ڈاڑھی گھنی تھی ۔ اس کے جسم پر بھی سبز کپڑے اسے ڈھکے ہوئے تھے ۔ صعلوک نے مجھ سے کہا: 'یہ یعقوب نبی ہیں' [علیہ السلام] ۔ پھر ہم دائیں طرف گویا حرم کے اندر جانے کے لیے پلٹے ۔ محمد العمری کہتا ہے کہ اس جگہ پہنچ کر ابوبکر الاسکاف نے مجھ سے کہا کہ یہ قصہ یہیں ختم کر دینا چاہیے ۔ چنانچہ میں اس کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا اور ہماری ملاقات اور جو کچھ وہ سنا رہا تھا وہ بات یہیں ختم ہو گئی ۔"

" اس کے بعد عرصہ ملنے کی میں جزد مسجد ابراہیم (خبرون) گیا اور مسجد میں پہنچ کر میں نے صعلوک کی نسبت دریافت حال کیا ۔ لوگوں نے کہا وہ ایک گھنٹے میں یہاں آ جائے گا ۔ جب وہ آیا تو میں اس کے پاس گیا اور اس کے برابر بیٹھ کر وہ قصہ میں نے اس کے دوست ابوبکر الاسکاف سے سنا تھا وہ بیان کرنا شروع کیا ۔ لیکن وہ مجھے ایسی نظر سے دیکھتا رہا گویا ان واقعات سے جو میں کہہ رہا تھا ، وہ بالکل لا علم تھا ۔ بس میں اس کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوا ... اس پر ظاہر کیا کہ میں کوئی برا خیال لے کر نہیں آیا بلکہ ابوبکر الاسکاف میرا چچا ہے ۔ اس پر وہ میری جانب مائل ہو گیا ۔ میں نے کہا اے صعلوک ، تم کو خدا کی قسم ، یہ تو بتاؤ کہ جب تم حرم کے اندر جانے کے لیے پلٹے تو کیا واقعہ ہوا اور کیا چیز تھی جو تم نے معائنہ کی ۔ اس نے کہا کیا ابوبکر نے اس بارے میں مجھ سے کچھ نہیں کہا ؟ میں نے جواب دیا میں اسے تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں ۔ تب اس نے کہا کہ ہم نے ایک آواز گویا حرم کے قریب سے آتی ہوئی سنی کہ کوئی پکار کے کہتا ہے کہ تم حرم سے چلے جاؤ ۔ خدا تم پر رحم کرے ! اور ہم دونوں بے ہوش ہو کر گر پڑے ۔ تھوڑی دیر بعد جب ہوش آیا تو ہم اٹھے مگر زندگی سے ناامید تھے اور ہمارے ساتھی بھی جو اوپر تھے مایوس ہو گئے تھے کہ ہم کو دوبارہ زندہ نہ دیکھیں گے ۔"

اس طرح یہ گویا علی ہروی کی بیان کردہ روایت کا ہی ایک مطول بیان ہے ۔

حضرت یوسفؑ کی لحد کے بارے میں مجیر الدین نے لکھا ہے :

"حضرت یوسفؑ کی قبر اس قلعے میں ہے جو حضرت سلیمانؑ کے بنائے ہوئے احاطے [یعنی حرم] کے باہر رہ گیا ہے ۔ خود یہ قبر حضرت یعقوبؑ کی قبر کے مقابل اور آنحضرت کے آبائے کرام حضرت ابراہیم واسحاق [علیہما السلام] کی قبروں کے قریب ہے ۔ یہ ابراہیم ابن احمد الخلنجی کا بیان ہے کہ خلیفہ المقتدر کی بیویوں میں سے 'العجوز' نام ایک بیوی نے جو اس مقدس شہر میں مقیم تھی مجھ سے فرمائش کی کہ اس مقام پر جاؤں جہاں حسب روایات حضرت یوسفؑ دفن ہوئے اور لحد کا پتہ چلا کر اس کے اوپر کوئی مقبرہ وغیرہ تعمیر کرا دوں ۔ چنانچہ الخلنجی مزدوروں کو لے کر روانہ ہوا اور وہ جگہ معلوم کی جہاں مشہور تھا کہ یوسف علیہ السلام دفن ہوئے ہیں اور یہ احاطے کے باہر حضرت یعقوبؑ کی قبر کے مقابل ایک جگہ تھی جسے الخلنجی نے کھیت کے مالک سے خرید لیا اور اسے کھدوانا شروع کیا ۔ روایت میں جس جگہ کی نشاندہی کی جاتی تھی ٹھیک اسی جگہ انہیں ایک چٹان ملی اور الخلنجی کے حکم سے اسے توڑ دیا گیا ۔ اس کا ایک ہی حصہ الگ کیا گیا تھا اور الخلنجی کہتا ہے کہ خود میں بھی کھائی کے اندر موجود تھا کہ مزدوروں نے پتھر کا ٹکڑا جو اٹھایا تو ناگہاں حضرت یوسف علیہ السلام کا جسم مبارک ہمیں نظر آیا کہ حسن و جمال میں ویسا ہی

دلکش و دلربا تھا جیسا ہم سنتے آئے تھے - پھر پہلے تو اس مقام سے خوشبو آئی اور اس کے بعد تیز ہوا چلنے لگی - لہٰذا میں نے مزدوروں سے کہا کہ چٹان کے ٹکڑے کو اپنی جگہ اس طرح رکھ دیں جیسا کہ وہ پہلے تھا - بعد ازاں اس جگہ وہ گنبد بنوا دیا گیا جو اب تک موجود ہے۔"[۱]

ان اقتباسات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ شہر خلیل کے تہہ خانوں میں حضرت ابراہیم[ؑ]، حضرت اسحٰق[ؑ]، حضرت یعقوب[ؑ] اور ان کی ازواج کی نعشیں موجود ہیں اور حضرت یوسف[ؑ] کی قبر بھی یہیں ہے - یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نعشیں تو تہہ خانے میں چبوتروں پر رکھی ہیں اور اوپر باہر زمین پر اسی جگہ قبروں کے تعویذ بنے ہوئے ہیں جن کے اوپر حجرے ہیں - یہ حجرے خود بھی عمارت کے اندر ہیں - زائرین ان حجروں کی جالیوں میں سے قبروں یعنی حجروں کے اندر سطح زمین پر بنے ہوئے قبر کے تعویذوں کی زیارت کرتے ہیں - ان اقتباسات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں تہہ خانے کی چھت کے بیٹھ جانے کی بدولت مرمت کی خاطر اور بعض مختلف اوقات میں بصورت دیگر تہہ خانے میں بعض لوگ اترے اور ان انبیا علیہم السلام کے جسدوں کا دیدار کیا اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ ایسے واقعات بھی ہوئے کہ کوئی ایک آدھ فرد محافظین حرم سے مل ملا کر تہہ خانے میں اتر گیا - چنانچہ ان روایتوں سے شرر نے "فردوس بریں" میں استفادہ کیا ہے لیکن یہ ایک بات ضرور کھٹکتی ہے کہ شرر کے ناول کا پلاٹ زمانی اعتبار سے ۶۵۲ ھجری کے عہد کو پیش کر رہا ہے جب کہ مندرجہ بالا تاریخی اقتباسات سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری کے نصف کے بعد سے ان تہہ خانوں کے راستے مکمل طور پر بند کر دیے گئے تھے اور پھر کوئی بھی نیچے نہیں اتر سکا تھا اور نہ ہی اس کے بعد کسی کے اترنے کی روایت بیان کی جاتی ہے - اس طرح شرر نے روایتوں کی جس رعایت سے فائدہ اٹھا کر پلاٹ کا یہ تانا بانا بنایا تھا وہ تاریخی حقیقت سے متصادم اور بعد از وقت ہو جاتا ہے کیونکہ ۵۸۰ھ کے بعد سے یہ راستہ دیوار چن کر بالکل بند کر دیا گیا تھا ، ابن بطوطہ کے بیانات میں اس امر کا واضح اشارہ موجود ہے - نیز حسین کا تہہ خانوں کے راستے کے قریب پڑا رہنا شرر نے کچھ ایسے انداز میں بیان کیا ہے جس سے یہ تصور ابھرتا ہے کہ وہاں کوئی بند دروازہ یا رکاوٹ موجود نہیں تھی اور سب مجاور وغیرہ وہیں سیڑھیوں کے سرے پر پڑے رہتے تھے - حقیقت اس کے برعکس ہے جو مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہو جاتی ہے - نیز محافظین اور دیگر زائرین کے قیام کے لیے اس بڑی عمارت یعنی حرم کے باہر مکان بنے ہوئے تھے - ناصر خسرو اور یاقوت وغیرہ نے ان کا مفصل ذکر کیا ہے -

"فردوس بریں" میں بیان کردہ تہہ خانے کی ایک اور بات محل نظر ہے - شرر نے لکھا ہے کہ کئی لاشیں چبوتروں پر رکھی نظر آئیں لیکن تاریخی بیانات سے یہ درست ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس تہہ خانے میں تین انبیا علیہم السلام اور ان کی تین ازواج کی (کل چھ) نعشوں کا ذکر ہوا ہے - وہ بھی اس طرح کہ صرف تین انبیا علیہم السلام کی نعشیں ہی دیکھی جا سکتی

۱- مجیرالدین : انس الجلیل ، ص ۶۴ ، تہہ خانوں سے متعلق یہ جملہ تفصیلات جس میں مختلف مصنفین کے حوالے موجود ہیں جی لی سٹرینج کی کتاب The Palestine under the Moslems سے لی گئی ہیں - ص ۳۰۹ تا ۳۲۷، ترجمہ بعنوان فلسطین و شام (بعہد حکومت اسلامی)، مترجم سید ہاشمی فرید آبادی (ص ۳۷۷-۳۹۹) -

ہیں اور وہ بھی ایک وقت میں نہیں ، کیونکہ یہ ایک دوسرے کے پائنتی سرہانے قطار میں ہیں۔ ان کی ازواج علیہن السلام کی نعشیں بھی اسی طرح ایک قطار میں ان کے پہلوؤں میں ۲۰ فٹ کے فاصلے پر ہیں اور ان دونوں قطاروں کے درمیان دیوار حائل ہے۔ ان ہی انبیا علیہم السلام کی نعشوں کے علاوہ کوئی چوتھی نعش وہاں موجود نہیں ، کیونکہ جیسا پہلے بیان ہوا حضرت یوسفؑ کی لحد احاطۂ حرم سے باہر ہے اور اس تہہ خانے میں شامل نہیں۔ گویا اول تو شرر کی یہ بات درست نہیں کہ وہاں چبوتروں پر کئی نعشیں موجود ہیں اور دوسرے ان کی بیان کردہ ترتیب صحیح نہیں۔ شرر نے لکھا ہے کہ ان سب نعشوں کے درمیان حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے جسم تھے ۔ اس پر ہم ابھی بحث کر چکے ہیں۔ شرر نے اپنے ناول کے ہیرو کو ان دونوں انبیا علیہما السلام کے درمیان اس طرح بٹھا دیا ہے کہ دونوں کے چہرے اس کے مقابل تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت یوسفؑ کی قبر حضرت یعقوبؑ کی قبر کے عین مقابل ہے لیکن ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ وہ احاطہ حرم سے باہر ہے اور اس تہہ خانے میں نہیں۔ لہذا ایسی کوئی صورت تصور میں بھی نہیں آ سکتی کہ ان کا ہیرو کسی ایسے مقام پر بیٹھ جائے کہ "دونوں نبیوں کے چہرے ہر وقت پیش نظر" ہوں۔

حسین (ہیرو) کے پہلی بار فردوس بریں میں پہنچنے کے موقع پر شرر نے جنت کی جو تفصیلات بیان کی ہیں ، ان کے مطابق اس میں دلکش نیلی نہر تھی ، جس کے ارد گرد خوبصورت پھول اور سایہ دار درخت تھے ، مرصع نشستیں ، نازک بدن اور پری جمال لڑکے تھے ، مختلف چمن اور روشیں تھیں ، چمنوں میں سونے چاندی کے تخت بچھے تھے ، مختلف میوہ دار درخت میووں سے لدے تھے ، خوبصورت محل اور بارہ دریاں بھی مختلف چمنوں میں بنی ہوئی تھیں[1]۔ اس بیان کی بہت سی جزئیات ، شرر کے تخیل کی گلکاریوں کا نتیجہ ہیں اور تخیل کا یہ عنصر فنکار کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کیونکہ ادیب یا شاعر کے پاس تصویر کشی کا واحد ذریعہ الفاظ ہوتے ہیں اور الفاظ کے ذریعے تصویر کشی کرتے ہوئے وہ تشبیہ و استعارہ کا سہارا لیتا ہے جو اپنی فطرت میں تخیل کا عنصر رکھتے ہیں۔ لہذا تخیل کی رنگ آمیزی لابدی امر ہے اور شرر کے یہاں ان خیالی جزئیات سے بھرپور منظر کشی کے حسن سلیقے اور فن کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ لیکن فردوس بریں کا یہ سارا منظر محض فرضی یا تخیلاتی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد بعض حقیقتوں پر ہے جو روایات ، سفر ناموں اور تواریخ کے ذریعے ان تک پہنچیں اور انھوں نے ان تواریخی روایات کے سانچے میں اپنے موقلم سے رنگ بھر کر انھیں جاذب نظر ، حقیقی اور آبدار بنا دیا۔

"فردوس بریں" کے پلاٹ کے سلسلے میں شرر نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ اس کی ابتدائی تحریک مارکوپولو کے سیاحت نامے کے مطالعے سے ہوئی۔ چنانچہ فردوس بریں کے منظر اور مارکوپولو کی روایات یکساں دکھائی دیتی ہیں۔ مارکوپولو ، خور شاہ کے والد علاء الدین کے عہد اقتدار میں اس علاقے سے گزرا۔ وہ اپنے سفرنامے میں فرقۂ باطنیہ کی اس جنت کا تفصیلی ذکر کرتا ہے اور اسے نہایت ہی پراسرار ، دلچسپ اور حسین جگہ قرار دیتا ہے۔ مارکوپولو کا بیان یہ ہے کہ :

۱۔ فردوس بریں ، ص ۱۴۱ تا ۱۴۵ ۔

''شیخ الجبال نے دو پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی تنگ وادی میں ایک ایسا عظیم الشان اور خوبصورت باغ لگوایا جیسا شاید ہی کبھی دیکھنے میں آیا ہو - اس باغ میں ہر قسم کے میوہ جات پائے جاتے تھے - شیخ نے اس باغ میں عظیم اور شاندار محل ، کوشکیں اور قصر تعمیر کروائے جن کے حسن کا تصور بھی انسانی تخیل سے بالاتر ہے - ان قصروں کی دیواروں پر خوبصورت مینا کاری اور منبت کاری کی گئی تھی - باغ میں ہر طرف نہریں بہتی تھیں جو شراب، شہد، دودھ ، پانی اور دیگر مائعات سے پر تھیں - شیخ نے یہاں نہایت حسین و نازنین کمسن دوشیزائیں جمع کر رکھی تھیں جو فن موسیقی اور ہر طرح کے ساز بجانے میں ماہر تھیں اور ازحد خوش گلو تھیں - شیخ الجبال نے یہ سب اہتمام اس لیے کیا تھا کہ وہ لوگوں کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ یہی حقیقی بہشت ہے -'' (ترجمہ)[۱]-

کرنل ہنری یول کا بیان ہے کہ فرقۂ باطنیہ کی جنت کے بارے میں یہ باتیں تمام مشرق میں مشہور تھیں اور اس کی تفصیلات مختلف مصنفین و مورخین نے شرح و بسط کے ساتھ لکھی ہیں - چینی سیاح کے سفرنامے میں بھی یہ تفاصیل موجود ہیں جنھیں کرنل ہنری یول نے ریموزے (Remusat) کے حوالے سے قلمبند کیا ہے - عربی ادب میں بھی اس سے مطابقت رکھتے ہوئے بیانات ملتے ہیں - بقول کرنل ہنری یول عربی روایات خصوصاً Memoirs of Hakim میں مندرج تفصیلات مارکوپولو کے بیانات سے حیرت انگیز حد تک مطابقت رکھتی ہیں - کرنل ہنری یول عربی روایت کو Hammer کے حوالے سے (Mines de l'orient III 201) نقل کرتے ہیں[۲] -

تاریخ جہانگشای[۳] ، طبقات ناصری اور جامع التواریخ[۴] میں قلعہ الموت کے بارے میں جو بیانات ہیں ان میں بھی مختلف قصروں ، کوشکوں ، قلعہ کے اندر نہروں اور حوضوں کا ذکر ہے - نیز یہ بھی بیان ہوا ہے کہ مختلف مائعات سے حوض بھرے ہوئے تھے جن میں شہد وغیرہ بھی شامل تھا - عطا ملک جوینی کا بیان اس ضمن میں سب سے زیادہ مستند قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ ہلاکو خان کے سرکردہ درباری تھے اور الموت پر قبضہ کے وقت وہ ہلاکو خان کے ہمراہ قلعہ لمسر کے محاصرے پر تھے جہاں الموت کی فتح کی خبر سنتے ہی انھوں نے ہلاکو خان سے اس امر کی اجازت لی کہ جب تک وہ قلعہ میں داخل ہوکر وہاں کی لائبریری کو دیکھ نہ لیں اس وقت تک فوج کو تاخت و تاراج سے باز رہنے کا حکم دیا جائے - چنانچہ جوینی کی درخواست پر عمل درآمد کے احکامات جاری ہوگئے اور اس طرح جوینی ، جیسا کہ انھوں نے خود بیان کیا ہے ، ان پہلے آدمیوں میں تھے جو الموت کی فتح کے بعد اس کے انہدام سے پہلے اس میں داخل ہوئے اور اسے اسی حالت میں دیکھا جیسا کہ وہ باطنیوں کے دور اقتدار میں تھا اس لیے جوینی کے بیانات کو قلعے سے متعلق عینی شہادت تصور کرتے ہوئے مستند قرار دیا جا سکتا ہے - دیگر معاصر مورخین نے بھی زیادہ تر جوینی ہی کے بیانات سے استفادہ کیا ہے - یہ معاصر مورخین اگرچہ الموت کے حوضوں ، باغوں اور قصروں کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن ان کے مصرف کی طرف واضح اشارہ نہیں کرتے لیکن پھر بھی اس سے مارکوپولو کے سفرنامے کی روایات کی بنیادی باتوں کی تصدیق ہو جاتی ہے - عطا ملک جوینی نے لکھا ہے :

۱- The book of Sir Marco Polo ، ترجمہ از کرنل ہنری یول ، ج ۱ ، باب ۲۳ ، ص ۱۴۵ ، مطبوعہ لندن ، ۱۸۷۵ء -
۲- ایضاً ، ص ۱۴۹ ، ۱۵۰ -
۳- تاریخ جہانگشای ، ج ۳ ، ص ۲۷۳ -
۴- فصلی از جامع التواریخ ، ص ۱۳۵، ۱۳۶ -

''حوضهای عمیق که از استعمال سنگ و آهک استغنا حاصل داشت که آب تنحتون من الجبال بیوتا در صفت آن وارد ساخته بودند و جهت شراب و سرکه و عسل و انواع مائعات و ادهان و جامدات انبارها و حوضها کنده و الشیاطین کل بناء و غواص که تفاصیل تعابیر آن در قصص من اراد فی آن عبارت مشاهده افتاد حوضی در سنگ بریده و در شیب آن حوضهای دریا آسا هم از سنگ ساخته که آب سرای خویش جهت ذخیره در آنجا رفتی و پیوسته آن جا روان بودی ۔''[1]

شرر نے اس جنت کے بارے میں دیگر تفصیلات زمرد کی زبانی آٹھویں باب میں بتائی ہیں۔ ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ "فردوس بریں" دراصل شاہان التموت کے سراپا حرم اور عشرت کدے کا درجہ رکھتی تھی اور ان کے محل سے ملحق تھی۔ یہ چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی اور اس کا راستہ قلعے میں واقع شاہی محل سے یا نہر کے ذریعے ہی تھا۔ خوبصورت عورتیں وہاں حوروں کے فرائض انجام دیتی تھیں، اور جن لوگوں کو معتقد بنا کر اہم کام لینے ہوتے تھے انہیں بھنگ پلا کر بے ہوشی کی حالت میں نہر کے راستے کشتی سے اس باغ میں پہنچادیا جاتا۔ ایسے لوگوں کے وہاں لائے جانے کے موقع پر خاص اہتمام کیا جاتا اور مکر و فریب کا جال خوب پھیلایا جاتا۔ اس باغ میں نہروں کے علاوہ تہہ خانے اور زمین دوز قصر بھی موجود تھے۔ بعض حوض ان خاص مواقع پر شہد، دودھ اور شراب وغیرہ سے بھرے جاتے تھے، معمول کو دو چار روز وہاں رکھ کر پھر بے ہوشی کی حالت میں نکال دیا جاتا اور وہ دوبارہ وہاں تک پہنچنے کے لیے اپنے آقاؤں اور مذہبی پیشواؤں کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ فرمانروائے التموت کی مرضی کے بغیر کوئی شخص وہاں نہیں آ سکتا تھا اور التموت کا حصار بذات خود انتہائی مضبوط تھا۔ زمرد کی زبانی اور بھی کئی تفصیلات بیان ہوئیں جنہیں طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

مندرجہ بالا بیان میں جن تفصیلات کا ذکر ہوا وہ تاریخی حقائق پر مبنی ہیں۔ اس فردوس بریں کا شاہان الموت کے سراپا حرم اور عشرت کدے کا درجہ رکھنے کا ذکر مارکوپولو نے بھی کیا ہے اور طبقات ناصری کے مترجم (انگریزی) میجر ریورٹی بھی کتاب کے حواشی میں مختلف حوالوں سے یہی لکھتے ہیں۔ پیٹرولی نے بھی اپنی کتاب میں مختلف روایات کے سہارے یہی بات دہرائی ہے مگر اس مذکورہ کتاب میں پیٹرولی نے اس باغ کے پھیلاؤ، تہہ خانوں اور حوضوں کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ اپنی جماعت کی مکمل سروے رپورٹ شائع کرتے ہوئے ان کی پیمائش بھی دی ہیں[2] جن سے W. Ivonov کے مضمون میں[3] بیان کردہ شکوک کا ازالہ اور شرر کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔

فدائیوں اور معتقدوں کو جنت کی سیر کرانے کے طریقے سے متعلق زمرد کی زبانی شرر کے بیانات مارکوپولو کی بیان کردہ تفصیلات سے بالکل ملتے جلتے ہیں۔ مارکوپولو کا بیان ہے کہ:

''شیخ کی مرضی کے بغیر کوئی آدمی اس باغ میں نہیں داخل ہو سکتا تھا۔ وہاں صرف وہ لوگ بھیجے

۱- تاریخ جہانگشای، ج ۳، ص ۲۷۳۔
۲- پیٹرولی : The Castles of the Assassins، ص ۲۲۹ و بعد۔
۳- در رسالہ Islamic Culture، س ۱۹۳۸ء۔

جاتے تھے جنھیں وہ حشیشین کے گروہ میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ اس باغ کے دروازے پر ایک بہت ہی مضبوط قلعہ تھا جو تمام دنیا کی قوت کی مدافعت کر سکتا تھا اور اس قلعے کے سوا باغ میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔۔۔ شیخ کے دربار میں ملک کے کئی نوجوان حاضر رہتے جنھیں وہ اس جنت کے قصے سنایا کرتا اور وہ اس پر پورا اعتماد اور اعتقاد رکھتے۔ وہ ان نوجوانوں میں سے چار، چھ یا زیادہ سے زیادہ دس کو بیک وقت اس جنت میں بھیجا کرتا تھا۔ جنت میں بھیجنے سے پہلے انھیں بے ہوشی کا دارو پلا دیا جاتا تھا جس سے وہ گہری نیند سو جاتے اور سوتے ہی میں انھیں اٹھا کر اس باغ میں پہنچا دیا جاتا۔ چنانچہ جب ان کی آنکھ کھلتی تو وہ اپنے آپ کو اس باغ میں پاتے جو اس قدر خوبصورت تھا کہ وہ بلاشبہ اسے بہشت تصور کرتے۔ وہاں حسین دوشیزائیں ان کی ہر طرح خاطر مدارات کرتیں اور ان کی خدمات تسکین کا ہر سامان فراہم کرتیں۔ چنانچہ انھیں وہاں وہ سب کچھ میسر ہوتا تھا جو نوجوانوں کو مرعوب کر سکتا ہے۔ ایسے میں وہ کب یہ پسند کر سکتے تھے کہ وہ اس جگہ کو اپنی مرضی سے چھوڑ دیں۔

بادشاہ، جسے ہم شیخ الجبال کہتے ہیں، کا دربار بہت پرشکوہ تھا اور اس نے سادہ لوح عوام کو یقین دلا رکھا تھا کہ وہ بہت بڑا پیغمبر ہے۔ جب کبھی وہ حشیشین میں سے کسی کو کسی خاص مہم پر بھیجنا چاہتا تو وہی داروئے بے ہوشی جس کا پہلے ذکر ہوا ہے، اس باغ میں موجود نوجوانوں میں سے کسی کو پلوایا جاتا اور اس طرح عالم بے خبری میں وہ باغ سے بادشاہ کے محل میں منتقل کر دیا جاتا، اس نوجوان کی جب آنکھ کھلتی تو وہ خود کو بہشت کی بجائے قلعے میں موجود پاتا اور اس جنت سے نکال دیے جانے کا دلی صدمہ محسوس کرتا۔ پھر اسے شیخ کی خدمت میں پیش کیا جاتا جہاں وہ اس طرح احترام و عقیدت سے سربسجود ہوتا کہ گویا واقعی وہ کسی حقیقی پیغمبر کے حضور میں ہے۔ بادشاہ اس سے پوچھتا کہ کہاں سے آ رہے ہو تو وہ جواب دیتا کہ فردوس بریں سے آیا ہوں اور اس طرح وہ حاضرین جو تاحال جنت کی سیر سے محروم ہوتے بہت متاثر اور مرعوب ہوتے اور ان کے دل میں جنت کی سیر کی تمنا شدت سے ابھرتی۔

شیخ نے جب کبھی کسی بادشاہ یا سلطان کو قتل کروانا ہوتا تو وہ ایسے نوجوان سے کہتا ”جاؤ اور فلاں کو قتل کر دو، تم جب واپس آؤ گے تو میرے فرشتے تمھیں بہشت میں پہنچا دیں گے اور اگر تم اس مہم میں مارے جاؤ تو بھی فکر نہ کرنا میں اپنے فرشتوں کو بھیج دوں گا کہ تمھیں اٹھا کر سیدھا بہشت میں پہنچا دیں۔“ چنانچہ اس نے ان لوگوں کے عقاید ایسے ہی سانچے میں ڈھال لیے تھے اور اس طرح اس کا کوئی حکم ایسا نہیں تھا جسے وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر پورا نہ کر دیتے ہوں تاکہ اس کی خوشنودی سے وہ بہشت میں جا سکیں۔ شیخ جس کسی سے بھی نجات چاہتا اسے اپنے آدمیوں سے اسی طرح قتل کروا دیتا تھا۔“ (ترجمہ)[1]

چینی سیاح کے بیانات بھی اس ضمن میں ایسے ہی ہیں جن کا ذکر کرنل ہنری یول نے ریموزے (Remusat) کے حوالے سے کیا ہے[2] اور Hammer نے Memoris of Hakim کے نام سے ایسی ہی عربی روایات بیان کی ہیں۔ ڈٹرولی مختلف روایات کے سہارے اس خفیہ جنت میں پیروؤں کو بھنگ پلا کر داخل کرنے اور اس طرح انھیں کسی کے قتل پر آمادہ کرنے کے طریقے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”کہا جاتا ہے کہ حسن صباح نے قلعہ الموت کے اندر ایک خفیہ باغ بنا رکھا تھا۔ فدائیوں کو، جب وہ خنجر زنی کے فن میں مہارت حاصل کر لیتے تھے، حشیش پلا کر اس باغ میں پہنچا دیا جاتا جہاں وہ تین دن ہر طرح کی مسرتوں سے لطف اندوز ہوتے اور انھیں یہ باور کرایا جاتا کہ یہ بہشت کی مسرتیں ہیں

۱- مارکوپولو کا سفر نامہ، مرتبہ کرنل ہنری یول، جلد اول، ص ۱۴۵ تا ۱۴۹ -
۲- ایضاً، ص ۱۵۰ -

لیکن یہ لذتیں زیادہ تر حسیاتی ہوتی تھیں ۔ ۔ ۔ وہ فدائی ہرگز یہ نہیں جان سکتے تھے کہ وہ کس طرح اس باغ میں پہنچے اور کب وہاں سے نکلے ، یہ سب کچھ انہیں ایک خواب کی طرح محسوس ہوتا تھا لیکن ایسا حقیقت پر مبنی زندہ خواب جس کے بارے میں وہ پورا یقین رکھتے تھے کہ وہ واقعی جنت میں تھے۔[1]

شرر نے ناول کے اختتام کے لیے ایک ڈرامائی انداز اختیار کیا ہے جس کی بہت سی جزئیات تاریخی صداقتوں سے مطابقت نہیں رکھتیں ۔ بعض نقادوں کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے اگر یہ تصور کر لیا جائے کہ ان جنوں کی موجودگی محض قارئین کی دلچسپی کے لیے ہے تو بھی دیگر کئی امور قابل ذکر ہیں ۔ شرر نے ناول میں جس طرح قلعہ الموت کے خاتمے کا ذکر کیا ہے اس کے مطابق ۲۷ رمضان کو ہلاکو خان کے ہمراہ اس کے دس ہزار سپاہی خفیہ راستوں سے باطنیوں کی جنت کی طرف سے اچانک قلعے میں داخل ہو گئے جب کہ وہاں عید [illegible] کا جشن ہو رہا تھا ۔ اس تاتاری گروہ نے ہلاکو خان کی سرکردگی میں قلعے میں پہنچتے ہی قتل عام شروع کر دیا ۔ اہل قلعہ بوکھلا اٹھے اور انھوں نے راہ فرار اختیار کرنے کے لیے قلعے کے پھاٹک کھول دیے ۔ لیکن تاتاریوں کا ۸۵ ہزار سپاہیوں کا لشکر پہلے سے موجود تھا جو دروازہ کھلتے ہی فوراً اندر داخل ہو گیا ۔ قتل عام کے بعد خور شاہ کی تلاش ہوئی اور وہ کسی تہ خانے سے برآمد کر لیا گیا ۔ ہلاکو خان نے اس کی جان بخشی کرتے ہوئے یہ سزا سنائی کہ اسے بحر خزر کے پار ترکستان کے علاقے میں تنہا پہنچا دیا جائے اور اس امر کی اجازت دے دی کہ وہ اگر چاہے تو ترکستان میں کسی تاتاری لڑکی سے شادی کر لے ۔ اس کے بعد ہلاکو خان کے حکم سے الموت آناً فاناً منہدم کر کے مٹی کے ڈھیروں میں تبدیل کر دیا گیا۔[2]

شرر کے ان بیانات میں پہلی بات جو تاریخی حقائق کے برعکس ہے وہ قلعہ الموت کی شکست اور انہدام کے وقت خور شاہ کا اس قلعے میں موجود ہونا ہے ۔ تاریخ کی رو سے ہلاکو خان نے الموت پر حملے سے پہلے میمون دز کا محاصرہ کیا تھا جہاں رکن الدین خور شاہ موجود تھا ۔ ہلاکو خان کے دربار سے وابستہ اور دیگر معاصر مورخین نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہلاکو خان ۲۶ شعبان ۶۵۱ھ کو لشکر لے کر قراقرم سے روانہ ہوا۔[3] راستے میں مختلف جگہوں پر مختلف عرصوں کے لیے قیام کرتا ہوا شعبان ۶۵۳ھ میں سمرقند پہنچا جہاں سے شوال ۶۵۳ھ میں روانہ ہوا۔[4] اس اثنا میں خور شاہ نے تاتاری سردار یسور نوین کے پاس مصالحت کے لیے ہمدان میں ایلچی بھیجا ۔ یسور نوین پہلے سے ہی ایک زبردست تاتاری لشکر کے ساتھ سرزمین ایران میں موجود تھا ۔ خور شاہ نے اپنے پیغام میں کہا تھا کہ اس سے پہلے جو غلطیاں ہوئیں وہ اس کے والد سے ہوئی ہوں گی خود اس نے ابھی ابھی اقتدار سنبھالا ہے اور اس سے تا حال ایسی کوئی غلطی نہیں سرزد ہوئی جو تاتاری سرداروں کی برہمی کا باعث بن سکے ۔ لیکن یسور نوین نے جواب دیا کہ اب بادشاہ ہلاکو خان چونکہ خود اس علاقے میں پہنچ رہا ہے

۱- پیٹرولی : ص ۲۰ ، ۲۱ ۔ ۲- فردوس بریں ، ص ۲۴۵ تا ۲۶۲ ۔

۳- (الف) تاریخ جہانگشای جوینی ، ج ۳ ، ص ۹۶ ۔
(ب) طبقات ناصری ، انگریزی ترجمہ از میجر ریورٹی ، حاشیہ ص ۱۱۹۴ ۔

۴- ایضاً (الف) ج ۳ ، ص ۹۸ (ب) ص ، ۱۱۹۶ ۔

اس لیے خور شاہ کو چاہیے کہ وہ بذات خود بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو[1]۔ چنانچہ خور شاہ نے اپنے بھائی سہنشاہ کو اس عرضداشت کے ساتھ ہلاکو خاں کی خدمت میں بھیجا کہ صلح کر لی جائے اور تین قلعے اس کو بخش دیے جائیں نیز حاضری کے لیے ایک برس کی مہلت دی جائے۔ یہ واقعات جمادی الاول ۶۵۴ھ کے ہیں[2]۔ یسور نوین ۱۰ جمادی الاول ۶۵۴ھ کو علاقہ رودبار میں داخل ہوا۔ خور شاہ کے بھائی شہنشاہ کے ہلاکو خاں کے پاس پہنچنے کے بعد جمادی الآخر کے اواخر میں دوبارہ ایلچی رکن الدین خور شاہ کے پاس پہنچے[3]۔ چنانچہ یہ نامہ و پیام بھی اسی طرح جاری رہا اور ہلاکو خاں کی ان قلعوں کی طرف پیش قدمی بھی ہوتی رہی۔ ۱۷ رمضان ۶۵۴ھ کو خور شاہ نے اپنا (نقلی) بیٹا ہلاکو خاں کے پاس بھیجا۔ ہلاکو خاں کو اصل کیفیت کا علم ہوگیا لیکن اس نے اس کا اظہار نہ کیا اور اس لڑکے کو دو دن تک کیمپ میں احترام کے ساتھ رکھ کر واپس بھیج دیا اور خود خور شاہ کی حاضری پر اصرار کیا۔ اسی اثنا میں ہلاکو خاں نے قلعہ شاہ دز کو فتح کر لیا[4]۔ ۵ شوال ۶۵۴ھ کو خور شاہ کا دوسرا بھائی شیر انشاہ ہلاکو کے کیمپ میں پہنچا تو ۹ شوال کو ہلاکو خاں نے سہنشاہ کو کیمپ سے واپس کرتے ہوئے رکن الدین کو پانچ دن کے اندر اندر تمام قلعے مسمار کرا کے حاضر ہونے کا نوٹس دیا اور ۱۲ شوال ۶۵۴ھ کو خود ہلاکو خاں قلعہ میمون دز کے سامنے پہنچ کر اس کی شمالی جانب کی پہاڑی پر خیمہ زن ہو گیا اور لشکر کو محاصرہ کر لینے کا حکم دے دیا۔ بالآخر ۲۷ شوال کو خور شاہ کا بیٹا، بھائی اور امراء ہلاکو کے سامنے حاضر ہوئے۔ ۲۹ شوال ۶۵۴ھ کو خود رکن الدین خور شاہ بھی حاضر ہوا اور یکم ذیقعدہ کو میمون دز ہلاکو خاں کے سپرد ہوا[5]۔ ہلاکو خاں نے کہا کہ خور شاہ اپنے ہاتھ سے تمام قلعداروں کو قلعے مسمار کر دینے اور حاضر ہونے کے احکام لکھے چنانچہ تعمیل ہوئی لیکن لمسر اور الموت کے سرداروں نے اس حکم کے ماننے سے انکار کر دیا۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ ان سرداروں نے یہ جرأت خور شاہ کے اشارے پر کی تھی، چنانچہ ہلاکو خاں رکن الدین خور شاہ کو ساتھ لیے ہوئے لشکر سمت الموت کی طرف بڑھا، اس کا محاصرہ کیا اور رکن الدین خور شاہ کو اوپر قلعے دار کی طرف بھیجا تا کہ اسے قلعہ خالی کر دینے کے بارے میں سمجھائے۔ خور شاہ ناکام لوٹا تو ہلاکو خاں قلعے کا سختی سے محاصرہ کرنے کا حکم دے کر کچھ لشکر کے ساتھ خود قلعہ لمسر کی طرف بڑھ گیا۔ قلعہ الموت کا محاصرہ جاری رہا بالآخر قلعہ والوں نے تنگ آ کر تین دن کی مہلت چاہی اور معاہدے کے مطابق چوتھی صبح قلعہ خالی کرکے باہر آ گئے اور پھر تاتاری لشکر قلعے میں داخل ہوا[6]۔

فرقہ باطنیہ کے قلعوں کے استیصال کی یہ روداد بہت مستند مآخذ اور مورخین کے بیانات

۱- فصلی از جامع التواریخ، ص ۱۲۶، ۱۲۷ -
۲- ایضاً، ص ۱۲۷ و تاریخ جہانکشای، ج ۳، ص ۱۰۶ تا ۱۰۸ -
۳- ایضاً، ص ۱۲۸ -
٤- ایضاً، ص ۱۲۹ و ایضاً، ج ۳، ص ۱۰۹، ۱۱۰ و حاشیہ طبقات ناصری، ص ۱۲۰۷ -
۵- ایضاً، ص ۱۳۱، ایضاً ج ۳، ص ۱۱۱، ۱۳۳ ؛ ایضاً ص ۱۲۰۸، ۱۲۰۹ -
٦- ایضاً،

سے مرتب کی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شرر نے قلعہ الموت کی فتح کا جو ڈرامائی انداز پیش کیا ہے وہ صحیح نہیں، قلعہ الموت ۲۷ رمضان کو نہیں فتح ہوا اور اس کی فتح سے بہت پہلے رکن الدین خور شاہ ہلاکو خاں کے لشکر گاہ میں پہنچ چکا تھا اور نظربند تھا۔ خور شاہ نہ تو الموت کی شکست کے وقت اس قلعے میں موجود تھا اور نہ ہی ہلاکو خاں اس قلعے کی فتح کے وقت موجود تھا۔ بقول عطا ملک جوینی ہلاکو خاں کو الموت کی فتح کی خبر لمسر میں پہنچائی گئی تھی جہاں وہ قلعہ لمسر کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ہلاکو خاں کے لشکر نے قلعے میں داخل ہونے کے لیے کوئی خفیہ راستہ نہیں استعمال کیا اور نہ ہی قلعہ آناً فاناً فتح ہوا۔

شرر کے بیان میں قلعے کی شکست و ریخت ایک فقرے میں اس طرح پیش ہوئی ہے جس سے قلعے کی ناپائیداری کا تاثر ابھرتا ہے، لیکن درحقیقت اس کی شکست و ریخت اتنی آسان نہیں تھی، خود ہلاکو خاں اس کے استحکام کو تشویش کی نظر سے دیکھتا تھا۔ لی سٹرینج نے قزوینی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس قلعے کے گرد نہایت عمیق و عریض غار تھے اور ان غاروں نے اس قلعے کو گرد و نواح کے پہاڑوں سے قطعاً بے تعلق کرکے ناقابل تسخیر بنا دیا تھا۔ نہ تیر اندازوں کے تیر اس تک پہنچ سکتے تھے اور نہ ہی وہ منجنیقوں سے پھینکے ہوئے پتھروں کی زد میں تھا۔[1]

پیٹرولی نے قلعہ الموت کے ناقابل تسخیر ہونے کے بارے میں اس کا محل وقوع بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

The castle of Alamut stands on top of a bluff about 600 feet high. Juvayni likened its appearence to a kneeling camel with its neck stretched out, and many other picturesque phrases have been used to describe it. Probably Freya Stark's a ship, broadside on—is the neatest and best. Peaks of Howdeqan range tower behind it to a height of some 15,000 ft. Now the other top there are two bright patches of green. Even from the foot of rock it is possible to appreciate its ideal strategic position (p 214) On the southern side the rock runs steadily down to the foot of the valley, a drop of approximately 800 ft, on the eastern side the rock runs fairly steeply down to a ravine, which drops another 50 ft or so. There is no cover from which to launch direct assault on the castle, and one gets on impression of overwhelming and tremendous strength[2]

پیٹرولی کے یہ بیانات نو ۱۹۶۰ء میں الموت کا محل وقوع دیکھنے پر مبنی ہیں لیکن جن لوگوں نے اس مستحکم قلعے کو اس وقت دیکھا جب کہ وہ باطنیہ کے قبضے میں تھا وہ بھی اس کی مضبوطی کے بارے میں حیران ہیں۔ عطا ملک جوینی جو قلعہ الموت کی فتح کے بعد انہدام سے پہلے اس میں داخل ہوئے، اس کی مضبوطی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''راستی آں است کہ آں قلعہ بود کہ مداخل و مخارج و مراقی و معارج آنرا بتیشید جدراں مجصص و بنیان مرصص چناں استحکامی دادہ بودند کہ آہن وقت تخریب آں گوئی سر بر سنگ می زد و بدست ہیچ نداشت اما دندان بر نمی کند و در احجار آں احجار چند ساباط با طول و عرض و ارتفاع۔''[3]

۱- لی سٹرینج: Lands of the Eastern Caliphate، ص ۲۲۱۔

۲- پیٹرولی: ص ۲۱۸۔ ۳- تاریخ جہانگشای، ج ۳، ص ۲۷۲۔

خور شاہ کی جاں بخشی اور اسے بحر خزر کے پار بھیج دینے کے سلسلے میں سب مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ ہلاکو خاں نے اسے اس کی خواہش کے مطابق منقو خاں کی خدمت میں حاضری کے لیے بھیج دیا تھا ، لیکن راستے میں ہی منقو خاں کی طرف سے اس کے قتل کا حکم موصول ہوا جس کے مطابق بقول عطا ملک جوینی :

''و او را و متعلقان او را در زیر لگد خرد کردہ بر شمشیر گزرانیدند و از نسل او اثری نماند'' ۔[۱]

تاتاری لڑکی سے شادی والی بات درست ہے لیکن شرر کے بیان اور حقیقت میں یہ فرق ہے کہ یہ شادی خور شاہ کی خواہش پر ہلاکو خاں کے فرمان کے مطابق رودبار الموت کے علاقے میں ہوئی اور اس کے بعد اسے منقو خاں کے سامنے حاضر ہونے کے لیے روانہ کیا گیا تھا[۲]۔

تاتاریوں کے دربار سے وابستہ بعض مورخین کی تحریروں سے یہ مشہور ہوگیا ہے کہ ہلاکو خاں نے مسلمانوں اور خلیفہ بغداد کی درخواست پر باطنیوں پر حملہ کیا تھا ۔ میجر ریورٹی اس بیان سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''لیکن ملاحدہ کے خلاف شکایت کرنے والے لوگوں میں سوائے ایک قاضی شمس الدین کے اور کوئی نہ تھا''[۳]۔ یہ قاضی شمس الدین قراقرم میں منقو خاں کے پاس قیام پذیر تھے اور باطنی فدائیوں کے خوف سے ہمیشہ مسلح اور زرہ پوش رہتے تھے ۔ منقو خاں کو ان کا یہ رویہ عجیب معلوم ہوا اور جب از راہ تفنن اس نے وجہ پوچھی تو قاضی صاحب نے منقو خاں کو بھی ویسا ہی زرہ دار لباس پہننے کا مشورہ دیتے ہوئے باطنیوں کے مظالم بیان کیے تھے ۔ میجر ریورٹی کا نقطہ نظر صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ جملہ معاصر تواریخ قراقرم سے ہلاکو خاں کی روانگی کی تفصیلات لکھتے ہوئے ان ہدایات کا ذکر کرتی ہیں جو منقو خاں نے الوداعی ملاقات میں ہلاکو خاں کو دی تھیں اور ان ہدایات و نصائح میں بغداد پر حملہ کرکے اسے تباہ کر دینے کی ہدایت بھی تھی ۔ یہ شہادتیں اتنی کثرت سے اور اتنے مختلف مکتبہ ہائے فکر کے اشخاص کے قلم سے ہیں کہ ان کا درج کرنا یا ان سے بحث کرنا سعی حاصل معلوم ہوتی ہے ۔

سرر نے ناول میں منقو خاں کی زبانی لکھا ہے :

''ہلاکو خاں دیلم کی تخت گاہ پر قبضہ کر چکا ہے فی الحال اس کا تعاقب کر رہا ہے ۔ اس فوج کشی کے بعد وہ ارض عراق کا عزم کرے گا اور ارادہ ہے کہ خلیفہ بغداد کو بھی اس کی سرتابیوں اور غرور کی سزا دی جائے ۔''[۴]

بہر کیف یہ بات کہ خلیفہ بغداد کی کسی درخواست پر تاتاری لشکر باطنیین پر حملہ آور ہوا تھا مناسب نہیں معلوم ہوتی کیونکہ خلیفہ بغداد کے ساتھ تاتاریوں کے خلیفانہ مراسم کی بجائے حریفانہ تعلقات تھے ۔

فردوس بریں کے کرداروں میں زمرد ، حسین ، شیخ شریف علی وجودی ، طور معنی ، کاظم جنوبی ، رکن الدین خور شاہ ، امام نجم الدین نیشاپوری ، دیدار (فدائی) ، بلغان خاتون ، منقو خاں ، ہلاکو خاں ، مرجان (حور) اور تولی خاں وغیرہ شامل ہیں ۔ ان کے علاوہ دیگر

۱- ایضاً ، ص ۲۷۷ ، ۲۷۸ -
۲- ایضاً ، ص ۳۷۴ -
۳- طبقات ناصری ، انگریزی ترجمہ ، حاشیہ ص ۱۱۹۳ -
٤- فردوس بریں ، ص ۲۰۱ -

جن اشخاص کا ذکر آیا ہے ان میں ملاحسنہ اللہ نقیب آمل ، امام نصر بن احمد ، نصیر الدین طوسی ، حسن صباح اور چغتائی خاں شامل ہیں ۔ ان میں سے زمرد ، حسین اور مرجان کے کردار تو صاف ظاہر ہے مولانا شرر کے تخلیقی کردار ہیں دیگر کرداروں کا جائزہ لینا ہوگا کہ ان میں سے کون سے تاریخی یا تخلیقی کردار ہیں ۔

شیخ شریف علی وجودی ، طور معنی اور کاظم جنونی کے کردار شرر کے تخلیقی کردار ہیں لیکن علی وجودی اور طور معنی کے بارے میں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کرداروں کا تصور مارکو پولو سے لیا ہے ۔ مارکو پولو نے اپنے سیاحت نامے میں جہاں شیخ الجبال اور اس کی جنت کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا کہ وہ کس طرح لوگوں کو جنت کی سیر کراتا تھا وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ اس فرمانروائے الموت کے دو نائب اور بھی ایسے تھے جنھیں فرمانروا جیسے ہی اختیارات حاصل تھے ، وہ بھی اپنے علاقے کے لوگوں کو متاثر کرکے اسی طرح جنت میں بھیجتے تھے ۔ ان میں سے ایک دمشق اور دوسرا کردستان کے علاقے میں متعین تھا[1] ۔ قیاس یہی ہے کہ مارکو پولو کے اس بیان سے ہی مولانا شرر نے شیخ علی وجودی اور طور معنی کے کرداروں کا بنیادی تصور لیا ہے ۔

رکن الدین خور شاہ ، منقو خاں ، حسن صباح اور ہلاکو خاں کا ذکر قبل ازیں آ چکا ہے اور یہ اس قدر مشہور تاریخی شخصیتیں ہیں کہ ان پر مزید تبصرے کی ضرورت نہیں ۔ امام نصر بن احمد اور امام نجم الدین نیشاپوری کے واقعات جس طرح شرر نے بیان کیے ہیں کسی تواریخ ان کی تصدیق نہیں کرتیں ، تاریخ گزیدہ اور ارمغان المقصود میں اس علاقے کے حکماء ، علماء ، فضلاء کے حالات بھی ملتے ہیں لیکن ان سے اور الاعلام سے شرر کے بیانات کی تصدیق نہیں ملتی ، امام نجم الدین کبریٰ تاریخی شخصیت ہیں لیکن ان کے حالات شرر کے ناول کے امام نجم الدین نیشاپوری کے حالات اور زمانے مختلف ہیں ۔ ابن اسفندیار کے یہاں امام شہید کے عنوان سے • رفقہ باطنیہ کے ہاتھوں شہید ہونے والے امام کا نام فخر الاسلام عبدالواحد بن اسمٰعیل ابوالمحاسن ہے اور ان کا زمانہ بھی ۵۰۶۵ھ سے پہلے کا ہے[2] ۔

بلغان خاتون کے بارے میں بعض نقادوں کا خیال ہے کہ یہ شرر کا فرضی اور خیالی کردار ہے[3] ۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ۔ شرر کا یہ کردار تاریخی ہے اور حقیقی نہ بھی ہو تو بھی اس بات کا بڑا جواز موجود ہے کہ انھوں نے یہ تاریخ سے لیا ہے ۔ جامع التواریخ[4] اور تاریخ جہانکشای[5] میں بلغان نام ملتا ہے جس کے باپ کا نام چغتائی ہے ۔ میجر راورٹی نے طبقات ناصری کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے اس کے متعلقہ حاشیے میں بلغان خاتون کا ذکر کیا ہے اور اسے چغتائی خان کی بیٹی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نام کی اور خواتین بھی تاتاریوں میں گزری ہیں[6] ۔ تاریخ میں اس نام کے بارے میں دو مختلف نظریات پائے جاتے ہیں ۔ ایک نظریہ تو

۱- سفر نامہ مارکوپولو ، مرتبہ ہنری یول ، ج ۱ ، ص ۱۴۹ -
۲- ابن اسفندیار : تاریخ طبرستان ، ترجمہ براؤن ، ج ۲ ، ص ۷۵ ، ۷۶ -
۳- فردوس بریں ، مجلس ترقی ادب ، طبع دوم، ص ۳۴۴ .
٤- جامع التواریخ (سیاق) ، ص ۱۳۹ -
۵- تاریخ جہانکشای ، ج ۳ ، ص ۲۷۸ -
۶- طبقات ناصری (انگریزی ترجمہ) ، حاشیہ ص ۱۱۴۸ -

میجر ریورٹی والا مندرجہ بالا نظریہ ہے اور دوسرا محمد بن عبدالوہاب قزوینی کا نظریہ جس میں وہ اسے تاتاری امراء میں سے ایک قرار دیتے ہوئے اس کا پورا نام قرابولغان لکھتے ہیں[1] ۔

چغتائی خاں ، چنگیز خاں کا بیٹا تھا ، چنگیز خاں کے بعد اس کا بیٹا اوکتائی (اوغتائی) تخت نشین ہوا جو چغتائی سے چھوٹا تھا لیکن چنگز خاں نے اسی کے لیے وصیت کی تھی ۔ اوکتائی قاآن ۶۳۹ھ میں مرا اور اس کے انتقال کے بعد جلد ہی ۶۴۰ھ میں چغتائی بھی چل بسا ۔

شرر نے ایک جگہ منقو خاں کو چغتائی کا بہادر بیٹا قرار دیا ہے[2] اور بلغان خانون کو چغتائی کی بیٹی ۔ اس طرح وہ دونوں سگے بہن بھائی ہوئے لیکن دوسری جگہ انھوں نے منقو خاں کو بلغان خاتون کا ابن عم قرار دیا ہے[3] ۔ دراصل منقو خاں ، چغتائی خاں کا بیٹا نہیں تھا بلکہ بھتیجا تھا وہ تولئی خاں کا بیٹا اور ہلاکو خاں کا بڑا بھائی تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ شرر ان کے حسب نسب سے تو بخوبی واقف تھے لیکن پہلی بار ان سے سہواً یہ تحریر ہو گیا کہ منقو خاں ، چغتائی خاں کا بہادر بیٹا تھا ۔

چغتائی خاں کے قتل کے بارے میں مصنف طبقات ناصری نے لکھا ہے کہ : "شکار گاہ میں اپنے ہی تیر باز گشتہ کے پیٹھ پر لگنے سے ہلاک ہوا"۔[4] تاریخ جہانکشای اور جامع التواریخ اس بارے میں خاموش ہیں لیکن طبقات ناصری کے مترجم (بزبان انگریزی) میجر ریورٹی متعلقہ حاشیے میں مصنف سے اختلاف ظاہر کرتے ہوئے اس تیر بازگشتہ کی ترکیب کو ایہام و ابہام کی حامل قرار دیتے ہیں اور الفی کے بیانات کو مستند قرار دیتے ہوئے پورے وثوق سے کہتے ہیں[5] کہ چغتائی خاں کا قتل فدائیوں کے ہاتھوں ہوا ۔ فرقہ باطنیہ کے استیصال کے سلسلے میں جامع التواریخ اور تاریخ جہانکشای کا یہ فقرہ کہ "از ایشاں دوسہ کس رابدست بلغان دادند تا بقصاص خون پدر خویش چغتائی کہ اورا فدائیان کارد زدہ بودند بکشت[6] ۔" میجر ریورٹی کے لیے مذکورہ بالا رائے قائم کرنے میں تقویت کا باعث بنا ہے ۔ اگرچہ اس بلغان اور چغتائی کے بارے میں محمد بن عبدالوہاب قزوینی کے بیان نے شک کی بڑی گنجائش پیدا کر دی ہے کہ یہ چغتائی ، چنگیز خاں کا نامور بیٹا نہیں تھا بلکہ ایک اور فرد ہے ۔ قزوینی نے اپنی بات کی دلیل میں جامع التواریخ کے اس اقتباس کا حوالہ دیا ہے کہ :

"امیر دیگر (از امراء ہزارہ کہ باجور ماغون بہ ایران آمدہ بودند) چغتائی بزرگ قورچی بود از قوم ارلات از خویشان بورغوجین نویان او را ملحدان کارد زدند و پسران او طولودای یار غوجی و بای تیمور و قراولغان و سرتاقتای و قرابولغان مذکور امیر ہزارہ بود ۔" اور لکھا ہے کہ "واضح است کہ این چغتائی پدر بلغان کہ فدائیان اورا کارد زدند بکلی غیر چغتائی معروف پسر چنگیز خان است ۔"[7]

اس بحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرر کو بلغان ، چغتائی اور اس کا فدائیوں کے ہاتھوں

۱۔ تاریخ جہانکشای، حاشیہ ، ج ۳ ، ص ۳۷۸ ۔
۲۔ فردوس بریں ، ص ۱۸۲ ۔
۳۔ ایضاً، ص ۱۹۶ ۔
۴۔ طبقات ناصری ، ص ۱۱۴۸ ۔
۵۔ ایضاً ،
۶۔ جامع التواریخ (سیاق) ص ۱۳۹ و تاریخ جہانکشای ، ج ۳ ص ۲۷۶ ۔
۷۔ تاریخ جہانکشای ، حاشیہ از قزوینی ، ج ۳ ، ص ۲۷۶ ۔

قتل ، فرقۂ باطنیہ کے استیصال کے وقت ملعون کے ایران میں موجود ہونے کے تاریخی واقعات کے بارے میں التباس ہوا جس سے انھوں نے ناول کا پلاٹ مرتب کیا ۔ دیدار کا کردار اگرچہ تخلیقی ہے لیکن مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں اس کی تخلیق کے لیے تاریخی پس منظر موجود ہے ۔ ناول میں رکن الدین خورشاہ کے اس سوال پر کہ دیدار کب آئے؟ دیدار بتاتا ہے کہ وہ آج ہی آیا ہے ، اس کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ جس روز وہ یہ روداد خورشاہ کے سامنے سنا رہا ہے اس سے ٹھیک دس ماہ نو دن پیشتر اس نے چغتائی خاں کو قتل کیا ۔ تاریخی اعتبار سے خورشاہ کا زمانۂ اقتدار کل ایک برس (شوال ۶۵۳ھ تا شوال ۶۵۴ھ) تھا ۔ اس لیے اگر شرر کا بیان کردہ واقعہ صحیح ہو تو چغتائی خاں کا قتل اسی زمانے میں ہونا چاہیے لیکن پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ چغتائی خان ۶۴۰ھ میں مرا ۔ یہ چودہ برس کا خلا اور اتنے برس ملغان خاتون کا اداس رہنا ، ناول کے پلاٹ کا تاریخی حقائق سے تصادم پیدا کر رہا ہے ۔ اس لیے گمان غالب یہی ہے کہ شرر کو ان تاریخوں اور اس واقعہ کے بارے میں اشتباہ ہوا ہے جسے انھوں نے تاتاریوں کے شاہی خاندان سے منسوب کر دیا ۔

تولی خاں کے بارے میں شرر نے لکھا ہے کہ منقو خاں کا بیٹا تھا اور قراقرم سے ہلاکو خاں کی مدد کے لیے چالیس ہزار کا لشکر لے کر روانہ ہوا[2] ۔ یہ تولی خاں ناول کے آخری باب میں بھی قلعہ الموت پر تاتار کی جانب سے حملہ آور ہوتا دکھائی دیتا ہے ۔ تاریخی طور پر منقو خاں کے اس نام کے کسی بیٹے کا وجود نہیں ملتا ، اس کے بیٹے اورنکتاش اور تالیو قراقرم میں ہی قیام پذیر تھے ، تاریخ سے ہلاکو خاں کو بعد میں بھیجی جانے والی کسی کمک کی تصدیق بھی نہیں ہوتی ۔ بعض نقادوں نے تولی خاں کے ذکر کو شرر کی غلطی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے ۔ "تولی خاں ، چنگیز خاں کا چھوٹا بیٹا اور منقو خاں کا باپ ہے ، شرر کو تسامح ہوا ہے[3]" ۔ لیکن یہ سمجھ لینا کہ شرر کو منقو خاں کے باپ کا نام نہیں آتا تھا اور انھوں نے باپ کو بیٹے کا بیٹا بنا دیا ، مناسب نہیں معلوم ہوتا ۔ دراصل تواریخ سے اس تولی خاں کا وجود ثابت ہے جو ہلاکو خاں کے ساتھ تھا اور قلعہ الموت اور فدائیوں کے دیگر قلعوں پر تاخت کے وقت ایک حصہ فوج کی کمان اس کے سپرد تھی ۔ شرر سے سہو اتنا ہی ہوا ہے کہ انھوں نے اسے منقو خاں کا بھتیجا لکھنے کی بجائے بیٹا لکھ دیا ہے ۔ یہ تولی خاں رشتے میں منقو خاں کا بھتیجا اور چنگیز خاں کے بڑے بیٹے توشی (جوجی) کا پوتا تھا ۔ اس کا نسب تولی بن اوردہ (ہردو) بن توشی بن چنگیز خاں ہے[4] اور بقول عطا ملک جوینی یہ بھی ہلاکو خاں کے ہمراہ ایران آنے والے شاہزادگان میں شامل تھا[5] ۔ بعض مورخین نے اس کا نام بولی اور بعض نے قولی لکھا ہے ۔ محمد بن عبدالوہاب قزوینی ، تاریخ جہانگشای کے حواشی میں لکھتے ہیں :

"تولی پسر دوم اوردہ (ہردو) بن توشی بن چنگیز خان است ، در وقت حرکت ہولاکو بایران کہ بناشد از الوس ہر یک از شاہزادگان شاہزادۂ بالشکری بمدد او رود این تولی از طرف الوس اوردہ معین شد و بایران

١۔ فردوس بریں ، ص ۱۸۳ ۔ ٢۔ ایضاً ، ص ۲۰۱ ۔
٣۔ فردوس بریں ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ، طبع دوم ، ص ۲۴۴ ۔
٤۔ جامع التواریخ ، مرتبہ ایدگار بلوشہ ، ص ۹۹ ، ۱۳۷ تا ۱۳۹ ۔
٥۔ تاریخ جہانگشای ، ج ۳ ، ص ۹۱ ۔

آمد و در حدود سنہ ۶۵۷ھ وفات یافت ۔"[۱]

شرر نے فردوس بریں کے مختلف ابواب میں شیخ علی وجودی ، زمرد ، خورشاہ اور دیگر کرداروں کے ذریعے فرقہ باطنیہ کے عقاید کی تفصیلات دی ہیں جن کی صحت قابل قدر ہے۔ انھوں نے فرقہ باطنیہ کی اصل ، ان کی تاریخ اور ان کے عقاید کا گہرا مطالعہ کیا اور ان عقاید کو ناول میں بغیر کسی رنگ آمیزی کے پیش کیا ۔ کتب تواریخ و مذہب سے ان کے تمام بیانات کی تصدیق ہوتی ہے ۔

فردوس بریں کے واقعات کا زمانی پھیلاؤ قابل توجہ ہے ۔ شرر نے واقعات کا زمانہ اس قدر پھیلا دیا ہے کہ ناول کے آغاز سے لے کر انجام تک جتنا وقت ناول کے واقعات لیتے ہیں اس سے پہلے ہی تاریخی اعتبار سے فرقہ باطنیہ کی جمت اور قلعے ختم ہو چکے تھے ۔

فردوس بریں کے واقعات کا آغاز ۶۵۱ھ کے موسم سرما کی ابتدا سے ہوتا ہے ۔ علم تقویم اور تاریخ کی رو سے ۶۵۱ھ کا سرما ماہ شعبان سے شروع ہوا لیکن ناول کے آغاز میں ہیرو اور ہیروئن حج کے لیے سفر کرتے دکھائے گئے ہیں اس لیے اگر آمل سے مکہ معظمہ تک کی مسافت کو بھی مدنظر رکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ناول کا آغاز رجب ۶۵۱ھ سے ہوتا ہے ۔ شرر نے ناول کے دوران جو مختلف وقفے زمانی طور پر خود بیان کیے ہیں ، انھیں درج ذیل کیا جا رہا ہے تاکہ زمانی پھیلاؤ کا تجزیہ کیا جا سکے ۔

(۱) ناول کا آغاز -- زمرد حسین کا سفر	رجب ۶۵۱ھ
(۲) زمرد کے غائب ہو جانے سے اس کا پہلا خط ملنے تک	چھ ماہ
(۳) پہلے خط کے بعد دوسرے خط تک وقفہ	ایک ماہ
(۴) وادیٔ البرز میں دوسرا خط ملنے کے بعد سفر اور تبریز پہنچنے تک	دو ماہ
(۵) تبریز سے کوہ جودی تک سفر کا وقت	دس دن
(۶) غار کی تلاش میں [کئی دن] جو وقت صرف ہوا	دس دن
(۷) کوہ جودی کے غار میں چلہ کشی	چالیس دن
(۸) کوہ جودی کے غار سے شہر خلیل تک سفر	تین ماہ
(۹) شہر خلیل ، تہہ خانے میں اترنے سے پہلے مجاوروں کے پاس	بیس دن
(۱۰) تہہ خانے میں چلہ کشی	چالیس دن
(۱۱) تہہ خانے سے نکل کر حلب تک سفر	آٹھ دن
(۱۲) شیخ علی وجودی کی خدمت میں	گیارہ ماہ
(۱۳) امام نجم الدین کے قتل کے لیے حلب سے نیشاپور کا سفر	چار ماہ
(۱۴) امام نجم الدین کے پاس قیام	تین ماہ
(۱۵) امام کے قتل کے بعد حلب تک واپسی کا سفر	چار ماہ
(۱۶) شیخ علی وجودی کا خط لے کر اصفہان تک سفر	تین ماہ
(۱۷) اصفہان سے الموت تک بے ہوشی کی حالت میں سفر	دس دن
(۱۸) رکن الدین خور شاہ سے ملاقات کے بعد وظیفہ	تین دن

۱۔ جامع *التواریخ* ، حاشیہ از قزوینی ، ج ۳ ، ص ۹۱ ۔

(۱۹) جنت میں قیام [کم از کم]	سات دن
(۲۰) بے ہوشی کی حالت میں اصفہان تک واپسی	دس دن
(۲۱) اصفہان سے حلب تک واپسی	تین ماہ
(۲۲) حلب سے دمشق تک سفر	آٹھ دن
(۲۳) امام نصر بن احمد کے پاس قیام	ایک ماہ
(۲۴) امام کے قتل کے بعد حلب تک واپسی کا سفر	آٹھ دن
(۲۵) حلب سے بغداد، اصفہان اور الموت تک سفر	تین ماہ دس دن
(۲۶) الموت سے قزوین اور وہاں سے زمرد کی مہر تک سفر	دس دن
(۲۷) زمرد کی مہر پر قیام	ایک ماہ
(۲۸) خط ملنے پر قراقرم تک سفر	تین ماہ دس دن
(۲۹) قراقرم میں شہزادی کو خط پیش کرنے کے انتظار میں	چھ ماہ
(۳۰) فوج کے ہمراہ قراقرم سے البرز تک سفر	چار ماہ

ناول کے مختلف حصوں میں بیان کردہ اس زمانی پھیلاؤ کے پس منظر، شرر کا یہ بیان کہ جب حسین امام نجم الدین نیشاپوری کے قتل کے بعد شیخ علی وجودی کا خط لے کر اصفہان پہنچا اور کاظم جوینی اسے ایک غار پر لے گیا جس کے اندر سے طور معنی کی آواز آئی: "مرحبا! جوان آملی مرحبا! جنت کی ایک حور دو سال سے تیرے فراق میں بے تاب ہے۔" یہ فقرہ زمانی طوالت کے اعتبار سے غلط ہے۔ یہ موقع شق نمبر ۱۶ کے بعد کا ہے اور اس وقت تک، جیسا کہ شرر کے بیان کردہ زمانی وقفوں کے مطابق سطور بالا میں جدول بنائی گئی ہے، زمرد اور حسین کے فراق کو ساڑھے تین سال گزر چکے تھے۔

حسین جب پہلی بار بے ہوشی کی حالت میں فردوس بریں میں پہنچا اور زمرد سے اس کی ملاقات ہوئی، اگر شرر کے بیان کردہ زمانی وقفوں کو مدنظر رکھا جائے تو (بمطابق شق نمبر ۱۹) ۱۰ محرم ۶۵۵ھ کا واقعہ ہونا چاہیے جب کہ تاریخی اعتبار سے ذیقعدہ ۶۵۴ھ میں فرقہ باطنیہ کی جنت کا صفحہ ہستی سے نشان تک مٹ چکا تھا۔ اس طرح حسین کی پہلی بار جنت کی سیر بھی بعد از وقت ہے کیونکہ اس وقت تک فردوس بریں کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی تھی۔

امام نصر بن احمد کے قتل کے بعد حسین کا حور ساہ کے پاس پہنچنا (بمطابق شق نمبر ۲۵) ناول کے پھیلاؤ کے اعتبار سے شوال ۶۵۵ھ کا واقعہ ہو سکتا ہے اور تاریخ کی رو سے رکن الدین حور ساہ کو اس وقت دنیا سے رخصت ہوئے بھی چند ماہ گزر چکے تھے۔ حسین جب زمرد کا خط لے کر قراقرم پہنچا (بمطابق شق نمبر ۲۹) اس وقت تک ناول کا زمانی پھیلاؤ کم از کم پانچ برس دو ماہ ہے، اور اسے رمضان ۶۵۶ھ کا زمانہ کہا جا سکتا ہے لیکن تاریخی طور پر یہ وہ زمانہ تھا جب ہلاکو خاں بغداد کو بھی تباہ و برباد کر چکا تھا۔ اس موقع پر شرر منقو خاں کی زبانی بتاتے ہیں "آج ۲۰ جمادی الاول ہے۔" جمادی الاول کی یہ ۲۰ تاریخ ناول کے مذکورہ زمانی پھیلاؤ کے اعتبار سے ۶۵۶ھ کے بجائے ۶۵۷ھ کی ہی ہو سکتی ہے اور اس طرح ناول کے پلاٹ کا ڈھانچہ زمانی پھیلاؤ کی زیادتی کی بدولت تاریخی نقطہ نظر سے درہم

برہم ہو جاتا ہے ۔ اس وقت منقو خان کا قراقرم میں موجود ہوتا تو کجا دنیا میں موجود ہوتا بھی صحیح نہیں کیونکہ ہلاکو خان کو ایران کی طرف روانہ کرنے کے بعد وہ خود چین کی طرف بڑھ گیا تھا اور پھر دوبارہ قراقرم کی طرف نہیں لوٹ سکا ۔ ۶۵۶ھ میں منقو خان کا چین کے علاقے میں ہی انتقال ہوگیا تھا ۔

فردوس بریں کے پلاٹ کا یہ پہلو بھی درست نہیں کہ الموت پر (کسی بھی سال) ۲۷ رمضان المبارک کو حملہ کیا گیا تھا ۔ تاریخی حقائق کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ۔ خور شاہ نے ۲۹ شوال کو اپنے آپ کو ہلاکو خان کے سپرد کیا اور اس کے چند دن بعد الموت کا محاصرہ ہوا جو ذیقعدہ ۶۵۴ھ میں تاتاریوں کے قبضے میں آیا ۔

ایک امر یہ بھی قابل ذکر ہے کہ زمرد (آٹھویں باب میں) حسین سے جب اپنی روداد الم بیان کرتی ہے تو بتاتی ہے کہ جب وہ وہاں لائی گئی تھی تو رکن الدین خور شاہ کے سامنے پیش کی گئی ، گویا ۶۵۱ھ میں خور شاہ فرمانروائے الموت تھا ۔ ساڑھے تین برس بعد جب حسین فردوس بریں میں پہنچا تو بھی رکن الدین خور شاہ ہی فرمانروا تھا اور اس کے آٹھ ماہ بعد جب دوبارہ سفارسی خط کے ساتھ گیا تو بھی خور شاہ ہی بادشاہ تھا اور پھر اس کے ڈیڑھ برس بعد جب تاتاری لشکر الموت پر حملہ آور ہوا تو بھی خور شاہ ہی تاجدار تھا ۔ اس اعتبار سے تاریخی واقعات بر گرفت ڈھیلی نظر آتی ہے اور پلاٹ میں بنیادی تاریخی نقص پیدا ہوگیا ہے کیونکہ رکن الدین خور شاہ بمشکل ایک برس الموت کا فرمانروا رہا ۔ وہ شوال ۶۵۳ھ میں اپنے باپ علاء الدین کی موت پر سربراہ بنا اور شوال ۶۵۴ھ میں ہلاکو خان کے ہاتھوں اس کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا ۔

یہ تھا فردوس بریں کے تاریخی واقعات کا تجزیہ ، یوں بعض ایسے اور امور بھی ہیں جن پر تاریخی نقطہ نظر سے گرفت کی جا سکتی ہے مثلاً دوسرے باب کا عنوان "بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید" ہے ۔ عنوان کی حد تک اس مصرعے کا استعمال جائز ہے لیکن اسی باب میں زمرد نے یہ مصرعہ اپنے خط میں استعمال کیا ہے ، ظاہر ہے شرر یہ خط حافظ کی پیدائش سے بھی نصف صدی پیشتر کے دور میں لکھوا رہے ہیں اس میں حافظ کے مصرعے کی موجودگی فنی سقم ہے ، لیکن ہم نے اس تجزیے میں ایسے امور کو نظر انداز کر دیا ہے ۔

۵۔ فلورا فلورنڈا

فلورا فلورنڈا شرر کا پانچواں تاریخی ناول ہے جو انھوں نے "زیاد و حلاوہ" کے نام سے ۱۸۹۳ء میں دلگداز میں قسط وار لکھنا سروع کیا تھا ، لیکن ابھی یہ ناول ادھورا ہی تھا کہ انھیں دلگداز بند کرکے حیدرآباد جانا پڑا جہاں سے وہ سر وقار الامراء کے بیٹے کے اتالیق کی حیثیت سے انگلستان چلے گئے ۔ آن کی عدم موجودگی میں آن کے احباب نے اس ناول کو مکمل کرکے شائع کر دیا ۔ یورپ کے سفر سے واپس آ کر شرر نے خود بھی اس ناول کے بقیہ حصے کو مکمل کیا اور ۱۸۹۹ء میں اسے "فلورا فلورنڈا" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا ۔ یہ ناول سرزمین ہسپانیہ میں اسلامی عروج کے دور میں اسلام کے خلاف سازشوں اور پادریوں اور راہبات کی بدکاریوں سے متعلق ہے ۔

فلورا فلورنڈا میں بیان کردہ تاریخی واقعات مختصراً یہ ہیں کہ : اندلس میں امیر عبدالرحمن

ثانی کے عہد میں اسلامی حکومت عروج پر تھی۔ رفاہی اور تعلیمی ادارے کثیر تعداد میں قائم تھے، ملک بھر میں علم و فضل کا چرچا تھا، امیر انتہائی رحم دل تھا اور امن و امان کی فضا تھی۔ اس عہد میں ۲۳۰ ہجری کے لگ بھگ ہسپانیہ کے آرک بشپ یولاجیس نے طلیطلہ کے پہاڑوں میں ایک رات چند راہبات اور راہبوں کو جمع کرکے مسلمانوں کے خلاف جدوجہد کے لیے آمادہ کیا، اس نے قرطبہ کی فلورا نامی ایک لڑکی کی مظلومیت کی داستان سنائی جس کا باپ مسلمان اور ماں عیسائی تھی، فلورا عیسائی تھی لیکن اس کا بھائی اسے اسلام قبول کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ یولاجیس نے راہبوں کو مسیح کے لیے جانی قربانیاں دینے کی ترغیب دلاتے ہوئے یہ طریقہ تجویز کیا کہ مسلمان قاضیوں کے روبرو جا کر پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی کریں، پھر ان سب سے رازداری کا حلف لے کر وہ قرطبہ لوٹ گیا۔

قرطبہ میں قاضی محمد بن زیاد بن عبدالرحمن لخمی نیک نفس عالم و فاضل قاضی تھے، ان کے احباب میں عبداللہ بن شامر اور یحییٰ بن حکم الغزالی شعرا، یحییٰ بن یحییٰ لیثی اور عبدالرؤف بن عبدالسلام والیٔ طلیطلہ شامل تھے۔ ان کی محفل میں ایک دن ایک نوجوان زیاد بن مسلمہ الہمدانی نے شکایت کی کہ عیسائی اس کی بہن کو ورغلاتے ہیں، ان کی والدہ عیسائی تھی اور والد مسلمان۔ والد نے لڑکی کا نام زہرا رکھا لیکن ماں فلورا کے نام سے پکارا کرتی تھی اور چھپ چھپ کر عیسائیت کی تعلیم دیتی تھی۔ ماں باپ کے مر جانے کے بعد مختلف راہبات اور بالخصوص یولاجیس کی دو شاگردیں بھی فلورا کو ورغلانے کا کام کرتی رہیں اور جب زیاد نے ان کی آمد پر پابندی لگا دی تو وہ پردہ دار مسلمان عورتوں کے روپ میں آنے لگیں، لیکن جب زیاد نے ہر عورت کے اپنے گھر میں آنا ممنوع قرار دے دیا ہے تو یولاجیس فلورا کو گھر سے نکلوا لینے کی سازشوں میں مصروف ہے۔ شاید فلورا خود ہی علی الاعلان عیسائی ہو جاتی لیکن وہ اس بات سے خائف تھی کہ مرتد کی سزا قتل تھی۔ زیاد نے قاضی کے کہنے پر دوسرے دن یہ مقدمہ باقاعدہ طور پر ان کی عدالت میں پیش کیا۔

اس دوران میں قرطبہ کے بڑے کتھیڈرل میں یولاجیس نے ایک رات خفیہ طور پر معتمد پادریوں، راہبوں اور راہبات کو جمع کرکے شہادت کی تحریک چلانے کی تجویز اور فلورا کو گھر سے نکال لانے کا مسئلہ پیش کیا۔ یولاجیس کی سمجھائی ہوئی سکیم کے مطابق ایک نوجوان خوبصورت راہبہ فلورنڈا نے خود کو اس مہم کے لیے یہ کہہ کر پیش کیا کہ وہ قرآن مجید اور تفاسیر پڑھ سکتی ہے اس لیے مسلمان عورت کے روپ میں زیاد کے پڑوس میں قیام کرکے اسے اپنا گرویدہ بنا کر فلورا کو بہ آسانی نکال لائے گی۔ ایک اور راہبہ بطور خادمہ نامہ و پیام کے لیے اس کے ساتھ رہے۔ یولاجیس نے شہادت کی تحریک فلورا کی آمد تک ملتوی رکھنے کا فیصلہ کیا اور کہا وہ اس دوران یہ انتظام کرے گا کہ فلورا کو گھر سے نکلتے ہی فرانس بھیج دیا جائے۔

فلورا کے بھائی زیاد کو بھی کسی طرح عیسائیوں کی سازش کا علم ہو گیا لیکن وہ یہ نہ معلوم کر سکا کہ فلورا کو نکال لے جانے کے لیے وہ کون سا طریقہ اختیار کریں گے۔ اس نے قاضی کو بھی باخبر کر دیا۔ دریں اثنا ایک دن اس کی خادمہ مرجانہ سے اسے معلوم ہوا کہ پڑوس کی کوئی عورت زیاد سے ملنا چاہتی تھی۔ زیاد اس عورت سے ملا جو دراصل راہبہ فلورنڈا تھی۔ اس نے اپنا نام حلاوہ اور خود کو ایک افسر جعفر بن عمر کی بیوہ بتایا جو چھ ماہ ہوئے

گیسما کی لڑائی میں مارا گیا تھا ۔ حلاوہ ترسلونہ سے آئی تھی ۔ اس نے خاوند کی وفات کے بعد دوسری شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا ۔ حمیدہ نامی ایک لونڈی بھی ہمراہ تھی ۔ حلاوہ نے خود کو بے سہارا ظاہر کرتے ہوئے زیاد سے درخواست کی کہ وہ روزانہ ایک بار اس کے گھر آ کر احوال پرسی کر جایا کرے ۔ زیاد نے حلاوہ کا ذکر فلورا سے تو کیا لیکن حلاوہ سے فلورا کا کوئی ذکر نہ چھیڑا ۔ چند دن کی ملاقاتوں میں بے تکلفی بڑھ گئی تو زیاد نے محسوس کیا کہ وہ زیادہ دیر جذبات پر قابو نہ رکھ سکے گا اس لیے اس نے حلاوہ سے شادی کی درخواست کی جسے اس نے قبول نہ کیا ۔ زیاد نے یہ تاثر لیا کہ وہ شادی کے بغیر ایسے گناہوں کی دنیا میں گھسیٹنا چاہتی ہے اس لیے اس نے بے تکلفی کی ملاقاتیں ختم کر دیں ۔ حلاوہ کو اپنی شکست پر دکھ ہوا اور اب وہ واقعی زیاد کے لیے محبت بھی محسوس کرنے لگی تھی ۔ کوئی چارہ نہ دیکھا تو بالآخر حلاوہ نے حمیدہ (ایولنٹ) کو یولاجیس کے پاس مشورہ لینے بھیجا جس نے مشن کی تکمیل کے لیے حلاوہ کو زیاد سے شادی کر لینے کی اجازت دے دی ۔ زیاد کے گھر دلہن بن کر آنے کے بعد حلاوہ نے اپنی دینداری کے ذریعے زیاد کو متاثر کیا ۔ اس نے فلورا کے کافرانہ نام پر بھی اعتراض کیا اور آیندہ زہرا کہنے پر اصرار کیا اور زہرا کے عقاید درست کر دینے کا بھی وعدہ کیا ۔ ایک دن موقع پا کر حلاوہ نے فلورا کے دلی تاثرات اور عقائد کی حقیقت پوچھ لی اور اپنی اصلیت بھی اس پر ظاہر دی ۔ اسی دن زیاد نے قاضی کے پاس سے آ کر حلاوہ کو بتایا کہ پادریوں نے فلورنڈا نامی کسی راہبہ کو متعین کیا ہے کہ وہ مسلمان عورت کے روپ میں اس محلے میں آ کر زیاد سے مراسم بڑھا کر فلورا کو نکال لے جائے ۔ اس نے حلاوہ کو فلورا کی کڑی نگہداشت کی تاکید کی ۔ فلورا فلورنڈا دونوں نے صورت حال پر غور کیا اور فلورنڈا کے انتہائی اصرار پر فلورا بھائی کا گھر چھوڑنے پر آمادہ ہو گئی ۔ زیاد نے حلاوہ کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ فلورا کو کسی مسلمان سے شادی کر لینے کی ترغیب دے لیکن فلورنڈا نے بڑی خوبصورتی سے چھ سات ماہ کی مہلت حاصل کر لی ۔

اس واقعہ کے ایک ماہ بعد ایک دن زیاد گھر میں یہ بتا کر چلا گیا کہ وہ رات کو امیر عبدالرحمٰن کے بیٹے محمد کے ولی عہدی کے جشن کی بدولت واپس نہیں آئے گا ۔ زیاد صبح جب جشن سے لوٹا تو فلورا ، حلاوہ اور حمیدہ تینوں غائب تھیں اور مرجانہ بے ہوشی کی گہری نیند میں تھی جسے رات شربت میں کچھ پلا دیا گیا تھا ۔ مسہری پر زیاد کو حلاوہ کا خط ملا جس میں اس نے انکشاف کیا تھا کہ جس فلورنڈا کا زیاد متلاشی تھا وہ خود حلاوہ ہی تھی اور فلورا کو لے جانے کے مشن میں کامیاب ہو گئی ۔ زیاد غیض و غضب کے عالم میں تلوار لے کر پادریوں کے قتل کے لیے جانا چاہتا تھا کہ مرجانہ نے بہ منت سمجھا کر قاضی کے پاس بھیجا ۔ قاضی نے واقعات سن کر بادشاہ کو ایک خط لکھا جسے دیکھ کر بادشاہ بہت برہم ہوا اور فوراً حبشیوں کی فوج کے دو افسر طلحہ بن عثمان الحمیری اور علی بن منذرالزبیدی قاضی کے پاس اس ہدایت کے ساتھ بھیجے کہ ان کے ہر حکم کی فوراً تعمیل کریں ۔ عبدالرؤف بھی قاضی کا خط ملتے ہی آ گیا اور حالات سن کر اس نے طلحہ اور علی کو حکم دیا کہ اپنے ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ بڑے کیتھڈرل کے سوا قرطبہ کے تمام گرجوں اور راہبوں کی قیام گاہوں سے ہر مرد و زن کو بلا امتیاز گرفتار کر لائیں ۔ خود عبدالرؤف نے اپنے ایک ہزار سپاہیوں سے بڑے کیتھڈرل کا محاصرہ کر لیا لیکن یولاجیس ، فلورا اور فلورنڈا کا کچھ پتہ نہ چلا

صرف پادری پلاحسں سے اس قدر معلوم ہوا کہ فلورنڈا رات کو گرجے گئی تھی اور پھر کہیں چلی گئی ۔ شام تک قرطبہ کے تمام پادری ، راہب اور راہبات گرفتار ہو کر قاضی کے سامنے پیش ہوئے اور قید خانے بھجوا دیے گئے ۔ اس واقعے کے ایک ماہ بعد یولاجس ، فلورا اور فلورنڈا کوہ پیرینیز کی گھاٹیوں کے ایک گرجے میں قیام پذیر تھے ۔ یولاجس منتظر تھا کہ برف پگھل کر راستہ کھل جائے تو فرانس نکل جائے ۔ اس نے پہلے تو فلورا کو کسی عیسائی سردار سے شادی کر لینے کا مشورہ دیا اور جب وہ نہ مانی تو خود ہی دندان آز تیز کرنے لگا ۔ یولاجس کا اصرار بڑھتا گیا لیکن فلورا کا بدستور انکار ہی رہا ۔ اب وہ بھائی کا گھر چھوڑ کر متاسف تھی اور چاہتی تھی کہ پھر قرطبہ چلی جائے لیکن ناممکن تھا ۔ اس دوران یولاجس خفیہ طور پر طلیطلہ گیا اور وہاں شہادت کی تحریک چلا کر دو ماہ میں واپس پہنچ گیا ۔

ابھی قرطبہ میں سب راہب وغیرہ بدستور زیر حراست تھے کہ ایک عیسائی نے قاضی کے سامنے رسول کریم ؐ کی شان میں گستاخی کی ، لوگوں نے مار مار کر اسے بے ہوش کر دیا ۔ قاضی نے روکا ۔ اس شخص کے ہوش میں آنے کے بعد پھر استفسار کیا تو اس نے پھر دریدہ دہنی کی ۔ قاضی نے غور و فکر کے بعد اسے مجنون سمجھتے ہوئے وہاں سے نکلوا دیا ، اتنے میں ایک اور عیسائی آ گیا اور اس نے بھی وہی حرکت کی ۔ پہلا بھی دوبارہ پکڑا ہوا آیا اور قاضی نے دونوں کو جیل بھجوا دیا ۔ شام کو قاضی نے احباب سے مشورہ کر کے دوسرے روز قرطبہ کے صاحب اثر معزز عیسائیوں ، مسلمان علماء اور قید خانے سے چار پانچ پادریوں کو مدعو کیا اور یحییٰ بن حکم الغزالی نے ان سے خطاب کیا ۔ عیسائیوں نے حکومت کے رویے کی تعریف اور یولاجس کی مذمت کرتے ہوئے اس فتنے کے انسداد کے لیے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے مجانین کے بارے میں حکومت کے انتہائی اقدام سے بھی اتفاق کیا ۔ اس کے بعد عموماً روز ایک عیسائی آتا ، دریدہ دہنی کرتا اور قتل ہوتا ۔ اسیر پادریوں میں سے اکثر رہا کر دیے گئے اور جو مشکوک تھے گرفتار رہے ۔

ادھر مشرق پہاڑوں میں اب شاہ سیپٹمانیہ کے ڈیوک الفانسو کی بیٹی ہیلن بھی فلورا کی دلدہی کے لیے وہیں آ گئی تھی اور ارادہ تھا کہ برف پگھلتے ہی فلورا سمیت واپس چلی جائے گی ۔ فلورا پادریوں کی ہوس پرستیوں سے آگاہ ہو کر عیسائیت اور پادریوں سے بدظن ہو چلی تھی ۔ ہیلن کے دل میں فلورا کے لیے بے پناہ محبت تھی ۔ جب یولاجس نے اپنی سفلی خواہشات کی تکمیل کے لیے فلورا پر بہت زیادہ دباؤ ڈالنا شروع کیا تو اس نے نن بن جانے کا فیصلہ کیا جس سے ہیلن نے یہ اصرار منع کیا ۔ اسی اثنا میں حکومت نے یولاجس کو آرک بشپ کے عہدے سے معزول کر کے عیسائیوں کو نیا آرک بشپ چن لینے کی اجازت دے دی تھی اور سب راہبوں اور راہبات کو رہا کر دیا تھا کیونکہ بڑی کوشش کے باوجود اس سے زیادہ یہ معلوم ہو سکا کہ یولاجس پیرینیز کی کسی گھاٹی میں مقیم ہے ۔ مجانین کی تحریک ، جس میں عورتیں زیادہ تھیں ، جاری تھی لیکن دیگر عیسائی پر امن تھے ۔

زیاد کی پریشانی اور بے کلی بدستور تھی ، وہ قاضی کے مشورے سے طلیطلہ گیا اور عبدالرؤف کو آمادہ کرنا چاہا کہ پیرینیز پر فوج کشی کرے لیکن اس نے اس اقدام کو خلاف مصلحت اور بے وقت قرار دیتے ہوئے تجویز کیا کہ کسی مسلمان کو راہب کے بھیس میں دریافت حال کے لیے بھیجا جائے گا ۔ یہ سن کر زیاد خود ہی چپکے سے نکل گیا ، راستے میں تلوار اور کپڑے ایک

غار میں پھینک کر خود راہبوں کے لباس میں چل پڑا ۔ اسی اثنا میں طلیطلہ کے گرجے کی ایک نن مرتھا بھی یولاجیس کے پاس جا پہنچی، فلورا نے یولاجیس سے اپنی عزت بچانے کے لیے مرتھا کے ساتھ طلیطلہ جا کر نن بننے پر اصرار کیا ۔ ہیلن نے پرزور طریقے پر اور فلورنڈا نے دبی زبان سے منع کیا ۔ جب فلورا مرتھا کے ساتھ چلی گئی تو فلورنڈا نے ہیلن کو خانقاہوں کی اندرونی بدکاریوں کا راز بتاتے ہوئے کہا کہ خانقاہ میں کوئی راہبہ کسی پادری کی کسی خواہش سے انکار نہیں کر سکتی اور ایسا کرے تو قتل کر دی جاتی ہے ۔ ہیلن کو یہ سن کر سخت دکھ ہوا، اسے سب پادریوں اور ننوں سے نفرت ہو گئی ، یولاجیس سے بھی ملنا ترک کر دیا ۔ فلورنڈا خائف تھی کہ ہیلن کہیں خانقاہوں کے راز کے سلسلے میں اس کا نام نہ بتا دے۔ فلورا کے جانے کے آٹھویں دن فلورنڈا اور یولاجیس بھی طلیطلہ روانہ ہو گئے ، یولاجیس جاتے وقت ہیلن کو دھمکی دے گیا کہ اس کی بے رخی پر اس کے باپ سے شکایت کرے گا ۔

مرتھا فلورا کو لے کر طلیطلہ پہنچی اور بڑی خانقاہ کی منتظمہ سے کہہ کر اسے سینٹ میری کے نام سے نن بنا دیا گیا ۔ اکیسویں دن فلورنڈا اور یولاجیس بھی وہاں جا پہنچے اور اسی رات پانچ راہبات فلورا کو زبردستی اٹھا کر یولاجیس کے کمرے میں چھوڑ آئیں ۔ اس واقعہ کے تقریباً چار ماہ بعد زیاد جرجس راہب کے روپ میں پیرینیز کی اس گھاٹی میں پہنچا جہاں ہیلن فلورا کی یاد میں مغموم زندگی گزار رہی تھی۔ جرجس اور ہیلن دو تین ملاقاتوں میں ایک دوسرے پر کھل گئے۔ زیاد نے اپنی اصلیت اور سابقہ واقعات ہیلن کو بتائے۔ ہیلن نے فلورا کی معصومیت کا یقین دلایا اور پھر دونوں ہمیشہ ساتھ رہنے کا فیصلہ کرکے چپکے سے طلیطلہ چلے گئے ۔

فلورا خانقاہ میں اپنے کمرے میں تنہا پڑی قسمت کو روتی رہتی ، اس کا پانچ ماہ کا حمل تھا اور منتظمہ سینٹ کرسٹین نے اسے کنواری ننوں کے بچوں سے جان چھڑانے کی تقریب کا منظر بھی دکھایا جس سے وہ بہت گھبرائی اور پہروں سجدے میں گڑگڑا گڑگڑا کر تائب ہوئی اور سچے دل سے مسلمان ہوگئی۔ اسی رات اس کے لیے پھر یولاجیس کی تفریح کا سامان بننے کے لیے بلاوا آیا ۔ فلورا متعلقہ کمرے میں گئی ، بظاہر اپنے سابقہ رویے پر نادم دکھائی دینے لگی ، یولاجیس خوش ہو گیا اور جب آدھی رات کو وہ سو رہا تھا تو فلورا نے اس کی گردن پر چھری پھیر دی اور مردہ خیال کرکے خود بھاگ نکلی ۔ یولاجیس کی چیخ و پکار پر راہبات جمع ہوگئیں ، سینٹ کرسٹین نے خانقاہ کی بدنامی کے خوف سے بے ہوش یولاجیس کو جنازے کی صورت میں اسی وقت برنینڈو کے ایک معتقد مارٹن کے گھر بھجوا دیا ، فلورنڈا بھی ہمراہ گئی ۔ اسی صبح عبدالرؤف نے شاہی فوج کے ساتھ خانقاہ کا محاصرہ کرکے تلاشی لی ۔ اس کے ہمراہ ہیلن اور زیاد بھی تھے ۔ جب فلورا ، فلورنڈا اور یولاجیس کا کچھ پتہ نہ چلا تو مرتھا اور سینٹ کرسٹین کو حراست میں لے لیا گیا مگر بے سود ۔ ہیلن اور زیاد قرطبہ چلے گئے اور وہاں شادی کر لی۔ دو ماہ تک یولاجیس مارٹن کے گھر مقیم رہ کر صحت مند ہو گیا ۔ اس دوران اسے پتہ چلا کہ فلورنڈا نے ہیلن پر خانقاہی رازوں کا انکشاف کر دیا تھا ، اس نے فلورنڈا کے لیے شہادت کو واحد ذریعہ نجات قرار دیا ۔ پھر دونوں برنینڈو کی مدد سے چوری چھپے طلیطلہ سے نکل کر قرطبہ پہنچے اور خفیہ طور پر شہادت کی تحریک تیز کی ۔ یولاجیس نے فلورنڈا کو حکم دیا کہ ہیلن کو قتل کرکے نعرہ شہادت بلند کرے ، راہب ستیاگو اس کی مدد پر مامور ہوا لیکن یہ دونوں جب

پل کے قریب رات کو قتل کا منصوبہ بنا رہے تھے زیاد نے سن لیا اور سنٹاگو کو قتل کرکے فلورنڈا کو پکڑ لایا۔ عبدالرؤف بھی اسی روز قرطبہ پہنچا تھا، ادھر سے گزرتے ہوئے وہیں آ پہنچا اور فلورنڈا کو گرفتار کرکے زیاد کے گھر بھجوا دیا جہاں زیاد نے خنجر کی نوک کے زور پر اس سے بولاحسن کا پتہ پوچھا اور ہملن بھی ہمراہ چلنے کو تیار ہو گئی۔

فلورا بولاحسن کو مردہ تصور کرکے بھاگی اور بچتی بچاتی ویرانوں میں پہنچ گئی۔ ایک غار میں اسے بھائی کی تلوار اور کپڑے ملے جس سے اس نے خیال کیا کہ عیسائیوں نے قتل کرا دیا ہوگا۔ بھائی کے کپڑے پہن، تلوار لگا کر یوسف نام تجویز کرکے چل پڑی۔ ایک گاؤں میں ابو مسلم نامی ایک افسر کے پاس ملازم ہوئی۔ کچھ دنوں بعد ابو مسلم کو معلوم ہو گیا کہ وہ عورت ہے۔ اس نے بیٹی کی طرح رکھنا چاہا لیکن فلورا راہب کے روپ میں قرطبہ کی طرف چل پڑی اور بولاحسن کے قرطبہ پہنچنے کے دس دن بعد وہاں پہنچی۔ زچگی کا زمانہ قریب تھا۔ ایک پادری ملا جس سے بولاحسن کی قرطبہ میں موجودگی کا علم ہوا۔ اسی کے توسط سے بولاحسن سے ملنے کا وقت لیا۔ اسی دن اس کے یہاں بچہ پیدا ہوا۔ رات بچے کو کمر سے باندھ، بھائی کا لباس پہن، ہلاجس کے ہمراہ بولاحسن کے پاس پہنچی۔ قدم چھونے کے بہانے جھک کر بچے کو زمین پر رکھا اور تلوار نکال کر بولاحسن پر دو بھرپور وار کیے۔ بولاحسن کی چیخ سن کر ساتھ کے کمرے سے ایک شخص نکلا اور اس نے آتے ہی فلورا کے چھرا گھونپ دیا۔ یہ شخص ابو مسلم تھا۔ بولاحسن نے بھی فلورا کو پہچان لیا تھا، ابو مسلم نے بھی اسے بعد میں پہچانا۔ ابھی بولاحسن تڑپ ہی رہا تھا کہ فلورنڈا، ہملن اور زیاد بھی آ پہنچے، ابو مسلم نے ہملن کو دیکھتے ہی اس پر بھی وار کرنا چاہا لیکن اس سے پہلے زیاد کی تلوار نے اس کا سر قلم کر دیا۔ یہ دراصل ہملن کا باپ الفانسو تھا۔ بولاحسن نے مرتے مرتے فلورنڈا کو غدار کہا اور ہلاجس نے جو کھڑا حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا دھکے سے بڑھ کر فلورنڈا کے بھی چھرا گھونپ دیا۔ فلورنڈا نے مرتے مرتے زیاد کو سب حقیقت بتائی، دم توڑتی ہوئی فلورا نے زیاد کو یقین دلایا کہ وہ سچے دل سے مسلمان ہو چکی تھی، ہملن نے فلورا کے بچے کو گود لے لیا۔ فلورا کا جنازہ بے پناہ مسلمانوں نے جامع قرطبہ میں پڑھا جس میں امیر عبدالرحمٰن بھی شامل تھا۔ الفانسو کو بھی دھوم دھام سے سپرد خاک کیا گیا۔

واقعات کا تحقیقی جائزہ

فلورا فلورنڈا میں بیان کردہ اکثر واقعات تاریخی صداقتوں اور بعض تاریخی روایات پر مبنی ہیں۔ پہلے باب میں شرر نے طلیطلہ کے پہاڑوں میں ایک پر ہول مقام کا منظر بیان کرتے ہوئے اس سے متعلق ہرقل اعظم کے تعمیر کردہ ایک طلسماتی برج کا ذکر کیا ہے جس کے دروازے پر ہر نیا بادشاہ اپنے نام کا قفل لگاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس برج میں سلطنت اور انقلاب زمانہ کا راز تھا۔ آخری قوطی شہنشاہ سپین راڈرک نے جب اس دروازے پر اپنے نام کا قفل لگوانے کی بجائے اس برج کو کھلوا کر دیکھا تو اسے اس میں اپنی سلطنت کی تباہی اور اپنی ہلاکت کی تصویر نظر آئی۔ راڈرک خوفزدہ ہو کر برج سے نکل بھاگا جس کے فوراً بعد برج خود بخود تباہ ہو گیا اور وہاں کی چٹانیں سرخ ہو ہو کر تڑخنے لگیں۔

اس برج اور راڈرک سے متعلق شرر کی بیان کردہ داستان اور تفصیلات بظاہر عجیب و غریب

ہیں لیکن یہ جملہ تفصیلات و واقعات تاریخی روایات پر مبنی ہیں ۔ سپین سے متعلق متعدد کتب تواریخ میں ایسی روایات ملتی ہیں ۔ سطور ذیل میں سٹینلے لین پول کی "مورز ان سپین" میں بیان کردہ روایت درج کی جاتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فلورا فلورنڈا کے پہلے باب میں بیان روایت محض ناول نگار کی ذہنی اختراع نہیں بلکہ ایک تاریخی اساس رکھتی ہے ۔ سٹینلے لین پول نے لکھا ہے :

"سپین میں جو فسانے زبان زد عوام الناس ہیں ، ان میں یہ حالات نہایت عجیب و غریب پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں ۔ کہتے ہیں واقعہ مذکور الصدر سے کچھ عرصہ پیشتر (یعنی طریف کے ساحل ہسپانیہ پر حملے سے پہلے) ایک دن جب شاہ راڈرک قدیم دارالخلافہ ٹولیڈو (طلیطلہ) میں نو روزی کر رہا تھا تو اچانک دو بوڑھے آدمی دربار میں داخل ہوئے ۔ یہ دونوں پرانی وضع کے سفید جبے پہنے ہوئے تھے، ان کے لمبے لمبے خوشنما پٹکوں پر منطقۃ البروج کی تصویریں منقش تھیں جن میں سے بے شمار گچھے کے گچھے لٹک رہے تھے ۔ شاہ راڈرک کے سامنے آ کر بعد ادائے مراسم شاہانہ انھوں نے اس طرح خطاب کیا : "اے بادشاہ ! قدیم زمانے میں جب شاہ ہرقل نے سمندر کے کنارے پر وہ مینار نصب کیے جو آج تک اسی کے نام سے مشہور چلے آتے ہیں تو آں کے ساتھ ایک نہایت عالی شان اور مضبوط عمارت بہ شکل گنبد اس قدیم شہر کے حوالی میں بنوا کر اس میں ایک طلسم رکھا اور اس کو آہنی کواڑوں اور جو کھٹ سے محفوظ کرکے اس میں فولادی قفل ڈال دیے اور بہ نظر دوراندیشی و احتیاط یہ انتظام کیا کہ ہر نیا بادشاہ جو سریر آرائے سلطنت ہو اپنے نام کا ایک علیحدہ قفل دروازے پر لگا دے اور بایں خیال کہ پیش از وقت افشائے راز نہ ہو ، یہ پیشین گوئی کی کہ جو شخص محفیات گنبد کو طشت از بام یا کم از کم دریافت کرنے کی کوشش کرے گا ، وہ سخت مصائب و آفات میں مبتلا ہوگا ، چنانچہ ہم نے اور ہمارے بزرگوں نے ہرقل کے زمانے سے لے کر اس وقت تک گنبد کی حفاظت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور کبھی کسی کو اس میں دخل دینے نہیں دیا ۔ اگرچہ بعض بادشاہوں نے اسرار گنبد کو معلوم کرنے کی کوشش بھی کی مگر آں کے اس ارادے کا انجام یا تو موت یا کوئی آفت ناگہانی ہوئی ۔ غرض دروازے سے آگے قدم رکھنا آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا ۔ اے بادشاہ اس وقت ہم حضور میں اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ بھی اپنے نام کا ایک علیحدہ قفل لگا دیں ۔" یہ کہا اور سلام کرکے دونوں رخصت ہوئے ۔

شاہ راڈرک جب اس حیرت انگیز قصہ کو بغور سن چکا تو اس کے دل میں دریافت راز کا شوق پیدا ہوا اور یہاں تک بڑھا کہ ہرچند اس کے مشیروں اور سب نے اس کو متنبہ کیا اور کہا کہ آج تک گنبد کے اندر کوئی شخص زندہ داخل نہیں ہوا حتیٰ کہ قیصر اعظم بھی اس قسم کی جرأت نہ کر سکا ، کیونکہ تقاویم کہنہ میں بھی لکھا ہے کہ گنبد کا بھید کوئی دریافت نہ کر سکے گا مگر ایک بادشاہ جو اپنے سلسلے میں اخیر ہوگا اور اس کو بھی یہ امر اس وقت میسر ہوگا جب کہ ستون سلطنت مل کر ثقل سے ہل جائے گا ۔ جب باہمی نفاق و بے وفائی اس کی بیخ و بنیاد کو کھوکھلی کر دیں گی اور غضب الٰہی نازل ہوگا ۔ مگر بادشاہ راڈرک ان تمام نصیحتوں کے برخلاف ایک روز بہت سے سوار اور پیادوں کو جلو میں لے کر گنبد کی جانب روانہ ہوا ۔

یہ گنبد کئی چٹانوں کے بیچ میں ایک بلند قلۂ کوہ پر واقعہ تھا ۔ اس کی دیواریں سنگ مرمر اور اور سنگ زبرجد سے بنائی گئی تھیں جن پر نہایت نازک اور دقیق نصیحتیں کندہ تھیں اور جو اس قدر صاف شفاف تھیں کہ باوجود اس قدر پرانے ہونے کے آفات کی دست درازیوں کی تاب نہ لا سکتی تھیں ۔ گنبد کا دروازہ پورے پتھر سے تراش کر بنایا گیا تھا جس کے کواڑوں پر ہرقل سے لے کر وٹیزا کے زمانے تک تمام شاہان سلف کے ہاتھ کے بھاری بھاری قفل پڑے تھے ۔ دروازہ کے دونوں جانب وہ دونوں بوڑھے کھڑے تھے جو دربار میں حاضر ہوئے تھے ۔ انھوں نے ہر چند شاہ راڈرک کو منع کیا اور سخت مصیبت کی پیشین گوئی کی لیکن جب آں کی کوئی نصیحت کارگر نہ ہوئی تو ناچار وہ بھی کمربستہ ہوگئے اور شاہ راڈرک کے جوان سپاہیوں کے ساتھ تمام دن آں بھاری قفلوں کے کھولنے میں مصروف رہے ۔ بالآخر قریب غروب آفتاب قفل کھل گئے اور بادشاہ مع اپنے ہمراہیوں کے دروازہ کی جانب بڑھا اور کواڑ کھول کر اول ایک

وسیع کمرہ میں داخل ہوا۔ اس کمرہ کی دوسری جانب ایک اور ایسا ہی دروازہ تھا جس سے پاس کے کمرہ میں راستہ جاتا تھا۔ اس دروازہ کے سامنے اس طرف پیتل کی ایک بڑی مہیب خوفناک مردانہ مورت استادہ تھی اور ایک بھاری گرز ہاتھ میں لیے دم بدم زمین پر مارتی تھی۔ یہ دیکھ کر تھوڑی دیر تک شاہ رازرق خوف و حیرت میں غرق رہا لیکن جب اس کے سینے پر یہ فقرہ "میں اپنا فرض منصبی پورا کرتا ہوں" کندہ دیکھا تو اس کا حوصلہ بڑھا اور اس کو قسم دے کر کہا "مجھ کو گزر جانے دے، میرا ہرگز یہ منشاء نہیں کہ اس گنبد کو ضرر پہنچاؤں یا اس کے دریچے تخریب کروں، صرف راز دریافت کرنا چاہتا ہوں"۔ یہ سنتے ہی طلسمی تصویر یک لخت گرز تھام کر خاموش کھڑی ہوگئی۔ بادشاہ مع اعیان و اراکین اس کے نیچے سے گزر کر دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کمرے کی دیواروں پر جابجا ہر قسم کے قیمتی پتھر نصب تھے اور بیچ وسط میں ہرقل کے بادشاہ کی ایک سنہری تپائی تھی جس پر ایک صندوقچہ رکھا تھا۔ صندوقچہ پر یہ عبارت کندہ تھی "تمام مخفیات گنبد اس بکس میں بند ہیں مگر اس بادشاہ کے اس کو کھولنے کی اور کسی کو جرأت نہ ہو سکے گی لیکن ذرا اس کو خبردار اور ہوشیار رہنا چاہیے کیونکہ اس وقت اس کو عجیب و غریب واقعات دکھلائی دیں گے جو مرنے سے پہلے آگے پیش آئیں گے۔"

جب شاہ رازرق نے بکس کھولا تو بجز ایک جری وصلی کے جو دو سنہری پتیوں کے بیچ میں محفوظ تھی اور کچھ نہ نکلا۔ وصلی پر گھوڑے سواروں کی تصویریں بنی تھیں جن کے چہرے نہایت خوفناک اور بھیانک تھے اور وہ اس قطع سے مسلح تھے۔ وصلی کے صفحہ پر یہ عبارت لکھی تھی۔" دیکھ اے بد اندیش، ان لوگوں کو جو تجھے سریر سلطنت سے نیچے گرائیں گے اور تیرے ملک پر قبضہ کریں گے۔"

وصلی پر نظر ڈالی تھی کہ شاہ رازرق اور اس کے ہمراہیوں نے دفعۃً میدان جنگ میں دار و گیر کا شور بلند ہوتے سنا۔ طلسمی گھوڑے وصلی کے صفحہ پر یک بیک بادلوں کی طرح حرکت کرنے لگے اور اس مرقع میں ایک حقیقی کارزار کا سماں بندھ گیا۔ بدنصیب شاہ رازرق کی آنکھوں کے سامنے اس عالم استعجاب و حیرت میں جانگزا واقعات پیش ہونے لگے جو بالترتیب ایک دوسرے کے بعد دکھلائی دیتے تھے اور نقش آب کی طرح مٹ جاتے تھے اور جن سے آنے والے حادثوں اور لڑائیوں کے نتیجے دریافت ہوتے تھے جو ابھی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ اس نے دیکھا کہ سامنے ایک میدان جنگ ہے، جس میں مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک سخت ہنگامہ کارزار گرم ہے۔ غازی مردوں کا جوش میں آ کر جھپٹنا اور اپنے پاؤں سے مخالفین کی لاشیں روندنا، قرنا اور نرسنگھوں کی مہیب آواز، نفیروں کی جھنکار اور صدہا طبلان جنگ کا طوفان خیز شور سنائی دیا۔ تلواریں میانوں سے نکلیں، گرز بلند ہوئے، تیر سنسنا کر پیام اجل پہنچانے لگے، برچھے اور برچھیاں چاروں طرف پھینکے لگیں، مسیحی میدان سے بھاگ نکلے، کفار (مسلمانوں) نے ان کا تعاقب کیا اور شکست فاش دی۔ جھنڈا جس پر کراس (صلیب) نصب تھا زمین پر گر گیا۔ سپین کے نشان کا پھریرا پامال ہوگیا۔ فتح مندوں کے خوشی کے نعروں، مصیبت زدوں کی غیض و غضب کی چیخوں، قریب المرگ زخمیوں کی آہ و زاری سے تمام ہوا گونجنے لگی۔ ہزیمت خوردہ سپاہیوں میں جو تہ و بالا ہو کر ادھر اُدھر بھاگے جاتے تھے، شاہ رازرق کی نظر اچانک ایک جوان مرد سپاہی پر پڑی جو شاہی تاج پہنے اور پشت پھیرے ہوئے تھا، مگر دور سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اسلحہ اور لباس خاص شاہ رازرق کے سے ہیں، ایک سفید گھوڑے پر سوار ہے جو ٹھیک ویسا ہے جیسا کہ اس کا لڑائی کا گھوڑا—اوریلیا۔ عین ہنگامہ میں وہ جوان گھوڑے سے نیچے گرا اور پھر کہیں اس کا پتہ نشان نہ معلوم ہوا۔ اوریلیا دیوانہ وار خالی پشت چاروں طرف بھاگا پھرتا تھا۔ یہ دیکھ کر شاہ رازرق اور اس کے ہمراہی طلسمی گنبد سے حواس باختہ ہو کر بھاگے مگر اس سے پہلے ہی وہ پیتل کی مورت غائب ہوگئی تھی، دونوں بوڑھے دروازے کے سامنے مرے پڑے تھے اور علاوہ اور بے شمار غیبی آفات کے ایک یہ بھی ہوا کہ گنبد میں فوراً اسی وقت آگ کے شعلے بلند ہوگئے، ہر ایک پتھر جل کر خاک سیاہ ہوگیا اور بیان کیا جاتا ہے کہ جس جس جگہ زمین پر یہ خاکستر ہوا میں اڑ کر گری، وہیں

ایک قطرہ خون پیدا ہوگیا ۔"[1]

فلورا فلورنڈا کے پہلے باب میں اس طلسماتی برج سے متعلق بیان کردہ روایت سٹینلے لین پول کی محولہ بالا روایت سے کاملاً مطابقت رکھتی ہے ۔ زمانۂ متوسط کے تقریباً سب مسلمان اور عیسائی مورخین نے اپنی تصانیف میں ایسی روایات کو جگہ دی ہے ۔ ابن الاثیر اور ڈوزی کے علاوہ المقری کے یہاں نفح الطیب میں بھی یہ روایت مذکور ہے ، لیکن المقری نے اس ضمن میں دو روایات نقل کی ہیں ۔ ایک تو یہ کہ

"شاہان یونان نے اوقات مختلفہ پر جو طلسم بنائے تھے اُن کو ایک صندوق میں بند کر کے طلیطلہ میں رکھ دیا تھا ۔ جس مکان میں یہ صندوق تھا اس میں ہر بادشاہ اپنے نام کا ایک قفل لگا دیتا تھا چنانچہ جس وقت لذریق تخت پر بیٹھا تو اس مکان میں ۲۶ قفل لگ چکے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں کے زمانے سے لے کر اس وقت تک ۲۶ بادشاہ حکمرانی کر چکے تھے اور لذریق ستائیسواں تھا ۔ جب اس کے انقراض دولت اور دخول عرب و بربر کا وقت آیا تو یہ شخص تخت پر بیٹھا ، اس نے اپنے وزیروں ، خاصان دولت اور اہل الرائے سے کہا کہ "مجھے اس مکان کے متعلق کچھ خیال پیدا ہوا ہے کہ جس میں ۲۶ قفل لگے ہوئے ہیں ۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے کھول کر دیکھوں کہ اس میں کیا ہے کیونکہ بے فائدہ تو کوئی عمل کیا ہی نہیں جاتا" سب نے کہا "آپ سچ فرماتے ہیں کہ کوئی کام بے فائدہ نہیں کیا جاتا ، اسی لیے ہر بادشاہ کا ایک قفل لگا دینا بھی بے فائدہ نہیں ہے ۔ مصلحت اسی میں ہے کہ آپ بھی اپنا قفل لگا دیجیے ، جیسے کہ اور بادشاہ لگاتے رہے ہیں ۔ آپ کے آبا و اجداد نے اس امر میں سستی نہیں کی ، آپ بھی جلدی کر کے اُن ہی کی تقلید کیجیے ۔" اس نے کہا کہ "میرا دل مجبور کر رہا ہے کہ میں اس کو کھول کر دیکھوں ۔" سب نے کہا کہ "اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ اس میں کچھ مال جمع ہے تو ہم تیار ہیں کہ مال کثیر جمع کر دیں لیکن آپ ایسا کوئی کام نہ کریں جس سے ہمارے اوپر کوئی حادثہ پڑے ۔" مگر بادشاہ اپنی ضد پر قائم رہا ، چونکہ وہ ایک مہیب آدمی تھا اس لیے کسی کو زیادہ اصرار کی جرأت بھی نہیں ہوئی ۔ آخر اس نے قفلوں کے کھولنے کا حکم دیا ، کیونکہ ہر قفل کے ساتھ اس کی کنجی بھی لٹک رہی تھی ، جب دروازہ کھلا تو مکان کے اندر سوائے ایک طلائی مرصع و مکلل بڑی میز کے اور کچھ نہ ملا جس پر لکھا ہوا تھا کہ یہ مائدہ سلیمان علیہ السلام ہے ۔ پھر ایک صندوق نظر آیا کہ جس میں قفل لگا ہوا تھا اور اس کی کنجی اسی میں لٹک رہی تھی ۔ جب اس کو کھولا اس میں ہرن کی جھلی رکھی ہوئی ملی اور صندوق کے پہلوؤں میں نہایت صنعت سے بنی ہوئی سواروں کی تصویریں تھیں ۔ جن کی شکلیں عربوں سے ملتی تھیں جو جانوروں کی کھالیں پہنے ہوئے، عمامے باندھے ہوئے، گیسو چھوڑے ہوئے، عربی گھوڑوں پر سوار ، ننگی تلواریں ہلاتے ہوئے برچھے تانے ہوئے تھے ۔ بادشاہ کے حکم سے وہ جھلی کھولی گئی تو اس میں لکھا ہوا تھا کہ "جب یہ مقفل مکان اور صندوق کھولا جائے گا تو وہ قوم جس کی تصویریں اس میں بنی ہوئی ہیں جزیرہ اندلس میں داخل ہو جائے گی ، جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک ہوگا ، نکل جائے گا ، اور ان کی حکومت بھی جاتی رہے گی ۔" جب لذریق نے جھلی کا نوشتہ سنا تو اپنے کیے پر بہت پچھتایا اور اس کو یقین ہوگیا کہ اب میری سلطنت باقی نہ رہے گی ۔"[2]

المقری کے یہاں دوسری روایت جو کتاب الخزایینی کے حوالے سے بیان کی گئی ہے ، اس پہلی روایت سے ملتی جلتی ہی ہے[3] ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ روایت بھی ملتی ہے کہ

۱۔ سٹینلے لین پول : مورز ان سپین ، ص ۱۰ تا ۱۸ ، ترجمہ حامد علی صدیقی، ص ۴۲ تا ۴۶ ۔

۲۔ المقری : نفح الطیب ترجمہ محمد خلیل الرحمن ، ص ۸۷ ، ۹۷ ۔

۳۔ نفح الطیب ، ترجمہ ، ص ۸۲ ، ۸۳ ۔

راڈرک نے اہل عرب کو جب اصل میدان جنگ میں دیکھا تو کہا تھا کہ یہ صورتیں تو وہی ہیں جن کو ہم نے بیت الحکمت میں دیکھا تھا۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ راڈرک نے اپنا ایک آدمی میدان جنگ میں طارق کی فوج کا جائزہ لینے بھیجا تھا جس نے واپس آ کر راڈرک سے کہا تھا:

''تیرے اوپر وہی لوگ حملہ آور ہوئے ہیں کہ جو تجھ کو صندوق میں دکھلائے گئے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم سب اپنی جان لے کر بھاگ جاؤ کیونکہ یہ لوگ یا تو مریں گے یا جو زمین تیرے قدموں کے نیچے ہے اس پر بھی وہ قبضہ کرکے رہیں گے۔ انہوں نے اس خیال سے کہ وہ واپس جانے سے مایوس ہو جائیں اپنے جہاز تک جلا دیے ہیں اور باستقلال وہ اس زمین میں صف آرا ہو گئے ہیں کیونکہ ان کے لیے ہماری سر زمین پر کوئی مقام ایسا نہیں کہ جہاں بھاگ کر جا سکیں۔''[۱]

اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ طلسماتی برج والی یہ روایت صحیح ہو جیسا کہ سٹینلے لین پول نے بھی اس روایت کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''متوسط زمانہ میں سپین اور عرب دونوں ملکوں کے مورخوں نے اس قسم کے حیرت انگیز اور بعید از قیاس واقعات نہایت خوشی سے قلمبند کیے ہیں۔ اور جو نیک و بد شگون طرفین کو لڑائی سے پیشتر پیش آئے ہیں، ان سے ان کے جرأت و مسرت کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔''[۲]

شرر نے خود بھی اس روایت کے بارے میں ناول کے حاشیے میں لکھا ہے:

''اس برج اور طلسم کی داستان تمام مورخین نے نقل کی ہے، انگریز مورخین بھی اس کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں گو خلاف قیاس ہونے کی وجہ سے ان کو اس پر یقین نہیں آتا، مگر یہ داستان ایسے معتبر ذرائع سے اور اس کثرت کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ محققین کوئی تاریخی عذر پیش نہیں کر سکتے۔ قدیم زمانے کے مسلمان اور عیسائی مورخین دونوں اس واقعے کو بیان کرتے ہیں۔''

بہرکیف یہ امر عیاں ہے کہ یہ روایت خود شرر کی تخلیق کردہ نہیں بلکہ اسے انہوں نے کتب تواریخ سے لیا ہے۔ اس سے پیشتر کہ یولا جیس اور فلورا کی تاریخی حقیقت اور فلورا کے اغوا یا ''سہادت'' کی تحریک کا تحقیقی جائزہ لیا جائے یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ناول میں یولاجس کی زبانی بار بار اس بیان سے غلط تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ''سہادت'' کی تحریک اسلامی حکومت کے ناجائز دباؤ، یا عیسائیوں کے مذہب میں کسی مداخلت کے خلاف شروع ہوئی۔ در حقیقت ایسی کوئی بات نہیں تھی، مسلمانوں کا عیسائی رعایا کے ساتھ منصفانہ و مشفقانہ رویہ تھا، بقول لین پول:

''مسلمان ان کے ساتھ بڑی مہر و محبت سے پیش آتے تھے۔ مذہبی فرائض ادا کرنے میں ان کو کامل آزادی تھی، کوئی امر حارج نہ تھا، اور وہ خود بھی اپنے ہم سر مسلمانوں کی طرح حرفت و تجارت سے بے تکلف بہرہ مند ہوتے تھے۔''[۴]

یولاجیس کی تحریک کے بارے میں یہ بیان درست ہے کہ یہ ۸۳۰ء کے لگ بھگ شروع ہوئی۔ تحریک کا اصل محرک اور پس منظر پادریوں کی ہوس اقتدار اور اسلام دشمنی تھی۔ لین پول لکھتا ہے:

''یوں تو اندلس بھر میں تقریباً ہر جگہ ایسے پرجوش لوگ موجود تھے مگر بالخصوص قرطبہ میں

۱۔ ایضاً، ص ۸۷۔ ۲۔ ایضاً، ص ۹۱۔ ۳۔ لین پول، ص ۱۸۔ ۴۔ ایضاً، ص ۸۲۔

بعض حضرات اس قدر زیادہ عالی خیال یا زیادہ صریح لفظ میں یوں کہو کہ متعصب تھے کہ ان کو سرے سے اہل اسلام کی حکومت ہی ناگوار تھی ۔ وہ ابھی تک اپنے کلیساؤں کی گزشتہ عظمت و دولت مندی کو بھولے نہ تھے ۔ خصوصاً کلرجی مین ایسے دشمنان دین مسیح کے ساتھ نفرت کرنے سے باز نہیں رہ سکتے تھے جنھوں نے ان کی موروثی عزت و عظمت کو خاک میں ملا کر ان کے ملک میں ایک نیا دین (باطل) شائع کر دیا تھا ۔ ہمارے نزدیک گورنمنٹ اسلام کی آزاد پالیسی نے یہ تمام گل کھلائے ۔ یہی وجہ تھی کہ ان نا عاقبت اندیش لوگوں نے قدیم زمانہ کے تارک الدنیا پارساؤں کی طرح نا برداشتنی اذیتوں کو بخوشی برداشت کیا اور جام شہادت کی تمنا کی ۔ یہ مسلمانوں سے سخت بیزار تھے کیونکہ وہ ان کو امر حق کے لیے اذیت جھیل کر آسمانی حکومت کا موقع نہ دیتے تھے ۔ بالخصوص مسلمانوں کی شگفتہ طبعی، پسندیدہ طرز معاشرت تو وہ کسی طرح دیکھ ہی نہ سکتے تھے . . . ملک کی حالت اس وقت نہایت خوفناک تھی ۔ اچھے اور معقول آدمیوں کو اپنی اور ساتھ دوسروں کی جانیں محض ایک خام خیال کے لیے تلف کرتے دیکھنا ، افسوس اور رحم کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا . . . . دین مسیحی اپنے عقیدت مندوں کو ہرگز ایسی لغو تعلیم نہیں دیتا کہ موت اور زحمت کو بلاوجہ کفارہ گناہ سمجھ کر باعث مسرت جاوید قرار دیں . . . . علاوہ ازیں یہ حالت اس لیے بھی نہ تھی کہ یہودیوں کی طرح ان کو سخت اذیات پہنچی تھیں یا رسوم مذہبی ادا کرنے میں کوئی امر حارج تھا ۔ نہ اس لیے تھی کہ مسلمان دین مسیحی سے ناواقف اور محتاج تلقین تھے ، کیونکہ عام مسیحیوں سے تو ان کو انجیل کا علم زیادہ تھا ۔ وہ حضرت عیسیٰ کا نام مبارک بدون علیہ الصلوٰہ و السلام نہ لیتے تھے ۔ اسلام حضرت یسوع مسیح کی ملہم و مبعوث ذات کو خوب پہچانتا ہے اور ان کو دلی عزت و حرمت کی نظر سے دیکھتا ہے ۔ غرضکہ مسلمان دین مسیحی سے تو ناواقف نہ تھے مگر اپنے دین کو اور ادیان کے ساتھ اس پر ترجیح دیتے تھے ۔ لیکن جب وہ مسیحیوں سے ''لکم دینکم ولی دین'' سے پیش آتے تھے تو پھر حضرات آخرالذکر کے لیے نا برداشتنی اذیات جھیل کر اپنے آپ کو راسخ العقیدت ثابت کرنے کا کون موقع تھا ، یہ سراسر انہیں کا قصور تھا ۔ جہاد سے درجہ شہادت حاصل کرنے کا ان کو سردست کوئی شرعی حیلہ نہ ملتا تھا ، جب کہ رسوم و فرائض مذہبی ادا کرنے کی ان کو پوری آزادی تھی . . . . عام مسیحی ہر طرح مطمئن اور آسودہ حال تھے . . . عملاً مذہبی قصیے چھیڑنا یا توہین مذہب سے دوسروں کا دل دکھانا مسیحیوں کے افعال شائستہ نہیں ہو سکتے ۔ جس قانون کی خلاف ورزی صریحاً سزائے موت ہو اس سے دیدہ و دانستہ تجاوز کرنا خودکشی ہے نہ کہ شہادت ۔''[1]

سطور ما قبل میں بیان ہوا کہ یہ تحریک امیر عبدالرحمٰن ثانی کے عہد میں پادریوں کے ایک مخصوص گروہ نے شروع کی جس کا سرغنہ یولاجیس تھا اور الویرو نامی ایک دولت مند عیسائی اس کی پشت پناہی کرتا تھا ۔[2] بقول لین پول :

''مسلمانوں کے دین کی توہین کرنا اور اپنے مسیحی بھائیوں کے تن بے جان میں مذہبی حمیت کی روح پھونکنا اس (یولوجیس) کے مقاصد زندگی تھے ۔ الویرو قرطبہ کا ایک نوجوان دولت مند چند پرجوش راہبوں اور قسیسوں کی ایک مختصر سی جمعیت مع چند بازاری دکانداروں کے اس کی کوششوں کے نتیجے میں اس کے ہمدرد و رفیق تھے ۔''[3]

سکاٹ نے ''ہسٹری آف دی مورش ایمپائر ان یوروپ'' میں یولاجیس کی اس تحریک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

''جو لوگ کسی جرم میں قتل کیے گئے ہوں وہ مظلوم نہیں کہلا سکتے ، یہ فرقہ مجرمین کا تھا

۱- لین پول : ص ۸۳ ، ۸۴ ترجمہ ، ص ۱۲۵ تا ۱۲۸ -
۲- حتی : History of the Arabs، ص ۵۱۵ ، ۵۱٦ -
۳- لین پول : ص ۸٦

"شہدا" کا نہ تھا۔ یہ لوگ بطوع خاطر اپنے آپ کو مہلکہ میں ڈالتے تھے اور اپنی جانیں دیتے تھے۔ وہ اسلام کو بت پرستانہ دین اور جھوٹا مذہب کہتے تھے۔ حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں گستاخیاں کرتے تھے۔ جب مادنہ کا موذن اذان دیتا تھا تو وہ بآواز بلند کہا کرتے تھے کہ "خدایا ہمیں شیطان کی آواز سے دنیا اور آخرت میں محفوظ رکھ"۔ ایسے جوش شہادت میں وہ عدالتوں میں گھس جاتے تھے اور قاضی کے سامنے کلمات کفر بکتے تھے . . . یہ جرائم ایسے تھے کہ نہ وہ خفیف کہے جا سکتے تھے، نہ قابل معافی تھے۔

شروع شروع میں تو حکام فوجداری حیران ہو کر رہ جاتے تھے اور انہیں ان لوگوں پر رحم آتا تھا، اس لیے انہوں نے ان کو اس بنا پر سزا دینے سے انکار کر دیا کہ یا تو یہ مخمور ہیں یا مخبوط، لیکن یہ لغو لوگ اس رعایت کی کب پروا کرنے والے تھے۔ قید کیے گئے تو وہاں بھی انہوں نے اپنی بکواس کو جاری رکھا . . یہ وبا تمام قرطبہ میں پھیل گئی۔ نبی اکرم و اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب و شتم کرنے سے زیادہ اب کسی بات میں عزت و حرمت باقی نہیں رہ گئی تھی لیکن اس "ثواب عظیم" کے کام میں نادری نمایاں نہ تھی۔ جب ان کے مریدین نطیب خاطر موت کے منہ میں جا رہے تھے، تو وہ اپنی قیمتی جانوں کو مصیبت میں کیوں پھنساتے، اور ایسی خلاف قانون حرکتیں کیوں کرتے جس سے ان کا منصب، ان کی جان، ان کا حال معرض زوال میں آ جاتا، البتہ پوشیدہ طور پر وہ اس جنون کو اپنی دعاؤں اور پند و وعظ کے ذریعے بھڑکاتے رہتے تھے۔ ان شہدا کی جو عزت و عظمت کی جاتی تھی اس سے اس بیہودہ جذبے میں اور بھی ابال اٹھتا تھا۔ رومی اور ایسٹریائی کلیسا کی منظوری کے بغیر اندلسی کلیساء فوراً ان مرنے والوں میں سے ہر ایک کی تقدیس کر دیتا تھا۔ مسلمان حکام اپنی رعایا کے اس عجیب و غریب ڈھونگ کو دیکھ کر حیرت زدہ تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس آفت کو رحم کرکے دبائیں یا سزائیں دے کر فرو کریں۔ اس امید سے کہ شاید یہی ترکیب کارگر ہو جائے، عبدالرحمن ثانی نے ایک حکم عام جاری کر دیا کہ جو عیسائی کلمات کفر بکے اس کو فوراً قتل کر دیا جائے، اس حکم سے اگرچہ مقصود اصلی حاصل نہیں ہوا مگر اتنا ضرور ہوا کہ شہدا کی تعداد میں کمی آ گئی لیکن مرتدین اور جلاوطنوں کی تعداد بڑھ گئی۔

غنیمت تھا کہ یہ مراق، جو خود کشی کو بڑھا رہا تھا، دارالخلافہ کی تمام آبادی میں نہیں پھیلا تھا۔ بہت سے لوگ ایسی ترکیب اختیار کرنے کے سخت بر خلاف تھے جس کا آخری نتیجہ یہ ہو کہ تمام قوم پر آفت آ جائے۔ آس پر اور قسم کے دار پڑ جائیں اور جتنی رعایتیں اس کو ملی ہوئی ہیں وہ سب یک لخت چھین لی جائیں . . . آخر مجبور ہو کر کچھ ہوشمند عیسائیوں نے خلیفہ سے، بذریعہ عرضداشت، درخواست کی کہ فوراً ایک دینی کونسل منعقد کرائی جائے اور اس موقع بابتہ کے متعلق جو کچھ فیصلہ وہ کونسل کر دے اس کو ناطق قرار دیا جائے۔ چنانچہ ملک محروسہ کے تمام اسقفوں اور پادریوں کو طلب کیا گیا۔ عبدالرحمن نے گومیز نامی ایک عیسائی کو اپنا قائم مقام مقرر کیا . . . کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ جو لوگ اب تک "شہید" ہو چکے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور آیندہ کے واسطے یہ ناجائز قرار دے دیا جائے . . . فرقۂ انتہا پسند نے (جس کا سرگروہ سینٹ یولاجیس تھا) صاف طور پر اعلان کر دیا کہ کونسل نے جو کچھ فیصلہ کیا ہے وہ ان کے بطون کے بالکل خلاف ہے . . . پادری اپنے اندھے مقلدین کے جوش کو ابھارتے رہے، جوشیلے لوگ برابر مسجدوں کی بے حرمتی، قضاۃ کی توہین کرتے اور اپنی جانیں دیتے رہے . . . . بہت سے پادری گرفتار کرکے قید کر دیے گئے اور اکثر بمشکل تمام روباہ بازی کرکے حکام کی داروگیر سے بچ نکلے۔ ان ہی لوگوں میں سینٹ یولاجیس بھی تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو اپنے رفیقوں سمیت "شہادت" کو سب سے بڑا ثواب کا کام سمجھتا تھا مگر اسی وقت تک کہ جب تک دوسرے آدمی مرتے رہے . . . . "[1]

سکاٹ اور لین پول کے ان اقتباسات کے ذریعے فلورا فلورنڈا میں مذکور شرر کے بہت سے

۱۔ سکاٹ : ترجمہ محمد خلیل الرحمن، اخبار الاندلس، ج ۳، ص ۲۱۳ تا ۲۱۸

بیانات کی تصدیق ہو جاتی ہے ۔ ایک تو یہ کہ بعض خود غرض پادریوں کا گروہ عیسائیوں کو اس بے ہودہ فعل پر اکساتا تھا ۔ اس گروہ کا سرغنہ یولاجیس تھا ۔ یہ پادری خود پس منظر میں رہتے تھے ۔ مسلمان حکام نے اول اول ان مجانین کے ساتھ بہت نرمی برتی لیکن بالآخر امیر عبدالرحمن ثانی نے ان کے قتل کا حکم دیا ۔ عیسائی اسقفوں اور پادریوں کی کانفرنس طلب کی گئی اور اس کانفرنس نے مجانین کے قتل کرنے کے فیصلے کی تصدیق کی لیکن یہ کانفرنس عیسائیوں کی درخواست پر امیر نے طلب کی تھی نہ کہ قاضی نے جیسا کہ ناول میں بیان ہوا ۔ ان اقتباسات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عام عیسائی اس فتنے سے الگ ، پرامن اور حکومت کے رویے سے مطمئن تھے ۔

جہاں تک یولاجس کے بارے میں شرر کے بیان کا تعلق ہے اس کے بیشتر حصے صحیح ہیں لیکن یہ امر درست نہیں کہ یولاجیس امیر عبدالرحمن ثانی کے عہد میں قتل ہوا یا اس طریقے سے قتل ہوا جیسا شرر نے بیان کیا ہے ۔ نیز یہ امر بھی تاریخ سے متصادم ہے کہ یولاجیس غائب ہوگیا تو پھر حکومت کی تلاش کے باوجود نہ مل سکا ۔ یہ امر بھی درست نہیں کہ فلورا اور یولاجیس ایک ساتھ قتل ہوئے ۔ فلورا یولاجیس سے آٹھ سال پہلے ۸۵۱ء میں امیر عبدالرحمن ثانی کے عہد میں قتل ہوئی جب کہ یولا جس ۸۵۹ء میں سلطان محمد بن عبدالرحمن ثانی کے عہد میں پریوی کونسل کے حکم سے قتل ہوا ۔ یولاجس کے ساتھ جو عورت قتل ہوئی وہ لکریتیا تھی اگرچہ اس کا بھی فلورا کی طرح ارتداد کا جرم تھا اور وہ بھی گھر سے یولاجیس اور اس کی بہن انولا نے اغوا کرائی تھی ۔ لین پول کے درج ذیل اقتباس سے صحیح صورت سامنے آتی ہے :

”یولاجیس کے خاص خاص عقیدت مندوں میں فلورا نامی ایک مخلوط النسل پری جمال دوشیزہ بھی تھی۔ اس کی ماں نے جو مسیحی مذہب رکھتی تھی اس کو اس قدر پوشیدہ طور سے اپنے مذہب پر تعلیم و تربیت دی تھی کہ سالہا سال فلورا کو کسی نے مسیحی نہ جانا، مگر آخرکار جس جوش نے یولاجیس کو جاں نثار اور حامی مذہب بنایا وہ نوعمر لڑکی کے دل میں بھی نشو و نما پانے لگا . . . ایک روز اپنے بھائی کے گھر سے بے خبر نکل بھاگی اور مسیحیوں میں جا چھپی ۔ بھائی نے ہرچند جستجو کی مگر کہیں سراغ نہ لگا ، آخر جب بہت سے قسیس بھگا لے جانے کے جرم میں ماخوذ ہو کر محبس میں بھیجے گئے اور فلورا کو اپنے قصور کی پاداش میں دوسروں کی اذیت پسند نہ آئی تو خود بخود گھر آ گئی اور برملا مسیحی کلمہ پڑھنے لگی ۔ اب تو اس کے بھائی کے ہوش اڑ گئے اور اس نے ہرچند زجر و توبیخ کے ساتھ اس کو ایسے بیان سے باز رکھنا چاہا مگر اس کی ضد سے تنگ ہو کر قاضی شہر کے پاس لایا ۔ یہاں فلورا پر ارتداد کا جرم قائم ہوا کیونکہ مسلمان کا بچہ خواہ مسیحی ماں کے بطن سے ہو شرع محمدی میں مسلمان سمجھا جاتا ہے اور ارتداد کی شرعی سزا موت ہے مگر بایں ہمہ فلورا جب ملزمہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوئی تو مجسٹریٹ نے اس کی بدنصیبی پر سخت افسوس کیا اور ہرچند کہ وہ فتوائے موت دینے پر قانوناً مجبور تھا لیکن قید تک کا حکم نہ دیا بلکہ صرف شدید جسمانی عقوبت دینے کے بعد بھائی کے سپرد کر دیا تاکہ گھر لے جا کر دین اسلام کی تلقین کرے مگر ثابت قدم لڑکی نے یہاں آ کر پھر وہی مصدر گردانا شروع کر دیا اور ایک روز بھاگ کر اپنے ہم مذہب رفیقوں میں جا چھپی یہاں وہ اول مرتبہ یولاجیس کی زیارت سے مشرف ہوئی . یہاں سے فلورا اور اس کی ایک بہن جو اس کی ہمدرد اور ہم خیال تھی ایک محفوظ مکان میں لے جا کر چھپا دی گئیں . . . . اسی اثنا میں قرطبہ کے مسیحیوں کا شوق شہادت یوماً فیوماً ترقی پکڑتا جاتا تھا۔ اول بسم اللہ پرفکٹس نامی ایک پریسٹ (قسیس) نے کی ۔ اس نے جوش وحشت میں اسلام کی توہین کی اور اس کی سزا میں عین عیدالفطر کے دن قتل ہوا۔ عیسائیوں نے اسے ”شہید ڈائی گلوشن“ کا خطاب دے کر شاہ ولایت بنا دیا۔ اس واقعے کے بعد ہی ایک راہب مسمی اسحق قبول اسلام

آخر اسحق قتل کے بہانے قاضی شہر کے پاس آیا . . اور درشت الفاظ میں مذہب کی توہین کرنے لگا . . .
نے پیغمبر اسلامؐ کی توہین کی اور قتل ہوا ، انہیں دنوں میں سلطان کے باڈی گارڈ کے ایک سپاہی ساھجو
ہوا ، اگلے اتوار چھ اور راہب اسی طرح قتل ہوئے اور پھر تین مرید . . غرض ۱۸۵۱ء کے موسم گرما کے
دو مہینے میں گیارہ شخصوں نے "جام شہادت" نوش کیا ۔"

"حکومت نے جب کونسل کے فیصلے کے مطابق تمام مفسد سرداروں کو قید کر دیا تو ان کے ساتھ
بولاجیس اور فلورا کو بھی محبس کی سیر کرنی پڑی ۔ (فلورا اس طرح محبس گئی کہ) ایک دن جب وہ گرجا
میں نہایت خضوع اور خشوع کے ساتھ تسبیح اور تہلیل میں مشغول تھی تو اس نے اپنے برابر ایک اور ہم
خیال عفیفہ کو دیکھا جو اسی اسحق کی بہن تھی جو شروع میں شہید ہوا تھا ۔ بیری اس وقت بڑی تضرع
اور زاری سے ہاتھ اٹھائے اپنے جنت مکانی بھائی کے جلیس ہونے کی دعا مانگ رہی تھی ، یہ دیکھ کر فلورا
نے بھی اس کا ہم سفر بننا چاہا اور دونوں وہاں سے اٹھ کر سیدھی قاضی صاحب کے مکان پر پہنچیں اور
حسب معمول جہاں تک ہو سکا اسلام اور بانی اسلام کی توہین کرنے لگیں جس سے صرف یہ مقصود تھا کہ
قاضی برانگیختہ ہو کر موت کا فتویٰ دے دے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر سلیم الطبع قاضی ایسا تنگ ظرف نہ
تھا کہ بچوں کا کہا بدلا ہو جاتا ۔ اس قسم کے لایعنی جملے سنتے سنتے اور مجنونانہ حرکات دیکھتے دیکھتے
اس کا جی اکتا گیا ، وہ اکثر ایسے موقعوں پر جب کہ کوتاہ اندیش لوگ خود موت کے منہ میں چلے آتے
تھے وہ مجبور ہو جاتا تھا ۔ چنانچہ اس وقت بھی بجائے برانگیختہ ہونے کے اسے لڑکیوں کی اٹھتی جوانی پر
رحم آ گیا ، اس نے ہر چند کوشش کی کہ وہ ان ہرلیات سے باز آئیں اور جو کچھ کہہ چکی ہیں اس کو واپس
لے لیں یا کم از کم یہی خیال کریں کہ اس نے سنا ہی نہیں ، مگر افسوس کور عقل لڑکیاں سفر آخرت کا
احرام باندھ کر آئی تھیں کیسے باز رہتیں اور کیوں کر اپنے دلیر ارادے کو فسخ کرتیں ، آخر تنگ ہو کر
قاضی نے ان کو قید خانے میں بھیج دیا ۔

قید کے دراز اور بظاہر ختم نہ ہونے والے زمانے نے "جام شہادت" کی تشنہ لڑکیوں کے حوصلے آخر
پست کر دیے اور وہ اسی طرح شش و پنج میں تھیں کہ اپنے دلی ارادے کو کس طرح فسخ کریں ۔ ان
کے مذہب کو استحکام سے بچانے اور ان کی جانیں لینے کے لیے کہیں سے یولاجس اور آمد ہوا ۔ اس شخص
کا دل اس کے کام کی مانند نہایت سخت تھا ۔ ایک عورت کو جس پر وہ ہزار جان سے نثار تھا ، جرأت
دلا کر مرنے پر راضی کرنا اسی کا کام تھا ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اپنا تمام وقت لکھنے پڑھنے میں گزارتا تھا تاکہ
مذہب کو ... اس کی محبت اور اس کی قریب پہنچی ہوئی ساعت ناگزیر کا دلخراش افسوس اس کو مذبذب
پری جمال فلورا کی محبت اور اس کی قریب پہنچی ہوئی ساعت ناگزیر کا دلخراش افسوس اس کو مذبذب
الارادہ نہ کر دے ۔ ۔ ۔ ۔ بالآخر جب قاضی صاحب کی بے تابانہ کوشش ان لڑکیوں کا نوشتۂ تقدیر نہ مٹا
سکیں تو ناچار فتوائے موت سنا دیا (۲۴ نومبر ۱۸۵۱ء) ۔ ۔ ۔ ۔ اس واقعہ کے بعد جلد یولاجیس اور دوسرے
قسیس بھی قید سے رہا ہو گئے ۔ اگلے برس عبدالرحمن نے بھی قید حیات سے مخلصی پائی اور محمد
$\left(\frac{۲۳۸ھ}{۸۵۲ء} \text{ تا } \frac{۲۷۳ھ}{۸۸۶ء} \right)$ اپنے فرزند کو جانشین چھوڑا ۔ ۔ ۔ ۔ یولاجیس کی نظر میں خدا جانے کس قیامت
کا سحر آفریں اثر تھا کہ جدھر پڑتی تھی کارگر ہو جاتی تھی ۔ ایک پاک دامن فلورا کے زاہد فریب حسن اور اٹھتی
جوانی پر زمانہ ابھی پوری طرح ماتم نہ کر چکا تھا کہ دوسری فلورا کی سنائی آئی کہ ایک اور دوشیزہ اپنے
والدین کو چھوڑ کر یولاجیس کے حلقۂ ارادت مندی میں داخل ہوئی اور حسب معمول جرم ارتداد میں
ماخوذ ہو کر قاضی صاحب کی عدالت میں مع اپنے اتالیق کے پیش کی گئی ۔ یولاجیس پر مجرم اصل کو
اغوا کرنے کا جرم قائم اور بموجب دفعہ تازیانہ تجویز ہوئی ۔ (اس پر یولاجیس نے بھی بانی اسلام کی شان
میں گستاخی کی ، مسئلہ پریوی کونسل کے سپرد ہوا اور بہت سمجھانے پر بھی جب یولاجیس باز نہ آیا تو)
۱۱ مارچ ۱۸۵۹ء کو قتل ہو کر اپنے حواریین سے جا ملا ۔"[1]

۱۔ لین پول : ص ۸۳ تا ۹۵ ، ترجمہ حامد علی صدیقی ، ص ۱۲۹ تا ۱۴۲ ۔

ان مفصل بیانات سے یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ شرر نے فلورا کے قتل اور پیرینیز کی گھاٹیوں میں روپوشی نیز ہسلن کی دوستی کے واقعات رنگ آمیزی کے لیے تخلیق کیے ، زیاد کا کردار ، اور ابو مسلم یا الفانسو کا کردار بھی اسی زمرے میں آتا ہے ۔ فلورنڈا کا کردار اس عورت سے لیا گیا ہے جس کے ساتھ فلورا روپوش رہی ، لین پول کے زیر نظر اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ "دوسری بہن" غالباً فلورا کے دوسرے بار کے اغوا میں ملوث تھی اس لیے وہ بھی روپوش رہی ۔ شرر نے ناول میں یولاجیس کی فلورا سے محبت کا جو منظر دکھایا ہے زیر نظر اقتباس میں بھی اس کے بارے میں ہلکے ہلکے اشارے ملتے ہیں ، جہاں تک فلورا اور یولاجس کے ساتھ قتل ہونے کا مذکور ہے یہ التباس غالباً شرر کو اپنے ماخذ کے کسی ایسے ہی فقرے سے ہوا ہوگا جیسا لین پول نے لکھا ہے کہ ایک فلورا کے بعد دوسری فلورا کی داستان منظر عام پر آئی ، اس دوسری لڑکی کا جو آخر میں یولا جیس کے ساتھ قتل ہوئی ، ڈوزی وغیرہ لکریتیا نام بتاتے ہیں ۔

یہاں یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شرر کے ناول سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مجانین کی اس تحریک میں سینکڑوں ہزاروں لوگ قتل ہوئے، یہ درست نہیں۔ قرطبہ میں کل چوالیس افراد قتل ہوئے[1] ۔ شرر نے ناول میں بیان کیا ہے کہ قتل ہونے والوں میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی ، کتب تواریخ اس امر کی تصدیق کرتی ہیں اور اس کے لیے جو وجہ شرر نے بیان کی ہے سکاٹ کے ایک بیان میں اس کی طرف اشارہ نکلتا ہے ۔ سکاٹ لکھتا ہے :

"علامہ فلوریز نے صرف چوالیس آدمیوں کا قرطبہ میں سزائے موت پانا لکھا ہے ۔ ان میں سے بہت سی عورتیں تھیں ۔ اس مقدس مورخ نے بسیط طور پر یہ لکھا ہے کہ ان عورتوں اور ان کے مقدس اور پر جلال رفیق "شہدا" کے آپس میں "رمز آمیز تعلقات صہریت" تھے ۔"[2]

سرر نے خانقاہوں کی اندرونی بدکاریوں کے متعلق جو بیانات لکھے ہیں وہ حقیقت پر مبنی ہیں اور خود عیسائی مورخین کے یہاں پادریوں کی ان سیہ کاریوں اور راہبات کی بدکاریوں کا رونا ملتا ہے ۔ سکاٹ ، ڈوزی اور لین پول کی تصانیف اس کا ثبوت ہیں ۔ شرر نے ناول میں بعض مشہور مسلمان شخصیتوں کا ذکر بھی کیا ہے، تاریخی شواہد کے مطابق ان میں یحییٰ بن یحییٰ لیثی کو عبدالرحمن اور اس کے والد کے عہد میں بہت بلند مرتبہ حاصل تھا ۔ یحییٰ امام مالک کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور امام مالک کی موطا کو انھیں کے طفیل افریقہ و اندلس میں فروغ نصیب ہوا[3] ۔ یحییٰ بن حکم الغزالی اس دور کے مشہور شاعر تھے اور امیر عبدالرحمن نے انھیں شاہ قسطنطنیہ کے پاس سفیر بنا کر بھی بھیجا تھا[4] ۔ عبدالرؤف امیر حکم کے زمانے میں وزیر رہ چکے تھے اور امیر عبدالرحمن ثانی نے انھیں مختلف بغاوتوں کے فرو کرنے پر وقتاً فوقتاً مامور کیا تھا[5] ۔ مریدہ کا محاصرہ بھی عبدالرؤف نے ہی کیا تھا ۔ ناول کے دوسرے باب میں طلیطلہ کی سرکشی کا ذکر بھی صحیح ہے ۔ زریاب مغنی کی مشہور و معروف شخصیت پر تواریخ اندلس میں مفصل مواد ہے ۔ شرر نے ناول میں شہزادہ محمد کی ولی عہدی کا جشن دکھایا

۱- سکاٹ : اخبار الاندلس (ترجمہ)، ج ۳ ، ص ۲۱۸ و حتی : History of the Arabs ، ص ۵۱٦ -
۲- سکاٹ : اخبار الاندلس (ترجمہ)، ج ۳، ص ۲۱۷ - ۳- ایضاً، ج ۱ ، ص ۳۸۲ -
٤- ایضاً ، ج ۱ ، ص ۳۸۳ - ۵- ایضاً ، ح ۱ ، ص ۳۸۸ -

ہے، یہ امر تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا، تاریخ کی رو سے امیر نے باقاعدہ اعلان نہیں کیا تھا[1] -

امیر عبدالرحمن کے عہد میں رفاہی تعمیراتی کاموں کا جو ذکر شرر نے کیا ہے وہ درست ہے - قرطبہ کے مشہور محلات ، پل وغیرہ سب کتب تواریخ و جغرافیہ سے ثابت ہیں[2] -

۶- ایام عرب

شرر کا یہ ناول دور جاہلیہ کی عربی تاریخ و تہذیب سے متعلق ہے - ناول دو جلدوں میں چھپا ، آخری حصہ ۱۹۰۰ء میں مکمل ہوا - ناول میں بیان کردہ واقعات کا خلاصہ یہ ہے : ہجرت نبوی ؐ سے تقریباً چالیس برس قبل ذیقعدہ کی ۱۵ تاریخ کو مکہ معظمہ سے دس میل کے فاصلے پر شہر طائف اور قصبہ نخلہ کے درمیان عکاظ نامی ایک چھوٹے سے دشت میں ایام جاہلیت کا مشہور بازار "سوق عکاظ" لگا ہوا تھا ، جس میں ہر طرف سے قبائل عرب آ کر جمع ہوتے تھے - ان دنوں مشاعرے اور دیگر کمالات کا مظاہرہ ہوتا تھا - جملہ قبائل عرب اس مہینے کو محترم اور اس میں قتل و غارت کو حرام سمجھتے تھے ، اس لیے ہر شخص اس بازار میں آنے سے پہلے اپنا اسلحہ نامی گرامی سردار عرب عبداللہ بن جدعان کے پاس رکھوا دیتا تھا - سوق عکاظ کے مشاعرے میں مشہور شاعر عرب نابغہ ذبیانی نے اپنا مشہور قصیدہ پڑھا ، جس میں نعمان بن منذر فرمانروائے حیرہ کی محبوبہ کے حسن کی تعریف تھی - قصیدے نے ایک نوجوان زہیر پر بہت اثر کیا ، اسے اس کا دوست عمرو بن لبید وہاں سے اٹھا کر اپنے خیمے میں لے آیا - یہ دونوں نوجوان بنی طے کی شاخ بنی عدرا سے تعلق رکھتے تھے - عمرو کے استفسار پر زہیر نے بتایا کہ چھ ماہ پہلے ارض حیرہ میں نعمان بن منذر کے دربار میں اس کی بیٹی حسنہ سے اس کا آمنا سامنا ہوا ، دونوں نے ایک دوسرے کے لیے کشش محسوس کی ، چند دن بعد ایک عورت حسنہ کو کسی بہانے زہیر سے ملانے اس کے گھر لے آئی ، نابغہ ذبیانی کے قصیدے نے وہی منظر یاد دلا دیا تھا - عمرو نے بتایا کہ ایسا ہی اثر اس پر پہلے دن علقمہ کے قصیدے نے کیا تھا اور اب وہ ملک غسان حارث اعرج کی بیٹی حلیمہ کا نادیدہ عاشق ہوگیا ہے - دونوں نے وعدہ کیا کہ ایک دوسرے کی کامیابی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے اور ایک ساتھ شادی کریں گے - یہ باتیں اسی خیمے میں بیٹھی ہوئی نوجوان خوبصورت عورت خولہ بنت عمیر بن عامر ثعلبیہ بھی سن رہی تھی - خولہ لبید بن صعصعہ کی منکوحہ تھی اور دو برس پہلے اس کے انتقال پر عمرو کو وراثت میں ملی اور اس کی بیوی بنی - حلیمہ کے بارے میں عمرو کی گفتگو سن کر خولہ کی طبیعت مکدر ہوئی اور وہ دل میں عمرو سے علیحدگی اختیار کر لینے کا فیصلہ کرکے خیمے سے نکل گئی -

سوق عکاظ میں عمرو اور زہیر کی ملاقات طلح بن مرہ کلبی سے ہوئی - طلح کے دادا کے بھائی کو زہیر کے پردادا نے قتل کیا تھا - زہیر کا حسب نسب جان لینے پر طلح کے دل میں انتقام کا جذبہ جوش مارنے لگا ، لیکن سوق عکاظ میں زہیر کے قبیلے کے حلیفوں کا غلبہ تھا اس لیے طلح زہیر کو کسی بہانے ارض بنی غسان میں لے جا کر قتل کرنے کے منصوبے پر غور کرنے لگا - اسی شام خولہ بنت عمیر کو طلح نے چند غنڈوں سے چھڑایا اور اپنے ساتھ لے گیا - خولہ سے اس کے حالات سنے ، طلح نے اس سے شادی کر لینے کا وعدہ کیا اور دونوں نے مشورہ کیا کہ خولہ

۱- ایضاً ، ج ۱ ، ص ۵۰۹ -   ۲- ایضاً ، ج ۱ ، ص ۴۹۸ تا ۵۰۳ -

شاہ حارث کے پاس چلی جائے (جس کا طلح ندیم خاص تھا) اور اس کے دل میں فرمانروائے حیرہ کی بیٹی حبیبہ کی محبت پیدا کرے ۔ اس طرح وہ حارث کے ہاتھوں اس کی محبوبہ اور بیٹی دونوں کے عاسقوں کو قتل کرا کے اپنا انتقام لے سکیں گے ۔ اس تجویز کے مطابق خولہ دولت غسان کے کچھ سپاہیوں کے ساتھ سوار کرا کے رخصت کر دی گئی ۔

دوسرے دن طلح نے زبیر اور عمرو کا قرب حاصل کر لیا ۔ زبیر کے والد سے اپنی دوستی کی جھوٹی داستانیں قسمیں کھا کھا کر سنائیں اور دونوں کا ہمراز بن کر مشورہ دیا کہ وہ اس کے ساتھ حارث کے پاس چلیں، عمرو کی آرزو تو وہ فوراً پوری کرا دے گا اور زبیر کے لیے وہ حارث کو نعمان سے لڑا کر، حبیبہ پر قبضہ کرا لے گا ۔ غرض اس نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے دونوں کو آمادہ کر لیا اور دوسری صبح تینوں ارض غسان کی طرف روانہ ہوگئے ۔

حارث بن ابی شمر غسانی المقلب بہ حارث اعرج غسانی خاندان کا بیسواں بادشاہ تھا اور بہت مشہور اور فیاض سالہان عرب میں شمار ہوتا تھا ۔ اس کے ملک کے شمال مغرب کی طرف حیرہ کا ملک تھا جہاں کا بادشاہ نعمان بن منذر تھا ۔ حیرہ کی حد عراق یا اس زمانے کی ساسانی سلطنت سے ملتی تھی اور وہاں کا فرمانروا دولت عجم کی منظوری سے مقرر ہوتا تھا ۔ نعمان بن منذر بھی سوکت و فیاضی میں اپنے ہمسایہ فرمانروا حارث کا حریف تھا لیکن حارث کے دربار میں فوجی قوت و سجاعت اور نعمان کے دربار میں نمائش اور سوکت کا زور تھا ۔ چند دن پیشتر نعمان نے حارث پر بیس ہزار کے لسکر سے حملہ کیا لیکن ہزاروں لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگا ۔ اس فتح کے پانچویں دن حارث کے دربار میں جشن منایا گیا ۔ اس موقع پر طلح بھی دربار میں پہنچ چکا تھا ۔ جب قیدیوں کے قتل کا حکم سنایا جا رہا تھا تو طلح نے ان میں حیرہ کے مشہور شاعر عروہ طائی کو بھی دیکھا اور اس کی سفارش کرکے جان بخشی کرا لی ۔ طلح نے بادشاہ کے سامنے خولہ کی دانشمندی کی تعریفیں کیں اور اس کا بادشاہ کی مصاحبت میں رہنا انتہائی سود مند بیان کیا ۔

خولہ نے بادشاہ کو اپنی داستان غم سناتے ہوئے نعمان کے خلاف نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کی بہن مدقون نعمان کے محل میں رہتی تھی جسے اس نے بے عزت کرکے محل سے نکال دیا اور وہ اسی غم میں مر گئی، اس طرح خولہ نعمان اور اس کی ماں ماریہ کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ۔ اس واقعہ کے ایک ہفتے بعد حارث کی بیٹی حلیمہ قصر کی ایک کھڑکی میں کھڑی پہاڑوں کے منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی ۔ اس نے خولہ کی توجہ ایک سوار کی طرف دلائی جو بڑی دیر سے سامنے کے پہاڑی راستے پر آ جا رہا تھا ۔ خولہ نے عمرو کو پہچان لیا ، خوفزدہ ہوئی اور شہزادی کو بتایا کہ وہ اس کا ایک ہم وطن اور نہایت بد ذات شخص ہے ۔ شہزادی کو خولہ کی اس بات کا یقین نہیں آتا تھا کیونکہ عمرو صورت سے بھلامانس انسان دکھائی دیتا تھا ۔ اس نے دوبارہ غور سے دیکھا اور عمرو اور حلیمہ کی نظریں چار ہوئیں ۔

خولہ نے تنہائی میں حارث سے ملاقات کے دوران نعمان بن منذر کی بیٹی حبیبہ کا ذکر کرکے اس کے حسن کا ایسا پرزور نقشہ کھینچا کہ حارث بے قرار ہوگیا ۔ طلح کو مشورے کے لیے طلب کیا گیا اور طے پایا کہ عروہ طائی کو نعمان کے پاس پیغام دے کر بھیجا جائے ، عروہ طائی کے بھیجنے سے نعمان ممنون بھی ہوگا ۔ چنانچہ عروہ طائی حارث کا خط لے کر ایک غسانی دستے کے ساتھ نعمان کے پاس روانہ ہوگیا ۔

عروہ کو گئے دو ماہ ہوگئے لیکن کوئی جواب نہ آیا ۔ اس دوران عمرو اور زہیر کی طلح کے ذریعے دربار تک رسائی ہوئی اور وہ باقاعدگی سے دربار میں حاضر ہونے لگے ۔ ایک روز دربار میں حلیمہ اور عمرو کا پھر آمنا سامنا ہوا ۔ اسی اثنا میں عروہ نعمان کی طرف سے منظوری کا خط لے کر آ گیا ۔ حارث نے شہزادی کو لانے کے لیے ایک ہزار سواروں کے جلوس کے ہمراہ دو سو اونٹ اور قیمتی ہدایا عروہ کے ساتھ بھیجے ۔ ادھر طلح کی کنیز مرجانہ نے طلح سے متنفر ہوکر زہیر اور عمرو سے ان کے مکان پر ملنا شروع کر دیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ وہ حلیمہ کو عمرو پر مائل کر دے گی ۔

نعمان بن منذر اپنے دربار میں ایرانی شہنشاہوں کی سی شان و شوکت پیدا کرنے کی کوشش میں ظالم ہو گیا تھا ۔ ایرانی تاجداروں کی تقلید میں اس نے بھی یوم قہر و غضب منانا شروع کر دیا تھا، جو بعد میں موقوف کر دیا گیا ۔ حارث کے پاس عروہ کے بھیجے کے چار ہفتے بعد نعمان حیرہ سے پانچ چھ کوس کے فاصلے پر ایک وادی میں خیمہ زن تھا، جہاں اس کی بیٹی حبیبہ، ماں سلمیٰ بنت وائل اور محبوبہ زینب بھی اس کے ہمراہ مقیم تھیں ۔ نعمان شکار کے لیے گیا ہوا تھا کہ اس کی ماں سلمیٰ بنت وائل نے زینب کو اپنی مدد پر آمادہ کرکے حبیبہ کی مشاطہ کلثوم کا بنایا ہوا ایک ایسا تیل حبیبہ کے ہاتھ منہ پر لگا دیا جس سے دو ماہ تک برص کی طرح کے داغ دکھائی دیتے تھے ۔ نعمان شکار سے لوٹا تو اسی دن عروہ بھی حیرہ سے ہوکر اسی وادی میں آ پہنچا ۔ حارث کی طرف سے خط، سو نوعمر غلام، سو پری جمال لونڈیاں اور دیگر تحائف پیش کیے ۔ خط میں حارث کی طرف سے جلدی کی تاکید تھی ۔ نعمان رخصتی کی تاریخ مقرر کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ زینب نے اسے تخلیے میں بلا کر بتایا کہ حبیبہ مبروص ہے شادی کر دینے سے بدنامی ہوگی ۔ نعمان نے خود جا کر حبیبہ کو دیکھا اور تمام تحائف اور لونڈی غلام عروہ کو واپس لے جانے کا حکم دیتے ہوئے حبیبہ کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا ۔

حارث کو جب اس انکار کی خبر پہنچی تو اس نے اصل وجہ کو چھپاتے ہوئے فوج کو تیاری کا حکم دے دیا ۔ خود قریب قریب کے قبائل کو جنگ میں شرکت کی دعوت دینے گیا اور چاروں طرف شترسوار دوڑا کے سب کو ارض حیرہ کی سرحد پر جمع ہونے کا پیغام دیا ۔ حکم ملتے ہی لوگ قصر کے گرد جمع ہونا شروع ہوگئے ۔ ایک رات حارث نے قصر سے نکل کر ان سے خطاب کیا اور دوسری صبح روانہ ہوکر اس وادی میں پہنچنے کا حکم دیا جہاں وہ جنگ سے پہلے ایک ہفتہ قیام کا ارادہ رکھتا تھا ۔

نعمان بن منذر کے دربار سے عروہ طائی کی واپسی کے ایک ماہ بعد ایک جشن کے دوران نعمان کو حارث کے لشکر کے جمع ہونے کی خبر ملی ۔ اس نے بھی اپنے لشکر اور قبائل کو سرحد پر پہنچنے کا حکم دیا اور خود بھی شاہی حرم کے ہمراہ شاہانہ ٹھاٹ باٹھ سے سرحد کی طرف روانہ ہوا ۔ دسویں روز وہ حارث کے لشکر کے وہاں پہنچنے سے پہلے اسی ہزار عربوں اور ایرانیوں کے لشکر کے ہمراہ خیمہ زن تھا ۔ حارث بھی قصر سے روانہ ہونے کے بیسویں روز ایک لاکھ سے زیادہ فوج کے ساتھ حیرہ کی سرحد پر پہنچا ۔ ایک تنگ درے سے میدان میں اترتے ہوئے شہزادی حلیمہ نے ہر قبیلے کے سردار کو خود عطر لگایا اور گلے میں ہار ڈالے ۔ عمرو کی باری آئی تو عمرو نے بے اختیار بڑھ کر شاہزادی کو گود میں اٹھا لیا ۔ اس گستاخی پر گرفتار ہوا ۔ حارث نے اسے حلیمہ کی سفارش پر یہ کہہ کر آزاد کر دیا کہ یہ شرفائے عرب سے ہے، اب سب قتل گاہ میں

جا رہے ہیں وہاں اس کی جرأت کا امتحان ہو جائے گا، اگر اس نے ناموری حاصل کی تو حلیمہ اسے بیاہ دی جائے گی ۔ اسی مقام پر عمرو نے شہزادی کی سہیلیوں کے گروہ میں خولہ کو بھی دیکھا اور اسے مرجانہ سے معلوم ہوا کہ وہ طلح کی بیوی ہے اور شاہی محل میں رہتی ہے ۔ شہزادی کو بھی خولہ کی اصلیت کا علم ہو گیا اور عمرو کے بارے میں ماریہ کو بھکانے کے منصوبے ناکام ہو گئے ۔

دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ حارث نے نعمان کی فوج کا جائزہ لے کر ارادہ کیا کہ جنگ کو دوسری صبح تک موقوف رکھا جائے ۔ زہیر نے وہاں جا کر حالات کا جائزہ لینے کی اجازت چاہی تو اسے ہدایت کی گئی کہ سواروں کا کافی گروہ ساتھ لے کر جائے لیکن عمرو اور زہیر تنہا نکل کھڑے ہوئے ۔ وہ ابھی تک اسی خیال سے سرفروشی کر رہے تھے کہ یہ جنگ طلح کے اس منصوبے کے تحت ہو رہی ہے جس کا اس نے سوق عکاظ میں ذکر کیا تھا ۔ عمرو اور زہیر کے نعمان کے لشکر تک پہنچتے پہنچتے رات آ چکی تھی ۔ وہ نعمان کے خیمے تک جا پہنچے اور پہلے ہی وار میں عجمی مرزبان اور بادشاہ کا ایک مصاحب ہلاک ہوئے ۔ چراغ بجھ گئے ، اندھیرے میں آپس میں تلواریں چل نکلیں جب کہ عمرو اور زہیر مرزبان کا سر کاٹ کر حارث کے لشکر تک آ پہنچے تھے ۔ اسے قدموں میں مرزبان کا سر دیکھ کر حارث نے ان کی جرأت اور دلیری کی بے انتہا تعریف کی ۔

مؤرخین کا خیال ہے کہ ایام عرب میں قبائل عرب اس معرکہ یعنی یوم حلیمہ سے زیادہ فوجیں کبھی نہیں لا سکے تھے ۔ لشکر صف آرا ہوئے تو نعمان کے قاصد پیغام لائے کہ پہلے شہزادے اور بادشاہ نبرد آزمائی کریں ۔ حارث مان گیا لیکن نعمان نے دھوکے سے ایک عجمی پہلوان کو شہزادہ بنا کر بھیجا جس کے ہاتھوں حارث کے دو بیٹے مارے گئے ۔ آخر عمرو نے اس پہلوان کا کام تمام کیا ۔ شمر بن حنفی نے اس فریب دہی پر احتجاج کیا اور اپنے گروہ سمیت نعمان سے جدا ہو کر حارث سے آ ملا ۔ باقاعدہ جنگ شروع ہوئی ۔ دونوں کے میسرہ تباہ ہوئے ۔ نعمان کی طرف سے قروۃ بن مسعود شیبانی مشہور تجربہ کار شہسوار مارا گیا ۔ حارث کا تیسرا بیٹا نعمان کے ہاتھوں ہلاک ہوا ، آخر زہیر نے نعمان کے بیٹے اور عمرو نے نعمان کا سر کاٹ کر نیزوں پر بلند کر دیا ۔ اہل حیرہ بھاگ نکلے ، زہیر ان کے تعاقب میں نکل گیا ، حارث نے طلح کو نعمان کے حرم کو گرفتار کر لانے پر مامور کیا ۔

نعمان کے چند وفادار خادم نعمان کے حرم کو وہاں سے نکال کر کچھ فاصلے پر ایک گھاٹی میں لے گئے تھے ۔ وہیں نعمان کی سربریدہ لاش لے جائی گئی ۔ عورتیں ابھی رو پیٹ رہی تھیں کہ طلح اپنے دستے کے ساتھ لاش لے جانے والوں کا تعاقب کرتا ہوا وہاں جا پہنچا ۔ اس نے حبیبہ کو زبردستی اٹھا لے جانا چاہا تو سلمیٰ کی آہ و زاری اور پردرد اشعار پر خود غسانیوں میں سے فحل بن نقیط اور اس کے ساتھی، بنی شیبان اور بنی کنانہ نے حبیبہ کی حمایت میں تلواریں کھینچ لیں اور آپس میں کشت و خون شروع ہو گیا ۔ اسی دوران زہیر بھی وہاں جا پہنچا اور حبیبہ کو گھوڑے پر بٹھا کر ایک سمت نکل گیا ۔ زہیر کو حبیبہ سے معلوم ہوا کہ حارث کی لشکر کشی کی اصل وجہ کیا تھی ۔ وہ حبیبہ کو بہت دور ایک بدوی کے خیمے میں ٹھہرا کر رات کو لوٹنے کا وعدہ کر کے پھر وادی صفر کی طرف روانہ ہو گیا ۔

حارث حبیبہ کے ہاتھ نہ آنے پر ملول تھا لیکن اس نے پھر بھی جشن کیا اور عمرو کی جرأت

کے صلے میں اسی وقت حلیمہ سے اس کی شادی کر دینی چاہی۔ عمرو نے حیلے بہانے سے صبح تک شادی ملتوی رکھنے کی اجازت لی۔ تخلیے میں اس نے حلیمہ کو زبیر سے کہا ہوا اپنا وعدہ بتایا۔ تھوڑی دیر میں انھیں مرجانہ کی زبانی علم ہوا کہ حارث نے زبیر کی گرفتاری اور قتل کا حکم دے دیا ہے۔ ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ زبیر وہاں جا پہنچا اور اس کے پیچھے ہی غسانی سپاہی اور افسر تھی۔ انھوں نے زبیر کو قید کر لیا اور قتل کے لیے لے جانا چاہا، اس پر عمرو مرنے مارنے پر تیار ہوگیا اور خود زبیر کو بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کی ذمے داری لے کر غسانی سپاہیوں کو رخصت کیا۔ زبیر سے عمرو کو بادشاہ کی برہمی کی اصل وجہ کا علم ہوا، دونوں دوست ہتھیار باندھ کر دربار میں پہنچے۔ بادشاہ نے زبیر کی گرفتاری کا حکم دیا اور لوگ بڑھنے لگے تھے کہ دونوں نے تلواریں کھینچ لیں اور بادشاہ سے قصور پوچھا۔ صبح تک کے لیے سزا ملتوی ہوئی۔ دربار سے لوٹ کر حلیمہ، عمرو، زبیر اور مرجانہ نے مشورے کیے۔ رات کے پچھلے پہر حلیمہ نے بادشاہ کے دو خاص انتہائی تیز رفتار گھوڑے ان دونوں کو دے کر لشکرگاہ سے نکال دیا۔ زبیر اور عمرو کے فرار سے حارث بہت خفا ہوا، اصطبل کے نگہبانوں کو غفلت کے جرم میں قتل کرا دیا۔ طلح اور خولہ نے وعدہ کیا کہ وہ زبیر اور عمرو کا سر لائیں گے اور حبیبہ کو زندہ بادشاہ کے سامنے حاضر کریں گے۔ مرجانہ حلیمہ کو ان سازشوں سے باخبر رکھتی تھی چنانچہ اب حلیمہ بھی وہاں سے نکل جانے پر آمادہ تھی۔ حارث دارالسلطنت کو لوٹ گیا۔

حیرہ سے چند فرسخ کے فاصلے پر زبیر، عمرو اور حبیبہ ایک تالاب کے کنارے فروکش تھے۔ طلح اور خولہ بھی وہاں پہنچ کر چھپے ہوئے تھے۔ ایک دن موقع پا کر انھوں نے حبیبہ کو زبردستی باندھ لے جانا چاہا۔ مرجانہ اور حلیمہ مردانہ لباس میں ادھر آ رہی تھیں، انھوں نے دیکھ لیا اور زبیر اور عمرو کو لے کر عین اس وقت جا پہنچیں جب طلح ایک جگہ شہزادی کو باندھنے میں مصروف تھا۔ دونوں گرفتار ہوئے لیکن آخر حبیبہ کی سفارش پر آزاد کر دیے گئے۔

خولہ اور طلح ان سے آزاد ہو کر چلے تو صحرا میں بھٹک گئے، پیاس سے بے دم تھے کہ ایک تیر طلح کی آنکھ میں آ لگا جو کسی نے ہرنوں کے گلے پر چلایا تھا۔ سوار نے آ کر بلا قصد تیر لگنے پر معذرت چاہی، پانی پلایا، آنکھ سے تیر کھینچا اور دونوں کو اپنے گھوڑے پر سوار کرکے لے چلا۔ پانچ چھ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ اپنے پڑاؤ میں پہنچا جہاں اس کے نوکروں نے استقبال کیا، طلح اور خولہ کو کچھ کھلا پلا کر سلا دیا گیا۔ یہ نوجوان سوار زید بن عدی تمیمی تھا جس کے باپ کی کوششوں سے نعمان حیرہ کا بادشاہ نامزد ہوا تھا لیکن بعد میں نعمان نے عدی کو قتل کرا دیا۔ طلح کی فتنہ جو طبیعت نے زید کے جوش انتقام کو بھڑکایا اور مشورہ دیا کہ پہلے وہ منذر بن نعمان کے ذریعے ساسانی دربار تک رسائی حاصل کرے۔ چنانچہ سب حیرہ کی طرف چلے۔ حیرہ میں بدستور سوگ ہو رہا تھا اور بد نظمی تھی۔ طلح منذر کے قصر کے آگے برہنہ ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔ منذر کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ایاس بن قبیصہ طائی ایران سے اپنے لشکر سمیت واپس آ رہا ہے اور خوف ہے کہ وہ طلح سے نئی طرح کے ایک قتل کا بدلہ لے گا۔ منذر کی بہن نے ایاس کی آمد کی خبر سنی تو پہلے تو خودکشی کی کوشش کی اور اس میں ناکام ہو کر بھائی کو یہ کہہ کر ایک کنیسے کی طرف چلی گئی کہ ایاس سے اپنی عزت بچانے کے لیے وہ مذہب تبدیل کرکے نن بن رہی ہے۔ منذر نے اپنی کس مپرسی کے باوجود طلح سے مدد کا وعدہ کیا اور

پھر طلح کے مشورے پر خولہ، طلح اور تین ساتھیوں کو لے کر شکار کے بہانے شہر سے چلا گیا تا کہ باہر رہ کر ایاس کی آمد کی اصل غایت سے با خبر ہو سکے ۔

ایاس بن قبیصہ دوسرے دن لشکر کے ساتھ آ پہنچا ، حیرہ کے پھاٹک زبردستی کھلوائے اور شہر میں قتل عام شروع کر دیا ۔ جب اسے منذر اور شہزادی ہند کے چلے جانے کا علم ہوا تو اس نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے یہ بات چھپائی کہ وہ فرمانروائے حیرہ نامزد ہو کر آیا ہے اور مشہور کیا کہ نعمان کی تعزیت کے لیے اور منذر کے پاس کسریٰ کا پیغام لے کر آیا ہے ۔ شہر میں امان بحال ہو گیا اور منذر کی بادشاہت کی منظوری کی خبر ہر طرف پھیل گئی ۔ ایاس منذر کی واپسی کا منتظر تھا کہ حیرہ سے باہر طلح ایک بدوی کے روپ میں اس سے ملا اور بتایا کہ اسے ایاس کی تلاش ہے کیونکہ بنی قضاعہ ، قبائل قحطان و عدنان اور جملہ حلیف قبائل نے منذر کی درخواست پر بنی طے کے علاقے پر حملہ کر دیا ہے ۔ پھر وہ ایاس کو بہلا پھسلا کر ریگستان میں ایک جھونپڑے میں لے گیا جہاں خولہ پیشہ ور رنڈی کا روپ دھارے بیٹھی تھی ۔ طلح اور خولہ نے تیز قسم کی شراب پلا کر اس سے اس کی آمد کا مقصد معلوم کیا اور طلح کی چرب زبانی نے اس پر اس قدر اثر کیا کہ اس نے سام تک لشکر لے کر اپنے قبیلے کی مدد کے لیے روانہ ہونے کا فیصلہ کر لیا ۔ پھر خولہ ، طلح اور منذر نے حیرہ کے سامنے ریت کے ٹیلوں میں چھپ کر ایاس کی روانگی کا منظر دیکھا ، رات کے وقت منذر نے شہر میں داخل ہو کر تاج و تخت سنبھال لیا ۔

اب منذر طلح کا ممنون تھا ، طلح نے اسے زہیر اور حبیبہ کے خلاف بھی بھڑکایا ۔ پھر طلح ، خولہ اور زید دربار کسریٰ میں سفارت کے لیے دستگرد کی طرف روانہ ہو گئے ۔ خسرو پرویز دستگرد میں رومیوں کے خلاف اپنی حالیہ فتح کا جشن منا رہا تھا ۔ دستگرد سے پہلے ہی طلح ان سے الگ ہو گیا اور زید اور خولہ جب سفیروں کی حیثیت سے پہنچے تو انہیں قصر شاہی کے قریب شاہی مہمانوں کے طور پر ٹھہرایا گیا ۔ انہیں یہ معلوم کرکے مایوسی ہوئی کہ شاید چھ ماہ تک باریابی نہ ہو سکے کیونکہ خسرو کوہ قاف کی طرف شکار کے لیے جا رہا تھا ۔

خسرو پرویز جب اپنے شکاری لشکر کے ساتھ شاہانہ آن بان سے کوہ قاف میں پہنچا تو شیریں نے استقبال کیا ۔ اپنی محبت یاد دلا کر بے توجہی کی وجہ پوچھی ۔ خسرو نے اپنی مجبوری بیان کی کہ اسے بہرام چوبین سے اپنی سلطنت واپس لینے کے لیے قیصر روم کا سہارا لینا پڑا جس نے مدد تو دی لیکن اپنی بیٹی مریم سے شادی بھی کرا دی ۔ خسرو پرویز نے یہاں شیریں کے ساتھ مل کر چوگان کھیلا ، شکار کیا ۔ شیریں جب خسرو سے الگ ہو کر انتظامات میں مصروف تھی تو طلح ایک بہت نامی گرامی حکیم عرب کی حیثیت سے اس سے ملا ۔ شیریں نے اسے بطور مہمان ٹھہرا لیا ۔ کئی ماہ اسی طرح تفریحات میں بیت گئے آخر ایک دن موقع پا کر طلح نے اپنی مکاری کی باتوں سے شیریں کا پورا اعتماد حاصل کر لیا ، اس کی داستان سنی اور مشورہ دیا کہ وہ خسرو پرویز کے ساتھ دستگرد چلی جائے ، طلح وہاں ہر طرح اسے ملکہ عجم بنانے کی کوشش کرے گا ۔

شیریں نے جب خسرو پرویز سے دستگرد چلنے کی آمادگی ظاہر کی تو وہ ازحد مسرور ہوا ، فوراً روانگی کی تیاری کا حکم دیا ۔ دستگرد پہنچنے سے پہلے شیریں کی آمد کی خبر وہاں پہنچ چکی تھی ۔ ملکہ مریم نے سب امراء کو اپنا طرف دار بنا لیا ، خسرو کا خاطر خواہ استقبال

بھی نہ ہوا ، مریم بھی کچھ خاص سے ملی اور دوسرے دن جب خسرو نے دربار طلب کیا تو کوئی امیر وزیر نہ آیا ۔ خسرو نے شہر سے باہر شیریں کے قصر میں آ کر ماجرا بیان کیا ، اس نے طلح کا تعارف کروایا اور طلح نے بادشاہ کو دوبارہ دربار طلب کرنے اور یہ اعلان کرانے کا مشورہ دیا کہ کوئی بات امراء کی مرضی کے خلاف نہ ہوگی ۔ دوسرے دن دربار میں سب آئے ، پرویز کے خطاب کے بعد بڑے پادری نے اپنی شکایت بیان کی ، طلح نے بادشاہ کی اجازت سے جواب دیے اور اپنی منطقی تقریر سے سب کو اس قدر قائل کیا کہ انھوں نے بادشاہ سے اپنی گستاخی کی معافی مانگی ۔

ملکہ مریم اندر اندر کڑھتی رہی ۔ چھ ماہ سے اس نے بادشاہ سے قطع تعلق اختیار کر رکھی تھی ۔ طلح کے مشورے پر بادشاہ نے ان سفیروں کو طلب کیا جو گیارہ ماہ سے باریابی کے منتظر تھے ۔ طلح نے خود کو حیرہ کا سفیر ظاہر کیا اور بتایا کہ منذر نے ایاس کی زبانی فرمان خسروی بھیجنے کے بعد بادشاہت قبول کی شاید ایاس اس طرح اسے دھوکہ دے کر خسرو سے اسے قتل کروانا چاہتا تھا تاکہ سلطنت کے ساتھ شہزادی ہند کو بھی حاصل کرے ۔ پھر طلح نے زید کو خسرو کے حضور پیش کرکے تعارف کرایا ، خسرو بہت خوش ہوا اور اسے اپنی بیوی کا منشی مقرر کیا ۔ ملکہ مریم جس کلیسے میں عبادت کے لیے جایا کرتی تھی خولہ وہاں اپنی ایک خادمہ کے ساتھ ایک راہبہ کے روپ میں جا بیٹھی اور ہر وقت عبادت میں مصروف رہنے لگی ۔ مریم نے کئی بار اسے متوجہ کرنا چاہا لیکن ناکام رہی ۔ ایک روز جب مریم اس کے قدموں میں گر پڑی تو اس نے روکھے پن سے کہا جاؤ مراد پوری ہوگی ۔ اسی شام طلح نے مریم کے حضور حاضر ہو کر قدموں میں گر کر رو رو کر معافی چاہی اور بتایا کہ سنٹ پطرس نے اسے خواب میں عذاب سے ڈرا کر معافی مانگنے اور ملکہ کی حمایت کا حکم دیا ہے۔ مریم طلح کے وعدوں پر مطمئن ہوئی اور راہبہ کی کرامات سے متاثر ہوکر اسی وقت شکریہ ادا کرنے گئی ۔ راہبہ نے مسکرا کر روٹی کا ایک ٹکڑا کھانے کو دیا ۔ مریم تبرک کھا کر لوٹی ۔ خولہ اور خادمہ فوراً کلیسے سے کھسک گئیں ، شام تک ملکہ وہ زہر آلود روٹی کھانے سے مر گئی ۔ طلح اور خولہ نے اس خادمہ کو بھی ہلاک کرکے ٹھکانے لگا دیا تاکہ ان کا راز نہ کھلے ۔

چند دن بعد شیریں ملکہ عجم بن گئی لیکن فرہاد کے عشق کا چرچا جلد ہی عام ہوگیا ۔ خسرو پرویز شیریں کی عفت مآبی پر کامل یقین کے باوجود متردد تھا ۔ مدائن میں اس نے طلح سے مشورہ کیا تو اس نے تجویز کیا کہ ملکہ اپنی زبانی فرہاد کو مدائن سے قصر بے ستون تک دودھ پہنچانے کے لیے ایک نہر کھودنے کا حکم دے ، چنانچہ فرہاد کو جب شیریں نے سر دربار یہ حکم سنایا تو اس نے ایک بار دیدار کی خواہش ظاہر کی ۔ شیریں نے نقاب الٹا اور فرہاد ایک نظر دیکھتے ہی بے تاب ہوکر قصر سے جنگل کی طرف بھاگا اور پہاڑوں میں تیشہ زنی کرنے لگا ۔ اس دوران زید کو جب طلح کی زبانی ملکہ مریم کے مرنے کی اصل وجہ معلوم ہوئی تو وہ خولہ کی عیاری پر سخت متحیر ہوا ، طلح سے ہی اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایاس بھی عیسائیت قبول کرکے اسی کنیسے میں رہ پڑا ہے جہاں شہزادی ہند نن کی حیثیت میں ہے ۔

کچھ عرصے کے بعد خسرو پرویز کے لیے شیریں کی ناز آفرینیاں پھیکی پڑ گئیں اور اس نے طلح اور زید سے اپنی اس کیفیت کا اظہار کیا ۔ زید نے طلح کے سکھائے ہوئے جملے دھرائے کہ

حسن کی اصلی تعرف ساسانی خزانہ شاہی میں موجود ہے ۔ خسرو پرویز نے تعجب کیا ، خزانے سے وہ صندوقچہ منگوایا اور بھرے دربار میں اس سے وہ تحریر نکال کر پڑھی گئی ۔ پرویز نے سن کر کہا ایسی عورت دنیا میں کہاں مل سکتی ہے ۔ زید نے طلح کی طرف دیکھ کر دبی زبان سے کہا کہ ہے تو سہی مگر ملنی مشکل ہے ۔ خسرو پرویز نے سن لیا ، طلح نے آتش شوق کو بھڑکانا ، آخر زید نے بتایا کہ ایسی عورتیں شاہان نبی کندہ کے گھرانے میں اکثر ہوتی ہیں اور بالخصوص نعمان کی بیٹی حبیبہ ہے ۔ پھر حبیبہ کے حسن کی تعریفیں بڑھا چڑھا کر بیان کیں اور یہ کہہ کر کہ منذر ہرگز اپنی بہن کو خسرو پرویز کو دینے پر آمادہ نہ ہوگا ، اس کے شوق اور غضب کو اور بھڑکایا ۔ خسرو پرویز یہ حکم دے کر دربار سے اٹھ گیا کہ زند اور سپہ سالار ماہویہ ایک ہزار نبرد آزما سواروں کے ساتھ جا کر حبیبہ کو لے آئیں ۔

منذر کو جب زید نے خسرو پرویز کا پیغام پہنچایا تو اس نے کہا اول تو حبیبہ اس کے قابو میں نہیں اور شادی کر چکی ہے دوسرے وہ کسی صورت میں اسے پسند نہیں کرتا کہ نبی کندہ کی شہزادیاں کسریٰ کی ہوس پرستوں کی تسکین کا باعث بنیں ۔ زید اور ماہویہ نے مدائن لوٹ کر بڑھا چڑھا کر خسرو پرویز کو باتیں سنائیں ۔ طلح نے مشورہ دیا کہ فی الحال حملے کی بجائے منذر کو مدائن میں طلب کیا جائے ۔ حملے کے لیے اس وقت کا انتظار کیا جائے جب سب ابنائے بادیہ آب ذی قار کے کنارے میلے کے لیے جمع ہوں ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ۔ منذر نے ساسانی سفیر کے پیغام کے جواب میں جلد ہی حاضر ہونے کا لکھا ۔ پھر حرم کی عورتوں بچوں اور اسلحہ دولت کو لے کر جنوب کی طرف صحرائے عرب میں نکل گیا اور سلمیٰ و آجا کی پہاڑیوں کے درمیان جا پہنچا ، اس کی شادی نبی طے میں ہوئی تھی لیکن وہ ایاس کی سازشوں اور خسرو کے خوف کے باعث مدد کے لیے آمادہ نہ ہوئے ۔ وہاں سے آگے منذر تمام قبائل عرب میں گھوما اور سب کو اپنی مصیبت کی داستان سنائی ۔ آخر آب ذی قار کے کنارے بنی شیبان کے پاس پہنچا ۔ عمرو، زہیر، حبیبہ اور حلیمہ بھی ان دنوں وہیں تھے ۔ منذر سردار قبیلہ ہانی بن مسعود سے ملا ۔ اس نے مدد کا وعدہ کیا اور حبیبہ کی خطا معاف کروائی ۔ دونوں بہن بھائی ملے ۔ منذر بیوی بچوں، مال اسباب اور اسلحہ زرہوں کو ہانی کی امانت میں دے کر حیرہ کے راستے مدائن کو روانہ ہوا ۔ مدائن کے باہر زید بن عدی سے ملاقات ہوئی اور اسے یقین ہوگیا کہ سب چال اسی کی تھی ۔ قصر کے باہر ہی منذر کو حراست میں لے لیا گیا ۔ دوسرے روز ایوان سفید میں دربار میں پیش ہوا ۔ جواب طلبی ہوئی ۔ ”کالی بکریوں“ اور قیمتی زرہوں کے بارے میں باز پرس ہوئی اور اس وقت تک کے لیے قید کا حکم ہوا جب تک دونوں چیزیں حاضر نہ کر دی جائیں ۔ پرویز نے ایک بار پھر تنہائی میں منذر کو منانا چاہا لیکن جب وہ نہ مانا تو زید کے مشورے پر اسے مست ہاتھی کے پاؤں سے باندھ دیا گیا جس نے اسے چیر پھاڑ کر روند ڈالا ۔

ملکہ شیریں پرویز کے بدلے ہوئے رویے پر متحیر تھی، طلح سے مشورہ کیا تو اس نے اپنی موجودگی میں یہی سوال خسرو سے کرنے کی صلاح دی ۔ ادھر خسرو پرویز کو پہلے سے متوقع سوال کا جواب سمجھا دیا ۔ حسب پروگرام دوسرے دن شیریں خسرو پرویز کے قدموں میں گر کر روئی، پرویز نے وجہ ملال پوچھی تو اس نے بے توجہی کا گلہ کیا ۔ پرویز نے فرہاد کے وجود کو اپنی پریشانی کا باعث قرار دیا ۔ طلح نے وعدہ کیا کہ وہ اس پریشانی کو دور کرنے کا

انتظام کرے گا اور شیریں کی خواہش پر یہ وعدہ بھی کیا کہ نہ تو اسے قتل کرائے گا نہ کرے گا۔ اس کے دوسرے روز جب فرہاد (وہ بے ستون میں تیشہ زنی کر رہا تھا) تو خولہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے روتی پیٹتی جا پہنچی۔ فرہاد نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ شیریں مر گئی۔ فرہاد نے یہ سنتے ہی اپنے سر میں تیشہ دے مارا اور مر گیا۔ ایک لکڑہارا یہ ماجرا دیکھ رہا تھا، اس نے دوسرے روز جب کہ جشن نوروز تھا، یہ خبر پہنچائی، شیریں کی آنکھوں میں حسرت جھلکنے لگی اور اس نے حکم دیا کہ اس لکڑہارے کے ذریعے اس عورت کو تلاش کرکے سزا دی جائے جس نے یہ فریب کیا تھا۔ طلح نے موضوع بدلنے کے لیے کہا کہ آب ذی قار کے میلے میں ایک ماہ باقی ہے لشکر کو تیاری کا حکم دیا جائے۔ چنانچہ ماہویہ کو ایک ہفتے کے اندر لشکر مرتب کرکے روانہ ہو جانے کا حکم دے دیا گیا۔ اسے یہ تاکید بھی کی گئی کہ بنی شیبان کے خلاف بھی سخت کارروائی کی جائے کیونکہ انہوں نے خسرو کے حکم پر منذر کے اہل خانہ اور زرہوں کو مدائن نہیں بھیجا تھا۔ ابن عیینہ کے لیے نئی فرمان جاری ہوا کہ قبیلہ بنی طے کے ساتھ ایرانی فوجوں سے میدان ذی قار میں آ ملے۔

طلح نے زید کو بھی لشکر کے ہمراہ جانے پر آمادہ کیا اور ادھر خولہ سے مشورہ کرکے طے کیا کہ دیگر لوگوں سے انتقام کے ساتھ زید کا بھی خاتمہ کرنا پڑے گا کیونکہ وہ ان کے بہت سے رازوں سے باخبر ہو چکا تھا۔ آخر ایک لاکھ ایرانی سپاہ ماہویہ کی سرکردگی میں روانہ ہوئی۔ طلح، زید اور خولہ بھی ہمراہ تھے۔ راستے کے گاؤں تباہ ہوتے گئے۔ پندرھویں دن حیرہ میں پہنچکر قتل عام کیا۔ قبائل کو درفش کاویانی تلے جمع ہونے کا حکم دیا گیا اور آب ذی قار پر جمع ہونے والے قبائل کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں۔ معلوم ہوا کہ بنی شیبان، بنی قریش، بنی قضاعہ اور شمالی عرب کے سب قبائل جمع ہیں۔ طلح کے مشورے سے ماہویہ نے فوراً کوچ کا حکم دیا اور آٹھویں دن آب ذی قار کے قریب پہنچے۔ اب ایرانی فوج دو لاکھ سے زیادہ تھی۔ پہنچتے ہی محاصرہ کر لیا اور ایلچی بھیجا کہ منذر کے اہل خاندان اور زرہیں ان کے حوالے کی جائیں۔ ہانی کے خیمے میں سرداروں نے مشورہ کرکے فیصلہ بنی عجلان کے سردار حنظلہ بن ثعلبہ پر چھوڑا، حنظلہ نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ دیا اور ماہویہ کے ایلچی کو یہی جواب دے کر لوٹا دیا گیا۔ ہانی نے منذر کی زرہیں فوراً نامی گرامی سرداروں میں تقسیم کیں۔ صفیں درست ہوئیں، پرجوش تقریروں کے بعد جنگ شروع ہوگئی۔ زبیر نے جب اپنا پلہ دبتے دیکھا تو جان پر کھیل کر ایرانیوں کی صفوں میں جا گھسا، عمرو نے بھی تقلید کی۔ ایرانی پہلوانوں نے گھیر کر یورش شروع کر دی لیکن پھر بھی ماہویہ زبیر کے نیزے میں چھد کر ہلاک ہوگیا۔ حنظلہ اور ہانی نے موقع کی نزاکت کو بھانپ کر بھرپور حملہ کیا جس کے نتیجے میں ایرانیوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ پیچھے ہٹے۔ ہانی اور حنظلہ نے عربوں کو ایرانیوں کے تعاقب میں جانے سے یہ کہکر روک دیا کہ آب ذی قار پر خود عربوں کا قبضہ ہے، دوسری صبح تک ایرانی پیاس سے ویسے ہی نڈھال ہوں گے۔ سب نے عمرو اور زبیر کے ہاتھ چومے، مرہم پٹی کی، لڑکیوں نے بنی عذرہ کی بہادری کے گیت گائے۔ رات بھر سرداروں میں مشورے ہوئے۔ ایرانی لشکر میں سے بیس ہزار سپاہی رات کو ہی نکل بھاگے۔ رات کو عمرو کو مرجانہ سے معلوم ہوا کہ طلح اور خولہ بھی ایرانی لشکر کے ہمراہ ہیں۔

دوسرے دن صفیں درست ہوئیں تو ایرانی پیاس سے نڈھال تھے۔ حنظلہ نے اپنی صفوں سے آگے نکل کر مقابل مانگا۔ اس دن ایرانی لشکر کا سپہ سالار اسفندیار تھا۔ نوش زاد نامی ایک پہلوان حنظلہ کے مقابلے کو نکلا، دیر تک زور آزمائی ہوئی اور بالآخر جنگ مغلوبہ چھڑ گئی۔ ساسانی لشکر کا دباؤ لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ صورت حال دیکھ کر حبیبہ اور شیبانی سردار کی بیٹی نے رجزخوانی شروع کی، تھوڑی ہی دیر میں جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ ساسانی لشکر مال اسباب چھوڑ کر بھاگا۔ عربوں نے تعاقب کیا۔ خولہ اور طلح بھی بدوی لباس پہن کر کھسکے اور اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک گھاٹی میں زید اور مرجانہ کو قابو کر لیا۔ عین اس وقت جب وہ ان دونوں کو قتل کرنا چاہتے تھے عمرو اور زبیر جا پہنچے لیکن پکڑتے پکڑتے طلح نے زید کے سینے میں خنجر اتار دیا۔ زید نے مرتے مرتے اپنا پتہ اور طلح کی عیاریوں کی داستان انہیں سنائی۔ ادھر زید کا دم نکلا ادھر مرجانہ نے خولہ کے خنجر گھونپ دیا۔ حبیبہ اور حلیمہ بھی آ پہنچیں، زبیر نے خولہ کے مرتے ہی طلح کا سر بھی قلم کر دیا۔ اس کے بعد شاہ حارث کو سردار ہانی کے ذریعے ساری کیفیت معلوم ہوئی۔ اس نے سفارت بھیج کر زبیر اور عمرو سے معذرت چاہی اور قلعہ بلقا میں چاروں کی پرتکلف دعوت کی۔

تحقیقی جائزہ

"ایام عرب" میں بیان کردہ رومانی اور تخیلی واقعات سے قطع نظر شرر نے جن تاریخی روایات و واقعات کا ذکر کیا ہے ان کا تحقیقی جائزہ سطور ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ دور جاہلیہ کے مشہور میلے یا بازار "سوق عکاظ"، اس کے محل وقوع، اس کی رونق اور کاروبار اور مشاعروں کی تفصیلات اکثر کتب تواریخ میں ملتی ہیں اور شرر کی بیان کردہ تفصیلات صحیح ہیں۔ کتب تواریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ محرم، رجب، ذی قعدہ اور ذی الحجہ کے چار مہینے تمام قبائل عرب میں محترم تھے اور ان میں قتل و غارت گری حرام تھی[1]۔ نامی گرامی سردار عرب عبداللہ بن جدعان کی شخصیت بھی تاریخ سے ثابت ہے[2]۔ یہ امر بھی صحیح ہے کہ ناول کے مذکورہ زمانے میں عرب کے مشہور شعرا، نابغہ زبیانی، لبید اور علقمہ زندہ تھے اور ناول میں ان سے متعلق بیان کردہ واقعات اور اشعار صحیح ہیں[3]۔

بنی عذرہ کے افسانہ ہائے حسن و عشق کی طرف شرر نے جو اشارہ کیا ہے وہ صحیح ہے۔ بنی عذرہ حسن و عشق کے معاملے میں تمام قبائل عرب میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان داستانوں کے بارے میں ہم نے اسی مقالے میں شرر کے ایک اور ناول (قیس و لبنیٰ) کے ضمن میں تفصیل سے ذکر کیا ہے، البتہ عمرو بن لبید اور زبیر بن مسلم کو بنی عذرہ کے قبیلے کے فرد دکھانا اور اس ناول کے تاریخی پلاٹ سے متعلق کرنا شرر کی تخیلی تخلیق ہے۔

ایام عرب میں جن مشہور بتوں، ہبل اور عزیٰ وغیرہ کا ذکر ہوا ہے اور انہیں جن

۱- الدکتور جواد علی : تاریخ العرب قبل الاسلام، ج ۵، ص ۲۴۲ -

۲- ایضاً، ج ۴، ص ۳۵۰ -

۳- نکلسن : A literary History of the Arabs، ص ۵۴، ۱۲۱ تا ۱۲۳، ۱۲۵، ابن خلدون : (ترجمہ عنایت اللہ لاہور)، ص ۱۷۳ -

جن قبائل سے متعلق دکھایا گیا ہے وہ صحیح ہے اور دور جاہلیہ کی تہذیب اور مذہب سے متعلق کتب تواریخ ناول میں بیان کردہ پرستش کے طریقوں کی تصدیق کرتی ہیں اور یہ بات صحیح ہے کہ عرب دور جاہلیہ میں سفر کے دوران گول گول پتھر ساتھ رکھ لیتے تھے اور انھیں اپنے بتوں کے نمائندے تصور کرکے ان کی پرستش کرتے تھے[1]۔

جاہلیہ کی اس رسم کا بھی کتب تواریخ میں ذکر ملتا ہے کہ باپ کے مرنے پر اس کی بیویاں اور حرم وراثت میں بیٹے کو ملتی تھیں۔ شرر نے عدت کے سلسلے میں، جو دستور بیان کیا ہے وہ بھی صداقت پر مبنی ہے اور یہ عقیدہ بھی کہ وہ آفات سے محفوظ رہنے کے لیے گلے میں سوکھی ہوئی خرگوش کی ران ڈال کر سفر کرتے تھے اور سفر شروع کرتے وقت دور تک اس طرح چلتے کہ پلٹ کر نہ دیکھتے، کوے کی آواز کو نحوست کی نشانی تصور کرتے تھے اور اگر کسی مقام پر کسی وبا کا کوئی احتمال ہو تو اس شہر میں داخل ہونے سے پہلے گدھے کی بولی بولتے اور یہ تصور کرتے کہ اس طرح وہ وبا آن پر اثر انداز نہیں ہو سکے گی۔

شرر نے (تیسرے باب میں) بنی غسان کی سر زمین کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تاریخ بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ کے بعد یوشع بن نون کو اسی ملک کی قوم عمالقہ سے لڑنے کا حکم ہوا تھا۔ عوج بن عنق اسی دشت کا باشندہ تھا اور بنی اسرائیل کے بارہ آدمی خدا کی طرف سے اطمینان دلانے کے باوجود جس گروہ سے ڈر گئے وہ بھی اسی سر زمین کے باشندے تھے، ملکہ زنوبیہ جو شہر پامیرا کی اولوالعزم ملکہ تھی اور جس نے عراق سے روما تک مہذب دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا اسی دشت کے تالو پر کھیل کر جوان ہوئی تھی۔ یہاں زمانہ قدیم سے عمالقہ کی سلطنت تھی جن کا بادشاہ سمیدع بن ہوثر اسرائیلیوں کے ہاتھوں قتل ہوا لیکن اس کے بعد بھی سلطنت اسی خاندان میں رہی اور ملکہ زنوبیہ نے جسے عرب ملکہ زبا کہتے ہیں ساری دنیا میں اپنی فتح مندی کا ڈنکا بجا دیا۔ اس کی شہرت نے اوریلین قیصر کو اس کی طرف متوجہ کیا اور وہ ملکہ زنوبیہ کو گرفتار کر لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے چند روز بعد بنی قضاعہ کے تنوخ نامی شخص نے عسان کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور روم کے تابع رہا۔ تین بادشاہوں کی حکومت کے بعد سلیح نامی ایک شخص نے اس خاندان کو اکھاڑ پھینکا اور قیصر ٹیٹس سے پروانہ خوشنودی حاصل کرکے حکومت کرنے لگا۔ اس کے خاندان نے بہت زمانہ حکومت کی اور بنی ضجعم انھیں میں سے تھے۔ ان کے بادشاہ داؤد بن شق کے زمانے میں بنی ازد کا ایک گروہ زبید اور دمع نامی وادیوں میں آ اترا۔ یہ مقام غسان کہلاتا تھا اور یہ لوگ بھی غسان کے نام سے مشہور ہو گئے۔ انھوں نے بنی ضجعم کی حکومت کو تباہ کرکے تخت چھین لیا اور دولت روم کے تابع ہو کر عیسائیت قبول کر لی۔ بعثت نبوی تک اس خاندان کے بتیس بادشاہ ہو گزرے تھے۔ ان جملہ امور کی تصدیق کتب تواریخ سے ہوتی ہے[2]۔ حارث الاعرج کے بارے میں ان بیانات کی تصدیق بھی کتب تواریخ سے

۱۔ تاریخ العرب قبل الاسلام، ج ۵، ص ۱۶، ۱۷، ۲۷ تا ۱۱۹۔

۲۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:

(i) تاریخ العرب قبل الاسلام، بذیل مادہ بنی غسان، ج ۴۔

(ii) ابن خلدون: (ترجمہ عنایت اللہ)، ج ۱، ص ۱۲۴ تا ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۶۸، ۱۶۹ و بعد۔

ہوتی ہے کہ وہ مشہور فیاض شاہان عرب میں سے تھا اور مداح رسولؐ حضرت حسان بن ثابتؓ نے دور جاہلیہ میں اس کی فیاضی کا قصیدہ کہا تھا[1]۔ حارث الاعرج کی ماں ماریہ دو گوشوارے پہنے رہتی تھی جو اس کی خمار کے نیچے سے لٹکتے رہتے تھے، اس لیے اس کا لقب "ذات القرطین" ہو گیا تھا۔ شرر کے اس بیان کی تصدیق تاریخ سے ہوتی ہے[2]۔

سلطنت حیرہ سے متعلق شرر کے یہ بیانات تاریخ سے ثابت ہیں کہ حیرہ کی حدود ایک طرف تو عراق یا اس زمانے کی سلطنت ساسانی سے ملتی تھیں اور دوسری طرف دولت بنی غسان سے، حیرہ کے بادشاہ دولت عجم کی منظوری سے مقرر ہوتے تھے، اور قدیم شاہان حیرہ کو دربار عجم میں بڑے بڑے عہدے حاصل رہے تھے، لیکن اس ناول میں بیان کردہ زمانے میں انھیں دربار خسروی میں ایک والیٔ ملک سے زیادہ حیثیت حاصل نہیں تھی۔ اگرچہ کسی زمانے میں بہرام چوبیں اور یزد جرد اول جیسے شہزادوں کی تربیت نعمان اول کی زیر نگرانی ہوتی تھی، مدائن کے مشہور قصر خورنق کی تعمیر فرمانروائے حیرہ کی مستعدی سے ہوئی تھی۔ ناول کے بیان کردہ زمانے میں شاہان حیرہ اور ملوک غسان کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے[3]۔

شرر نے زیر نظر ناول میں شاہان حیرہ و غسان کے درمیان دو جنگیں بیان کی ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق پہلی بار شاہ حیرہ نے حارث پر لشکر کشی کر کے تاوان مانگا، حارث نے حکمت عملی سے کام لیا اور شاہ حیرہ کو شکست ہوئی۔ دوسری بار چونکہ نعمان نے حارث کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے حارث نے فوج کشی کی اور اس جنگ میں نعمان مارا گیا۔ یہ جنگ یوم حلیمہ کے نام سے تاریخ عرب میں مشہور ہے۔ درحقیقت ان دونوں جنگوں کے بارے میں کتب تواریخ میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہم یہاں ابن الاثیر کے بیانات سپرد قلم کرتے ہیں جن سے یہ تضاد آشکارا ہو جائے گا۔

شرر نے نعمان کی جس پہلی لشکر کشی کا ذکر کیا ہے اس کا بیان ابن الاثیر کے یہاں اس طرح ہے:

"یہ لڑائی منذر بن ماء السماء اور حارث الاعرج ابن ابی شمر غسانی کے درمیان ہوئی تھی۔ اس لڑائی کا سبب یہ ہوا تھا کہ منذر ابن ماء السماء عربوں کا بادشاہ حیرہ سے تمام معد کو لے کر روانہ ہوا اور عین اباغ میں جا کر ذات الخیار میں مقام کیا اور حارث الاعرج کے پاس جو شام میں عربوں کا بادشاہ تھا پیغام بھیجا کہ یا تو مجھے فدیہ دے جس سے میں لوٹ جاؤں اور اپنے لشکر کو واپس لے جاؤں اور نہیں تو لڑنے کو تیار ہو جا۔ حارث نے کہا اچھا ہمیں مہلت دے کہ ہم اپنے معاملہ میں سوچ لیں، پھر اس نے لشکر کو جمع کیا اور منذر کی طرف روانہ ہوا اور اس سے کہلا بھیجا، ہم دونوں شیخ ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تو اپنے اور میرے لشکر کو تباہ مت کر، یہ بہتر ہوگا کہ ایک شخص تیرے بیٹوں میں سے نکلے اور ایک میرے بیٹوں میں سے نکلے۔ یہ دونوں لڑیں اور جب کوئی مارا جائے تو دوسرا نکلے اور جب ہماری سب اولاد ماری جائے تو میں خود نکلوں اور اُدھر سے تو نکلے، جو اپنے مقابل کو مارے وہی ملک کا

۱۔ (i) ابن خلدون : (ترجمہ عنایت اللہ)، ج ۱، ص ۱۲۷، و ۱۲۹ و بعد۔ (ii) نکلسن : ص ۵۳۔
۲۔ ابن خلدون : (ترجمہ شیخ عنایت اللہ)، ج ۱، ص ۱۲۴۔
۳۔ ملوک حیرہ سے متعلق تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو :
(i) تاریخ العرب قبل الاسلام، ج ۴، ص ۵ و بعد۔
(ii) ابن خلدون : (ترجمہ عنایت اللہ)، ج ۱، ص ۱۲۴، ۱۲۵ و ۱۴۴ بعد۔

مالک ہو جائے ۔ اس پر دونوں نے معاہدہ کر لیا ۔ پھر منذر نے اپنے اصحاب میں سے ایک بڑے شجاع و دلاور کو بلایا اور اسے میدان میں بھیجا اور یہ ظاہر کرنے کو کہا کہ دونوں صفوں کے درمیان کھڑا ہو کر کہے میں منذر کا بیٹا ہوں ۔ جب وہ شخص نکلا تو حارث نے اپنے بیٹے ابو کرب کو بھیجا ، جب ابو کرب گیا اور اسے دیکھا تو اپنے باپ کے پاس لوٹ آیا اور کہا یہ تو منذر کا بیٹا نہیں بلکہ وہ اس کا غلام ہے یا اس کے اصحاب میں سے کوئی دلاور شخص ہے ۔ حارث نے کہا بیٹے کیا تو موت سے ڈر گیا ۔ میں نہیں خیال کرتا کہ شیخ عرب مجھ سے دھوکا اور فریب کرے ۔ اس لیے ابو کرب لوٹ کر میدان میں گیا اور اس سے لڑا ، اس سوار نے اسے مار ڈالا اور اس کا سر لے جا کے منذر کے سامنے ڈال دیا اور پھر میدان میں لوٹ کر آ گیا ۔ پھر حارث نے اپنے دوسرے بیٹے کو لڑائی کا حکم دیا کہ بھائی کے خون کا بدلہ لیوے ۔ وہ بھی میدان میں نکلا ، جب اس کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تو باپ کے پاس لوٹ کر آیا اور کہا بابا جان یہ تو کسی طرح منذر کا بیٹا نہیں ہے ۔ حارث نے کہا شیخ مجھ سے کبھی دغا نہ کرے گا اس واسطے وہ پھر لوٹا اور میدان میں جا کر اس دلاور کے ہاتھ سے مارا گیا ۔

جب شمر بن عمرو الحنفی نے جس کی ماں غسانیہ تھی اور جو اس وقت منذر کے پاس تھا یہ بات دیکھی تو کہا اے بادشاہ دھوکہ اور غدر بادشاہوں اور ذوی الکرام سے بہت بعید ہے تو نے اپنے ابن عم سے دو مرتبہ غدر اور فریب کیا ۔ منذر سن کر غصے میں آیا اور اسی وقت اسے لشکر سے نکلوا دیا اور شمر وہاں سے نکل کر حارث کے لشکر میں چلا آیا اور سارا حال اس سے کہہ دیا ۔ حارث نے کہا مانگ تو کیا مانگتا ہے اس نے کہا کچھ نہیں صرف تیرے کپڑے اور تیری دوستی چاہتا ہوں ۔

جب دوسرا روز ہوا تو صبح کو حارث نے اپنا لشکر آراستہ کیا اور لڑائی کی انہیں تحریص و ترغیب دی ۔ اس کے پاس چالیس ہزار فوج تھی ، وہ سب قتال کے واسطے صف باندھ کر کھڑی ہوئی ۔ منذر مارا گیا اور اس کا لشکر شکست کھا کر بھاگا ۔ ۔ ۔ ''[1]

ابن الاثیر نے ایک اور روایت بھی بیان کی ہے ، یہ گویا اس دوسری جنگ کا ذکر ہے جسے شرر نے یوم حلیمہ کے نام سے ناول میں بیان کیا ہے :

''جب منذر بن ماء السما مر گیا جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے تو اس کے بعد اس کا بیٹا منذر الملقب بہ لقب اسود تخت نشین ہوا ۔ پھر جب اس کی حکومت جم گئی اور ثابت قدم حاصل ہو گیا تو اس نے لشکر فراہم کیا اور باپ کا انتقام لینے کے واسطے حارث الاعرج کی طرف روانہ ہوا اور اس سے کہلا بھیجا ۔ ۔ ۔ پھر منذر چل کر مرج حلیمہ میں مقیم ہوا ، وہاں جو غسانی تھے اسے خالی کر کے اسود کے قبضہ میں چھوڑ گئے اسے مرج (چراگاہ) حلیمہ بنت الحارث کے سبب سے کہتے ہیں ۔ پھر حارث بھی روانہ ہوا اور مرج میں ہی آ کر خیمہ زن ہوا اور مرج میں جو لوگ مقیم تھے انہیں حکم دیا کہ اس کے لشکر کے واسطے کھانا پکائیں ۔ چنانچہ انہوں نے کھانا تیار کیا اور کٹھلوں میں اٹھا کر لائے اور لشکر میں لا کر رکھ گئے ، یہ لوگ لڑتے اور جب کھانے کی خواہش ہوتی تو ان کٹھلوں کے پاس آتے اور ان میں سے کھانا کھا جاتے تھے ۔ اسی طرح لڑائی حارث اور اسود میں کئی ہی روز تک جاری رہی ، جو کچھ ایک فریق کسی کا نقصان کرتا دوسرا فریق بھی اس کا اسی قدر نقصان کر دیتا اور اپنا عوض لے لیتا تھا ۔ جب حارث نے یہ حالت دیکھی تو اپنے قصر میں دربار کیا اور اپنی بیٹی ہند کو بلایا اور اس سے کہا بہت عطر طشتوں میں لا کر رکھے اور اپنے لوگوں کے لا کر لگائے ۔ پھر غسان کے لوگوں کے درمیان ندا کر دی کہ جو کوئی حیرہ کے بادشاہ کو قتل کرے گا میں اپنی بیٹی ہند اس کو دے دوں گا ۔ لبید بن عمرو الغسانی نے یہ سن کر اپنے باپ سے کہا کہ بابا جان میں بادشاہ حیرہ کو جا کر مارتا ہوں ، اگر مار لیا تو بہتر ورنہ میں تو ضرور مارا جاؤں گا ، میرا گھوڑا اچھا نہیں ہے اگر آپ اپنا گھوڑا ریتیہ دے دیں تو بڑی مہربانی ہوگی ۔ اس نے

---

[1] ابن الاثیر : تاریخ الکامل ، (ترجمہ مولوی عبدالغفور خان) ، ج ۲ ، ص ۸۳ تا ۸۶ ۔

گھوڑا بیٹے کو دے دیا ، جب لشکر نے حملہ کیا اور تھوڑی دیر تک لڑتے رہے تو لبید نے جا کر اسود پر حملہ کر دیا اور ایک ضرب سے اسے ہلاک کر ڈالا اور گھوڑے سے گرا دیا اور اس کے آدمی یہ دیکھ کر چاروں طرف بھاگ گئے ۔ پھر لبید نے اُتر کر اس کا سر کاٹا اور حارث کے سامنے لا کر ڈال دیا ۔ اس وقت حارث اپنے قصر پر تھا اور سپاہیوں کو دیکھ رہا تھا ۔ جب لبید نے اسود کا سر اس کے سامنے لا کر ڈالا تو حارث نے کہا جا تو اپنے چچا کی بیٹی کو لے لے ، میں نے اُسے تجھے دے دیا اور تیرا بیاہ اس سے کر دیا ۔ لبید نے کہا میں پھر لڑائی میں جاتا ہوں اور اپنے آدمیوں کی تسلی کرتا ہوں ، جب سب لوگ لوٹیں گے تو میں بھی لوٹوں گا ۔ پھر وہ لوٹ گیا ، وہاں جا کر دیکھتا ہے کہ اسود کے بھائی کے پاس لوگ لوٹ کر آ گئے ہیں اور وہ بڑے جوش و غضب سے لڑ رہا ہے ۔ لبید بھی اس واسطے آگے بڑھا اور لڑ کر مارا گیا ۔ ۔ ۔ لخم دوباہ بھاگ نکلے اور چاروں طرف مارے گئے اور غسانیوں کو بڑی اچھی فتح نصیب ہوئی ۔

کہتے ہیں کہ اس لڑائی میں ایسی کثرت سے گرد اڑی تھی کہ آفتاب چھپ گیا تھا ۔ ۔ ۔ لشکر بہت کثرت سے تھا ۔ اسود تمام عراق کے عربوں کو لایا تھا اور ایسے ہی حارث بھی تمام شام کے عربوں کو لے کر پہنچا تھا ۔ یہ لڑائی عربوں کی بہت مشہور لڑائی ہے اور غسان کے شعرا نے اس کے سبب سے بڑا فخر کیا ہے ۔''[1]

ابن الاثیر نے یوم حلیمہ کی نسبت ایک اور روایت بھی بیان کی ہے اور لکھا ہے :

''منذر کے قتل کی نسبت ایک اور روایت بھی مشہور ہے ۔ بعض علما نے بیان کیا ہے کہ اس لڑائی کا سبب یہ ہوا تھا کہ حارث بن ابی شمر نے منذر اللخمی سے اس کی بیٹی مانگی تھی اور اس سے شادی کا پیغام دیا تھا اور یہ ارادہ کیا تھا کہ اس طرح لخم اور غسان میں لڑائی کا خاتمہ کر دے ۔ منذر نے اس واسطے اپنی بیٹی ہند کا اس سے نکاح کر دیا ۔ مگر ہند کو مردوں کی طرف رغبت نہ تھی ۔ اس واسطے اس نے کسی تدبیر سے اپنے بدن پر برص کے نشان بنا لیے اور اپنے باپ سے کہا مجھے اس حالت میں غسان کے بادشاہ کے پاس بھیجتا ہے ۔ اس واسطے منذر کو اس کے دینے سے بڑی ندامت ہوئی اور اسے روک رکھا ، پھر حارث نے آدمی بھیجا اور اُسے طلب کیا مگر اس کے باپ نے نہ بھیجا اور حیلہ حوالہ کر دے ۔

پھر اسی میں منذر کہیں کسی طرف غزا کے لیے گیا ، حارث بن ابی شمر نے موقع پا کر حیرہ کو ایک لشکر بھیجا ، اس نے آ کر اسے لوٹا اور جلا کر خاک کر دیا ۔ جب یہ خبر منذر کو ہوئی تو وہ غزا سے واپس آیا اور غسان کا ارادہ کیا ۔ ادھر حارث نے بھی جب اس خبر کو سنا تو وہ بھی اپنے آدمی جمع کر کے روانہ ہوا ۔ یہ دونوں لشکر عین اباغ میں ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اور لڑائی کے واسطے صف بندی کی اور دونوں طائفوں میں خوب سخت لڑائی ہوئی ۔ منذر کے میمنہ نے حارث کے میسرہ پر حملہ کیا جس میں اس کا بیٹا تھا ، اُسے لخمیوں نے مار ڈالا اور میسرہ والے بھاگ گئے ۔ اُدھر حارث کے میمنہ نے منذر کے میسرہ پر حملہ کیا ، میسرہ والوں کو شکست ہوئی اور ان کا سردار فروہ بن مسعود بن عمرو بن ابی ربیعہ بن ذہل بن شیبان مارا گیا اور پھر غسان کے قلب والوں نے منذر پر حملہ کیا اور اسے قتل کر دیا جس سے اس کے لوگ چاروں طرف بھاگ نکلے اور بہت لوگ قتل ہوئے اور بنی تمیم کے آدمی ان میں سے بکثرت قید ہوئے ۔''[2]

شرر نے غالباً اسی بیان سے حبیبہ کو اس کی مشاطہ کلثوم کے تیار کردہ تیل کے ذریعے مبروص بنا کر پیش کیا ہے اور اس سازش میں نعمان کی ماں سلمیٰ بنت وائل اور نعمان کی محبوبہ

۱۔ ابن الاثیر : (ترجمہ عبدالغفور خان) ، ج ۳ ، ص ۸۶ تا ۸۸ ۔
مندرجہ بالا اقتباس میں دو جگہ پر غالباً شہزادی حلیمہ کی بجائے حارث کی بیٹی کا نام ہند درج ہو گیا اور یہ اس لیے بھی سہو معلوم ہوتا ہے کہ اسی شہزادی کے نام سے یہ جنگ یوم حلیمہ کہلائی تھی ۔
۲۔ ابن الاثیر : (ترجمہ عبدالغفور خان) ، ج ۳ ، ص ۸۹ ، ۹۰ ۔

زینب کو بھی شامل کیا ہے اور نعمان نے برص کے داغ دیکھنے کے بعد اپنی خاندانی عزت کو برقرار رکھنے کی خاطر رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا ، جس پر برہم ہو کر حارث الاعرج نے مرج حلیمہ میں نعمان کا مقابلہ کیا ۔

شرر نے ناول کے پلاٹ میں عمرو اور زبیر کو سیرا نعمان کے لشکر میں گھستے دکھایا ہے ۔ وہ دونوں رات کے وقت نعمان کے لشکر میں پہنچے ، اس کے مرزبان کو قتل کر دیا اور شمعیں بجھا دیں ۔ بس پر نعمان کے سپاہی صبح تک آپس میں تلوار چلاتے رہے ۔ پلاٹ کے اس حصے کی بنا ابن الاثیر کے درج ذیل اقتباس پر دکھائی دیتی ہے ، ابن الاثیر نے لکھا ہے :

''ایک اور بھی منذر کے قتل کی روایت ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نے لشکر بہت کثرت سے جمع کیا اور کوچ کرکے شام میں آیا اور شام کا پادشاہ بھی جس کا نام اکثر لوگوں کے نزدیک حارث ابن ابی شمر ہے روانہ ہوا اور مرج حلیمہ میں آ کر قیام کیا جو حلیمہ بادشاہ شام کی بیٹی کے نام سے موسوم ہو گیا تھا ۔ اور لخمی بادشاہ مرج الصفر میں مقیم ہوا ۔ پھر حارث نے دو سواروں کو طلیعہ کے طور پر بھیجا ۔ ایک ان میں سے حصاف گھوڑی پر سوار تھا ، جس کی گھوڑی بن پاؤں سے چلتی تھی ، مگر ایسی تیز تھی کہ دوئی گھوڑا اس کی گرد کو بھی نہ پہنچتا تھا ۔ غرض یہ دونوں سوار گئے اور لخمیوں میں جا کر مل گئے اور بادشاہ کے قریب تک پہنچ گئے ۔ وہاں اس کے سامنے اس وقت شمع تھی ۔ انھوں نے شمع بردار کو مار ڈالا جس سے وہ لوگ گھبرا گئے اور مضطرب ہو کر اپنی تلواریں نکالیں اور ایک دوسرے کو مارنے لگے ۔ اور صبح تک یہی فساد رہا ۔

پھر اس کے پاس پادشاہ غسان کے سفیر آئے اور صلح کی درخواست کی اور ارادہ دینا منظور کیا اور یہ کہلا بھیجا کہ میں سرداروں کو تقریر حال کے واسطے بھیجتا ہوں اور اپنے اصحاب کو بلایا ، پھر اس نے ان میں سے سو جوان اور ایک قول میں ہے اسی جوان لیے اور انھیں ہتھیار دیے اور اپنی بیٹی حلیمہ سے ان کے خوشبو لگوائی اور لباس پہنوائے ۔ جب لبید بن عمرو حلیمہ کے پاس آیا جو زیتیہ گھوڑے کا سوار تھا تو اس نے حلیمہ کا ایک بوسہ لے لیا اس لیے وہ باپ کے پاس روتی ہوئی آئی ۔ حارث نے کہا وہ ہماری قوم میں ایک شیر ہے ، اگر وہ سلامت لوٹ آیا تو میں تیرا اس سے نکاح کر دوں گا اور پھر اسے قوم کا سردار بنایا اور یہ لوگ روانہ ہوئے ۔ جب لشکر عراق کے قریب پہنچے تو حیرہ کے بادشاہ نے بھی اپنے رئیسوں کو جمع کیا اور غسانی ان کے پاس آئے ۔ جب بادشاہ کے پاس سب پہنچ گئے تو انھوں نے ہتھیار نکالے اور جسے پایا قتل کر دیا اور لبید بن عمرو نے عراقیوں کے بادشاہ کو قتل کر دیا ۔ غسانیوں کو عراقیوں نے گھیر لیا لیکن لبید بن عمرو بچ گیا اور حارث بادشاہ کو آ کر خبر دی ۔ حارث نے کہا میں نے تجھے اپنی بیٹی حلیمہ دی ۔ لبید نے کہا کہیں لوگ یہ نہ کہیں میں سو آدمیوں میں سے بھاگ کر آیا ہوں پھر وہ انھیں لخمیوں کی طرف لوٹ گیا اور لڑ کر مارا گیا ۔ ۔ ''۱

ابھی تک ہم نے ابن الاثیر کے جو بیانات درج کیے ہیں ان میں ان جنگوں سے متعلق مختلف روایات دکھائی دیتی ہیں۔ خود ابن الاثیر نے بھی ان تضادات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

''ان لڑائیوں کی مدت میں اور اس امر میں کہ کون لڑائی پہلے ہوئی اور کون لڑائی پیچھے ہوئی نسابوں اور اہل سیر نے بہت اختلاف کیا ہے ۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ اور نیز اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ مقتول کون ہے ۔ کوئی یوں بیان کرتے ہیں کہ حلیمہ کی لڑائی میں جو شخص مارا گیا وہ منذر ابن ماء السماء تھا اور اباغ کی لڑائی میں جو مارا گیا وہ منذر ابن المنذر تھا اور کوئی بالکل اس کے برخلاف بیان کرتے ہیں ۔ اور بعض راوی ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں یہ دونوں لڑائیاں ایک ہی ہیں دو نہیں۔''۲

۱۔ ابن الاثیر : (ترجمہ عبدالغفور خان) ، ج ۳ ص ۹۳ ، ۹۴ ۔
۲۔ ایضاً ، ص ۹۴ ، ۹۵ ۔

بہرحال اس تضاد کے باوجود یہ امر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ شرر نے یوم حلیمہ کے معرکے سے متعلق جو جزئیات بیان کی ہیں مثلاً ، حلیمہ کا سرداروں کو عطر لگانا ، مرج حلیمہ کے باسندوں کو فوج کے لیے کھانا تیار کرنے پر مامور کرنا ، دو بہادروں کا طلیعہ کے طور پر رات کو نعمان کی فوج میں جا گھسنا اور مرزبان کو قتل کرنا ، اس کے بعد شاہ حیرہ کے لشکر کا تاریکی میں آپس میں لڑنا ، شاہ حیرہ اور شاہ غسان کا یہ طے کرنا کہ پہلے ان کے بیٹے لڑیں اور پھر وہ خود ، شاہ حیرہ کا دھوکہ دے کر ایک پہلوان کو اپنے بیٹے کے طور پر نکالنا ، حارث کے بیٹے ابو کرب کا باپ کے پاس لوٹ کر جانا اور باپ کی طرف سے بزدلی کا طعنہ سن کر پہلوان سے لڑنا اور مارا جانا ، پھر حارث کے دوسرے بیٹے کا اسی پہلوان کے ہاتھوں مارا جانا ، اس پر سمر بن عمرو الحنفی کا جو شاہ حیرہ کے ساتھ تھا احتجاج کرنا اور لشکر سے نکالا جانا ، سمر کا حارث کے لشکر میں آ ملنا اور حقیقت بتانا ، جنگ میں شاہ حیرہ کی طرف سے فروہ بن مسعود بن عمرو بن ابی ربیعہ کا مارا جانا ، وغیرہ واقعات کی تاریخی روایات موجود ہیں۔

شرر نے ناول میں عمرو بن لبید عذری کا ذکر کیا ہے جب کہ ابن الاثیر کے یہاں لبید بن عمرو غسانی کا ذکر ملتا ہے اور مندرجہ بالا اقتباسات میں اس واقعے کا ذکر بھی ہے کہ جب شہزادی حلیمہ سرداروں کو عطر لگا رہی تھی تو لبید نے اس کا بوسہ لے لیا ، حارث الاعرج نے اسے یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ اگر وہ کوئی خاص کارنامہ دکھائے گا تو حلیمہ اسے دے دی جائے گی اور پھر اسی کے ہاتھوں شاہ حیرہ قتل ہوا۔

اب ہم اس ناول میں بیان کردہ تاریخی واقعات کے سب سے کمزور ترین پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شرر نے جنگ عین اباغ اور یوم حلیمہ دونوں میں نعمان بن منذر کا ذکر کیا ہے لیکن یہ امر صحیح نہیں جیسا کہ ابن الاثیر کے مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے یہ جنگیں نعمان بن منذر اور حارث الاعرج کے درمیان نہیں ہوئیں بلکہ منذر کے پیشرو منذر بن ماء السماء یا منذر بن المنذر بن ماء السماء کے درمیان ہوئیں۔ تاریخ العرب قبل الاسلام کے مولف الدکتور جواد علی نے یوم عین اباغ اور یوم حلیمہ کو ایک ہی جنگ قرار دیتے ہوئے مختلف حوالوں سے منذر بن ماء السماء سے متعلق قرار دیا ہے[1] گویا یوم حلیمہ کے معرکے میں مارے جانے والا نعمان نہیں بلکہ منذر تھا۔ ابن خلدون کے یہاں بھی ابن قوطیہ کے حوالے سے یہی مذکور ہے[2]۔ نکلسن بھی مختلف حوالوں سے یہی بیان کرتا ہے کہ یوم حلیمہ میں منذر سوم (منذر بن ماء السماء) ۵۵۴ء میں مارا گیا۔ نکلسن یوم النعم اور یوم بوس کی رسم بھی منذر بن ماءالسماء سے متعلق بیان کرتا ہے۔[3] نعمان بن منذر کا عہد اس کے کئی برس بعد کا ہے ، بقول نکلسن نعمان بن منذر نے ۵۸۰ء تا ۶۰۲ء یا ۵۸۵ء تا ۶۰۷ء حکومت کی[4]۔ نعمان بن منذر کی تخت نشینی کے بارے میں جو واقعات شرر نے بیان کیے ہیں وہ درست ہیں۔ ابن الاثیر نے یہ واقعات بیان کیے ہیں کہ عدی بن زید تمیمی اور اس کے بھائی کسریٰ کے پاس رہتے تھے اور بالکل انھیں کے ہوگئے تھے۔ جب منذر بن المنذر بادشاہ ہوا تو اس

۱- تاریخ العرب ، ج ۳ ، ص ۶۳ -

۲- ابن خلدون : (ترجمہ عنایت اللہ)، ج ۱ ، ص ۱۷۳ ، ۱۷۴ ، ۵۲۹ تا ۵۶۹ -

۳- نکلسن : A literary History of the Arabs ، ص ۴۳ -

۴- ایضاً ، ص ۴۵ -

نے اپنے بارہویں بیٹے نعمان کو عدی بن زید کی گود میں دے دیا ۔ منذر کے دوسرے گیارہ بیٹے گورے چٹے اور خوبصورت تھے اسی لیے اشاہب کہلاتے تھے جب منذر ابن المنذر مر گیا تو کسریٰ نے چاہا کہ کسی کو بادشاہ مقرر کیا جائے ۔ عدی کے مشورے سے سب کو طلب کیا گیا ۔ عدی نے نعمان کو ایک سوال کا جواب سکھا دیا اور کسریٰ نے سب سے وہی سوال کیا ۔ نعمان کا جواب پسند آیا اسے بادشاہ مقرر کیا گیا ۔ نعمان بدشکل اور پست قد تھا ۔ بعدازاں لوگوں نے نعمان کو عدی بن زید کے بارے میں بدگمان کرنا شروع کر دیا ، نعمان نے عدی کو حیرہ میں بلایا اور قید کر دیا ، کسریٰ نے رہائی کی سفارش کی لیکن نعمان نے عدی کو قید خانے میں ہی قتل کروا دیا ۔ پھر نعمان ایک مرتبہ شکار کے لیے گیا ہوا تھا جہاں اسے عدی کا بیٹا زید مل گیا ، نعمان نے اس کے باپ کے بارے میں اس سے بہت کچھ معذرت کی ، زید بن عدی کو سفارشی خط کے ساتھ کسریٰ کے پاس بھیجا ۔ کسریٰ نے زید بن عدی کو اس کے باپ کی جگہ مقرر کر دیا ۔ وہ جملہ تحریرات اس کے ذریعے سے ہوتی تھیں جو عربوں کو بھیجی جاتی تھیں ۔ زید کے دل میں نعمان سے بغض و انتقام کا جذبہ تو موجود ہی تھا جب اس نے کسریٰ کے دربار میں اچھی طرح قدم جما لیا تو ایک مرتبہ اس کے سامنے ایک تحریر پیش کی جو خوبصورت عورتوں کی صفات سے متعلق عجم کے شاہی خزانے میں موجود تھی ۔ یہ تحریر دراصل منذر نے نوشیروان کو ایک لڑکی بھیجتے ہوئے اس لڑکی کی صفات میں لکھ بھیجی تھی ۔ نوشیروان نے ان صفات کو خود لکھوا کر عجمی خزانے میں رکھوا دیا تھا ۔ زید بن عدی نے خسرو پرویز کو بتایا کہ ان صفات کی عورتیں نعمان کے یہاں ہیں ، اس کی بیٹی اور اس کے چچوں کی بیس سے زیادہ بیٹیاں انھی صفات کی ہیں ۔ کسریٰ نے کہا کہ نعمان کو پیغام بھیج دیا جائے تو زید نے جواب دیا وہ اس طرح ہر گز نہیں بھیجے گا بلکہ چھپا دے گا اس لیے زید کے ساتھ عربی دان عجمی سردار کو بھیج دیا جائے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ نعمان نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ کسریٰ کو ان حسین عورتوں کی موجودگی میں ان کی کیا ضرورت ۔ اس کا زید نے اپنے ساتھی کو یہ ترجمہ سمجھایا کہ کیا کسریٰ کے لیے ادھر کی گائیں کافی نہیں ۔ پھر خسرو پرویز کو بھی انھوں نے خوب بھڑکایا ۔ خسرو پرویز نے نعمان کی طلبی کے لیے آدمی بھیجا ۔ نعمان کو کسریٰ کی برہمی کا علم ہو چکا تھا ، وہ اپنا مال و منال ، آل و عیال لے کر نکلا ، قبیلہ بنی طے کے پہاڑوں میں اپنے سسرال کے یہاں گیا لیکن انھوں نے کسریٰ کے خوف سے اعانت سے انکار کر دیا ۔ پھر ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا آخر بنی شیبان کے پاس ذی قار میں آیا اور ان کے سردار ہانی بن مسعود بن عمرو الشیبانی نے ہر طرح مدد کا یقین دلایا ۔ نعمان اپنے آل و عیال ، مال دولت اور چار سو یا آٹھ سو زرہوں اور اسلحہ کو ہانی کے پاس امانت چھوڑ کر دربار عجم میں حاضری کے لیے روانہ ہوا ، ساباط کے پل پر اسے زید بن عدی ملا اور اس کی گفتگو سے اسے یقین ہوگیا کہ سب کیا دھرا اسی کا ہے ۔ قصر کے دروازے پر پہنچتے ہی اسے قید کر دیا گیا اور بعض روایتوں میں ہے کہ بعد میں نعمان کو ہاتھی کے پیر سے کچلوا کر مار دیا گیا[1]۔

نکلسن کے یہاں بھی یہ واقعات اسی طرح بیان ہوئے ہیں جس طرح ابن الاثیر کے یہاں ملتے ہیں ۔ ہاتھی کے پاؤں سے نعمان کو مروا دینے کا بیان نکلسن کے یہاں ہے ، ابن الاثیر نے

۱۔ ابن الاثیر : (ترجمہ عبد الغفور خاں) ، ج ۳ ، ص ۲۶۴ تا ۲۷۲ ۔

صرف نعمان کے مارے جانے کا ذکر کیا ہے[1]۔ ابن خلدون نے یہی واقعات بیان کیے ہیں اور نعمان بن منذر کا عہد حکومت ۲۲ سال بیان کیا ہے ۔ دیگر تفصیلات وہی ہیں[2]۔

ان بیانات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شرر نے نعمان بن منذر کو جس طرح یوم حلیمہ میں قتل ہوتے دکھایا ہے، وہ غلط ہے، یوم حلیمہ میں نعمان کا دادا مارا گیا تھا۔ علاوہ ازیں شرر نے زید بن عدی کی سازشوں کا شکار منذر بن نعمان کو دکھایا ہے یہ صحیح نہیں بلکہ خود نعمان جس نے عدی بن زید کو قتل کیا تھا اس کے بیٹے زید بن عدی کی سازش کا شکار ہو کر خسرو پرویز کے ہاتھوں قتل ہوا ۔

غرض ان بیانات کے سلسلے میں شرر نے نعمان بن منذر کے واقعات زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، کچھ خود اس سے اور کچھ اس کے بیٹے منذر بن نعمان سے متعلق بیان کر دیے ہیں ۔

ایام عرب میں بعض ایسے واقعات کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں جن کا ناول کے پلاٹ سے تو کوئی تعلق نہیں لیکن وہ عرب معاشرت میں ضرب المثل بن چکے تھے ۔ علاوہ ازیں بعض اشخاص کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں اور بعض عقاید اور روایتی کہانیوں کا بھی ذکر ہے۔ سطور ذیل میں ایسے جملہ متفرق واقعات ، ضرب الامثال اور عقائد کا مختصر ذکر کیا جا رہا ہے ۔

تیسرے باب میں عرب کے شاعر لبید کا ذکر آیا ہے ۔ لبید عرب کے مشہور شعراء میں سے تھا اس نے ۱۴۵ برس کی عمر پائی جس میں سے ۹۰ سال ایام جاہلیت اور ۵۵ سال اسلام کے دور میں گزارے ۔ لبید نے حضرت معاویہ کے عہد میں انتقال کیا ۔ لبید نے اسلام کے بعد اپنے دور جاہلیت کے شعر سنانا قطعاً موقوف کر دیا تھا ۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک مرتبہ کوفہ کے والی مغیرہ بن شعبہ کو کسی مشہور شاعر کو بھیجنے کے لیے لکھا ، انہوں نے لبید کو کہا ۔ حضرت عمرؓ نے شعر سنانے کے لیے اصرار کیا اور آخر لکھ بھیجنے کا کہا ۔ لبید نے گھر سے سورہ بقرہ لکھ بھیجی ۔ حضرت عمر فاروقؓ نے خوش ہو کر وظیفہ مقرر کر دیا ۔ لبید پہلے نعمان کے دربار میں تھا وہاں سے حارث اعرج کے پاس چلا گیا تھا ۔

چھٹے باب میں قرقرہ کی زبانی لکھا ہے کہ ”کم از کم بس شادیاں کیں لیکن ہر زفاف کی صبح کو بیٹھا منتظر رہا کہ بی بی ناشتہ لائے گی لیکن ناشتہ کی بجائے لونڈی نے آ کر گھر سے نکال دیا ۔“ یہ دراصل مذاق میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جاہلیت میں اکثر عورتیں نکاح کے فسخ و بقا کو اپنے ہاتھ میں رکھتی تھیں ۔ شب عروسی کے بعد صبح چاہتیں تو خاوند سے تعلق رکھتیں یا نکاح فسخ کر دیتیں ۔ ایسی عورتوں میں عمر بنت سعد (آم خارجہ) ، ماریہ بنت حعید ، عاتکہ بنت مرسلمہ ، فاطمہ بنت خرشب اغاریہ بہت مشہور تھیں جنھوں نے کئی کئی نکاح کیے ۔ ام خارجہ کا تو چلتے چلتے باتوں باتوں میں ایجاب و قبول ہو جاتا تھا ۔ روایت ہے کہ ایک بار بیٹے کے ساتھ جا رہی تھی کہ دور سے کوئی جاتے نظر پڑا ۔ پوچھا کون ہوگا ، بیٹے نے کہا کوئی نکاح کا خواستگار ، تو بولی خدارا جلد قدم بڑھا کے چلو ۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی ایسا قبیلہ نہ تھا جس میں اس عورت نے نکاح کر کے اپنے بطن سے جیتی جاگتی یادگاریں

۱- نکلسن : A Literary History of the Arabs ، ص ۳۵ تا ۴۹ ۔

۲- ابن خلدون : (ترجمہ عنایت اللہ) ، ج ۱ ، ص ۱۴۲ تا ۱۴۶ ۔

نہ دی ہوں ۔ ان عورتوں کا یہ معمول تھا کہ جسے رکھنا ہوتا نکاح کی دوسری صبح اس کے لیے ناشتہ لے کر جاتیں ورنہ لونڈیوں سے نکلوا دیتیں ۔ اسی باب میں ان باتوں کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر کوئی راستہ بھول جائے تو کپڑے الٹے پہننے سے راستہ مل جاتا تھا ۔

چودھویں باب میں طلح اور خولہ کے مکالموں میں پانی کے سلسلے میں زرقاء یمامہ کی آنکھوں اور سردار قریش کے اونٹ کی ٹھوکر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ زرقاء یمامہ کی ایک لڑکی تھی جو بہت دور سے دیکھ لیتی تھی اور اس کی تیز آنکھوں کے قصے عربوں میں مشہور تھے ۔ سردار قریش سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جد امجد عبدالمطلب ہیں ، انھوں نے چشمۂ زمزم کو ، جو پٹ کے بند ہو گیا تھا پھر کھود کے نکالا اور جب قریش نے اس خوش نصیبی میں شریک ہونے کا ارادہ کیا تو وہ سب کو لے کے کسی کاہن سے ملنے کو چلے تا کہ اس کے فیصلے پر عمل کریں ۔ راستے میں پانی ختم ہو گیا اور سب لوگ پیاس سے یہاں تک پریشان ہوئے کہ اپنی اپنی قبر کھود کے بیٹھ گئے ۔ اتفاقاً حضرت عبدالمطلب کے اونٹ کی ٹھوکر سے ایک چشمہ جاری ہوا جس سے سب کو زندگی ملی اور سب نے خود ہی تسلیم کر لیا کہ زمزم کے ڈھونڈنے اور کھودنے کا مستحق ان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔

سولھویں باب میں طلح برہنہ ہو کر منذر کے قدموں میں گر پڑتا ہے ۔ یہ دراصل عربوں کی دور جاہلیت کی اس رسم کی طرف اشارہ ہے کہ جس شخص کو فریاد کرنی ہوتی تو وہ اپنی بےکسی ظاہر کرنے کے لیے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے اپنی مدد پر آمادہ کرنے کے لیے برہنہ ہو جاتا تھا ۔ اسی باب میں قبیلہ بنی طے کا ذکر کرتے ہوئے شہزادی ہند کی زبانی لکھا ہے کہ "ان کی ہر عورت رقاش بنی ہوئی ہے ۔" رقاش نامی ایک عورت بنی طے میں گزری تھی جو بڑی شہسوار تھی اور خود میدان جنگ میں آ کے معرکہ آرا ہوتی ۔ ایک مرتبہ اس نے قبیلۂ بنی ایاد پر حملہ کیا اور شکست دے کر بہتوں کو گرفتار کر لیا ۔ اسیروں میں ایک خوش رو نوجوان بھی تھا جسے اس نے اپنی خدمت کے لیے منتخب کیا ۔ آخر اسی نوجوان سے ناجائز تعلقات کی بنا پر وہ قبائل عرب میں بدنام ہوئی ۔

ناول میں شرر نے ایاس بن قبیصہ طائی سے متعلق جو واقعات بیان کیے ہیں اُن میں سے یہ امور صحیح ہیں کہ ایاس بن قبیصہ نے اس وقت خسرو پرویز کو ممنون احسان کیا جب وہ روم کی طرف بھاگ رہا تھا ۔ نعمان بن منذر کے مارے جانے پر کسریٰ نے ایاس کو حیرہ کا حکمران مقرر کیا تھا[1] ۔

یوم ذی قار سے متعلق شرر نے جو تفصیلات بیان کی ہیں اُن میں سے بہت سی جزئیات صحیح ہیں لیکن عجمی لشکر کے سرداروں کے جو نام انھوں نے بیان کیے ہیں اُن کی تصدیق نہیں ہوتی ۔ ابن الاثیر کا بیان ہے کہ کسریٰ نے زید کے چکمے میں آ کر جو لشکر بھیجا تھا اس نے ذی قار میں ہانی بن مسعود کے پاس نعمان بن زرعہ کو یہ شرائط دے کر بھیجا کہ یا وہ بے شرط قید ہو جائیں ، یا اپنا ملک چھوڑ کر کہیں اور نکل جائیں یا لڑیں ۔ عربوں نے حنظلہ بن ثعلبة العجلی کی رائے کو صائب قرار دے کر اسے جواب کا مجاز بنایا ، اس نے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا ۔ ہانی نے زرہیں اور ہتھیار لوگوں میں تقسیم

۱۔ ابن خلدون : (ترجمہ عنایت اللہ) ، ج ۱ ، ص ۱۲۶ ۔

کر دیے ۔ حنظلہ نے کجاووں کے تنگ کاٹ دیے ، اس لیے اس کا لقب مقطع الوضن ہوگیا ۔ حنظلہ نے اپنے واسطے ایک قبہ کھڑا کر دیا اور قسم کھائی کہ جب تک قبہ نہ بھاگے گا وہ نہ بھاگے گا ۔ قرین الشسانی کی بٹی نے اس موقع پر حو رجزیہ اسعار پڑھے وہ بھی شرر نے درست درج کیے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ ارشاد کہ یہی پہلا معرکہ ہے جس میں عربوں نے عجمیوں سے اپنا انتقام لیا ۔ روایت ہے کہ آپ؏ نے یہ ارشاد اسی دن فرمایا جس دن ذی قار میں عربوں کو فتح ہوئی ۔ یہ واقعہ بعثت نبوی کے بعد کا ہے اور آپ؏ ابھی مکہ معظمہ میں ہی قیام بذیر تھے[1]۔

خسرو پرویز کے بارے میں بیان کردہ واقعات میں سے اکثر درست ہیں مثلاً ہرمز کے خلاف بہرام کی بغاوت ، پرویز کے ماموں بندویہ اور بسطام کا ہرمز کو اندھا کرنا ، پرویز کا بہرام سے شکست کھانا ، موریق کے پاس بھاگنا ، ہرمز کا قتل، بہرام چوبیں کا بادشاہ بننا ، پرویز کا موریق کی بیٹی مریم سے بیاہ کرنا اور اس کی مدد سے دوبارہ سلطنت حاصل کرنا نیز ملکہ شیریں سے متعلق بیانات کی تصدیق کتب تواریخ سے ہوتی ہے[2]۔

۷- مقدس نازنین

شرر کا یہ تاریخی ناول مسیحت اور بالخصوص پاپائیت کے ایک عجب و غریب واقعہ سے متعلق ہے جس کے بارے میں مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ یہ ناول ۱۹۰۰ء میں لکھا گیا ۔ ناول میں بیان کردہ تاریخی واقعات کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

"انگلستان کے سہر وِنچسٹر میں ایک بشپ اور کچھ راہب تبلیغ دین کے لیے مختلف ممالک کا دورہ کرتے ہوئے آئے تھے اور خیمے لگا کر قیام پذیر تھے۔ فرانس کے کلیسا سے متعلق نوجوان جرمن بسپ لزارس کے سامنے ایک دن ایگنس نامی ایک خوبرو دوشیزہ نے اعتراف گناہ کرتے ہوئے اپنے عاشق ہنری کا ذکر کیا ۔ پادری نے بہت کرید کرید کر اور دلچسپی لے کر تفصیلات پوچھیں اور پھر گفتگو کے لیے اسے نجی خیمے میں لے گیا ۔ خیمے کے دروازے پر پہنچنے سے پہلے ہنری بھی وہاں پہنچ گیا ۔ بشپ اس کی مداخلت سے سخت برہم ہوا اور اسے راہبوں کی حراست میں دے دیا ۔ تخلیے میں بشپ نے ایگنس کو اس امر پر آمادہ کر لیا کہ وہ مردانہ لباس میں اس کے ساتھ رہ کر دینی علم حاصل کرے اور شہرت پائے ۔ اس موقع پر اچانک خانقاہ کے خیمے کو آگ لگ گئی ، بشپ بھی آگ بجھانے والوں کی مدد کو لپکا ، اتنے میں چند لوگ ایگنس کو زبردستی اٹھا لے گئے ۔ لزارس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ سب ہنری کی شرارت ہے ۔ اس نے راہبوں کو ہنری کے حاضر کرنے کا حکم دیا تو اسے یہ معلوم کر کے سخت غصہ آیا کہ ہنری ان سب راہبوں کو مار پیٹ کر بھاگ گیا تھا ، وہ اس کے تعاقب میں گئے ہوئے تھے کہ پیچھے سے کسی نے خانقاہ میں آگ لگا دی تھی ۔

لزارس سوچنے لگا کہ انگلستان کے بشپ کو لکھ کر ہنری کو سزا دلوائی جائے ، اتنے میں ایگنس کی ماں ایموجن آ گئی ۔ اس نے لزارس کے سامنے ایگنس کی تعریفیں اور ہنری کی

---

(1) ابن خلدون : (ترجمہ عنایت اللہ) ج ۱ ، ص ۱۴۷ ، ۱۴۸ ۔

(11) ابن الاثیر : ج ۳ ، ص ۲۶۴ ، ۲۷۲ تا ۲۷۴ ۔ ۲ - ایضاً ، ج ۳ ، ص ۲۴۴ تا ۲۵۱ ۔

برائی بیان کر کے کہا کہ تھوڑی دیر ہوئی ہنری اور اس کے ساتھی ایگنس کو گھر چھوڑ کر گئے ہیں لیکن ان کے باہمی مشوروں سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید رات کو آ کے بھگا لے جائیں ۔ ایموجن نے تجویز کیا کہ لزارس جا کر ایگنس کو سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ خانقاہ میں لے آئے ، ایموجن کے لیے اس کی نگہداشت مشکل ہے ۔ لزارس ایموجن کے ساتھ اس کے گھر گیا جو شہر سے بہت دور ایک ویرانے میں واقع تھا ۔ جب مکان کے اندر داخل ہوا تو ہنری اور اس کے ساتھیوں نے اسے باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا ۔ پھر برہنہ کر کے باہر نکالا ، پشت پر کوڑے برسائے ، بعد ازاں اسے جسم ڈھانپنے کے لیے ایک چادر دے دی گئی ۔ اتنے میں راہبوں کا ایک گروہ آیا اور اسے زبردستی پکڑ کر ویسٹمنسٹر کی خانقاہ میں لے گیا ۔ اس نے بہترا کہا کہ وہ فرانس کا بشپ ہے لیکن انھوں نے ایک نہ سنی اور خانقاہ کے تہہ خانے میں ایک مخصوص حالت میں کھڑا کر دیا ۔ اس اذیت میں لزارس بار بار گرتا اور پھر کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا جاتا ۔ ایک دن بعد خانقاہ کا بشپ خود آیا اور معذرت چاہی کہ انھیں لزارس کی اصلیت کا علم نہ تھا ۔ لزارس اپنی خانقاہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ لوٹا جو اسے چھڑانے گئے تھے ۔ اس نے راہبوں کے سردار دانیال کو سب ماجرا سنایا اور ایگنس سے اپنی محبت کا ذکر بھی کیا ۔ دانیال اسی وقت لزارس کے مشورے سے ایگنس اور اس کی ماں کو طلب کرنے گیا۔ ایموجن خوف زدہ تھی ، ایگنس اسے تسلی دے کر لزارس کے پاس حاضر ہوئی اور اسے یقین دلایا کہ وہ دونوں ماں بیٹی اس سازش سے بالکل بے خبر تھیں ۔ جب اس کی ماں لزارس کو بلانے آئی تھی تو اس دوران ہنری آیا اور اس نے ایگنس کو اپنے گھر لے جا کر بند کر دیا اور خود اپنے دوستوں سمیت ان کے گھر آ بیٹھا ۔ ایگنس نے لزارس کے ساتھ مردانہ روپ میں چلنے پر آمادگی ظاہر کی اور اس سے راہبوں کا لباس لے کر دوسری رات تیار رہنے کا وعدہ کر کے لوٹ گئی ۔

ایگنس نے لزارس کے پاس سے لوٹ کر جب اپنی ماں کو ماجرا سنایا تو وہ بہت بے تاب اور غمگین ہوئی اور روتی بیٹی گھر سے نکل گئی ۔ دوسری رات لزارس نے راہبوں کو سامان سمیت روانہ ہو کر شہر سے باہر دو میل پر انتظار کرنے کا حکم دیا اور خود دانیال اور دس راہبوں کے ساتھ ایگنس کے گھر کی طرف گیا ۔ اس نے اندھیرے میں ایگنس کو تیار پایا اور اسے ساتھ لے کر چل پڑا ۔ کچھ دور ایک سرائے کے قریب ایگنس نے پیاس کی شکایت کی ، سرائے میں پہنچ کر یہ حقیقت کھلی کہ ہنری اور اس کے ساتھی وہاں موجود ہیں اور لزارس کے ساتھ ایگنس کی بجائے ہنری کا ایک نوعمر دوست ہے ۔ ہنری کے ساتھیوں کی تعداد زیادہ تھی ، وہ راہبوں کو مار پیٹ کر بھاگ نکلے ۔ اب لزارس کو بھی ایگنس کے لیے جانے کی ضد سی ہو گئی ، وہ آگے بڑھ کر پہلے سے روانہ شدہ راہبوں کے ساتھ ملا اور سب ایک بڑی سرائے میں ٹھہر گئے ۔

اپنے قیام کا انتظام کرنے کے بعد لزارس دانیال ، چند راہبوں اور سرائے والے کے ساتھ گدھوں کے باندھنے کے لیے ایک جگہ دیکھنے نکلا ۔ راستے میں انھیں کچھ آہٹ سی معلوم ہوئی اور پھر یوں محسوس ہوا کہ کوئی زور سے بھاگا ہے ۔ اس کے بعد دو عورتیں سامنے آئیں اور ایک نے اپنا نام مرتھا ظاہر کر کے بتایا کہ وہ ایگنس کو ساتھ لائی ہے ۔ لزارس بدگمانی کی وجہ سے اسے بھی ہنری کی چال سمجھا ۔ ایگنس کو اس نے قریب بلایا اور آواز پہچان نہ سکنے پر اسے ایک قریبی گڑھے میں دھکا دے دیا ۔ ایگنس نے گرتے ہوئے جو چیخ و فریاد کی اس پر

لزارس نے اسے پہچان لیا ۔ بڑی مشکل سے سب نے مل کر اسے اس ویرانی گڑھے سے نیم جان بے ہوشی کی حالت میں نکالا اور سرائے میں لا کر گرم کیا ۔ دوسری صبح سفر ملتوی رہا ۔ ایگنس نے لزارس کو ماجرا سنایا کہ اس کی ماں نے ہنری سے مدد طلب کی تھی اور انھوں نے ایگنس کو مقررہ وقت پر کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا ۔ پھر مرتھا نے اچانک آ کر اسے رہائی دلوائی اور ساتھ لے آئی ۔ راستے میں ہنری نے دیکھا لیکن مزاحم نہ ہوا ۔ اسی رات سرائے میں قیام کے دوران ہنری نے ایگنس اور لزارس کو الگ الگ فریب دے کر خوب بھٹکایا اور اذیت دی لیکن وہ ایگنس کو زبردستی اٹھا لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکا ۔

دوسرے دن علی الصباح لزارس کا قافلہ مذہبی تقدس کی شان سے لندن کو روانہ ہوا ۔ چار دن اطمینان سے سفر کیا تھا کہ پانچویں دن راستے میں ہنری کے ساتھیوں نے پھر فریب دے کر انھیں غلط راہ پر ڈال کر دلدل میں پھنسا دیا ۔ جب گدھے گردن تک دلدل میں پھنس گئے اور سب زندگیوں سے نامراد ہوگئے تو کنارے سے ہنری کی آواز آئی کہ صرف ایگنس کی جان بچائی جا سکتی ہے ۔ ہنری کی بے رحمانہ اور طعن آمیز گفتگو پر ایگنس کو سخت غصہ آیا ، اس نے جدوجہد کی اور اس کی حاضر دماغی اور کوشش سے سب کی جان بچ گئی ۔ قریب کے دیہاتیوں کو بلا کر آٹھ گدھے بھی بچا لیے گئے ، ضائع ہونے والے گدھوں کی کمی پورا کرنے کے لیے دیہاتیوں نے باقی چھ گدھے دیے اور اس طرح یہ قافلہ بدقت لندن پہنچا ۔ وہاں ایک ہفتہ کے قیام کے دوران لزارس کے دیگر ساتھی بھی آ ملے جو وہیں قیام پذیر تھے ۔

لندن سے لزارس اپنے چالیس ساتھیوں کو لے کر چار دن کے سفر کے بعد آبنائے انگلستان کے ساحل پر پہنچا ، جہازوں کی تعداد تھوڑی ، مسافر زیادہ اور سمندر متلاطم تھا ۔ بشپ نے والی سے مل کر مراعات حاصل کرنی چاہیں لیکن اسے بتایا گیا کہ اس کے خلاف ہنری کا دعویٰ ہے اور اسے ایگنس کے سلسلے میں ملکی قوانین کے تحت ہنری سے ڈوئل کرنا پڑے گا ۔ لزارس نے اپنا مذہبی حق استعمال کرتے ہوئے راہبوں میں سے ایک مشہور سپہ گر ہرمن کو نامزد کیا جس کے تیسرے ہی وار میں ہنری شدید زخمی اور نیم جان ہو کر بے ہوش گر پڑا ۔ گردن کی رگ کٹ جانے سے بہت خون بہا ، ایگنس جو مردانہ لباس میں تھی اس منظر پر چیخ کر بے ہوش ہوگئی ، دیگر راہب اسے اٹھا لے گئے ، پھر والی نے سمندر میں تلاطم کے باوجود کپتان کو حکم دیا کہ لزارس اور اس کے ساتھیوں کو پار پہنچائے ۔

ایگنس کو چھ گھنٹے بعد ہوش آیا تو جہاز آبنائے انگلستان کو پار کر رہا تھا ۔ فرانس پہنچ کر انھوں نے پندرہ دن کے لیے قیام کرکے ادھر ادھر سیر کی ۔ اب ایگنس ہر وقت زیادہ تر و تازہ محسوس ہونے لگی اور لزارس کی بے کلی میں بھی اضافہ ہونے لگا ۔ پندرہ دن بعد سفر شروع ہوا ، دس دن بعد لوٹیشیا (پیرس) پہنچے ۔ اس وقت وہاں لوئیس شارلمین کا جانشین تھا ۔ ایگنس چاہتی تھی کہ ہر وقت لزارس کے قریب رہے لیکن یہاں اسے کیتھڈرل سے متعلق بڑی خانقاہ میں ٹھہرنا پڑا ۔ اگرچہ وہ مردانہ لباس میں تھی مگر تاڑنے والی نگاہیں بھانپ لیتی تھیں ۔ ایگنس کو پتہ چلا کہ سپین کے مسلمانوں کا ایک جہاز ارض شام کی طرف حجاج کو لیے جا رہا تھا کہ عیسائی بحری لٹیروں کے ہاتھ پڑ گیا حجاج کو اب ماس کی مقدس تقریب کے دن بڑے کنیسہ کے دروازے پر ذبح کیا جائے گا ۔ لزارس نے بتایا کہ وہ دو تین دن بعد الہانیہ کے شہر فولڈا جائیں گے تاکہ وہاں سکون سے علم حاصل کر سکیں لیکن دوسرے دن لزارس لوٹیسیا کے اسقف اعظم

کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا۔ ایگنس مغموم اور متردد تھی، ایک معمر راہب جس سے پہلے دن لزارس کی معیت میں ملاقات ہوئی تھی آ کر اسے ساتھ لے گیا۔ اس نے ایگنس کے لیے یوحنا نام تجویز کیا، اسے ایک خانقاہ کی منتظمہ سسٹ اگسٹس کے سپرد کرکے چلا گیا۔ ایگنس نے وہاں منتظمہ کے مشورے سے ننوں کا لباس پہن لیا۔ اسی دن جب ساٹھ اسیر مسلمان مرد اور عورتوں کو مقتل گاہ میں لایا گیا تو بوڑھے راہب اور ایگنس نے مشورہ کرکے منتظمہ کو آمادہ کیا کہ ان میں سے دو چار کو ان کی غلامی کے لیے بخش دیا جائے۔

مقتل گاہ میں ہزاروں لوگ موجود تھے، اسقف اعظم اور بادشاہ لوئس بھی وہیں تھے۔ منتظمہ اگسٹس نے اسقف اعظم سے تین قیدی مانگے، اس کی درخواست قبول ہوئی اور جب دوسرے مسلمان قتل ہو رہے تھے، بوڑھے راہب کے بتانے کے مطابق ایک دس سالہ مسلمان، ایک علی نامی نوجوان اور اس کی بہن سلمیٰ کو بچا لیا گیا۔ ایگنس اور راہب ان قیدیوں کو لے کر خانقاہ پہنچے۔ سسٹ اگسٹس نے لزارس کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنے کا وعدہ کیا۔ دوسرے دن راہب نے بتایا کہ لزارس کو انگلستان سے آئی ہوئی ایک شکایت پر گرفتار کیا گیا ہے۔ ایگنس کی تلاش جاری ہے، لزارس کا بھی یہی مشورہ ہے کہ ایگنس فولڈا چلی جائے۔ چنانچہ راہب نے پانچ گھوڑوں کا انتظام کیا اور سلمیٰ ننوں کا اور باقی راہبوں کا لباس پہن کر اسی رات خانقاہ کو خیرباد کہہ گئے۔

یہ قافلہ جب فولڈا کی دینی درسگاہ میں پہنچا تو انہیں وہاں قیام کی جگہ مل گئی۔ یوحنا (ایگنس) کا تعارف انگلستان کے امیرزادے کی حیثیت سے ہوا، اسے داخلہ مل گیا۔ چند دن بعد راہب نے علی کو بھی مرقس کے نام سے داخل کرا دیا اور ایگنس کی ہر طرح کی نگہداشت کی تاکید کرکے وہ خود سلمیٰ اور دوسرے مسلمان کو لے کر بیت المقدس کی طرف روانہ ہوگیا۔ ایگنس نے بہت جلد لاطینی اور یونانی کی صرف و نحو ازبر کر لی، استاد بھی اس کی ذہانت کے معترف تھے۔ ایک دن لزارس وہاں ایک عورت کے روپ میں آ پہنچا۔ اس نے بتایا کہ جب فرانس والے اس سے ایگنس کے بارے میں کچھ معلوم نہ کر سکے تو اسے پاپائے روم کے پاس بھیج دیا جہاں اس کے لیے قتل کی سزا تجویز ہوئی لیکن وہ حیلے سے ایک رات حجرے کے تہہ خانے میں ایک عورت کو جو ولیوں کے ڈھانچوں کی زیارت کے لیے آئی تھی قتل کرکے اسی کا لباس پہن کر بھاگ نکلا اور دو ماہ میں فولڈا پہنچا۔ ایگنس نے اسے بھی مردانہ کپڑے پہنا کر ایرسموس کے نام سے وہیں داخل کرا دیا۔ علی کو لزارس کی نگاہوں میں ہوس دکھائی دیتی تھی، ایک دن اس نے ایگنس کو خبردار کیا، لزارس نے سنا، تلخی ہوئی اور جب تنہائی میں لزارس نے ایگنس پر دست درازی کرنی چاہی تو ہنری کمرے میں جا پہنچا۔ ہنری پندرہ دن سے اسی خانقاہ میں موجود تھا۔ ہنری لزارس کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن ایگنس کے اشارے پر علی نے اسے پکڑ کر باندھ دیا اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر تینوں حجرے کا دروازہ باہر سے بند کرکے اپنے سامان لے کر خانقاہ سے نکل گئے۔

مذکورہ واقعے کے ایک سال بعد یہ لوگ مختلف ملکوں کی خاک چھانتے ہوئے یونان میں اثینیہ (ایتھنز) پہنچے۔ یہاں تحصیل علوم کے بعد ایگنس نے خانقاہ میں رات دن ریاضتیں شروع کر دیں۔ دو برس کا عرصہ گذر گیا لیکن اب اس کی صورت پہچانی نظر نہ آتی، سوکھ کر کانٹا ہوگئی، دنیا و ما فیہا سے بےخبر رہنے لگی۔ لزارس کی بےکلی بھی بڑھتی جا رہی تھی اور اب وہ علی کو

اپنا رقیب سمجھنے لگا تھا ۔ علی اسے جھوٹی تسلیاں دیتا رہا ۔ ایک دن ہنری وہاں آ پہنچا اور لزارس کو قتل کر دیا ، مرقس (علی) آیا تو ہنری نے اس پر بھی وار کیا ، علی نے اسے گرا لیا لیکن ہنری نے اسے چکمہ دے کر ایک دوسرا خنجر نکال کر اس کے سینے میں گھونپ دیا ۔ پھر دونوں لاشوں کو گٹھڑی میں باندھ کر نکلا ، دیوار سے باہر پھینک کر خود بھی کودا ۔ پہرہ دار ہوشیار ہوا تو ہنری پھر گٹھڑی اٹھا کر بھاگا ۔ لزارس کی لاش گر پڑی لیکن دوسری لاش کو وہ ہمراہ لے جانے میں کامیاب ہوگیا ۔ ایگنس کو سخت صدمہ ہوا، اسے ہنری کا ایک خط بھی ملا جس میں اس نے دونوں کے قتل اور مرقس کی لاش کو ایک گڑھے میں پھینک دینے کا اعتراف کیا تھا ۔ ایگنس اب وہاں بددل ہوگئی تھی اور اس بوڑھے راہب کے پاس بیت المقدس جانا چاہتی تھی لیکن خانقاہ کے راہب اور مدرسے کے منتظم نے اسے پوپ کے نام خطوط دیے اور کہا کہ وہ روم جائے جہاں ایک خانقاہ کے منتظم کی اسامی خالی ہے، اس پر اس کا تقرر ہو سکے گا اور جلد ترقی ملے گی ۔

ایگنس یوحنا کے روپ میں وہاں سے روانہ ہو کر رومیاما، ونشسا کے شہروں سے ہوتی ہوئی دینی مقتداؤں کے لباس میں ہنگاریہ اور پھر وینس پہنچی ۔ وینس سے ملان ہوتی ہوئی روما کے دارالسلطنت میں پہنچی ۔ اب ایگنس کی پرانی عادتیں پھر عود کر آئی تھیں لیکن اب ان کے ساتھ شرم کی بجائے بےباکی تھی ۔ سینٹ پٹرس کی خانقاہ میں دو چار روز کے قیام میں اس کے علم و فضل کا دور دور شہرہ ہوگیا ۔ ہر طرف سے لوگ زیارت کو آنے لگے ۔ ہفتہ بھر میں کئی خانقاہوں کے بڑے بڑے راہبوں کے دل اس کے مراقبوں کے سامنے مغلوب ہوگئے ، حتیٰ کہ روما کا پوپ سینٹ لیو چہارم بھی جو ۸۴۷ء سے دین مسیحی کا مقتدا اور حضرت مسیح[ع] کا جانشین تھا اس کے ملنے کا مشتاق ہوگیا لیکن جب یوحنا نے خود حاضری نہ دی تو مقدس لوگوں کا وفد بھیجا ، ملاقات کا وقت مقرر ہوا ، اس دن استقبال کا خاص اہتمام ہوا ، دربار خاص میں پوپ نے یوحنا سے تبادلہ خیال کیا ۔ پوپ اس کے سامنے بہت انکسار سے کام لے رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس پر یوحنا کی روحانی قوتوں کا بڑا اثر ہے ۔ یوحنا نے خطوط پیش کیے، پوپ نے اسے مسیحی دنیا کے سب سے بڑے کالج کا مدرس اعلیٰ مقرر کر دیا جہاں جلد ہی اس کے علم و فضل کے علاوہ اس کی عاملیت اور روحانیت کا بھی زبردست چرچا ہوا ۔ اب اس کا شباب بھی دن بدن پھر نکھرنے لگا ۔ ہنری وہاں بھی ایک دن زنانہ روپ میں پہنچا لیکن خلوت گاہ میں دو شخصوں نے جنھیں ایگنس مرقس اور ایرمینوس کی روحیں کہتی تھی، ہنری کے منصوبوں کو ناکام بنا دیا اور اسے مار پیٹ کر خانقاہ سے نکال دیا گیا ۔

اب ایگنس کے معمولات میں بہت فرق آ گیا تھا اس نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا اور چند دنوں بعد جب ایک کارڈینل مر گیا تو اسے کارڈینل مقرر کیا گیا اور اس طرح کالج میں لیکچر دینے کے کام سے بھی نجات مل گئی ۔ پہلے تو اس کا حسن و شباب نکھرتا گیا پھر پژمردگی طاری ہونے لگی اور اس نے خانقاہ سے نکلنا بالکل چھوڑ دیا ۔ لیو چہارم کے مرنے پر اسے پوپ بنا دیا گیا اور جب وہ قصرلاطران سے جلوس کی شکل میں طلائی گاڑی میں سینٹ بطریس کے گرجے کی طرف جا رہی تھی تو سخت مضمحل تھی، اس مرحلے پر ہنری نمودار ہوا اور گاڑی کے قریب پہنچ کر لوگوں کو چیخ چیخ کر بتانے لگا کہ وہ انگلستان کی ایک لڑکی ایگنس ہے اور اس نے ابھی ابھی گاڑی میں ایک بچے کو بھی جنم دیا ہے ۔ بچہ رونے لگا ، لوگوں نے پتھراؤ کا ارادہ کیا ،

انگنس بے ہوش ہوگئی اور جب ہنری اس کا لباس پھاڑ کر لوگوں کو اس کا سینہ دکھا رہا تھا تو اچانک شمعیں بجھ گئیں۔ ہنری کو کسی نے پکڑ لیا اور تھوڑی دیر بعد گاڑی پر سنگ باری شروع ہوگئی جو رات بھر جاری رہی اور صبح وہاں پوپ کی گاڑی اور ساز و سامان کی بجائے ایک چھوٹی سی پہاڑی قائم تھی۔

دریائے طائبر کے دہانے پر جہاں یہ دریا بحیرہ روم میں گرتا ہے ایک لمبے لمبے اسی پتواروں والا عرب جہاز کھڑا تھا۔ کپتان بالکل تیار اور کسی کی آمد کا منتظر تھا۔ پچھلی شب دریائے طائبر کی طرف سے ایک کشتی آئی، جہاز ران مستعد ہوگئے، کشتی سے سات آٹھ آدمی ایک بھاری صندوق سمیت جہاز میں سوار ہوئے، کپتان نے فوراً جہاز کا رخ موڑا اور تیزی سے روانہ ہو گیا۔ مسافروں کے اس صندوق میں بھری زنجیروں سے جکڑا ہوا بند تھا۔ اسے جب صندوق سے نکالا گیا تو وہ جہاز پر اپنے سامنے مرقس (علی) کو زندہ دیکھ کر چکرا گیا۔ مرقس نے اسے اندرسوس (جو دراصل معمر راہب تھا) سے بھی ملایا اور بتایا کہ ہنری تو اسے مار کر غار میں پھینک آیا تھا لیکن وہ دراصل صرف زخمی تھا اور قریب کے دہقانوں کی توجہ سے چار ماہ میں صحت یاب ہو کر پھر روم میں انگنس کے پاس جا پہنچا تھا اور اسی خانقاہ کدے میں رہنے لگا تھا۔ اسے میں انگنس کے ہوش میں آ جانے کی اطلاع ملی۔ علی نے اسے تسلی دی، بچے کی خیریت بتائی اور انگنس کے ہنری کے استعمال دلانے پر سنگ باری شروع ہوئی تو علی اور اس کے ساتھی راہب نے جو پوپ کی گاڑی کی دونوں طرف ساتھ ساتھ تھے ہنگامہ پیدا کر کے شمعیں بجھا دیں اور ہنری اور انگنس کو بچے سمیت اس طرح اٹھا لے گئے کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔

بارہ دن میں یہ جہاز سسلی کے ساحل پر اور دوسرے دن شہر بلنسیہ کی بندرگاہ پر پہنچا۔ ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی ایک کشتی آ کر بوڑھے راہب کو لے گئی۔ ساحل پر علی کا پرجوش استقبال ہوا۔ علی کی بہن سلمیٰ بھی انگنس سے لپٹ لپٹ کر ملی۔ یہاں پہنچ کر انگنس کو معلوم ہوا کہ لوٹشیا میں اسے جو بوڑھا راہب ملا تھا اور اب روما سے وہاں تک ساتھ آیا تھا وہ علی اور سلمیٰ کا باپ اور بلنسیہ کا والی یعقوب بن ابراہیم تھا۔ بیٹی بیٹے کی گرفتاری کی خبر سن کر خود راہبوں کے بھیس میں لوٹشیا پہنچا تھا اور انگنس کے ذریعے انہیں بچا لیا تھا۔ بلنسیہ میں چند روز کے قیام کے بعد انگنس مسلمان ہوگئی اور پھر یہ سارا خاندان حج کو گیا جہاں انہوں نے ہنری کو بہت ستانے والوں ایک بدوی کے پاس بیچ دیا۔ ادھر روم میں چند دن بعد جب عیسائیوں کا غصہ فرو ہوا تو انہوں نے وہ پتھر ہٹائے لیکن انہیں نہ تو اس مونث پوپ کی اور نہ اس بچے کی ہڈیاں ملیں، چنانچہ ان کی طرف سے پھر خوش اعتقادی پیدا ہوگئی اور قصر لاطران کے صحن میں دوسرے پوپوں کی پتھر کی مورتوں کے ساتھ انگنس کی مورت بھی اس وضع سے بنا کر رکھی گئی کہ ایک عورت کے سر پر پاپائیت کا تہرا تاج رکھا ہے اور وہ گود میں ایک بچے کو لیے کھڑی ہے۔

تاریخی واقعات کا جائزہ:

پوپ انگنس کا واقعہ تاریخ میں ایک متنازع واقعہ ہے۔ بعض مؤرخین اس واقعہ کو صحی
قرار دیتے ہیں اور بعض اس کی تردید کرتے ہیں۔ سرِ اس واقعے کی صحت کے بارے میں یقی

رکھتے ہیں اور جس قدر واقعات انھیں کتب تواریخ سے اس ضمن میں مل سکے ہیں ان میں شرر نے تصرف کرکے انھیں ایک دلچسپ کہانی کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ یہ بحث تو بہت طویل ہوگی کہ آیا یہ واقعہ صحیح ہے یا نہیں۔ موزوں معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں شرر کے اس تحقیقی و تاریخی مضمون کے کچھ اقتباسات درج کیے جائیں جو انھوں نے اس واقعے سے متعلق دلگداز میں لکھا تھا۔ اسی سے یہ اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو تاریخی روایات انھیں ملیں ان میں شرر نے کس قدر تصرف اور رنگ آمیزی کی ہے۔ شرر اس ضمن میں لکھتے ہیں:

”یہ واقعہ اس قدر عجیب و غریب ہے کہ بعض پراٹسٹنٹ مورخین نے بھی جو رومن کیتھولک عقاید سے اختلاف رکھنے کی وجہ سے ان کے پوپوں کے بھی عموماً دشمن ہوتے ہیں، اس کی صداقت سے انکار کر دیا ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ اس قصے کو ایسے مستند مورخین نے اپنی کتابوں میں لکھ دیا ہے کہ کسی طرح اسے غلط اور بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ گبن نے اپنی مشہور تاریخ ”انحطاط و زوال روما“ میں لکھا ہے کہ ”پوپ جون کا قصہ غلط معلوم ہوتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا واقعہ پیش ہی نہیں آ سکتا۔“ ایک اور مشہور مورخ نے جو ۱۳۴۳ء میں روما کے مشہور گرجے سینٹ جان کی زیارت کو گیا تھا اپنی تصنیف میں لکھ دیا ہے کہ ”اسی (۸۰) مشہور اور قابل ترین مورخ لکھ رہے ہیں کہ ایک عورت سینٹ پیٹر کے تخت پاپائی پر بیٹھ چکی ہے۔“ اور چونکہ یہ سب لوگ رومن کیتھولک عقائد کے پابند ہیں لہذا ان میں سے کسی کے بیان کو ہم غلط یا اس دینی معاملے میں فرضی نہیں ثابت کر سکتے، لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ پروٹسٹنٹ مصنفین اتنی تکلیف اٹھا کے اس واقعے کو غلط ثابت کرنے کی کیوں کوشش کرتے ہیں جب کہ خود انھیں کے عقاید کا ایک دینی مقتداء کارڈنل بیرونیس کھلے لفظوں میں لکھ رہا ہے کہ ”بہت سے ایسے لوگ تخت پاپائی پر بیٹھ چکے ہیں جنھیں ہم دیو یا شیطان کے لفظوں سے بھی نہیں یاد کر سکتے۔ ان کی حرکتیں دیووں اور شیطانوں سے کئی درجے بڑھی ہوئی تھیں“۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اسی صدی میں تھیوڈورا اور مروزیا ایسی زبردست عورتیں موجود تھیں جو اپنی مرضی کے مطابق پوپوں کا انتخاب کیا کرتی تھیں اور جب ان کا جی چاہتا ایک پوپ کو اس کی جگہ سے ہٹا کے کسی دوسرے شخص کو جس پر ان کی نظر عنایت ہو جاتی اس تخت پر بٹھا دیتیں اور اس طرح عورتوں نے سیکڑوں برس درپردہ تخت پاپائی پر حکومت کی ہے۔ پھر کیا یہ غیر ممکن ہے کہ ایک اسی قسم کی عالی حوصلہ عورت کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ درپردہ حکومت کرنے سے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ خود مردانے کپڑے پہن کر اس تخت پر بیٹھے اور اقتدارات کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔

آج کل کے مسیحی مورخین اس امر کے ثابت کرنے میں اپنی ساری کوششیں صرف کر رہے ہیں کہ پوپ جون کا واقعہ بالکل فرضی ہے اور یہ قصہ افسانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اسے پوپ کے دشمنوں نے دنیا میں مشہور کر دیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن یہ بات بہت تعجب خیز ہے کہ وہ لوگ اپنی ساری عقل اور پورا زور قلم اس ایک واقعے کی تردید میں صرف کر رہے ہیں حالانکہ اسی قسم کے سینکڑوں واقعات ہیں جن کی نسبت وہ ایک لفظ بھی نہیں لکھتے . . . .

کارڈنل بیرونیس لکھتا ہے کہ ”. . . . اس زمانے کا یہ عام رواج تھا کہ عورتیں مسیحی دنیا پر حکومت کر رہی تھیں اور بہت سی عورتیں ایسی تھیں جنھوں نے زنانے کپڑے اتار کر پھینک دیے اور مردانے بھیس میں گرجے کی خدمت میں مصروف ہو گئیں . . . . حاکم اسکندریہ فلپ کی بیٹی یوجینیا مردانے لباس میں دین کی خدمت کے لیے گرجے میں داخل ہوئی، ذاتی قابلیت کی بدولت اس نے بہت بڑا درجہ حاصل کر لیا اور یہ امر کبھی کسی پر نہ ظاہر ہوا ہوتا اگر خود اسی نے کسی ضرورت سے لوگوں کو نہ بتا دیا ہوتا۔ اسی طرح اسکندریہ کی ایک اور عورت تھیوڈورا تھی، مردانے لباس میں معمولی خدمتوں سے ترقی کرتی ہوئی اسقف اعظم کے درجے تک پہنچ گئی اور اسی میں اپنی ساری زندگی بسر کر دی، مرنے کے بعد اصلیت ظاہر ہوئی۔ جب یہ حالت ہے تو بہت ممکن ہے کہ اس زمانے میں ایسی عورتیں بھی گزری ہوں جنھوں نے اپنے

عورت ہونے کا راز آخر وقت تک نہ ظاہر ہونے دیا ہو۔''[1]

شرر لکھتے ہیں: ''ہم اس قصے کو اسی سلسلے سے بیان کیے دیتے ہیں جس طرح متعدد مورخین لکھتے آئے ہیں:

.... نویں صدی عیسوی کے آغاز میں جب کہ سارے فرانسیسی علاقے میں دین مسیحی کی اشاعت کا جوش پھیلا ہوا تھا ایک بڑا قابل انگریز پادری مقام مینیمس میں آیا۔ اس کے ساتھ ایک نہایت حسین عورت تھی جسے وہ پادری علاقہ ریٹانی سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ عورت در اصل جزیرہ آئرلینڈ کی رہنے والی تھی اور یہ عام طور پر مشہور تھا کہ بہت کم عمری میں وہ کسی پادری کے ساتھ گھر سے نکل آئی تھی۔ یہاں اس عورت کا نام ہلڈی گرانڈ مشہور تھا۔ یہ نہیں معلوم اس کے والدین نے بھی یہی نام رکھا تھا یا کوئی اور، مگر ہر شخص جانتا تھا کہ وہ کسی شریف خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔

مقام مےنیس میں پہنچ کے اس عورت کی ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام جون رکھا گیا۔ مورخین کو اس لڑکی کے نام میں اختلاف ہے۔ بعض لکھتے ہیں کہ اس کا نام ایگنس تھا اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا نام گلبرٹ رکھا گیا۔ مگر زیادہ تر مورخین اس کا نام جون ہی بتاتے ہیں۔ یہ لڑکی نہایت حسین تھی اور کم عمری میں یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس میں غیر معمولی حسن و جمال کے ساتھ ایسی عقل و دانش موجود ہے کہ بڑی ہو کے وہ بہت سے عقلمند مردوں سے فوقیت لے جائے گی۔ اس کے باپ نے یہ دیکھ کے ... ارادہ کیا کہ اسے زمانے کے مطابق علوم و فنون کی تعلیم دے۔ لڑکی نے بہت جلد تعلیم حاصل کر لی اور چند ہی روز میں اتنی ترقی کر گئی کہ بہت سے قابل ترین عالموں سے آگے نکل گئی۔ ابھی اس کی عمر پورے بیرہ برس کی بھی نہ تھی مگر وہ بڑے بڑے عالموں سے منتہی مسئلوں پر نہایت قابلیت اور خوبی کے ساتھ بحث کرتی۔ وہ جرمنی، انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں نہایت آزادی کے ساتھ گفتگو کر سکتی تھی۔ اسے لاطینی زبان کی بھی تعلیم دی گئی تھی ..

فولڈا کی خانقاہ میں ایک نوجوان پادری تھا، اس سے اور جون سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ اس کی ظاہری شکل و شباہت اور علم و فضل کے ساتھ اس کی وسیع معلومات نے جون کے دل کو اس کی جانب مائل کر دیا اور اس پادری کا دل بھی جون کی جانب راغب ہو گیا .. . دونوں دل و جان سے ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے ... پادریوں کو شادی کرنے کی اجازت نہ تھی اور وہ کسی عورت کو اپنے ساتھ نہ رکھ سکتے تھے اور جب یہ حالت تھی کہ دونوں عاشق و معشوق ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے تھے یا جون کو کسی طرح گوارا نہ تھا کہ فولڈا کا پادری اس سے علیحدہ ہو جائے لہذا اس نے یہ ارادہ کیا کہ مردانے کپڑے پہن کے فولڈا کی خانقاہ میں اپنے دوست اور عاشق پادری کے ساتھ آزادی سے رہا کرے۔ اس طرح جون نے اپنا نام جان رکھا اور اپنا وطن سر زمین انگلستان کو بتایا۔ چند دنوں بعد یہ بنا ہوا انگریز جان فولڈا کی خانقاہ کا پادری مقرر ہوا اور اسی کی قسمت میں یہ لکھا تھا کہ آخر میں سینٹ پیٹر کے تخت پر جلوہ افروز ہو کر ساری مسیحی دنیا کی باگ اپنے ہاتھ میں لے۔

فولڈا کی خانقاہ میں یہ دونوں عاشق و معشوق اس طرح دو مہینے سے زیادہ نہیں رہنے پائے تھے کہ بعض لوگوں کو ان کی نسبت کچھ شبہ پیدا ہوا اور اس خوف سے کہ کہیں یہ راز کھل نہ جائے دونوں ایک رات کی تاریکی میں اس خانقاہ سے نکل گئے اور پاپیادہ مختلف ممالک کا سفر کرتے ہوئے یونان کے دارالسلطنت ایتھنہ میں پہنچے۔ اس میں دونوں نے کئی سال بسر کیے اور اعلیٰ درجے کی مذہبی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ایتھنہ اس زمانے میں بھی علوم و فنون کا مرکز مانا جاتا تھا۔ لہذا اس قدیم تاریخی دارالسلطنت میں جون اپنے دلی دوست فولڈا کے پادری کے ساتھ نہایت عجیب و غریب معلومات سے اپنے علم کو وسعت دیتی رہی۔ اس نے ادب، تاریخ، فلسفہ اور سب سے زیادہ دینی تعلیم حاصل کی۔ اس کے معلم اور دیگر علماء سب اس کی خداداد قابلیت کی ہمیشہ تعریف کرتے رہے۔ ان دونوں کا نام بہت مشہور ہوا اور دور دراز ممالک تک

۱۔ مضامین شرر، ج ۳، سیرنسواں، حصہ دوم، مقالہ پوپ جون، ص ۱۳۹ تا ۱،۲۱۔

نہایت ادب اور تعظیم کے ساتھ لیا جانے لگا۔

ایک روز دفعۃً خدا معلوم کیا خیال پیدا ہوا کہ دونوں نے علیحدہ علیحدہ سفر کرنے کی خواہش اور آمادگی ایک دوسرے پر ظاہر کی اور اٹینیہ چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ فولڈا کا پادری مشرق کی طرف چلا اور جون مغرب کی طرف۔ (یہ ذکر کیا ہے کہ فولڈا کا پادری بغداد جا پہنچا اور حصول علم میں منہمک ہو گیا) . . . جون جو اب انگریز جان کے نام سے مشہور تھی مختلف شہروں میں ہوتی ہوئی خاص دارالسلطنت روما میں پہنچی . . . . یہاں جون نے دیکھا کہ ہر شخص کو اپنی قابلیت ظاہر کرنے کا بہت اچھا موقع حاصل ہے، لہذا اس نے اپنے دل میں کہا کہ یہیں میں بھی انتہائی عروج حاصل کر سکتی ہوں۔ وہ یہاں مردانے لباس میں آئی تھی اور اسی حالت میں زندگی بسر کرنے لگی اور اس شہر میں کوئی متنفس ایسا نہ تھا جو اس راز سے واقف ہو . . . . اس وقت پوپ سرجیس ثانی سینٹ پیٹر کے تخت پر رونق افروز تھا . . .

جون کی قابلیت، خوبصورتی اور اس کے اخلاق نے سارے شہر میں ایک شہرہ پیدا کر دیا۔ اور ان باتوں کو دیکھ کر اب اس کے دل میں بھی ایک نئی امید پیدا ہو گئی۔ یہاں پہنچ کر انگریز جان یعنی جون سے ایسا غیر معمولی علم و فضل اور قابلیت ظاہر ہوئی کہ لوگ اسے اس زمانے کا بڑا قابل اور عالم شخص ماننے لگے۔ سلطنت کے معززین، بڑے بڑے پادری اور علماء و فضلا سب اس کے سامنے آ کے سجدہ کرتے، اس کے پاؤں کو بوسہ دیتے اور اس کی شاگردی کو فخر کی نگاہ سے دیکھتے۔

اس نوعمر عالم کی اعتدال پسندی، سادی زندگی اور بے لوث ہمدردیٔ خلائق کی ہر گھر میں تعریف ہونے لگی۔ روما الکبریٰ میں پہنچنے کے بعد جون نے اپنی زندگی کا طرز بالکل بدل دیا۔ اب وہ زیادہ تر تنہائی میں خاموش بیٹھی رہتی اور اسی چیز نے ساری مسیحی دنیا کو اس کے فریب میں مبتلا کر دیا۔ اصل یہ ہے کہ جون ایک عجیب و غریب دماغ کی عورت تھی۔ چند روز میں اسے شہر کے عام لوگوں، پادریوں اور معززین و امرا میں ایسی ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی کہ وہ خود سینٹ پیٹر کا مقدس تاج اپنے سر پر رکھنے کی آرزو مند ہو گئی . . . .

قدیم شہر روما کے قریب ہی اس زمانے میں ایک خانقاہ تھی جو سینٹ مارٹن کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے متعلق ایک مدرسہ بھی تھا جہاں یونانی اور لاطینی زبانوں میں مذہبی تعلیم دی جاتی تھی . . . . یہ خانقاہ شہر کے باہر اور تنہائی کے مقام پر واقع ہوئی تھی لہذا جون کو بہت پسند آئی۔ وہ اس خانقاہ میں داخل ہو گئی اور اسے ایک بڑے پادری کا درجہ دیا گیا۔ چند روز بعد وہ مدرسے کی اعلیٰ پروفیسر مقرر ہوئی جہاں وہ اپنے وسیع علم کے بے بہا جوہر ظاہر کرنے لگی۔ اس کی فصاحت کی اس قدر شہرت ہوئی کہ بڑے بڑے نامی گرامی مقتدا اس کے لکچر سننے کے متمنی ہو گئے۔ اب اس کی شہرت روما سے گزر کے دور دراز ملکوں میں پہنچ گئی۔ اس خانقاہ کے راہب اور پادری کوئی اس راز سے واقف نہ تھے کہ وہ عورت ہے۔ سب اسے جان انگریز کے لقب سے یاد کرتے اور "اسے حامی دین مسیح" کا خطاب دیا گیا۔ اسی زمانے میں جون نے بد عقیدہ مسیحیوں کے خلاف ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا جس کے زور قلم اور دیگر خوبیوں نے ساری مسیحی دنیا میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔

جون کو اس خانقاہ میں داخل ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ پوپ سرجیس نے انتقال کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسیحی کلیسیا میں سخت ترین پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اندرونی جھگڑے اور بد عقیدگیاں روز بروز بڑھتی جاتی تھیں۔ ساتھ ہی عربوں نے خاص اٹلی پر حملہ کر کے بعض مقامات پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایک عقلمند پادری لیو رابع کے نام سے پوپ منتخب ہوا۔ یہ نیا اسقف اعظم جون کو سینٹ مارٹن کی خانقاہ میں دیکھ چکا تھا . . . . اور اس کی قابلیت اور دیگر صفات سے بخوبی آگاہ تھا لہذا اس نے جون کو مزید مرتبے عطا کیے اور نہایت اہم معاملات میں اس سے مشورہ لینے لگا۔ اس پوپ نے کئی بار ایسے اہم معاملات جون کے سپرد کیے جن کا فیصلہ نہایت مشکل نظر آتا تھا۔ مگر وہ سب اس خوبی کے ساتھ طے پا گئے کہ پوپ کو بڑی خوشی ہوئی اور وہ بے اختیار جون کی تعریف کرنے لگا۔ چند روز میں نظر آنے لگا کہ

رومۃ الکبریٰ کے انتظامات ، پوپ کے دربار کے معاملات اور مسیحی دنیا کے کل امور جون کی مدد کے بغیر کسی طرح انجام ہی نہیں پا سکتے - کئی مرتبہ یہ بھی ہوا کہ جون رومی سپاہیوں کی فوجیں اپنی ماتحتی میں لے کے گئی اور عربوں کو شکست دے کے اٹلی کی سر زمین سے باہر کر دیا ۔ پوپ سرجیس کے آخر زمانے میں کارڈنل لیو وزیراعظم کی حیثیت رکھتا تھا مگر اس کی یہ حالت تھی کہ کل انتظامات جون کے سپرد کر دیے تھے اور وہ سارا کام نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیتی - سرجیس کے انتقال کے بعد جب وہی کارڈنل لیو رابع کے نام سے پوپ منتخب ہوا تو اس نے سب سے پہلا یہ کام کیا کہ جون کو سیکرٹری آف اسٹیٹ کا اعلیٰ ترین مرتبہ دے دیا اور اس کے چند روز بعد جون کارڈنل منتخب ہوئی - (اس کے بعد شرر نے کارڈنل منتخب ہونے کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے) -

پوپ لیو رابع زیادہ دنوں تخت پاپائی پر نہیں قائم رہ سکا - اس کی صحت پہلے ہی خراب تھی - اب ساری مسیحی دنیا کے فکروں نے اسے بہت جلد قبر کے اندر پہنچا دیا- لیو رابع کا انتقال ہو گیا اور مقتدیاں دین مسیحی دوسرے پوپ کے انتخاب کے لیے جمع ہوئے - (اس کے بعد جون کو پوپ منتخب کرنے کی وجوہات کی تفصیل بیان کی ہے) اس مذہبی جماعت کے انتخاب کنندگان نے انگریز جان یعنی جون کو تخت پاپائی پر لٹھا کے اس کے سر پر تہرا تاج رکھ دیا - اس طرح جون پوپ منتخب ہوئی اور اس کا نام پوپ جان ہشتم رکھا گیا . .

رومۃ الکبریٰ کے باشندوں نے اس انتخاب پر بڑی خوشی کا اظہار کیا - سارے شہر میں روشنی کی گئی - ہر جگہ باجا بج رہا تھا اور سب ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے کہ دراصل یہی ایک ایسا شخص منتخب ہوا ہے جو واقعی اس کا مستحق تھا اور اس زمانے میں اور کوئی اس سے زیادہ مستحق نہ تھا - جون نے نہایت ہی متانت ، عقلمندی اور ہوشیاری کے ساتھ حکومت شروع کی اور مسیحی دنیا نے اس کی دانائی کی بدولت بہت سے فائدے حاصل کیے - بے شمار خرابیوں کی اصلاح کی گئی - پوپ کے خزانے میں روپے کی آمدنی اور مصارف کا کوئی حساب نہ تھا - اسی کے زمانے سے ایک دفتر قائم ہوا اور آمد و خرچ کا حساب مرتب ہونے لگا - اس سے پہلے پوپوں کی فضول خرچیوں سے خزانہ ایک مدت سے خالی رہا کرتا تھا - اب اس میں کثرت کے ساتھ روپیہ جمع ہونے اور باقی رہنے لگا

اب جون دینی و دنیوی قوت و اقتدار کے اعلیٰ ترین مرتبے پر پہنچ گئی تھی اور اسے اپنی امید سے زیادہ کامیابی حاصل ہو گئی - وہی باتیں جن کا کبھی خواب دیکھا کرتی تھی حقیقت ثابت ہو گئیں ، مگر یہ حالت بہت دنوں تک نہیں رہ سکی - جون کو پوپ منتخب ہوئے دو تین سال سے زیادہ نہیں گزرے تھے کہ دفعۃً اس کی طبیعت میں ایک قسم کا انقلاب پیدا ہوا - اب یہ بات اس کے دل میں جم گئی کہ یہ سب شان و شوکت محض نمائشی اور بے کار ہے- اس سے حقیقی مسرت نہیں حاصل ہو سکتی . اب اس کی طبیعت میں نسوانی جذبات نے زور کیا - سب لوگ اس کے تابع فرمان تھے . لیکن اس کے دل میں یہ ہوس پیدا ہوئی کہ کوئی مجھے دل سے چاہتا ، مجھ پر حکومت کرتا اور میں اس کی خدمت کرتی - (شرر نے اس کی ان اندرونی کیفیات اور ماضی کی یادوں کے سلسلے میں اس کی بے چینی کی مفصل بیان کی ہے) پوپ کی ذاتی خدمتیں انجام دینے کے لیے جو لوگ محل میں رہا کرتے تھے ان میں ایک نہایت حسین نوجوان تھا جس کا نام نال ڈیلو تھا - اس کی خوش قسمتی تھی کہ جون کی نظر انتخاب اسی پر پڑی ، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ شخص فولڈا کے پادری سے بہت مشابہ واقع ہوا تھا - نال ڈیلو شہر فلورنس کا رہنے والا تھا، جون اس پر فریفتہ ہو گئی اور اس کے ساتھ خاص عنایت و مہربانی سے پیش آنے لگی - چند روز میں یہی شخص جون کے کل انتظامات خانگی کا داروغہ بن گیا اور زیادہ زمانہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ یہ راز بھی اس پر ظاہر ہو گیا کہ تخت پاپائی پر مرد نہیں بلکہ ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے . . . (اس کے بعد شرر نے ایک رات رومہ میں ظاہر ہونے والی مختلف بدشگونیوں کی تفصیل بیان کی ہے) . . .

اب جون اپنے کمرے سے بہت کم باہر نکلتی - عام طور پر لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ پوپ صاحب ریاضت و عبادت میں مصروف ہیں اور دینی ترقی کے لیے چلہ کشی اختیار کیے ہوئے ہیں - مگر دراصل واقعہ

یہ تھا کہ جون بال ڈیلو کے آغوش شوق میں بیٹھی ہوئی عشق و محبت کے مزے لوٹ رہی تھی اور سلطنت اور مذہبی انتظامات وزراء کے سپرد کر دیے گئے تھے جو جون کے نام سے حکومت کر رہے تھے، مگر یہ حالت زیادہ دنوں نہیں قائم رہ سکی۔ قدرت نے خود ہی انتقام لینا شروع کر دیا۔ اب جون حاملہ تھی اور بہت ہی قریب زمانے میں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ بال ڈیلو سخت پریشاں تھا کہ اس مصیبت کا کیا علاج کرے، مگر جون کو ابھی زیادہ فکر نہ تھی۔ وہ نویں صدی عیسوی کے مسیحیوں کی ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے مطمئن تھی۔ . . اس نے یہی ترکیب سوچ رکھی تھی کہ جب ضرورت ہو گی تو لوگوں کو ابھی ایک کرامت دکھا دوں گی اور سب اسے تسلیم کر لیں گے۔ (اس کے بعد شرر نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ فولڈا کا پادری بارہ برس بعد وہاں آیا، اس نے جون کو پہچان لیا، لیکن بال ڈیلو سے جون کا قرب دیکھ کر جوش رقابت میں اسے دھمکیاں وغیرہ دیں)۔

(شرر نے اس عہد میں رومہ الکبریٰ پر نازل ہونے والی مختلف آفات و مصائب کا ذکر کیا ہے جن کے رد کے لیے لوگوں نے پوپ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا، ایک روز رومہ الکبریٰ کے باشندے پوپ صاحب کے محل کے سامنے جمع ہوئے اور اسے باہر آنے پر مجبور کیا) دوسری صبح سارے شہر میں بڑا جوش تھا۔ سب لوگ اس دینی جلوس کے دیکھنے کو اپنے گھروں سے نکل آئے تھے اور ہر شخص اس کا منتظر تھا کہ کب پوپ صاحب آ کے ہماری پریشانیوں کو رفع کر دیتے ہیں۔ رومۃ الکبریٰ کے کل گرجوں کے گھنٹے خوشی سے بج رہے تھے۔ شہر اور اس کے قرب و جوار کے کل پادری، راہب اور ننیں پوپ کے محل کے سامنے جمع ہو گئیں۔ جون کے دل پر اس وقت ایک خاص اثر تھا۔ بال ڈیلو نے اس کی یہ حالت دیکھ کر اس سے کہا آپ نہ جائیے مگر جون وعدہ خلافی کی جرأت نہ کر سکی۔ غرض جون اس مذہبی جلوس کے آگے چلی۔ تھوڑی ہی دور جانے پائی ہو گی کہ اس کا چہرہ متغیر ہونے لگا اور اس کے خاص طبیب نے اسے محسوس کیا کہ اس کی حالت اچھی نہیں ہے اس نے کچھ مفرح دوائیں پلائیں۔ جلوس دریا کے کنارے تک پہنچ گیا، پوپ نے لوگوں کی خواہش کے مطابق پانی کو اتر جانے کا حکم دیا اور کھیتوں کی طرف ہاتھ اٹھا کے برکت کی دعائیں پڑھیں۔

اب جلوس ختم ہو گیا اور جون اپنے حجر پر بیٹھی تا کہ محل میں واپس آئے مگر افسوس وہاں تک پہنچنا اس کی قسمت میں نہیں لکھا تھا۔ دن کی گرمی، تکان اور پریشانی کو وہ برداشت نہ کر سکی اور وضع حمل کا زمانہ بھی آ گیا تھا۔ دفعۃً صلیب اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ کسی شیطان نے پوپ پر غلبہ پا لیا ہے فوراً ایک بہت بڑے پادری بلائے گئے جو بھوت اتارنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ لوگ چاروں طرف حلقہ کیے ہوئے اس بھوت اتارے جانے کے عمل کو غور سے دیکھ رہے تھے کہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ پوپ جون کے ایک بچہ پیدا ہوا۔ اب لوگوں کے جوش و خروش کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جون اور اس بچے کو اسی جگہ قتل کر ڈالا اور دوسرے دن اسی جگہ دفن کر دیا۔

گیارہویں صدی کے مورخین لکھتے ہیں کہ جہاں جون کا خاتمہ ہوا تھا اسی مقام پر ایک عالیشان گرجا تعمیر کیا گیا اور جون اور اس کے بچے کی سنگ مرمر کی مورت اس واقعے کی یادگار میں قائم کر دی گئی۔ مگر جب پراٹسٹنٹ لوگوں نے پوپوں کی مخالفت اور ان پر اعتراضات شروع کیے تو وہ مورت وہاں سے غائب کر دی گئی۔ یہ واقعات ہیں جن کا اس عجیب و غریب عورت کے متعلق تاریخوں میں پتہ چلتا ہے۔"[1]

۸۔ فتح اندلس

فتح اندلس ۱۹۰۴ء میں مکمل ہو کر زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ یہ ناول شرر کے مشہور و مقبول تاریخی ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا موضوع اسلامی تاریخ کے وہ روشن واقعات ہیں جنھوں نے ہسپانیہ میں صدیوں کی شاندار اسلامی حکومت کے لیے راستہ کھولا۔ ناول میں بیان

۱۔ مضامین شرر، ج ۳، سیرنسواں، حصہ دوم، مقالہ پوپ جون، ۱۴۱ تا ۱۶۲۔

کردہ تاریخی واقعات کا خلاصہ یہ ہے :

آبنائے جبرالٹر کے جنوبی ساحل پر سبتہ کے قدیم شہر میں ایک بہادر سردار جولین فرمانروا تھا ۔ موسیٰ بن نصیر نے شمالی افریقہ فتح کرنے کے بعد طنجہ کو دارالامارت بنایا اور دو دفعہ جولین پر فوج کشی کی لیکن ناکام رہا ۔ اسی دوران ایک عیسائی افسر پندرہ دن میں جہاز کا سفر کرکے اسکندریہ سے سبتہ پہنچا اور پریشانی کے عالم میں جولین کو تخلیے میں بتایا کہ "شام سے مسلمانوں کے خلیفہ نے ایک نئی فوج روانہ کی ہے جو بہت جلد سبتہ پر حملہ آور ہوگی ۔ عیسیٰ بن مزاحم نامی ایک نو عمر شخص نے ، جو جولین کی بیٹی فلورنڈا کا نادیدہ عاشق ہے ، یہ مہم اپنے سر لی ہے ۔ عیسیٰ ایک غلام تھا لیکن اپنی صلاحیتوں کی بدولت اس نے اتنی ترقی کی ہے ۔" افسر نے یہ بھی بتایا کہ عیسیٰ جس رفتار سے بڑھ رہا ہے اس کے مطابق وہ دو تین دن میں سبتہ کی دیواروں کے نیچے ہوگا اور موسیٰ بن نصیر بھی اپنی فوجوں کے ساتھ اس سے یہیں آ ملے گا ۔

جولین نے بظاہر اطمینان کا اظہار کیا کہ وہ دو مرتبہ مسلمانوں کو شکست دے کر ان کے طریق جنگ سے پورے طور پر باخبر ہو چکا ہے لیکن اسے تردد ضرور لاحق ہو گیا تھا اور وہ فلورنڈا کو کسی محفوظ مقام پر بھیج دینا چاہتا تھا ۔ جولین نے فلورنڈا کو بلا کر اونچ نیچ سمجھا کر کہا کہ وہ طلیطلہ کے شاہی محل میں چلی جائے جہاں ایک بار پہلے جولین نے راڈرک کی درخواست اور شاہی رسم و رواج کے باوجود اسے نہیں بھیجا تھا ۔ فلورنڈا نے راڈرک کو بدنیت اور ظالم کہہ کر جانے سے گریز کرنا چاہا لیکن جولین نے اسے اطمینان دلایا کہ راڈرک یہیں کے ساتھ بادشاہ وٹزا کی بیوہ پر بری نظر نہیں ڈال سکے گا اور اگر کوئی خدشہ ہوا تو جولین اسے فوراً بلا لے گا ۔ فلورنڈا فوراً طلیطلہ روانہ ہوئی اور اس کے چوتھے روز اسلامی لشکر نے پہنچ کر خشکی کی تین طرف سے سبتہ کا محاصرہ کر لیا ۔ جولین نے بھی ضروری حفاظتی انتظامات کیے لیکن وہ دل میں متردد تھا کہ اب کی بار اسلامی لشکر کے تیور پہلی دو بار کی نسبت مختلف تھے ۔ دوسری صبح اسلامی جہازوں نے سمندر کی طرف سے بھی محاصرہ کر لیا ۔ جولین نے دس ہزار فوج کو سمندر کی طرف نگہداشت پر مقرر کرکے بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ باہر نکل کر مقابلہ کیا اور پھر واپس قلعے میں داخل ہو گیا ۔ مسلمانوں نے منجنیقوں سے پتھر برسانے شروع کیے ۔ بحری جنگ بھی ہوئی ۔ جولین کے امراء نے مشورہ دیا کہ قلعے کی دیوار کے ساتھ اندر کی طرف ایک گہری خندق کھود کر اس میں سمندر کا پانی چھوڑ دیا جائے ۔ جہازوں کو قلعے کے ساتھ اس طرح جوڑ دیا جائے کہ حرکت نہ کر سکیں اور ایک دیوار بن جائیں ۔ ایک دو آدمی خفیہ طریقہ پر جا کر سپین اور فرانس سے مدد حاصل کریں ۔

فلورنڈا جب طلیطلہ پہنچی تو راڈرک نے خود استقبال کیا ۔ رفتہ رفتہ بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے آخر اظہار عشق کر دیا ۔ شہزادی کبیدہ خاطر ہوئی تو راڈرک نے دھمکی دی ۔ فلورنڈا نے ایک معتمد غلام کو سمجھا کر سبتہ بھیجا کہ وہاں سے اس کی طلبی کا پیغام لائے ۔ کچھ عرصہ بعد وہیں فلورنڈا کی ملاقات اپنی ماموں زاد بہن مریم سے ہوئی جو ڈان پڈرو کی بیٹی تھی اور راڈرک سے عزت بچانے کے لیے فلورنڈا کے پاس پناہ لینے آئی تھی ۔ مریم اپنے باپ کے ساتھ بھاگ کر نربونہ چلی گئی تھی لیکن بد قسمتی سے پکڑی گئی اور اب

راڈرک اس کی عزت کے درپے تھا ۔

فلورنڈا مریم کو تسلی دے ہی رہی تھی کہ راڈرک آیا اور فلورنڈا کے احتجاج کے باوجود مریم کو کھینچ لے گیا ۔ فلورنڈا چھپ کر بھاگ نکلی لیکن شہر پناہ کے پھاٹک پر پکڑی گئی ۔ دوسری صبح مریم نے فلورنڈا کو بتایا کہ وہ رات ایک ساقیہ کی مدد سے بچ گئی ، ساقیہ نے ایک عورت کو مریم کے کپڑے پہنا کر راڈرک کے کمرے میں پہنچا دیا تھا جسے اس نے پہلے ہی شراب میں بے ہوشی کی دوا پلا رکھی تھی ۔ پھر مریم فلورنڈا کو بھی ساقیہ سے ملا کر خود سبتہ روانہ ہو گئی ۔ چار پانچ دن بعد فلورنڈا کا نمبر آیا لیکن وہ کسی حیلے راڈرک سے نہ بچ سکی ۔ اس پر چند روز جنون اور پچھتاوے کی کیفیت رہی ، پھر اس نے راڈرک کو اپنا لینا چاہا لیکن باپ کا بلاوا آ گیا اور راڈرک نے بھی اسے واپس چلے جانے پر مجبور کیا ۔

فلورنڈا کا فرستادہ غلام جب جبرالٹر پہنچا تو سبتہ کا محاصرہ ہو چکا تھا ۔ اس نے ایک ماہ تک وہاں پہرے کی مشق کی اور ایک رات بس میل تیر کر سبتہ پہنچا ۔ فلورنڈا کا پیغام سن کر جولین کو بہت دکھ ہوا ، عربوں کے محاصرہ سبتہ کو تین ماہ ہو چکے تھے ۔ شہر کی حالت نازک تھی ، چنانچہ جولین نے موسیٰ بن نصیر کے پاس ملاقات کا پیغام بھیجا اور دوسرے دن موسیٰ سے مل کر سپین کی حالت بیان کر کے وہاں قبضہ کرنے کا مشورہ دیا اور اپنی مدد کا یقین دلایا ۔ موسیٰ نے سپین پر حملے کی اجازت کے لیے امیر المومنین کو لکھ بھیجا اور جولین سے صلح کر لی ۔ جولین نے اسی دن فلورنڈا کی واپسی کے لیے راڈرک کو خط لکھا ۔ صلح کے ایک ہفتے بعد مریم بھی سبتہ آ پہنچی ، اپنی روداد سنائی اور فلورنڈا کا پیغام دیا ۔ اسلامی لشکر شہر سے باہر ہی تھا ، صرف افسر قلعے اور قصر شاہی میں قیام پذیر تھے ۔ عیسیٰ بن مزاحم قلعے میں مقیم فلورنڈا کے عشق میں بے تاب تھا اور طرح طرح کے منصوبے بناتا تھا ۔ موسیٰ اسے تسلی دیتا ، یہاں عیسیٰ نے جولین کی بیوی کے ہمراہ ایک نوجوان لڑکی (مریم) کو دیکھ کر سوچا کہ وہ فلورنڈا ہے ۔ اسی دوران اکتادیو نامی ایک سردار طایطلہ سے راڈرک کے حکم پر مریم کو چوری چھپے پکڑ لے جانے آیا لیکن اکتادیو اور اس کے تین ساتھی عیسیٰ کے ہاتھوں قتل اور دو اسیر ہوئے ۔ مریم کو عیسیٰ نے بچا لیا ، بات جولین تک پہنچی اور اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ خود عیسیٰ شہزادی کا شیدائی ہے ۔ دوسری صبح فلورنڈا آ پہنچی لیکن افسردہ و ملول ، موسیٰ کو تعجب تھا کہ جولین کی ایک ہی بیٹی ہے جو اب آئی ہے ، عیسیٰ جس کا ذکر کرتا ہے وہ کون ہے ۔ عیسیٰ بھی حیران ہوا اور موسیٰ کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ وہ پہلی کو ہی چاہے گا ، خواہ وہ کوئی بھی ہو ۔ اسی روز خلافت کا فرمان آیا کہ پہلے اچھے جہازوں میں تھوڑی سی فوج سپین کے ساحل پر بھیج کر وہاں کے حالات معلوم کیے جائیں اور پھر لشکر کشی ہو ، شام کو جولین کو معلوم ہوا کہ موسیٰ نے طریف کی سرکردگی میں چار جہازوں پر دو سو آدمی بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے ۔ اسی شام جولین نے موسیٰ سے مل کر اصرار کیا کہ عیسیٰ کا فلورنڈا پر عاشق ہونا مشہور ہو چکا ہے اس لیے وہ مریم کے بجائے اب فلورنڈا سے شادی کر لے ۔ موسیٰ نے صورت حال سے عیسیٰ کو بھی مطلع کرتے ہوئے وقتی طور پر اس مسئلے کو ملتوی رکھنے کا فیصلہ کیا ۔

دوسری صبح دو سو سپاہیوں کو طریف کی سرکردگی میں رخصت کیا گیا ۔ چار پانچ گھنٹے میں وہ سپین کے ساحل پر ایک بستی میں جا اترے ۔ مقامی فوج اور لوگوں سے مقابلہ

ہوا ۔ چار گھنٹے میں گاؤں پر قبضہ ہو گیا ، بعد میں اسی گاؤں کا نام طریفہ پڑا ۔ دوسری صبح جبرالٹر کی فوجی چھاؤنی سے دو ہزار سپاہی آ پہنچے ، ان کا سردار پلیٹاس تھا ، جنگ ہوئی ، پلیٹاس اور سات آٹھ سو سپاہی قتل ہوئے ، باقی بھاگ نکلے ۔ طریف نے ایک جہاز سبتہ بھیج کر فتح کی خوش خبری دی جہاں سے یہ مژدہ فوراً دربار خلافت میں بھیج دیا گیا ۔

اس دوران عیسوی کو مریم سے معلوم ہوا کہ جولین فلورنڈا سے اس کی شادی کر دینے پر محض اس لیے مصر ہے کہ فلورنڈا راڈرک کے ہاتھوں بے عصمت ہو چکی ہے ، اور اب کوئی سردار اس سے شادی پر آمادہ نہیں ہوگا ۔ مریم نے عیسوی سے اپنی مجبوریاں اور جولین سے محبوبیت بھی بیان کیں ۔ موسوی کو جب اصل حالات کا علم ہوا تو اس نے مریم کی تعریف کی اور عیسوی کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے حالات کو جلد درست کر دینے کا وعدہ کیا ۔

طریف کی فتح کے بعد طارق بن زیاد کی سرکردگی میں سو جہازوں پر بارہ ہزار جنگجو سپین روانہ ہوئے ۔ فلورنڈا کی عیسوی سے ملاقات ہوئی ۔ اس نے عیسوی کو رام کرنے کے لیے تمام نسوانی حربے اختیار کیے ۔ موسوی سے مشورے پر اس نے تجویز کیا کہ عیسوی پانچ ہزار فوج لے کر سپین چلا جائے تاکہ وقتی طور پر فلورنڈا کے آمنے سامنے سے بچ جائے ۔ اب کی ملاقات پر عیسوی نے فلورنڈا کو بتایا کہ طارق نے جبرالٹر فتح کر لیا تھا اور اپنے جہاز جلا دیے تھے ۔ اب راڈرک اسی ہزار فوج اس کے مقابلے کے لیے تیار کر رہا ہے اس لیے عیسوی کمک لے کر جائے گا ۔ فلورنڈا متردد ہو گئی ۔ اسی رات عیسوی کی مریم سے بھی ملاقات ہوئی اور معلوم ہوا کہ مریم بھی جلد ہی سبتہ سے چلے جانے کا ارادہ رکھتی ہے ۔ صبح جب عیسوی روانگی کی تیاری کر رہا تھا تو فلورنڈا آئی ۔ عیسوی سے اپنی محبت کا برملا اظہار کیا ، ساتھ چلنے پر نہ صرف اصرار کیا بلکہ یہاں تک کہا کہ وہ عیسوی کے قدموں میں رہنے کے لیے اس کی اور مریم کی لونڈی بن کر رہے گی ۔ موسوی اور عیسوی نے فلورنڈا کو سمجھایا اور تسلی دی کہ ابھی حالات ٹھیک نہیں بعد میں اسے بھی سپین بھیج دیا جائے گا ۔

ادھر جبرالٹر سے کئی منزل آگے ندی کے کنارے راڈرک اور طارق کے لشکر خیمہ زن تھے ۔ طارق کو رات خواب میں رسول اکرمؐ نے فتح کی بشارت دی ۔ عیسائی لشکر ندی کے پار تھا ، عیسوی دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ دور سے چکر لگا کر ندی کے پار اترا اور علی الصباح فوج کو پانچ ٹکڑیوں میں تقسیم کرکے پانچ طرف سے حملہ کر دیا ۔ اسی دوران طارق بھی اپنے لشکر کے ساتھ پار اتر گیا ۔ جنگ زوروں پر ہوئی ، روغن نفت کی پچکاریاں بے تحاشہ چلیں ، لوہے میں غرق نائٹ جل جل کر گرے ۔ دوپہر تک عیسائی بھاگ رہے تھے اور مسلمان تعاقب میں تھے ۔ مسلمانوں کے بارہ ہزار لشکر میں سے ڈیڑھ ہزار شہید ہوئے تھے ۔ عیسائی بیس ہزار سے زیادہ لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگے ۔ مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی ۔

راڈرک بہت پریشان تھا، اس نے طلیطلہ میں سب سرداروں کو لشکر سمیت جمع ہونے کا حکم دیا ۔ دریائے ٹیگس کے کنارے مختلف اضلاع سے زبردست لشکر جمع ہوا ۔ یہ لشکر بڑی شان سے وادی الکبیر کے کنارے پہنچا ۔ تین دن میں ایک لاکھ مسیحی پار اترے اور پڑاؤ ڈالا ۔ طارق کی فوج وہاں سے چار فرسخ پر تھی ۔ راڈرک نے سفیر بھیجا ، طارق نے مناسب جواب دیا ۔ عیسائیوں نے فیصلہ کیا کہ عرب سپین میں غریب الوطن ہیں انھیں حملے کی جلدی ہوگی اس لیے جب تک وہ حملہ نہ کریں حملہ نہ کیا جائے ۔ انھیں دنوں دریا کے کنارے ،

قلعہ قلطرادہ کا ڈانڈولو نمی نائٹ بلنسہ کے کؤنٹ پوسٹاس کی بیوی بلانش سے مصروف بوس و کنار تھا کہ پوسٹاس موقع پر پہنچ گیا ۔ اس نے بیوی کو قتل کر دیا اور خود ڈانڈولو کے ہاتھوں مارا گیا ۔ اتنے میں بلانش کا بھائی قسطلہ کا کؤنٹ الفانسو آ گیا جس کے ہمراہ فلورنڈا بھی تھی ۔ بہن اور بھائی کو مقتول دیکھ کر وہ بھی ڈانڈولو سے لڑا اور مارا گیا ۔ فلورنڈا ڈانڈولو کے ساتھ ہو گئی ، اسے رام کیا اپنا گرویدہ کرکے عیسیٰ اور مریم کے خلاف بھڑکا کر انتقام پر آمادہ کرنا چاہا ۔ اس نے ڈانڈولو کو بتایا کہ مریم اربونہ جانے کے بہانے عیسیٰ کے ساتھ اسلامی لشکر گاہ میں مقیم ہے ۔ دوسرے دن عیسائیوں نے حملے میں پہل کی ، معلوم ہوا کہ پوسٹاس بلانش اور ڈیوک الفانسو کے قتل کے سلسلے میں ایک کاؤنٹ نے جو خود بھی زخمی تھا ، عیسیٰ بن مزاحم کا نام لیا تھا اس لیے عیسائیوں نے برہم ہو کر حملے میں پہل کی ۔ جنگ شروع ہوئی ۔ مریم کچھ دیر تو تماشا دیکھتی رہی پھر خود بھی مردانہ لباس میں گھوڑے پر سوار ہو کر نکل آئی ۔ دوران جنگ عیسیٰ کا ڈانڈولو سے سامنا ہوا ، اس نے اسے میدان کار زار سے ہٹ کر الگ مقابلے کی دعوت دی ۔ عیسیٰ نے قبول کیا ، مقابلہ ہوا ، ڈانڈولو شدید زخمی ہو کر گر پڑا ، دوسرے نائٹ نے جو فلورنڈا تھی ، عیسیٰ پر حملہ کر دیا لیکن ایک اور سوار درمیان میں حائل ہو گیا ، وہ مریم تھی ۔ فلورنڈا نے مریم کو پہچان لیا تھا ۔ اس وقت جب فلورنڈا مریم کے ہاتھوں قتل ہونے والی تھی فلورنڈا نے اس کا نام لے کر جان بخشی چاہی ، تب عیسیٰ پر حقیقت منکشف ہوئی ۔

مریم اور عیسیٰ واپس لشکر میں پہنچے ، جنگ زوروں پر جاری تھی ، مسلمانوں کا دباؤ بڑھ گیا ، راڈرک اوریلیا نامی گھوڑے پر بھاگا ، بس پھر مسلسل تعاقب ہوا ، پھر راڈرک غائب ہو گیا ۔ کہتے ہیں کہ وہ دریا میں ڈوب گیا تھا ۔ دوسرے دن طارق نے اشتہار جاری کیا کہ مسلمان صرف ظلم مٹا کر وارثوں کو حکومت دلانے آئے ہیں ۔ اس اعلان کا خاطر خواہ اثر ہوا ۔ چھوٹے چھوٹے سرداروں نے قلعوں کو مضبوط کرکے مقابلہ کیا اور شکست کھائی ۔ طارق پیش قدمی کرتا ہوا شہر لریدہ تک پہنچ گیا ۔ وہاں سے مریم تنہا والد سے ملنے اور سینٹ مارٹن کی زیارت کرنے گئی لیکن مارٹن نے اسے ذلیل کرکے نکلوا دیا کہ وہ مسلمانوں میں رہ کر عزت اور مذہب کھو بیٹھی ہے ۔ وہاں فلورنڈا سے ملاقات ہوئی جو نن کے روپ میں تھی ۔ اس نے مریم کو اس کے والد سے ملانے کے بہانے ایک ویران مقام پر لے جا کر ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا ۔ ایک بدصورت نن اس کی نگہبان تھی اور اس کی رائے تھی کہ مریم کو زنانی خانقاہ میں بھیج کر اس کی سزا دریافت کی جائے ۔ رات کو مریم کو ایک بند حجرے میں جہاں کچھ راہبات اور راہب تھے مارٹن کے سامنے پیش کیا گیا ۔ مارٹن اسے ایک کمرے میں روحوں کے دربار میں لے گیا ، وہ بہت خوفناک کمرہ تھا ۔ اندر پہنچتے ہی صلیب حرکت میں آئی پھر ہڈیوں کے ڈھانچے ہلنے لگے ۔ ان ڈھانچوں نے تجویز کیا کہ مریم کے لیے اس کے ہاتھ کا تازہ شہید ڈانڈولو سزا تجویز کرے ۔ ڈانڈولو وہاں نمودار ہوا اور مریم کو قتل کرنا چاہتا تھا کہ دوسری روحوں نے کہا ان کا کام سزا دینا نہیں سزا تجویز کرنا ہے ۔ اس پر ڈانڈولو کی روح نے یہ سزا تجویز کی کہ مریم تین سال تک قسطلہ کی خانقاہ کے تہہ خانے میں رہے ۔ اسے روز ایک گھنٹہ الٹا لٹکایا جائے اور اس کے جسم سے روز ایک تولہ خون نکالا جائے ۔ ریاضت کی ہر سخت وضع میں آدھ گھنٹہ رکھا جائے اور پھر کسی جفاکش راہب کے ساتھ الہٰیہ ، یونان و

وم میں پا پیادہ پھرائی جائے۔ مریم اس خوفناک منظر میں اس سزا کے سنتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

مریم دیر تک بے ہوش رہنے کے بعد ہوش میں آئی تو ذہنی طور پر تقریباً مفلوج تھی ور اسی مقام پر تھی۔ اسے دوبارہ ڈرایا دھمکایا جانے لگا کہ اچانک دروازہ کھلا اور بہت سے ءرب سپاہی اندر گھس آئے۔ ہڈیوں کے ڈھانچے گرنے لگے، دیواروں کو ڈھانپنے والی سیاہ پادریں نوچی گئیں تو ڈھانچوں کے پیچھے سے راہب اور راہبات برآمد ہوئیں، سب اسیر ہوئے۔ ریم نے دیکھا کہ فلورنڈا، ڈانڈولو، مارٹن اور سب راہب اور راہبات اسیر تھے۔ ہڈیوں کے ڈھانچے زمین پر بکھرے ہوئے تھے اور عیسیٰ خود بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ وہ مریم پر کی گئی سختیوں کے بارے میں سن کر رو پڑا۔ عیسیٰ نے بتایا کہ اس نے دو عیسائیوں اور دس سپاہیوں کو خفیہ طور پر مریم کی حفاظت پر مامور کر رکھا تھا۔ اسے جب مریم کے اس زنانی خانقاہ یں لائے جانے اور اس مقام کی خوفناکی کا علم ہوا تو وہ دو سو سپاہیوں کو لے کر وہاں پہنچا ھا۔ عیسیٰ کی فرمائش پر مریم کی تسلی کے لیے عیسائیوں نے پھر وہی تماشا دکھایا۔ مارٹن تل ہوا، فلورنڈا اور ڈانڈولو کو معاف کر دیا گیا۔

اس واقعے کے دو ماہ بعد عیسیٰ کا لشکر ہسپانیہ کے مشرقی حدود کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بدالعزیز بن موسیٰ کا لشکر بھی ہمراہ تھا۔ نئی فوج سے مقابلہ ہوا جو قلعہ اوریولو میں ناہ گزین ہو گئے۔ قلعہ والوں نے صلح کی درخواست کرتے ہوئے آزادی کے حقوق چاہے اور تایا کہ بصورت دیگر قلعہ میں موجود بیس چالیس ہزار سپاہی کٹ مریں گے۔ عیسائیوں نے طرادہ کے علاقے اور قسطلہ کے صوبے کو خود مختار چھوڑنے کا مطالبہ کیا۔ عیسیٰ نے اصرار کیا کہ لڑائی کی جانے کیونکہ طارق وغیرہ حربہ کے بغیر کسی کو نہ چھوڑتے تھے۔ مسلمانوں ا حملہ شروع ہوا تو دو پادری باہر نکلے۔ سرداروں سے مل کر امان چاہی اور کہا بلاوجہ یس چالیس ہزار سپاہی جان دے دیں گے۔ عیسیٰ کو یقین نہیں تھا، جنگ روک کر انھوں ے پادریوں کے ساتھ قلعہ کے گرد چکر لگایا تو دیواروں پر ہر طرف ہزاروں سپاہی خود اور زرہ ہنے موجود تھے، ان کی اندازاً تعداد پچاس ہزار تھی۔ صلح کا معاہدہ ہو گیا جو بعد میں سلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہوا۔ معاہدے کے بعد جب مسلمان اندر گئے تو انھیں ہت تھوڑے مرد نظر آئے، لشکر کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ یہیں مریم کے والد سے لاقات ہوئی، اس نے بتایا کہ وہ مارٹن کے مارے جانے پر وہاں گیا، خوب رویا اور پھر فلورنڈا ور ڈانڈولو کا سن کر قلطرادہ میں آ گیا۔ وہ دونوں یہیں ہیں اور فلورنڈا نے ہی عورتوں بچوں و خود پہنا کر فصیل پر کھڑا کیا تھا۔

ڈان پڈرو سینٹ مارٹن کی خانقاہ کے حالات سن کر متاسف ہوا اور اس فریب پر نفرت کے اظہار کے باوجود اس نے اسیر راہبوں کی رہائی کی درخواست کی۔ عیسیٰ نے یہیں ڈان پڈرو کے سامنے مریم سے شادی کی اجازت کے لیے درخواست کی۔ باپ بیٹی میں اول تو تلخ کلامی وئی پھر بدگمانیاں دور ہو گئیں، دونوں نے ایک دوسرے سے معذرت کی اور عیسیٰ اور مریم نکاح پڑھوا دیا گیا۔ عیسیٰ نے وعدہ کیا کہ وہ پڈرو کے وراثت کے حقوق انھیں دلوائے گا۔ وسرے دن اسے عبدالعزیز سے ولید بن عبدالملک کی وفات، سلیمان بن عبدالملک کی تخت نشینی، وسیٰ اور طارق کو سپین سے، قتیبہ بن مسلم کو کاشغر اور محمد بن قاسم کو سندھ سے واپسی

کے احکام خلافت کی خبر ملی ، اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ طارق نے اور موسیٰ نے جولین اور پڈرو کے حقوق کے لیے الگ الگ سفارشات دربار خلافت کو بھیجی تھیں - مشورے کے بعد طے پایا کہ عیسیٰ خود دارالخلافت میں جا کر خلیفہ سے بات کرے ، عبدالعزیز طلیطلہ میں قیام کرے ، پڈرو نربونہ کی بجائے طلیطلہ کی خانقاہ میں عبدالعزیز کی سرپرستی میں قیام کرے -

عیسیٰ مریم کے ہمراہ آٹھویں دن طلیطلہ پہنچا ، پڈرو ٹیگس کے کنارے ایک خانقاہ میں فرو کش ہوا - وہاں سے عیسیٰ اور مریم پندرہ دن میں برشلونہ پہنچے ، جہاں بیس دن قیام کے بعد ایک عرب تاجر جہاز پر سوار ہو کر الحیریا میں اترے ، وہاں سے قافلے کے ساتھ مصر روانہ ہوئے - چار ماہ بعد سکندریہ پہنچے ، کچھ دن قیام کے بعد فسطاط گئے - چند دن بعد شہر قلزم (سویز) سے بحر روم کے ساحل پر شہر غرہ اور عسقلان ہوتے ہوئے بیت المقدس گئے ، ایک ہفتہ میں وہاں پہنچے ، شاہی مہمان رہے - مریم نے بیت اللحم کی زیارت بھی کی پھر وہاں سے نابلوس ، ناصرہ اور طبریہ کی جھیل کے قریب سے ہو کر بانیاس پہنچے ، وہاں سے دمشق میں درخواست بھیجی ، آٹھویں دن فرمان آ گیا اور مریم شاہی مہمان کی حیثیت سے دمشق میں داخل ہوئی - عیسیٰ نے اسے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرا کر خود الگ رہنے کا فیصلہ کیا اور مصلحتاً اپنا تعلق راز میں رکھا - وہ اعزائے خلافت اور عہدہ داروں سے ملا - اسے معلوم ہوا کہ موسیٰ کو پابزنجیر حاضر کرنے کا حکم دیا گیا ہے ، عبدالعزیز اندلس میں امیر نامزد ہوا ہے - عیسیٰ نے افسوس کیا ، موسیٰ کی آمد اور مقدمے کے پیش ہونے کا منتظر رہا لیکن اس دوران میں اس نے امرائے دولت کو مریم کا طرفدار بنا لیا -

دمشق میں آمد کے ایک ماہ بعد مریم کو باریابی کا شرف حاصل ہوا - خلیفہ نے حالات سنے ، خاندان کے بارے میں دریافت کیا ، حوصلہ افزائی کی اور اس کے حقوق کا خیال رکھنے کا وعدہ کیا - خلیفہ مریم کی ذہانت ، گفتگو اور صورت سے بہت متاثر ہوا ، شاید وہ اسے اپنے حرم میں داخل کر لینا چاہتا لیکن یہ معلوم کرکے خاموش ہو گیا کہ مریم کی عیسیٰ سے شادی ہو چکی ہے - اس نے کئی بار مریم کو طلب کیا اور مختلف موضوعات پر گھنٹوں گفتگو کی - طارق اور موسیٰ جب پیش کیے گئے تو اس وقت بھی مریم دربار میں موجود تھی - خلیفہ نے موسیٰ سے مریم اور اس کے باپ کے بارے میں سوالات کیے اور اس امر پر برہمی کا اظہار کیا کہ پڈرو کے حقوق کی بجائے جولین کی سفارش کی گئی تھی ، جولین کو مدد کے صلے میں اور مراعات دی جا سکتی تھیں - پھر موسیٰ اور طارق کا جھگڑا پیش ہوا - طارق رہا ہوا اور موسیٰ اس الزام میں قید ہوا کہ اس نے طارق کی ناموری کے حسد سے بدنیتی کی بنا پر فتوحات روک دینے کا حکم دیا تھا - مریم کے باپ کو بہت بڑا علاقہ دینے اور اس کی عزت سپین میں سب سے زیادہ سمجھنے کا حکم ہوا ، جولین کا درجہ اس کے بعد رکھا گیا - مریم نے شکریہ ادا کیا - عیسیٰ نے اسے واپس چلنے کو کہا کیونکہ وہ سپین کو اپنا وطن کہتا تھا - اس نے مریم کو بتایا کہ جب عبدالملک بن مروان کے عہد خلافت میں قرطاجنہ میں ملکہ کاہنہ سے مسلمانوں کی جنگ ہوئی تو شاہ غیطشہ نے بھی دوسرے عیسائی بادشاہوں کی طرح شاہی خاندان کے سردار سلوقوس کو دس ہزار فوج کے ساتھ مدد کے لیے بھیجا تھا - عیسیٰ سردار سلوقوس کا بیٹا تھا اور چھ سات سال کی عمر میں وہ بھی باپ کے ہمراہ تھا - ملکہ کاہنہ کو شکست ہوئی تو عیسیٰ بھی اپنے باپ کے ساتھ گرفتار ہوا - سلوقوس قبول اسلام کے انکار

میں قتل ہوا اور عیسیٰ غلام بنا کر شام بھیج دیا گیا ۔ خلیفہ کے قریبی عزیزوں میں سے ایک نے اسے اپنا لیا ، عیسیٰ نے خود متاثر ہو کر دین اسلام قبول کیا ، خالد بن یزید سے قرآن پڑھا ، سپہ گری سیکھی اور پھر اپنی صلاحیتوں کی بنا پر گزشتہ لڑائی میں سالار بنا کر بھیجا گیا ۔ دونوں میں مذہب کے بارے میں تبادلہ خیال ہوا اور عیسیٰ نے تجویز کی کہ ڈیڑھ ماہ بعد خلیفہ حج کو جا رہا ہے ، مریم خلیفہ سے اجازت لے تو وہ بھی ہمراہ چلیں ۔ اجازت مل گئی ، مریم مکہ معظمہ میں دوران حج اسلامی اخوت اور اصولوں سے اتنی متاثر ہوئی کہ وہیں کلمہ توحید پڑھ لیا ۔

حج سے خلیفہ کی واپسی پر عیسیٰ اور مریم بھی خلیج سویز تک شاہی قافلے کے ہمراہ رہے ، وہاں سے حقوق کا فرمان خلافت لے کر مریم وطن روانہ ہوئی ۔ فرمان خلافت کی بدولت ہر قریے اور ہر شہر میں شاندار استقبال ہوا ، طلیطلہ میں استقبال کے بعد قصرالامارہ میں ٹھہرائی گئی ۔ باپ سے مل کر شاہی فرمان پیش کیا اور باپ سے سلوقوس کے بارے میں پوچھا ۔ پڈرو نے بتایا کہ وہ اس کا بڑا بھائی اور شاہ غطیشہ کا ولی عہد تھا ۔ پڈرو نے یہ بھی تصدیق کی کہ سلوقوس محبت کے مارے اپنے چھ سالہ بچے کو بھی اپنے ساتھ میدان جنگ میں لے گیا تھا ۔ مریم نے عیسیٰ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ وہ پڈرو کا بچھڑا ہوا بھتیجا ہے ۔ اس کے بعد پڈرو نے طلیطلہ میں ہی رہبانیت کی زندگی گزار دی اور مریم و عیسیٰ اپنی جاگیر پر قرطبہ چلے گئے ۔ ابن قوطیہ اسی خاندان کی یادگار تھا ۔

تاریخی واقعات کا تحقیقی جائزہ

فتح اندلس کے پہلے باب میں یہ ذکر آیا ہے کہ گریگوری جسا تمام افریقہ کا فرماں روا عربوں سے شکست کھا چکا تھا لیکن کاؤنٹ جولین والیٔ سبطہ پر موسیٰ بن نصیر دو بار لشکر کشی کے باوجود کامیاب نہ ہوا ۔ گریگوری کی شکست کا واقعہ تاریخی اعتبار سے مستند ہے اور شرر نے اس پر ایک تاریخی ناول فلپانا کے عنوان سے لکھا ہے ، اسی ناول کے ضمن میں ہم نے گریگوری کے مفصل تاریخی حالات بیان کیے ہیں ۔ کاؤنٹ جولین والیٔ سبطہ کی شخصیت ، شجاعت مختلف کتب تاریخ سے ثابت ہے اگرچہ بعض مورخین نے بوجوہ اسے فرضی کردار بنانے کی کوشش کی ہے لیکن ان میں سے اکثر نے انسائیکلوپیڈیا اسلام کے بیان کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے جب کہ خود انسائیکلوپیڈیا اسلام کے پاس جولین کی شخصیت کو فرضی قرار دینے کے لیے کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں بلکہ محض استدلال اور قیاسات کے ذریعے ایک رائے قائم کی گئی ہے[1] ۔ کاؤنٹ جولین والیٔ سبطہ ، سپین کا معزول مقتول بادشاہ وٹزا ، اس وقت

---

۱ - فلپ کے حتی نے بھی جولین کو افسانوی کردار قرار دینے کی کوشش کی ہے ، لکھا ہے کہ ''اس مہم کے لیے جہاز ایک نیم افسانوی شخص جولین نے مہیا کیے تھے جو سبطہ کا بزنطینی امیر تھا ۔ یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اس کے محرکات کیا تھے ۔ ایک کہانی بیان کی جاتی ہے کہ مغربی گاتھوں کے غاصب بادشاہ راڈرک نے جولین کی خوبصورت بیٹی کی آبرو ریزی کی تھی ۔ یہ کہانی الحاقی ہے ، واقعہ یہ ہے کہ تسخیر ہسپانیہ کی پوری داستان میں عربوں اور ہسپانویوں نے آرائش کی وجہ سے حد درجہ آمیزش کر دی ہے ۔'' (تاریخ شام ص ۶ے ۔ ۳ےے) لیکن فلپ حتی کے بیان کی صداقت کے لیے کوئی جواز موجود نہیں البتہ یہ ضرور

(حاشیہ جاری بر صفحہ ۱۸۱)

کا سپین کا فرمانروا راڈرک، جولین کی بیٹی فلورنڈا، موسیٰ بن نصیر اور طارق وغیرہ سے متعلق اس ناول کے پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے باب میں بیان کردہ واقعات سے متعلق تاریخی حقائق حسب ذیل ہیں :

''پادریوں کی جماعت کثیر، اور بہت سے عماید و رؤسا غداروں کے ساتھ شامل ہوئے' ایک اور بادشاہ کا انتخاب کر لیا گیا اور تھوڑے فتنہ و فساد کے بعد وٹزا کو تخت سے اتار کر غالباً قتل کر دیا گیا۔ تاریخ سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان کا آخر انجام کیا ہوا۔ اس نئے بادشاہ کا نام راڈرک (لرریق یا رازرق تھا) اگرچہ اس کی عمر بیاسی برس کی ہو گئی تھی لیکن اس کے قویٰ ایسے مضبوط تھے کہ جوان معلوم ہوتا تھا اور جوانوں کی طرح چست و چالاک تھا . . . . اگرچہ وہ خاندان شاہی سے نہ تھا' . . .

قوم وزیگاتھ نے ایک یہ رسم ڈال دی تھی کہ معزز خاندانوں اور با اختیار لوگوں کی اولاد کو وہ دارالسلطنت میں تخت کے پاس ہی رکھتے تھے۔ ظاہر تو کیا جاتا تھا کہ اس کی عرض صرف یہ ہے کہ ان کو تعلیم دی جائے اور تربیت کیا جائے مگر فی الحقیقت مقصود یہ تھا کہ وہ یرغمال رہیں تاکہ ان کے اعزا و اقربا وفادار رہیں کیونکہ ان ہی لوگوں کو سرحد کی حفاظت پر مامور کیا جاتا تھا اور یہی لوگ اہم موقعوں پر سپہ سالار مقرر کیے جاتے تھے۔ سن بلوغ تک یہ لڑکے بادشاہ کے غلام یا خدمت گزار کا کام کرتے تھے اور ان کو فوجی مشق اور مردانہ کاموں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ملکہ کی خدمتگزار ان ہی معزز خاندانوں کی لڑکیاں ہوتی تھیں، جو محل شاہی میں رہتی تھیں، ان کی تعلیم ایسی ہوتی تھی کہ وہ بالغ و خود مختار ہو کر معزز خواتین بن سکیں۔ ان ہی میں کاؤنٹ جولین کی لڑکی تھی جو راڈرک کے محل میں رہتی تھی۔ یہ کاؤنٹ پہلے سلطنت بیزنطینی کا باجگزار تھا اور قلعہ سبتہ کا قلعدار، جب مسلمانوں کی اٹھتی جوانی نے افریقہ کے تمام یونانی مقبوضات کو لے لیا اور کاؤنٹ جولین تنہا رہ گیا تو اس نے قریب ترین مسیحی سلطنت کی حمایت میں آنا چاہا۔ کچھ سیاسی حالت اور ضرورت تھی اس کی داعی ہوئی کہ اس نے اپنے قلعہ اور اپنی ذات کو دربار طلیطلہ کے سپرد کر دیا۔ اس کی یہ لڑکی بہت ہی حسین تھی۔ راڈرک اس پر بے طرح مائل ہو گیا اور جب وہ خوشامد درآمد سے راضی نہ ہوئی تو اس نے جبر و تشدد اس پر قابو پایا۔ کاؤنٹ جولین کو اپنی بیٹی کی اس رسوائی کی خبر ہوئی تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سخت سردی کی آندھیوں اور بارش کی پروا نہ کرکے وہ فوراً دارالسلطنت پہنچا۔ یونانیوں کا مکر و فریب مشہور ہے، کاؤنٹ جولین نے اسی سے کام لیا اور بغیر اس کے کہ وہ اپنے رنج کو ظاہر کرے اس نے یہ ظاہر کیا کہ اس کی بیوی سخت بیمار ہے، اس لیے اس نے اپنی بیٹی کو ماں کے بستر مرگ پر لے جانے کی درخواست کی۔ بہانہ ایسا

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۰)

محسوس ہوتا ہے کہ فتح ہسپانیہ کے سلسلے میں حتیٰ اپنے یورپی تعصبات کو دبا نہیں سکے اور اس عظیم الشان تاریخی فتح کا ذکر کرتے ہوئے وہ اسے لوٹ مار کی مہم قرار دیتے ہیں جب کہ اس کے برعکس تمام مورخ جولین کی شخصیت اور مذکورہ واقعات کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ بلاذری، (ص ۲۳۰)؛ ابن عذاری (ج ۲، ص ۶)' مقری' ابن عبدالحکم (ص ۲۰۶)؛ ابن الاثیر (۴ : ۴۴۴)' ابن الخطیب (ص ۲۹) اور ابن خلدون (۵ : ۲۵۰) نے جولین، راڈرک اور فلورنڈا کے مذکورہ واقعات مفصل بیان کیے ہیں۔

۱۔ لین پول راڈرک کے متعلق لکھتا ہے : رازرق نے شاہ وٹزا کو سلطنت سے بر طرف کرکے خود عنان حکومت ہاتھ میں لے لی . . اس بادشاہ نے پرواز حکومت تو بہت اچھی طرح اٹھایا مگر آخرکار جاہ و حشمت کی حرص میں ڈوب گیا، اس کی شہوت پرست عیش پسند طبیعت نے ان بھڑک اٹھنے والے اسباب میں بارود کا کام دیا جو اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور جن کو شعلہ زن ہو کر سلطنت کو خاکستر کرنے میں ایک ذرا سی چنگاری کی ضرورت تھی، (ص ۸)۔ مقری نے نفح الطیب میں ابن حیان کے حوالے سے لزریق کے بارے میں بیان کیا ہے کہ وہ غاصب تھا اور جولین کو اپنی بیٹی کی رسوائی کی بدولت اس سے پر خاش تھی، (ص ۸۰)۔ ڈوزی نے عبرت نامہ اندلس (ترجمہ عنایت اللہ) میں فلورنڈا کو غیطشہ کی نواسی قرار دیتے ہوئے اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔ (ج ۱، ص ۴۰۵)۔

تھا کہ انکار بھی نہ ہو سکتا تھا ۔ راڈرک کو کسی قسم کا شبہ بھی نہ ہوا اور اس نے لڑکی کو لے جانے کی اجازت دے دی ۔ کاؤنٹ جولین نے حسب معمول پوری وفاداری دکھائی اور آداب شاہی بجا لا کر فوراً واپس چلا آیا ۔ اپنے مستقر پر پہنچتے ہی اس نے راڈرک سے انتقام لینے کی وہ تدابیر شروع کر دیں جن کو وہ پہلے ہی اپنے ذہن میں قرار دے چکا تھا ۔ قلعہ سبتہ یورپ کی کنجی تھا اور اتنا مضبوط تھا کہ اس پر نہ کوئی کامیابی کے ساتھ حملہ کر سکتا تھا ، نہ محاصرہ وغیرہ کا اس پر کوئی اثر ہو سکتا تھا ۔ اب تک بارود کا کسی کو علم نہ تھا کہ دشمن اس سے ہی کامیاب ہو سکتا ۔ وزیگاتھ کی غفلت کہ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہی قلعہ بیرونی حملوں کے روکنے میں سد سکندری کا کام دیتا ہے ۔ ملک سپین پر صدیوں سے کوئی حملہ نہ ہوا تھا ۔ اسلام کی لاثانی طاقت سے یہ لوگ بالکل نا واقف تھے ۔ وہ اپنے ملک کی آب و ہوا ہی کو غیر ملک کے باشندوں کے ناموافق سمجھ کر مطمئن تھے مگر فی الحقیقت عیش و عشرت میں اتنے منہمک تھے کہ دربار طلیطلہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ سپین بالکل محفوظ ہے اور اس کی سلطنت ابد الآباد تک قائم رہنے والی ہے ۔

کاؤنٹ جولین خط مستقیم موسیٰ بن نصیر کے پاس پہنچا ۔ قیروان افریقہ کا دارالامارہ بن چکا تھا اور موسیٰ اس وقت وہیں تھا ۔ اس عرب سردار کو اپنے محسن مہمان کے آنے کی وجہ معلوم نہ تھی ، موسیٰ نے تمام عربی فوج کو جو ان کے ماتحت تھی ، لے کر دو مرتبہ سبتہ پر فوج کشی کی تھی اور دونوں مرتبہ اس بہادر یونانی سے ہزیمت اٹھا کر واپس آئے تھے ۔ بہر کیف انھوں نے جولین کو نہایت عزت و حرمت سے اپنا مہمان رکھا ۔ جولین نے اپنے مطلب کا اظہار کیا اور بہت ہی طول طویل تقریر میں سلطنت گاتھ کی دولت و حشمت کی تعریف کی اور ان پر فتح پانے کو بہت آسان بتلایا ۔ انھوں نے وہاں کے لوگوں کی خانہ جنگیاں ، باہمی رقابت و عناد ، مذہبی تشددات اور ایذا ، ضبطی جائداد موروثی ، معززین کی بے عزتیوں وغیرہ کا تمام حال بیان کیا ۔ انھوں نے اس کی تفصیل بیان کی کہ شاہی خاندان کے آدمی بادشاہ نہیں بنائے جاتے جس سے ان کے دلوں میں آگ لگی ہوئی ہے ۔ اس وقت ایسے خاندان کا آدمی تخت پر متمکن ہے جو کہ ازروئے نسل غیر ملکی اور کم درجے کا آدمی ہے ۔ لوگ اس کو غاصب سمجھتے اور بری نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ انھوں نے نہایت شاندار الفاظ میں ملک سپین کی لطافتوں اور کششوں، اس کی سر سبز وادیوں ، اس کے درخشندہ دریاؤں کی تصویر کھینچی اور بیان کیا کہ وہاں کی جڑی بوٹیاں جو دواً استعمال ہوتی ہیں ،

۱۔ لین پول بھی گاتھوں کے دستور اور کاؤنٹ جولین کی بیٹی فلورنڈا کے بارے میں یہی واقعات بیان کرتا ہے اور لکھتا ہے ''یہ لڑکی نہایت حسینہ و جمیلہ تھی ، شاہ راڈرک کا فرض تھا کہ اس لڑکی کی عصمت کو اپنی بیٹیوں کی طرح محفوظ رکھتا مگر اس نے تمام فرائض منصبی کو نسیاً منسیاً کرکے اس کے دامن عصمت کو آلودہ کر دیا ، یہ ایک بڑی بھاری بے عزتی تھی کیونکہ جولین کی بی بی شاہ وٹزا کی حقیقی بیٹی تھی ، گویا لڑکی کی بے عزتی سے تمام خاندان گاتھ کی بے عزتی ہوئی —لڑکی نے اس غم و غصہ میں اپنے باپ کو خط لکھ کر ایک معتبر غلام کے ذریعے اطلاع دی ۔'' (ص ۱۱) لین پول جولین کے طلیطلہ پہنچنے اور فلورنڈا کو لانے کے سلسلے میں وہی تفصیلات بیان کرتا ہے جو اخبار الاندلس میں مندرج ہیں ۔ البتہ لین پول نے یہ اضافہ کیا کہ راڈرک جولین کے ساتھ بہت لطف و کرم سے پیش آیا اور خصوصی اعزاز کے ساتھ اسے رخصت کیا نیز چلتے وقت اس سے فرمائش کی کہ افریقہ سے چند خاص قسم کے شکاری باز اس کے لیے بھیجے جس کے جواب میں جولین نے کہا کہ وہ ایسے باز بھیجے گا جو اس نے کبھی نہ دیکھے ہوں گے ۔ لین پول کا خیال ہے کہ جولین کے اس جواب سے اس کی مراد عرب شہسوار تھے (ص ۱۲) ۔ نفح الطیب میں مقری نے مختلف مآخذ کے حوالوں سے ان امور کی تفصیلات بیان کی ہیں ۔ کتاب الحرانی کے حوالے سے انھوں نے فتح کی تفصیلات دی ہیں - مقری نے جولین پر موسیٰ کے دو بار ناکام حملوں ، غیطشہ کی مدد ، لزریق کے ہسپانیہ پر غاصبانہ قبضے ، فلورنڈا بنت جولین کی بے حرمتی ، جولین کے خبر پا کر جانے اور بہانہ کرکے لانے ، بازوں کی فرمائش وغیرہ کی تفصیلی روداد بیان کی ہے (ص ۸۶ ، ۸۷) ، سید امیر علی ص ۱۰۷ ، ۱۰۸ ۔

جادو کا کام کرتی ہیں وہاں کی کانیں ، وہاں کی شکارگاہیں قابل دید ہیں ۔ وہاں کی لوٹ حملہ آوروں کا انتظار کر رہی ہیں ۔ وہاں عورتیں نہیں بلکہ حوریں اور پریاں ہیں ۔ وہاں کے آدمیوں کو انھوں نے زنانہ بتلایا اور یہ بیان کیا کہ سستی نے ان کو کسی کام کا نہیں رکھا ۔ عیش و عشرت اور شہوت رانی سے وہ کہیں کے نہیں رہے ہیں' ۔ ان میں سے بہت سی باتوں کو تو موسیٰ خود جانتے تھے لیکن سبتہ کا قلعہ جس کا قلعہ دار ان کا موجودہ مہمان کاؤنٹ جولین تھا ، ایک ایسی سد سکندری تھی کہ جو اس اسلامی سپہ سالار کے توڑے ٹوٹنے والی نہ تھی ، لیکن یہ بھی ممکن نہ تھا کہ مسلمان جزیرہ الاندلس یا جزیرہ نما ونڈال کے متعلق جتنی خبریں تھیں ان کی تصدیق کر لیتے ۔

موسیٰ اس کو تو تسلیم کرتے تھے کہ جو فواید کاؤنٹ جولین بیان کرتے ہیں وہ صحیح ہیں مگر ساتھ ہی ان کو قوم گاتھ کی ایمانداری پر اطمینان نہ تھا ۔ بہر حال کاؤنٹ کو جواب دینے سے پہلے انھوں نے خلیفہ وقت کی منظوری لینی چاہی ۔ چنانچہ انھوں نے مفصل حالات لکھ کر دمشق کو قاصد دوڑائے ۔ ولید بن عبدالملک اس وقت امیر المومنین تھے ، انھوں نے فوراً منظوری دے دی ، اس کے ساتھ ہی انھوں نے سخت تاکید کی کہ پوری احتیاط کی جائے حالانکہ موسیٰ جیسے ہوشیار اور چالاک شخص کے لیے اس کی ضرورت نہ تھی ، کیونکہ وہ خود بہت ہی محتاط تھے اور کسی پر مشکل سے اعتبار کرتے تھے ۔ موسیٰ نے جولین کو بلا کر کہا کہ ہم تمھاری دیانت کا یوں امتحان کرنا چاہتے ہیں کہ تم کچھ فوج لے کر دشمنوں کے ملک پر حملہ کرو ۔ جولین نے اس شرط کو بہت ہی خوشی کے ساتھ منظور کیا اور اپنی تھوڑی سی فوج لے کر آبنائے کو عبور کر گئے ۔ مدینہ سڈونیہ (سدونہ) کے قرب و جوار میں ساحل کو خوب لوٹا ۔ بہت سے گرجاؤں کو جلا دیا ، کھڑی ہوئی فصلوں کو تباہ کر دیا اور سالم و غانم واپس آ گئے۲ ۔ موسیٰ نے یہ دیکھ لیا کہ ان کے حلیف سے اب ایسے افعال سرزد ہو گئے ہیں کہ اس کا بادشاہ اس کے قصور معاف نہیں کرے گا ۔ نیز انھوں نے اس چھوٹے سے مقابلے سے یہ دیکھ لیا کہ اگر پوری تیاری کر کے حملہ کیا جائے گا تو اس میں یقیناً کامیابی ہوگی ۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد انھوں نے جولین سے معاہدہ کر لینے پر رضامندی ظاہر کی ۔ ۔ وٹزا کی اولاد بھی اس جلسے میں شامل تھی ان میں اوپاس نہ صرف اس سازش میں شریک تھا بلکہ مجلس شوریٰ کا عنصر غالب یہی شخص تھا ۔ سبتہ کی کنجی موسیٰ کے حوالے کر دی گئی اور جب کاؤنٹ جولین نے خلیفہ ولید بن عبدالملک کی وفاداری کا حلف اٹھوا لیا تو اس کو فوج کا افسر مقرر کر دیا گیا ۔"۳

اخبارالاندلس کے اس اقتباس اور دیگر کتب تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شرر نے چوتھے باب تک بیان کردہ واقعات میں یہ تصرف کیا ہے کہ موسیٰ بن نصیر کا دارالامارت قیروان کی بجائے طنجہ بیان کیا ہے، عیسیٰ بن مزاحم کو موسیٰ کی کمک پر آتا دکھایا ہے اور جولین نے نہ چاہنے کے باوجود موسیٰ کے خوف سے فلورنڈا کو مجبوراً راڈرک کے پاس بھیجا ۔ فلورنڈا کے روانہ

۱۔ لین پول نے بھی یہی تفصیلات بیان کی ہیں اور موسیٰ کو سپین پر حملہ آور ہونے کے لیے جو ترغیبات دیں ان کی بھی تفصیل دی ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ موسیٰ نے کوئی وعدہ کرنے سے پہلے خلیفہ ولید بن عبدالملک سے استمزاج کیا ، (ص ۱۲ ، ۱۳)۔ ڈوزی نے بھی عبرت نامہ اندلس میں یہ تفصیلات بیان کرتے ہوئے جولین کی طرف سے حملے کی ترغیبات ، جہازوں کے انتظام کے وعدے اور معاہدے کا ذکر کیا ہے نیز موسیٰ بن نصیر کے خلیفہ سے استصواب کا بیان بھی ہے (ج ۱ ، ص ۳۰۵) ۔

۲۔ نفح الطیب میں مقری نے کتاب الغرانبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ جولین نے پہلے دو جہازوں میں اپنی جمعیت بھیج کر سواحل اندلس پر حملہ کیا (ص ۸۹) اور بخاری اور ابن حیان کے حوالوں سے بھی اس پہلے حملے کا ذکر کیا ہے ۔ (ص ۵۹) ۔

۳۔ سکاٹ : اخبار الاندلس (ترجمہ محمد عبدالرحمن) ، ج ۱ ، ص ۲۰۹ تا ۲۱۳ ۔

ہو جانے کے بعد جلد ہی موسیٰ بن نصیر نے سبتہ کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے کے دوران ہی جولین کو راڈرک کے ہاتھوں فلورنڈا کے رسوا ہو جانے کی خبر ملی اور اس نے موسیٰ سے صلح کر لی جس کے بعد فلورنڈا واپس سبتہ پہنچ آئی۔ تاریخی حقائق کے مطابق فلورنڈا سلطنت کے دستور کے مطابق راڈرک کے پاس تھی، اس پر راڈرک کی دست درازی کی خبر سن کر جولین خود طلیطلہ گیا اور بہانے سے فلورنڈا کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اس کے بعد وہ موسیٰ سے ملنے کے لیے ایک وفد کے ہمراہ قیروان گیا، حالانکہ سبتہ سے طنجہ قریب تھا اور وہاں موسیٰ کی طرف سے طارق بن زیاد حاکم تھا، لیکن جولین نے براہ راست موسیٰ سے تبادلہ خیال کرنے کے لیے قیروان کا رخ کیا۔ اس وضاحت کے بعد تیسرے باب میں بیان کردہ محاصرے کے واقعات اور جنگی تفصیلات کی بحث کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ وہ سب شرر کے تخیل کی مرہون منت ہیں۔

عیسیٰ بن مزاحم کا فلورنڈا پر نادیدہ عاشق ہونا اس ناول کا تخیلی عنصر ہے اور اس سلسلے کو تاریخی واقعات کے ساتھ دلچسپی کے لیے شامل کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں شرر نے جولین اور موسیٰ بن نصیر کی ملاقات کا منظر پیش کیا ہے، ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ یہ ملاقات قیروان میں ہوئی تھی نہ کہ سبتہ کی دیواروں کے باہر۔ اس باب میں موسیٰ بن نصیر کی زبانی مسلمان جرنیلوں محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم کی فتوحات کا سرسری ذکر ہوا ہے جو تاریخی اعتبار سے درست ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ موسیٰ نے خلیفہ ولید بن عبدالملک سے سپین پر حملے کی اجازت مانگی جہاں سے مشروط اجازت ملی اور موسیٰ نے پھر خلیفہ کو یقین دہانی کرائی کہ افریقہ اور سپین کے درمیان اتنا بڑا سمندر حائل نہیں جس میں فوج کے ڈوب جانے کے خدشات ہوں بلکہ دوسرا کنارہ سامنے نظر آتا ہے۔

چھٹے، ساتویں اور آٹھویں باب کا مواد تخیلی رومانی ہے اور آٹھویں باب کا یہ بیان کتب تاریخ کے بیانات کے مطابق نہیں کہ جولین سبتہ میں موجود تھا کہ فلورنڈا ہسپانوی گارڈ کے ساتھ کشتیوں میں سبتہ پہنچی، بلکہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ جولین اسے خود لینے کے لیے گیا تھا اور اپنے ہمراہ لایا۔ نیز اس وقت نہ تو اسلامی فوج سبتہ میں موجود تھی نہ ہی سبتہ محصور تھا۔

نویں اور دسویں باب میں یہ واقعات بیان کیے گئے ہیں کہ دربار خلافت سے مشروط اجازت ملنے پر موسیٰ بن نصیر نے طریف کی سرکردگی میں، جولین کے فراہم کردہ چار جہازوں میں دو سو سپاہیوں کو سواحل اندلس پر تاخت کے لیے بھیجا اور انہیں تاکید کی کہ وہ سامنے سفید عمارتوں والے قصبے پر قبضہ کر کے آگ روشن کر کے کامیابی کی خبر دیں۔ یہ جہاز چار پانچ گھنٹے میں جبرالٹر کے پاس پہنچ کر خلیج کی طرف مڑ گئے۔ چار گھنٹوں کی لڑائی کے بعد مذکورہ قصبے پر قبضہ کر لیا گیا جس کا نام بعد میں طریفہ پڑا۔ دوسری صبح ان کے مقابلے کے لیے دو ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج جبرالٹر سے آ پہنچی۔ مقابلہ ہوا اور اس لڑائی میں اندلسیوں کے سات آٹھ سو آدمی مارے گئے، ان کا سردار پلیٹانس قتل ہوا اور بقیۃ السیف بھاگ نکلے۔ طریف نے ایک جہاز پر فوراً سبتہ خبر بھیجی جہاں سے یہ مژدہ دربار خلافت میں بھیج دیا گیا۔

مذکورہ بالا واقعات سے متعلق لین پول نے طریف کے ہمراہیوں کی تعداد پانچ سو اور جہازوں کی تعداد چار بیان کی ہے نیز یہ کہ طریف جس مقام پر پہلے پہل اترا اس کا نام طریفہ

رکھا گیا[1] - حجاری اور ابن حیان کا بیان ہے کہ طریف کے ساتھ سو سوار اور چار سو پیدل تھے اور یہ فوج چار جہازوں میں رمضان ۹۱ھ میں اندلس پہنچی[2] - کتاب الخزائنی میں بھی یہی تعداد دی گئی ہے[3] - سکاٹ نے طریف کے ہمراہیوں کی تعداد ایک سو سوار اور تین سو پیادے بیان کی ہے[4] - حتی نے ایک سو سوار اور چار سو پیادوں کا ذکر کیا ہے[5] - غرض طریف کے ہمراہیوں کی تعداد کے سلسلے میں اختلاف رائے ہے لیکن اکثریت کی رائے یہی ہے کہ طریف کے ہمراہ ایک سو سوار، چار سو پیادے اور چار جہاز تھے - اس اعتبار سے شرر کی بیان کردہ تعداد درست نہیں -

گیارھواں باب رومانی اور تخیلی ہے - بارھویں، تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں باب میں یہ تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں کہ طریف کی کامیابی کی اطلاع ملنے پر سرداروں اور جولین کے مشورے پر فوری حملہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور تیسرے دن طارق بن زیاد کو بارہ ہزار سپاہ کے ساتھ جولین کے فراہم کردہ سو جہازوں میں اندلس روانہ کر دیا گیا - طارق نے ساحل اندلس پر اترتے ہی جبرالٹر کے قلعے پر قبضہ کر لیا اور اپنے جہازوں کو آگ لگا دی تاکہ فوج کے دل سے واپسی کا خیال ہی مٹ جائے - طارق کے حملہ آور ہونے کی خبر سنتے ہی اسی ہزار ہسپانوی لشکر مقابلے پر آ گیا - موسیٰ بن نصیر نے عیسیٰ بن مزاحم کی سرکردگی میں پانچ ہزار سپاہیوں کی کمک بھیجی، جبرالٹر سے کئی منزل آگے ہسپانوی فوج سے آمنا سامنا ہوا، درمیان میں ندی حائل تھی - اس مقام پر طارق بن زیاد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور آپ سے فتح کی بشارت پائی - طارق نے رات کی تاریکی میں کچھ فوج پار اتاری اور صبح کے دھندلکے میں دونوں طرف سے حملہ کر دیا - گھمسان کی جنگ ہوئی اور دوپہر تک ہسپانوی بیس ہزار سپاہیوں اور آہن پوش نائٹوں کی لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ نکلے - اس مقابلے میں ڈیڑھ ہزار مسلمان بھی شہید ہوئے - یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس رزم گاہ میں شرر نے مسلمان لشکر کی کل تعداد بارہ ہزار بیان کی ہے جب کہ پچھلے ابواب میں انھوں نے لکھا ہے کہ طارق بارہ ہزار سپاہی لے کر اندلس پہنچا اور بعد ازاں پانچ ہزار سپاہی مزید ان کی کمک پر آئے -

مذکورہ بالا واقعات میں یہ باتیں تو تاریخی اعتبار سے صحیح ہیں کہ موسیٰ بن نصیر نے طریف کی کامیابی کے بعد اندلس پر زیادہ فوج کے ساتھ لشکر کشی کرنے کا فیصلہ کیا لیکن یہ امر محض تخیلی ہے کہ طریف کی کامیابی کے تیسرے دن طارق بن زیاد کو روانہ کر دیا گیا - طارق کے ساتھ ابتداً روانہ ہونے والے سپاہیوں کی تعداد میں خود شرر کے یہاں بھی تضاد پایا جاتا ہے اور کتب تاریخ میں بھی اس حد تک اختلاف ضرور ہے کہ بعض نے لکھا ہے کہ طارق ابتداً بارہ ہزار سپاہی لے کر روانہ ہوئے[6] اور بعض نے یہ بیان کیا ہے کہ ابتداً ان کے ساتھ سات ہزار کا لشکر تھا اور راڈرک سے مقابلے سے پہلے موسیٰ نے پانچ ہزار سپاہی کمک پر بھیجے تھے - بہرحال

۱- لین پول : The Moors in Spain، ص ۱۳ - ڈوزی نے بھی سو سواروں، چار سو پیادوں اور جولین کے فراہم کردہ چار جہازوں کا ذکر کیا ہے - عبرت نامہ اندلس، ج ۱، ص ۴۵ -

۲- بحوالہ مقری، نفح الطیب، ص ۵۹ - ۳- ایضاً، ص ۸۶ -

٤- سکاٹ : اخبار الاندلس، ج ۱، ص ۵۲۱ -

۵- حتی : تاریخ شام، ترجمہ غلام رسول مہر، ص ۶۷۳- ابن الاثیر نے تعداد چار سو بیان کی ہے (ج ۲، ص ۱۳۷) -

٦- ابن خلدون : ج ۵، ص ۲۵۰-

کل تعداد کے بارے میں اختلاف رائے نہیں ہے[1] - طارق پہلے پہل قلة الاسد (Lion's Rock) پر اترا اور اسی یادگار کے طور پر اس مقام کا نام جبل الطارق (جبرالٹر) پڑ گیا[2] - مذکورہ واقعات میں شرر نے ہسپانوی فوج سے طارق کا جو مقابلہ بیان کیا ہے وہ غالباً تھوڈومیر کے لشکر سے مقابلے کا ذکر ہے - کشتیوں میں آگ لگا دینے والے واقعے کا بھی بعض کتب تواریخ میں ذکر ہوا ہے - طارق کی جو تقریر اس موقع سے متعلق بعض تاریخوں میں درج ہے اس میں بھی اس امر کی طرف واضح اشارہ موجود ہے[3] - آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کا واقعہ بھی بعض کتب تواریخ میں ملتا ہے لیکن بعض مؤرخین نے اسے ساحل پر اترتے وقت اور بعض نے راڈرک کے مقابلے میں صف آرائی کے موقع سے متعلق قرار دیا ہے[4] -

سولھویں تا بیسویں باب میں راڈرک کی اس حکمت عملی کا ذکر ہے جس سے کام لے کر اس نے مسلمانوں کے مقابلے کے لیے ایک لاکھ فوج جمع کر لی اور وادی الکبیر کو پار کرکے اس مقام پر کیمپ لگایا جہاں سے طارق چار فرسخ دور تھا - یہ بھی مذکور ہوا ہے کہ راڈرک اور تجربہ کار سردار وادی الکبیر کے پار نہیں اترنا چاہتے تھے لیکن پرجوش مسیحی نہ مانے - اس باب میں طلسمی برج کے واقعات کی طرف بھی اشارہ ہے جس کی تفصیلات ہم "فلورا فلورنڈا" کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں -

سولھویں اور سترھویں باب میں نائٹوں کے عشق کی تفصیلات ہیں جو تاریخی اعتبار سے صحیح ہیں - اندلس میں ان دنوں ایسی ہی فضا تھی، عورتیں نائٹوں کے پہلو گرمانے کو باعث فخر سمجھتی تھیں اور نائٹ اپنی شمشیر کے بل بوتے پر اس عاشقی کو اپنا حق تصور کرتے تھے - شرر نے اسی ضمن میں سلسلہ کے کاؤنٹ پوسٹاس کی بیوی بلانس کو ایک نائٹ ڈانڈولو کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دکھایا ہے - بلانس اپنے شوہر پوسٹاس کے ہاتھوں اور پوسٹاس ڈانڈولو کے ہاتھوں قتل ہوا - وہیں بلانس کا بھائی الفانسو جو قسطلہ (کسٹائل) کا حاکم تھا فلورنڈا کے ہمراہ پہنچا اور وہ بھی ڈانڈولو کے ہاتھوں قتل ہوا - ڈانڈولو نے دم توڑتے الفانسو سے وعدہ کیا کہ وہ قسطلہ کو عربوں سے بچائے گا کیونکہ اسی کی سرحد پر اس کا اپنا قلعہ قلطرادہ بھی واقع ہے - راڈرک نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ مسلمانوں کو اندلس میں غریب الوطنی کی وجہ سے حملے کی جلدی ہوگی اس لیے جب تک مسلمان حملہ نہ کریں لڑائی میں پہل نہ کی جائے - طارق بھی راڈرک کی طرف سے پہل کا منتظر تھا - آخر دونوں لشکر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوگئے - جنگ ہوئی، ہسپانوی شکست کھا کر بھاگے، بیس پچیس میل تک مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا - راڈرک بھی اوریلیا نامی گھوڑے پر بھاگا، بیس پچیس میل کے تعاقب کے بعد اس کا پتہ نہ چلا، غالب خیال یہی ہے کہ وہ وادی الکبیر میں ڈوب گیا - اس کے بعد چھوٹے چھوٹے سرداروں نے قلعہ بند

١- ڈوزی ابتدائی تعداد سات ہزار بیان کرتا ہے اور جہازوں کی تعداد چار بیان کرتا جنھیں اس فوج کو پار پہنچانے کے لیے کئی پھیرے کرنے پڑے - اور وہ کمک کے پانچ ہزار سپاہیوں کا بھی ذکر کرتا ہے - ج ١، ص ٣٠٥، ٣٠٦ - یہی بیان ابن الاثیر، (خلافت بنو امیہ، ج ٢، ص ١٣٧، ١٣٨) - انسائیکلوپیڈیا اسلام بذیل مادہ الاندلس، ج ٣، ص ٣٣٨؛ سکاٹ ج : ١، ص ٢١٦ ' سید امیر علی : ص ٨ ١ اور لین پول : ص ١٣، ١٤ اور مقری : ص ٦١ کا ہے -

٢- ایضاً - ٣- لین پول : ص ٢٠ -

٤- ابن الاثیر : ج ٢، ص ١٣٧ ' لین پول : ص ٢٠ ' مقری : ص ٦١ ' سکاٹ : ج ١، ص ٢١٩ -

ہو کر مقابلہ کرنا چاہا لیکن وہ طارق کی پیش قدمی کو نہ روک سکے اور طارق لریدہ کے شہر تک پہنچ گیا جہاں سینٹ مارٹن کی مشہور خانقاہ بھی تھی۔ طارق نے یہ اشتہار دے دیا تھا کہ وہ ظلم مٹانے اور غیطشہ کے بیٹے ڈان پڈرو کی حمایت میں آیا ہے۔ اس کا اندلسیوں پر اچھا اثر ہوا۔

طارق کے راڈرک کے خلاف صف آرا ہونے، ایک دوسرے کے حملے کا منتظر رہنے اور پھر دونوں لشکروں میں آٹھ دن کی معرکہ آرا جنگ کا کتب تواریخ میں مفصل ذکر ملتا ہے[1]۔ راڈرک کے گھوڑے کا نام، اس کے فرار اور بیس پچیس میل تک تعاقب کا ذکر بھی تاریخوں میں موجود ہے[2] اور اکثر تاریخوں میں یہ بھی مذکور ہوا ہے کہ ندی کے کنارے دلدلی علاقے میں راڈرک کا ایک جوتا ملا، خود اس کی لاش کا کوئی پتہ نہیں چلا، غالباً وہ کہیں ڈوب کر مر گیا تھا[3]۔ لین پول نے اس ضمن میں ہسپانویوں کی بعض خوش فہمیوں کا ذکر بھی کیا ہے[4]۔ طارق کی پیش قدمی کے بارے میں شرر نے جو تفصیلات بیان کی ہیں ان کی کتب تواریخ سے تصدیق ہوتی ہے[5]۔

اکیسویں اور بائیسویں باب میں مسیحی خانقاہوں کے اندر کے فریب اور مظالم پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ اس دور میں پادریوں کے مظالم کا کتب تواریخ میں اکثر ذکر ملتا ہے اور لین پول و سکاٹ کی قابل قدر تصانیف بھی کلیسا کی ان مکروہات پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ بعض امور کا ذکر ہم نے "فلورا فلورنڈا" اور "مقدس نازنین" کے ضمن میں کیا ہے۔ تئیسویں اور چوبیسویں باب میں ابتدائی فتوحات کے دو ماہ بعد کے واقعات ہیں جن کے مطابق عبدالعزیز بن موسیٰ اور عیسیٰ بن مزاحم ہسپانیہ کے مشرقی حدود میں عیسائیوں سے نبرد آزما تھے۔ بنی قوط کے عیسائی قلعہ اوریولو میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ اس لڑائی میں پندرہ سولہ ہزار مسیحی سپاہی مارے گئے تھے۔ عبدالعزیز نے قلعے کا محاصرہ کر لیا، اس کے حملوں کی تاب نہ لا کر اور قلعے کے مخدوش حالات کے پیش نظر پادری صلح کی درخواست لے کر آیا اور یہ تأثر دیا کہ قلعے میں چالیس پچاس ہزار سپاہی موجود ہیں اگر باعزت صلح نہ ہوئی تو وہ سب ہتھیار ڈالنے کی بجائے کٹ مرنا پسند کریں گے۔ عبدالعزیز نے قلعے کے گرد چکر لگایا تو ہر جگہ فصیل پر خود و زرہ پہنے عیسائی سپاہی تیار کھڑے تھے جن کی تعداد پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی، چنانچہ معاہدۂ صلح لکھ دیا گیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ قلعے میں فوج نہ تھی صرف عورتیں، بچے اور غلام تھے جنہیں وردیاں پہنا کر فصیلوں پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے اس فریب کے انکشاف کے باوجود اپنے معاہدے کا احترام کیا اس طرح قلعہ قلطرادہ بچ گیا جو بعد میں مسلمانوں کے لیے ایک عذاب بنا۔

ان ابواب میں بیان کردہ واقعات میں سے قلعے میں موجود عورتوں اور بچوں کو فوجی لباس پہنا کر فصیل پر کھڑا کرنے اور اس طرح صلح کا معاہدہ کر لینے کے واقعے کا بیان کتب تواریخ میں موجود ہے[6] اور یہ بھی مذکور ہوا ہے کہ بعد میں اصل حقیقت آشکار ہو جانے کے

۱، ۲، ۳- انسائیکلوپیڈیا اسلام بذیل مادہ الاندلس ؛ لین پول: ص ۲۱، ۲۲ ؛ ڈوزی : ج ۱، ص ۳۰۷ ؛ سکاٹ : ج ۱، ص ۲۲۱ ، مقری: ص ۹۲؛ سید امیر علی: ص ۱۰۹؛ ابن الاثیر: (خلافت بنو امیہ ترجمہ)، ج ۲، ص ۱۳۹ - ٤- لین پول: ص ۲۲ - ۵- ایضاً، ص ۲۳ بیعد؛ سکاٹ: ج ۱، ص ۲۲۲ تا ۲۲۳ -

٦- مقری: نفح الطیب (ترجمہ محمد خلیل الرحمن)، ص ۹۸ -

باوجود مسلمانوں نے اپنے عہد کا پاس کیا،[1] اگرچہ آخرکار یہی پاس داری اندلس میں مسلمانوں کے لیے باعث اذیت ثابت ہوئی ۔ البتہ شرر نے ان واقعات میں رومانی تصرف کرتے ہوئے فلورنڈا، مریم اور ڈان پڈرو وغیرہ کو بھی یہاں جمع کر دیا ہے ۔

پچیسویں باب میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ اندلس میں ابھی مہم جاری تھی کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہوگیا اور سلیمان تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ اس نے موسیٰ، طارق کو سپین سے، قتیبہ بن مسلم کو کاشغر سے اور محمد بن قاسم کو ہندوستان سے واپس طلب کر لیا ۔ اس بیان میں یہ امر تو صحیح ہے کہ خلیفہ ولید کے بعد سلیمان خلیفہ مقرر ہوا اور یہ بھی کہ اس نے قتیبہ اور محمد بن قاسم کو معزول کرکے دمشق طلب کر لیا لیکن یہ امر محل نظر ہے کہ موسیٰ اور طارق کو بھی اسی کی طلبی پر اندلس سے واپس لوٹنا پڑا ۔ مؤرخین کی اکثریت کی یہی رائے ہے کہ یہ دونوں ولید بن عبدالملک کی طلبی پر ہی واپس لوٹے تھے ۔ البتہ اس ضمن میں مؤرخین کے یہاں اختلاف رائے ہے کہ آیا موسیٰ بن نصیر خلیفہ ولید کی زندگی میں دمشق پہنچے یا اس وقت تک سلیمان تخت خلافت پر بیٹھ چکا تھا ۔ شرر نے اسی باب میں موسیٰ اور طارق کے باہمی اختلاف کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کی تصدیق اکثر کتب تواریخ سے ہوتی ہے ۔

چھبیسویں باب میں ڈان پڈرو کی بیٹی اور عطسہ کی پوتی مریم اپنے شوہر عیسیٰ بن مزاحم کے ساتھ اپنے حقوق کے لیے اندلس سے دمشق کی طرف سفر کرتی دکھائی گئی ہے ۔ اس سفر میں شرر نے جو مقامات اور ان کی اہمیت بیان کی وہ تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے درست ہے ۔ اسی باب میں یہ ذکر بھی ہے کہ جب مریم دمشق پہنچی تو خلیفہ سلیمان حج کے لیے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا، مریم دربار میں پیش ہوئی، اس کی اداؤں، شائستگی اور صورت نے خلیفہ کو بہت متاثر کیا ۔ ستائیسویں باب میں جب موسیٰ اور طارق کا مقدمہ پیش ہوا تو مریم کے حقوق کے سلسلے میں بھی بازپرس ہوئی ۔ طارق مقدمے میں بری اور موسیٰ قید کیا گیا ۔ مریم کے باپ کو بہت بڑی جاگیر دی گئی اور اندلس میں اس کی عزت سب سے زیادہ قرار دی گئی ۔ مریم اور عیسیٰ نے خلیفہ کے ہمراہ حج کیا، مریم مسلمان ہوگئی اور واپس اندلس چلی گئی ۔ اسی باب میں یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ عیسیٰ دراصل ڈان پڈرو کے بڑے بھائی سلوقوس کا بیٹا تھا جو دس ہزار فوج کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف ملکہ قرطاجنہ کی مدد کے لیے افریقہ گیا تھا، عیسیٰ بھی ہمراہ تھا ۔ شکست ہوئی سلوقوس تو مارا گیا لیکن عیسیٰ چھوٹی سی عمر میں غلام بنا لیا گیا اور خلیفہ کے ایک عزیز نے اسے اپنے بچوں کی طرح پالا ۔ مریم اور عیسیٰ قرطبہ کے قریب اپنی جاگیر میں قیام پذیر ہوگئے اور ان کی نسل سے ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے علم و ادب کی بڑی خدمت کی، ابن قوطیہ اسی خاندان کا چشم و چراغ تھا ۔

تاریخی اعتبار سے اس ناول کا سب سے کمزور حصہ اس میں عیسیٰ بن مزاحم کا ہیرو کی حیثیت سے آنا، مریم سے اس کا معاشقہ، مریم کا سبتہ میں موجود ہونا، فتح اندلس کے دوران عیسیٰ کا مریم سے نکاح ہونا اور سلیمان بن عبدالملک کے دربار میں مریم کا حاضر ہوکر اپنے حقوق حاصل کرنا ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سارے پلاٹ کی اساس بعض تاریخی واقعات پر ہے لیکن شرر نے اس میں بہت زیادہ واقعاتی اور رومانی تصرف کیا ہے ۔ مقری نے ان واقعات کے بارے میں لکھا

۱۔ مقری : ص ۹۸ : سکاٹ : ج ۱، ص ۲۳۸ ' لین پول : ۲۴ تا ۲۶ ۔

ہے کہ طارق نے غیطشہ کی اولاد سے حقوق کا عہد کیا تھا جس کی موسیٰ اور خلیفہ دونوں نے توثیق کی ۔ جنگ کے بعد ان کو اپنے باپ کی جاگیرات وغیرہ بحال رکھنے کے علاوہ انعام و اکرام بھی مرحمت ہوا اور انھیں ایسا رتبہ دیا گیا کہ انھیں کسی کی تعظیم کے لیے کھڑے ہونے کی ضرورت نہ رہی ۔ بڑے بیٹے المند کے حصے میں ہزار جاگیرات علاقۂ غرب اندلس میں آئیں جن کی وجہ سے وہ اپنی جاگیر کے قریب اشبیلیہ میں جا بسا ، دوسرے بھائی ارطباس کے حصے میں بھی ہزار جاگیرات آئیں چونکہ اس کا حصہ وسط اندلس میں واقع تھا اس لیے اس نے قرطبہ میں سکونت اختیار کی، تیسرے بھائی وقلہ کو بھی اتنا ہی حصہ ملا جو شرق اندلس میں واقع تھا ، وہ شہر طلیطلہ میں جا رہا ۔ خلافت امیرالمومنین ہشام بن عبدالملک میں المند مرگیا اور اس نے اپنے پیچھے اپنی بیٹی سارہ المعروف بہ قوطیہ اور دو چھوٹے بیٹے چھوڑے ۔ ارطباس نے ان کی جاگیرات پر قبضہ کرکے اپنی جاگیرات میں ضم کر لیا ۔ المند کی بیٹی سارہ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے ساتھ ایک جہاز کرائے پر لے کر عسقلان پہنچی اور وہاں سے امیرالمومنین ہشام کی خدمت میں دمشق میں حاضر ہوئی ۔ اپنے چچا کے ظلم و تعدی کی فریاد کی اور خلیفہ ولید بن عبدالملک نے جو عہد اس کے باپ سے کیا تھا یاد دلوایا ۔ خلیفہ اس کی صورت اور حزم کو دیکھ کر متعجب ہوا اور اپنے عامل افریقہ حنظلہ ابن صفوان کو اس کا انصاف کرنے اور اس کے چچا ارطباس سے اس کا حق لے دینے اور اس کو اور اس کے بھائیوں کو اس کے باپ کی جاگیر پر بحال کر دینے کے لیے لکھا ۔ حنظلہ نے اپنے چچیرے بھائی ابوالخطاء عامل اندلس کو لکھ بھیجا اور اس نے امیرالمومنین کے احکام کی تعمیل کرا دی[1] ۔

مقری نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے سارہ کا نکاح عیسیٰ بن مزاحم سے کر دیا اور وہ دونوں اندلس چلے گئے ۔ عیسیٰ اپنی منکوحہ کی جاگیر کو اس کے چچا ارطباس کی دستبرد سے بچاتے رہے ۔ سارہ کے دو لڑکے ابراہیم و اسحق پیدا ہوئے ۔ ان دونوں نے اشبیلیہ میں بہت عزت، ریاست اور شہرت پائی ۔ ان کی نسل سارۃ القوطیہ کی طرف منسوب ہوئی ۔ جن دنوں سارہ دمشق میں خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے پاس گئی تھی تو اس نے وہاں عبدالرحمن ابن معاویہ کو بھی دیکھا تھا ۔ جب عبدالرحمن الداخل نے اندلس پر قبضہ کر لیا تو سارہ اس سے ملی، اس نے پہچان لیا اور اس کا بہت اعزاز و اکرام کیا اور یہ اجازت دی کہ جب بھی وہ قرطبہ آئے تو بلا روک ٹوک قصر شاہی میں آیا جایا کرے ۔ اس سے سارہ کے اکرام میں اور بھی اضافہ ہوا[2] ۔

مقری نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس سال عبدالرحمن الداخل نے اندلس کی سلطنت حاصل کی تھی اسی سال سارہ کے شوہر عیسیٰ بن مزاحم کا انتقال ہوگیا تھا ۔ امیر عبدالرحمن الداخل نے اس کا نکاح ثانی عمیر بن سعید سے کر دیا[3] ۔

سید امیر علی نے سارہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب کے ایک حاشیے میں لکھا ہے:

"A grand daughter of Witiza named the princess Sarah visited the court of Hisham to seek redress against her uncle, who had usurped her and her brother's patrimony. Hisham received her with kindness and consideration and lodged her in his queen's palace He not only had her property restored to her by her uncle but married her to an Arab

۱- مقری: نفح الطیب (ترجمہ)، ص ۹۹، ۱۰۰ - ۲- ایضاً، ص ۱۰۰ - ۳- ایضاً، ص ۱۰۰، ۱۰۱ -

noble, with whom she returned to Spain

She continued in her religion, but then children were brought up as Moslems. Her descendants occupied a distinguished position in the country One of them, surnamed Ibn Ghoutia (son of the Gothic princess), was a scholar and well known writer [1]

مذکورہ بالا تاریخی حوالہ جات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اس ناول میں عیسیٰ بن مزاحم اور مریم سے متعلق واقعات کے سلسلے میں شرر نے کس قدر تصرف کیا ہے - فتح اندلس کے سلسلے میں ان دونوں کرداروں اور ان سے متعلق واقعات کا ذکر بے محل ہے -

۹- یوسف و نجمہ

یہ ناول دلگداز میں ۱۸۹۱ء میں چھپنا شروع ہوا لیکن تکمیل سے پہلے ہی شرر کو دلگداز بند کر کے حیدرآباد جانا پڑا اور یہ ناول نامکمل رہ گیا - اسے شرر نے ۱۹۰۶ء میں مکمل کیا - یوسف و نجمہ کو تاریخی ناولوں کی صف میں شامل کرتے ہوئے اس اعتبار سے ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے کہ اس میں ایک آدھ واقعے اور دو چار ناموں کے علاوہ کوئی تاریخی بات نہیں - ناول کا خلاصہ یہ ہے :

ایک تین سال کا بچہ اپنی ماں کے ساتھ ایک فنس میں سفر کر رہا تھا، چند لوگ فنس کے گرد تھے، اس کا باپ گھوڑے پر سوار چند مسلح نوکروں کے جلو میں جا رہا تھا - جنگل میں ایک دن اس قافلے نے کہیں قیام کیا تھا کہ حملہ ہوا، فنس الٹ گئی، بچے کی ماں کو حملہ آوروں نے فنس سے کھینچ کر نکال لیا، کچھ دیر بعد بچہ فنس سے نکلا تو ماں اور دیگر بہت سے ساتھی مردہ پڑے تھے - بچے کو اتنا یاد تھا کہ جب اس کی ماں کو فنس سے کھینچ کر نکالا جا رہا تھا تو کسی نے یہ بھی کہا تھا کہ "وہ ہاتھ سے نکل گیا"- بچے نے مردہ ماں کو ہلایا جلایا اور جب وہ نہ بولی تو وہ خود بھی اس کی خون آلودہ لاش سے لپٹ کر سو گیا -

دوسری صبح کچھ مسلح سوار ادھر سے گزرے، ان میں سے دو گھوڑوں سے اتر کر لاشوں کے قریب آئے، بچے کو زندہ اور روتا دیکھ کر پکارا اور ایک سوار نے اسے اپنے ساتھ گھوڑے پر سوار کر لیا - شام کو اس فوج نے ایک گاؤں کے قریب خیمے لگائے جہاں سے وہ سوار رات کو ہی بچے کو لے کر ایک اور گاؤں کی طرف چلا اور صبح اس گاؤں کے ایک مکان میں پہنچا جو اس کا گھر تھا اور وہاں اس کی نوجوان بیوی، بوڑھی ماں، بیوی کے بھائی کی ہندو بیوہ، اس کے دو بچے (۵ سالہ قاسم اور ۳ سالہ نجمہ)، خادمہ کلثوم، اس کا لڑکا مرزا اور کچھ نوکر چاکر تھے - اس لاوارث بچے نے اس نوجوان کو ابا، اس کی بیوی کو اماں اور نجمہ کی ماں کو خالہ کہنا شروع کیا - اماں نے اسے اپنی اولاد کی طرح لاڈ پیار سے پالنا شروع کیا اور اس کا نام یوسف رکھا - یوسف کی خاطر کبھی کبھی اماں کی خالہ سے جھڑپ بھی ہونے لگی -

یوسف اور نجمہ میں بچپن سے ہی انس بڑھنے لگا، چھ سال کی عمر میں یوسف کو مولوی جلال الدین کے پاس سبق کے لیے بٹھایا گیا، نجمہ، مرزا اور قاسم بھی اس کے ہم درس تھے - مرزا اور قاسم کند ذہنی کی وجہ سے اکثر مار کھاتے، نجمہ اور یوسف ذہین تھے - چار سال میں انہوں نے عربی، فارسی اور بہت کچھ پڑھ لیا - مرزا مکتب سے اٹھا دیا گیا، قاسم بدستور مار کھاتا

۱- امیر علی، سید : A Short History of Saracens، ص ۱۵۷-

رہا - دس برس کی عمر میں یوسف اور قاسم نے فن سپہ گری سیکھنا شروع کیا - دس برس کی عمر میں نجمہ کو مکتب سے اٹھا دیا گیا اور پھر یوسف کی توجہ بھی سبق سے ہٹ گئی اور اسے بھی مار پڑنے لگی - ایک دن اسی طرح یوسف کو مار پڑ رہی تھی کہ ایک نووارد شخص نے جو مولوی صاحب کے پاس بیٹھا تھا، ان کے چھرا گھونپ دیا اور یوسف کو زبردستی اٹھا لے جانا چاہا لیکن ناکام رہا - بعد میں معلوم ہوا کہ نووارد کے ساتھ پچاس سوار اور بھی تھے جو گاؤں کے باہر اس کے منتظر تھے -

مولوی جلال الدین کے قتل کے بعد یوسف کے لیے ایک یمنی استاد مقرر ہوا جس کے درس سے ایک برس کے اندر یوسف کی عربی کی استعداد بڑھ گئی - نجمہ سے اب بہت کم ملاقات ہوتی تھی - اسی دوران دادی اماں ڈیڑھ ماہ بیمار رہ کر مر گئی - یوسف کو جس شخص نے پالا تھا اس کا نام ملک نصیرالدین افتخارالملک تھا - سلطان فیروز شاہ تغلق نے اس کی خاندانی خدمات کے صلے میں اسے ۷۶۲ھ میں اٹاوے کے قریب کا علاقہ جاگیر میں دیا تھا اور اس نے اٹاوے سے دس بارہ کوس سال میں رہائش اختیار کر لی تھی - ۷۶۲ھ میں فیروز شاہ نے مشرق ہند کی طرف بعض بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے سفر کیا تھا - نصیرالدین بھی ہمراہ تھا اور اسی سفر سے واپسی میں اسے یوسف ملا تھا - نصیرالدین کی شادی یوسف کے ملنے سے ۱۰ برس پہلے ہوئی تھی لیکن اس کی کوئی اولاد نہ تھی -

کچھ عرصے بعد نجمہ کی ماں کا انتقال ہوگیا اور اس کے ایک ہفتے بعد کسی نے پانچ ہزار آدمیوں کے ساتھ نصیرالدین پر حملہ کر دیا - نصیرالدین کے ساتھ صرف پانچ سو آدمی تھے - حالات مخدوش دیکھ کر اس نے اپنی بیوی کو مشورہ دیا اور وہ تینوں بچوں، کلثوم اور مرزا کو ساتھ لے کر مکان کی پچھلی دیوار توڑ کر جنگل میں نکل گئی - یہ رات انھوں نے جنگل میں مختلف واہموں اور خوف و ہراس میں کاٹی - صبح نماز پڑھ کر آگے روانہ ہوئے - دوسری رات پھر جنگل میں قیام کا فیصلہ ہوا، مرزا اور قاسم ایک قریبی گاؤں سے خورد و نوش کا کچھ سامان خرید لائے اس گاؤں میں انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ حملہ آوروں نے نصیرالدین کو گاؤں میں قید کر رکھا ہے اور اس سے تمام جائداد اور یوسف کا مطالبہ کرتے ہیں - رات باری باری پہرہ دے کر کاٹی، صبح پھر روانہ ہوئے شام کو ایک گاؤں کے قریب، پہاڑ کے دامن میں ایک کھوہ میں ٹھہر گئے - رات بھیڑیے نے نجمہ کو لے جانا چاہا لیکن یوسف نے اس کا گلا دبوچ کر اسے ہلاک کر دیا - ایک کالا ناگ مرزا کے ہاتھوں مرا - رات کے پچھلے پہر سات مسلح آدمیوں نے انھیں اس کھوہ میں گھیر لیا اور لوٹنا چاہا - مرزا نے ان کے سردار کے سر پر پتھر کھینچ مارا، سردار زخمی ہوا لیکن اس کی پاداش میں فوراً ہی مرزا کا سر نصرت خان کی تلوار سے اڑ گیا - اس کے بعد انھیں لوٹ کر اور رسیوں سے باندھ کر ایک دیہات میں لے جا کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا -

یہ پانچوں اسیران بلا چار دن اس مکان میں قید رہے اور مرزا کے ہاتھوں زخمی ہونے والے خان صاحب نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنے وارثوں کا پتہ بتائیں تاکہ ان سے رقم وصول کرکے انھیں رہا کر دیا جائے - جب کامیابی نہ ہوئی تو انھیں پھر رسیوں سے باندھ کر اونٹوں پر سوار کیا گیا - اب کے ان ظالموں کے گروہ میں ایک حبشی بھی تھا - بارہ دن کے سفر کے بعد وہ جودھپور کے ایک گاؤں میں پہنچے اور ایک ویران قلعے میں قیام پذیر ہوئے - رات کو اس گروہ کے سردار خان صاحب نے اپنے ساتھیوں کو اپنی بہادری کے قصے سناتے ہوئے یہ واقعہ بھی سنایا

کہ ایک مرتبہ ایک ملک صاحب دلی سے اودھ کی حکومت کا پروانہ لے کر مع آل و عیال اور دولت کے روانہ ہوئے ۔ ان کے ساتھ بس پچیس آدمی تھے، خان صاحب اپنے چالیس پچاس آدمیوں کو ساتھ لے کر تاک میں چلے ۔ راستے میں باقی ساتھیوں کو پیچھے آنے کی ہدایت کرکے دو تین ساتھیوں کے ہمراہ جن میں حبشی مراد بھی تھا، ملک صاحب سے جا ملے، دوستی پیدا کی اور ہمسفر ہو گئے ۔ تین چار دن بعد جنگل میں موقع دیکھ کر ترہی بجا کر باقی ساتھیوں کو بلا لیا، مقابلہ ہوا، ملک صاحب کے اکثر ساتھی مارے گئے، ملک خود زخمی ہوا، اس کی نوجوان اور خوب صورت بیوی کو فنس سے نکال کر لوٹا، ٹکڑے ٹکڑے کیا، حبشی مراد نے بھی جو نیزہ لیے فنس کے ساتھ ساتھ دوڑتا رہا تھا ملک کی بیوی کے چہرے پر نیزہ مارا تھا ۔

یوسف یہ داستان سن رہا تھا ۔ واقعات کے سنتے ہی چیخ اٹھا، دوسری صبح حبشی مراد نے یہ دیکھ کر کہ ان سب کے اکٹھا رہنے سے شور و غل ہوتا ہے اور آرام میں خلل پڑتا ہے، نجمہ کو زبردستی لے جانا چاہا ۔ یوسف نے مزاحمت کی اور اس کے نیزے سے زخمی ہوا ۔ نجمہ زبردستی الگ لے جائی گئی ۔ یوسف مجنونانہ کیفیت میں نصرت خان سے لڑ پڑا ۔ حبشی قاسم اور یوسف کے قتل کر دینے کے حق میں تھا لیکن نصرت خان کی سفارش پر محض ہتھکڑیاں ڈالنے پر اکتفا کیا گیا ۔ اسی شام جو جب سب ڈاکو کہیں باہر گئے ہوئے تھے نصرت خان چپکے سے آیا اور سب کو رہا کر دیا ۔ وہ نجمہ کے کردار سے بہت متأثر ہوا تھا جسے خان صاحب اپنے حرم میں لینا چاہتا تھا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تھی ۔ نصرت خان نے انہیں مشورہ دیا کہ وہاں سے نکل کر فوراً پانچ چھ کوس پر کیونسیر چلے جائیں جہاں کا راجا بہت رحم دل ہے ۔

یہ سب روانہ ہو کر رات بھر سفر کرکے صبح کیونسیر پہنچے ۔ راجا نے ایک مسلمان مترجم کے ذریعے ان کا حال سنا، شفقت فرمائی اور احترام سے ایک مکان میں ٹھہرایا ۔ راجا کا وہ مسلمان درباری سراج الدین خان تھا جسے راجا نے بادشاہ کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کرنے کے لیے دلی سے بلوایا تھا، وہی ان کا میزبان قرار دیا گیا ۔ ایک ہفتہ قیام کیا تو راجا نے ایک ہزار روپیہ اور تین تھان کمخواب کے بھیجے، سراج الدین خان نے عورتوں کے لیے برقعے بنوا کر دیے ۔ اسی دوران ڈاکوؤں میں سے ایک جوگی کے روپ میں ان کے گھر تک پہنچا، پہچان کر واپسی میں مکان اور راستے پر نشان لگا لیا ۔ یوسف کو شبہ ہوا تو اس نے نشان مٹا دیے اور سراج الدین کو مطلع کیا ۔ اس نے مکان پر پہرہ لگوا دیا، معلوم ہوا کہ راجا نے اس ویران قلعے پر چھاپہ بھی مروایا تھا لیکن ڈاکو نہ مل سکے تھے ۔ یوسف نے راجا سے اپنے دلی بھجوانے کی خواہش کی تو طے پایا کہ انہیں ایک فوجی دستے کے ساتھ جودھ پور پہنچا دیا جائے جہاں سے وہ راج کنور کے لشکر کے ساتھ دلی جائیں ۔ راج کنور لشکر کے ہمراہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہونے جا رہا تھا ۔

کیونسیر کے قیام کے دوران ایک رات یوسف نے سنا کہ کوئی ان کی دیوار کے قریب باتیں کر رہا تھا اور دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سراج الدین اسے منع کر رہا تھا دوسری رات پھر شور ہوا لوگ جمع ہوئے تو معلوم ہوا کہ کوئی دیوار پھاندنا چاہتا تھا کہ راجا کھڑک سنگھ کے بیٹے کنور رنبیر سنگھ نے اس کو پکڑا لیکن وہ کنور کو زخمی کرکے بھاگ نکلا ۔ یوسف کو یہ بھی معلوم ہوا کہ کنور نجمہ سے شادی پر مصر ہے، اس نے سراج الدین سے تصدیق کی، اس نے تسلی دی ۔ یوسف کو سراج الدین سے معلوم ہوا کہ راجا کھڑک سنگھ کا بڑا بھائی رگھبیر سنگھ کیونسیر کا راجا تھا اس کا ایک بیٹا رنبیر سنگھ اور دو بیٹیاں چندرا وتی اور

پاربتی تھیں ۔ چندراوتی کو کوئی بھگا لے گیا جس کے غم میں راجا تیس برس ہوئے راج پاٹ چھوڑ کر کہیں نکل گیا ۔ کھڑک سنگھ کی اپنی کوئی اولاد نہیں اس لیے اس نے کنور رنبیر سنگھ کو ولی عہد مقرر کیا ہے ۔

دوسرے دن یوسف راجا کی خدمت میں حاضر ہوا اور رخصت کرنے کے لیے منت کی ۔ راجا نے گیس سنگھ کو مقرر کیا کہ انہیں پچاس سواروں کے دستے کے ہمراہ جودھ پور لے جا کر راجا کے حوالے کر آئے تا کہ وہ انہیں راج کنور کے لشکر کے ہمراہ دلی بھیج دے ۔ تیسرے دن صبح دو رتھوں میں سامان رکھا گیا عورتیں سوار ہوئیں ۔ قاسم اور یوسف گھوڑوں پر سوار گسں سنگھ کے پچاس سواروں کے جلو میں روانہ ہوئے ۔ چوتھے دن یہ قافلہ جودھ پور پہنچا ۔ گیس سنگھ نے راجا سے مل کر یوسف وغیرہ کو ان کے سپرد کیا ۔ راجا نے انہیں ایک مکان میں ٹھہرایا ، دوسرے دن اپنے بیٹے رگھبیر سنگھ سے یوسف کو ملا کر ضروری ہدایات دیں ۔ جودھ پور میں یوسف کی ملاقات حاجی محمد صالح نامی عربی وضع کے ایک شخص سے ہوئی جو غریب الوطن تھا اور دلی جانے کا ارادہ رکھتا تھا ۔ یوسف نے اسے اس کے تین همراہیوں سمیت اپنے مکان کے بیرونی حصے میں ٹھہرا لیا ۔ آٹھویں دن راجا جودھ پور نے دو ہاتھی، دو اونٹ اور دو گھوڑے یوسف کو دیے اور وہ راج کنور کے ساتھ لشکر کے قلب میں محمد صالح اور اس کے ساتھیوں سمت دلی روانہ ہوئے ۔

حاجی محمد صالح کھانا بہت اچھا پکاتا تھا اکثر یوسف وغیرہ کی دعوت کرتا ۔ ایک پڑاؤ پر کنور ، یوسف کو بھی شیر کے شکار پر ہمراہ لے گیا، اس دن یوسف کی دلیری اور جانثاری سے کنور کی جان بچی اور شیر مارا گیا جس سے کنور یوسف کا انتہائی ممنون احسان ہوگیا ۔ ایک پڑاؤ پر حاجی صالح نے ہرن کا شکار کرکے یوسف وغیرہ کی دعوت کی، انہیں باہر ساتھ کھلایا، عورتوں کے لیے اندر الگ بھیجا، پھر قاسم اور یوسف کو راج کنور کے پاس ساتھ لے گیا تا کہ اس کے آدمیوں کے لیے لشکرگاہ سے نکلنے کا پروانہ لے دیں جنھیں وہ صبح سویرے آگرہ بھجنا چاہتا تھا اور خود یوسف کو دلی پہنچا کر لوٹنے کا ارادہ رکھتا تھا ۔ پروانہ اس نے اپنے ایک آدمی کو دے کر کنور کے خیمے سے رخصت کر دیا اور خود دیر تک بیٹھے رہے ۔ وہاں سے اٹھے تو وہ انھیں سیر کے بہانے بہلا پھسلا کر لشکرگاہ سے باہر لے گیا اور کچھ دور جا کر جب اس کے خدمتگار اور اس نے یوسف و قاسم کے گلے میں پھندا ڈالنا چاہا تب وہ متنبہ ہوئے ۔ اس کوشش میں ناکام ہو کر وہ دونوں بھاگ نکلے، یوسف اور قاسم لوٹے تو صالح کا خیمہ خالی تھا ۔ خدمتگار روانہ ہو چکے تھے ۔ کلثوم اور اماں بے ہوش تھیں، نجمہ کا کچھ پتہ نہ تھا۔ کنور کو خبر کی گئی اس نے ایک حکیم کو انہیں ہوش میں لانے پر مامور کیا، سو سواروں کی چار ٹکڑیاں فوراً مختلف سمتوں میں روانہ کیں ۔ کلثوم وغیرہ نے ہوش میں آ کر بتایا کہ کھانا کھاتے ہی ان پر غشی طاری ہوگئی تھی ۔ تلاش میں بھیجے ہوئے سوار صبح ناکام لوٹے ۔ وہ دن پڑاؤ رہا اور دوسرے دن کنور نے دلی جانے کی بجائے آگرے کے لیے کوچ کا ارادہ کیا، سو سپاہیوں کو جوگیوں کے روپ میں نجمہ کی تلاش پر متعین کیا اور پچاس افسروں کو پچاس پچاس سپاہیوں کے جتھوں کے ساتھ ان سادھوؤں کے قریب رہنے کا حکم دیا ۔ یوسف بھی کلثوم، اماں اور قاسم کو کنور کی امان میں دے کر کچھ ہمراہیوں کے ساتھ قلندروں اور سادھوؤں کے روپ میں روانہ ہوا ۔ کنور نے یوسف کے بارے میں روزانہ کی خبریں منگوانے کے لیے آگرے تک سپاہیوں کی خاص ڈاک بٹھائے

کا اہتمام کیا۔

ایک رات یوسف نے اپنے چار قلندروں اور پانچ سادھوؤں کے ساتھ ایک مقام پر قیام کیا ہوا تھا کہ ایک معمر سادھو اور اس کا بالکا بھی وہاں آ گئے۔ یوسف نے انھیں ساتھ ٹھہرا لیا۔ معمر سادھو سے معلوم ہوا کہ آٹھ دن پہلے سادھوؤں کا ایک گروہ ایک لڑکی کو لے جا رہا تھا۔ ان میں محمد صالح نام ایک آدمی تھا جو دوسروں کو اپنی کارگزاریاں سنا رہا تھا کہ اس کے بالکے نے سن لیا۔ اس بےہوش لڑکی کو انھوں نے ہوش میں لا کر ایک غلط داستان سنا کر راج کنور کے خلاف بدظن کرنے کی کوشش کرتے ہوئے خود کو اس کا ہمدرد ظاہر کیا۔ وہ لوگ جودھ پور کے قریب کسی پرانے قلعے کی طرف روانہ ہوئے تھے اور وہاں سے کیونسر جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس دن یوسف کے ہمراہیوں نے وہیں قیام کر کے کنور کو اطلاع بھجوائی اور دوسرے دن معمر سادھو اور اس کے بالکے کے ہمراہ جودھ پور کا قصد کیا۔ اس پرانے قلعے تک پہنچنے سے پہلے یوسف اور اس کے ساتھی ان ٹھگوں تک جا پہنچے، لیکن نجمہ ان کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ ٹھگ جس نے کیونسر میں یوسف کے مکان پر نشان لگایا تھا ایک ویرانے میں یوسف، معمر سادھو اور اس کے بالکے کے داؤ آ گیا۔ انھوں نے اسے ذرا دھمکا کر اس سے معلوم کر لیا کہ نجمہ کو انھوں نے خان صاحب ڈاکو کے لیے دس ہزار روپے کے معاوضہ پر اٹھوایا تھا۔ اب اسے کنجوانہ میں ایک عورت کے پاس چھوڑ آئے ہیں جسے بعد میں پانچ سو روپے دے کر نجمہ کو منگوا لیں گے۔ سادھو نے اس ٹھگ کو بےہوشی کی دوا دے کر گٹھڑی میں بندھوا لیا اور یوسف وغیرہ چپکے سے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کنجوانہ کے قریب پہنچ کر اس ٹھگ کو ہوش میں لا کر مجبور کیا کہ وہ پانچ سو روپے لے جا کر بائی جی کو دے اور لڑکی کو لے آئے۔

دوسرے دن سادھو، اس کا بالکا، یوسف اور وہ ٹھگ بائی جی کے پاس گئے اور ایک ہزار روپیہ اسے دے کر کہا کہ خان صاحب کو کچھ شبہ ہو گیا ہے اور انھوں نے شیخ جی کو لڑکی کے وہاں پہنچنے تک قید کر لیا ہے۔ شیخ نے وعدہ سے دگنی رقم دے کر بھیجا ہے کہ لڑکی کو ان کے ہمراہ بھیج دیا جائے۔ بائی جی نے دوسرے دن تک غور کرنے کی مہلت مانگی۔ دوسرے دن اس نے نجمہ کو ان کے سپرد کر دیا لیکن ابھی وہ مکان کے دروازے سے نکلے بھی نہیں تھے کہ کچھ فوجی سواروں نے آ کر انھیں حراست میں لے لیا۔ بائی جی کو پکڑ کر کہیں اور لے گئے انھیں شام تک وہیں محبوس رکھا اور رات کو لے کر چلے۔ لمبے سفر کے بعد پڑاؤ کیا۔ دوسری صبح اچانک رنبیر سنگھ کے لشکر نے آ کر انھیں گھیر لیا۔ معلوم ہوا کہ پہلے دن قید کرنے والے خان صاحب ڈاکو اور اس کے ہمراہی تھے جنھیں حاجی صالح نے اپنے ایک آدمی کے لاپتہ ہو جانے پر مشتبہ ہو کر مطلع کر دیا تھا۔ سب کو ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں لیکن بالکے کے گانے سے متاثر ہو کر کنور نے سادھوؤں کی بیڑیاں کھلوا دیں، نجمہ کو سراج الدین کی حفاظت میں دے دیا گیا۔ حاجی صالح کے لیے کنور نے پیغام بھجوایا کہ کیونسیر کے قریب آ کر اس سے ملے۔ دس بارہ دن میں یہ کیونسیر کے قریب پہنچے، حاجی صالح بھی آ گیا، دو دن بعد اس سارے مقدمے کی سماعت ہونی تھی کہ اچانک ملک نجم الدین ضیاءالملک کی سرکردگی میں شاہی لشکر آ پہنچا اور سلطان فیروز شاہ کا حکم سنایا کہ کنور رنبیر سنگھ اپنے تمام ساتھیوں اور قیدیوں سمیت فوراً دلی حاضر ہو۔ چنانچہ سب کو بلا حیل و حجت وہیں سے شاہی لشکر کے ساتھ روانہ ہونا پڑا۔

یہ شاہی لشکر کنور رگھبیر سنگھ کی ایما پر بادشاہ نے بھیجا تھا۔ کنور کو روز روز کی

خبریں پہنچتی تھیں ۔ دلی پہنچ کر بھی یوسف اپنی مرضی سے سب قیدیوں کے ساتھ رہا ۔ جب سب سلطانی دربار میں پیش ہوئے تو یوسف نے اپنی داستان سنائی ۔ ملک نصیرالدین بھی وہیں موجود تھے جنھوں نے اسے بیٹے کی طرح پالا تھا ۔ ایک سردار معزالدین نے بادشاہ کے سامنے اعتراف کیا کہ ملک نصیرالدین پر حملہ ان کے ایما سے ہوا تھا کیونکہ معزالدین کے بھائی سہاب الدین کو جو خاندیس کا رئیس تھا ایک ہندو عورت ملی تھی جو کسی راجا کی بیٹی تھی اور اپنے عاشق جے سنگھ کے ساتھ نکل بھاگی تھی ۔ جے سنگھ اور اس کے ساتھی ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے اور وہ بچ گئی تھی ۔ شہاب‌الدین سے اسے ملک نصیرالدین کا برادر نسبتی لے اڑا اور ان کے پاس جا ٹھہرا ۔ وہاں اس کے دو بچے ہوئے اور وہ خود مر گیا ۔ معزالدین دریافت احوال کرتا رہا تھا اور اسے شبہ ہوا کہ یوسف اسی عورت کا بیٹا ہے اس لیے اس نے اسے اغوا کرنا چاہا اور اسی سلسلے میں مولوی جلال الدین اس کے ہاتھ سے مارا گیا ۔ بعد میں بھی اسی نے نصیرالدین پر حملہ کیا تھا ۔ وہ معمر سادھو جو یوسف کے ہمراہ آیا تھا آگے بڑھا اور اس نے بتایا کہ وہ راجا رگھبیر سنگھ یعنی کنور رنبیر سنگھ کا باپ اور نجمہ کا نانا ہے ۔ ملک نجم الدین ضیاء الملک جو سلطان کے حکم سے ان سب کو گرفتار کرکے لایا تھا یوسف کا والد تھا ۔ یوسف نے بتایا کہ ملک نجم الدین کے قافلے پر کئی برس پہلے حملہ کرنے والا ڈاکو وہی خان صاحب تھا جو اسیروں میں موجود تھا ۔ نجم الدین نے شناخت کے لیے حبشی مراد اور خان کو غور سے دیکھا اور پہچان لیا ۔ بادشاہ نے تمام ڈاکوؤں اور ٹھگوں کے قتل کا حکم دیا ۔ رنبیر سنگھ، معزالدین اور نصرت خان کو معاف کر دیا ۔ خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی نے دربار میں یوسف اور نجمہ کا نکاح پڑھا ۔ بادشاہ نے نجمہ کی وساطت سے یوسف کو کیونسیر کا والی بنانا چاہا لیکن یوسف نے بادشاہ کے پاس رہنے کو ترجیح دی ۔ سادھو جی (رگھبیر سنگھ) مع اپنے بالکے کے ہمیشہ یوسف کے ساتھ رہے ۔

تحقیقی جائزہ

یوسف و نجمہ شرر کے ان تاریخی ناولوں میں شامل ہے جن میں انھوں نے تاریخ کے عنصر کو بہت کم برتا ہے ۔ زیر نظر ناول میں ماسوائے کہیں کہیں بعض مقامات کے ناموں اور بعض تاریخی شخصیتوں کے ذکر کے انھوں نے تاریخ کو ناول کے پلاٹ کے طور پر استعمال نہیں کیا ۔ یوسف یا نجمہ سے وہ جس قسم کے واقعات بھی منسوب کریں اس سے تاریخ متاثر نہیں ہوتی ۔ فیروز شاہ تغلق کے بعض امراء کے نام انھوں نے ناول میں استعمال کیے ہیں لیکن ان میں بہت کم نام اصلی ہیں ۔ شرر نے اسی قسم کے نام خود تخلیق کر لیے ہیں جو اس عہد میں امراء کے مروج تھے اور اگر کوئی تاریخی شخصیت ہو بھی تو ناول کے واقعات نہ تو تاریخ کو متاثر کرتے ہیں اور نہ ہی تاریخی شخصیت کو ۔

اس پورے ناول میں صرف ایک بار سنہ کا استعمال ہوا ہے جس سے بعض واقعات کا زمانہ متعین ہو جاتا ہے ۔ شرر نے ساتویں باب میں ملک نصیرالدین افتخارالملک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۷۶۲ھ میں سلطان فیروز شاہ تغلق نے اسے خاندانی خدمات کے صلے میں اٹاوے کے قریب علاقہ جاگیر میں دیا تھا ۔ اسی سال ملک نصیرالدین کو یوسف راستے میں اپنی مقتول ماں کے سینے سے لپٹا ہوا ملا ۔ اس اعتبار سے ناول کی زمانی ترتیب درست ہے کہ اس پہلے واقعے سے

ناول کے اختتام تک فیروز شاہ تغلق کا عہد ہی تھا۔ تاریخ فیروز شاہی مؤلفہ سراج عفف کے مطابق فیروز شاہ ۷۵۲ھ میں تخت نشین ہوا اور ۷۹۰ھ تک اس کا عہد حکومت رہا۔ اس اعتبار سے اگر یوسف ۲۵ برس کی عمر میں بھی دہلی پہنچا ہو تو (۷۵۸ھ+ ۲۵ = ۷۸۳ھ) وہ سلطان فیروز شاہ تغلق ہی کا عہد تھا۔

اس ضمن میں ایک قابل توجہ امر یہ بھی ہے کہ برنی کی تاریخ فیروز شاہی (مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور) میں سلطان فیروز شاہ تغلق کا تخت نشینی کا سن ۶۸۹ھ بیان کیا گیا ہے ہاتھیوں کے شکار کا واقعہ بھی مذکور ہوا ہے۔ شکار کے معاملے میں سلطان کے شوق کا ذکر بھی تاریخ فیروز شاہی میں ملتا ہے اس لیے شرر نے آخری باب میں دربار کے منظر کو پراثر بنانے کے لیے سلطانی فطرت کے اس پہلو سے استفادہ کیا ہے۔

۱۰۔ شوقین ملکہ

یہ ناول دوسری صلیبی جنگ سے متعلق ہے۔ شوقین ملکہ کی اشاعت ۱۹۰۴ء میں قسط وار شروع ہوئی اور ۱۹۰۶ء میں مکمل ہوئی۔ ناول میں بیان کردہ تاریخی واقعات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۵ جمادی الاول ۵۳۹ھ کو دریائے دجلہ کے کنارے موصل کے شہر، قلعے میں اور شہر کے باہر ہر طرف سلطان عماد الدین زنگی کا لشکر اپنی تیاریوں میں مصروف تھا۔ سلطان کارخانے سے نکل کر الجزیرہ والی سڑک پر لشکر کے کیمپ کو دیکھتا ہوا بڑھتا جا رہا تھا کہ اسے ایک بوڑھا اور ایک چودہ سالہ نوعمر ایک اونٹ پر سوار آتے ملے۔ وہ بوڑھا سلطان کو بلاد اسلامیہ میں فرنگیوں کی چیرہ دستیوں کی داستان سنانے آیا تھا۔ اس نے سلطان کو بتایا کہ وہ اطراف حلب کا ترک ہے اور خاندان سمیت حج کے لیے جا رہا تھا کہ راستے میں فرنگی لشکر کا سامنا ہوا۔ اس کا جوان بیٹا کئی فرنگیوں کو مار کر مرا، بیوی بیٹیاں گرفتار ہوئیں، یہ پوتا زخمی بچ گیا جسے حلب لے جا کر علاج کرایا اور اب انتقام کے ارادے سے نکلا ہے۔ اس بوڑھے سے سلطان نے رہا (ایڈیسا) کے بارے میں بھی معلومات حاصل کیں اور اسے علم ہوا کہ وہاں کا فرنگی حاکم جوسلین دریائے فرات کے کنارے ایک گاؤں میں عیش و عشرت میں مصروف ہے۔ سلطان زنگی نے بوڑھے ترک کو اپنا چچا اور بچے کو بھتیجا بنا لیا، تسلی دی، انھیں ساتھ لیے فوراً قصر شاہی میں پہنچا۔ افسران فوج کو طلب کیا۔ جب سب آ گئے تو دسترخوان بچھا، وہیں سلطان نے انھیں اپنے نووارد مہمانوں سے متعارف کرایا۔ سب منتظر تھے کہ سلطان ہاتھ بڑھائے تو کھانا شروع کریں لیکن سلطان نے انھیں مخاطب کرکے کہا، "بہادرو! اس وقت اس دسترخوان پر صرف وہی میرے ساتھ کھانا کھائے جو کل میرے برابر کھڑا ہوکر شہر رہا کے پھاٹک پر نیزہ بازی کر سکے۔" ایک ترک افسر اور اس نو وارد نوعمر لڑکے نے آگے بڑھ کر کہا کہ وہ کل سلطان کے ساتھ ہوں گے۔ لڑکے کی اس جرأت پر سب کو حیرت ہوئی۔ شہر رہا موصل سے نوّے میل کے فاصلے پر تھا اور سلطان نے قسم کھا لی تھی کہ وہ دوسرے دن رہا کی دیواروں کے سامنے ہوگا، افسروں نے ہر طرح ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ کھانے کے بعد نقیبوں نے ہر طرف فوراً کوچ کا حکم پہنچا دیا۔ منجنیقوں اور محاصرے کے سامان کے پرزے الگ الگ کرکے اونٹوں پر لادے گئے جو الگ نہ ہو سکتے تھے ان کے نیچے پہیے لگا کر آگے اونٹ جوت دیے گئے۔ آدھی رات تک

جب وہاں ایک متنفس بھی نہ رہا تو زنگی اپنے دونوں مہمانوں کے ساتھ دس ہزار سواروں کے جھرمٹ میں موصل سے نکل کر شہر رہا کی طرف روانہ ہوا ۔

سارے لشکر کا اتنے کم وقت میں پہنچنا ممکن نہ تھا لیکن سلطان خود صبح ہوتے ہوتے نصف راہ طے کر چکا تھا اور شام سے پہلے رہا کی دیواروں کے نیچے تھا ۔ پوری فوج تو درکنار گارڈ شاہی کے بھی بمشکل آدھے سوار سلطان کے ساتھ پہنچ سکے تھے ۔ رہا کی پہاڑی چوٹیوں پر پہرہ دینے والوں نے کوسوں دور سے سلطانی علم دیکھتے ہی شہر والوں کو مطلع کر دیا تھا اور ایک شخص جوسلین کو اطلاع دینے کے لیے بھی روانہ ہوگیا تھا ۔ سلطان جب رہا کے سامنے پہنچا تو شہر کا لشکر اور ارمنی رعایا مقابلے کے لیے تیار تھی ۔ سلطان کے پہلے حملے کو انھوں نے جانبازی سے روکا ۔ شام کے قریب سلطان نے دوبارہ زوردار حملہ کیا، فرنگیوں کے قدم اکھڑ گئے لیکن انھوں نے احتیاط سے لڑتے لڑتے شہر میں داخل ہوکر پھاٹک بند کرنا چاہا ۔ سلطان نے پھاٹک پر اس زور سے نیزہ مارا کہ پھل دروازے میں پھنس گیا اور ہاتھ میں صرف لکڑی رہ گئی، اس دوران فرنگیوں نے یورش کرکے سلطان کو گھیر لیا ، ایک زبردست آہن پوش نائٹ نے جو جوسلین کی عدم موجودگی میں وہاں سردار تھا ، سلطان کے سر پر گرز مارنا چاہا، اس اثنا میں سلطان کی تلوار بغل کے نیچے سے زرہ کاٹ گئی اور اسی لمحے اس نو عمر لڑکے کا نیزہ زرہ کٹی جگہ سے نائٹ کے جسم میں داخل ہوکر دوسری طرف سے زرہ توڑ کر نکل گیا ۔ مسیحیوں نے شہر میں داخل ہوکر پھاٹک بند کر لیا ۔ سلطان نے لڑکے کی جرأت اور بہادری کی خوب داد دی ۔

شام ڈھلے سلطان رہا سے پانچ میل کے فاصلے پر اپنے خیمے میں چلا گیا ، البتہ سلطانی لشکر رات بھر آہستہ آہستہ پہنچتا رہا ۔ جوسلین نے اطلاع پا کر رہا میں واپس آنے کی بجائے وہیں سے دیگر فرنگی فرمانرواؤں کے دربار میں خوشامدانہ التماس کے ساتھ کمک کے لیے ایلچی بھیجے ۔ حاکم انطاکیہ کی اس سے دیرینہ عداوت تھی اس لیے اس نے ایلچی کو صاف جواب دے دیا ۔ دوسری صبح سلطان نے نماز سے فارغ ہوکر شاہی گارڈ کے ساتھ شہر کے گرد و نواح کا جائزہ لیا اور شہر کے ہر طرف فوج کو صفیں باندھ کر کھڑا رہنے کا حکم دیا ۔ جونہائی دن گزرنے پر سلطان جائزے سے فارغ ہوا اور شہر کے جنوبی پھاٹک پر ٹھہر گیا، نا گہاں اس نے تلوار کو علم کی طرح چاروں طرف گھمایا اور فوج نے پھیل کر رہا کا محاصرہ کر لیا ۔ سلطان کو جب شہر والوں کی طرف سے جنگ کا جواب ملا تو اس نے دوبارہ تلوار ہلائی اور منجنیقیں چلنے لگیں، تیر برسنے شروع ہوگئے اور گریک فائر نے ہر طرف آگ برسانی شروع کر دی ۔ شہر والوں کو یقین ہو گیا کہ سلطان اس واقعہ کا انتقام لےگا جب صلیبی گھٹنوں تک مسلمانوں کے خون میں ڈوبے ہوئے بیت المقدس میں داخل ہوئے تھے اور صرف مسجد اقصیٰ میں ستر اسی ہزار مسلمان ذبح کیے گئے تھے ۔ اٹھائیس دن کے شدید محاصرے اور تابڑتوڑ حملوں کے بعد رہا فتح ہوگیا اور شہر میں فاتح فوج کے ہاتھوں زبردست قتل عام ہوا ۔ سلطان نے اگرچہ ترکمانوں اور کردوں سے وعدہ کیا تھا کہ فتح کے بعد انھیں لوٹ مار کی اجازت ہوگی لیکن بعض ایسے دردناک مناظر اس کی نظروں سے گزرے کہ اس نے امن و امان بحال کر دیا ۔ قیدیوں کو رہا اور لوٹا ہوا مال واپس کرنے کا حکم دے دیا ۔ اس فتح سے پورے علاقہ الجزیرہ پر سلطان کا قبضہ ہوگیا ۔ دجلہ اور فرات کے درمیان دریائے فرات کے قلعہ بیرہ کے سوا تمام شہروں پر اتابک زنگی کا علم لہرا رہا تھا ۔ رہا پر اپنا افسر مقرر کرکے سلطان بیرہ کی طرف بڑھ گیا ۔

رہا جمادی الآخر ۵۳۹ھ میں فتح ہوا تھا اور اس بات کو پانچ ماہ گزر چکے تھے ، سلطان نے بیرہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا ، ایک آدھ دن میں بیرہ فتح ہونے والا تھا کہ موصل سے قاضی تاج الدین کا خط ملا کہ سلطان محمد کے پوتے الپ ارسلان خفاجی نے جسے زنگی نے خستہ حالی میں پناہ دے کر ہمیشہ خود کو اس کا نائب ظاہر کیا تھا ، وزیر نصیر الدین کو قتل کر دیا - قاضی تاج الدین شہرزوری نے خفاجی کو محل پر قبضہ کرنے کے بہانے لا کر وہاں قید کر دیا ہے - سلطان محاصرہ اٹھا کر لوٹا لیکن موصل سے ایک منزل پہلے قاضی کا خط ملا کہ کوئی اندرونی فساد نہیں ہوا اور لوگ سلطان کے استقبال کی تیاریاں کر رہے ہیں - سلطان کو محاصرہ اٹھانے کا بہت افسوس ہوا - وہیں سے اپنے منہ بولے چچا معمر ترک زین الدین کو موصل کا حاکم مقرر کر کے لوٹ گیا - واپسی میں اس نے زین الدین کے ہوتے صلاح الدین کو اپنے ساتھ رکھا اور اسے اپنے بیٹے نور الدین کا رفیق بنا دیا -

سلطان زنگی وہاں سے مغرب کی طرف روانہ ہوا اور تمام آزاد یا سرکش سرداروں کے قلعوں کو فتح کرتا ۵۴۱ھ کی ابتدا میں قلعہ جعبر کے قریب پہنچا اور محاصرہ کر لیا - جعبر کے حاکم سالم بن مالک عقیلی کو ملک شاہ سلجوقی نے حاکم مقرر کیا تھا لیکن اس کے مرتے ہی سالم سر کش ہو گیا - سلطان نے اتمام حجت کے لیے حسان کو بھیجا لیکن سالم نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا - محاصرے کا زیادہ تر سامان سلطان موصل میں چھوڑ آیا تھا اس لیے محاصرے نے کئی ماہ طول کھینچا آخر سلطان نے حسان کو پندرہ دن کے اندر موصل سے بڑی منجنیقیں اور بارود پہنچانے کا حکم دیا لیکن اسی رات تین غلاموں نے سوتے میں سلطان کو ہلاک کر دیا اور قلعے کے پھاٹک کے نیچے جا کر شور مچایا کہ زنگی مارا گیا - انھیں فوراً پھاٹک کھول کر اندر لے لیا گیا - سالم نے فصیلوں پر باجے بجوائے ، سلطانی لشکر میں کہرام مچ گیا - نورالدین اور صلاح الدین غم سے نڈھال تھے ، آخر نورالدین نے مہر کی انگوٹھی سلطان کی انگلی سے اتار کر پہنی اور افسروں کے مشورے سے سلطان کی لاش لے کر لشکر سمیت رقہ پہنچا ، وہاں سلطان کو دفن کیا اور سرداران عساکر کے مشورے سے سپاہیوں کو ان کے گھروں کو جانے کی اجازت دے دی ، غلاموں کے لشکر کو موقوف کیا اور شاہی گارد کے دس ہزار سواروں کے ساتھ حلب کو روانہ ہوا - حلب پہنچتے ہی نورالدین کو معلوم ہوا کہ جوسلین نے رومی فوجوں کے ذریعے رہا پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے چنانچہ وہ حلب سے اور اس کا بھائی سیف الدین موصل سے فوراً رہا کی طرف بڑھے ، جوسلین ان کی آمد کی خبر سنتے ہی بھاگ نکلا ، برہمی میں نورالدین نے رہا کے عیسائیوں کو بالکل تباہ کر دیا - ہزاروں عورتیں اور صدہا بچے قید ہوئے جن میں صلاح الدین نے اپنے خاندان والیوں کو ڈھونڈا لیکن ناکام رہا اور افسردہ خاطر حلب چلا گیا - اب اسے خیال آنے لگا کہ شاید کوئی فرنگی سردار واپس جاتے ہوئے انھیں اپنے ساتھ لے گیا ہو -

اٹلی کے شہر وطربو میں ۱۱۴۶ء/۵۵۰ھ میں ایک دن جب بطرس حواری کا ایک سو سڑسٹھواں جانشین پوپ یوجنیس ثالث مسند پاپائیت پر بیٹھنے کے ایک سال بعد وارد ہوا تو بڑی دھوم دھام سے اس کا استقبال ہوا - کیتھڈرل اعظم میں کارڈینلوں کے ساتھ گفتگو میں لوئی ہفتم کی گرجے کو جلانے والی حرکت اور کلیرود کی خانقاہ کے ولی برنارڈ کی جرأت مندی کا ذکر ہوا - اس محفل میں ایک گروہ آ پہنچا جس میں چند عورتیں، دو نوعمر لڑکے، چند راہب اور سن رسیدہ اسقف تھے - انھوں نے شہ نشین کے قریب پہنچ کر دھاڑیں مار کر رونا شروع کیا - ان میں شام

و ارمینیہ کے شہر جبالہ کا اسقف بھی تھا جو ارض مقدس میں عیسائیوں کی بد حالی اور مسلمانوں کے مظالم کی داستان سنانے آیا تھا۔ پوپ نے تسلی دی اور پھر ان میں سے چند کو اپنے مراسلے اور نمائندوں کے ساتھ برنارڈ کے پاس فرانس کے شمالی میدانوں کی طرف رخصت کیا۔ برنارڈ کا عیسائی بادشاہوں اور پوپ پر بڑا گہرا اثر تھا۔ اس نے حالات سنے اور کہا وہ استخارہ کرے گا۔ ارض مقدس سے آنے والوں میں متی نامی ایک نوجوان بھی تھا جو پوپ اور برنارڈ کے بارے میں اچھا نظریہ نہیں رکھتا تھا اور گاہے گاہے اپنے ساتھیوں کے سامنے اس کا اظہار بھی کر دیتا تھا۔ دوسرے دن برنارڈ نے اعلان کیا کہ جہاد ضروری ہے اور وہ خود بھی جہاد کی تبلیغ پر نکلے گا۔

برنارڈ مختلف شہروں اور علاقوں کو صلیبی جہاد کے لیے مشتعل کرتا ہوا علاقہ برگنڈی کے چھوٹے سے شہر وزیلے میں پہنچا۔ یہاں کے جلسے میں شاہ فرانس لوئی ہفتم اور اس کی وارث تاج و تخت بیوی ملکہ ایلی نر بھی سریک ہوئے۔ لوئی اور ایلی نر نے اپنے آپ کو جہاد کے لیے پیش کیا اور ان کی تقلید میں ہزاروں عورتوں اور مردوں نے صلیبی مارکہ لگایا۔ ایلی نر نے ارض مقدس سے جانے والے وفد سے ملاقات کی، دعوت دی، ان کے حالات سنے اور نوجوان متی کو مشرق کے حالات معلوم کرنے کے لیے اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ برنارڈ وہاں سے جرمن بادشاہ کونراڈ کو جہاد پر آمادہ کرنے کے لیے روانہ ہوا اور گاؤں گاؤں تبلیغ کرتا ہوا راٹسبان میں کونراڈ سے ملا اور اسے آمادہ کیا۔ شاہ فرانس ملکہ ایلی نر اور متی وغیرہ کو ساتھ لے کر ڈنز میں پوپ یوجینیس سے ملا۔ پوپ نے فوراً روانگی کا مسورہ دیا، برنارڈ نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ ایلی نر نے دل بہلانے کے لیے گانے بجانے والی عورتوں کا ایک بڑا گروہ بھی ساتھ لے لیا تھا، اس لیے جہاں سنسان جنگل میں پڑاؤ ہوتا وہاں ان عورتوں کی وجہ سے جنگل میں منگل ہو جاتا۔

صلیبیوں کے اگلے گروہ میں دو لاکھ ساٹھ ہزار آدمی تھے۔ دوسرے میں ایک لاکھ پیادہ اور ساٹھ ہزار سوار تھے۔ شہنشاہ جرمن اور شاہ فرانس کے ذاتی باڈی گارڈز میں ستر ستر ہزار آہن پوش تھے، اس طرح کل چار لاکھ مجاہدین اور چھ لاکھ زائرین تھے۔ عورتوں کی کثیر تعداد مردانہ کپڑے پہنے اور زرہ لگائے ہمراہ تھی۔ جرمن فوج میں دس ہزار عورتیں ایک سنہری مہمیز اور سنہری ڈھال والی معمر عورت کی سرکردگی میں تھیں اور ایلی نر کے ساتھ چھ ہزار عورتیں تھیں۔ جرمن فوج میں عورتیں سب سے آگے اور فرانسیسی فوج میں سب سے پیچھے تھیں۔ ملکہ عورتوں سمیت اپنا پڑاؤ لشکر سے تین چار میل ہٹ کر ڈالتی جہاں رات کو سریلے نغمے گونجتے اور مسیحی افسر رات کو چھپ چھپ کر تماشا دیکھنے آتے۔ سپاہیوں نے بھی کیمپ کی بعض عورتوں کے ساتھ تعلقات بڑھا کر آنے کی صورت پیدا کر لی تھی۔ مسیحیوں میں مشہور ہو گیا کہ ایلی نر کا کیمپ بدکاریوں کا مرکز ہے اور وہاں کوئی عورت بےعصمتی سے بچی ہوئی نہیں۔ بادشاہ کو ایلی نر کے بارے میں شبہ تھا لیکن بے بس تھا۔ لوئی اگر کیمپ میں رات گزارنے آتا تو ایلی نر یہ سمجھتی کہ وہ اس کی خوب صورت کنیز سبلیہ کے لیے آتا ہے۔ لوئی متی کے سلسلے میں ایلی نر سے بدگمان تھا۔ قسطنطنیہ کی قلمرو میں پہنچ کر کونراڈ ایڈریا نوپل میں ٹھہرا اور لوئی نے اس سے دو منزل پیچھے کیمپ کیا جب کہ ایلی نر نے زنانہ کیمپ فرانسیسی لشکر سے ڈیڑھ منزل آگے بڑھا کر جرمن لشکر کے قریب لگایا تاکہ اسے لوئی سے دور رہ کر آزادی حاصل رہے۔ لوئی نائٹوں کی وضع میں رات کو کیمپ تک پہنچا اور وہاں سے ایک معمر عورت سے زنانہ لباس حاصل کر کے

ایلی نر کے خیمے کے قریب پہنچا جہاں اس نے خیمے کی پشت پر سلامہ کو متی سے محو راز و نیاز دیکھا ۔ تھوڑی دیر بعد اسے معلوم ہوا کہ جسے وہ سبلیہ سمجھ رہا تھا وہ خود ایلی نر تھی ۔ اس غلط فہمی کے دوران ایلی نر اور لوئی دونوں کے راز ایک دوسرے پر آشکار ہوگئے اور تلخ کلامی ہوئی، آخر دونوں نے باہمی طور پر یہ سمجھوتہ کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کریں گے اور بظاہر ایک دوسرے سے محبت جتاتے رہیں گے ۔

لوئی نے وہ رات سلمہ کے ساتھ زنانہ کیمپ میں گزاری، صبح سویرے ایلی نر کے بھائی نواب مورین نے آ کر بتایا کہ کونراڈ نے اپنے ایک بیمار عزیز کو خانقاہ میں ٹھہرایا تھا جسے قسطنطنیہ کے بادشاہ مینول کے آدمیوں نے قتل کر دیا اس پر فریڈرک نواب موابیہ کو طیش آ گیا لیکن مینول نے اس کے خلاف فوراً لشکر کشی کر دی اور خونریزی جاری ہے ۔ تھوڑی دیر بعد لوئی کو دوبارہ یہ اطلاع ملی کہ جرمنوں نے یونانیوں کو پامال کر دیا ہے ۔ پھر لوئی نواب مورین کے ساتھ اپنے کیمپ کو لوٹ گیا ۔

قسطنطنیہ کی قلمرو سے گزرتے ہوئے صلیبیوں کو بے انتہا دشواریاں پیش آئیں ۔ شہنشاہ یونان عیسائی ہونے کے باوجود مغربی مسیحیوں اور پوپ کے پیروؤں کا سخت دشمن تھا ۔ اس کا چونکہ مسلسل واسطہ ترکوں سے تھا اس لیے اس نے ان صلیبیوں کے بارے میں انھیں اطلاعات فراہم کیں ۔ یونانی رعایا بھی صلیبیوں کے ساتھ دشمنی کرتی، انھیں جعلی سکے دیتی اور آٹے میں زہر ملا دیتی تھی ۔ کسی نہ کسی طرح صلیبی شاہ یونان کو راضی کر کے باسفرس کے پار اترے جہاں سے آگے انھیں ترکوں سے واسطہ پڑنا تھا ۔ کونراڈ جوش جہاد میں لوئی سے کئی منزل آگے نکل گیا اور لوئی جب نقیہ کے علاقے میں پہنچا تو اسے چند یونانیوں سے خبر ملی کہ کونراڈ نے ترکوں کو شکست دے کر ان کے دارالخلافہ قونیہ پر قبضہ کر لیا ہے ۔ لوئی نے اس رات اسقیانوس جھیل کے کنارے ایلی نر کے کیمپ میں جشن منانے کا پروگرام بنایا ۔ دوران جشن تین خستہ حال جرمن سپاہیوں نے آ کر جرمن سپاہ کی تباہی کی خبر سناتے ہوئے بتایا کہ مینول نے مسلمانوں کو اطلاعات فراہم کر کے مستعد رکھا تھا ۔ اس کے فراہم کردہ یونانی رہنما لشکر کو غلط راستے پر لے گئے اور ایسے جنگل بیابان میں پہنچا دیا جہاں نہ کھانے کو کچھ تھا اور نہ رسد۔ قحط پڑا اور جب لشکر خستہ حالی میں کماد و قیاد کی گھاٹیوں سے گزر رہا تھا تو ترک فوج نے چاروں طرف سے گھیر کر حملہ کر دیا ۔ تین دن یہ کیفیت رہی کہ راہ فرار نہ ملتی تھی ۔ سب جرمن عورتیں لونڈیاں بنا لی گئیں اور سارا سامان ترک فوج کی نذر ہوا ۔ کونراڈ وہاں سے زندہ بچ نکلنے کے باوجود عدم پتہ ہوگیا ۔ لوئی نے افسوس کرتے ہوئے کہا کہ اسی لیے لانگرس کے اسقف نے پہلے یونانیوں کو شکست دینے کی تجویز پیش کی تھی لیکن پوپ کی اجازت کے بغیر قسطنطنیہ پر حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب لوئی کو ایلی نر کی ہمراہی عورتوں کی حفاظت کا بھی دغدغہ تھا لیکن ایلی نر کونراڈ کی تباہی پر دل میں خوش تھی کہ اس طرح بیت المقدس کی فتح کا سہرا فرانسیسیوں کے سر ہوگا ۔

کونراڈ اسی شام اپنے چند خستہ حال رفیقوں سمیت وہاں پہنچا۔ وہ خود زخمی تھا اور اس کی نو حصے فوج کٹ چکی تھی، باقی لاپتہ تھے ۔ لوئی اور ایلی نر نے دلجوئی کی ۔ کونراڈ واپس جا کر نیا جرمن لشکر لانا چاہتا تھا لیکن لوئی نے اسے ہمراہ چلنے اور مشترکہ کمان کی پیشکش کی۔ ایلی نر نے کونراڈ کو بھی شیشے میں اتارنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی ۔ اس رات بچے کھچے

جرمن سپاہیوں میں سے دس ہزار سے کچھ زیادہ سپاہی جن میں پانچ سو نائٹ بھی شامل تھے واپس آ پہنچے ۔ لوئی نے کونراڈ سے مل کر دوسری صبح پیش قدمی کا فیصلہ کیا لیکن کونراڈ رات کو تمام جرمن سپاہیوں سمیت فرانسیسی کیمپ سے چوری چھپے نکل گیا ۔ لوئی کونراڈ کی اس بدعہدی پر بہت برہم ہوا اور لشکر کے ساتھ جنوب مشرق کی طرف بڑھنے لگا ۔ کوہ ایلپس ان کے بائیں اور کوہ ایڈا دائیں طرف تھا ۔ وہ درمیانی راہ سے نکل کر علاقے فرنجیا میں داخل ہوئے ۔ شہر گاموس اور افسوس سے گزرے لیکن یہاں بھی مینول کی رعایا نے فرانسیسیوں کے غلط رویے کی بنا پر انھیں قدم قدم پر دھوکے دیے ۔ لوئی ترک فوج سے لڑ بھڑ کر دریائے میاندر کے پار اترا اور کوہستان قدموس کی گھاٹیوں اور دروں سے ہوتا ہوا شہر ساطالیا میں پہنچا ۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ اسلامی لشکر مقابلے کو تیار ہے ۔ نائٹ جیافرے بڑے حصہ فوج کے ساتھ آگے بڑھا ، نواب مورین اور عورتیں بھی اسی حصہ میں تھیں ۔ ترکوں نے ہٹ کر راستہ دے دیا ۔ ایک کوہستان سے گزر کر یہ لشکر مرغزار میں پہنچا تو ناگہاں چاروں طرف ٹیلوں اور سلسلہ کوہ کی بلندیوں پر ترک صفیں باندھے ہوئے نمودار ہوئے ۔ ادھر لوئی باقی ماندہ فوج کے ساتھ بڑھ رہا تھا کہ اسے جنگل میں فرنگی وضع کی ایک فوج نظر آئی ۔ لوئی کے ہمراہیوں نے اسے دیکھ کر سلامی لی اور خوشی کے نعرے بلند کیے ۔ دوسری طرف سے بھی جواب ملا ۔ اب لوئی کے ہمراہی اسلحہ چھکڑوں پر لادے اطمینان سے بڑھ رہے تھے اور جونہی ایک گھاٹی میں پہنچے تو وہی فرنگی وضع کی فوج اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرکے ان پر ٹوٹ پڑی ۔ سخت غارت گری ہوئی ، لوئی خوش قسمتی سے زندہ بچ گیا ۔ رات کو بچے کھچے فرانسیسی جمع ہو کر بمشکل لوئی کے ہمراہ اگلے حصہ فوج تک پہنچ سکے ۔

لوئی نے پیش قدمی جاری رکھی جب کہ سردی، برسات نے نصف سے زیادہ فوج کو بیمار کر دیا ، گھوڑے مر گئے یا کھا لیے گئے ۔ عورت مرد چیتھڑوں میں ایطالیہ پہنچے جو مینول کی قلمرو میں تھا اور وہاں یونانی آباد تھے لیکن انھوں نے پھاٹک بند کرکے لوئی کی فوج کو کھلے میدان میں ڈیرا ڈالنے پر مجبور کر دیا ۔ نہ رسد، نہ روپیہ، نہ چراگاہ اور اس پر یونانیوں کی گراں فروشی ۔ سرداروں نے سمندر کی راہ سفر کرنے کا فیصلہ کیا تو حاکم ایطالیہ نے جہاز فراہم کرنے کی پیشکش کی ، جن کی فراہمی میں پانچ ہفتے لگے ۔ اس دوران کئی فاقوں سے مر گئے اور پھر بےشمار زائرین کو جہازوں میں جگہ نہ مل سکی ۔ لوئی نے نہیری نواب آف فلانڈرس اور آرشمبو رئیس بوروں کو ان زائرین کا سردار مقرر کرکے وہاں چھوڑا اور حاکم ایطالیہ سے درخواست کی کہ انھیں سواحل قلیقیہ پہنچا دے ۔ لوئی کی روانگی کے دوسرے دن ترک لشکر نمودار ہوا اور ایطالیہ کے باہر پڑے ہوئے زائرین کا قلع قمع کیا ۔ سردار ایک جہاز میں فرار ہو کر لوئی کے پیچھے روانہ ہوگئے ۔ زائرین تین ہزار اور چار ہزار کی دو ٹکڑیوں میں قلیقیہ کی طرف روانہ ہوئے لیکن ان میں سے بیشتر ترکوں کی تلوار اور حالات کی نامساعدت کا شکار ہوگئے ۔ بیماروں کو ایطالیہ والوں نے شہر پناہ میں لے کر قتل کر دیا ۔ تین ہزار مسلمان ہوگئے ۔ دو چار ہفتے بعد وبا پھوٹی اور سب مسیحیوں کو وہاں سے بھاگنا پڑا ۔

لوئی ایلی نر کے ساتھ ساحل پر اتر کر انطاکیہ پہنچا تو صرف ایک چوتھائی لشکر باقی بچا تھا ۔ انطاکیہ میں ایلی نر کا ماموں ریمنڈ حکمران تھا ۔ یہاں عیش و نشاط کی ایسی محفلیں جمیں کہ معلوم ہونے لگا گویا ایلی نر کی ساتھی عورتیں صرف مشرقی عیش پرستوں کی صحبت کا لطف

اٹھانے آئی تھیں - ریمنڈ کو نورالدین سے سخت خدشہ تھا - اب اسے قدرے تقویت حاصل ہوئی - اس نے لوئی کی دعوت کرکے مشورہ دیا کہ بیت المقدس کے بجائے حلب کا رخ کرکے نورالدین کو شکست دے ، لیکن لوئی کو علم ہوگیا کہ ریمنڈ اس کے افسروں کو لالچ اور دباؤ سے اپنا ہم خیال بنا رہا ہے - ایلی نر یہاں متی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہی - ریمنڈ نے ایلی نر کو خوش کرکے اس کے ذریعے کام نکالنے کے لیے شہر سے باہر پرفضا باغوں میں اس کی دعوتوں کا اہتمام شروع کیا - ایلی نر نے ریمنڈ اور متی سے اپنی اس خواہش کا برملا اظہار کیا کہ وہ مشرق مسلمان امراء کی صحبتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہے -

انطاکیہ میں متی نے ایلی نر پر یہ راز کھول دیا کہ وہ عمادالدین زنگی کا منہ بولا بھتیجا اور نور الدین کا رفیق صلاح الدین ہے اور اسے اپنے سابقہ حالات بھی سنائے - بالڈون ثالث حاکم بیت المقدس کو ریمنڈ کے ارادوں کا علم ہوا تو اس نے فصیح اللسان ناموروں اور سرداروں کا گروہ لوئی کو بیت المقدس لانے کے لیے بھیجا - اس جماعت کی تبلیغ و ترغیب پر ریمنڈ اور ایلی نر نے سخت اختلاف کیا - لوئی کو یہ بھی معلوم ہوا کہ کونراڈ اس سے پہلے عکہ پہنچ چکا ہے - ایلی نر اور لوئی میں سخت تکرار ہوئی اور لوئی نے تخلیے میں ایلی نر کے رویے پر اس سے سخت احتجاج کیا لیکن بے سود کیونکہ ایلی نر لوئی سے طلاق حاصل کرکے متی کو اپنانے کے پہلو پر غور کر رہی تھی - متی سے اس نے اپنے حالات کا اظہار کرکے وعدہ لینا چاہا اور اسی پر خوش اور مطمئن ہوگئی کہ متی کو بھی اس سے محبت ہے - ایلی نر نے طلاق حاصل کرنے کے لیے ریمنڈ سے بھی گٹھ جوڑ شروع کیا - متی اس ادھیڑبن میں تھا کہ وہ ایک ایسی عورت کو کیسے بیوی بنائے جو روز نئے شخص کا پہلو گرماتی ہے - ریمنڈ اور ایلی نر میں مشورے جاری ہی تھے کہ ایلی نر کو لوئی کی طرف سے بیت المقدس کو روانگی کی تیاری کا پیغام ملا - ایلی نر نے غصے میں جواباً اسے خط میں "خود پرست حاکم فرانس" کے القاب سے خطاب کرتے ہوئے بیت المقدس جانے سے انکار کرتے ہوئے نکاح فسخ کرانے کا لکھا - لوئی خط ملتے ہی رات گئے خود ایلی نر کے خیمے میں پہنچا اور اس کے انکار پر اسے اس کی چار خواصوں سمیت پچاس نائٹوں کی حراست میں خاموشی سے لے کر روانہ ہوگیا اور لشکر کو فوری کوچ کا حکم دیا - جاتے جاتے اس نے ملکہ کی طرف سے زنانہ کیمپ میں بھی پیغام بھجوا دیا کہ سب ملکہ کی تقلید میں روانہ ہوں - چنانچہ سوائے متی اور چند خواصوں کے باقی سب روانہ ہوگئے - متی کو شبہ تھا کہ ایلی نر کو زبردستی لے جایا گیا ہے اس لیے وہ ریمنڈ کے مشورے سے اکیلا ہی مسیحی مقتداؤں کی وضع میں ان کے پیچھے روانہ ہوگیا اور جبل نصیریہ کے دامن میں سفر کرتا ہوا تیسرے دن لوئی کے لشکر کے قریب جا پہنچا ، لوئی طرطوس کے قریب فروکش ہونے والا تھا - متی احتیاطاً لشکر سے پیچھے رہا - وہاں اسے دو بدویوں کا تعاون حاصل ہوگیا - عبداللہ نامی بدوی اپنے قبیلے کے لوگوں کو جمع کرکے لانے کے لیے واپس گیا اور ابراہیم متی کے ساتھ آگے بڑھا - متی ابراہیم کو لشکرگاہ کے باہر ٹھہرا کر مسیحی سپاہیوں کے لباس میں لشکرگاہ میں داخل ہوا اور خفیہ خفیہ ایلی نر کا پتہ لگا کر اس سے ملا اور انہیں لشکرگاہ کے باہر پہنچنے کا کہہ کر لوٹ گیا -

صبح پھوٹ رہی تھی کہ ایلی نر اپنی چاروں خواصوں کے ساتھ لشکرگاہ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئی اور متی کے ہمراہ ابراہیم کی رہنمائی میں آفتاب طلوع ہوتے ہوتے کومہ جا پہنچی جہاں عبداللہ اپنے قبیلے کے لوگوں کو لیے منتظر تھا - متی نے ان سے ملکہ کا تعارف کرا کے اس

پر کیے جانے والے مظالم کی داستان سنا کر انھیں انطاکیہ پہنچانے میں مدد کے لیے درخواست کی۔ دوپہر کو یہ قافلہ گھاٹیوں کے اندر ہی اندر نصیرلن پہنچا۔ شیخ قبساہ نے استقبال کیا اور عربی مذاق کی مہمان داری ہوئی۔ دوسرے روز آدھی رات کے بعد سفر شروع ہوا اور آفتاب سمت الراس پر تھا کہ سب نے علی برقوص کے خیموں میں پہنچ کر قیام کیا۔ یہاں ایک چودہ پندرہ سالہ ترک دوشیزہ نغمہ (زمرد) کے ذریعے صلاح الدین کی ملاقات اپنی دادی سے ہوئی اور اسے معلوم ہوا کہ اس کے خاندان کی جملہ عورتیں، اس کی ماں ترکان خاتون، پھوپھی کبک خاتون وغیرہ اسی قبیلے میں لونڈیوں کی حیثیت سے موجود ہیں اور زمرد اس کی پھوپھی کی بیٹی ہے۔

صلاح الدین نے ملکہ ایلی نر کی وساطت سے شیخ قبساہ سے تمام لونڈیوں کے منہ مانگی قیمت پر خریدنے کا فیصلہ کیا اور شیخ نے ایلی نر سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق سارے قبیلے کی لونڈیاں حاضر کر دیں جن میں بیس عرب اور باقی ترک تھیں۔ سات آٹھ ام الولد تھیں مگر صرف دو کی گود میں بچے تھے۔ عربی لونڈیوں نے بھی ملکہ کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ علی برقوص کے خیموں میں ایک دن مزید قیام کے بعد سب انطاکیہ روانہ ہوئے۔ بدرقہ کے طور پر دس پندرہ عرب بھی ہمراہ تھے، دوپہر سے پہلے انطاکیہ پہنچے۔ ریمنڈ نے استقبال کیا۔ ایلی نر نے ایک لاکھ روپیہ منگوا کر علی برقوص کے لیے عربوں کو دیا اور ساتھ آنے والوں کو انعام و اکرام سے نواز کر رخصت کیا۔ ایلی نر صلاح الدین کے خاندان کی عورتوں سے ملی اور زمرد کو رشک کی نگاہوں سے دیکھ کر اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہا لیکن صلاح الدین نے حیلے بہانے سے ٹال دیا۔ یہاں صلاح الدین کو معلوم ہوا کہ لوئی اور کونراڈ دمشق پر حملے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اسے فتح کر کے فلانڈرس کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ نیز یہ بھی علم ہوا کہ سیف الدین اور نور الدین مقابلے کے لیے حمص پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ اس نے بڑی مشکل سے ایلی نر سے چار ماہ کی رخصت لی اور موصل کی تیاری کرنے لگا۔

ایلی نر نے صلاح الدین کو رخصت کرنے سے پہلے اس کے سب اہل خاندان کی دعوت کی اور زمرد کو اپنے پاس بٹھایا لیکن صلاح الدین دونوں کے درمیان میں بیٹھ گیا اور ملکہ جو چیز بھی زمرد کو پیش کرتی پہلے خود کھاتا۔ جب ملکہ نے اپنے ہاتھ سے سب کو سموسے تقسیم کیے تو صلاح الدین نے زمرد کے کان میں کہہ کر اسے کھانے سے منع کر دیا، اس طرح ایلی نر کی زمرد کو زہر دینے کی کوشش ناکام ہوگئی۔ دوسری صبح صلاح الدین اپنے خاندان کی خواتین کے ساتھ انطاکیہ سے روانہ ہوا اور دس بارہ دن میں موصل پہنچا۔ زین الدین سے سب کو ملایا۔ پھر زین الدین نے موصل کے خزانے سے ایک لاکھ روپے قرض لے کر زر فدیہ کے لیے صلاح الدین کو دیے جنھیں انطاکیہ پہنچانے کے بہانے صلاح الدین دوسرے دن جہاد میں شمولیت کے لیے روانہ ہوگیا۔ آٹھویں دن حمص میں سلطان کے پاس پہنچ کر اسے سارا احوال سنایا اور وہاں سے رقم کے ساتھ ایلی نر کو یہ خط بھیج دیا کہ چونکہ ایلی نر نے بدعہدی کرتے ہوئے زمرد کو زہر دینے کی کوشش کی تھی اس لیے وہ اس کے پاس لوٹ کر نہیں آ سکتا اور رقم واپس ارسال کر رہا ہے۔ اس کے بعد ایلی نر نے صلاح الدین کی طرف سے مایوس ہو کر شہنشاہ انگلستان سے شادی کر لی اور رچرڈ شیر دل کی ماں بنی۔ صلیبیوں کے عزائم خاک میں ملانے کے بعد صلاح الدین موصل لوٹا، تمام خاندان اور دادا کے ساتھ حج کے لیے گیا، وہیں زمرد سے شادی کی اور پھر تمام عمر سلطان کی صحبت اور جہاد میں گزار دی۔

تحقیقی جائزہ

ناول کا آغاز کرتے ہوئے شرر لکھتے ہیں کہ ۱۵ جمادی‌الاول ۵۱۰ھ کو موصل کے شہر اور قلعے میں سلطان عماد الدین زنگی کا لشکر زبردست جنگی تیاریوں میں مصروف ہے - اس کے دوسرے دن سلطان رہا (ایڈیسہ) پر حملہ کرتا ہے - یہ سن صحیح نہیں ہے شاید سہو کتابت ہو، کیونکہ اسی ضمن کی بعد میں درج شدہ سنین اس سے مختلف اور صحیح ہیں۔ تاریخی اعتبار سے اسے ۵۳۹ھ ہونا چاہیے -

"شہر رہا کی فتح" کے عنوان سے شرر نے پہلے تو واقعات کا تاریخی پس منظر بیان کیا ہے اس دور میں شرر نے شام و فلسطین میں بین عیسائی اور رومی سلطنتوں کا ذکر کیا ہے - شرر نے لکھا ہے کہ اس وقت یروشلم میں بالڈون ثالث نابالغ کی ماں حکمران تھی - انطاکیہ کی نابالغ وارث لڑکی سے ریمنڈ نے شادی کرکے وہاں کی حکومت حاصل کر لی تھی - اور رہا میں جوسلین (ثانی) نامی عیاش و غیر منتظم نوجوان حکمران تھا، اس کا باپ جوسلین اول زبردست بہادر تھا اور اس کے ظلم سے بغداد میں صف ماتم بچھی رہتی تھی - یہ بیانات تاریخی اعتبار سے مستند ہیں -[1]

شرر نے اسی باب میں لکھا ہے کہ جوسلین ثانی عیاش تھا اور جب سلطان عماد الدین زنگی نے رہا پر حملے کا فیصلہ کیا تو جوسلین دریائے فرات کے کنارے ایک پرفضا مقام پر شاہد پرستی اور میکسی میں مصروف تھا - آرچر کے بیان سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے -[2]

اسی باب میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ زنگی کا باپ ملک شاہ سلجوقی کا مشیر و ہم صحبت تھا، سلطان ملک شاہ نے اسے حلب کا حاکم بنایا - وہ ملک شاہ کے بیٹے کو ایک معرکے میں بچاتے ہوئے مارا گیا - اس وقت زنگی کی عمر ۱۰ سال تھی - زنگی فرنگیوں سے ابتدائی لڑائیاں مودود کے جھنڈے تلے لڑا اور طبریہ کے معرکے میں وہ فرنگیوں کو مار کر بھگاتے بھگاتے طبریہ کے پھاٹک تک جا پہنچا تھا اور پورے زور سے پھاٹک میں نیزہ دے مارا - ان واقعات کی کتب تواریخ سے تصدیق ہوتی ہے -[3]

شرر نے لکھا ہے کہ بعد ازاں سلطان محمود نے زنگی کو بغداد میں نائب بنا کر بھیجا اور ۵۲۱ھ میں وہ والیٔ موصل مقرر ہوا - آرچر لکھتا ہے:

Afterwards he entered the service of Mahmud who made him his agent at Baghdad and Irak, and on the death of Alborsok he was appointed Governor of Mosul in 1127 A.D[4]

شرر نے اس وقت مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں، ان کی کس مپرسی، باہمی چپقلش اور ان مایوس کن حالات میں ان پر فرنگیوں کی چیرہ دستیوں کا جو ذکر کیا ہے اس کی تصدیق بھی کتب تواریخ سے ہوتی ہے -[5]

شرر نے لکھا ہے کہ والیٔ موصل مقرر ہونے کے بعد زنگی نے پہلے تو چھوٹی چھوٹی اسلامی

۱- ٹی - اے - آرچر : The Crusades، ص ۲۰۱، ۲۰۲ -
۲- آرچر : کروسیڈ، ص ۲۰۲ -
۳- آرچر : کروسیڈ، ص ۱۹۷، ۱۹۸ -
٤- آرچر : کروسیڈ، ص ۱۹۸ ؛ لین پول : ص ۲۹ تا ۳۳ -
۵- آرچر : کروسیڈ، ص ۱۹۸، ۱۹۹ ؛ لین پول : ص ۳۹ تا ۴۷ -

سلطنتوں کو زیر کرنے کی طرف توجہ دی ۔ جزیرہ عمر، نصیبین، سنجار وغیرہ کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کے بعد دوسرے سال حلب کی طرف توجہ دی جہاں کا مسلمان حاکم نصف آمدنی بطور خراج رومیوں کو دیتا تھا ۔ حلب پر قبضہ کے بعد زنگی نے ۵۲۳ھ میں شہر حماۃ پر قبضہ کیا اور ۵۲۴ھ میں پہلی بار عیسائیوں کا مدمقابل ہوا اور انہیں شکست دے کر شہر اثارب پر قابض ہوگیا ۔ ان بیانات کی کتب تواریخ سے تصدیق ہوتی ہے ۔[1]

شرر لکھتے ہیں کہ زنگی بارہ برس تک مشرق کی اسلامی سلطنتوں سے برسر پیکار رہا اور اس دوران میں ایک مرتبہ اس کا اپنا مرکز موصل بھی تین مہینے محاصرے میں رہا، لیکن آخر زنگی غالب آیا ۔ مسلمانوں سے مطمئن ہوکر اب اس نے رہا (ایڈیسہ) کی طرف توجہ دی ۔ تاریخ ان امور کی تصدیق کرتی ہے ۔[2]

رہا پر حملے کے سلسلے میں سلطان کی عجلت اور ایک دن میں اتنی طویل مسافت طے کرکے شام تک رہا کے قلعے کی دیواروں تلے جا پہنچنا، حملہ، مقابلہ، جوسلین کا رہا میں نہ آنا، دیگر فرنگی ریاستوں سے رہا والوں کا مدد طلب کرنا، انطاکیہ کی طرف سے مدد کا انکار، ۲۸ دن محاصرہ جاری رہنا اور جنگ کے بعد رہا کا فتح ہونا، ان جملہ امور کی کتب تواریخ تصدیق کرتی ہیں ۔[3]

شرر نے لکھا ہے کہ رہا کے مسیحیوں کی درخواست پر بیت المقدس کی مسیحی فوج کمک پر پہنچی لیکن وہ فوج ابھی رہا سے پانچ فرسخ پر تھی کہ اسے رہا پر مسلمانوں کے قبضے کی خبر ملی اور وہ وہیں سے منتشر ہوگئی ۔ رہا جمادی الآخر ۵۳۹ھ کی درمیانی تاریخوں میں فتح ہوا ۔ اس کے پانچ ماہ بعد سلطان نے قلعہ بیرہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا کہ اسے موصل میں بغاوت کی خبر ملی، وہ محاصرہ اٹھا کر لوٹ گیا ۔ پھر واپس آکر ۵۴۱ھ میں قلعہ جعبر کا محاصرہ کیا لیکن اسی محاصرے کے دوران اسے ایک رات قلعدار کی سازش سے غلاموں نے قتل کر دیا ۔ ان امور، سنین اور جملہ جزئیات کی کتب تواریخ سے تصدیق ہوتی ہے ۔[4] سلطان زنگی کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں کتب تواریخ ان کی بھی تصدیق کرتی ہیں کہ سلطان انتہائی شجاع، بہادر، دلیر اور نیک فطرت کا مالک تھا ۔ اس نے اپنے لشکر میں اخلاق، نظم و ضبط وغیرہ کا پورا خیال رکھا تھا ۔ وہ اپنے سپاہیوں کی ضروریات پر بھی پوری توجہ دیتا تھا ۔ ابن اثیر نے اپنے والد کی زبانی سلطان کے اوصاف مفصل بیان کیے ہیں ۔

سلطان کے قتل کے بعد نورالدین کا سلطان کی انگوٹھی پہننا، سیف الدین غازی کا حلب چلا جانا اور نورالدین کا بھی واپس لوٹنا، اس دوران جوسلین کا دوبارہ رہا پر قبضہ کر لینا اور نورالدین کا فوراً لوٹ کر حملہ آور ہونا، جوسلین کا شکست کھا کر بھاگ نکلنا وغیرہ جو واقعات شرر نے

۱- آرچر : کروسیڈ، ص ۱۹۸ تا ۲۰۰ ۔

۲- آرچر نے کروسیڈ میں موصل کے محصور رہنے کی سن ۱۱۳۳ء بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ زنگی ۱۱۴۳ء تک اسلامی سلطنتوں سے برسر پیکار رہا ۔ (ص ۲۰۱، ۲۰۲) ۔

۳- آرچر : کروسیڈ، ص ۲۰۲ : لین پول : ص ۴۷، ۴۸ ۔

۴- آرچر : کروسیڈ، ص ۲۰۳ ؛ لین پول : آرچر اور رنسیمان سلطان زنگی کے قتل کی تاریخ ۱۴ ستمبر ۱۱۴۶ء بتاتے ہیں ۔ لین پول : ص ۵۰ تا ۵۵ ۔

بیان کیے ہیں وہ تاریخی اعتبار سے مستند ہیں[1]۔

پانچویں باب میں شرر نے یہ واقعات بیان کیے ہیں کہ رہا کی اس شکست پر یروشلم کے پادریوں اور راہبوں کا ایک وفد روم میں گیا تاکہ پوپ کو آمادہ کیا جائے کہ وہ مسلمانوں سے رہا کو واپس لینے کے لیے یورپین صلیبیوں کا لشکر بھیجے۔ یہ پادری ۱۱۴۶ء/۵۴۰ھ میں ایطالیہ کے شہر وطراو میں پوپ یوجینس سے ملے۔ اس نے واقعات سن کر انھیں سینٹ برنارڈ کے پاس بھیجا۔ یہ واقعات اور سنین بھی تاریخ کی رو سے صحیح ہیں۔ نیز چھٹے باب میں سینٹ برنارڈ کی شخصیت، شعلہ بیانی، بادشاہوں پر اس کے اثر وغیرہ کے جتنے واقعات شرر نے بیان کیے ہیں وہ سب صحیح اور مستند ہیں۔[2]

ساتویں باب میں شرر نے ۱۱۴۶ء میں ویزیلے کے جلسے کا ذکر کیا ہے جس میں برنارڈ کی شعلہ بیانی نے ہر طرف صلیبی جہاد کا جوش پیدا کر دیا۔ فرانس کے بادشاہ لوئی ہفتم نے اس جلسے میں برنارڈ سے صلیب لی اور صلیبی مارکہ لگا کر جنگ کے لیے تیار ہوگیا۔ اس جلسے کی جملہ جزئیات، برنارڈ کی تقریریں اور لوگوں کا جوش وغیرہ تاریخ سے تصدیق ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ فرانس میں جوش پیدا کرکے برنارڈ جرمنی کی طرف بڑھا تاکہ وہاں کے بادشاہ کانراڈ کو بھی صلیبی جہاد پر آمادہ کر سکے اور کانراڈ برنارڈ کے سامنے بے بس ہوگیا۔[3]

نویں باب سے آخر تک رومانی حصہ کو چھوڑ کر صلیبی لشکر کی پیش قدمی، قدم قدم پر ان کی مشکلات، ترکوں سے مقابلہ، تباہی و خستہ حالی، جرمن لشکر کی بربادی، کانراڈ کا واپس لوٹنا، لوئی کی مشکلات، انطاکیہ تک بہ حالت زار پہنچنا، عورتوں کی بڑی تعداد ہمراہ ہونے کی وجہ سے خرابیاں وغیرہ جتنے واقعات شرر نے بیان کیے ہیں، کتب تواریخ ان سب کی تصدیق کرتی ہیں۔ مختلف کتابوں میں دیے گئے واقعات کا خلاصہ ہم سطور ذیل میں درج کرتے ہیں:

آرچر کے بیانات کے مطابق لوئی نے زبردست تیاریاں کیں اور روجر آف سسلی سے بات کرکے خشکی کے راستے سفر کا فیصلہ کیا۔ ۱۱۴۷ء میں پوپ نے انھیں رخصت کیا۔ کانراڈ لوئی کا انتظار کیے بغیر اپریل ۱۱۴۷ء میں روانہ ہوگیا۔ کانراڈ کی بے تحاشا فوج میں نظم و نسق کا فقدان تھا۔ وہ لوگوں سے زبردستی مال چھین لیتے تھے جس کی بدولت یونانی ان کے خلاف ہوگئے۔ جب وہ ایڈریا نوپل اور بازنطین کے دارالخلافے کے درمیان قیام پذیر تھا تو دریائے میلاس میں اچانک طوفان آ گیا۔ اس کے ہزاروں آدمی اور خیمے ڈوب گئے۔ مینول نے باسفورس پار کر جانے کی تاکید کی لیکن کانراڈ دارالخلافہ دیکھنے کے شوق میں قسطنطنیہ کے نواح میں مقیم ہوا جس سے مخالفت بڑھ گئی۔ آخر کانراڈ باسفورس کے پار اترا اور بازنطینی بادشاہ سے رہنما طلب کیے۔ ایشیائے کوچک میں اس کا سفر تباہ کن ثابت ہوا۔ یونانی اور فرانسیسی مورخ مینول پر غداری کا الزام لگاتے ہیں کہ اس نے انھیں آٹے میں چاک ملا کر دیا، جعلی سکے دیے، غلط راہ دکھائی اور

۱- لین پول: صلاح الدین ایوبی (ترجمہ نصیب اختر)، ص ۵۵، ۵۶، رنسیمان: A History of the Crusades ج ۲، ص ۲۳۹، ۲۴۰؛ آرچر: ۲۰۳، ۲۰۵۔

۲- آرچر: کروسیڈ، ص ۲۰۷، ۲۰۸؛ لین پول: ۵۶، ۵۷۔

۳- آرچر: کروسیڈ، ص ۲۱۰، ۲۱۱، رنسیمان: ص ۲۳۵ ببعد۔

ترکوں کو باخبر رکھا ۔ آخر کانراڈ کو بھوک اور موت کے خوف سے پسپائی اختیار کرنی پڑی ۔[1] زائرین کی وجہ سے مشکلات اور بھی بڑھ گئیں ۔ کانراڈ خود دو بار زخمی ہوا اور اپنے لشکر کا صرف دسواں حصہ زندہ بچا کر نقیہ پہنچ سکا ۔

لوئی جو کانراڈ کی تقلید کر رہا تھا ، قدم قدم پر دشواریوں میں مبتلا ہوا ۔ یونانیوں نے شہروں کے دروازے ان پر بند کر دیے ۔ سامان ان پر قلعے کی دیواروں سے ٹوکریوں کے ذریعے بیچا جاتا ۔ روجر آف سسلی اور مینول کے تعلقات میں کشیدگی بڑھ گئی ۔ بشپ لانگریاس نے مشورہ دیا کہ پہلے مینول کی سلطنت کا خاتمہ کیا جائے لیکن لوئی نے اختلاف کیا اور مینول سے دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ باسفورس سے پار اترنے کے بعد لوئی کی مشکلات میں اور اضافہ ہوگیا ۔ نیقیہ پہنچ کر اسے کانراڈ کی تباہی کا علم ہوا ۔ وہ خود جا کر کانراڈ سے ملا ، ہمدردی کا اظہار کیا ، دونوں نے ساتھ مل کر بڑھنے کا فیصلہ کیا ۔ ایفس کے قریب مینول کے مخبروں نے انھیں بتایا کہ ترک حملہ کرنے والے ہیں ۔ کانراڈ واپس ہوگیا اور لوئی نے کرسمس گزار کر لادیقہ کی طرف قدم بڑھایا لیکن دو دن بعد ہی اسے سخت تباہی سے دو چار ہونا پڑا ۔ ایک سرنفلک پہاڑ کے قریب پہنچا تو مقدمۃ الجیش نے جس میں جافرے اور لوئی کا ماموں شامل تھے جنوب کی طرف خیمے لگائے ۔ اوپر سے ترکوں نے زبردست تیروں کی بارش کی ، گھوڑے کھائیوں میں گر کر ہلاک ہوگئے ۔ سخت قتل عام ہوا ۔ لوئی دوسرے دن تک اس درے کو عبور نہ کر سکا ۔ خوف زدہ زائرین کے ساتھ بڑی مشکل سے جان بچا کر دوسرے روز جیافرے تک پہنچا ۔ لشکر میں افلاس پھیل گیا ، ۲ فروری کو وہ بہ خرابیٔ بسیار ایٹیلیہ پہنچا ۔ گورنر سے معاہدہ کرکے خود آگے روانہ ہوا اور زائرین کو طرسوس پہنچانے کی درخواست کی ، لیکن بعد میں یونانیوں نے دھوکا دیا ۔ آخر ترکوں نے ان فاقہ زدہ زائرین کی دستگیری کی ۔ کئی نے تبدیل مذہب کر لیا ۔ مارچ ۱۱۴۸ء میں لوئی انطاکیہ پہنچا جہاں اس کی بیوی کا ماموں ریمنڈ حاکم تھا ۔ ریمنڈ کا خیال تھا کہ لوئی حلب اور قیساریہ کی فتح میں اس کی مدد کرے گا اس لیے اس نے شاندار استقبال کیا لیکن لوئی نے بیت المقدس کا ارادہ کیا ۔[2]

رنسیمان نے بھی یہ جملہ واقعات بہت تفصیل سے بیان کیے ہیں ، اس کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ صوفیہ سے آگے جرمنوں نے لوگوں کو لوٹنا شروع کیا ۔ اختلاف بڑھ گیا ۔ منول نے رہائی کے لیے آدمی دیے ۔ ایک زخمی جرمن پیچھے رہ گیا تھا جسے قتل کر دیا گیا اس پر فساد ہوگیا ۔ بمشکل حالات پر قابو پایا گیا ۔ سیلاب سے کئی سپاہی اور مال اسباب ڈوبا ۔ لوئی ایک ماہ بعد روانہ ہوا تھا ۔ اس کے ہمراہ عورتوں کا ایک بہت بڑا لشکر بھی تھا جن میں ملکہ ایلی نر بھی شامل تھی ۔ کانراڈ نیقیہ کے قریب پہنچا تو ۲۵ اکتوبر کو ایک ندی کے کنارے ترکوں نے اس پر اچانک ہلہ بول دیا ۔ شام تک وہ نامراد بمشکل جان بچا کر نیقیہ کی طرف بھاگا ۔ نوے فی صد فوج تباہ ہوئی ۔ لوئی ۴ اکتوبر کو قسطنطنیہ پہنچا ۔ لانگریاس نے اسے یونانیوں کو تباہ کرنے کا مشورہ دیا اس نے نہ مانا ۔ نومبر کے اوائل میں وہ نیقیہ پہنچا ۔ فریڈرک آف صوابیہ

۱- آرچر: کروسیڈ، ص ۲۱۱، ۲۱۲ -

۲- آرچر: کروسیڈ، ص ۲۱۴ تا ۲۱۸ -

نے لوئی کے کیمپ میں آکر اسے کانراڈ کی تباہی کی خبر سنائی - لوئی جرمن کیمپ کی طرف دوڑا، کانراڈ سے ملا، ہمدردی کی، پھر ساتھ چلے - کانراڈ پیچھے رہ گیا اور لوئی آگے نکل گیا - ایٹیلیہ کا پہاڑی راستہ دشوارگزار اور خطرناک تھا - اس وادی میں ترکوں نے حملہ کیا، زبردست تباہی ہوئی - رات کی تاریکی نے لوئی کی جان بچا لی - بمشکل اٹیلیا پہنچے - سمندر کا سفر اختیار کیا لیکن صرف فوج کے لیے جہاز مہیا ہو سکے، باقی وہیں رہے جن میں سے اکثر کو ایٹیلیہ والوں نے اور بعض کو ترکوں نے قتل کر دیا [1] -

سلطان عماد الدین زنگی سے متعلق بیان کردہ واقعات، رہا کی فتح اور پھر برنارڈ کا صلیبی جوش پیدا کرنا وغیرہ اور اس صلیبی جنگ سے متعلق شرر کے بیان کردہ جملہ واقعات کی تصدیق گبن کی تاریخ سے بھی ہوتی ہے -[2] سید امیر علی، ابن الاثیر، ابن خلکان کے یہاں بھی یہی تفصیلات ملتی ہیں -[3]

ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ماسوائے ایلی نر کے واقعات کے جن کی بحث آیندہ سطور میں ہوگی ناول میں بیان کردہ دیگر جملہ واقعات تاریخی اعتبار سے درست اور صحیح ہیں اور ان کی تمام جزئیات کی بھی تاریخی کتب سے تصدیق ہوتی ہے -

شوقین ملکہ کے پلاٹ میں ایک اہم عنصر ملکہ ایلی نر، اس کی عیاشی اور صلاح الدین سے محبت ہے - یہ واقعات بھی تاریخی اعتبار سے درست ہیں اور صلاح الدین کی وجہ سے بعض یورپین تاریخی ناول نگاروں کو اور فرانسیسی افسانہ نگاروں کو جن میں خود سکاٹ بھی شامل ہے یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ معاشقہ سلطان صلاح الدین ایوبی سے تھا، اس لیے انھوں نے خوب خوب حاشیہ آرائی کی ہے -

رنسیمان لکھتا ہے کہ جب لوئی اور ایلی نر انطاکیہ پہنچے تو وہاں کے امرا نے ایلی نر اور اس کی ہمراہی عورتوں کی تفریح کے لیے خوب خوب محفل نشاط مرتب کیں - وہ موسم بہار وہاں عیش و نشاط میں گزرا - ایلی نر نے ریمنڈ کی ہمنوائی کی جس سے لوئی کو حسد پیدا ہوا اور تلخ کلامی تک نوبت پہنچی - رنسیمان لکھتا ہے کہ

"It was whispered that Raymond's affection was more than avuncular."

لوئی نے ان حالات میں فوری روانگی کا فیصلہ کیا لیکن ملکہ نے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا اور طلاق لینے کا فیصلہ کیا - لوئی ملکہ کو زبردستی ساتھ لے گیا -[4]

آرچر لکھتا ہے کہ لوئی نے ۱۱۵۱ء میں ایلی نر کو طلاق دے دی کیونکہ اس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے اپنے ماموں کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں - اسی ضمن میں آرچر لکھتا ہے :

"Other tales of a more fabulous character make Eleanor ride, like Penthesilea, at the head of a band of Amazon Ladies, and represent her as the heroine of amours with Saladin, then a mere boy of thirteen".[5]

۱- سٹیون رنسیمان : A History of the Crusades، ج ۲، ص ۲۷۴ تا ۲۷۳ -
۲- گبن: ملاحظہ ہو باب ۸، ۹۰۴، ج ۷، ص ۳۹۳ تا ۴۰۷ -
۳- سید امیر علی: A Short History of the Saracens، ص ۳۳۴ بیعد -
۴- رنسیمان: ج ۲، ص ۲۷۳ تا ۲۷۹ -
۵- آرچر: کروسیڈ، ص ۲۱۹، ۲۲۰ -

لین پول ایک فرانسیسی افسانہ نگار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ

''فرانسیسی افسانہ نگاروں نے کم عمری میں صلاح الدین سے حسن و عشق کے واقعات منسوب کر دے۔ وہ صلاح الدین اور ایلی نر کے شرمناک قسم کے تعلقات کا ذکر کرتا ہے۔ افسانہ نگار کے خیال کے مطابق ایلی نر اپنے خاوند کے ساتھ صلیبی جنگ کے سلسلے میں فلسطین میں موجود تھی.... وہ صلاح الدن سے شادی کر لینے اور مسلمان ہو جانے کو تیار تھی.... ممکن ہے جیسی کہ مسٹر آرچر نے مجھے توجہ دلائی ہے کہ روماں نگاروں نے ہمارے صلاح الدین کو اس کے ہم نام صلاح الدین ایغیشان کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہو جو فرینکس کے خلاف زنگی کے حملے کا ایک مشہور جرنیل تھا۔''[1]

محمد صادق حسین صدیقی تاریخ عالم اسلام میں لکھتے ہیں:

''ریمنڈ اور ملکہ ایلی نر کے گہرے تعلقات کا عوام میں چرچا ہونے لگا۔ ان کے تعلقات کو طشت از بام ان لوگوں نے کیا جو ایلی نر سے آشنائی رکھتے تھے۔ رشک رقابت نے انہیں اپنی حسین ملکہ کو بدنام کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اسی دوران میں یہ شگوفہ پھوٹا کہ ملکہ ایلی نر کی عنایتیں صرف نائٹوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی آشنائی مسلمانوں سے بھی ہے۔ چنانچہ ایک نوجوان ترک صلاح الدین نامی پر وہ اس قدر فریفتہ تھی کہ اس کے ساتھ بھاگ چلنے پر آمادہ ہوگئی، لیکن صلاح الدین نے صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ مسلمان ہے اور ایک فاحشہ عورت کو خواہ وہ ملکہ ہی کیوں نہ ہو اپنے ساتھ بھگا لے جا کر دنیا اور عقبیٰ کی رسوائی نہیں خرید سکتا۔ کہتے ہیں کہ جب ایلی نر ہر طرح سے سمجھا اور دھمکا کر تھک گئی اور صلاح الدین اس کے لیے آمادہ نہ ہوا تو ملکہ نے اسے نقصان پہنچانے کی بھی کوشش کی۔ ملکہ ایلی نر کی امر عیاشی اور آوارگی کا اثر یہ ہوا کہ فوج کے ساتھ جو اور عورتیں آئی تھیں وہ بھی بد چلنی کرنے لگیں.... ملکہ ایلی نر صلاح الدین کی طرف سے مایوس ہوکر اپنے چچا (ماموں) ریمنڈ کی محبوبہ بن گئی۔ جب لوئی کو ان کے تعلقات کا علم ہوا تو اس نے ایلی نر کو ڈانٹ پلائی مگر وہ ایسی بے باک اور دلیر عورت نکلی کہ بادشاہ لوئی کو چھوڑ کر ریمنڈ کے پاس چلی گئی اور اپنی شادی منسوخ کرا کے اپنے ماموں کے پاس بطور داشتہ کے رہنے کو تیار ہوگئی۔ بادشاہ لوئی اس ہتک سے سخت برافروختہ ہوا۔ ایک شب کو موقع پا کر وہ اپنی ملکہ یعنی منکوحہ کو اس کی خواب گاہ سے جبراً پکڑ کر لے گیا اور اسی وقت انطاکیہ سے کوچ کر کے یروشلم کی طرف چل پڑا۔''[2]

ایلی نر کی اس فحاشی اور صلاح الدین نامی ایک ترک سے تعلقات کی تصدیق جوزف فرانسو امشو کی ہسٹری آف کروسیڈس سے بھی ہوتی ہے۔ غالباً شرر نے شوقین ملکہ کے پلاٹ کے لیے یہ حصہ جوزف فرانسو ہی سے لیا ہے کیونکہ شرر نے اپنی تاریخ حروب صلیبیہ[3] میں جوزف فرانسو کے حوالوں سے یہ امور بیان کیے ہیں۔

۱۱- قیس و لبنیٰ

قیس و لبنیٰ شرر کے ان تاریخی ناولوں میں سے ہے جن کے بارے میں خود شرر کو بھی یہ دعویٰ ہے کہ ان میں انھوں نے تاریخی واقعات میں بہت کم تصرف کیا ہے۔ قیس و لبنیٰ کو شرر نے اسی دعوے کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس کے واقعات میں انھوں نے اتنا تصرف بھی نہیں کیا جس قدر مثنوی نگاروں نے کیا ہے۔ قیس و لبنیٰ ۱۹۰۷ء میں شروع ہو کر ۱۹۰۸ء میں مکمل ہوا۔ اس میں بیان کردہ واقعات کا خلاصہ یہ ہے:

ریگ زار عرب میں قیس عذری اور اس کا دوست ثعلبہ اونٹوں پر سفر کر رہے تھے۔

۱- لین پول: صلاح الدین ایوبی، (ترجمہ) ص ۳۱۱ تا ۳۱۳ و ۳۵۶۔
۲- صادق حسین صدیقی: تاریخ عالم اسلام، ج ۲، ص ۶۷۵۔
۳- شرر: تاریخ حروب صلیبیہ، ص ۹۱ تا ۱۰۴۔

دونوں شدید پیاسے تھے، اچانک گرد و غبار کا طوفان اٹھا اور جب تھا تو قریب ہی بالو کا ایک پہاڑ کھڑا تھا اور ثعلبہ کا نام و نشان بھی نہ تھا ۔ مجبوراً قیس تنہا آگے بڑھا اور ایک درے میں گھس گیا ۔ دو گھنٹے کے بعد بنی کعب کے خیموں کے قریب پہنچ کر العطش پکارا ۔ ایک خوبرو نازنین لبنیٰ نے پانی لاکے پلایا ، اور کیفیت دریافت کی ۔ پانی پی کر قیس غش کھا گیا ۔ لبنیٰ سہارا دے کر خیمے میں لائی، مرد باہر گئے ہوئے تھے، قبیلے کی عورتیں جمع ہوئیں اور قیس کو دیکھ کر انھوں نے اطمینان کیا کہ تشویش کی بات نہیں ۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش آ گیا ۔ شام ڈھلنے والی تھی کہ قبیلے کے مرد بنی عامر کے بازار سے خرید و فروخت کرکے لوٹے ۔ لبنیٰ کے باپ حباب نے قیس کو دیکھ کر کچھ ناگواری کے ساتھ روداد معلوم کی اور اس کے خاندان کا سن کر کہا کہ بنی کعب کے خیمے بنی عذرہ کے لیے ہیں ۔ پھر اس نے قیس سے حسب نسب معلوم کیا اور اس سے تمام ماجرا سن کر خوش خوشی سے اسے مہمان ٹھہرایا ۔ حباب بنی کعب کا سردار تھا ۔ اس نے اپنی بیوی خولہ سے مشورہ کرکے لبنیٰ کو تین بکریاں لانے کو کہا ۔ لبنیٰ بکریاں لائی ۔ حباب نے انھیں ذبح کرکے عورتوں کے سپرد کیا، جنھوں نے کھال اتار کر انھیں صاف کیا، آگ روشن کی، تکے بھونے، ساتھ کے دوسرے خیموں کے لوگ بھی شریک ہوئے، بے تکلف دعوت تھی جس میں گوشت کے علاوہ پنیر، روٹیاں، چھوہارے اور اونٹنی کا دودھ بھی تھا ۔

قیس لبنیٰ کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا لیکن اسے احساس تھا کہ بنی کعب عذریوں کی عشق بازی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ۔ اس خیال سے کہ وہاں اس کا مزید قیام اس کے دل کی حالت کو آشکار کر دے گا اس نے اچانک اجازت چاہی، لبنیٰ نے تنہا رات کو سفر نہ کرنے کا مشورہ دیا لیکن قیس نے حباب سے بنی عامر کے تالاب کا راستہ دریافت کیا، جو دو دن کی مسافت پر تھا اور چل نکلا ۔ قیس کو بنی کعب کے خیموں میں قیام کے دوران لبنیٰ اور اس کی سہیلیوں کی باہمی گفتگو سے علم ہوگیا تھا کہ لبنیٰ دو دن بعد سہیلیوں کے ساتھ بنی عامر کے تالاب پر پانی لینے جائے گی ۔ قیس حباب سے رخصت ہوکر راستے بھر لبنیٰ کے بارے میں سوچتا صبح سویرے دخول و حومل پہاڑیوں کے قریب بنی لخم کے خیموں تک جا پہنچا ۔ شیخ قبیلہ ابو عامر نے اسے مہمان ٹھہرایا ۔ پرتکلف دعوت کی ۔ قیس نے ان سے بنی عامر کے تالاب اور بنی کعب کے وہاں سے پانی لانے کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور رات کو پرتکلف دعوت کے بعد رخصت ہوگیا اور صبح بنی عامر کے تالاب پر جا پہنچا ۔ نماز و طعام سے فارغ ہوکر اس نے جبل السواد کی ایک پہاڑی کے پاس ایسی جگہ تلاش کر لی جہاں بیٹھ کر وہ تالاب تک ہر آنے جانے والے کو بآسانی دیکھ سکتا تھا ۔

قیس کو وہاں چند گھنٹے گزرے تھے کہ اسے تالاب کے قریب کچھ لڑکیاں کھیلتی نظر آئیں ۔ قیس ان کا نظارہ دیکھتا اور لبنیٰ اور اس کی سہیلیوں کا تصور کرتا رہا جنھیں آنے میں ابھی دو دن باقی تھے ۔ سورج غروب ہو رہا تھا کہ وہ تالاب پر گیا ۔ لڑکیاں نہا رہی تھیں، انھوں نے قیس سے چھیڑ چھاڑ کی ۔ ان میں ایک لڑکی لبنیٰ تھی، اس نے کہا اگر وہ عذری ہے تو شعر سنائے، قیس نے بے اختیار لبنیٰ کے حسن و عشق سے متعلق اشعار سنانے شروع کیے ۔ وہ لڑکی سنتی تھی اور زرد پڑتی جاتی تھی ۔ تالاب سے لوٹ کر لبنیٰ کی سہیلیاں دیر تک اسے چھیڑتی رہیں اور وہ یہی کہتی رہی کہ وہ اس نوجوان کو نہیں جانتی ۔ لبنیٰ نے وہ رات تفکرات میں کاٹی اور صبح پھر سب تالاب پر جمع ہوئیں ۔ قیس پھر تالاب کے کنارے آ گیا اور اشعار پڑھے ۔ لبنیٰ کی والدہ اور

دوسری عورتیں بھی آ گئیں ۔ لبنیٰ کی ماں نے اشعار سن کر لڑکیوں سے ماجرا پوچھا اور قیس کو لبنیٰ کے عشق کے اظہار سے باز رکھنا چاہا لیکن وہ بدستور اشعار پڑھتا رہا ۔ آخر لبنیٰ کی ماں اور دوسری کئی عورتوں نے قیس پر تلوار کے کئی وار کیے اور اسے نیم جان بے ہوش چھوڑ کر لبنیٰ کو ہمراہ لے کر فوراً واپس روانہ ہوگئیں ۔ قیس کے زخموں سے بہت سا خون بہہ چکا تھا ۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا ، اتنے میں ایک بدوی لڑکا آ گیا ، قیس کی حالت دیکھ کر اس نے چاہا کہ اسے دو تین فرسخ پر اپنے خیموں میں لے جائے لیکن وہ سفر کے قابل نہ تھا ، وہ لڑکا صبح کھانا اور اونٹ لانے کا وعدہ کرکے چلا گیا ۔ رات بھر قیس وہیں پڑا رہا ۔ صبح بنی کعب کی عورتیں تالاب پر پہنچیں تو قیس وہیں بے ہوش پڑا تھا ، لبنیٰ نے پہچانا ، بہت دکھی ہوئی ، خیمے میں لے گئی اور تیمارداری کی ۔ وہ بدوی لڑکا بھی آ گیا ، اس سے انہیں کیفیت معلوم ہوئی اور پتہ چلا کہ بنی کلب کی عورتوں نے قیس کو زخمی کیا تھا ۔ تیمارداری سے قیس کو ہوش آیا ۔ بنی کلب کی عورتیں تالاب پر دو دن رکا کرتی تھیں لیکن اس بار قیس کی وجہ سے آدھی تو لوٹ گئیں اور لبنیٰ چند عورتوں اور سہیلیوں کے ساتھ ہفتہ بھر وہیں ٹھہری رہی ۔ قیس کے زخم بھر آئے ۔ اس دوران قیس لبنیٰ کی تعریف میں شعر پڑھتا اور وہ سب سمجھتیں کہ وہ بنی کلب کی لبنیٰ کا عاشق ہے ۔ ایک دن لبنیٰ کو اس نے صاف بتا دیا کہ وہ لبنیٰ کعبیہ کا شیدا ہے ۔ لبنیٰ نے دوست داری، ہمدردی اور محبت کا یقین دلایا اور اعتراف کیا کہ وہ خود بھی اسے چاہتی ہے، لیکن بے بسی ظاہر کی اور قیس کو ضبط و تحمل کی تلقین کرتے ہوئے حضرت امام حسینؓ سے سفارش کرانے کا مشورہ دیا کیونکہ حباب ان کا معتقد تھا ۔ یہ سنتے ہی قیس چھٹے دن بغیر کچھ بتائے مدینہ کی طرف روانہ ہوگیا ، راستے میں میہ نامی ایک محمل نشین خاتون کا قافلہ مل گیا جس کے ساتھ وہ مدینہ منورہ پہنچا اور روضۂ انوار پر پہنچ کر فریاد شروع کی ۔ ایک صحابی نے اس کے انداز فریاد اور عاشقانہ اشعار کو گستاخی قرار دے کر لوگوں سے کہا کہ اسے دربار رسالتؐ سے باہر نکال دیں ۔ کھینچا تانی ہو رہی تھی کہ حضرت امام حسینؓ تشریف لے آئے ۔ انھوں نے اپنے رضاعی بھائی قیس بن ذریح کو پہچان لیا ، لوگوں سے چھڑایا اور گھر لے آئے ۔

حضرت امام حسینؓ نے قیس سے سب کیفیت سنی اور دوسرے دن اس کے ہمراہ بنی کعب کے خیموں کی طرف سفر کیا ۔ بنی کعب کے لوگ اور حباب دور سے دیکھتے ہی دوڑے آئے ۔ آپ نے حباب سے آمد کا مقصد بیان کیا ، اس نے فوراً قبول کیا اور کہا اگر قیس کے والدین پیام دیتے تو اچھا ہوتا ، پھر حباب عقد کر دینے پر مصر تھا لیکن حضرت امامؓ قیس کو لے کر بنی عذرہ کی طرف چل پڑے کہ قیس کے والدین کو لائیں ۔ چھ دن کے سفر کے بعد وہاں پہنچے اور دور سے ہی اونٹ پر سے اتر کر برہنہ پا ہوگئے ۔ بنی عذرہ سن کر برہنہ پا دوڑے ، حضرت امام حسینؓ اس وقت تک خیمے میں نہ بیٹھے جب تک ذریح نے یہ اقرار نہ کیا کہ وہ دوسرے دن ان کے ساتھ چل کر بنی کعب کو پیغام دے گا ۔

دوسرے دن امام حسینؓ قیس، اس کے والد اور چند معززین بنی عذرہ کے ساتھ پھر سفر پر روانہ ہوئے اور چھ دن بعد دوبارہ بنی کعب کے خیموں میں پہنچے ۔ نکاح کی گفتگو ہوئی ۔ لبنیٰ سے بھی استفسار ہوا اور اس کی تجویز پر ایک سو اونٹ اور پچاس ہزار دینار مہر مقرر ہوا ۔ امام حسینؓ نے فوراً قبول کیا اور مہر کی رقم مدینہ پہنچتے ہی خود ادا کرنے کا ذمہ لیا ۔ دوسری صبح نکاح ہوا اور لبنیٰ کو لیے یہ قافلہ مدینہ منورہ کو چلا ۔ لبنیٰ کو جہیز میں دو

لونڈیاں ریحانہ اور نغمہ بھی ملیں ۔

مدینے میں حضرت امام حسینؓ نے دعوت ولیمہ کے دوران مہر کی رقم ادا کی اور قیس اور اس کے والد کو سمجھا بجھا کے رخصت کیا کہ لبنیٰ کو اچھی طرح رکھیں، قیس والدین کی فرماں برداری کرے اور ذریح بیٹے اور بہو کا خیال رکھے ۔ اس واقعے کو ایک برس گزر گیا، لبنیٰ پورے بنی عذرہ میں سب سے زیادہ مقبول تھی ۔ ساس سسر اور پورا قبیلہ اسے سب سے زیادہ نیک اور اچھے اوصاف والی تصور کرتا ۔ لبنیٰ قیس کی بےکاری پر کڑھتی اور اسے مجبور کرتی کہ وہ ماں باپ کے کام کاج میں ہاتھ بٹایا کرے لیکن قیس بدستور صرف صورت لبنیٰ کا پروانہ بنا بیٹھا تھا ۔ رفتہ رفتہ لبنیٰ کو محسوس ہونے لگا کہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اب اس کی قدر و منزلت میں فرق آنے لگا ہے ۔ اسی بات پر وہ ایک دن رو پڑی اور پھر قیس کے استفسار پر اسے مشورہ دیا کہ وہ والدین کی خدمت کیا کرے تاکہ اس کی لاولدی کا انھیں افسوس نہ رہے ۔ چنانچہ اب قیس لبنیٰ کی خاطر دن بھر والدین کے کام میں ہاتھ بٹاتا ۔

جوں جوں دن گزرتے گئے لبنیٰ ملول ہوتی گئی ۔ ایک دن قیس کے والدین نے قیس کو کہا کہ لبنیٰ لاولد ہے اور کسی کام کی نہیں، قیس اسے چھوڑ دے ۔ قیس نے بہت صفائی پیش کی لیکن وہ نہ مانے اور اس کی ماں نے گریبان پھاڑ کر قسم کھائی کہ جب تک وہ لبنیٰ سے دستبردار نہ ہوگا وہ کسی خیمے ۱۱ چھت کے نیچے نہیں جائے گی ۔ عذری لوگوں نے اسے سمجھایا کہ اس کا اصرار بے جا ہے قیس اپنے فعل میں مختار ہے کہ لبنیٰ کو رکھے یا چھوڑے لیکن وہ نہ مانی اور دھوپ میں بیٹھ گئی ۔ قیس نے بہت منایا اور آخر ماں پر چادر تان کر کھڑا ہوگیا ۔ رات کو لبنیٰ سے ملا تو دونوں اپنی قسمت پر خوب روئے ۔ لبنیٰ نے تجویز کی کہ امام حسینؓ کے پاس چلے جائیں ۔ قیس نے کہا اب مجبوری ہے اگر چلے گئے تو ماں دھوپ میں بیٹھی بیٹھی جھلس کر مر جائے گی ۔ لبنیٰ نے تجویز پیش کی قیس اسے چھوڑ دے، وہ اپنے قبیلے میں چلی جائے گی اور جس طرح بنی گزار لے گی ۔ قیس نے یہ بھی نہ قبول کیا اور نہ ہی لبنیٰ کی اس بات سے اتفاق کیا کہ دونوں باری باری چادر کا سایہ کریں ۔ اب قیس صبح سے شام تک روزانہ ایک منٹ ہلے بغیر ماں پر سایہ کیے کھڑا رہتا اور رات کو خستہ و نڈھال لوٹتا اور دونوں میاں بیوی اپنی بدنصیبی پر روتے ۔

ایک مدت اسی طرح گزر گئی ۔ قیس لاغری کی انتہا کو پہنچ گیا، جھلس کر سیاہ ہوگیا، لبنیٰ بھی اس کا حال دیکھ دیکھ کر بیمار ہوگئی ۔ لوگوں نے دیکھا کہ اب قیس چند دنوں کا مہمان ہے تو اس کی ماں کو سمجھایا لیکن وہ نہ مانی اور نہ قیس باز آیا ۔ آخر ذریح نے ایک رات قیس کو بہلایا پھسلایا اور بہت مجبور کیا کہ لبنیٰ کو طلاق دے دے ۔ قیس نے غور کرنے کی مہلت چاہی لیکن ذریح نے اسی وقت فیصلے پر اصرار کیا اور کہا اگر قیس لبنیٰ کے بغیر واقعی زندہ نہ رہ سکا تو وہ لبنیٰ سے دوبارہ شادی کرا دے گا ۔ غرض اس نے جھانسا دے کر قیس سے لبنیٰ کو تین طلاق دلوا دی، فوراً ہر طرف خبر پھیلی، اس کی ماں بھی خوش ہوگئی لیکن اس کے تھوڑی دیر بعد جب قیس لبنیٰ سے ملنے گیا اور لونڈی نے خیمے میں داخل نہ ہونے دیا تو پھر اسے ہوش آیا ۔ وہ چار ماہ تک دیوانہ وار بنی عذرہ کے خیموں کے گرد چکر لگاتا رونا پیٹتا رہا، لیکن لبنیٰ سے ملاقات نہ ہوئی اور آخر ایک دن وہ اپنے قبیلے کی طرف روانہ ہوگئی ۔ قیس کو جب خبر ہوئی تو دوڑا اور کئی فرسخ بعد محمل کو جا پہنچا لیکن لونڈی نے پھر بھی کوئی بات

نہ کرنے دی، مجبوراً ناقہ کے ہر ہر قدم کے نشان کو چومتا ہوا واپس لوٹا ۔ باپ نے رات کو باندھ کر رکھا لیکن وہ صبح سویرے بھاگ نکلا ۔ صحرا میں بھٹکنے اور اپنے آپ سے لبنیٰ کی باتیں کرنے لگا ۔ ذریح بنی عذرہ کے چند شرفا کو ساتھ لے کر گیا ، رویا ، منت کی اور پھر ساتھیوں کی مدد سے قیس کو زبردستی گھر لایا ۔ ماں نے قبیلے کی پانچ حسین لڑکیوں کو اس کے پاس بٹھایا کہ شاید کوئی پسند آ جائے لیکن بجائے اس کے کہ وہ کسی کی طرف مائل ہوتا اس کی وحشت اور بڑھی اور تیز بخار ہوگیا ۔

ایک ہفتہ شدید بخار رہا اور قیس بالکل صاحب فراش ہوگیا ۔ جب کسی دوا نے اثر نہ کیا تو بنی طے کے ایک نامی حکیم کو بلا کر لائے ، اس نے حالات سن کر اور دیکھ کر قبیلے کے لوگوں کو الگ لے جا کر سمجھایا کہ قیس کے سامنے ناکامی یا لبنیٰ کی مذمت کی کوئی بات نہ کی جائے نیز یہ کہ سات دن میں تپ رفع ہو جانے کے بعد وہ اسے ساتھ لے جائے گا ۔ یہ سمجھا کر وہ قیس کے پاس گیا تو اس کی داستان غم سنی اور وعدہ کیا کہ وہ ایسی صورت نکال لے گا کہ لبنیٰ قیس کو مل جائے ۔ یہ مژدہ سنتے ہی قیس اٹھ بیٹھا ، بخار جاتا رہا ۔ حکیم نے آٹھویں دن آنے کا وعدہ کیا اور اس کے والدین کو ضروری ہدایات دے کر رخصت ہوگیا ۔

آٹھویں دن حکیم آیا تو قیس اچھا خاصا تر و تازہ تھا ۔ حکیم نے قیس سے وعدہ لیا کہ لبنیٰ سے ملانے کی خاطر اسے جو حکم دیا جائے گا وہ وجہ پوچھے بغیر عمل کرے گا ۔ پھر حکیم نے اسے سامان سفر درست کر کے مختلف قبائل میں گھومنے اور دو دو ہفتہ ہر جگہ قیام کا مشورہ دیا ۔ قیس آمادہ ہوگیا ، حکیم نے اس کے والدین کو بھی مصلحت سمجھائی اور پھر پہلے وہ اسے اپنے ہی قبیلے میں لے گیا ۔ بنی طے میں قیس کی مہمان نوازیاں ہوئیں، مشہور شاعر عرب کی حیثیت سے ہر جگہ قدر ہوتی ۔ بنی طے سے نکل کر بنی شیبان، بنی مرین، بنی یسکر، بنی غطفان، بنی ثقیف، بنی کلاب اور بنی حارث کا دورہ کرتے ہوئے ، بنی فزارہ میں پہنچا ۔ قیس کے والدین اور حکیم کا اس سے باقاعدہ رابطہ تھا اور وہ اب خوش تھے کہ قیس لبنیٰ کو تقریباً بھول چکا ہے ۔ بنی فزارہ میں قیام کے دوران ایک چشمے کے قریب قیس کی ایک چنچل حسینہ سے ملاقات ہوئی اور جب قیس نے اس کا نام پوچھا اور اس نے لبنیٰ بتایا تو قیس تڑ سے گر کر بے ہوش ہو گیا ۔ لڑکی اسے ہوش میں لائی اور اپنے خیمے میں پہنچایا ، لبنیٰ بنت الحارث فزاریہ کا بھائی عامر فزاری بھی آ گیا ۔ قیس کو زبردستی اپنے پاس ٹھہرایا اور دعوت کی ۔ اس کا باپ اور چچا افریقہ کی طرف جہاد پر گئے ہوئے تھے ۔ عامر محسوس کر رہا تھا کہ لبنیٰ قیس کی طرف مائل ہے ۔ حکیم صاحب بھی اتفاق سے وہاں آ گئے ، انھوں نے بھی حالات کا جائزہ لیا اور عامر کو لبنیٰ کا قیس سے نکاح کر دینے کا پیغام دیا ۔ عامر اپنے باپ کی اجازت کا متمنی تھا ۔ اس دوران لبنیٰ فزاریہ نے بے اختیار قیس سے اپنی محبت کا اظہار کیا اور قیس نے بھی اسے یقین دلایا کہ وہ شادی کے بعد اس کی دل جوئی کی کوشش کرے گا کیونکہ لبنیٰ قیس کے سارے حالات سے باخبر ہونے کے باوجود اسے چاہتی ہے ۔

تین چار دن کے بعد لبنیٰ کا باپ بھی جہاد سے واپس آ گیا اور اس نے حکیم کے اصرار اور عامر اور لبنیٰ کی مرضی دیکھ کر بعض فزاریوں کے اختلاف کے باوجود ہاں کر دی ۔ حکیم نے دس ہزار دینار مہر اپنے پاس سے ادا کیا اور شادی ہوگئی ۔ لبنیٰ فزاریہ نے لبنیٰ کعبیہ کے لیے اس قدر محبت کا اظہار کیا اور ایسی باتیں کیں کہ قیس بھی حیران تھا ۔ لبنیٰ ہر حال میں

قیس کا ساتھ دینے کا عزم کیے ہوئے تھی۔ قیس کے والدین کو خبر ہوئی تو اس کی ماں نے فوراً بہو کو لانے کے انتظامات شروع کیے اور ایک ہفتہ بعد بنی فزارہ کی طرف چل پڑے، لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے شادی کے دس بارہ دن بعد قیس نے لبنیٰ سے اجازت لی کہ جا کر اپنے والدین کو لے آئے، اور پھر سب اکٹھے چلیں۔ قیس لبنیٰ سے رخصت ہو کر ابھی راہ ہی میں تھا کہ ایک شتر سوار سے معلوم ہوا کہ لبنیٰ کعبیہ نے بہت دباؤ اور اصرار کے باوجود دوسری شادی سے انکار کر دیا، چنانچہ اب قبیلے والے قیس سے انتقام لینے کو اٹھ کھڑے ہوئے ہیں کہ وہ ابھی تک لبنیٰ سے نسبت رکھتا ہے۔ لبنیٰ کعبیہ کے والد حباب نے امیر معاویہ کے سامنے عرض فریاد کی تھی کہ جس پر انھوں نے مروان والی مدینہ کو حکم بھیجا ہے کہ قیس کا خون حلال ہے اور لبنیٰ کی خالد بن خلدہ غطفانی کعبی سے شادی کر دی جائے۔ قیس نے اس شتر سوار کو اپنا ماجرا سنایا اور پھر کپڑے پھاڑ کر مجنونانہ روپ میں چل پڑا کہ مدینہ پہنچ کر خود کو مروان کے سپرد کر دے۔ راستے میں ایک جگہ خاک اڑا رہا تھا کہ عبداللہ بن عباس رضؓ ملے، ماجرا پوچھا اور ساتھ لے چلے کہ پہلے حج کرے پھر مدینہ جائے۔ ایک منزل پر قیام ہوا تو قیس ایک پہاڑ کی طرف بدوی خیموں میں نکل گیا۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ معاویہ کے حکم کے باوجود لبنیٰ خالد سے شادی سے انکار کرتی رہی لیکن جب اس نے سنا کہ قیس نے لبنیٰ فزاریہ سے شادی کر لی ہے تو لبنیٰ نے بھی برہم ہو کر خالد سے نکاح کر لیا۔ یہ سن کر قیس روتا پیٹتا قافلے میں واپس آیا۔

اہل قافلہ نے مکہ معظمہ سے دو منزل پر احرام باندھے۔ قیس سب سے چھپ کر اشعار پڑھتا جا رہا تھا کہ ایک بڑھیا نے آ کر لبنیٰ کا سلام دیا۔ قیس نے جواب میں اشعار کے ذریعے ہزاروں سلام بھیجے۔ اسی رات جب قافلے میں سکون تھا لبنیٰ کعبیہ قیس سے آ کر ملی، اپنی داستان غم سنائی اور بتایا کہ وہ بھی اسی قافلے میں ایک محمل میں حج کے لیے سفر کر رہی ہے۔ دیر تک دونوں ایک دوسرے کا دکھ سنتے رہے۔ قیس کو ایک ساربان کے ذریعے مجنون عامری کی داستان کا پتہ چلا اور سنا کہ وہ قیس سے ملاقات کا مشتاق ہے تو بس قیس رات کو چپکے سے ابن عباس کو خبر کیے بغیر نجد کی طرف چل پڑا۔ کئی دن کے سفر کے بعد نجد میں پہنچا اور کئی دن کی تلاش کے بعد مجنون تک پہنچا۔ دونوں لپٹ لپٹ کر روئے، پھر قیس مجنون کا پیغام لے کر لیلیٰ کے پاس گیا، رات کو بستی کے باہر اس سے ملا، مجنون کی حالت زار بیان کی، لیلیٰ نے کہا خود اس پر بھی وہی کچھ بیت رہی ہے اس لیے مجنون کو چاہیے کہ صبر کرے، وحشت چھوڑے اور اسے بدنام نہ کرے، مقدرات اٹل ہوتے ہیں۔ قیس نے واپس جا کر یہ پیغام مجنون کو سنایا اور پھر فوراً مدینہ منورہ کی طرف چل پڑا کیونکہ حج کا وقت گزر چکا تھا اور اسے توقع تھی کہ حسنین علیہما السلام سے مدینہ ہی میں ملاقات ہوگی۔

دشت مجنون سے نکل کر آبلہ پائی کے صدمے سہتا تیسرے دن ایک قبیلے میں پہنچا۔ انھوں نے مہمان نوازی کی، شیخ قبیلہ نے حالات سن کر مزید عنایت کی اور زبردستی اپنا ایک خوبصورت اونٹ دیا، دس بارہ دن کا زاد سفر ہمراہ کرکے مدینے کی راہ بتائی۔ چھ سات روز میں مدینے کے قریب پہنچا تو ایک شخص سے ملاقات ہوئی جس نے اونٹ کو دیکھ کر قیمت پوچھی، قیس نے اس کی نذر کر دیا، اس نے وعدہ لیا کہ قیس دوسرے دن مدینہ میں کثیر بن صلت کے مکان پر جا کر پانسو درہم وصول کرے گا۔ قیس پیدل چلتا مسجد نبوی میں پہنچا، وہیں حسنین علیہما السلام

سے ملاقات ہوئی ۔ روداد غم سنائی، انھوں نے تسلی دی ۔ مروان نے اسے مسجد میں دیکھ لیا اور گرفتار کرنا چاہا لیکن حضرت امام حسنؓ نے اپنی امان میں لے لیا ۔ گھر لے گئے ، تسلی دی ۔ پھر دونوں بھائی خالد کے گھر گئے اور اس سے ایک مقصد پورا کرنے کا وعدہ لے کر قیس کو لینے لوٹے ۔ اس دوران قیس کو اونٹ لینے والے سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا ۔ وہاں گیا اس نے بٹھایا، پانسو درہم نذر کیے اور قیس کو وہیں انتظار میں چھوڑ کر مروان کے بلاوے پر چلا گیا ۔ اتنے میں خاتون خانہ آگئی اور جب اس نے نقاب الٹا تو قیس نے دیکھا وہ لبنیٰ کعبیہ تھی ۔ اس سے گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ اونٹ لینے والا بھی واپس آگیا جو لبنیٰ کا خاوند خالد تھا ۔ اب اسے معلوم ہوا کہ اس کا مہمان قیس ہے ۔ خالد نے لبنیٰ سے دو ٹوک بات پوچھی تو اس نے صاف کہہ دیا کہ اس کا دل ہمیشہ قیس کا رہے گا ۔ اسی اثناء میں حسنین علیہما السلام تشریف لے آئے ، دروازے پر ہی خالد سے مل کر مقصد بیان فرمایا تو اس نے فوراً لبنیٰ کو طلاق دے دی ۔ آپ نے اپنے پاس سے اسے ایک لاکھ درہم دیے اور اندر گئے تو انھیں قیس بھی مل گیا ۔ لبنیٰ کعبیہ کو اسی وقت حضرت امام حسنؓ نے اپنے گھر بھجوا دیا اور حباب کعبی کو خط لکھا کہ ضروری امر میں ملاقات کرنی ہے فوراً مدینہ آئے ۔

اسی دوران ایک دن مروان نے چپکے سے قیس کو پکڑوا کر خفیہ طریق پر دمشق بھیج دیا ۔ دمشق میں امیر معاویہؓ کے سامنے پیش ہوا ، سب ماجرا سنایا ، اپنے اشعار پڑھے جنھیں سن کر امیر معاویہؓ بھی رو پڑے ، ہمدردی کی اور نہ صرف اسے آزاد کر دیا بلکہ مروان کو حکم لکھ بھیجا کہ قیس کو ہر طرح کی آزادی ہے خواہ وہ بنی کعب کے خیموں میں کھڑا ہو کر لبنیٰ کے عشق کے شعر پڑھے ۔ نیز اگر کوئی اذیت دینے پر آمادہ ہو تو حکومت کی طرف سے قیس کی حفاظت کی جائے ۔ قیس دو چار دن خلافت کے مہمان کی حیثیت سے دمشق میں ٹھہرا اور پھر ایک مسلح گارد کے ساتھ مدینہ کو روانہ کیا گیا ۔

قیس کو غائب ہوئے دو ماہ گذرے تھے کہ حباب کعبی مدینے پہنچا ۔ تاخیر سے آنے کی معذرت کی، حسنین علیہما السلام نے یادآوری کا مقصد بیان فرمایا ۔ حباب نے کہا اگر لبنیٰ راضی ہے تو اسے کوئی اعتراض نہیں ۔ اسی لمحے عامر بن حارث المزاری اپنی بہن لبنیٰ فزاریہ کے ہمراہ آیا ، وہ بھی حسنین علیہما السلام سے ملے ۔ لبنیٰ فزاریہ کو بھی وہیں ٹھہرایا گیا ۔ دونوں لبنائیں ملیں ۔ لبنیٰ کعبیہ، لبنیٰ فزاریہ کے اعلیٰ اخلاق اور بےلوث محبت سے بہت متأثر ہوئی ۔ دریں اثنا قیس بھی دمشق کے مسلح گارد کے ہمراہ آ پہنچا ۔ اپنی روداد سنائی ۔ حباب اور عامر سے ملا ۔ لبنیٰ کا قیس سے پھر نکاح پڑھا دیا گیا ۔ لبنیٰ فزاریہ سے استفسار کیا گیا تو اس نے ساری عمر ہر حال میں قیس کے ساتھ رہنے کی آرزو ظاہر کی ۔ قیس چند دن وہاں رہ کر خوش و خرم اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ گھر کو روانہ ہو گیا ۔

واقعات کا تحقیقی جائزہ

قیس و لبنیٰ میں بیان کیے گئے تاریخی واقعات کے تحقیقی جائزے سے پہلے اس ناول کے واقعات کے سلسلے میں خود شرر کا بیان درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ شرر لکھتے ہیں :

”ختم ۱۹۰۸ء کے ساتھ ہم اپنا ایک نیا ناول قیس و لبنیٰ پبلک کے دربار میں پیش کرتے ہیں ۔ اس میں عربی مذاق اور عربی معاشرت کے مختلف نمونے دکھانے کے ساتھ ایک سچے عاشق عرب کے نفس الامری واقعات

درج کیے گئے ہیں ۔ اگرچہ ہمارے ناول تاریخی ہیں مگر پھر بھی ان میں ناول کا پلاٹ درست کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تصرف کرکے تاریخ کو بدلنا ہی پڑا ہے ۔ بخلاف ان کے اس میں یہ خاص بات ہے کہ قیس بن ذریح کے جو کچھ واقعات تھے سب ایک عمدہ ترتیب سے باہم منسلک کر دیے گئے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ گمکو کا سلسلہ بنایا ہوا ہے مگر اس کے ساتھ یہ کہنے کی بھی جرأت کی جا سکتی ہے کہ حسن حقیقت پر فقط نقاشی اور رنگ آمیزی کی گئی ہے اور بس ۔

ابتداً قیس کا تشنہ لب ہوکے بنی کعب میں جانا ، لبنیٰ کا پانی پلانا ، اور لبنیٰ کی صورت دیکھتے ہی قیس کا اس پر عاشق ہو جانا اس کے بعد اس کی سرگردانی اور پریشانی، پھر جناب امام حسینؓ کی سعی سے عقد ہونا اور خود جناب امام کا زر مہر ادا فرمانا ، پھر اولاد نہ ہونے سے اور نیز ان کے باہمی وفور عشق کو دیکھ کے قیس کی ماں کا برہم ہونا اور آخر قسم کھا جانا کہ جب تک قیس لبنیٰ کو طلاق نہ دے میں نہ سائے میں بیٹھوں گی اور نہ بستر پر سوؤں گی ۔ ایک مدت تک روز یہ معمول رہا کہ قیس اس پر اپنی چادر سے سایہ کیے رہتا اور آخر زندگی سے تنگ آکے لبنیٰ کو طلاق دینا ۔ پھر اپنے اس فعل پر ندامت و افسوس، جوش عشق کا بڑھنا ، بنی عذرہ کی لڑکیوں کا چھیڑنا ، آخر قیس کا بیمار پڑنا ، طبیب کا آنا ، اور یہ مشورہ دینا کہ قیس کو اس کی طبیعت پر چھوڑ کے قبائل عرب میں پھرنے اور دورہ کرنے کا موقع دیا جائے شاید اس طریقہ سے وہ لبنیٰ کو بھول کے کسی اور لڑکی پر فریفتہ ہو جائے۔ آخر اسی سفر کی بدولت بنی فزارہ کی لبنیٰ سے اس کا عقد ہو جانا، اس عقد کی خبر سن کے لبنیٰ کعبیہ کا بحکم امیر معاویہ خالد بن خلدۂ عطفانی سے عقد کر لینا ۔ یہ سن کے قیس کا مجنون ہو کے دشت پیمائی کرنا ۔ عبداللہ بن عباسؓ کا اس سے ملنا ، پھر اس کا مجنون عامری سے جا کے ملنا ، اس کا پیام لے کے لیلیٰ کے پاس جانا اور لیلیٰ کا شکایت کرنا کہ مجنون اپنے اشعار میں کہتا ہے کہ میں اسے ملنے کو گئی تھی ، بھلا اس سے پوچھو تو کہ میں کب آئی تھی ۔ پھر مجنون کو اس جواب سے مطلع کرکے مدینہ کی راہ لینا ۔ راستے میں لبنیٰ کے شوہر خالد کا ملنا، اس کا اونٹ خریدنا اور مدینہ میں کثیر بن صلت کے مکان پر بلانا اور وہاں روپیہ دیے جانے کے بعد لبنیٰ کا اسے پہچاننا اور کہنا کہ یہ تو قیس ہے ۔ پھر حضرات حسنینؓ کی کوشش سے خالد کا اسے طلاق دینا ۔ مروان کی مخالفت اور قیس کا دربار معاویہ میں جاکے کامیاب واپس آنا اور قیس و لبنیٰ کا دوبارہ عقد ہونا اور دوسری لبنیٰ کا بھی باوجود اختیار ملنے کے قیس ہی کے پاس رہنے کو پسند کرنا ، یہ سب واقعات سچے اور تاریخی ہیں اور ہم نے اتنا بھی تصرف نہیں کیا جتنا کہ مجنون عامری کے حالات بیان کرنے میں اکثر مثنویوں میں کیا گیا ہے ۔"[1]

شرر نے قیس و لبنیٰ سے متعلق اپنے مذکورہ بالا مضمون میں جو دعویٰ کیا ہے وہ بہت حد تک صحیح ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ قیس و لبنیٰ میں بیان کردہ واقعات کی توثیق مستند کتب تواریخ سے ہوتی ہے ۔ کتاب الاغانی میں مذکورہ واقعات اور قیس بن ذریح کے اشعار تفصیل سے درج کیے گئے ہیں ۔[2] قیس بن ذریح کے حسب نسب کی تفصیل دی گئی ہے[3] فرق صرف یہ ہے کہ شرر نے اسے عذری بیان کرکے اس کے عشق کی شدت کے لیے اس کی خاندانی روایات کو بطور جواز پیش کرنا چاہا ہے ۔ قیس بن ذریح کے حضرت امام حسینؓ کے رضاعی بھائی ہونے کی شہادت بھی ملتی ہے[4] اور ایک خاص مجبوری کے تحت قیس کا بنی کعب کے خیموں تک جا پہنچنا بھی بیان ہوا ہے[5]۔ بنی کعب کے خیموں میں لبنیٰ بنت الحباب الکعبیہ کا قیس کو پانی پلانا، اور اس طرح پہلی ملاقات میں ہی قیس کا لبنیٰ کا گرویدہ ہو جانا[6]، پھر حضرت امام حسینؓ کی کوشش سے لبنیٰ کا قیس سے نکاح ہونا اور حضرت امام کا مہر وغیرہ کی ادائی کی ذمے داری لینا بھی

١- دلگداز نمبر ١٢، ج ١١، دسمبر ١٩٠٨ء ۔ ٢- کتاب الاغانی، ج ٧، ٨، ص ١١٢ تا ١٣٣۔
٣- ایضاً: ص ١١٢ ۔ ٤- ایضاً: ص ١١٢ ۔ ٥، ٦- ایضاً: ص ١١٣ ۔

مذکور ہوا ہے[1]۔ کتاب الاغانی میں یہ واقعہ بھی تفصیل سے بیان ہوا ہے کہ شادی کے بعد پہلے پہل تو لبنیٰ کی بڑی قدر افزائی ہوئی، سب اس کی عادات و اخلاق کے معترف تھے لیکن جب کافی وقت گزرنے پر بھی اس کے یہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو قیس کی ماں نے لبنیٰ کعبیہ کی مخالفت شروع کر دی[2]، قیس کو ہر طرح سے مجبور کیا گیا کہ وہ لبنیٰ سے علیحدگی اختیار کر لے لیکن جب وہ نہ مانا تو اس کی ماں نے کسی چھت کے نیچے سونے بیٹھنے کی قسم کھا لی اور خیمے سے باہر نکل کر دھوپ میں بیٹھ گئی[3]۔ قیس نے اور دیگر لوگوں نے اسے بہت سمجھایا لیکن جب وہ باز نہ آئی تو قیس ماں پر چھاؤں کرنے کے لیے چادر تان کر کھڑا ہو گیا۔ کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ قیس سورج طلوع ہوتے ہی چادر تان کر کھڑا ہو جاتا اور سورج غروب ہونے تک بغیر ہلے جلے اسی طرح کھڑا رہتا حتیٰ کہ وہ خود دھوپ میں جھلس گیا اور اس کی اپنی جان کے لالے پڑ گئے[4]۔ آخر حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر قیس نے لبنیٰ کو طلاق دے دی[5] لیکن اس کے بعد وہ پچھتایا، یہاں تک کہ اس پر دیوانگی طاری ہو گئی، لبنیٰ بالآخر اپنے میکے روانہ ہو گئی، قیس دیوانہ وار اس کے پیچھے بھٹکتا پھرا اور بیمار پڑ گیا[6]۔ ایک طائی حکیم نے اس کا علاج معالجہ شروع کیا اور وہی طریق علاج اختیار کیا جس کا شرر نے ذکر کیا ہے[7]۔

طبیب کے مشورے کے مطابق مختلف قبائل میں گشت کے دوران قیس بنی فزارہ میں پہنچا جہاں اس کی ملاقات لبنیٰ فزاریہ سے ہوئی[8]۔ کتاب الاغانی میں یہ واقعہ بھی مذکور ہوا ہے کہ قیس جب لبنیٰ فزاریہ سے ملا اور اس نے نام پوچھا تو جواب میں لبنیٰ کا نام سنتے ہی غش کھا کر بے ہوش ہو گیا۔ لبنیٰ فزاریہ کو اس کی یہ ادا اس قدر بھائی کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ لبنیٰ کعبیہ کا دیوانہ ہے اس کی شیدائی ہو گئی اور بالآخر دونوں میں شادی ہو گئی[9]۔

ناول میں لبنیٰ فزاریہ سے شادی کے بعد کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں کتاب الاغانی میں ان کی بھی تفصیل ملتی ہے۔ مثلاً لبنیٰ کعبیہ کا مجبوراً خالد سے شادی کرنا، پھر قیس سے ملاقات، قیس کی دیوانگی، قیس کی خالد سے ملاقات، مروان کا امیر معاویہ کے حکم کے مطابق قیس کو گرفتار کر لینا، حضرت امام حسنؓ و حسینؓ کی کوشش سے خالد کا لبنیٰ کعبیہ کو طلاق دے دینا، اور حضرت امام کی کوشش سے لبنیٰ کعبیہ کا دوبارہ قیس سے نکاح ہو جانا، لبنیٰ فزاریہ کا بھی ہمیشہ کے لیے قیس اور لبنیٰ کعبیہ کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرنا اور اسے نباہنا وغیرہ[10]۔

غرض تاریخی واقعات کی صحت کے اعتبار سے قیس و لبنیٰ ایسا ناول ہے جس میں شرر نے تقریباً تمام واقعات ایسے بیان کیے ہیں جن کی تصدیق مستند کتب تواریخ سے ہوتی ہے اور بہت کم ایسے تاریخی واقعات ہیں جہاں شرر نے تاریخی واقعات میں تصرف کیا ہے۔

۱۲۔ ماہ ملک

یہ ناول سلطان غیاث الدین غوری اور سلطان شہاب الدین غوری کے عہد سے متعلق ہے۔ ناول کا نام سلطان غیاث الدین کی بیٹی کے نام پر رکھا ہے، یہ ناول شرر نے ۱۹۱۰ء میں لکھا۔ ناول میں بیان کردہ واقعات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱، ۲۔ کتاب الاغانی، ج ۷، ۸، ص ۱۱۳۔ ۳، ۴، ۵۔ ایضاً: ص ۱۱۴۔ ۶۔ ایضاً: ص ۱۱۵۔
۷۔ ایضاً: ص ۱۱۶ تا ۱۲۰۔ ۸، ۹۔ ایضاً: ص ۱۲۱۔ ۱۰۔ ایضاً: ص ۱۲۲ تا ۱۳۴۔

۵۶۳ھ کے موسم بہار میں سلطان غیاث الدین محمد سام غوری کی بیٹی ماہ ملک فیروز کوہ کی گھاٹیوں میں شاہی شکارگاہ میں اپنی دو سہیلیوں کے ہمراہ شکار کھیل رہی تھی۔ اس نے ایک ہرن کو تیر کا نشانہ بنایا۔ ہرن زخمی ہوکر جھاڑیوں میں کھو گیا، شہزادی مصروف تلاش تھی کہ اسے ایک نوجوان نظر آیا جس کی پنڈلی میں تیر ترازو تھا۔ اس نوجوان نے شہزادی کے سامنے آکر بڑی بےباکی سے گفتگو کرتے ہوئے خود کو شہزادی کا شکار قرار دیا۔ شہزادی نے اس کی لگاوٹ اور بےباکی کی گفتگو سے برہم ہوکر ترہی بجا کر حبشی غلاموں کو وہاں طلب کر لیا۔ نوجوان ان کے پہنچنے سے پہلے غائب ہوگیا اور ان دس حبشی غلاموں نے شکارگاہ کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ایک ہفتہ بعد سلطان کو خبر ہوئی تو اس نے بھی کئی جاسوس مقرر کیے لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ چند دن بعد رمضان المبارک کی ایک شب کو شہزادی مسجد سے محل کو خفیہ راستے سے لوٹ رہی تھی کہ پھر اس نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ اب کی بار شہزادی بہت خوفزدہ ہوئی اور بخار میں مبتلا ہوگئی۔ سلطان نے اس بیماری کو وہم تصور کیا اور علاج کے لیے حکیم سامنے طلب کیے۔

گزشتہ واقعے کے دوسرے روز جشن عید کے موقع پر محفل رقص و سرود برپا تھی کہ سلطان کے پاس خوارزم شاہ کا سفیر آیا۔ سلطان ابھی اس سفارت کا جواب ہی سوچ رہا تھا کہ معلوم ہوا اس کے چچا ملک فخرالدین حاکم بامیان، علاءالدین واخ حاکم بلخ اور تاج الدین یلدز حاکم ہرات نے فیروز کوہ پر حملے کے لیے مشترکہ طور پر پیش قدمی شروع کر دی ہے۔ ادھر خوارزم شاہ شہر سرخس تک آ پہنچا تھا اس لیے سلطان نے امراء کے مشورے سے اسے تو وقتی طور پر ٹالنے والا جواب بھیجا اور عجلت میں جو بیس ہزار فوج مہیا ہو سکی اسے لےکر دوسرے دن متحدہ حریفوں کے مقابلے کو روانہ ہوا۔ ماہ ملک، فتنہ اور گوہر بھی ساتھ تھیں۔ فیروز کوہ سے بارہ کوس پر سلطان نے مرغزار زاغ رز میں پڑاؤ کیا۔ اسی رات شہزادی سہیلیوں سمیت لشکرگاہ سے باہر سیر کو نکلی اور پھر اسی نوجوان سے سامنا ہو گیا۔ اب کے نوجوان نے برملا اظہار عشق کیا۔

دوسری صبح جب سلطان غیاث الدین اور تاج الدین یلدز کے لشکر آمنے سامنے ہوئے تو دو نوجوان سلطان سے اجازت لےکر لشکر کی صفوں سے نکلے اور آناً فاناً انھوں نے یلدز کے پاس پہنچ کر اس کا سر کاٹ کر نیزے پر رکھ لیا جسے دیکھتے ہی یلدز کا لشکر بغیر لڑے بھاگ نکلا۔ ان دونوں جوانوں نے سلطان کے استفسار پر بتایا کہ وہ خراسان سے سلطان کی خدمت میں رہنے کے لیے آئے ہیں لیکن انھوں نے درخواست کرنے سے پہلے امتحان دینا ضروری تصور کیا۔ خصوصی دربار کا اہتمام ہوا جس میں سلطان کی طرف سے شہزادی نے انھیں مرصع دستانے اور اپنی طرف سے تاج پہنائے۔ ان دو میں سے ایک نوجوان وہی شہزادی کا پراسرار عاشق تھا۔ شہزادی نے اسے رات لشکرگاہ سے باہر ملنے کو کہا۔ ان نوجوانوں نے سلطان کو اپنے نام سعدالدین اور شرف الدین بتائے۔ انھیں دربار میں بلند مرتبہ اور سعد الملک اور شرف الملک کے خطابات ملے۔ بادشاہ نے سارے مال غنیمت کا وارث انھیں قرار دیا اور انھوں نے اپنی طرف سے لشکریوں میں تقسیم کر دیا۔

اب سلطان نے اپنے چچا کو خط اور یلدز کا سر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ سعد الملک اور شرف الملک نے سفارت کے فرائض انجام دینے پر اصرار کیا تو انھیں دو ہزار جوانوں کے ساتھ

جانے کی اجازت مل گئی ۔ اسی رات شہزادی اپنی دونوں سہیلیوں کے ساتھ لشکرگاہ کے باہر سعد الملک سے ملی اور اس کے اصرار پر شہزادی نے اقرار کر لیا کہ اگر سلطان منظور کر لیں تو اسے اس سے شادی کر لینے میں عذر نہیں ہوگا، نیز رازداری کے وعدے پر اس نے انھیں اپنے خاص ملازمین میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا ۔

دوسرے دن جب سعد الملک اور شرف الملک ملک فخرالدین کے پاس سفارت لیے جا رہے تھے، انھیں معلوم ہوا کہ علاءالدین قاج سنجری حاکم بلخ کا لشکر قریب ہی ہے تو انھوں نے پہلے اس سے نبٹ لینے کا فیصلہ کیا اور ہمراہی سواروں کو دو دو سو کی ٹکڑیوں میں تقسیم کرکے یکے بعد دیگرے حملے کی ہدایات دیں ۔ آدھ آدھ گھنٹے بعد ایک نیا جتھا حملہ آور ہوتا رہا اس طرح آٹھویں ٹکڑی کے حملہ آور ہوتے ہی علاء الدین کا لشکر بھاگ نکلا ۔ سعد الملک نے اس کا علم چھین لیا اور فخرالدین کے پاس پہنچا ۔ اسے سلطان کا خط اور فیروز کوہ چلنے کی دعوت دی ۔ وہ حالات سن کر مرعوب ہوا ۔ چوتھے دن آنے کا وعدہ کیا، یہ فوراً لوٹ گئے ۔ غیاث الدین بھی سن کر حیران ہوا کہ انھوں نے اتنی آسانی سے قاج کے لشکر کو شکست دے دی ۔ سلطان کا لشکر کامراں لوٹا ۔ فیروز کوہ کو دلھن کی طرح آراستہ کیا گیا ۔ یوم موعود پر غیاث الدین اپنے بھائی شہاب الدین شاہ غزنین کے ہمراہ دس ہزار سوار لےکر استقبال کو نکلا ۔ ملک فخرالدین کا جلوس آیا تو دونوں بھائی پا پیادہ ہوگئے اور رکاب تھامے چچا کو پورے اہتمام کے ساتھ فیروز کوہ لائے ۔ زبردست استقبال ہوا ۔ چند دن ٹھہرا کر ملک فخرالدین کو اسی اہتمام سے رخصت کیا ۔ شہاب الدین ہندوستان کی مہم پر جانا چاہتا تھا کیونکہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیر میں تھے اور وہاں کا راجا ان کے درپے آزار تھا ۔ اسی اثنا میں خوارزم شاہ کا سفیر آ گیا ۔ خوارزم شاہ کے خط میں شہزادی ماہ ملک سے شادی کی درخواست تھی ۔ دونوں سلطان بھائی برہم ہوئے ۔ سفیر کو گرفتار کر لیا گیا اور آئندہ اقدام کے لیے کانفرنس شروع ہوئی ۔

شہزادی کی خواصوں میں رزم و بزم پراسرار ہیں ۔ رزم نے ظاہر کیا کہ وہ ایسے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے جو ساحری کی بنا پر خلائق میں بدنام ہے اور ایک موکل خود اس کے تابع بھی ہے ۔ اس نے موکل بلانے کا ڈراما کرکے سلطان کی اس خفیہ کانفرنس کی باتیں ماہ ملک کو سنائیں ۔ شہزادی اس سے خائف بھی تھی اور متأثر بھی ۔ رزم نے شہزادی کو سعد الملک، شرف الملک کے متعلق بھی بتایا کہ وہ دونوں غوری نسل سے ہیں، خاندان کا مورث اعلیٰ سام ابن قطب الدین ہندوستان سے واپس لوٹتے ہوئے ڈوب گیا ۔ اس کا بیٹا عزالدین ایک تختے پر بیٹھ گیا جس پر ایک شیر بھی تھا اور غزنین پہنچا ۔ اس کی نسل سے شاہان غور ہیں اور دوسرا بیٹا دریائے کابل سے دریائے سندھ میں پہنچا اور منصور میں کنارے لگا ۔ وہاں سے مکران اور مکران سے خراسان چلا گیا ۔ یہ دونوں نوجوان اس کی نسل سے ہیں لیکن خود بھی نہیں جانتے کہ کون ہیں ۔ اس نے شہزادی کو ان کے گھر کا پتہ بتا کر مشورہ دیا کہ فتنہ کا بھائی رشید الدین رزم، بزم کو ساتھ لے جا کر حقیقت حال معلوم کرے ۔

ان واقعات کو پانچ ماہ گزر گئے ۔ شہاب الدین ہند کے راجاؤں کی سرکوبی کو چلا گیا تھا اور سعد الملک، شرف الملک خوارزم شاہ سے معرکہ آرائی کو گئے ہوئے تھے ۔ اسی دوران شرف الملک کا ایک نامہ بر خط لےکر آیا کہ دو ماہ سے خوارزم شاہ محصور تھا ۔ اب وہ معافی مانگتا اور توبہ کرتا ہے خراج دینا قبول کر لیا ہے، اس کی صلح کی درخواست بھی ارسال کی گئی

تھی جو ذیقعدہ ۵۸۷ھ کی محررہ تھی - سلطان نے سجدہ شکر ادا کیا اور معافی کا خط لکھ بھیجا، نیز سعد الملک، شرف الملک کو تاکید کی کہ ایک سال کا خراج وصول کرکے لوٹ آئیں -

اس واقعے کے دوسرے روز خبر پہنچی کہ سلطان شہاب الدین کو شکست ہو گئی ہے اور اسے زخمی حالت میں پالکی میں لایا جا رہا ہے - خبر سنتے ہی شہر میں صف ماتم بچھ گئی - شہاب الدین کا قافلہ پانچ ہزار سواروں کے جھرمٹ میں پہنچا، غیاث الدین نے شہر سے تین میل باہر استقبال کیا - محل میں پہنچ کر سرگزشت سنی - شہاب الدین نے بتایا کہ وہ بٹھنڈہ کے قلعے کو فتح کرکے ضیاء الدین تولکی کے سپرد کرکے لوٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ معلوم ہوا راجا پتھورا والی اجمیر بڑے ساز و سامان کے ساتھ مقابلے کو آیا ہے - اس کا بھائی کھانڈے رائے دہلی کا راجا لشکر کا سپہ سالار تھا اور دو لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی ساتھ لایا تھا - ندی سرستی کے کنارے موضع ترائن کے قریب لشکر مدمقابل ہوئے - دوسرے دن زبردست جنگ جاری تھی کہ مسلمانوں کی میمنہ میسرہ کے لوگ بھاگ نکلے، کسی نے شہاب الدین کو بھی بھاگ نکلنے کا مشورہ دیا تو اسے سخت طیش آیا اور وہ تلوار لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑا - کھانڈے رائے مقابلے پر آیا تو سلطان نے اس زور کا نیزہ مارا کہ اس کے کئی دانت توڑ دیے لیکن کھانڈے رائے نے نیزہ پکڑ کر اس کا ہولا اس زور سے سلطان کے سینے پر مارا کہ وہ زخمی ہوکر گر پڑا، فوج نکل بھاگی - تقریباً بیس ہزار مسلمان سپاہی شہید ہوئے - سلطان بےہوش موت کے منہ میں پڑا تھا کہ سعد الملک نے لپک کر گھوڑے پر لادا اور لے نکلا - بیس کوس پر آ کر مفرور لشکریوں سے ملا -

شہاب الدین سے یہ روداد سن کے غیاث الدین حیران تھا کہ سعد الملک خوارزم شاہ کے محاصرے پر سے ہندوستان کیسے پہنچا - اس موقع پر ملکہ جوہر نے بتایا کہ رشید الدین تحقیق کرکے لوٹا ہے کہ قطب الدین حسن جو سلطان محمود کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک قلعہ میں مارے گئے تھے، ان کا بیٹا سام ہندوستان چلا گیا تھا - سعد الملک اور شرف الملک سام کے ایک بیٹے اشرف الدین حسن کی اولاد سے ہیں - ان واقعات کے بعد سعد الملک اور شرف الملک کے عہدوں میں ترقی ہوئی - شہاب الدین نے زخم ٹھیک ہو جانے پر چھ ماہ بعد غزنین کا سفر کیا اور ایک لاکھ ترک و تاجیک اور افغانی لشکر تیار کرکے فیروز کوہ لوٹا اور وہاں غوریوں کی فوج طلب کیے بغیر آگے بڑھنے کا ارادہ کیا - اس کی برہمی دیکھ کر فتنہ کے والد نے عاجزی سے ارادہ پوچھا تو شہاب الدین نے بتایا کہ جس دن سے اسے شکست ہوئی ہے اس نے نہ لباس بدلا ہے، نہ بستر پر سویا ہے اور نہ دنیاوی عیش و عشرت کی طرف توجہ دی ہے - اس معمر غوری نے بہت منت سماجت کی اور وعدہ کیا کہ غوری خلجی اب اپنی بزدلی کے داغ میدان جنگ میں دھوئیں گے - شہاب الدین نے ان کا قصور معاف کر دیا - غیاث الدین نے قاضی سعید الدین کو سعد الملک، شرف الملک کے خاندان کے بارے میں تحقیقات پر مقرر کیا اور انھیں خراسان روانہ کیا -

شہاب الدین جب فیروز کوہ سے روانہ ہوا تو اس کے ساتھ ساٹھ ہزار ترک و تاجک، ستر ہزار افغان، تیس ہزار خلجی اور پانچ ہزار غوری سوار تھے - سعد الملک اور شرف الملک شہزادی ماہ ملک کی دو خادماؤں رزم و بزم کے ساتھ روانہ ہوئے - ملتان کے حاکم رکن الدین قوام الملک نے امراء اور لشکر کے ساتھ استقبال کیا لیکن سلطان نے اپنے لشکر سمیت شہر سے باہر قیام کرنے کو ترجیح دی - دوسرے دن سلطان نے پانچ ہزار ترک، پانچ ہزار افغان اور

پانچ ہزار غوریوں اور اپنے خاص غلاموں اور جلوس والوں کے ساتھ شہر کا دورہ کیا، ایوان شاہی میں گیا - دربار میں ملتان کے سرداروں، زمینداروں کو اپنی فوج کے ساتھ علم شاہی کے نیچے جنگ کے لیے جمع ہونے کا حکم دیا - دوسرے دن روانگی کے وقت دس ہزار ملتانی سوار بھی لشکر میں شامل ہوگئے - ایک ہفتے بعد لاہور پہنچ کر دربار کیا، وہاں کے امرا اور سرداروں نے بھی اپنے لشکر کے ساتھ شمولیت کا عہد کیا - یہاں گھکروں کے سردار کی طرف سے حلقہ بگوش اسلام ہونے کی عرض داشت آئی - سلطان نے انھیں تمام مراعات دینے کا اقرار کیا اور فخر الملک، شرف الملک سوریانی کی تجویز پر پتھورا کو بھی اتمام حجت کے لیے دعوت اسلام دی - حملے کا پروگرام دو ماہ کے لیے ملتوی ہوگیا، سلطان نے لشکر کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے فاصلوں پر پھیلا دیا - ایک ماہ کے اندر گھکروں کا سردار حاضر ہوا، اسلام قبول کیا، بری رسوم سے تائب ہوا اور دس ہزار سواروں کے ساتھ جھنڈے کے نیچے حاضر ہونے کا وعدہ کر کے لوٹا، چند دن بعد راجا پتھورا کا جواب آیا جو انتہائی توہین آمیز تھا - سلطان نے آئندہ جمعہ کو بعد نماز کوچ کا فیصلہ کیا -

مقررہ دن لاہور سے روانگی کے وقت سلطان نے لشکر کے مختلف حصوں پر سوار متعین کیے لاہور سے تین چار منزل پر خبر ملی کہ دشمن کا بحر ذخار بڑھتا آ رہا ہے - ڈیڑھ سو راجا اطراف ہند سے سمٹ کر اکٹھے ہوئے تھے جن کے ساتھ تین لاکھ راجپوت اور تین ہزار ہاتھی تھے - سرستی ندی کے کنارے پہنچے تو دشمن کا لشکر نظر آیا - سلطان تلاوڑی کے مشہور میدان میں خیمہ زن ہوا - اسی دن راجا پتھورا کا خط ملا جس میں اپنی کثرت فوج کے اظہار کے ساتھ شہاب الدین کو واپس چلے جانے کا مشورہ درج تھا - سلطان نے کچھ سوچ کر جواب لکھا کہ وہ اپنے بھائی غیاث الدین کے حکم سے آیا ہے اور واپسی کے لیے اسی کی منظوری ضروری ہے - اگر پتھورا دو ماہ لڑائی سے باز رہنے کا وعدہ کر لے تو وہ غیاث الدین کو خط بھیج کر واپسی کی اجازت منگوائے - اس خط کے جواب میں پتھورا نے التوائے جنگ کی منظوری دے دی لیکن شہاب الدین نے اپنے افسروں کو جنگ کے لیے پوری طرح تیار رہنے کی خفیہ ہدایات دے دیں - دوسری صبح سلطان نے اچانک زوردار حملہ کر دیا - زبردست جنگ ہوئی، شام تک تقریباً سب راجا مارے گئے، کھانڈے راؤ بھی قتل ہوا، ہندو شکست کھا کر بھاگ نکلے - راجا پتھورا بھی بھاگ نکلا لیکن کسی گاؤں کے چودھری نے دوسرے دن گرفتار کر کے پیش کیا اور انعام پایا -

سلطان شہاب الدین میدان جنگ سے فارغ ہو کر اجمیر گیا - خواجہ معین الدین چشتی کے قدم چومے، انھوں نے مسکرا کر فرمایا سلطان خود نہیں آیا ان کا بلایا ہوا آیا ہے - پھر ان کے ارشاد پر سلطان نے راجا پتھورا کے بیٹے کو گدی پر بٹھا دیا اور خود دہلی پہنچا جہاں راجا دہلی نے اطاعت قبول کر لی، سلطان نے اس کی نگرانی کے لیے قطب الدین ایبک کو میرٹھ میں چھوڑا اور خود لاہور میں چند روز قیام کرنے کے بعد غور کی طرف لوٹا - واپسی میں سعد الملک اور شرف الملک سے ان کے خاندان کے بارے میں دریافت کیا، حالات سن کر کہا وہ اس کے بھتیجے ہیں - انھیں شہزادوں کے بھاری حلے اور کلغی دار دستاریں پہنائیں - سلطان شہاب الدین بڑے تزک و احتشام سے فیروز کوہ میں داخل ہوا، اس کے ساتھ چودہ راجاؤں کی دولت کے علاوہ دو ہزار ہاتھی، پندرہ ہزار غلام اور تیس ہزار لونڈیاں بھی مال غنیمت میں تھیں - سلطان غیاث الدین نے استقبال کیا - شہاب الدین نے بھائی سے سعد الملک اور شرف الملک کے کارناموں

کا ذکر کیا اور وثوق سے کہا کہ وہ غوری شہزادے اور ان کے بھتیجے ہیں۔ غیاث الدین نے فتح کی خوشی میں چالیس روزہ جشن کا اہتمام کیا۔ بیسویں دن قاضی صاحب آ پہنچے، انھوں نے بتایا کہ وہ خراسان سے حج کو چلے گئے تھے۔ خلیفہ بغداد الناصر الدین اللہ عباسی سے ملے، زیارتیں کیں، پھر بیت المقدس گئے، وہاں سے عکہ جا کر سلطان صلاح الدین ایوبی کے جہاد میں شریک ہوئے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ پندرہ دن خراسان میں رہ کر انھوں نے تحقیق کی اور یہ بیان درست پایا کہ سعد الملک، شرف الملک دونوں شہزادے ہیں اور سام کی اولاد سے ہیں۔ سلطان شہاب الدین سے مشورہ کرکے دوسرے دن عظیم الشان دربار کا اہتمام کیا، شہزادگی کے اعلیٰ لباس تیار کروائے، دربار میں قاضی صاحب نے ان دونوں کا ماجرا بیان کیا اور ان کی شہزادگی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس موقع پر فتنہ کا باپ سامنے آیا اور بتایا کہ وہ عزیزالدین ہے اور سعد الملک کا حقیقی چچا ہے۔ بیس برس ہوئے بھائی سے خفا ہو کر فیروز کوہ میں آ گیا تھا۔ اس طرح رشید الدین اور فتنہ بھی شاہی خاندان سے ثابت ہوئے۔ شہزادی ماہ ملک نے فتنہ کے لیے بھی محل میں اسی قسم کی تقریب کا اہتمام کیا اور اسے اختر ملک کا لقب دیا گیا۔

سلطان غیاث الدین نے ایک دن خود ہی شہاب الدین پر اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ جشن کے دوران ماہ ملک کی سعد الملک سے شادی کر دے۔ شہاب الدین نے تجویز کیا کہ شرف الملک کی اختر ملک یعنی فتنہ سے شادی کر دی جائے۔ سلطان نے ملکہ جوہر ملک سے مشورہ کرکے جشن کے آخری دنوں میں آگے پیچھے دونوں شادیوں کی تاریخیں مقرر کر دیں۔ اس فیصلے کی خبر سنتے ہی رزم، بزم دونوں شہزادی کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ ماہ ملک نے اپنی سہیلی گوہر کے لیے رشید الدین کا رشتہ تجویز کرکے اپنی ماں کو سلطان کی منظوری لینے پر آمادہ کیا لیکن سلطان نے قطعی انکار کر دیا۔ ماہ ملک نے حجلۂ عروسی میں داخل ہونے کے لیے سعد الملک کو تین شرطیں پوری کرنے کو کہا، ایک یہ کہ اس نے مہر میں ملک خوارزم اور خراسان دینا طے کیا تھا، مہر ادا کرے۔ دوسرے رزم، بزم کو تلاش کرکے لائے اور تیسرے گوہر کی رشید الدین سے شادی کروائے۔

دوسرے دن جب سلطان غیاث الدین اور شہاب الدین کی موجودگی میں قاضی نے شرف الملک اور اختر ملک کا نکاح پڑھوایا تو فوراً ہی دونوں سلطانوں کے لیے اندر سے بلاوا آ گیا۔ ان کے اندر جاتے ہی سعد الملک نے خود کو گوہر کا وکیل بتا کر اور دو گواہ پیش کرکے گوہر کا رشید الدین سے نکاح پڑھوا دیا۔ سلطان زنان خانے سے واپس آئے تو انھیں علم بھی نہ ہوا کہ ان کی عدم موجودگی میں کیا کچھ ہو گیا ہے۔ اس رات سعد الملک نے ماہ ملک کو جا کر بتایا کہ تمام شرطیں پوری ہو گئی ہیں۔ گوہر کے نکاح کا ماجرا سناتے ہوئے بتایا کہ فتنہ اور سلطان شہاب الدین نے مدد کی۔ گوہر بھی وہاں موجود تھی اس نے بھی ماہ ملک کے سامنے اعتراف کیا۔ اختر ملک کو بھی کسی طرح حجلۂ عروسی سے نکال کر شہزادی کے پاس لایا گیا۔ اس کے آنے پر سعد الملک اور شرف الملک باہر نکل گئے کہ رزم، بزم کو بلا لائیں۔ اتنے میں رزم، بزم آ گئیں اور جلد ہی بھید کھل گیا کہ رزم بزم، سعد الملک اور شرف الملک ہی کے بہروپ تھے۔ سعد الملک نے شہزادی کو بتایا کہ وہ خود ہی خوارزم شاہ ہے۔

جشن کے بعد ملکہ جوہر ملک نے سلطان کو گوہر کے نکاح اور رزم، بزم کے بہروپ اور سعد الملک کے خوارزم شاہ ہونے کے بارے میں بتایا۔ سلطان کے حکم پر وہ دونوں دلہنوں

سمیت پا بہ زنجیر لائے گئے ۔ سلطان نے ان کے قتل کا حکم دیا تو دونوں شہزادیوں نے کہا وہ بھی ساتھ مریں گی ۔ سلطان نے ان کو بھی ساتھ قتل کر دینے کا حکم دیا تو شہاب الدین نے کہا وہ بھی ان کے ساتھ قتل ہونا پسند کرے گا ۔ اس پر سلطان خاموش ہوگیا ۔ ان سے دوبارہ پوچھا کہ واقعی وہ غوری شہزادے ہیں تو انھوں نے یقین دلایا ۔ سلطان نے سب کو معاف کرکے خراسان جانے کی اجازت دے دی ۔

واقعات کا تحقیقی جائزہ

"ماہ ملک" کو تاریخی ناول کے اعتبار سے شرر کے کمزور ترین تاریخی ناولوں میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔ اس ناول میں سنین کی صحت مشکوک ہے اکثر واقعات اور ناموں کو باہم خلط ملط کر دیا ہے اور ناول کا بہت سا حصہ شرر کی اپنی تخلیق ہے ۔

شرر نے ناول کا آغاز ۵۶۴ھ سے کیا ہے اور آغاز کے چند دنوں بعد بقول شرر غیاث الدین اور شہاب الدین کے چچا ملک فخرالدین نے علاءالدین قماج حاکم بلخ اور تاج الدین یلدز حاکم ہرات کو ساتھ ملا کر فیروز کوہ پر حملے کا ارادہ کیا ۔ شرر کے اس بیان میں اول تو غیاث الدین کے چچا کا نام ہی غلط درج ہوا ہے ۔ غیاث الدین کے چچا کا نام علاءالدین تھا اور ۵۶۴ھ سے بہت پہلے ۵۵۶ھ میں اس کا انتقال ہو چکا تھا ۔ علاءالدین سے غیاث الدین اور شہاب الدین کی لڑائی ۵۵۶ھ سے بھی پہلے کا واقعہ ہے ۔ ابن خلدون کے درج ذیل اقتباس سے ان امور پر روشنی پڑے گی :

"سیف الدین سوری کے قتل کے بعد بلاد غور کی حکومت پر اس کا بھائی حسین شاہ ملقب بہ علاء الدین قابض ہوا ۔ اس نے غور کی تمام پہاڑیوں اور شہر فیروز کوہ پر قبضہ کر لیا ۔ فیروز کوہ غزنین اور ہندوستان کے درمیان میں واقع تھا جس کی وسعت و آبادی خراسان کے قریب قریب تھی ۔ علاء الدین نے نہایت استقلال و استحکام کے ساتھ حکومت کی ۔ خراسان پر قبضہ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی ۔ اہل ہرات کی خواہش پر ہرات کا قصد کیا ۔ تین مرتبہ کے محاصرے کے بعد امان کے ساتھ قابض ہوا ۔ سلطان سنجر کے نام کا خطبہ پڑھا ۔ پھر بلخ کی جانب بڑھا ۔ اس وقت سلطان سنجر کی طرف سے امیر قماج بلخ کی گورنری پر تھا ۔ مقابلہ کے وقت اہل بلخ نے دھوکا دیا جس سے امیر قماج کے پاؤں اکھڑ گئے ۔ علاءالدین نے بلخ پر قبضہ کر لیا ۔ سلطان سنجر کو ان واقعات کی اطلاع ہوئی، فوجیں لے کر علاءالدین کے مقابلے پر آیا ۔ سلطان کو فتح نصیب ہوئی، علاءالدین گرفتار کر لیا گیا ۔ چند روز بعد سلطان سنجر نے خلعت دے کر پھر فیروز کوہ کی حکومت عطا کی ۔

اس کے بعد ۵۴۳ھ میں علاء الدین نے غزنین پر حملہ کیا اور قبضہ کرکے اپنے بھائی سیف الدین کو حکومت غزنین پر مامور کیا . . . . اہل غزنین نے سیف الدین کو گرفتار کرکے بہرام شاہ کے حوالے کر دیا ۔ بہرام شاہ نے غزنین پر قبضہ کرکے سیف الدین کو قتل کر ڈالا . . علاءالدین نے بغرض انتقام غزنین پر چڑھائی کی اور بزور تیغ فتح کرکے غزنین کو تاخت و تاراج کیا، سارے شہر کو جلا کر راکھ کر دیا ۔

جب علاء الدین کی حکومت و سلطنت کو استحکام حاصل ہوگیا تو اس نے بلاد غور پر اپنے بھتیجوں غیاث الدین اور شہاب الدین پسران سام بن حسین کو مامور کیا ۔ ان دونوں نے نہایت خوبی سے اپنے مقبوضہ ممالک کا انتظام کیا . . . . لگانے بجھانے والوں نے ان کے چچا علاء الدین سے لگانا بجھانا شروع کر دیا اور موقع پا کر یہ جڑ دیا کہ شہاب الدین اور غیاث الدین حکومت و سلطنت کے دعویدار ہیں اور آپ پر حملہ کی تیاری کر رہے ہیں ۔ علاء الدین نے غیاث الدین اور شہاب الدین کو بلا بھیجا ۔ یہ کسی وجہ سے نہ آ سکے، علاء الدین کا شبہ یقین کی حد تک پہنچ گیا ۔ فوراً فوجیں مرتب کرکے دونوں کی گرفتاری کے لیے بھیج دیں ۔ اتفاق یہ کہ علاء الدین کی فوج کو شکست ہوگئی اور غیاث الدین اور شہاب الدین نے علانیہ اپنے چچا کی

مخالفت کا اعلان و اظہار کرکے اس کے نام کا خطبہ موقوف کر دیا۔ علاء الدین کو اس سے سخت غصہ پیدا ہوا۔ دوبارہ فوجیں مرتب کرکے خود بقصد جنگ غیاث الدین اور شہاب الدین پر فوج کشی کی۔ سخت خونریز جنگ ہوئی۔ بالآخر علاء الدین کی فوج میدان جنگ سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ علاء الدین نے امن کا جھنڈا بلند کر دیا۔ خاتمہ جنگ پر غیاث الدین اور شہاب الدین اپنے چچا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسے تخت حکومت پر بٹھلا کر چھوٹوں کی طرح کھڑے ہوگئے۔ علاءالدین اپنے بھتیجوں کی مردانگی اور سعادت مندی سے نہایت خوش ہوا۔ اپنی بیٹی کو غیاث الدین کے عقد نکاح میں دیا اور مرنے کے وقت اس کے حق میں حکومت و سلطنت کی وصیت کر گیا۔ علاءالدین بادشاہ غور نے ۵۵۶ھ میں وفات پائی۔ ابو الفتح غیاث الدین ابن سام ابن حسین دارالحکومت فیروزہ کوہ میں اپنے چچا علاءالدین کی وصیت کے مطابق تخت حکومت پر متمکن ہوا۔۔۔۔ ۵۷۱ھ میں امرائے دولت غزنویہ کو شکست دے کر اس نے اپنے بھائی شہاب الدین کو غزنین کی حکومت پر مقرر کیا۔"[1]

شرر نے ۵۶۳ھ سے ناول شروع کیا ہے جس کا سطور بالا میں ذکر ہوا کہ تاریخی اعتبار سے غلط ہے لیکن اس کے بعد چند ماہ کے واقعات بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "۵۸۷ھ کا زمانہ ہے"۔ یہ تضاد تعجب انگیز ہے۔ ۵۸۷ھ میں شہاب الدین کی راجہ پتھورا کے خلاف لشکر کشی کے واقعات تاریخی اور زمانی اعتبار سے صحیح ہیں۔ راجہ پتھورا کے لشکر کی تعداد (دو لاکھ) اور ہاتھیوں کی مذکورہ تعداد (تین ہزار) بھی صحیح ہے۔ اس جنگ کے سلسلے میں بیان کردہ مقام اور محل وقوع بھی صحیح ہے۔ شہاب الدین کے میمنہ و میسرہ کا بھاگ کھڑا ہونا، کھانڈے رائے سے مقابلہ، کھانڈے رائے کے دانتوں کا شہاب الدین کے نیزے سے ٹوٹنا اور خود شہاب الدین کا کھانڈے رائے کی تلوار سے زخمی ہونا اور خلجی سپاہی کا اچک کر شہاب الدین کے گھوڑے پر جا بیٹھنا اور اسے سنبھال کر گھوڑے کو راجپوتوں کے نرغے سے نکال لے جانا وغیرہ تاریخی اعتبار سے صحیح ہیں۔ ان واقعات کی تفصیلات تاریخ فرشتہ اور زین المآثر میں ملتی ہے۔ ابن خلدون کے یہاں بھی یہ تفصیلات موجود ہیں۔ شہاب الدین کو زخمی حالت میں لاہور اور پھر وہاں سے غزنی لایا گیا جہاں وہ ۵۸۸ھ تک مقیم رہا۔[2]

اس شکست کے بعد سلطان شہاب الدین کا امرائے غور سے برہم ہونا اور سرداران لشکر و امراء کو دربار میں حاضری کی اجازت نہ دینا، نیز ایک برس تک انتقام کی آگ میں جھلستے رہنے کے بعد سرداران لشکر سے مشورے کے بغیر دفعتاً غزنی سے کوچ کرنا اور ایک بوڑھے سردار غور کی سفارش پر ان کا سابقہ قصور معاف کرکے انھیں لشکر میں شامل ہونے کی اجازت دینا وغیرہ واقعات جو شرر نے ناول میں لکھے ہیں وہ درست ہیں اور ابن خلدون کے بیانات سے ان امور کی تصدیق ہوتی ہے۔[3] نیز اس دوسری جنگ کی تفصیلات، محل وقوع، ڈیڑھ سو راجگان ہند کا متحد ہوکر مقابلہ پر آنا، لشکر کی تعداد، شہاب الدین کا اتمام حجت کے لیے راجہ پتھورا کو پیغام، اس کا جواب، راجہ پتھورا کا شہاب الدین کو مشورہ اور شہاب الدین کا جواب کہ وہ بھائی کی اجازت کے بغیر واپس نہیں لوٹ سکتا وغیرہ بیانات جو شرر نے بیان کیے ہیں اور اس جنگ کا انجام وغیرہ ان امور کی تصدیق بھی تاریخ فرشتہ[4] اور ابن خلدون کے بیانات سے ہوتی ہے۔[5]

۱- ابن خلدون: ترجمہ حکیم احمد عثمانی، ج ۶، ص ۳۱۲ تا ۳۱۴۔
۲- ایضاً: ج ۶، ص ۳۲۲، ۳۲۳۔ ۳- ایضاً: ج ۶، ص ۳۲۳، ۳۲۴۔
۴- تاریخ فرشتہ، مقالہ دوم، ص ۵۸۔ ۵- ابن خلدون: ج ۶، ص ۳۱۷، ۳۱۸ و ۳۲۴، ۳۲۵۔

ان واقعات کے علاوہ شرر نے دیگر جو واقعات بیان کیے ہیں، وہ زیادہ تر خیالی ہیں اور جن واقعات میں تھوڑی بہت تاریخی صداقت ہے وہ زمانی اعتبار سے غلط مقام پر بیان ہوئے ہیں ۔ مثلاً خوارزم شاہ کے سفیر کی آمد وغیرہ کے واقعات ۔ تاج الدین یلدز کی شکست اور علاء الدین قاج کی شکست کے واقعات بھی تخیلی ہیں ۔ تاج الدین یلدز سلطان غیاث الدین کے انتقال (۵۹۹ھ) کے بعد بھی زندہ تھا اور ۶۰۲ھ میں اس نے غیاث الدین کے بیٹے کو شکست دے کر غزنی پر قبضہ کر لیا۔ یلدز ۶۱۰ھ کے بعد دہلی کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتا تھا کہ قطب الدین ایبک کے غلام سمس الدین سے جنگ کے دوران قتل ہوا[1]۔ شرر کو خوارزم شاہ کے ساتھ مصالحت کے سلسلے میں بھی سلطان غیاث الدین اور اس کے بیٹے غیاث الدین محمد کے ناموں کے بارے میں التباس ہوا ہے۔ خوارزم ساہ سے سلطان غیاث الدین محمد نے مصالحت کی تھی تا کہ ایبک یلدز کے خلاف لسکر کشی کر سکے[2] ۔

۱۳- فلپانا

یہ ناول خلافت حضرت عثمان غنیؓ کے عہد سے متعلق ہے اور ۱۹۱۰ء میں لکھا گیا ۔ اس کا موضوع طرابلس کی فتح ہے ۔ یہ جنگ حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں گریگوری کے ساتھ لڑی گئی ۔ اسلامی لشکر کے سپہ سالار اور والی مصر و افریقہ عبداللہ ابن سعد (بن ابی سرحؓ) تھے ۔ ناول میں بیان کردہ واقعات کا خلاصہ یہ ہے :

حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت میں جب مصر اور مغربی بلاد اسلامیہ کے والی عبداللہ ابن ابی سرح تھے ایک مصری نو مسلم اسقلیبیوس آن کے خلاف شکایت لایا ۔ حضرت عثمان غنیؓ نے شکایت سن کر فوراً جواب طلبی کا پروانہ بھیجا ۔ ابن ابی سرح اس وقت طرابلس کے مسیحی حکمران گریگوری کے خلاف معرکہ آرا تھے ۔ گریگوری کو افریقہ اور اندلس و روم سے برابر کمک آ رہی تھی ۔ اس کی حسین و شجاع بیٹی خود میدان جنگ میں لشکر کی قیادت کرتی تھی ۔ حضرت عثمان غنیؓ نے جب اس جہاد کے لیے رضا کار طلب کیے تو آن میں عبداللہ بن زبیرؓ بھی تھے۔ کمک فوری طور پر روانہ ہوئی ۔ مصری نو مسلم بھی ابن زبیرؓ کے ہمراہ تھا ۔ ابن زبیرؓ اور آن کے ساتھی بہت تیزی سے سفر کرتے ہوئے اور راستے میں اپنے گھوڑے مسلمان حاکموں کے تازہ دم گھوڑوں سے بدلتے ہوئے تین ماہ کا سفر تیرہ دن میں طے کر کے جب شہر طرابلس کے سامنے پہنچے تو میدان کار زار گرم تھا لیکن اسلامی لسکر کی کارروائی میں سستی جھلکتی تھی ۔ ابن زبیرؓ کو پتہ چلا کہ سپہ سالار خود خیمے میں ہیں جس کے گرد ایک سو سپاہی پہرہ دے رہے ہیں ۔ وہ بہت حیران ہوئے اور فوراً ابن ابی سرح کے پاس پہنچ کر انھیں ملامت کیا کہ وہ اس طرح جنگ سے کنارہ کش ہو کر خیمے میں بیٹھے ہیں ۔ امیر نے بتایا کہ سارا افریقہ فلپانا کے حسن کا دیوانہ ہے اور گریگوری نے اعلان کر رکھا ہے کہ جو کوئی مسلمان سپہ سالار کا سر لائے گا فلپانا اُسے بیاہ دی جائے گی ۔ ابن زبیرؓ نے امیر کو اس کی بزدلی پر ملامت کرتے ہوئے فوراً جوابی اشتہار دینے کا مشورہ دیا کہ جو کوئی گریگوری کا سر لائے گا اُسے فلپانا کے ساتھ طرابلس کی حکومت بھی دی جائے گی ۔ چنانچہ فوراً دونوں زبانوں میں ہر طرف اعلان کر دیا گیا اور اشتہار

۱- ابن خلدون : ج ۶، ص ۳۳۷ تا ۳۵۸ ۔ ۲- ایضاً

لکھ کر تقسیم کر دیے گئے اس طرح اب خود گریگوری دوہری مشکل میں مبتلا ہو گیا۔ اسے نہ صرف مسلمانوں کی طرف سے بلکہ ان عیسائی سرداروں کی طرف سے بھی خوف لاحق ہو گیا جو فلپانا کے امیدوار تھے۔

فلپانا نے اس نئی صورت حال پر باپ سے مشاورت کی اور حفاظتی انتظامات کو بہتر بنایا لیکن اپنی جگہ وہ خود بھی مشوش تھی۔ اسے مسلمانوں کی یک جہتی پر رشک آتا تھا کہ کوئی لالچ ان کے قدموں کو ڈگمگا نہ سکا جب کہ اس اعلان کے بعد اسے عیسائیوں کی طرف سے بہت اندیشہ لاحق تھا۔ اس نے سہیلیوں سے مل کر کچھ نئے منصوبے بنائے، میدان جنگ کے لیے اپنی ایک سہیلی کو اپنا بہروپ بھرنے پر آمادہ کیا اور ایک ڈیوک کی داشتہ عرب غسانی عورت زینب کو ساتھ ملا کر اسلامی کیمپ میں گھسنے کا فیصلہ کیا۔

رات کو اسلامی لشکر میں ابن زبیر اور ابن ابی سرح نے سب گشت اور دوسرے دن کے جنگی منصوبوں پر غور کیا۔ طے پایا کہ صبح سے ہی آدھے لشکر کو پیچھے چھپا کر رکھا جائے اور دوپہر کو جب جنگ ملتوی ہونے لگے تو تازہ دم نصف حملہ آور ہو۔ اسی شب جوزفینا، ہیلینا اور فلپانا حبشیوں کے بہروپ میں اور زینب عربوں کے روپ میں مسلح اسلامی لشکرگاہ میں داخل ہوئیں لیکن امیر کے خیمے پر زبردست پہرہ دیکھ کر حملہ آور ہونے کی ہمت نہ پڑی۔ وہاں انہیں ابن زبیر کے بارے میں بھی علم ہوا۔ وہ تینوں زینب کو وہاں ٹھہرا کر لوٹ گئیں اور اس کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ دوسری شب ابن زبیر کو بہلا پھسلا کر لشکرگاہ سے باہر لائے۔

دوسری صبح لشکر کی روانگی کے وقت زینب نے ابن زبیر تک رسائی حاصل کر لی اور خود کو فلپانا کا دعوے دار ظاہر کیا۔ ابن زبیر سے ہتھیار اور گھوڑا بھی حاصل کیا۔ یہاں زینب کو اس دن کے حملے کے خفیہ منصوبے کا بھی پتہ چلا۔ دوران جنگ زینب فلپانا تک جا پہنچی اور اسے بتا دیا کہ آدھا اسلامی لشکر دوپہر کے انتظار میں چھپا بیٹھا ہے۔ ابن زبیر نے اسے فلپانا سے باتیں کرتے دیکھ لیا، وہ سپاہیوں کے ساتھ لپکے، فلپانا اور اس کی سہیلیوں کو تو عیسائیوں نے حلقہ بنا کر بچا لیا لیکن زینب گرفتار کر لی گئی۔ فلپانا نے باپ کو آگاہ کیا تو اس نے گھبرا کر صلح کا علم بلند کرکے دو دن کے لیے جنگ رکوا لی اور غور کرنے کی مہلت حاصل کی۔

التوائے جنگ کے بعد ابن زبیر نے زینب کی اصلیت معلوم کر لی لیکن وہ پھر بھی چکمہ دے گئی کہ وہ فلپانا کی رازدار ہے اور شہزادی خود بھی ابن زبیر سے ملنے کی متمنی ہے اور اس خاطر وہ روز رات قلعے سے باہر نکلتی ہے۔ اس رات ابن زبیر زینب کی بات کی صداقت معلوم کرنے اس کے ساتھ لشکرگاہ سے باہر گئے، فلپانا اور اس کی سہیلیوں سے ملاقات ہوئی، ابھی گفتگو ہو رہی تھی کہ حسب پروگرام بیس مسیحی سوار آ پہنچے۔ تلوار چلی، مصری نو مسلم بہانے سے تاک میں تھا وہ فوراً شب گشت کے سپاہیوں کو بلا لایا جن کے آتے ہی عیسائی ابن زبیر کو زخمی حالت میں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

دوسری صبح اسقلیبیوس نے اپنی بھتیجی جولیانا کے ذریعے زینب سے بدلہ لینے کا پروگرام بنایا۔ جولیانا دل سے مسلمان تھی اور گریگوری کے محل میں خادمہ تھی۔ وہ ایک قریبی گاؤں میں ایک دوست کے پاس گیا، وہاں سے رومی راہبوں کا لباس پہن کر طرابلس کے قلعے میں پہنچا جہاں اس کی بہت تعظیم کی گئی۔ گریگوری کو اس نے زبردست مسیحی کمک کی آمد کا مژدہ سنایا اور کہا کہ ایک ہزار سپاہی دس کوس پر ساحل پر اتر چکے ہیں، نو ہزار جلد پہنچ رہے ہیں۔ اس نے

فلپانا کو ترغیب دی کہ وہ سہیلیوں سمیت خفیہ طور پر ساحل پر پہنچے، دوسرے دن جب لڑائی گرم ہو تو کمک کے ان سپاہیوں کو لے کر پیچھے سے آ پڑے ۔ پھر اس نے جولیانا کو تنہائی میں رازدار بنا کر شہزادی کے رخصت ہونے کے بعد اسلامی کیمپ میں چلے آنے کا کہا ۔ قلعے سے رخصت ہو کر اسقلبیوس پھر اسی گاؤں میں لباس تبدیل کرتا ہوا ابن زبیر کے پاس جا پہنچا اور انھیں پروگرام سے آگاہ کیا ۔ جولیانا بھی آ پہنچی، اسے وہاں ٹھہرا کے وہ ایک ہزار سواروں کو رومی لباس میں لے کر چلے اور راستے میں اسقلبیوس نے پھر راہبانہ وضع اختیار کر لی ۔ شہزادی اور اس کی سہیلیوں سے ملاقات ہوئی ۔ شہزادی نے سپاہیوں سے پرجوش خطاب کیا، زینب کی نظر ابن زبیر پر پڑ گئی، اس نے پہچان کر فلپانا کو بتایا ۔ اسقلبیوس نے سن کر دوڑو پکڑو کا شور مچایا اور ابن زبیر ڈرامائیت پیدا کرنے کے لیے بھاگے، سواروں نے بظاہر سخت تعاقب کر کے انھیں گرفتار کر لیا ۔ فلپانا بہت خوش تھی کہ ابن زبیر بھاگ نہیں سکے اور نو وارد فوج کا راز فاش ہونے سے بچ گیا ۔

اب ابن زبیر کو حراست میں لیے یہ لشکر خاموشی کے ساتھ شہزادی کو پہنچانے چلا ۔ فلپانا سواروں کے جھرمٹ میں اس طرح مسرور چلتی رہی کہ اسے اس وقت اصلیت کا پتہ چلا جب وہ اسلامی لشکرگاہ میں پہنچ چکی تھی اور سہیلیوں سمیت اس سے اسلحہ لے لیا گیا ۔ انھیں ایک خیمے میں ٹھہرایا گیا ۔ جولیانا نے جو پہلے سے اسلامی کیمپ میں تھی، آدھی رات کو پہرے دار کو سوتے میں ہی قتل کر دیا اور فلپانا اور اس کی سہیلیوں کو نکال لے گئی ۔ قلعے میں پہنچ کر بادشاہ کو ماجرا سنایا اور دوسری صبح بہت سویرے حملے کا پروگرام بنایا ۔

دوسری صبح عیسائیوں نے بہت سویرے حملہ کیا لیکن شب گشت کے سپاہیوں نے روک لیا ۔ جنگ شدت سے شروع ہوئی ۔ ابن زبیر نے کچھ سپاہیوں کے ساتھ گریگوری کی طرف رخ کیا لیکن وہ ساڑھے تین ہزار عیسائیوں کے نرغے میں آ گئے اور زخمی ہو کر گرفتار ہوئے ۔ انھیں فوراً قلعے میں بھیج دیا گیا ۔ فلپانا اپنے پانچ سو سواروں کے جھرمٹ میں ابن زبیر کے باقی ساتھیوں کے تعاقب میں لپکی لیکن اصل لشکر سے الگ ہوتے ہی اسے معلوم ہوا کہ وہ پانچ سو سوار مسلمان تھے اور اب وہ ان کی حراست میں تھی ۔ گریگوری مغموم تھا لیکن جولیانا نے تسلی دی اور شہزادی کو چھڑا لانے کا وعدہ کیا ۔

اسقلبیوس ابن زبیر کی گرفتاری پر پھر اپنے دوست کے پاس گیا اور وہاں سے ایک معمار کے ساتھ چالیس مزدوروں میں شامل ہو کر قلعے میں جا پہنچا ۔ شام کو جب فصیل کی مرمت کا کام بند ہوا تو اس نے بے گھر ہونے کا بہانہ کیا اور رات گئے تک اکیلا کام کرتا رہا ۔ اس دوران اس نے مٹی کا ڈھیر اس طرح لگایا کہ اندر کی طرف سے اس کے ذریعے فصیل پر چڑھا جا سکتا تھا رات کو گلیوں میں پھر کر اس نے ابن زبیر کے محبس کا پتہ لگایا ۔ پھر ایک فاحشہ عورت کو چارہ بنا کر ان کے پہرے داروں کو شراب میں بے ہوشی کی دوا پلا دی اور اس طرح انھیں چھڑا کر صبح اسلامی کیمپ میں لے آیا ۔

اسی شب جولیانا اسلامی لشکر میں پہنچی، اسقلبیوس کی بھتیجی کی حیثیت سے امیر سے اپنا تعارف کرایا اور قیدیوں کے تبادلے کی تجویز پیش کی، پھر لوٹی لیکن اس طرح مراعات حاصل کر کے وہ فلپانا وغیرہ کو چوری چھپے نکال لے گئی ۔ جس شب اس طرح دونوں طرف کے قیدی بچ نکلے اس کی صبح پھر جنگ شروع ہوئی ۔ دوپہر تک گھمسان کا رن پڑا، دوپہر کو جب

التوا کا طبل بجا، ابن زبیر آدھی تازہ دم فوج سے ان پر جا پڑے۔ عیسائی قلعہ بند ہوگئے لیکن ابن زبیر فصیل پر چڑھ کر قلعے میں اتر گئے۔ اسلامی لشکر اندر داخل ہوگیا۔ گریگوری نے نائٹوں کے ساتھ مل کر مقابلہ کیا لیکن مسلمانوں نے انھیں ٹکڑیوں میں تقسیم کر لیا۔ گریگوری ابن زبیر کے ہاتھوں قتل ہوا۔ فلپانا غائب تھی۔ اسے زخمی حالت میں ایک نائٹ اٹھا لے گیا تھا لیکن اس کے چچا نے سلطنت کے لالچ میں پتہ بتا دیا اور اس طرح وہ برآمد کر لی گئی۔ ابن زبیر تین چار دن بعد امیرالمومنین کے نام سپہ سالار کا خط، خمس اور فلپانا کو لے کر روانہ ہوئے۔ تین ماہ بعد مدینہ پہنچے۔ امیرالمومنین نے شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا۔ دوسرے دن مسجد نبوی میں بلند آواز سے ابن ابی سرح کا خط پڑھا، پھر فلپانا کا ہاتھ ابن زبیر کے ہاتھ میں دے دیا۔ ابن زبیر نے فلپانا کو آزاد کر دیا اور مسجد سے گھر چلے گئے لیکن فلپانا نے اس عظمت کردار سے متاثر ہو کر اپنی خوشی سے ان سے نکاح کر لیا۔

تحقیقی جائزہ

سکاٹ نے اس جنگ سے متعلق جو واقعات بیان کیے ہیں وہ یہ ہیں:

"حضرت عثمان غنیؓ نے عمرو بن العاص کو حکومت مصر سے معزول کرکے عبداللہ ابن سعد (اپنے رضاعی بھائی) کو وہاں مقرر کر دیا۔ یہ بڑے جنگ آزمودہ، مستقل مزاج اور اپنی قوم بھر میں بہت بڑے شہسوار تھے۔ مگر ان کی تمام خوبیوں پر اس وجہ سے پانی پھر گیا کہ وہ پابندی دین کی چنداں پروا نہ کرتے تھے.... عبداللہ ابن سعد نے اپنے زیر حکومت ملک کی تمام ذرائع اور فوج کو، جو بقدر ایک لاکھ بیس ہزار کے تھی جمع کرکے افریقہ کی طرف پیش قدمی کی (اور مختلف سمتوں میں فوج روانہ کر دی) بیزنطینی سلطنت میں، بجائے زمانہ قدیم کے نائب السلطنت کے، حاکم صوبہ مقرر کیے گئے۔ اس وقت طرابلس کا حاکم صوبہ گریگوری تھا۔ اس شخص کے عقل و فہم کی آزمائش بربریوں کی مختلف لڑائیوں میں ہو چکی تھی۔ گریگوری ایک لاکھ بیس ہزار غیرقواعد دان اشرار کا ایک گروہ لے کر طرابلس کا محاصرہ توڑنے کے لیے روانہ ہوا۔ مسلمان محاصرہ چھوڑ کر مقابلہ کے لیے تیار ہوگئے۔ کئی لڑائیاں ہوئیں جن کا نتیجہ کسی فریق کے موافق نہ ہوا۔ گریگوری کی فوج اگرچہ بہت زیادہ تھی مگر چونکہ عرب جان توڑ کر لڑتے تھے، اس لیے وہ بہت ہی جلد تنگ آ گئے۔ مجبور ہو کر گریگوری نے اعلان کر دیا کہ جو شخص مسلمانوں کے سپہ سالار کا سر لائے گا اس سے وہ اپنی بیٹی کی شادی کر دے گا اور ایک لاکھ اشرفیاں انعام دے گا۔ گریگوری کی یہ بیٹی ہتھیار لگا کر ہر روز فوج کے مقدمہ الجیش میں نمایاں طور پر کھڑی ہوتی اور لڑتی تھی۔ اگرچہ عبداللہ نے اپنی عمر میں موت کو سینکڑوں صورتوں میں دیکھا ہوگا مگر اس وقت گریگوری کے اعلان سے ایسے مرعوب ہوئے کہ ان کو اپنے لالچی مدمقابل کے سامنے ہونے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ وہ کچھ ایسے پست ہوئے کہ اپنے خیمے سے باہر نکلنا بھی چھوڑ دیا، اور فوجی انتظام وغیرہ سب اپنے ماتحتوں پر چھوڑ دیا۔ اس اثنا میں ابن زبیر کچھ کمک لے کر وہاں پہنچ گئے۔ یہ بھی بڑے نمود کے سپاہی تھے۔ انھوں نے یہاں آ کر سپہ سالار کی بزدلی کا حال نہایت افسوس کے ساتھ سنا، اور ان سے مل کر سخت ملامت کی اور یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنی طرف سے یہ اعلان کر دیں کہ جو شخص گریگوری کا سر ان کے قدموں میں لا ڈالے گا اس کو ایک لاکھ اشرفی کے علاوہ اس کی دلربا بیٹی بطور کنیزک کے دی جائے گی۔ چنانچہ اس مشورہ پر عمل کرکے تمام فوج میں اعلان کر دیا گیا۔ اس انعام کی لالچ میں جوانان عرب پہلے سے بھی زیادہ جان لڑانے لگے۔ عبداللہ کو بھی اپنی حرکت پر بہت شرم آئی اور وہ بھی مقدمۃ الجیش میں آ کر لڑنے لگے، لیکن ایک تو یونانیوں کی تعداد زیادہ تھی دوسرے وہ دستہ ہائے فوج ان کے دل بڑھا رہے تھے جن میں ابھی تک رومیوں کا استقلال اور نظام موجود تھا، تیسرے نومیڈیا کا رسالہ ان کی پشت پر تھا، جس کی بہادری کی جگرتھا کے زمانے سے دھاک بیٹھی ہوئی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہر لڑائی میں عربوں کی تعداد کم ہوتی چلی جاتی تھی۔ یہ کیفیت دیکھ کر ابن زبیرؓ سے پھر مشورہ

لیا گیا ۔ صبح ہوتے ہی حسب معمول پھر جنگ شروع ہوئی ۔ شام کو جب طرفین کی فوج تھک گئی تو دونوں فوجیں آرام کرنے کے لیے اپنے اپنے خیموں میں چلی گئیں، لیکن آج مسلمان اپنی تمام فوج میدان جنگ میں نہیں لائے تھے ۔ اس وقت ماہقی تازہ دم فوج کو ابن زبیر لے کر رعد و برق کی طرح دشمنوں کے خیموں پر جا پڑے ۔

چونکہ تمام فوج دن بھر کی سخت محنت کے بعد آرام کر رہی تھی، ان کو خیال بھی نہ تھا کہ شب خون پڑے گا ۔ اس لیے سخت گھبراہٹ پیدا ہوگئی ۔ بری بھلی صفیں جو یہ لوگ باندھ سکے تھے وہ بھی ٹوٹ گئیں، گریگوری مارا گیا اور مسلمانوں نے اپنی فوج کو لوٹ معاف کر دی ۔ فتح کے صلے میں مسلمانوں کو بڑی لوٹ اور بے تعداد غلام ہاتھ آئے ۔ گریگوری کی مرد منش ماہوش بیٹی ابن زبیر کے ہاتھ لگی ۔ شہر صوفے ٹیلا پر قبضہ ہو جانے کے بعد تمام علاقہ خلیفۂ اسلام کا تابع فرمان ہوگیا ۔ مگر ایک طرف تو بیماری نے قہر ڈالا، دوسری طرف سپہنوں کی متواتر لڑائیوں اور کمک نہ پہنچنے سے عبداللہ نہ فوج محافظ شہر میں چھوڑ سکے، نہ اندرون ملک کی بے چین اور شریر رعایا کو اپنے قابو میں رکھ سکے، اسی لیے انہوں نے پچیس لاکھ دینار لے کر پیش قدمی بند کر دی ۔ تمام مال مغروتہ مدینہ بھیج دیا گیا اس میں سے خمس عبداللہ کو دیا گیا اور ؛ ق مروان نے کچھ کم قیمت دے کر خرید لیا ۔"[1]

ابن العذاری المراکشی نے بھی اس جنگ کا ذکر کرتے ہوئے عمرو بن العاص کی معزولی کے بعد عبداللہ ابن سعد (ابن ابی سرح) کے تقرر، بطور والی مصر، کا ذکر کیا ہے اور حضرت عثمان غنی رض کے ارشاد پر حضرت عبداللہ ابن زبیر کے ان کی کمک پر جانے کا حال بیان کیا ہے، لیکن کمک پر جانے والی فوج کے بارے میں لکھا ہے کہ

"انہوں (حضرت عثمان غنی رض) نے لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا اور جب سب جمع ہوگئے تو آپ نے کھڑے ہوکر ان کو وعظ نصیحت فرمائی ۔ جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دی اور پھر کہا کہ میں نے عبداللہ بن سعد سے اس بات کا عہد لے لیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ کریں اور نرمی سے پیش آئیں ۔ جب تک کہ تم عبداللہ بن سعد بن ابی سرح تک نہ پہنچو میں نے حرث بن الحکم کو تمہارا افسر مقرر کیا ہے ۔ اس کے بعد عبداللہ بن سعد بن ابی سرح تمہارے حاکم ہوں گے ۔"[2]

اس سلسلے میں گریگوری سے جنگ کے واقعات لکھتے ہوئے ابن العذاری لکھتے ہیں :

"عبداللہ (بن سعد) بن ابی سرح بیس ہزار آدمیوں کو لے کر مصر سے افریقیہ کی طرف نکلے ۔ افریقیہ کا حاکم جرجیر نامی ایک بطریق تھا ۔ طرابلس سے طنجہ تک کا علاقہ اس کے ماتحت تھا ۔ عبداللہ بن ابی سرح نے اطراف افریقیہ میں فوج کے دستے روانہ کیے اور انہوں نے ہر طرف سے مال غنیمت جمع کیا ۔ ایک روز علی الصباح سبیطلہ (یا بسیطلہ) کے مقام پر عبداللہ اور بطریق کا مقابلہ ہوا ۔ افریقیہ اور مغرب کے حاکم جرجیر کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار فوج تھی جسے دیکھ کر مسلمانوں کا دل گھٹنے لگا ۔ ان کے اور عبداللہ ابن سعد کے درمیان میں اختلاف رائے ہوگیا ۔ عبداللہ اپنے خیمے میں اس معاملے پر غور و فکر کرنے چلے گئے ۔ جب جرجیر نے دیکھا کہ مسلمانوں پر اس کا رعب طاری ہوگیا ہے تو اس نے اپنا دیدبان نکلوایا اور اس پر چڑھ کر لشکروں کو دیکھنے اور لڑائی کا نظارہ کرنے لگا . . . . اس کی بیٹی بھی دیدبان پر چڑھ گئی اور اپنے چہرے سے نقاب ہٹا لیا ۔ اس کی ان لونڈیوں کی تعداد جو دیدبان پر اس کے ساتھ تھیں، چالیس تھی اور وہ سب کی سب بہترین لباس و زیورات سے مزین تھیں ۔ اس کی فوج ایک ایک دستہ کرکے سامنے سے گزری ۔ اس (بطریق) نے ان سے پوچھا کہ کیا تم اس (عورت) کو جانتے ہو ۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں یہ ہماری مالکہ اور بادشاہ کی بیٹی ہے ۔ اس نے کہا تم میں سے جو کوئی عبداللہ بن سعد امیر عرب کو قتل کرے گا یہ مع تمام خدم و حشم اور

۱- سکاٹ : اخبار الاندلس (ترجمہ) ج ۱، ص ۱۳۰ تا ۱۳۳ -

۲- ابن العذاری المراکشی : البیان المغرب فی اخبار المغرب، ترجمہ جمیل الرحمن، ج ۱، ص ۱۱ -

نعمت و زینت کے اس کے لیے ہے۔

. . . . حالت یہ تھی جیسا کہ اس سے پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی اور جرجیر کے پاس ایک لاکھ بیس ہزار فوج تھی۔ اسی وجہ سے مسلمانوں میں اختلاف رائے ہوگیا اور عبداللہ ابن سعد اس معاملے پر غور و فکر کرنے کے لیے اپنے خیمے میں چلے گئے۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ لوگ اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے اور جرجیر ایک بھورے گھوڑے پر سوار اپنے ساتھیوں کے پیچھے ان سے بالکل الگ کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ دو لونڈیاں تھیں جو اس پر مور کے پروں سے سایہ کیے ہوئے تھیں۔ میں عبداللہ بن سعد کے خیمے کی طرف آیا اور اندر جانے کی اجازت مانگی۔ اس کے حاجب نے کہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو کیونکہ وہ تم ہی لوگوں کے معاملے میں غور و فکر کر رہے ہیں اور اگر وہ کسی صائب رائے پر پہنچ گئے تو خود باہر آ جائیں گے یا لوگوں کو بلا لیں گے۔ میں نے کہا میں ان سے کچھ کہنا سننا چاہتا ہوں۔ حاجب نے جواب دیا کہ ان کا حکم ہے کہ جب تک وہ مجھے نہ بلائیں میں لوگوں کو ان کے پاس نہ جانے دوں۔ (حضرت) عبداللہ ابن زبیر کہتے ہیں کہ میں خیمے کے گرد پھرتا ہوا اس کے پیچھے چلا گیا۔ جب انھوں نے میری صورت دیکھی تو سر سے اشارہ کیا کہ آ جاؤ۔ چنانچہ میں خیمے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ جب میں خیمے کے اندر داخل ہوا تو انھوں نے کہا کہ اے ابن زبیر تم یہاں کیوں آئے۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے دشمنوں کی ایک کمزوری دیکھ پائی ہے، چاہا کہ ہم اس فرصت سے فائدہ اٹھائیں جو خدا نے ہمارے لیے مہیا کر دی ہے۔ مجھے خوف ہوا کہ کہیں ہم اس کو ضائع نہ کر دیں۔

یہ سنتے ہی وہ فوراً کھڑے ہوگئے اور باہر نکل آئے۔ انھوں نے وہ تمام حالات جو میں نے دیکھے تھے ملاحظہ کیے اور باآواز بلند کہا کہ اے لوگو! اپنے دشمن کے مقابلے میں ابن زبیر کا ساتھ دو۔ یہ سن کر لوگوں کی ایک بڑی تعداد میرے گرد جمع ہوگئی۔ ان میں سے میں نے تیس سواروں کو منتخب کیا اور ان سے کہا کہ میں حملہ کرتا ہوں جو شخص پیچھے سے مجھ پر حملہ کرے اسے مار کر بھگا دو۔ جو کوئی میرے سامنے آئے گا اس کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں، انشاءاللہ۔

عبداللہ ابن زبیر کا بیان ہے کہ یہ کہہ کر میں نے اس طرف حملہ کیا جہاں جرجیر تھا اور جو لوگ میرے ہمراہ تھے وہ میرے پیچھے رہے۔ یہاں تک کہ میں ان کی صفوں کو چیر کر اس خالی میدان میں پہنچ گیا جو میرے اور اس کے درمیان واقع تھا، اس (جرجیر) نے یہ سمجھا کہ میں اس کے پاس ایلچی بن کر آیا۔ مگر جب اس نے مجھ پر ہتھیار کے نشانات دیکھے تو خیال کیا کہ میں اس کے پاس بھاگ کر آیا ہوں۔ بہرحال جب میں اس کے پاس پہنچا تو میں نے اس کے نیزہ مارا اور وہ گر پڑا۔ میں اس کی طرف حملہ کرنے کے لیے جھپٹا۔ مجھے دیکھ کر اس کی دونوں لونڈیاں بھی اس پر گر پڑیں۔ میں نے ان میں سے ایک کا ہاتھ کاٹ ڈالا اور جرجیر کا کام تمام کرکے اس کا سر اپنے نیزے پر اٹھا لیا۔ یہ دیکھ کر اس کے ہمراہی پلٹ پڑے۔ مسلمانوں نے میرے جانب بڑھ کر ان پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کو کامیابی ہوئی اور رومیوں کو ہزیمت۔ مسلمانوں نے ان کو خوب دل کھول کر قتل کیا اور ہر طرف سے کمین گاہوں سے لوگ نکل کر حملہ آور ہوئے۔ مسلمانوں کے رسالہ اور پیادہ فوج نے سبیطلہ کے قلعہ کی جانب پیش قدمی کی۔ رومی قلعہ میں داخل ہونے سے مانع آئے۔ مسلمانوں نے میدان اور ناہموار زمین میں ہر جانب سے ان کو گھیرنا اور دھکیلنا شروع کیا، ان کے بہادروں اور شہسواروں کو قتل کیا، بے شمار آدمی قید ہوئے، یہاں تک کہ میں نے بچشم خود ایک مقام پر ایک ہزار سے زیادہ قیدی دیکھے۔''

افریقیہ کے بعض معززین کا بیان ہے کہ جرجیر کے قتل کے بعد لوگوں میں تنازعہ ہوا کہ اس کو کس نے قتل کیا۔ جرجیر کی بیٹی یہ معاملہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا یہ عرب کس معاملے میں جھگڑ رہے ہیں۔ اس کو بتلایا گیا کہ تمھارے باپ کے قاتل کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس نے کہا میں نے اس شخص کو دیکھا ہے جو میرے باپ کے پاس تک پہنچ گیا تھا اور جس نے اس کو قتل کیا تھا۔ امیر ابن ابی سرح نے پوچھا کہ کیا تم اس کو دیکھ کر پہچان لوگی . . . . چنانچہ انھوں نے لوگوں کو اس کے سامنے سے گزرنے

کا حکم دیا ۔ یہاں تک کہ عبداللہ ابن زبیر اس کے سامنے سے گزرے . . . . اس لڑکی نے پہچان لیا ۔ (اس کے بعد مال غنیمت وغیرہ کا ذکر ہے) اس سے فارغ ہوکر امیر عبداللہ نے عبداللہ ابن زبیر کو بلایا اور کہا کہ تم سے زیادہ اس بشارت کو پہچانے کا حق اور کسی کو نہیں ۔ اس لیے تم جاؤ اور امیرالمومنین حضرت عثمان غنیؓ کو مدینہ میں اس کامیابی کی بشارت دو ۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن زبیر سبیطلہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ چوبیس دن میں مدینہ پہنچے ۔ افریقیہ میں ان کے قیام کا زمانہ ایک سال اور دو مہینے تھا ۔"[1]

ابن خلدون کے یہاں بھی اس جنگ سے متعلق یہی تفصیلات ہیں ۔ ابن خلدون کے بیان کے مطابق حضرت عبداللہ ابن زبیر، عبداللہ ابن ابی سرح کی کمک پر گئے تھے تو انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ گریگوری کے اشتہار کے باعث ابن ابی سرح اپنے خیمے میں پہرے میں بیٹھے ہیں اور لشکر بے دلی سے لڑ رہا ہے ۔ ابن زبیر کے مشورے پر ہی جوابی اعلان شائع کیا گیا اور ان کی تجویز پر ہی جنگ کا وہ نقشہ مرتب کیا گیا جس کی بدولت فتح نصیب ہوئی ۔ ابن خلدون بھی گریگوری کا قتل ابن زبیر کے ہاتھوں بیان کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ گریگوری کی لڑکی اعلان کے مطابق ابن زبیر کو دے دی گئی[2] ۔ البلاذری نے بھی فتوح البلدان میں اس فتح میں ابن زبیر کی نمایاں کارکردگی بیان کی ہے[3] ۔ ابو الفداء نے بھی یہی واقعات بیان کیے ہیں لیکن ہمارے اردو ادب کے بعض نقادوں نے شرر کے تاریخی ناولوں پر بھرپور تنقید کرتے ہوئے شرر کی تاریخ دانی کو ناقص قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ شرر نے حضرت زبیر کا واقعہ حضرت عبداللہ ابن زبیر سے منسوب کر دیا ہے ۔ حالانکہ حقیقت اس تنقید کے برعکس ہے ۔ دراصل ان نقادوں نے اسلامی تاریخ کے بارے میں صرف انگریزی مآخذ پر انحصار کیا ہے اور اس ضمن میں ان کی تنقید کا واحد سہارا گبن ہے ۔ گبن ابن زبیر اور زبیر میں فرق کو محسوس نہیں کر سکا اور اپنی مشہور تاریخ زوال روما میں وہ ہر جگہ ابن زبیر کو زبیر لکھ گیا ۔ ہمارے نقادوں نے گبن کے بیان کی تصدیق کی ضرورت نہیں محسوس کی اور شرر کو مورد الزام ٹھہرا دیا ۔ گبن کے یہاں دیگر تفصیلات صحیح ہیں ۔ مثلاً عبداللہ ابن ابی سرح کے ساتھ چالیس ہزار اور گریگوری کے جھنڈے تلے ایک لاکھ بیس ہزار کا لشکر تھا ۔ گریگوری کی خوب صورت بیٹی صبح سے شام تک میدان جنگ میں فوجوں کو لڑاتی تھی ۔ وہ خود بھی زبردست شہسوارہ اور فنون حرب میں کامل تھی ۔ گریگوری نے عرب سردار کا سر لانے والے کے لیے ایک لاکھ اشرفی اور اپنی بیٹی کو انعام میں دینے کا اعلان کیا، جس کی بدولت عبداللہ ابن ابی سرح کو اپنے خیمے میں محصور ہوکر بیٹھنا پڑا ۔ (عبداللہ ابن) زبیر بارہ آدمیوں کے ساتھ کمک پر پہنچے، انہوں نے جوابی اعلان کیا، اور پھر گریگوری انہیں کے ہاتھ سے قتل ہوا وغیرہ وغیرہ[4] ۔ تاریخ عالم اسلام میں محمد صادق حسین صدیقی نے بھی گریگوری کے ساتھ اس جنگ اور ان واقعات کو تفصیل سے رقم کیا ہے[5] ۔

فلپانا کے پہلے دو ابواب میں شرر نے تاریخی پس منظر کے طور پر جو مواد استعمال کیا

۱- ابن العذاری المراکشی : البیان المغرب فی اخبار المغرب، ترجمہ ج ۱، ص ۱۱ تا ۱۷ ۔
۲- ابن خلدون : ترجمہ حکیم احمد عثمانی، ج ۱، ص ۴۱۱ تا ۴۱۳ ۔
۳- البلاذری : فتوح البلدان، ترجمہ سید ابوالخیر مودودی، ص ۳۲۷، ۳۲۸ ۔
۴- گبن : ج ۶، باب ۵۱، ص ۴۵۶ تا ۴۶۳ ۔
۵- محمد صادق حسین صدیقی : تاریخ عالم اسلام، ج ۱، ص ۷۸۲ تا ۷۸۴ ۔

ہے، صحابہؓ کے نام، ان کے رشتے، عالم اسلام کی کیفیت، فتوحات، انتظامات وغیرہ وہ بھی تاریخی اعتبار سے مستند ہے۔ اس ناول میں صرف وہ حصہ شرر کی قوت متخیلہ کا مرہون منت ہے جس میں انھوں نے کبھی حضرت عبداللہ ابن زبیر اور کبھی فلپانا کی گرفتاری اور قید کے منظر دکھائے ہیں اور ڈرامائی چاشنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۴۱۔ زوال بغداد

اسلامی تاریخ کے ایک عبرت ناک موضوع پر یہ ناول شرر نے ۱۹۱۲ء میں شائع کیا۔ اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے "۱۹۱۱ء کے خریداران دلگداز کی خدمت میں پیش کیا گیا۔" ناول کا موضوع تیرھویں صدی عیسوی میں خلافت بغداد کا انتشار، مسلمانوں میں فرقہ وارانہ تعصبات اور فسادات ہے اور انھیں تعصبات کے نتیجے میں خلیفہ المستعصم کے وزیر نے ہلاکو خان سے ساز باز کرکے اسے بغداد پر حملے کی دعوت دی اور بغداد کی عبرت انگیز تباہی معرض وجود میں آئی۔ ناول میں دیے گئے واقعات کا خلاصہ یہ ہے:

۶۵۴ھ میں ایک نوعمر شریف زادی زبیدہ ایک بوڑھی عورت ام زغول کو ساتھ لیے آدھی رات کو دجلہ کے پار قصر سدوک کی طرف گئی۔ وہ دونوں راستے میں سنی شیعہ جھگڑوں اور حنبلی شافعی مناقشات پر تبادلہ خیال کرتی رہی تھیں۔ برامکہ کے کھنڈروں کے قریب سے گزرتے ہوئے زبیدہ خوف سے لرزہ براندام تھی۔ کشتی سے اتر کر وہ قصر سیدوک پہنچیں جہاں ام زغول کے کہنے پر زبیدہ نے اس کے ساتھ مل کر عنقود کا نوحہ پڑھا جس کے ختم ہوتے ہی جنوں کے بادشاہ کی روایتی بہو عنقودہ نمودار ہوئی اور زبیدہ سے لپٹ گئی۔ عنقودہ زبیدہ کے حسن کی تعریف کرنے لگی۔ زبیدہ نے وہاں اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس کا ابن عم یوسف ورم گلو اور خناق کے مرض میں مبتلا ہے، اس کے اچھا ہونے کے لیے دعا کرانا چاہتی ہے۔

عنقودہ زبیدہ کو جنت العنقود کی سیر کے بہانے تہہ خانے کے راستے ایک خوب صورت باغ میں لے گئی۔ وہاں اسے سوگوار ضعیفہ ام عنقود سے ملایا۔ پھر ایک قبر پر لے گئی جہاں دس بوڑھے قرآن خوانی میں مصروف تھے۔ زبیدہ کے نوحے پر عنقودہ نے بھی ماتم کیا۔ عنقودہ نے اسے بتایا کہ یہ قرآن خواں جن ہیں۔ اس نے زبیدہ سے کہا یوسف شیعہ ہے، زبیدہ اسے چھوڑ کر کسی سنی سے شادی کر لے یا یوسف کو سنی بنائے۔ عنقودہ کی درخواست پر جنوں نے یوسف کے لیے دعا کی۔ صبح کی اذان ہو رہی تھی کہ عنقودہ نے زبیدہ کو جلدی جلدی تہہ خانے کے خفیہ راستے سے نکال کر ام زغول کے سپرد کیا اور خود غائب ہو گئی۔

بغداد میں عیاروں کے گروہ کے دو رکن طقطقی اور شقشقی لوگوں کو آپس میں لڑانے اور فرقہ وارانہ فساد پھیلانے میں نفریحاً سرگرم عمل تھے۔ عیاروں سے نہ صرف رعایا بلکہ سلطنت بھی خائف تھی۔ خلیفہ المستعصم باللہ کاہل، بزدل اور بخیل تھا۔ وہ سال میں ایک بار حرم سرا سے نکلتا تھا۔ اس کی حرص کا یہ عالم تھا کہ ملک الناصر یوسف والی حلب نے جب ملک الناصر داؤد سے دمشق کی حکومت چھین لی تو داؤد نے خلیفہ کے پاس ایک لاکھ اشرفیوں کی مالیت کے جواہرات وغیرہ امانت رکھوائے لیکن بعد میں خلیفہ نے ان کی واپسی سے انکار کر دیا حتیٰ کہ داؤد نے روضۂ اقدس کی چادر پکڑ کر فریاد کی۔ نجم الدین باذرائے نے جب خلیفہ کو یہ خبر سنائی تو اس نے کہا کہ اس نے اسے یوسف کی قید سے رہائی دلوائی اور ملک شام میں اس کے بھائی

سے اسے ایک لاکھ کی آمدنی کا علاقہ دلوایا ، وہ ان جواہرات کا معاوضہ تھا ۔ علاوہ ازیں خلیفہ نے داؤد کو اپنے پاس رکھا اور اس کی مہمانداری کے مصارف برداشت کیے ۔ اس کے جواہرات میں سے وہ رقم وضع کرکے باقی اسے ادا کر دی گئی تھی ۔ غرض خلیفہ نے زیورات کی واپسی سے صاف انکار کر دیا اور پھر وزیر موید الدین ابن علقمی کو بلوا کر اس سے اپنے فیصلے کی تائید بھی حاصل کی ۔ خلیفہ نے ابن علقمی سے شکایت بھی کی کہ شیعہ لوگ حد سے گزرتے جا رہے ہیں اور سنیوں کا قتل عام کر رہے ہیں ۔ اسی دوران خلیفہ کو معلوم ہوا کہ جواہرات کا بکس اس کی خواب گاہ سے چوری ہو گیا ہے اور اس کی جگہ خلافت کے بارے میں بھی تنبیہہ کا خط لکھا پڑا ہے ۔

یوسف صحت مند ہوگیا اور زبیدہ سے سر راہ ایک ملاقات میں یوسف نے اسے منع کیا کہ وہ جاہل عورتوں کی طرح قصر سیدوک میں منتیں مانئے نہ جایا کرے ۔ زبیدہ نے یوسف سے فرمائش کی کہ وہ اس کی خاطر سنی ہوجائے ، ظاہرداری کے لیے ہی سہی، زبیدہ اس کی جگہ شیعہ ہوجائے گی ۔ اس کے بعد وہ یوسف سے رخصت ہوئی اور اس نے دیکھا کہ اسی وقت ایک بوڑھی عورت یوسف کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئی ۔ زبیدہ اور ام زغول چند ہی قدم آگے بڑھی تھیں کہ سواروں کا ایک غول شور مچاتا آیا اور ان دونوں کو بے ہوش کرکے اٹھا لے گیا ۔ ہوش آنے پر زبیدہ نے اپنے آپ کو قصر سیدوک میں ایک غیر محرم کی گود میں پایا ۔ اس مرد نے اسے بتایا کہ وہ عنقودہ ہے اور اس نے مردانہ بھیس اختیار کر رکھا ہے، وہی اسے اٹھا لائی ہے ۔ عنقودہ نے زبیدہ کو یوسف سے بد گمان کرنے کے لیے دکھایا کہ ایک کوشک میں یوسف ایک نوجوان عورت کو گود میں لیے بیٹھا ہے ۔ زبیدہ افسردہ دل وہاں سے لوٹی اور رات بھر بے چین رہی اس دوران سوچنے پر اسے یوں محسوس ہوا کہ بغداد میں یوسف کو الگ لے جانے والی ضعیفہ کی شکل ام عنقود سے ملتی تھی ۔

اس دوران سیعوں کی ایک حرکت کے خلاف ولی عہد شہزادہ امیر ابوبکر نے بغداد کے سنیوں اور ترک لسکر کو جمع کرکے کرخ پر حملہ کیا ۔ خونریز لڑائی ہوئی اور شیعوں کا زبردست قتل عام ہوا ۔ تین ہزار سے زیادہ مرد قتل ہوئے اور پانچ ہزار عورتیں بچے گرفتار کیے گئے ۔ سیعوں کو اس مصیبت سے بچانے کے لیے ابن علقمی کی ساری کوششیں ناکام رہیں اور وہ اس قتل عام پر رو رو کر دعا کرنے لگا کہ وہ ایسا انتقام چاہتا ہے کہ سارا بغداد آج کا کرخ بن جائے ۔ کرخ کے شیعوں پر اس ظلم کی خبر سن کر دیگر شہروں کے شیعہ اٹھ کھڑے ہوئے ۔ مستعصم باللہ نے ابن علقمی کی چاپلوسی کرکے اسے اس فساد کے روکنے پر آمادہ کیا اور اس کے خوش کرنے کے لیے خلیفہ نے ایک لاکھ ترک فوج میں سے دس ہزار کے سوا باقی سب کو برطرف کر دیا ۔

انھی دنوں ایک شب زبیدہ اور یوسف کی پھر سر راہ ملاقات ہوئی ۔ یوسف نے شکایت کی ، زبیدہ قصر سیدوک میں ایک غیرمحرم سے ہم آغوش تھی ۔ زبیدہ نے تردید کی اور مجبوراً بتایا کہ وہ عنقود کی بیوہ تھی، کوئی مرد نہیں تھا ، یوسف نے بدگمانی برقرار رکھتے ہوئے کہا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ۔ جواباً زبیدہ نے کہا کہ اس نے بھی ایک عورت کو یوسف کی گود میں بیٹھے دیکھا ہے ۔ اتنے میں تین آدمی پیچھے سے آئے اور یوسف کو بے ہوش کرکے اٹھا لے گئے ۔ زبیدہ یہ ماجرا دیکھتے ہی بے ہوش ہوگئی اور جب ہوش آیا تو خود کو عنقودہ کے پاس پایا ۔ عنقودہ نے اسے ڈرا دھمکا کر اور بہتیرے طریقوں سے سمجھایا کہ وہ یوسف کو بھول جائے

پھر ایک صندوق سے ہیرے جواہرات کے متعدد زیورات نکال کر اسے باری باری پہنائے اور چاہا کہ زبیدہ انھیں لے جائے لیکن اس نے انکار کر دیا ۔ عنقودہ سے رخصت ہو کر جب وہ شہر پہنچی تو اسے یوسف نظر آیا جو ایک شخص سے ایک صندوق اٹھوائے لیے جا رہا تھا ۔ زبیدہ نے صندوق کو پہچانا ، اسی میں سے عنقودہ نے اسے زیورات نکال کر پہنائے تھے ۔ اتنے میں ایک شخص نے بڑھ کر یوسف کو ٹوکا اور صندوق کے بارے میں استفسار کیا ۔ جھگڑا بڑھا ، لوگ جمع ہونے لگے حتی کہ سپاہی آ پہنچے ۔ اس دوران ٹوکنے والا اور صندوق اٹھانے والا صندوق پھینک کر غائب ہو چکے تھے ۔ یوسف نے کوتوال کے استفسار پر بتایا کہ وہ صرف اتنا جانتا ہے کہ کسی نے وہ صندوق اسے کوتوال تک پہنچانے کی ہدایت کی تھی ۔ کوتوال نے صندوق پہچان کر کہا کہ یہ خلیفہ کے جواہرات والا صندوق ہے جو خلیفہ کی خواب گاہ سے چوری ہوا تھا ۔ بات پھیلتی گئی خلیفہ خبر سن کر خود آ پہنچا اور جب صندوق کھولا تو جواہرات کی بجائے اس میں خلیفہ کی محبوبہ نسیم السحر بے ہوش ملی ۔ یوسف کو گرفتار کرکے دربار خلافت میں لے گئے ۔ اس نے بہت صفائی پیش کی مگر شنوائی نہ ہوئی ۔ نسیم السحر نے ہوش میں آنے پر بتایا کہ وہ کچھ تاجروں کی چیزیں ملاحظہ کر رہی تھی کہ وہ اسے بے ہوش کرکے اٹھا لے گئے ۔ اس کا خیال تھا یوسف بے گناہ ہے اور یہ سب عیاروں کا کارنامہ ہے جب کہ خلیفہ اسے شعوں کی کارستانی قرار دیتا تھا ۔ یوسف کو محل میں ہی کڑے پہرے میں رکھا گیا ۔

عیاروں نے جب دیکھا کہ نسیم السحر کی مداخلت کی وجہ سے یوسف قتل ہونے سے بچ گیا ہے تو حنبلیوں کو شافعیوں کے خلاف بھڑکاتے ہوئے خلیفہ کو شافعیوں کا طرف دار ٹھہرایا ۔ اس طرح حنبلیوں نے قصر خلافت پر رات کو حملہ کر دیا ، اس دوران عیار یوسف کو نکال لے گئے ۔ مجاہد الدین ایبک اور نجم الدین نادرائے نے خلیفہ کو بگڑتے ہوئے حالات سے متنبہ کرنے کا مشورہ کیا کیونکہ ابن علقمی ہلاکو خان کے ساتھ ساز باز کر رہا تھا اور فوج کی برطرفی اسی سازش کی ایک کڑی تھی ۔ نسیم السحر کے اصرار پر خلیفہ نے دربار کرنے کا فیصلہ کیا لیکن جب سرداروں نے اس کی توجہ ابن علقمی کی سازش کی طرف دلانے کی کوشش کی تو اس نے سننے سے قطعاً انکار کر دیا ۔ اس طرح ابن علقمی اپنی سازش میں کامیاب رہا ۔

یوسف کو لاپتہ ہوئے دو ماہ گزر چکے تھے ۔ زبیدہ اس کے بارے میں جاننے کے لیے بے قرار تھی ۔ دو چار بار قصر سیدوک گئی لیکن عنقودہ نے یوسف کا ذکر بھی نہ چھیڑا ۔ بالآخر ایک دن وہ بہت بے قرار ہوئی اور اپنی خادمہ کو لے کر قصر سیدوک پہنچی ۔ عنقودہ سے درخواست کی کہ وہ جنوں کے ذریعے یوسف کی خیریت معلوم کر دے ۔ عنقودہ نے اس کے لیے یہ شرط رکھی کہ زبیدہ اپنی خادمہ کے ہمراہ آ کر تین دن جنت العنقود میں اس کی مہمان رہے ۔ زبیدہ نے مجبوراً منظور کیا اور والدہ سے اجازت لے کر قصر سیدوک پہنچی، تین رات وہاں جشن طرب کی کیفیت رہی ۔ رخصت کے وقت عنقودہ نے سوسن اور زبیدہ کو ایک کمرے کے راستے باہر نکالا تو انھوں نے خود کو لق و دق صحرا میں پایا ۔ ساتھ ہی آواز آئی کہ عنقودہ نے زبیدہ کی محبت میں چلہ کھینچا اور اب وہ مرد بن گئی ہے اور اس نے اپنا نام مسعود رکھا ہے ۔ وہاں زبیدہ نے صحرا میں یوسف کو بھی خاک اڑاتے دیکھا ، اس کے پاس پہنچی لیکن یوسف نے کوئی توجہ نہ دی اور جو گفتگو کی اس پر زبیدہ چکرا کر گر پڑی ۔ تیسرے دن ہوش آیا تو اپنے گھر تھی اور سوسن نے بتایا کہ بے ہوش ہوتے ہی اسے دو آدمی محافے میں ڈال کر لے آئے تھے جب کہ سوسن کو پھر

انھیں بھول بھلیوں اور دریا کے راستے لایا گیا۔ اس دوران یوسف بھی زبیدہ کے گھر آ کر ملا، اس سے حالات سنے اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ وقت کم ہے تیسرے دن ہلاکو کا حملہ ہوگا اس سے پہلے بہت سا کام کرنا ہے۔

خلیفہ تاتاریوں کی آمد کی خبریں سننے کے باوجود صرف اپنے جواہرات کے بارے میں متردد تھا۔ یوسف ایک حبشی کے روپ میں خلیفہ سے ملا، جواہرات برآمد کرنے کا وعدہ کیا، پانچ ہزار سپاہ ساتھ لی۔ انھیں برامکہ کے کھنڈروں میں چھپا دیا۔ ام زغول کو مجبور کیا کہ وہ زبیدہ اور سوسن کو قصر سیدوک لے جائے۔ جب زبیدہ نے قصر سیدوک میں نوحہ پڑھا تو خفیہ راستے سے مسعود برآمد ہوا۔ اس نے زبیدہ کو ساتھ لے جانا چاہا لیکن ام عنقود آ گئی۔ اس نے مسعود کو برا بھلا کہا اور غصے میں قصر سیدوک کا سارا راز افشا کر دیا۔ اس وقت تک قصر سیدوک کو ہر طرف سے فوج نے گھیر لیا تھا۔ یوسف قریب ہی چھپا ہوا سب باتیں سنتا رہا۔ پھر گرفتاریاں شروع ہوئیں، قصر سیدوک سے ۴۰ مرد اور ۱۵۰ عورتیں گرفتار ہوئیں۔ متعدد چوریوں کا مال اور خلیفہ کے جواہرات کا صندوق برآمد ہوا۔ یوسف زبیدہ کی شادی ہوگئی۔ عیاروں کے سربراہوں کو سزائے موت دی گئی۔ اسی دن تاتاری لشکر بغداد پر حملہ آور ہوا۔ سرداروں نے حسب استطاعت مقابلہ کیا۔ تاتاری لشکر شکست کھا کر بھاگا۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا لیکن رات اسلامی لشکر نشیبی زمین پر تھا کہ ابن علقمی نے فرات کی ایک نہر کا بند تڑوا کر اکثر کو ختم کروا دیا۔ تاتاری لشکر پھر لوٹ پڑا، مجاہد الدین نے خلیفہ کو حرم کے ساتھ دریا کے راستے نکل چلنے کا مشورہ دیا۔ وزیر نے پھر فریب دیا اور خلیفہ چکمے میں آ گیا۔ اس کے مشورے پر امیر ابوبکر کو بھیج کر خلیفہ رہ گیا۔ ہلاکو نے سب مال اسباب قصر سے وہاں منگوایا، پھر قتل عام کیا، خلیفہ کو نمدے میں لپیٹ کر کچلا گیا، ایک شہزادی کو ترکستان بھیجا گیا۔ چار دیواری کے اندر اٹھارہ لاکھ آدمی قتل ہوئے۔ وبا پھیل گئی۔ یوسف زبیدہ بھی بغداد چھوڑ گئے۔ ابن علقمی آخر ہلاکو خاں کے ہاتھوں ذلت کی موت مرا۔ عباسی شہزادی سمرقند میں اپنی جد اعلیٰ قثم بن عباس کے روضے پر دم توڑ گئی۔

تحقیقی جائزہ:

زوال بغداد کا موضوع بغداد میں ساتویں صدی ہجری میں سنی شیعہ فسادات، حنبلی شافعی مناقشات اور مختلف عیاروں کی سرگرمیاں ہے۔ شرر نے ان اختلافات کا ہولناک نتیجہ بغداد پر ہلاکو خان کا حملہ اور بغداد کی تباہی بیان کیا ہے۔ جیسا کہ سطور ما قبل میں بیان ہوا، شرر نے وزیر موید الدین ابن علقمی کو اس سازش کا سرغنہ قرار دیا ہے۔ مختلف کتب تواریخ میں اس سے متعلق جو بیانات ملتے ہیں ان میں سے بعض درج ذیل ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناول کا تاریخی حصہ بہت حد تک صداقت پر مبنی ہے۔ بغداد کی تباہی سے متعلق مولف طبقات ناصری کا بیان یہ ہے:

''امیر المومنین المستعصم باللہ را وزیری بود بدمذہب و رافضی اسم او احمد العلقمی بود و میان او و پسر مہتر امیرالمومنین کہ امیر ابوبکر نام بود بسبب غارت روافض کہ ساکنان کرخ و مشہد موسیٰ جعفرؒ بودند خصومتی افتادہ بود و امیر ابوبکر پسر امیرالمومنین ایشان را غارت کردہ بود و بعضی را کشتہ بود، بدان انتقام وزیر دارالخلافہ کہ رافضی و بدمذہب بود با امیرالمومنین خلاف کرد در سرو خفیہ نزیک ہلاو

مکتوبات نوشت و بایشان بساخت و کفار را استدعا کرد و لشکر های گرد برگرد عراق را بطریق اجازت از بغداد باطراف فرستاد و بر رای امیرالمومنین چنان نمود که با کفار صلح افتاده است ما را بلشکر حاجت نیست ـ بعد ازان که بغداد از لشکر خالی گشت نا گاه لشکر کفار مغل بحوالی بغداد رسیدند و از ملک موصل خرسته بودند و بر زبردست بغداد جسربستند و از دجله بگذشتند و تکریت قلعهٔ بود در غایت استحکام غازیان تکریت بیرون آمدند و آن جسر را سوختند ـ روزی دیگر مغلان باز جسر راست کردند و مسلمانان را شهید کردند امیرالمومنین ابوبکر پسر امیرالمومنین و امیر علم دارالخلافه سلیمانشاه ایوانی ترکمانی که مدت سی سال با کفار مغل تیغ زده بودند و غزوه ها سست کرده بر دو بموافقت یکدیگر چند کرت بر کفار زدند و لشکرهای کفار را منهزم گردانیدند و کرت نخستین کفار مغل را از حدود بغداد تا باصفهان تعاقب نمودند و بسیار از لشکر کفار بدوزخ فرستاد ـ

. . . . آن ملعون مدبر رافضی چون عصیان و ارتداد در مزاج و طبیعت داشت لشکر گرد بغداد اجازت کرده بود وبرسایان بغداد بم در سر با بلاؤ یار شده بودند و مکتوبات نبشته بودند و لشکر های کفار را استدعا نموده و از حال احتیال وزیر ملوک و بندگان خلیفه را که سلاطین بودند معلوم شده بود و یک کرت مکتوب وزیر که بنزدیک بلاو ملعون نشته بود برخلیفه عرضه کردند برنوع قصد ایشان حمل کرد و سبب آن بود که میان وزیر و سلطان مجاهد الدین ایبک سر دواتدار منازعتی و مخالفتی بود ـ سر دواتدار مخالفت وزیر را با پسر خلیفه امیر ابوبکر بسبب کشتن روافض معلوم داشت واین معنی را بسمع مبارک امیرالمومنین میرسانید ـ وزیر را چون سعی سردواتدار معلوم شد بخدمت خلیفه چنان نمود که سردوادار میخواهد تاترا از خلافت دور کند و امیر ابوبکر را بخلافت بنشاند ـ امیرالمومنین را چون سعی بر دو طرف معلوم شده بود سخن بیچکدامی در سعی یکدیگر التفات نمی کرد ـ چون ملوک مکتوب وزیر که بنزدیک بلاو نشته بود بخدمت خلیفه باز نمودند جواب داد که این سعی ایبک سردوادار باشد و الا وزیر ازین بات نکند ـ ملوک ازین جواب افسرده شدند تا چون بلاو بده فرسنگی بغداد رسید سلیمان شاه که امیر علم بود و ملک عزالدین پسر فتح الدین گرد که پهلوان دارالخلافه بود و میمنه لشکر خلاف ایشان داشتند باسلطان مجاهد الدین ایبک سردواتی مستنصری مشورت کردند که کار از دست بشد وخصم زبردست نزدیک آمد وزیر مخالف با اعدا بساخت امیرالمومنین را باز باید نمود تا تدبیر دفع کفار بسازد ـ مجاهد الدین ایبک گفت هر سخن که درین باب امکان داشت من گفتم در سمع امیرالمومنین جایگیر نیامد، باقی شمارا هم اجازت خلوتی طلب کنم ـ شما هر دو عرضه داشت کنید ـ درآن طریق ملک سلیمانشاه و ملک عزالدین هر دو از رسیدن خصم و طلب دفع و تدبیر آن بخدمت خلیفه عرضداشتند، فرمود که باوزیر گفته شده است، جواب از وزیر باید طلب کرد ـ هردو از بارگاه خلافت نومید بیرون آمدند و باجوبودن باهشتاد هزار سوار از طرف ایران و آذربیجان زبردست بغداد جسری از ملک موصل حاصل کرد و بنزدیک تکریت جسری بربست ـ غازیان تکریت از شهر و قلعه بیرون آمدند و جسر بستهٔ کفار را تمام بسوختند و کفار بسیار در دوزخ فرستاند و اندک مسلمانان شهادت یافتند ـ دیگر روز کفار مغل باز جسر را عمارت کردند چنانچه بتحریر پیوسته و یکدیگر بطرف کوفه و دجله و کرخ بدوانیدند و خلق را شهید کردند، و ملک عزالدین و مجاهدالدین دواتی باتیست هزار سوار از بغداد بردجله درگزشتند و جماعت ساکنان کرخ و قصبات دیگر را بمدد طلب نمودند بالشکر کفار مصارف کردند ـ چون حشم اسلام را پیاده بسیار بود بیش جمله کفار جلاوت نمودند ـ بزیمت برلشکر کفار افتاد و بسیار بدوزخ رفتند و ملک عزالدین بسیار جهت نمود که بزیمت کفار را تعاقب باید کرد تاهم بدین فتح بقایای کفار را زیر تیغ گردانیده شود، مجاهد الدین ایبک در تعاقب تانی نمود آن شب بیابها لشکرگاه مسلمانان شد و در جوار آن موضع شهریست که آنرا شهر شیر گویند از آب فرات شق شود و زمین آن شهر رفعتی دارد و موضع لشکرگاه مسلمانان در پستی بود، درآن شب وزیر رافضی ملعون جماعتی را فرستاد تا آب مهر برلشکرگاه مسلمانان بکشادند، تمام لشکر در زیر آب شد و سلاح شان تباه گشت و عاجز شدند بامدادان لشکر کفار معاودت کردند و مصاف شد مسلمانان از غایت اضطرار و زحمت سپاه منهزم شدند ملوک اسلام شکسته از دجله عبره کردند و ببغداد لشکرگاه کردند بموضعی که جامع و قصر سنجریست چون لشکر ملاعین بدانجا رسید سلیمان شاه و ملک عزالدین و مجاهد الدین دواتی بخدمت خلیفه آمدند که خصم بردر شهر رسید و مارا در بغداد سوار اندک است و عدد کفار دویست هزار یا زیاده است ، صواب آن باشد که امیرالمومنین در کشتی نشیند و خزائن و حرمها را در کشتی نشاند و ماهم در خدمت امیرالمومنین

در کشتی باشیم و در دجله برانیم تا حد بصره در آن جزائر مقام کنیم تا نصرت حق تعالیٰ در رسد و کفار را مقهور گرداند ـ خلیفه باوزیر این معنی گفت ـ وزیر ملعون امیرالمومنین را رضی‌الله عنه گفت که من با ایشان طریق صلح کرده ام بدین حاجت نیست و ایشان بخدمت امیرالمومنین آیند اگر برقول من اعتماد نیفتد امیر ابوبکر را بایشان باید فرستاد تا مزاج هلاو مغل معلوم کند ـ امیرالمومنین را این رای صواب افتاد، پسر خود امیر ابوبکر را فرستاد و وزیر ملعون در سر معتمدی را بر هلاو فرستاد که امیر ابوبکر را خدمت بسیار کن و اعزاز و اکرام دار و استقبال کن که خلیفه اعتماد کند و غرض تو بحاصل شود ـ چون امیر ابوبکر بیرون آمد و بلشکرگاه هلاو رسید هلاو بقدر چهل گام استقبال کرد و شرط خدمت باقامت رسانید و ببرد برجای خود بنشاند و برانوی حرمت در خدمت امیر ابوبکر بنشست و گفت که من خدمت نمودن آمده ام، بندگی خواهم کرد برکا که عم من است بردست شیخ سیف‌الدین باخرزی ساحوری مسلمان شده است، من نیز مسلمان خواهم شد، امرای خود را پرسدم که بزرگترین مسلمانان کیست، مرا بحضرت خلافت نشان دادند، من آمده ام تا بردست امیرالمومنین مسلمان شوم ـ چون کلمات شیرین درمیان آورد امیر ابوبکر بدین مزخرفات زهر آلود اعتماد کرد و از انجا باعزاز تمام بخدمت امیرالمومنین باز آمد و آنچه مشاهده کرده بود و شنیده تمام عرضه داشت ـ وزیر ملعون گفت که صواب آنست که امیرالمومنین باتعظیم هرچه در موکب خلافت بیرون برود تا هلاو مغل شرط استقبال و خدمت بجا آورد ـ هرچند ملوک اسلام امیرالمومنین را گفتند اعتماد نمی باید کرد، تقدیر آسمانی و قضای سبحانی در رسیده بود، بهیچ وجه منع آن مسلمانان عاری مفید نیامد، بعاقبت قضا باریانه قهر در عقب مرکب خلافت میزد تا امیرالمومنین بایک هزار و دویست سوار معروف از ملوک و صدور و علما و اکابر و تجا و کارداران دولت بیرون رفت، چون بلشکرگاه هلاو مغل ملعون در رسید او را با آن موکب بموضعی بداشتند و جمله را از هم متفرق گردانیدند و امیرالمومنین را بگرفتند و فرمان داد تا بقلم خود بقایای معارف که در بغداد بودند فرمان می نبشت تا بیرون می آمدند تا تمام را بدست آورد و همه را شهید گردانید و این جا در کشته شدن امیر ابوبکر چند روایت است والله اعلم، یک روایت آنست که او را و سلیمانشاه را و فتح الدین کرد را و مجاهد الدین ایبک دواتی را جمله را شهید کردند ـ و بعضی روایت می کنند که چون از نزدیک هلاو بخدمت پدر باز رفت در وقتیکه امیرالمومنین بیرون می رفت امیر ابوبکر بیرون نرفت و از بغداد بطرف بادیه و جانب شام رفت ـ و بعضی میگویند که شهادت یافت بسبب آنچه در حضور هلاو کلمات درشت گفت و این کلمات آن بود که مارا گمان افتاد که چون ترا اصل بزرگ است تو مرد تمام بانسی و بادشاه بزرگ، برقول تو اعتماد کردیم اکنون معلوم شد که تو نه بادشاهی و نه مردی چون غدر کردی که بادشاهان و مردان غدر نکنند ـ هلاو فرمود تا او را شهید کردند ـ و بعضی روایت میکنند که امیر ابوبکر را بایکی از سادات بزرگ فرمان داد تا بطرف آذربیجان برند . . چند منزل برفت مرتدان با هلاو گفتند که خطا کردی اگر امیر ابوبکرسلامت باذربیجان رسد جمله لشکر های روم و شام و مغرب باو جمع شوند و هرائینه انتقام خود بکشد در عقب کسان خود فرستاد و او را باز آورد و شهید کرد ـ

کفار چند روز امیرالمومنین المستعصم بالله را خواستند تا نگاه دارند، جماعت مسلمانان که درمیان لشکر مغل بودند گفتند که اگر هلاو خون این خلیفه برزمین ریزد او و لشکر کفار مغل در زلزله بزمین فرو شوند او را نباید کشت و غرض آن مسلمانان این بود که امیرالمومنین زنده بماند، جمله را در کشتن او توقف افتاد مگر ملک موصل بدرالدین لولو و دیگر کفار با هلاو مغل گفتند اگر خلیفه زنده ماند جمله مسلمانان که درمیان لشکر اند و این طائفه که بدیگر بلاد اند خروج کنند و او را خلاص دهند و ترا که هلاوی زنده نگزارند ـ هلاو ازان ترسید که اگر خلیفه زنده بماند خروج مسلمانان را باشد و اگر بتیغ کشته بشود چون خون او بر زمین برسد زلزله برزمین افتد و خلق هلاک شوند قصد کشتن امیرالمومنین بنوع دیگر پیش گرفت و بگفت تا او را در محافظت جامخانها بپیچیدند و لگد برتن مبارک او میزدند تا هلاک شد و امیر ابوبکر پسرش را و امیر اعظم سلیمانشاه را شهید کردند و جمله ملوک حضرت خلافت مگر پسر خرد امیرالمومنین را و جمله خزائن بغداد که حصر و حد آن اموال در حوصلهٔ تحریر قلم و در دائره تقریر بنی آدم نگنجد برگرفت از نقود و جواهر و ظرائف و مرصعیه جمله را بلشکرگاه خود برد و آنچه از نقود لائق منقو خان بود با بعضی از حواری و حرم خلیفه و یک

دختر خلیفہ بطرف ترکستان روان کرد . . . . چون ان اموال و در مہا بشہر سمرقند برسید دختر خلیفہ از فرمان وی کہ برسر ایشان موکل بود اجازت طلبید کہ یکی از اجداد مرا روضۂ در سمرقند است یعنی قثم بن عباسؓ تا او را زیارت کردہ آید۔ این موکل فرمان دہ او را اجازت داد با آن معصومہؓ بسر روضہ قثم بن عباس آمد و شرائط زیارت بجا آورد و دو رکعت نماز بگذارد و روی بر زمین نہاد و دعا کرد کہ خداوندا اگر این قثم بن عباس کہ جد من است در حضرت تو آبروی دارد جان این بندہ را بحضرت خود بری و از دست این نا محرمان مرا خلاص بخشی، در اجابت کشادہ شد و ہمدران سجدہ جان پاک را بحضرت باری تعالیٰ فرستاد . . . . چون وزیر ملعون ببغداد باز آمد و بعضی را ازان خلق جمع کرد و در بغداد ساکن گردانید و بعضی از بندگان خلیفہ کہ بوادی رفتہ بودند و زندہ ماندہ بقدر دہ ہزار سوار جمع شدند و ناگاہ از دجلہ عبرہ کردند و بر بغداد زدند و وزیر ملعون و شحنۂ کفار را بگرفتند و ہر دو را قطعہ قطعہ کردند و ہر کہ از اتباع آن ملاعین بدست آمد و ترسایان بغداد حملہ را برگرفتند و بدوزخ فرستادند . . و بعضی روایت می کنند کہ ہلاو وزیر را فرمود کہ دولت تو از کہ بود؟ وزیر گفت کہ از دارالخلافہ۔ ہلاو گفت چون حق نعمت منعمان خود محافظت نکردی مرا ہم نشای۔ فرمان داد تا او را بدوزخ رسانیدند، واللہ اعلم۔"[1]

جلال الدین سیوطی نے بھی تاریخ الخلفا میں اسی قسم کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ابن علقمی کو اس سازش کا سرغنہ قرار دیا ہے [ص ۵۶۳ تا ۵۷۱]۔

میجر ریورٹی نے طبقات ناصری کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے اس کے مبسوط حواشی بھی لکھے ہیں۔ میجر ریورٹی لکھتا ہے کہ موید الدین محمد بن عبدالملک علقمی استاد دربار تھا اور ۶۴۲ھ میں اسے ناصرالدین محمود کی جگہ اسے وزیر بنا کر خلیفہ مستعصم نے بغداد کے زوال کے اسباب پیدا کیے اور یہ سب سے بڑی غلطی تھی[2]۔ ابن علقمی کے بارے میں میجر ریورٹی لکھتا ہے کہ یہ وزیر دانا، چالاک، اچھا شاعر تھا۔ تمام حکومت براہ راست اس کے زیر اثر تھی، وہ مذہباً شیعہ تھا اور عباسی خلافت سے در پردہ بغض رکھتا تھا، وزیر کو اس بات کا بھی دکھ تھا کہ امراء اس کی ویسی تعظیم نہیں کرتے جیسی کرنی چاہیے، چنانچہ اس ضمن میں خلیفہ نے بھی امراء کو رویے کی اصلاح کی ہدایت کی لیکن ابن علقمی کے دل میں درباریوں، امراء اور خلیفہ سے عداوت بڑھتی گئی، مگر یہ سب اس نے دل میں اس طرح چھپائے رکھا کہ کوئی شک بھی نہ کر سکے۔ حالات بگڑتے جا رہے تھے اور خلیفہ کا بیٹا امیر ابوبکر خلیفہ کی کمزوری کی بدولت سنیوں کا سردار بنا ہوا تھا۔ غربی بغداد کے محلے کی شیعہ آبادی میں بنی ہاشم کے چند لوگوں کا شیعوں کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ اس سے سنی شیعہ فساد شروع ہوا اور امیر ابوبکر نے شیعوں کی سرکوبی کے لیے فوجی دستے بھیجے۔ میجر ریورٹی اس فعل کو غیردانشمندانہ اور ناپسندیدہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امیر ابوبکر کی ہدایت پر ان لوگوں نے شیعوں کی خواتین کے ساتھ ایسا سلوک کیا گویا وہ کفار کی خواتین تھیں اور مال غنیمت میں ملی تھیں۔ وہ انھیں گھوڑوں پر اپنے آگے بٹھا کر بازاروں سے اس طرح گزرے کہ وہ سر اور پاؤں سے برہنہ تھیں۔ ابن علقمی اس واقعے سے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا۔ وہ انتقام کی آگ میں جلتا رہا اور اس کے ذرائع پر غور کرتا رہا[3]۔ سنیوں سے انتقام لینے کی اسی فکر میں اسے معلوم ہوا کہ ہلاکو ملاحدہ کے استیصال کے بعد عراق عرب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے موقع کو غنیمت جانا اور مغلوں کو بلا مزاحمت بغداد کا قبضہ دلانے کے منصوبوں پر عمل شروع کر دیا۔ اس نے ہلاکو سے نامہ و

۱۔ منہاج سراج: طبقات ناصری (فارسی) مرتبہ کپتان ناسویس، ص ۴۲۳ تا ۴۳۳۔

۲۔ طبقات ناصری، ترجمہ میجر ریورٹی (انگریزی) حاشیہ، ص ۱۲۲۷۔ ۳۔ ایضاً: حاشیہ، ص ۱۲۲۹۔

پیغام کا آغاز کیا اور اسے معلومات بہم پہنچانی شروع کیں ۔ ادھر اس نے خلیفہ کو چکمہ دیا کہ اب ہر طرف امن و امان ہے، کوئی دشمن نہیں، اس لیے فوج کا خرچ برداشت کرنا دانشمندی نہیں اور تجویز پیش کی کہ فوج کو برطرف کرکے فوجی افسروں کو نواحی علاقوں میں سول فرائض پر مامور کر دیا جائے ۔ اس وقت خلیفہ کے لشکر میں ایک لاکھ چوبیس ہزار سوار تھے ۔ خلیفہ نے دولت کے لالچ میں آ کر ان باتوں کو ہمدردی اور بہی خواہی پر مبنی تصور کیا اور غدار وزیر کو اپنے منصوبے پر عمل کی اجازت دے دی ۔ تھوڑے ہی عرصہ میں دارالخلافہ فوج سے خالی ہوگیا ۔ تب اس نے ہلاکو کو حالات سے باخبر کرکے اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے بغداد پر حملے کی دعوت دی ۔ ہلاکو نے اولاً ان باتوں پر چنداں اعتماد نہ کیا لیکن ابن علقمی کی طرف سے مسلسل ایسے پیغامات پر اس نے خواجہ نصیرالدین طوسی سے مشورہ کیا جو اب ہلاکو کا معتمد تھا ۔ وہ بھی شیعہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا اور عباسی خاندان سے اسے ذاتی وجوہ کی بنا پر مخاصمت بھی تھی، اس لیے وہ بھی اس سازش میں شریک ہوگیا ۔ بعد میں براہ راست اس کے اور ابن علقمی کے درمیان نامہ و پیام ہونے لگا اور پھر خواجہ نے شبھ لگن کی پیش گوئی کی ۔ ہلاکو نے ۱۰ رمضان ۶۵۵ھ کو خلیفہ کو پیغام بھیجا کہ اس نے ملاحدہ کے خلاف اس کی مدد کیوں نہیں کی[1] ۔ اس پیغام میں دھمکی اور مطالبات کے علاوہ شہر کی فصیلوں کو منہدم کر دینے، خندقوں کو بھرنے اور حکومت بیٹے کے سپرد کرکے خود حاضر ہونے کی تاکید کی تھی ۔ نیز یہ کہ اگر خود نہ آئے تو وزیر، سردواندار اور سلیمانشاہ کو بھیجے، مؤخرالذکر دو اور سلیمانشاہ کی حاضری خصوصیت کے ساتھ ضروری قرار دی گئی کیونکہ وہ ہلاکو کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا ۔ بصورت دیگر جنگ کے لیے تیار ہوجانے کا چیلنج ۔ خلیفہ نے اس کے جواب میں تکبر کا مظاہرہ کیا اور کچھ لوگوں نے پیامبروں کو شہر کے باہر رسوا کرنا شروع کیا ۔ ابن علقمی نے خبر پا کر اپنے غلام دوڑائے، انہیں چھڑایا اور بحفاظت روانہ کیا تاکہ ہلاکو تک اس کی وفاداری کی روداد پہنچے ۔ وزیر نے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ دولت اور تحفے تحائف سے کام لے کر وہ ہلاکو کو اپنا دوست بنا لے ۔ اس نے تجویز کیا کہ ایک ہزار تھان ریشمی کپڑوں کے، ایک ہزار عمدہ اونٹ، ایک ہزار عرب گھوڑے ہلاکو کے لیے اور مغل شہزادوں اور امراء کے لیے مناسب تحفے بھیجے جائیں ۔ نیز معافی مانگ کر ہلاکو کا نام خطبہ میں شامل کر لیا جائے اور اس کے نام کا سکہ چلایا جائے ۔ مگر مجاہدالدین اور دیگر نے مخالفت کی[2] ۔ رشیدالدین مؤلف جامع التواریخ کے خیال میں مجاہدالدین وغیرہ کی اس تجویز سے مخالفت محض ابن علقمی سے دشمنی کی بنا پر تھی ۔ وہ انہیں بدمعاشوں کے نام سے یاد کرتا ہے ۔

میجر ریورٹی لکھتا ہے کہ مجاہدالدین ایبک سردواندار جانتا تھا کہ وزیر غدار ہے، اس لیے اس نے خلیفہ کو سب امور بتا کر کہا کہ اس طرح وزیر اپنی فرماں برداری کے اظہار کے علاوہ دیگر امراء کو وہاں بھیج کر مروانا چاہتا ہے ۔ دیگر امراء نے بھی اس کی تائید کی اور خلیفہ کو اس امر سے باز رکھا ۔ نیز سردواندار نے برطرف شدہ فوج کو فوراً واپس طلب کرکے بحال کرنے کی تجویز پیش کی، لیکن اس معاملے میں خلیفہ پھر وزیر کی مکاری اور اپنی بدقسمتی سے مات کھا گیا[3] ۔

۱۔ طبقات ناصری، ترجمہ میجر ریورٹی (انگریزی) حاشیہ، ص ۱۲۳۰ ۔ ۲۔ ایضاً : حاشیہ، ص ۱۲۳۱۔
۳۔ ایضاً : حاشیہ، ص ۱۲۳۲ ۔

میجر ریورٹی روضۃ الصفا، تاریخ الفی اور دیگر مورخین کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اوکتائی خان کے ابتدائی عہد میں مغلوں نے دو بار بغداد کا رخ کیا اور ہزیمت اٹھائی تھی۔ اس لیے اب اگر بغداد کے اندر سے غداری نہ ہوتی تو وہ کبھی ادھر کا رخ کرنے کی ہمت نہ کرتے۔ نیز اب انھیں یہ بھی علم تھا کہ جو فوج انھیں شکست دیا کرتی تھی وہ اب برطرف ہو چکی ہے[1]۔

میجر ریورٹی نے جامع التواریخ کے مؤلف پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے حقائق کے بیان میں انتہائی جانب داری سے کام لیا ہے[2]۔ اس نے یہ تاریخ ہلاکو کے نام معنون کی ہے اور وزیر کی غداری کا کہیں معمولی سا ذکر بھی نہیں کیا بلکہ سردواندار جیسے لوگوں کو غدار کہا اور ان پر بے جا الزامات عاید کیے ہیں[3]۔ ریورٹی لکھتا ہے کہ رشید الدین بے خیالی میں ایک جگہ سردواندار کی یہ گفتگو لکھ گیا ہے کہ اس نے خلیفہ کے حضور اپنی بے گناہی پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اگر وہ غدار ہے تو یہ تلوار ہے اور یہ سر حاضر ہے، لیکن وزیر درحقیقت غدار ہے اور مستقلاً ہلاکو سے نامہ و پیام کر رہا ہے۔ بے خیالی میں یہ فقرے لکھ جانے کے بعد رشیدالدین انھیں سردواندار کے خلاف استعمال کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ ریورٹی رشیدالدین کے علم کی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی لکھتا ہے کہ جہاں کہیں اس کے مغل آقاؤں یا اس کے اپنے مفاد کا تعلق ہے اس کے بیانات ناقابل اعتماد ہیں البتہ طبقات ناصری کے مصنف نے جو ہم عصر تھا صحیح حالات پیش کیے ہیں[4]۔

میجر ریورٹی نے حسام الدین حاکم درہ تنگ کو بھی خلیفہ کے خلاف سازش میں شریک قرار دیا ہے۔ ابتدا میں اس نے ہلاکو کے ساتھ تعاون کیا لیکن خلیفہ کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ اس کی حوصلہ افزائی کرے تو وہ اپنی ایک لاکھ فوج کو ہلاکو کی راہ میں دیوار بنا دے گا اور ایک مغل بھی بغداد کی طرف نہ بڑھ سکے گا۔ خلیفہ نے وزیر سے مشورہ لیا اور چونکہ یہ بات وزیر کے منصوبوں کے خلاف تھی اس لیے اس نے ایک طرف تو حسام الدین کی دل شکنی کی دوسری طرف ہلاکو کو صورت حال سے مطلع کر دیا چنانچہ ہلاکو نے اپنے بیٹے کو اس پر مامور کیا جس نے حسام الدین سے وفاداری کے امتحان کے بہانے قلعے خالی کروا لیے، لشکر منتشر کروا دیا، قلعے منہدم کروا دیے اور بالآخر حسام الدین کو اس کے ساتھیوں سمیت قتل کروا دیا[5]۔

ریورٹی کے بیان کے مطابق ہلاکو نے بغداد کو دو طرف سے گھیرنے کے لیے لشکر بھیجے لیکن خود راستے سے واپس ہو کر ۱۲ رجب ۶۵۶ھ کو ہمدان پہنچا کیونکہ ابھی ابن علقمی کی سازش مکمل نہیں ہوئی تھی۔ وہاں سے پھر دھمکی آمیز پیغام بھیجے، ادھر تاجو ۱۱ محرم کو دجلہ کو عبور کرکے نہر عیسیٰ پر پہنچا۔ خلیفہ نے باخبر ہوتے ہی فتح الدین، مجاہد الدین وغیرہ کو بیس ہزار سواروں کے ہمراہ مدافعت کو بھیجا جنھوں نے ۹ فرسخ کے فاصلے پر انبار کے مقام پر بوقا تیمور کی فوج سے جنگ لڑی۔ الفی کے مطابق مغل ہزیمت اٹھا کر بھاگ گئے۔ مغلوں کے جانب دار مؤرخین اس قصے کو اپنے رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ مجاہدالدین ناتجربہ کار تھا اس نے عزالدین کو بھی تعاقب پر مجبور کیا نتیجہ یہ ہوا کہ کھلے میدان میں پہنچ کر مغل پھر مڑے اور تاریکی پھیلنے تک جنگ جاری رہی۔ رات کو مغلوں نے فرات کا ایک بند توڑ کر پانی چھوڑ

۱۔ طبقات ناصری، ترجمہ میجر ریورٹی (انگریزی)، حاشیہ، ص ۱۲۳۳۔ ۲۔ ایضاً: حاشیہ، ص ۱۲۳۵۔
۳۔ ایضاً: حاشیہ، ص ۱۲۳۶۔ ٤۔ ایضاً: حاشیہ، ص ۱۲۳۶۔ ۵۔ ایضاً: حاشیہ، ص ۱۲۳۸۔

دیا اور اسلامی لشکر کی کثیر تعداد سوتے میں غرق ہوگئی ۔ صبح مغلوں کی بڑی تعداد نے حملہ کیا عزالدین مارا گیا، مجاہدالدین تین آدمیوں کے ساتھ بغداد پہنچا[1] ۔ میجر ریورٹی اس جانبدارانہ بیان پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ فرات کا بند کاٹنے کا کام کسی ایسے آدمی کے بغیر نہیں ہو سکتا جو اس علاقے کے جملہ نشیب و فراز سے واقف ہو اور یہ کارنامہ مغلوں کا نہیں غدار وزیر کا تھا[2] ۔ الفی اسے ۱۰ محرم کا واقعہ قرار دیتا ہے ۔ رشیدالدین کے مطابق ہلاکو ۱۱ محرم کو بغداد کے سامنے خیمہ زن تھا جب کہ ریورٹی انھیں ایک ماہ پیشتر ذی الحجہ کے واقعات قرار دیتا ہے۔

میجر ریورٹی کے بیان کے مطابق لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا، خلیفہ نے دروازے بند کر دینے کی ہدایت دی اور پہرہ سخت کر دیا ۔ امراء اور عوام تیار ہوکر ہدایات سننے آئے ۔ دوسری صبح سویرے جنگ شروع ہوئی ۔ تیروں اور پتھروں کا مینہ برسنے لگا ۔ دونوں طرف کئی ہلاک و مجروح ہوئے ۔ فریقین نے رات کو اپنی حالت درست کی دوسری صبح پھر جنگ شروع ہوئی اور پچاس دن جاری رہی ۔ شیعوں نے کچھ آدمی ہلاکو کے پاس خط دے کر بھیجے جن میں اپنے بزرگوں کی پیش گویوں اور ہلاکو کی فتح کے یقینی ہونے کے بارے میں لکھا۔ ہلاکو بہت خوش ہوا اور حلہ کے لوگوں کو امان دی ۔ اپنا شحنہ ساتھ بھیجا اور اس طرح وہ بچ گئے ۔ ہلاکو نے شعوں کو خوش کرنے کے لیے سو مغل نجف میں ان کے مقابر کی حفاظت کے لیے بھیجے ۔ ریورٹی نے حواشی میں جنگ کی بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں اور سلیمانشاہ و مجاہدالدین کی شہادت کے بارے میں مختلف روایات درج کی ہیں۔ امیر ابوبکر کے ساتھ ہلاکو کے پہلے سلوک کے سلسلے میں طبقات ناصری کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے میجر ریورٹی لکھتے ہیں کہ یہ کچھ بعید ازقیاس نہیں ۔ جنگ کو دو ماہ ہو چلے تھے، خلیفہ بہت مشکل میں تھا، وزیر سے مشورہ کیا تو اس نے ہلاکو کی بڑھتی ہوئی قوت سے مزید خوف زدہ کرتے ہوئے ہلاکو کے سامنے حاضر ہو جانے کا مشورہ دیا، یہ بھی کہا کہ خلیفہ دولت دے کر عزت اور حکومت بچا لے کیونکہ ہلاکو تو محض دولت حاصل کرنے آیا ہے ۔ یہ بھی کہا کہ ہلاکو اپنی بیٹی سے امیر ابوبکر کی شادی کرنا چاہتا ہے اور اسی طرح خلیفہ ہلاکو کے بیٹے کے لیے رشتہ دے کر لوگوں کو تباہی سے بچا سکتا ہے ۔ خلفیہ اس کی باتوں میں آگیا اور ۴ صفر (۹ فروری) کو علماء، قاضیوں، رؤسا و امراء کے ساتھ جن کی تعداد تین ہزار تھی اپنے چار بیٹوں سمیت روانہ ہوا ۔ خلفیہ، اس کے بیٹے اور چار پانچ ملازموں کو اندر داخل ہونے دیا گیا باقی سب تقسیم کر دیے گئے ۔ ہلاکو نے گرمجوشی سے رسمی گفتگو کی ۔ خلیفہ کو کہا کہ وہ اپنے آدمی بھیج کر لوگوں کو ہتھیار پھینک دینے کا کہے ۔ وزیر اور ہلاکو کی اس سازش پر بڑی تعداد میں لوگ ہتھیار پھینک کر مغل کیمپ کی طرف بڑھے اور قتل کر دیے گئے ۔ دوسرے دن ہلاکو نے شہر میں قتل عام کا حکم دیا ۔ شہر مسمار ہونے لگا، حرم سرا تباہ، مسجدیں، لائبریریاں، ہسپتال، کالج سب نذر آتش کر دیے گئے[3]، تاریخ گزیدہ کے مطابق ایک مغل مباچھو نے ایک گلی میں چالیس شیرخوار بچے دیکھے اور قتل کر دیے ۔

۱۶ صفر کو ہلاکو شہر میں داخل ہوا ۔ اکثر مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ بغداد میں تاتاریوں کے ہاتھوں اٹھارہ لاکھ آدمی قتل ہوئے[4] ۔

۱- طبقات ناصری، ترجمہ میجر ریورٹی (انگریزی)، حاشیہ، ص ۱۲۳۹، ۱۲۴۰

۲- ایضاً: حاشیہ، ص ۱۲۴۱- ۳- ایضاً: حاشیہ، ص ۱۲۰۷ تا ۱۲۵۲ ۔ ٤- ایضاً: حاشیہ، ص ۱۲۵۵-

لی سٹرینج نے بغداد پر اپنی تصنیف میں ہلاکو کے بغداد پر حملے کی تفصیلات بیان کی ہیں جو بہت حد تک طبقات ناصری سے ملتی ہیں ۔ لی سٹرینج کے مطابق پچاس دن بغداد کا محاصرہ جاری رہا[۱] ۔

ناول میں رومانی قصے کے افراد کے ناموں کے علاوہ جن تاریخی شخصیتوں کا ذکر آیا ہے ان کے نام اور عہدے طبقات ناصری، رشیدالدین اور دیگر معاصر مورخین کے یہاں ملتے ہیں ۔ چوتھے باب میں شرر نے بغداد میں شروع سے ہی سنی شیعہ چپقلس کا جو تاریخی پس منظر بیان کیا ہے وہ بھی تاریخی اعتبار سے مستند ہے ۔ اب سطور ذیل میں ہم اس ناول میں بیان کردہ مقامات کی بحث کریں گے اور جغرافیائی صداقتوں کا جائزہ لیں گے ۔

پہلے باب میں شرر نے لکھا ہے کہ بغداد دجلہ کے دونوں کناروں پر آباد ہے ۔ لی سٹرینج کی کتاب کے سات نقشے اس کی تصدیق کرتے ہیں[۲] ۔ شرر نے لکھا ہے کہ مغربی پہلو کرخ یا غربی بغداد کہلاتا ہے ۔ یہ بات بھی صحیح ہے، لی سٹرینج لکھتا ہے :

"Karkh, which further at this time gave its name in general paralance to all that half of Baghdad which lay on the Western Bank".[۳]

شرر نے لکھا ہے کہ غربی بغداد میں جامعہ منصور کا بلند مینار نظر آتا ہے ۔ یہ امر صحیح ہے ۔ لی سٹرینج کی کتاب میں نقشہ II (بمقابل ص ۱۵) شق ۱ و نقشہ نمبر VIII (بمقابل صفحہ ۲۶۳) شق ۳۸ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے[۴] ۔ لی سٹرینج کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ناول کے زمانے میں یہ مسجد موجود تھی:

"The building appears even to have passed unhurt through the great mongol siege of the year 656 (AD 1258) for its name does not occur in the list of the Mosques and shrines which were burnt and subsequently restored by order of Hulagu, and in the year 727 (AD 1327) when Ibn Batutah visited Baghdad, the Mosque of Mansur is mentioned as still standing".[۵]

شرر نے لکھا ہے کہ مغربی بغداد میں ایوان خلافت کی عمارتیں نظر آتی ہیں ۔ یہ بیان محل نظر ہے ۔ بلاشبہ ابتدائی دور میں قصر خلافت غربی بغداد میں تھے اور ہارون الرشید کے دور تک رہے لیکن مامون الرشید کے دور سے شرقی بغداد کے وہ قصر دارالخلافت بن گئے جو ابتدا میں تفریح کی غرض سے تعمیر کیے گئے تھے اور عباسیہ دور حکومت کی آخری چار صدیوں میں ایوان خلافت رہے[۶] ۔

شرر نے لکھا ہے کہ مشرقی بغداد رصافہ کہلاتا تھا، لی سٹرینج کے بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے ۔ لی سٹرینج لکھتا ہے :

"East Baghdad being still known as the Rusafah side".[۷]

۱۔ جی ۔ لی سٹرینج : Baghdad during the Abbasid Caliphate، ص ۳۴۱ ، لی سٹرینج کے نزدیک ان واقعات سے متعلق Sir H. Howarth کی History of Mongols، مارکوپولو، مراصد اور طبقات ناصری مستند مآخذ ہیں ۔

۲۔ لی سٹرینج : Baghdad during the Abbasid Caliphate ۔

۳۔ ایضاً : ص ۳۲۰ ۔

۴۔ ایضاً : ص ۱۹، ۳۰، ۳۳ تا ۳۷، ۳۴۶، ۳۵۶ ۔

۵۔ ایضاً : ص ۳۷ ۔

۶۔ ایضاً : ص ۲۴۲ تا ۲۵۹ ، ۲۶۳ ، ۲۶۵ و ۳۱۷ تا ۳۲۰ و نقشہ جات ۷ ، (ص ۲۳۱) ، ۸ (ص ۲۶۳) و ۵ (ص ۱۰۷) ۔

۷۔ ایضاً : ص ۳۲۰ ۔

شـرر لکھتے ہیں کہ مشرقی بغداد میں زبیدہ خاتون کا قصر خاموش ہے ۔ شـرر کی یہ بات درست نہیں ۔ زبیـدہ کا قصر (Karar Palace) مغربی بغداد میں تھا ۔ نیز متعلقہ ناول کے زمانے میں نہ تو اس قصر کا کوئی ایسا وجود باقی تھا کہ کوئی عمارت نظر آئے اور نہ ہی اس کے قریب ایسے قصر تھے جو با رونق ہوتے کیونکہ چوتھی صدی کے اواخر تک یہ بالکل تباہ و برباد ہوکر کھنڈر بن چکے تھے جہاں بعد میں "بیمارستان" بنا دیا گیا اور یہ ہسپتال ۵۹۳ھ تک موجود تھا۔ قصر ہارون الرشید، قصر قرار اور زبیـدہ سے متعلق دو قصر مغربی بغداد میں ہیں[1]۔

شـرر نے مدرسہ نظامیہ مشرقی بغداد میں بیان کیا ہے، یہ صحیح ہے ۔ اسی طرح جامعہ مستنصریہ کا شرقی بغداد میں ہونا بھی صحیح ہے اور حضرت امام اعظم (امام ابو حنیفہؒ) کا مزار رصافہ میں ہے[2] ۔

شـرر نے پہلے باب میں محلہ مامونیہ کی گلی سکتہ العروس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس گلی سے دو عورتیں نکل کر دریا کے کنارے کنارے چلتی ہیں اور محلہ ظفریہ کا رخ کیے ہوئے ہیں ۔ یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ لی سٹرینج کی کتاب کے مطابق محلہ مامونیہ دریا سے تقریباً نصف مل ہٹ کر ہے جب کہ محلہ ظفریہ شمال کی طرف تقریباً سوا مسل کے فاصلے پر ہے[3] ۔ اس لیے محلہ مامونیہ سے محلہ ظفریہ کی طرف رخ دریا کے کنارے کنارے نہیں ہو سکتا ۔ علاوہ ازیں شرر لکھتے ہیں کہ یہ خواتین مامونیہ سے ظفریہ پہنچیں اور اس سے نکل کر قراح ابو شحم میں پہنچیں ۔ یہ بیان اس اعتبار سے درست نہیں معلوم ہوتا کہ قراح ابو شحم مامونیـہ سے ظفریـہ کے راستے میں پڑتا ہے ۔ لی سٹرینج کے نقشوں کی رو سے قراح ابو شحم مامونیہ سے پون میل کے فاصلے پر ہے اور ظفریہ وہاں سے تقریباً اتنا ہی اور آگے ہے[4] ۔ شـرر نے لکھا ہے کہ یہ خواتین قراح ابی شحم میں پہنچ کر آگے بڑھیں اور سوق الریحانین میں پہنچیں ۔ بغداد کے نقشوں کی رو سے شرر کا بیان کردہ یہ راستہ کچھ عجیب سا دکھائی دیتا ہے ۔ محلہ مامونیہ سے سوق الریحانین صرف نصف یا پون میل کے فاصلے پر ہے اور شرر نے ان خواتین کو مامونیہ سے سوق الریحانین تک پہنچانے کے لیے پہلے مامونیہ سے ظفریہ (ڈیڑھ مسل)، پھر ظفریہ سے واپس قراح ابی شحم (پون میل) اور وہاں سے سوق الریحانین (ایک میل) کا سفر کرایا ہے ۔ اس طرح انھیں نصف یا پون میل کی بجائے بلاوجہ تین میل کا فاصلہ طے کرنا پڑا ہے ۔

لی سٹرینج کے یہاں رباط سعادۃ ، مشرعۃ الصالحین، خرابہ ابن جردہ اور قصر سیدوک کا ذکر نہیں ملتا البتہ شرر کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ مدرسہ مستنصریہ کے سامنے دجلہ پر کشتیوں کا پل تھا لیکن پل کے فوراً بعد برامکہ کے کھنڈرات کا وجود نہیں ملتا ۔ پل سے تین میل کے دریائی سفر کے بعد برامکہ کے کھنڈرات کی حدود شروع ہوتی ہیں ۔ علاوہ ازیں یہ دریا سے کم از کم نصف میل ہٹ کر ہیں اور ان کا باہمی فاصلہ بھی تین تین چار چار فرلانگ ہے[5] ۔

تیسرے باب میں بیان کردہ محلہ سوق السلطان کا محل وقوع صحیح ہے ۔ البتہ یہ امر صحیح نہیں کہ قنطرہ باب الحرب سے باب بصرہ کی طرف راستہ سوق السلطان سے ہو کر گزرتا ہے ۔

۱- ایضاً : نقشہ نمبر ۲ (ص ۱۵)، ۸ (ص ۲۶۳) و ۳ (ص ۴۷)، ۵ (ص ۱۰۷) و صفحات ۱۰۲ تا ۱۰۶ ۔

۲- ایضاً : ص ۸۸، ۱۶۷، ۲۹۶ تا ۳۰۰، ۳۲۶، ۳۵۵ و نقشہ نمبر ۸ و ص ۱۶۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۷، ۲۸۰، ۲۸۲، ۳۳۴، ۳۴۹ و ۳۵۳ ۔

۳- ایضاً : نقشہ ۸، ص ۲۶۳ ۔

۴- ایضاً ۔

۵- ایضاً : ص ۴۲، ۱۷۶ تا ۱۸۴ و نقشہ ۳، ۵ و ۷ و ص ۲۰۶ ۔

باب بصرہ، باب الحرب اور قنطرہ باب الحرب غربی بغداد میں ہیں جب کہ سوق السلطان شرق بغداد میں ۔ شارع ابن ابی عون، سکتہ العتیقہ کا ذکر بھی لی سٹرینج کے یہاں موجود ہے[1] ۔ باب بصرہ کی آبادی کے بارے میں لی سٹرینج نے لکھا ہے :

"The population of this (Basrah Gate) being the orthodox sunni faith were the rivals of the karkh people, who were all bigoted hetrodox Shi'ahs" [2]

شــرر نے شرق بغداد میں (محلہ) مقتدریہ کا ذکر کیا ہے لیکن یہ نام درست نہیں، اگرچہ یاقوت نے بھی شروع میں اس کا نام مقتدریہ ہی لکھا ہے لیکن آگے چل کر دیگر بیانات میں اس کی اصلاح کی ہے ۔ ابن اثیر اسے مقتدیہ لکھتے ہیں۔ لی سٹرینج نے اس غلطی کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ خلیفہ مقتدر (م ۳۲۰ھ) نے نہیں بلکہ مقتدی (م ۴۸۷ھ) نے بنایا تھا[3] ۔

چوتھے باب میں شــرر نے مستعصم باللہ کے قصر الشجر کا ذکر کیا ہے ۔ لی سٹرینج کے یہاں اس قصر کا ذکر اس طرح ملتا ہے :

"Among the most famous buildings erected by Muktadir was the Palace of the tree (Dar-ash-Shajarah) so called from the tree made of silver, weighing 500,000 dirhams (or about 50,000 ounces), which stood in the middle of its palace surrounded by a great circular tank filled with clear water. The tree had eighteen branches, every branch having numerous twigs, on which sat various kinds of mechanical birds in gold and silver, and the spread into the air carrying leaves of divers colours, the leaves moving as the wind blew, while the birds through a concealed mechanism piped and sang. On either side of this palace, to the right and left of the tank, stood life sized figures in two rows, each row consisting of fifteen horsemen, mounted upon their mares, both the men and the steeds being clothed and caparisoned in brocade. In their hands the horsemen carried long-poled Javelins, and those on the right appeared to be attacking their adversaries in the row of horsemen on the left hand side .

In after days the palace of the tree (Dar ash-Shajarah), built under Muktadir as already described, was used as a state prison by later Caliphs, who as a measure of precaution, kept their near relations here in honourable confinement". ..[4]

قصر الشجر کے اس بیان میں کہیں خلیفہ مستعصم باللہ اس سے متعلق نہیں دکھائی دیتے اور نہ ہی ان کے ذکر کے سلسلے میں کہیں اس قصر کا بیان ملتا ہے، گویا شــرر نے قصر الشجر کی تاریخی روایات میں کچھ تصرف کرکے اسے مستعصم باللہ سے متعلق کر دیا ہے اور اس طرح ناول میں چاشنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔

چھٹے باب میں شیعوں پر سنیوں کی چڑھائی کا ذکر کرتے ہوئے شرر لکھتے ہیں کہ سب لوگ باب بصرہ میں جمع ہو چکے ہیں ۔ ان میں مندرجہ ذیل علاقوں کے لوگ پہنچ چکے تھے ۔ باب ابرز، باب الحرب، قنطرۃ العتیقہ، شونیزیہ، رباط شیخ الشیوخ ، قراح القاضی ، ظفریہ ، درب الدواب اور سوق الدواب ، شارع ابن عون، قطعہ ، درب اللیان، سوق الصفرہ ، سوق الصیارف، سوق نظامیہ اور مستنصریہ ۔ ہم مختصراً ان محلوں کے محل وقوع کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

۱- ایضاً : ص ۲۸۲، ۲۶۳، ۱۰۷، ۱۱۲، ۱۲۳، ۱۲۶، ۱۵۸، ۱۵۹، نقشہ جات ۵ و ۷ ۔

۲- ایضاً : ص ۳۳۶ ۔ ۳- ایضاً : ص ۲۸۶، نقشہ نمبر ۸ ۔ ۴- ایضاً : ص ۲۵۶ تا ۲۵۹ ۔

۱- باب ابرز: شرق بغداد میں محلہ ظفریہ کے پاس[1] -
۲- باب الحرب: غربی بغداد میں باب بصرہ کے قریب[2] -
۳- قنطرۃ العتیقہ: غربی بغداد میں باب بصرہ کے قریب[3] -
۴- شونیزیہ: نہر عیسیٰ کے قریب کرخ سے ملحق آبادی[4] -
۵- رباط شیخ الشیوخ: مشرقی بغداد میں[5] -
۶- قراح القاضی: شرقی بغداد میں قراح ابی شحم اور محلہ ظفریہ کے قریب[6] -
۷- ظفریہ: شرقی بغداد میں[7] -
۸- درب الدواب اور سوق الدواب: نہر عیسیٰ کے قریب شرقی بغداد میں[8] -
۹- شارع ابن عون: باب الحرب کے قریب[9] -
۱۰- قطیعہ: غربی بغداد میں[10]-
۱۱- درب اللسان: باب اللیان شرقی بغداد میں[11]-
۱۲- سوق الصفرہ: باب الصفریہ شرقی بغداد میں[12]-
۱۳- سوق الصیارف: شرقی بغداد میں سوق الریحانین کے قریب[13]-
۱۴- سوق نظامیہ: شرقی بغداد میں مدرسہ نظامیہ سے ملحق بازار[14]-
۱۵- مستنصریہ: شرقی بغداد میں[15]-

شرر نے ان سب محلوں کے لوگوں کو باب بصرہ میں جمع دکھایا ہے گویا شرقی بغداد سے آنے والے بھی دجلہ کو عبور کر چکے ہیں اور کرخ سے بالکل قریب کی آبادی میں ہیں، لیکن آگے چل کر شرر جب مزید تفصیلات بیان کرتے ہیں تو ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ باب بصرہ کو شرقی بغداد میں تصور کر رہے ہیں کیونکہ وہ لکھتے ہیں کہ پھر کوچ کے نقارے پر چوٹ پڑی (اور ان لوگوں نے باب بصرہ سے روانہ ہوکر) مدرسہ مستنصریہ کے سامنے والے کشتیوں کے پل کو پار کیا، حالانکہ باب بصرہ دجلہ سے ہٹ کر شہر منصور کے بھی مغرب میں ہے - اس طرح اس کے بعد کی تفصیلات خیالی رہ جاتی ہیں -

عنقود کے نوحے سے متعلق بغداد کی قدیم روایات اور عیاروں کے متعلق تاریخی حقائق کا ذکر شرر نے خود ہی ناول کے حواسی میں کر دیا ہے -

شرر نے آخری باب میں بغداد سے متعلق سعدی کا مرثیہ زبیدہ کی زبان سے پڑھوا دیا ہے لیکن انھیں جلد ہی اس امر کا احساس ہوگیا کہ یہ زمانی تصرف فنی نقطہ نظر سے غلط ہے اس*لیے انھوں نے یہ کہہ کر بات بنائی ہے کہ زبیدہ کا پڑھا ہوا یہ مرثیہ معلوم نہیں بعد کو سعدی کے ہاتھ کس طرح لگ گیا -

---

۱- ایضاً: نقشہ ۵، ۷ - ۲- ایضاً: نقشہ ۵ - ۳- ایضاً: ص ۵۰، ۵۴، ۶۰، ۹۰، ۹۳، ۱۲۴، ۱۲۶ -
۴- ایضاً: ص ۷۹ - ۵- ایضاً: ص ۳۴۸، ۳۴۹ - ۶- ایضاً: ص ۲۸۷، نقشہ نمبر ۸ -
۷- ایضاً: ص ۲۸۱، ۲۸۳ - ۸- ایضاً: ص ۲۲۷ تا ۲۲۹ - ۹- ایضاً: ص ۱۲۴، نقشہ ۵ -
۱۰- ایضاً: ص ۱۱۳ - ۱۱- ایضاً: ص ۲۷۶ - ۱۲- ایضاً: ص ۲۸۸ -
۱۳- ایضاً: ص ۲۷۲ - ۱۴- ایضاً: ص ۲۹۹ - ۱۵- ایضاً: نقشہ ۸ -

۱۵- رومۃ الکبریٰ

رومۃ الکبریٰ قبل از اسلام کے دور سے متعلق ہے - یہ ناول ۱۹۱۲ء میں لکھا گیا - اس میں شرر نے پانچویں صدی عیسوی کے ابتدائی دور کے حالات روما بیان کیے ہیں - ناول میں بیان کردہ واقعات کا خلاصہ یہ ہے :

ولادت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ۱۶۶ برس پہلے ۴۰۴ء کے موسم بہار میں ایطالیہ کے ساحلی شہر لوریطوم سے رومہ کو جانے والی سڑک پر شہزادی پلاقیدیا دو ہزار رومی فوجی سواروں کے جھرمٹ میں سفر کر رہی تھی کہ رومۃ الکبریٰ کے جنوبی پھاٹک سے دو میل کے فاصلے پر دو خوش رو نوجوانوں نے شہزادی کو قسطنطنیہ سے لایا ہوا اس کی سہیلیوں کا ایک خط دیا - یہ نوجوان شکل سے رومی نظر نہیں آتے تھے - خط دینے والے نوجوان نے اپنا نام ارسطوبلوس بتایا اور کہا کہ اس کا بھائی آریوس کے عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے ملحد قرار دیا گیا تھا اور وہ قسطنطنیہ کے اسقف کے خوف سے تین سال ہوئے رومہ میں بھاگ آیا تھا، ارسطوبلوس اسے واپس لے جانے کے لیے آیا ہے لیکن رومہ میں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ گوتھ بادشاہ الارق کو پولیشیا کے میدان میں شکست دینے کی خوشی میں قیصر ہونوریوس کا ٹرائمف ہونے والا ہے اس لیے وہ اس جشن کو دیکھنے کے لیے رک گیا ہے - شہزادی نے خط کے جواب کے لیے اسے ٹرائمف کے دوسرے روز شہر کے باہر اپنی بہن افطاویہ کے باغ میں غروب آفتاب کے وقت آنے کا کہا -

ہونوریوس کے استقبال کے لیے ٹرائمف کے موقع پر روما کو دلہن کی طرح سجایا گیا - دور دور سے لوگ جلوس دیکھنے کے لیے آئے - اس موقع پر ارسطوبلوس اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ جلوس کی گزرگاہ پر کھڑا تھا اور ان کی باہمی گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ ارسطوبلوس الارق کے سفیر کی حیثیت سے قیصر کے پاس صلح اور جنگی قیدیوں کی رہائی کے لیے آیا ہے - قیدیوں میں الارق کی ملکہ بھی شامل تھی - ارسطوبلوس کو یہ معلوم کرکے سخت دکھ ہوا کہ ٹرائمف میں جنگی قیدیوں اور مال غنیمت کی نمائش جہیز کے سامان کی طرح کی جاتی ہے - ارسطوبلوس چاہتا تھا کہ الارق کی ملکہ کو ٹرائمف میں دیگر قیدیوں کے ساتھ شامل نہ کیا جائے لیکن وہ اس مقصد کے حصول میں ناکام رہا کیونکہ اس کا واحد ہمدرد، ہونوریوس کا وزیر اعظم اسٹلی شو، ایک دن پہلے ہی بادشاہ کے استقبال کے لیے شہر سے ایک منزل آگے جا چکا تھا -

ارسطوبلوس اور اس کے ساتھیوں کو ٹرائمف کا منظر دیکھ کر انتہائی دکھ ہوا - الارق کی ملکہ پا پیادہ قیدیوں میں شامل تھی - شہزادی پلاقیدیا بھی اس جلوس میں تھی - ایک جگہ بت پرستوں نے قیصر ہونوریوس کا رتھ روک کر درخواست کی کہ اگرچہ سلطنت کا مذہب عیسائیت ہو چکا ہے لیکن مندروں کے دروازے اس خوشی کے دن کھول دینے چاہییں - اسقف اعظم کے مشورے سے قیصر نے ان کی درخواست مسترد کر دی - اس دوران چونکہ دور دور تک پھیلا ہوا جلوس بھی رک گیا تھا اور لوگ اس کی وجہ جاننا چاہتے تھے - ایک فوجی سردار سلوانوس حالات معلوم کرکے اپنے رتھ کی طرف واپس جا رہا تھا کہ شہزادی پلاقیدیا نے اسے روک کر جلوس کے رک جانے کی وجہ پوچھی - سردار نے اپنی عزت افزائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسا لگاوٹ کا طرز گفتگو اختیار کیا جو شہزادی ہی کو نہیں بلکہ قریب کھڑے ارسطوبلوس کو بھی ناگوار گزر رہا تھا - اسے محسوس ہوا کہ وہ شہزادی سے اسٹلی شو کی کوئی شکایت کر رہا ہے، پھر اس نے شہزادی سے تخلیے میں ملاقات کا وقت مانگا اور اس نے اتفاق سے اسے وہی وقت اور جگہ

بتائی جس کے لیے پہلے ہی وہ ارسطوبلوس سے کہہ چکی تھی۔ جلوس وہاں سے آگے بڑھ کر کنیسۂ لاطران میں داخل ہوا جہاں ہونوریوس مقتدائے اعظم کے سامنے رسوم بجا لایا۔

دوسرے دن سورج غروب ہونے کے بعد پلاقیدیا اپنی بہن کے باغ میں سلوانوس کی منتظر تھی اور سوچ رہی تھی کہ سلوانوس اسٹلی شو جیسے محب وطن، دانا اور بہادر وزیر کا دشمن کیوں ہو رہا ہے۔ سلوانوس آیا اور گفتگو کے دوران اس نے یہ ظاہر کیا کہ جنگ میں نام وری اس نے اور اس کے ساتھیوں کونٹ ہرقلین، سپہ سالار اولمپیوس، تھیوڈوسوس اور اتھانسیوس وغیرہ کی شجاعت سے حاصل ہوئی۔ الارق کا میدان جنگ سے زندہ بچ کر نکل جانا اسٹلی شو کی سازش کا نتیجہ تھا۔ وہ گوتھوں کا طرف دار ہے اور قیصر پر اس کا جادو چل رہا ہے۔

سلوانوس کو شہزادی کی توجہ آمیز باتوں سے تقویت ہوئی تو کہا کہ وہ اور اس کے ساتھی اسٹلی شو کے دشمن ہیں اور اسے قتل کر دیں گے۔ پھر اس نے مزید ہمت کر کے شہزادی سے کہا کہ وہ سلوانوس سے شادی کر لے تو اسٹلی شو کے ساتھ قیصر کا بھی خاتمہ کر دیا جائے اور شہزادی کو قیصرہ بنا دیا جائے۔ اس نے اپنی بیوی کے بارے میں شہزادی کو یقین دلایا کہ وہ اسے زہر دے کر اس کا خاتمہ کر دے گا۔ اب شہزادی سلوانوس کے دل کا سارا بھید جان چکی تھی۔ اس نے برہمی کے ساتھ سلوانوس کو برا بھلا کہا۔ سلوانوس نے شہزادی کو پکڑ کر گرا لیا اور خنجر سینے پر رکھ کر کہا کہ یا تو وہ اس سے شادی کرنا قبول کرے یا وہ اس کی بےحرمتی کے بعد اسے قتل کر دے گا۔ شہزادی نے اس حالت میں بھی سلوانوس کی خواہشات کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ ارسطوبلوس کو بھی شہزادی نے وہی وقت دے رکھا تھا اور وہ ٹرائمف کے دوران شہزادی سے سلوانوس کی گفتگو بھی سن چکا تھا اس لیے وہ پہلے ہی آ کر باغ میں چھپ گیا تھا۔ جونہی سلوانوس نے شہزادی کے ساتھ زبردستی شروع کی ارسطوبلوس نے فوراً کنج سے نکل کر سلوانوس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ شہزادی نے ارسطوبلوس کو پہچانا، شکریہ ادا کیا اور اس امر پر افسوس کیا کہ سلوانوس زندہ گرفتار نہ ہوا تاکہ اس سے پوری سازش کا پتہ چلتا۔ ارسطوبلوس نے شہزادی کو مشورہ دیا کہ وہ اسٹلی شو اور قیصر کو صورت حال سے مطلع کرے۔ شہزادی نے کہا کہ قیصر کو سمجھانا تو مشکل ہے کیونکہ وہ ہر وقت اپنے حواریوں میں گھرا رہتا ہے اور ایک دو روز میں اپنے نئے دارالسلطنت راونا کو چلا جائے گا البتہ وہ اسٹلی شو کو مطلع کرے گی۔

ارسطوبلوس نے شہزادی سے ملنے کی غایت بیان کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا ایک گوتھ دوست اڈولفوس قسطنطنیہ میں اس زمانے میں تعلیم حاصل کرتا رہا ہے جب کہ شہزادی بھی وہاں زیر تعلیم تھی۔ وہ اس وقت سے شہزادی کا پرستار ہے اور شہزادی سے شادی کا خواہش‌مند ہے۔ پلاقیدیا نے اس مسئلے پر پہلے تو گوتھوں سے اپنی نفرت کا اظہار کیا پھر اپنے سماجی مرتبے کا ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ پلاقیدیا سے شادی کے لیے اس کے دونوں بھائیوں قیصر ہونوریوس اور ارقادیوس شاہ قسطنطنیہ کی منظوری ضروری ہے، علاوہ ازیں اس کا چچا زاد بھائی مقسمی نوس بھی اس کا طلب گار ہے۔ ارسطوبلوس نے بہت کوشش کی کہ شہزادی اپنی حد تک اعتراف کر لے، اس نے یہ بھی بتایا کہ انکار کی صورت میں روما پر تباہی و بربادی مسلط ہو جائے گی۔ شہزادی نے غور و فکر کے لیے دو سال کی مہلت چاہی اور ارسطوبلوس سلوانوس کی لاش کو ٹھکانے لگا کر شہزادی سے رخصت ہوا۔

دوسرے دن اسٹلی شو نے ارسطوبلوس اور اس کے ساتھیوں کو الارق کے سفیروں کی حیثیت سے قیصر ہونوریوس کے سامنے پیش کیا۔ ارسطوبلوس نے شاہ الارق کی طرف سے صلح کے لیے یہ شرائط پیش کیں: (۱) ملکہ اور تمام اسیروں کو رہا کر کے ان کے ہمراہ وطن واپس بھیجا جائے۔ (۲) الارق کو الیریا کا جائز حکمران تسلیم کیا جائے۔ (۳) بلقان کے شمالی صوبجات جو حکومت قسطنطنیہ کے قبضے میں ہیں انھیں فتح کر لینے کی اجازت دی جائے اور (۴) چونکہ یہ فوج کشی تاج قیصری کی خدمت گزاری کے لیے ہوگی اس لیے اس کے مصارف دربار قیصری برداشت کرے۔ بحث کے بعد قیصر نے چاروں شرائط تسلیم کر لیں اگرچہ امرائے دربار نے اس فیصلے کو ناگواری سے سنا۔

الارق کی ملکہ اڈولفیا، ارسطوبلوس اور امراء کے ساتھ وطن واپس پہنچی۔ الارق نے استقبال کیا، ارسطو بلوس نے ٹرائمف میں گوتھوں کو ذلت آمیز طریقے پر گھمانے کی تفصیلات بیان کیں۔ الارق فوراً انتقام لینا چاہتا تھا لیکن اسے اسٹلی شو کی شرافت کا بھی پاس تھا۔ ارسطوبلوس نے مشورہ دیا کہ فی الحال تیاری کی جائے اور انتقام کو مستقبل قریب پر اٹھا رکھا جائے جب قیصر اسٹلی شو کو اس کے عہدے سے الگ کر دے گا۔ اس صورت میں اسٹلی شو کی بی بی سرینہ، جو قیصر کی منہ بولی ماں ہے، اور شہزادی پلاقیدیا بھی ان کی مددگار ہوں گی۔

سابقہ واقعات کو تین برس گزرے تھے کہ تاتاریوں کے بادشاہ رادا گائسوس نے تاتاریوں اور بعض بت پرست گوتھوں کا چار لاکھ سے زیادہ لشکر جمع کر کے قیصر کے مملوکہ علاقے میں مار دھاڑ شروع کر دی۔ رومہ میں ہر طرف ان حالات سے خوف و ہراس پھیل گیا۔ پلاقیدیا نے اسٹلی شو کو اس یلغار کو روکنے پر آمادہ کیا۔ اسٹلی شو نے شہزادی کو بتایا کہ ہرقلین اور اولمپیوس کی سازشوں نے قیصر کو اپنے بس میں کر رکھا ہے بہرکیف اس نے وعدہ کیا کہ وہ خود لشکر تیار کرے گا اور الارق کو بھی مدد پر آمادہ کرے گا۔ اسی اثنا میں ارسطوبلوس دس ہمراہیوں سمیت یہ سفارت لے کر آ پہنچا کہ گزشتہ دو برس کے واجب الادا مصارف جنگ ادا کیے جائیں۔ اسٹلی شو اور پلاقیدیا نے اسے قائل کیا کہ وہ فوری طور پر الارق کو کہہ کر رادا گائسوس کے مقابلے کے لیے لشکر لے کر ونیشیا میں اسٹلی شو سے آ ملے۔ ارسطو بلوس شہزادی کا مہمان تھا، اس نے تخلیے میں پھر اڈولفوس کا ذکر چھیڑا، دیر تک گوتھوں کے اوصاف اور شہزادی کی مجبوریوں پر گفتگو ہوئی، آخر شہزادی نے وعدہ کیا کہ اگر اڈولفوس انھیں رادا گائسوس اور ہنوں کے مظالم سے نجات دلائے تو وہ اڈولفوس کے سوا کسی دوسرے سے ہرگز شادی نہ کرے گی۔ ارسطو بلوس الارق کے نام اسٹلی شو کا خط لے کر لوٹ گیا۔

ارسطوبلوس کو رومہ سے واپس گئے تین ہی ماہ ہوئے تھے کہ الارق اور اسٹلی شو کے لشکر مقام موعود پر ملے اور گھبرائے ہوئے لوگوں کی ڈھارس بندھاتے ہوئے آگے بڑھے اور جب رادا گائسوس نے شہر فلارنس کا محاصرہ کر رکھا تھا یہ دونوں لشکر اس کے سر پر جا پہنچے۔ اس نے مجبوراً محاصرہ اٹھا لیا۔ زبردست لڑائیاں ہوئیں جن میں اڈولفوس نے خوب خوب داد شجاعت دی۔ رادا گائسوس قتل ہوا اور اس کا تمام لشکر تباہ و برباد ہوگیا، رومیوں کا مٹا ہوا وقار پھر سے بحال ہوگیا۔ اتفاق سے اسی اثنا میں فرانس اور انگلستان کے لشکروں نے بغاوت کر دی۔ ہرقلین اور اولمپیوس نے قیصر کو بھڑکایا کہ بغاوت کا اصل محرک اسٹلی شو ہے۔ قیصر خود بغاوت کو فرو کرنے نکلا، اسٹلی شو بھی رادا گائسوس کی مہم سے فارغ ہو کر قیصر کی کمک کو جا

پہنچا اور باغیوں کو شکست ہوئی - پھر قیصر نے اسٹلی شو کی سفارش پر باغیوں کو معاف کر دیا لیکن ہرقلین اور اولمپیوس نے معافی کی اس سفارش کو بھی قیصر کے سامنے اسٹلی شو کی بغاوت میں شمولیت کی دلیل کے طور پر پیش کیا - الارق کے مصارف جنگ کی ادائی کے مطالبے کے خط کے ساتھ اسٹلی شو نے قیصر کو جو خط لکھا تھا اسے قیصر کی ہتک قرار دیا - اس طرح بظاہر اسٹلی شو کی قدر دانی کرنے کے باوجود قیصر دل میں اس کے خلاف عناد لیے ہوئے راونا کو لوٹ گیا -

اسٹلی شو نے بغاوت کے فرو ہو جانے کے بعد اپنے لشکر کو منتشر کر دیا اور خاص ہمراہیوں کے ساتھ سیر و تفریح کرتا ہوا لوٹ رہا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ قیصر نے راونا جاتے ہوئے پاویا میں پہنچ کر اسٹلی شو کے طرف دار فوجی افسروں اور امراء کو قتل کرا دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ جو کوئی بھی اسٹلی شو کا حامی یا دوست ہو اسے قتل کر دیا جائے - غرض اس طرح قتل عام سے روما اچھے قابل اور محب وطن لوگوں سے خالی کر دیا گیا حتیٰ کہ اسٹلی شو کو بھی راونا میں اولمپوس کے حکم پر گرفتار کرکے قتل کر دیا گیا - اس خبر سے رومۃالکبریٰ میں کہرام مچ گیا - سرنا اور پلاقیدیا بھی سخت مغموم تھیں اور سرنیا اپنے شوہر کا انتقام لینا چاہتی تھی - اسی دوران ارسطوبلوس بھی رومہ میں پہنچا، سرنیا نے اسے اسٹلی شو کے انتقام کے لیے آمادہ کیا - اس بار پلاقیدیا نے تخلیے میں ارسطوبلوس کو بتایا کہ اگر اس کے بھائی مان جائیں تو وہ اڈولفوس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے - ارسطو بلوس الارق کا خط لایا تھا جسے اسٹلی‌شو کی معرفت قیصر کو پیش کرنا چاہتا تھا لیکن رومہ کے حالات دیکھ کر وہ فوراً واپس لوٹ گیا -

شاہ گوتھ الارق کو اسٹلی شو کے قتل کی خبر ملی تو اسے بہت دکھ ہوا اور اس بات پر افسوس بھی کہ اس نے دربار قیصری میں سفارت کیوں بھیجی - الارق اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ارسطو بلوس واپس پہنچ گیا اور الارق یہ سن کر خوش ہوا کہ وہ خط واپس لے آیا ہے - اب الارق نے ایک معمولی افسر کے ہاتھ قیصر ہونوریوس کو خط بھیجا کہ اگر دو ماہ کے اندر پچھلے سارے برسوں کے مصارف جنگ نہ بھیجے گئے تو اس کا لشکر ایطالیہ کی سرحدوں میں داخل ہو جائے گا، خط بھیجنے کے بعد الارق نے لشکرکشی کی تیاریاں شروع کر دیں - ہونوریوس کی طرف سے ملنے والا جواب کافی اشتعال انگیز تھا جسے دیکھتے ہی الارق نے فوراً حملہ کر دیا اور کوہستان الپس کی بستیوں کو روندتا ہوا، دریائے پوے کو عبور کرکے بلاد ایکویلیا، الٹی نم، کنکارڈیا، کریمونا کو تاخت و تاراج کرتا ہوا رومۃالکبریٰ کی طرف بڑھا - قیصر ہونوریوس کی نالائقیوں سے نالاں تیس ہزار رومی فوجی بھی اس کے ساتھ مل گئے - الارق نے رومۃالکبریٰ کی دیواروں کے نیچے پہنچ کر دریائے طبیر اور تمام راستوں سے رسد کی ناکہ بندی کر دی اور محاصرہ کر لیا - قیصر ہونوریوس راونا میں بیٹھا رہا - ان خوش‌عقیدہ لوگوں کا خیال تھا کہ رومہ کی حفاظت خدا خود کرے گا - الارق نے اعلان کر دیا کہ وہ اسٹلی شو کے انتقام کے لیے آیا ہے جس کے نتیجے میں لوگ اس کے ساتھ شامل ہونے لگے لیکن جلد ہی سرنیا نے ایسی غیر محتاط گفتگو شروع کر دی اور شہر میں ایسا قحط پھیلا کہ لوگوں نے سرنیا کو قتل کر دیا - قحط سے مجبور ہو کر لوگوں نے الارق کے پاس قاصد بھیجے اور الارق اس شرط پر محاصرہ اٹھانے پر آمادہ ہوگیا کہ اہل رومہ اسے پانچ ہزار پونڈ سونا، تیس ہزار پونڈ چاندی، چار ہزار ریشم کے تھان، تین ہزار ارغوانی رنگ کے کپڑے کے تھان اور تین ہزار پونڈ سیاہ مرچ دیں - اہل رومہ سے یہ چیزیں وصول کرکے

اس نے ناکہ بندی ختم کر دی اور شہر کے دروازے کھل گئے ۔ محاصرہ اٹھتے ہی اہل رومہ کے چالیس ہزار غلام بھی الارق سے آ ملے ۔ الارق نے وہیں ٹھہر کر ہونوریوس کو اپنی شرائط صلح بھیجیں جن میں پلاقیدیا سے اڈولفوس کی شادی کی شرط بھی شامل تھی ، مگر اولمپیوس کی سازشوں نے ہونوریوس کو یہ شرائط ماننے کی اجازت نہ دی اور قیصر نے وہلاسیا کے مشہور شاہی گارد کے چھ ہزار جوان والنس کی سر کردگی میں الارق کے مقابلے کے لیے روانہ کر دیے ۔ اس گارد کو الارق کے لشکر کے ایک حصے نے راستے ہی میں بری طرح نیست و نابود کر دیا ۔ اسی دوران الارق کے ہاتھ ہونوریوس کا ایک ایسا دستخطی خط پڑگیا جس میں اس نے گوتھوں کی سخت توہین لکھی تھی ۔ الارق نے خط سے برہم ہو کر پھر رومہ کا محاصرہ کر لیا اور بندرگاہ اوشیا پر بھی قبضہ کر لیا جہاں غلے کے تمام ذخیرے تھے ۔ مجبوراً رومہ کے عوام نے الارق کی تمام شرائط پھر مان لیں ۔

الارق کی ہدایت پر روما کی سینٹ نے شہر کے حاکم فوجداری اتالوس کو شہنشاہ روم منتخب کر لیا ۔ اڈولفوس سلطنت روم کی تمام افواج کا سپہ سالار اعظم مقرر ہوا ۔ پلاقیدیا پورے احترام سے قصر قیصری میں ٹھہری رہی اور جن لوگوں کی اس نے سفارش کی انھیں ہر ممکن سہولت دی گئی ۔ ارسطو بلوس شہزادی سے ملا اور بتایا کہ یہ سب انتظامات عارضی ہیں ، مصلحت کے تحت اتالوس کو وقتی طور پر قیصر بنا دیا گیا ہے ۔

الارق نے ایک لشکر افریقہ بھی بھیجا لیکن اس کے سردار ساروس نے شکست کھائی اور افریقہ کے رومی لشکر سے مل گیا ۔ افریقہ سے پانچ ہزار رومی لشکر لامپی توس کی سرکردگی میں ہونوریوس کی مدد کو راونا پہنچا ۔ ہونوریوس کے تمام سازشی امراء حالات کی نزاکت کو دیکھ کر بھاگ چکے تھے ، اولمپیوس قتل ہو چکا تھا ، قیصر نے افریقہ سے آنے والی اس کمک کو غیبی امداد تصور کیا ۔ ساروس بھی پانچ ہزار گوتھوں کے ساتھ ہونوریوس سے مل گیا اور فتح کی صورت میں اپنی ایک آرزو کے پورا کرانے کا وعدہ لیا ۔ الارق اپنا لشکر لے کر راونا کی طرف بڑھا ۔ اڈولفوس اور الارق بھاری لشکر کے ساتھ ابھی پیچھے ہی تھے کہ اتالوس ایک لشکر کی کمان کرتا ہوا تیزی سے راونا کی سمت بڑھا لیکن ساروس سے بری طرح شکست کھا کر الارق کے پاس واپس پہنچا ۔ الارق کو اس پر بہت غصہ آیا اور اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس شکست میں بعض گوتھوں اور ساروس کی غداری شامل تھی ۔ کچھ سوچ کر الارق نے اتالوس کو ایک خط دے کر ہونوریوس کے پاس بھیجا اور اسے تاکید کی کہ وہ خود جا کر ہونوریوس کو تاج قیصری پہنائے ۔ الارق نے خط میں لکھا تھا کہ تاج و تخت تو ہونوریوس کا ہوگا ، وہ اسے واپس کر رہا ہے لیکن ملک پر اس کا کوئی اختیار نہ ہوگا ۔ الارق یہ خط قیصر کو بھیج کر راونا کی طرف بڑھنے کی بجائے واپس لوٹ گیا ۔

اتالوس نے راونا پہنچ کر ہونوریوس کو الارق کا خط پیش کیا اور ساتھ ہی اپنی مجبوری بیان کی ، تاج پہنایا ۔ اسی موقع پر ساروس نے اپنی خواہش بیان کرتے ہوئے درخواست کی کہ پلاقیدیا سے اس کی شادی کر دی جائے ۔ اس بات کو ہونوریوس نے ناگواری کے ساتھ سن کر وقتی طور پر برداشت کرتے ہوئے کہا اس کے لیے خود شہزادی کی منظوری ضروری ہے ۔

اس بار جب الارق رومہ واپس پہنچا تو اس نے سخت قتل عام کرایا ۔ پلاقیدیا کے محل پر پہرہ بٹھا دیا ۔ اسے نقل و حرکت کی اجازت تھی لیکن نگرانی کی جاتی تھی ۔ اب الارق نے

ایطالیہ کے تمام شہروں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا اور انتہائی جنوب تک جا پہنچا ۔ اگرچہ رومی اب اس کا مقابلہ نہیں کرتے تھے لیکن بستیاں بدستور لٹتی تھیں ۔ اسی دوران الارق مر گیا لیکن گوتھوں نے فوراً اڈولفوس کو بادشاہ بنا لیا جو کہ ملکہ اڈولفیا کا بھائی تھا ۔ ہونوریوس نے اس نئی تبدیلی پر ساروس کو پلاقیدیا کے رومہ سے نکال لانے پر مامور کیا ۔ ساروس راہبوں کا بھیس بدل کر گیا ، پلاقیدیا سے مل کر اپنے آنے کی غایت بیان کی ، اسے اڈولفوس کے خلاف بھڑکایا اور چکمہ دے کر اسے بھی راہبوں کے بھیس میں نکال لایا ۔ اس وقت اڈولفوس راونا کے باہر کیمپ لگائے ہوئے تھا لیکن اس کے ساتھ بہت تھوڑا لشکر تھا ۔

ساروس نے پلاقیدیا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ راونا میں داخل ہونے سے پہلے ایک بار اسے اڈولفوس کی صورت دکھائے گا ۔ کیمپ میں پہنچ کر دونوں ایک اور راہب کے ساتھ حاجب کے ہمراہ اڈولفوس کے خیمے میں پہنچے ۔ اڈولفوس سو رہا تھا ۔ پلاقیدیا اسے چند لمحے دیکھتی رہی اور آخر پہچان لیا ۔ جونہی تیسرے راہب نے بادشاہ کو جگانے کے لیے آواز دی ۔ ساروس نے خنجر اڈولفوس کے سینے میں پیوست کر دینا چاہا ۔ پلاقیدیا جھپٹ کر درمیان میں آ گئی ، ساروس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چیخی کہ یہ تو اس کا دوست ارسطوبلوس ہے ۔ اس اثنا میں خود اس کا اپنا بازو زخمی ہو گیا ۔ حاجب نے صورت حال کو بھانپ لیا اور ساروس کو پہنچانتے ہی فوراً قتل کر دیا ۔ اب پلاقیدیا کو معلوم ہوا کہ اڈولفوس ارسطو بلوس ہی کا دوسرا نام ہے ۔ ساروس کے بارے میں دونوں نے ایک دوسرے کو تفصیلات بتائیں ۔ ارسطو بلوس نے شہزادی کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے خود زخمی ہو کر اسے بچا لیا ۔

اڈولفوس نے ہونوریوس کو غیر مشروط صلح کا پیغام بھیجا ۔ ہونوریوس سو سواروں کے ساتھ شہر سے باہر آیا ۔ دربار لگا ۔ اڈولفوس نے پرزور تقریر کی اور کہا کہ اب وہ روما کو خالی کر دیں گے اور ہمیشہ ہونوریوس کے دوست رہیں گے ۔ ہونوریوس بہت متأثر ہوا اور فوراً اڈولفوس سے پلاقیدیا کی شادی کر دی ۔ اڈولفوس نے کہا کہ وہ اپنے لیے ایک نئی سلطنت خود پیدا کرے گا اور اس وقت تک کے لیے پلاقیدیا کو قیصر کے پاس چھوڑ کر فرانس کے شہر نربونہ کی طرف بڑھا ۔ پھر وہ سارے فرانس کو فتح کرتا ہوا پیرینیز کی دوسری طرف سپین میں جا پہنچا ۔ وہاں سے اتالوس کو اپنا سفیر بنا کر پلاقیدیا کے لانے کے لیے بھیجا اور خود سارے ہسپانیہ کو فتح کر کے کوہسار پیرینیز میں شہزادی کا انتظار کرنے لگا ۔ امراء نہیں چاہتے تھے کہ شہزادی پلاقیدیا اڈولفوس کے پاس جائے اس لیے امراء اور ان کی بیگمات نے رخنے ڈالنے شروع کیے ۔ ہونوریوس نے ہر معاملے میں پلاقیدیا کو خود مختار ٹھہرایا ۔ چنانچہ شہزادی نے بھرے دربار میں اڈولفوس کے پاس جانے کے فیصلے کا اعلان کیا ۔ مقسمی نوس کی شادی اقطاویہ سے کر دی گئی اور پلاقیدیا سپین چلی گئی ۔ اسی کی نسل سے سپین کے گوتھی شہنشاہوں کا سلسلہ چلا جو دو صدیوں تک سپین پر متصرف رہے ۔

تاریخی واقعات کا جائزہ

رومتہ الکبری میں بیان کردہ جملہ واقعات رومانی واقعات کے ماسوا بہت حد تک تاریخی شواہد پر مبنی ہیں ۔ اڈولفوس اور شہزادی پلاقیدیا کے درمیان شادی اور محبت کا قصہ قائم کرنے کے لیے بھی تاریخی اساس موجود ہے ۔ اس ناول میں شرر نے تاریخی واقعات میں بہت کم

تصرف کیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس ناول کی تمام تر تعمیر گبن کی مشہور عالم تاریخ پر مبنی ہے۔

گبن نے اپنی تاریخ زوال روما میں اسٹلی شو[1]، الارق[2]، ارکڈیس[3] اور ہونوریوس[4] کا مفصل ذکر کیا ہے۔ گبن کے بیان کے مطابق الارق ۳۹۸ء میں ماسٹر جنرل بنا[5]، پھر وزی گوتھوں کا بادشاہ بن گیا۔ الارق نے ۴۰۳ء میں اٹلی پر حملہ کیا[6]، ہونوریوس کا یہ عقیدہ تھا کہ اس مقدس سر زمین پر کوئی حملہ آور نہیں ہو سکتا اور جو ایسی جسارت کرے گا خود تباہ و برباد اور مورد عتاب الٰہی ہوگا۔ یوں بھی وہ اپنی خوش آمد پسندانہ فطرت کی وجہ سے ہر وقت حواریوں میں گھرا رہتا تھا اور اس میں الارق کے مقابلے کی تاب بھی نہ تھی۔[7] اسٹلی شو نے ہمت کرکے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔[8] ہونوریس نے الارق کے خوف سے ملان میں پناہ لی اور پھر الپس کی طرف بھاگ نکلا۔[9] اسٹلی شو نے ۲۰ مارچ ۴۰۳ء کو پولیشیا کی جنگ میں الارق کو شکست دی اور اسیران جنگ میں الارق کی بیوی بھی گرفتار ہوئی۔[10] اسٹلی شو نے الارق کی بیوی کی قدر دانی کی اور وہ الارق کی جرأت و شجاعت کا بھی معترف تھا۔[11] ہونوریوس نے اس فتح کی خوشی میں جشن منایا[12] اور پھر ۴۰۴ء میں راونا (Ravenna) میں چلا گیا۔[13] اس اعتبار سے ناول کے آغاز کا زمانہ اور واقعات تاریخی اعتبار سے بالکل درست ہیں۔

گبن کے یہاں الارق اور اسٹلی شو کی اس جنگ کے بعد صلح کے معاہدے کی تفصیلات بھی موجود ہیں۔[14] یہ معاہدہ ۴۰۴ء میں ہوا اور لمسڈیس نے اس معاہدے اور بالخصوص رقم (مصارف جنگ) والی شق سے شدید اختلاف کیا۔[15] گبن کے یہاں اولمپیوس کا ذکر بھی ملتا ہے۔[16]

راداگائسوس (Radagaiesus) اور اس کے حملے کے بارے میں سرر نے جو تفصیلات بیان کی ہیں اس کی تمام جزئیات گبن کے یہاں موجود ہیں۔ گبن کے مطابق راداگائسوس نے اپنے زبردست لشکر کے ساتھ ۴۰۶ء میں اٹلی پر حملہ کیا۔[17] الارق نے اسٹلی شو کی درخواست پر مدد کی۔ گبن نے جملہ معرکوں کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے[18] یہ ذکر بھی کیا ہے کہ اسٹلی شو نے راداگائسوس کو شکست دینے کے لیے اس کے لشکر کو گھیرے میں لے کر اس کے گرد خندق کھدوا دی اور اس طرح شکست کے بعد راداگائسوس کے لشکر کی بھاری اکثریت قتل ہوئی۔[19]

مختلف امرا کی سازشوں کے باعث ہونوریوس کے اسٹلی شو سے بدگمان ہو جانے کے واقعات گبن کے یہاں بھی ملتے ہیں اور شرر نے اسٹلی شو کے گرجے میں پناہ لینے اور دھوکے سے امان کے بہانے لے جا کر قتل کیے جانے کے جو واقعات بیان کیے ہیں آن کی جزئیات اور تفصیلات بھی گبن کے یہاں موجود ہیں۔ گبن کے بیان کے مطابق ۲۳ اگست ۴۰۸ء کو اسٹلی شو قتل کیا گیا۔[20]

شرر نے الارق کی طرف سے تین برس کے مصارف جنگ کے مطالبے کا جو ذکر کیا ہے وہ بھی گبن کے یہاں مذکور ہوا ہے[21] علاوہ ازیں یہ ذکر بھی گبن کے یہاں ملتا ہے کہ اسٹلی شو

۱- گبن : باب ۳۰، ص ۱ تا ۷۔ ۲- ایضاً: ص ۱ تا ۷۔ ۳، ۴- ایضاً: ص ۱۲۔ ۵- ایضاً: ص ۱۰۔
۶- ایضاً : ص ۱۳۔ ۷- ایضاً : ص ۱۵۔ ۸- ایضاً : ص ۱۵۔ ۹- ایضاً : ص ۱۷، ۱۸۔
۱۰- ایضاً: ص ۱۹، ۲۰۔ ۱۱- ایضاً : ص ۲۱۔ ۱۲- ایضاً : ص ۲۳۔ ۱۳- ایضاً: ص ۲۶۔
۱۴- ایضاً: ص ۲۷ تا ۲۹۔ ۱۵- ایضاً : ص ۴۹، ۵۰۔ ۱۶- ایضاً: ص ۵۲۔ ۱۷- ایضاً : ص ۳۲۔
۱۸- ایضاً : ص ۳۳ تا ۳۵۔ ۱۹- ایضاً : ص ۳۶، ۳۷۔
۲۰- ایضاً : ص ۵۳ تا ۵۵۔ ۲۱- ایضاً : ص ۴۹۔ ۵۲۔

کے قتل کے بعد الارق کے مطالبے میں شدت پیدا ہوگئی اور اس نے ایک معمولی افسر کے ہاتھ ہونوریوس کو خط بھیجا[1] اور بعد ازاں اکتوبر ۴۰۸ء میں روم کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔[2] شرر نے الارق کی پیش قدمی کی جو تفصیلات دی ہیں ، گبن کے یہاں ان سب کی تصدیق ہوتی ہے۔ گبن کے مطابق الارق الپس (Alps) ، پو (Po) ، ایکویلیا ، اٹلی م ، کنکارڈیا (Concordia) اور کریمونا وغیرہ کو روندتا اور فتح کرتا ہوا ریمنی پہنچا[3] اور اسے فتح کرکے روم کا محاصرہ کر لیا۔ شرر نے روم کے محاصرے اور وہاں کی حالت کی جتنی تفصیلات بیان کی ہیں وہ سب گبن کے یہاں موجود ہیں۔[4] گبن نے اسٹلی شو کی بیوی کے حالات اور اس کے قتل کا واقعہ بھی بیان کیا ہے۔[5]

شرر نے الارق کے روما کے پہلے محاصرے کے بعد تاوان وصول کرکے محاصرہ اٹھا لینے کا جو ذکر کیا ہے اس کی تفصیلات و جزئیات بھی گبن کے یہاں موجود ہیں[6]۔ گبن نے یہ ذکر بھی کیا ہے کہ محاصرہ اٹھا لینے کے بعد الارق نے ہونوریوس سے صلح کی بات چیت شروع کی لیکن یہ بات چیت بے نتیجہ اور غیر مفید ثابت ہوئی جس کے نتیجے میں الارق نے اسی سال یعنی ۴۰۹ء میں روما کا دوبارہ محاصرہ کر لیا۔[7] یہاں اس امر کی طرف اشارہ کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ ناول کا جو نسخہ ہمارے پیش نظر ہے اس میں روما کے محاصرہ کا سن ۴۳۰ء دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس ناول کی تمام جزئیات گبن سے ماخوذ محسوس ہوتی ہیں ، اس لیے یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ شرر نے یہ تاریخ غلط درج کی ہوگی۔ یہ غلطی سہو کتابت کا کرشمہ معلوم ہوتی ہے۔

شرر نے ناول میں دوسرے بار محاصرے کے بعد اتالوس (Attalus) کے قیصر بنائے جانے اور پھر اس کے معزول کیے جانے کا جو ذکر کیا ہے گبن کے یہاں بھی یہ تفصیلات اسی طرح ملتی ہیں۔[8] گبن نے اتالوس کے معزول کیے جانے کی بھی وہی وجہ بیان کی ہے[9] جو شرر کے یہاں مذکور ہے ، علاوہ ازیں افریقہ سے کمک کے آ جانے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ گبن نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ۲۴ اگست ۴۱۰ء کو الارق نے تیسری بار پھر روما کا محاصرہ کر لیا اور اس محاصرے کی جملہ تفصیلات بیان کی ہیں۔ گبن کے بیان کے مطابق ۲۹ اگست ۴۱۰ء کے روما کو خالی کرکے اٹلی کو تباہ کرنا اور اس کے دیگر شہروں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔[11]

گبن نے بیان کیا ہے کہ اٹلی کی تاخت کی مہم ابھی جاری ہی تھی کہ الارق ۴۱۰ء میں مر گیا اور اس کی جگہ اڈولفس بادشاہ بنا۔[12] اڈولفس کی مہمات کے ذکر کے بعد گبن نے بیان کیا ہے کہ اس نے خود ہی جنگ بندی کی تجویز پیش کی ، ہونوریوس کو بلایا ، ایک زبردست متاثرکن تقریر کی اور صلح کرتے ہوئے ۴۱۲ء میں جنگ بند کر دی اور روم کو خالی کر دیا۔[13]

گبن کے یہاں شہزادی پلاسدیا کا ذکر بھی موجود ہے ، جب الارق نے پہلی بار روما کا محاصرہ کیا تو پلاقیدیا وہیں تھی اور اس کی عمر بیس برس تھی۔ گوتھوں نے اسے روم میں

۱- گبن: باب ۳۱، ص ۶۱، ۶۲ -
۲- ایضاً : ص ۶۳ -
۳- ایضاً : ص ۶۴، ۶۵ -
۴- ایضاً : ۶۶، ۶۷، ۹۲ تا ۹۵ -
۵- ایضاً : ص ۹۲ -
۶- ایضاً : ص ۹۵ تا ۹۸ -
۷- ایضاً : ص ۱۰۲ -
۸- ایضاً : ص ۱۰۴، ۱۰۵ -
۹- ایضاً : ص ۱۰۶، ۱۰۷ -
۱۰- ایضاً: ص ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰ -
۱۱- ایضاً : ص ۱۲۰ تا ۱۲۲ -
۱۲- ایضاً : ص ۱۲۳ -
۱۳- ایضاً : ص ۱۲۴، ۱۲۵ -

ہی رکھا ، گبن نے اس کے حسن ، اس سے اڈولفس کی محبت اور ۴۱۴ء میں شادی کا ذکر بھی کیا ہے۔ شادی کے موقع پر پلاقدیا کو دیے جانے والوں تحفوں کی تفصیل بھی بیان کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ پھر اڈولفس سپین چلا گیا اور وہاں اپنی حکومت قائم کرکے پلاقیدیا کو بھی ہمراہ لے گیا۔[۲] اس اعتبار سے شرر کے اس ناول میں سوائے رومانی قصے کے دیگر تمام واقعات تاریخی اعتبار سے درست ملتے ہیں۔

۱۶- الفانسو

یہ ناول ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا۔ اس میں شرر نے سسلی کے ایک بادشاہ کے حالات بیان کیے ہیں، جن میں تاریخی حصہ کم اور رومانی و تخلیقی عنصر زیادہ ہے۔ ناول میں کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے اسے کسی خاص زمانے سے متعلق قرار دیا جا سکے۔ الفانسو میں بیان کیے گئے حالات کا خلاصہ یہ ہے:

جزیرہ سسلی میں بادشاہ مہرجان کی حکمرانی تھی، اس سے پہلے اس کا بھائی کارلوس سسلی کا بادشاہ تھا۔ کارلوس کی بہن بوران کے ایک رئیس سے ناجائز تعلقات قائم ہو گئے تھے جس پر کارلوس نے اس رئیس کو قتل کروا دیا۔ بوران نے سرداروں کو کارلوس کے خلاف اکسا کر پلرمو میں بغاوت کرا دی جس میں کارلوس قتل ہوا اور پھر مہرجان تخت پر بیٹھا۔ مہرجان لاولد تھا اور بہن (بوران) سے دبتا بھی تھا۔ بوران اپنی بیٹی سلطانہ کو ولی عہد بنانا چاہتی تھی اور مہرجان اس پر آمادہ بھی تھا لیکن اسے اپنے بھائی کے دو بیٹوں کا خیال تھا۔ کارلوس کا بڑا بیٹا وان رادرف شاہی محل میں خود بادشاہ کے زیر تربیت تھا جب کہ چھوٹا بیٹا الفانسو وزیر فرنان کے سپرد تھا۔ فرنان نے الفانسو کی بہت اچھی تربیت کی تھی۔ الفانسو اور فرنان کی بیٹی ضیا میں باہمی الفت تھی لیکن فرنان نے ضیا کی دایہ ماریہ، مشاطہ مرجانہ اور لونڈی مٹلڈا کو تاکید کر رکھی تھی کہ ان دونوں کو باہم نہ ملنے دیا کریں۔ ان حالات میں ضیا اور الفانسو اس پہلو پر غور کرنے لگے کہ ان دونوں کے کمروں کے درمیان کوئی خفیہ راستہ بن جائے تو وہ سب کی نظروں سے بچ کر ایک دوسرے سے مل سکیں۔

ان دنوں صقلیہ کے شہر مسینا میں جو ایطالیہ سے قریب تھا نیپلز کی سلطنت کے بعض باغیوں نے بغاوت کے آثار پیدا کر دیے تھے۔ بوران کے مشورے سے مہرجان نے فرنان کو اس بغاوت کے فرو کرنے اور چار پانچ ماہ کے لیے ملک کا دورہ کرنے پر مامور کیا۔ بوران کا اصرار

۱- گبن: باب ۳۶، ص ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸-

۲- (i) ایضاً، ص ۱۲۹-

(ii) اخبارالاندلس (سکاٹ) ترجمہ، ح ۱ کے باب اول دوم کی تعلیقات میں مذکور ہے کہ "جب ۳۹۵ء میں تھیوڈوسی اس اعظم مر گیا اور ملک ہانوری اس اور ارکیڈی اس کے درمیان تقسیم ہو گیا تو الارک بادشاہ وزیگاتھ نے چاہا کہ مشرق سلطنت اس کو اپنا سپہ سالار مان لے۔ جب اس سے انکار ہوا تو اس نے اپنے آدمیوں کو لے کر یونان پر حملہ کر دیا۔ پھر ۴۰۰ء میں اس نے اٹلی پر حملہ کرکے روم کو لوٹ لیا۔ صقلیہ اور افریقہ پر حملہ کرنے کی تیاری میں مصروف تھا کہ موت نے آ دبایا۔ اس کے بعد اٹولوف تخت پر بیٹھا اس نے ہانوری اس کی بہن سے شادی کر لی اور اٹلی کو چھوڑ کر ۴۱۲ء میں جنوبی گل کے راستے پائیرینس سے گزرتا ہوا سپین پہنچ گیا۔"

تھا کہ پلرمو میں جتنی فوج موجود ہے اسے لے کر فرنان ایک ہفتے کے اندر روانہ ہو جائے۔ بوران کے اصرار کی وجہ یہ تھی کہ وہ فرنان کی عدم موجودگی میں کارلوس کے دونوں بیٹوں کا خاتمہ کرانا چاہتی تھی۔ فرنان بھی بوران اور بادشاہ کی اصل چال کو سمجھ چکا تھا اور اس کے توڑ کی تلاش میں تھا کہ فرمانروائے الجزائر کے سفیر پلرمو آ پہنچے۔ ان سفیروں میں الجزائر کا وزیر یحییٰ بن سعد مرابطی، عیسیٰ بن احمد البلوعی اور سپہ سالار فوج حسن بن شہائب السکونی شامل تھے۔ سفیروں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا اور نیپلز کے خلاف جنگ میں بادشاہ کو الجزائر کی مدد پر آمادہ کرنے کے لیے فرنان سے اعانت کی درخواست کی۔ فرنان نے دو چار دن میں صاحب الرائے وزراء سے مشورہ کرکے جواب دینے کا وعدہ کیا۔ فرنان نے اسی دن شاہی خاندان کے ایک فرد وزیر مرکیس کو جو مہرجان کا ابن عم بھی تھا بلایا، اس سے وفاداری کا عہد و پیمان لے کر اپنی الجھنیں اس سے بیان کیں جن میں یتیم شہزادوں کی نگہداشت، الجزائری سفارت کا مقصد اور فرنان کے دورے کے پیچھے بوران کی بد نیتی وغیرہ کے مسائل شامل تھے۔ باہم مشورے سے طے پایا کہ فرنان سفر پر روانہ ہونے سے پہلے مرکیس کو اپنا قائم مقام مقرر کرا جائے اور مرکیس بظاہر بوران کی باتوں میں نیم رضامندی کا اظہار کرکے اس کے منصوبوں سے باخبر ہو کر شہزادوں کو قتل ہونے سے بچائے رکھے نیز سفیروں کے متعلق کہا جائے کہ وہ شہزادوں کے طرف دار ہیں اور ان کی حمایت کے لیے آئے ہوئے ہیں، اس سے بوران اور مہرجان خائف رہیں گے۔ اس مشاورت کے بعد دوسرے دن فرنان نے مرکیس کو نائب مقرر کرا دیا، سفیروں کو سمجھا دیا اور وعدہ کیا کہ وہ واپس لوٹ کر بادشاہ کو حمایت پر آمادہ کر لے گا۔

فرنان کے مسینا کی طرف روانہ ہونے کے بعد مرکیس نے اس کے قصر پر جہاں الفانسو قیام پذیر تھا ایک ہزار سپاہیوں کا پہرہ لگوا دیا اور خود روزانہ جا کر الفانسو اور ضیا کی خیریت دریافت کرتا۔ فرنان کے روانہ ہونے کے تین چار دن بعد الفانسو نے اپنے وفادار غلام لیگانو سے ضیا کے کمرے تک خفیہ راستہ بنوانے کے منصوبے پر مشورہ کیا لیکن مقامی معماروں سے رازداری کی توقع نہ رکھتے ہوئے الفانسو یحییٰ سے ملا اور فرمائش کی کہ رازداری کی شرط کے ساتھ اپنے وطن سے دو چار حبشی غلام اور تین چار ماہر معمار منگوا دے۔ یحییٰ نے بخوشی قبول کرتے ہوئے دوسرے دن الجزائر جانے والے جہاز کے ذریعے اپنے بادشاہ کے پاس خط بھیجا اور چند معمار اور غلام بھیجنے کا لکھا۔ اس دوران ضیا اور الفانسو نے سرنگ کی تعمیر تک محل کے اندر اطمینان کی ملاقاتوں کے لیے تین خادماؤں کو شیشے میں اتار لیا۔ چند دن بعد الجزائر سے غلام اور معمار آ پہنچے جنھیں یحییٰ نے الفانسو کی خدمت میں پیش کیا۔ الفانسو نے معماروں کو اپنا اور ضیا کا کمرہ دکھا کر اپنا مقصد بیان کیا۔ انھوں نے غور کرکے کہا کہ اگر پچاس مزدور مل جائیں تو ایک مہینے میں کام مکمل ہو سکتا ہے۔ الفانسو نے مزدوروں کے سلسلے میں بھی یحییٰ کے ذریعے الجزائری جہاز کے خلاصیوں کی خدمات حاصل کیں اور انتہائی خفیہ طریقے پر کام شروع ہو گیا۔ باہر یہ مشہور کیا گیا کہ ضیا اور شہزادہ اپنے کمروں میں نقش و نگار بنوانا چاہتے ہیں۔ لیگانو کی نگرانی میں اس راز داری سے کام ہوا کہ قصر میں موجود کسی فرد کو بھی کانوں کان اصل بات کی خبر نہ ہو سکی اور سرنگ تیار ہو گئی۔ سرنگ کی استرکاری کے بعد دونوں کمروں میں خوب نقش و نگار بنائے گئے۔ کمروں میں سرنگ کے دروازے اس ہنرمندی سے بنائے گئے کہ غور سے دیکھنے پر بھی ان کی موجودگی کا علم نہ ہو پاتا تھا، چابی لگانے پر دروازوں کے دونوں پٹ بغیر

آواز کے مختلف سمتوں میں سرک جاتے اور پھر خود بخود بند ہو جاتے تھے ۔ ایک کنجی ضیا کو اور دوسری الفانسو کو دے دی گئی ۔ معمار کام ختم کرتے ہی الجزائر لوٹ گئے اور اس طرح ضیا اور الفانسو کی دن رات کی ملاقاتوں کا خفیہ سلسلہ شروع ہو گیا ۔ الفانسو رات کو احتیاطاً سرنگ میں یا ضیا کے کمروں میں جا کر سو جاتا اور اس طرح وہ دو بار بوران کے بھیجے ہوئے آدمیوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بھی بچ گیا ۔

بوران نے مرکس کو سلطانہ سے شادی اور صقلیہ کی حکومت کا لالچ دے کر ساتھ ملانا چاہا لیکن مرکیس سلطانہ کی آبروباختگی سے باخبر تھا ۔ چار پانچ ماہ بعد فرنان واپس آ گیا ۔ حالات کو معمول پر دیکھ کر مرکس کا شکریہ ادا کیا ۔ بادشاہ سے مل کر الجزائری سفیروں کی آمد کی اصل غایت بیان کی اور اسے یہ معاہدہ کرنے پر آمادہ کر لیا کہ بیرونی حملے کی صورت میں ایک ملک دوسرے کی مدد کرے گا ۔ سفیر خوش خوش لوٹے اور اتفاقاً ادھر الجزائر اور نیپلز میں بھی جنگ بند ہو کر صلح ہو گئی ۔

الجزائر کے ساتھ دوستی کے معاہدے کو تین برس گزر گئے ۔ پلرمو میں سلطانہ کی آوارگی کے قصے گھر گھر مشہور ہو گئے، اس کا گھر ہر قسم کی بد چلنیوں کا مرکز بن گیا تھا ۔ بوران اب بھی فرنان سے مسلسل یہ تقاضا کر رہی تھی کہ شہزادوں کو قتل کرا دیا جائے ۔ آخر فرنان نے اسے مشورہ دیا کہ الفانسو کو وارث تاج و تخت قرار دے کر سلطانہ سے اس کی شادی کر دی جائے ۔ بوران کو خدشہ تھا کہ شہزادے اس سے اپنے باپ کا انتقام لیں گے لیکن بالآخر کوئی چارہ نہ دیکھ کر آمادہ ہو گئی اور الفانسو کو دوسرے دن دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا ۔ فرنان نے الفانسو کو خوش خبری سنائی کہ بادشاہ اسے دربار میں طلب کر کے ولی عہد مقرر کرنا چاہتا ہے ۔ اسی رات فرنان اچانک بادشاہ کی شدید علالت کی خبر سن کر شاہی محل کی طرف چلا گیا اور ضیا اور الفانسو میں رات دیر تک بہان نسو ہوئے، الفانسو نے قسم کھائی کہ وہ بادشاہ بنتے ہی ضیا کو اپنی ملکہ بنا لے گا اور اگر ایسا نہ کر سکا تو تاج و تخت چھوڑ دے گا ۔

دوسری صبح فرنان درباری لباس پہنے ہوئے امراء اور سرداران فوج کے ہمراہ الفانسو کے پاس آیا ۔ تنہائی میں جہاں فرنان کے علاوہ ضیا اور ماریہ بھی تھیں فرنان نے الفانسو کو بتایا کہ بادشاہ الفانسو کی ولی عہدی کی وصیت کرنے کے بعد مر گیا ہے ۔ اب وہ الفانسو کو رسم تاج پوشی ادا کرنے کے لیے لے جانے آئے ہیں ۔ الفانسو نے بے اختیار وزیر کے سامنے ضیا سے اپنی محبت کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اسے اپنی ملکہ بنائے گا ۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سادہ کاغذ اور اپنی مہر ضیا کے حوالے کر دی کہ وہ جو شرائط چاہے لکھ کر مہر لگا دے ۔ ضیا نے اپنے باپ کو مختار قرار دیتے ہوئے کاغذ اور مہر اس کے سپرد کر دی ۔ پھر فرنان تو ضیا کو ساتھ لے کر اسی وقت دربار آراستہ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا اور الفانسو شاہی لباس پہن کر سرداران فوج کے جلو میں شاہی گھوڑے پر سوار ہو کر لوگوں کے سلام لیتا قصر شاہی کو چلا ۔ دربار میں سلطانہ اور بوران بھی موجود تھیں ۔ سلطانہ نے بڑی بے تکلفی کا مظاہرہ شروع کیا ۔ جب الفانسو تخت پر بیٹھ گیا تو فرنان نے وصیت پڑھ کر سنائی کہ بادشاہ نے الفانسو کو اس شرط کے ساتھ ولی عہد مقرر کیا ہے کہ وہ سلطانہ سے شادی کرے گا اور اگر وہ انکار کرے تو پھر سلطانہ کی شادی وان رادرک سے کر کے تخت و تاج اس کے حوالے کر دیا جائے ۔ الفانسو برہمی کے ساتھ اس شادی سے انکار کا اعلان کرنا چاہتا تھا کہ وزیر نے اس کے بولنے سے پہلے

ایک کاغذ نکال کر پڑھا جو الفانسو کی طرف سے شادی کرنے کے اقرار میں تھا اور اس نے امراء کو اس کاغذ پر الفانسو کی مہر بھی دکھائی ۔ الفانسو کو سخت غصہ آیا لیکن وہ یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ شادی کے لیے پوپ سے اجازت ملنے میں بھی چھ سات ماہ لگیں گے اس دوران وہ وزراء اور سرداران فوج کو ہمنوا بنا کر سلطانہ سے شادی سے انکار کر دے گا ۔ یہ دربار نذریں قبول کرنے کے بعد برخواست ہوگیا ۔

دربار کے برخواست ہونے پر تخلیے میں الفانسو فرنان پر بہت برہم ہوا اور صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے باپ کے قاتل کی بیٹی اور ایک بدکار لڑکی سے ہرگز شادی نہیں کرے گا ۔ پھر وقتی مصلحت کے تحت خاموش ہو رہا اور کئی دن ضیا سے ملنے کے لیے نہ جا سکا ، بوران اور سلطانہ سے خندہ پیشانی سے ملتا رہا ۔ سلطانہ کو جلد شادی کا اصرار تھا اور الفانسو اسے محبت کا جھوٹا یقین دلا کر بہلا رہا تھا ۔ ایک دن سلطانہ اور الفانسو کے درمیان اسی مضمون کی گفتگو ضیا اور وزیر نے بھی سن لی ، جس کا ضیا پر شدید رد عمل ہوا اور سلطانہ ضیا اور الفانسو کے درمیان کسی عہد و پیمان کے وجود کو بھانپ گئی ۔ قصر شاہی سے واپس جاتے ہوئے فرنان نے بیٹی کے دل میں ہر طرح یہ بات بٹھانے کی کوشش کی کہ الفانسو کے سارے وعدے جھوٹے تھے اور وہ محض لڑکپن کی جذباتیت تھی ، اگرچہ ضیا اسی بات پر اڑی رہی کہ اگر الفانسو بے وفائی بھی کرے تو وہ کسی دوسرے سے شادی نہیں کرے گی ۔ سلطانہ نے یہ سوچ کر کہ اسے اپنے مقاصد کے حصول میں فرنان سے ہی مدد مل سکتی ہے فوراً اس کے گھر کا رخ کیا ، وہاں اس نے ضیا کو الفانسو کے خلاف خوب بھڑکایا اور پھر فرنان اور سلطانہ دونوں نے مل کر ضیا کو مرکیس سے شادی کے لیے آمادہ کر لیا ۔ اس کام میں اسی قدر عجلت دکھائی گئی کہ اسی وقت قصر فرنان کے گرجے میں ضیا اور مرکس کا نکاح پڑھوا دیا گیا ۔

شب عروسی کو ضیا ناسازیٔ طبع کا بہانہ کرکے الگ بیٹھ کر روتی رہی اور مرکیس تنہا بستر پر کروٹیں بدلتا رہا ۔ الفانسو کو شبہ تھا کہ ضیا نے اس کی اور سلطانہ کی گفتگو سن لی ہے اس لیے وہ امور مملکت سے فارغ ہوتے ہی ضیا کی غلط فہمی رفع کرنے کے لیے آدھی رات کو قصر فرنان میں پہنچا اور سرنگ کے راستے ضیا کے کمرے کی طرف چلا ۔ وہ اس شادی سے ، جو اسی دن چند گھنٹوں میں طے ہوکر سرانجام پا گئی تھی ، بےخبر تھا ۔ سرنگ کے زینوں پر الفانسو کے قدموں کی آہٹ محسوس کرتے ہی ضیا نے شمع گل کر دی اور جب الفانسو کمرے میں پہنچا تو اس نے دبی زبان میں ضیا کو پکارا ۔ مرکیس اندھیرے میں ہی تلوار لے کر جھپٹا اور کسی کے بھاگنے کی آواز سن کر لپکا لیکن خود ہی دیوار سے ٹکرا کر زخمی ہوگیا ۔ مرکیس کا شور سن کر سب جمع ہوگئے ۔ فرنان کو شبہ تھا کہ الفانسو ہوگا اور ضیا نے سازش کرکے دروازہ کھولا ہوگا لیکن یہ شبہ اس نے کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا ۔ مرکیس بقیہ تمام رات تلوار لیے بیٹھا رہا ۔

الفانسو کے لوٹ جانے کے بعد ضیا کے دل میں یہ سوچ کر اس کے لیے نفرت پیدا ہونے لگی کہ وہ محبت تو سلطانہ سے کرتا ہے اور اسے ذلیل کرنے کے لیے آیا تھا ۔ ادھر الفانسو اس ادھیڑبن میں تھا کہ ضیا کے کمرے میں کوئی مرد کیوں اور کون تھا ۔ دوسری صبح الفانسو شاہانہ جلوس کے ساتھ شکار کے لیے گیا اور شکارگاہ سے ایک ہرن کے تعاقب کے بہانے قصر فرنان کی پشت پر پرفضا باغ میں جا پہنچا جہاں ضیا ایک بنچ پر ماریہ کے گود میں سر رکھے رو رہی تھی ۔ وہاں پہنچ کر الفانسو پر یہ انکشاف ہوا کہ ضیا نے مرکیس سے شادی کر لی ہے ، الفانسو نے

سلطانہ کے بارے میں اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن ضیا کچھ سنے بغیر قصر کی طرف لوٹ گئی ۔ الفانسو غصے میں بھرا ہوا شکارگاہ میں پہنچا اور سب کو فوراً لوٹ چلنے کا حکم دیا ۔ راستے بھر وہ سوچتا رہا کہ فرنان اور مرکیس دونوں کو پکڑوا کر قتل کرا دے لیکن قصر میں پہنچ کر اس نے کوتوال شہر کو حکم دیا کہ مرکیس وان رادرف کے ساتھ مل کر اس کے خلاف سازش کر رہا ہے اس لیے اسے فوراً گرفتار کر کے حراست میں رکھا جائے ۔ شاہی حکم کی فوری تعمیل ہوئی اور مرکیس باغیوں کی طرح پا بہ زنجیر قید خانے میں پہنچ گیا ۔

مرکیس کی گرفتاری پر فرنان نے سوچا کہ خود ہی بادشاہ کے پاس جا کر منت سماجت کرے لیکن قصر شاہی میں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ کسی کو باریابی کی اجازت نہیں حتیٰ کہ سلطانہ بھی اجازت نہ ملنے پر واپس لوٹ گئی ہے ۔ فرنان کئی گھنٹے وہاں ٹہلتا رہا اور بالآخر موقع پاکر اندر گھس گیا ۔ بادشاہ کے قدموں پر گر کر گڑگڑایا ۔ الفانسو نے فرنان سے کہا کہ وہ سلطانہ سے ہرگز شادی نہیں کرے گا خواہ تاج و تخت سے ہاتھ دھونا پڑے ۔ فرنان کو لعنت ملامت کرتے ہوئے اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ ضیا کو ہر قیمت پر حاصل کرے گا اور اگر ناکام رہا تو صقلیہ سے چلا جائے گا اور صقلیہ میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی ۔ آخر جب فرنان نے بہت منت سماجت کی تو الفانسو نے مرکیس کی رہائی کا وعدہ کیا اور کہا کہ قصر فرنان کے جن کمروں میں اس نے بچپن گزارا ہے وہاں اسی کا قبضہ رہے گا اور لیگانو ان میں قیام کرے گا ۔ فرنان کے چلے جانے کے بعد الفانسو نے سوچا کہ مرکیس کو ایک رات قید میں ہی رہنے دیا جائے اور خود رات کو ضیا سے مل کر گفتگو کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرے ۔

مرکیس کو گرفتاری سے پہلے ہی مٹلڈا سے ضیا اور الفانسو کی محبت کا علم ہو چکا تھا اور جب فرنان سے رہائی کی خوش خبری سننے کے باوجود رات تک اس کی رہائی کا حکم نہ آیا تو اسے شبہ ہوا کہ الفانسو اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے ۔ چنانچہ اس نے داروغہ سے مل ملا کر وہ رات گھر جا کر رہنے کی اجازت حاصل کر لی اور کسی کو خبر کیے بغیر مٹلڈا کے ذریعے چپکے سے ضیا کے حجلۂ عروسی میں جا چھپا ۔ وہاں اس نے ماریہ اور ضیا کی گفتگو سنی، پھر سلطانہ آ کر ضیا کو زبردستی کھانے کے لیے لے گئی ۔ سلطانہ چاہتی تھی کہ وہ ضیا کے بہروپ میں اس کے کمرے میں سوئے تا کہ الفانسو آئے تو اس سے باتیں کرکے اس کے دل کا بھید معلوم کرے لیکن ضیا نہ مانی اور اپنے کمرے میں چلی گئی ۔ ضیا کو خود بھی الفانسو کی آمد کی توقع تھی ۔ الفانسو آیا ، دونوں نے گلے شکوے کیے ، دل کا غبار نکالا ، آخر ضیا نے الفانسو کی منت کی کہ عشق اور شرافت کے مقابلے میں ایسے حالات نہ پیدا ہونے دے کہ ضیا کے ہاتھوں سے شرافت کا دامن نکل جائے ۔ پھر الفانسو کو آیندہ نہ آنے کی تاکید کی اور کمرے سے نکلنے کا بہانہ پیدا کرنے کے لیے شمع گرا کر بجھا دی ۔ ضیا تو شمعیں روشن کرانے کے لیے کمرے سے نکل گئی لیکن الفانسو وہیں رکا رہا ۔ ضیا کے باہر جاتے ہی مرکیس اندھیرے میں الفانسو پر جھپٹ پڑا ۔ الفانسو مرکیس کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے صرف وار بچاتا رہا ۔ سلطانہ چونکہ دیر سے دروازے کے ساتھ لگ کر الفانسو اور ضیا کی گفتگو سنتی رہی تھی اس لیے جب ضیا شمعیں روشن کرنے نکلی تو سلطانہ ، جو مکمل طور پر ضیا کے بہروپ میں تھی ، شمعیں لے کر اندر جانے پر مصر ہوئی ، مجبوراً ضیا دوسرے کمرے میں چلی گئی ۔ سلطانہ جب ضیا کے بہروپ میں شمعیں لیے کمرے میں داخل ہوئی تو الفانسو اور مرکیس میں تلوار چل رہی تھی ۔ مرکیس

اس کی جانب ذرا سا متوجہ ہوا ہی تھا کہ الفانسو کی تلوار اسے گلے سے سینے تک کاٹ گئی۔ وہ شمع رکھ کر دوڑی اور مرکیس سے لپٹ گئی، دونوں گرے اور گرتے ہی مرکیس نہ یہ کہہ کر اس کے بھی خنجر گھونپ دیا کہ وہ ضیا کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہے، الفانسو تمام عمر روتا رہے۔ جب وہ دونوں مر گئے تو الفانسو رونے چیخنے اور سینہ کوبی کرنے لگا۔ بہت سے لوگ جمع ہوگئے۔ فرنان بھی بیٹی اور داماد کی لاشیں دیکھ کر سینہ کوبی کرنے لگا اور الفانسو کو طعنے دیے تو الفانسو نے ہاتھ سے تلوار پھینک دی، ان نتائج کو فرنان کے اعمال کا انجام قرار دیتے ہوئے خودکشی کے لیے کمر سے خنجر نکالا اور اپنے سینے میں بھونکنا چاہتا تھا کہ پیچھے سے ضیا نے ہاتھ پکڑ لیا۔ سب دوسری ضیا کی موجودگی پر حیران رہ گئے۔ آخر اصلیت کوئلی اور وزیر نے اپنے قصوروں در بادشاہ سے معافی مانگی اور کہا ضیا الفانسو کی ہے۔ الفانسو نے فرنان کی خواہش پر اسے سرنگوں کی سیر کرائی اور خفیہ دروازوں کا راز دکھایا۔ فرنان نے وہ قصر بیٹی کے جہیز میں دینے کا اعلان کیا۔ مرکیس اور سلطانہ کے جنازے اہتمام سے اٹھائے گئے۔ ضیا اور الفانسو نے بھی ماتمی جلوس میں شرکت کی۔

بوران نے ہر طرف سے ناکام ہوکر وان رادرق کو ابھارا اور اس نے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر بغاوت کر دی۔ وان رادرق کے ساتھی الفانسو کی فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور بھاگ کر مسینا چلے گئے۔ وہاں کے باغیوں کو اپنے ساتھ ملایا، ایطالیہ میں سفیر بھیجے۔ اس طرح اتنی قوت پیدا کر لی کہ الفانسو سے متعدد لڑائیاں لڑیں۔ چند روز میں سلطنت نیپلز بھی وان رادرق کی طرف دار ہوگئی اور ایطالیہ سے بھی بہت سی فوجی کمک آئی۔ اس کے جواب میں الجزائر سے جرار عربی لشکر آیا اور ساتھ ہی صقلیہ کے مسلمان بھی الفانسو کے حق میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ وان رادرق جنگ میں مارا گیا۔ بوران گرفتار ہوکر الفانسو کے حکم سے قتل ہوئی۔ فرنان خود رومۃ الکبریٰ جا کر پوپ سے ضیا اور الفانسو کی شادی کی اجازت لے آیا اور اس طرح پلرمو میں پھر سے خوشیاں لوٹ آئیں۔

تحقیقی جائزہ:

"الفانسو" کو تاریخی ناول کہتے ہوئے اس اعتبار سے قدرے ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے کہ اس میں کوئی زمانہ متعین نہیں اور ایسے واقعات بیان کیے ہیں جو کسی دور کے بھی ہوسکتے ہیں۔ ناول میں کرداروں کے بعض نام مثلاً ضیا، مرجانہ، مہرجان وغیرہ ایسے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ناول اس عہد کا ہے جب کہ سسلی پر اسلامی تہذیب کا کافی اثر پڑ چکا تھا۔ ناول کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں سسلی پر اسلامی حکومت نہیں تھی اور نہ ہی اس کا کوئی بہت گہرا اثر تھا کیونکہ بادشاہ الجزائر کے سفیروں کو مہینوں وہاں ٹھہرائے رکھتا ہے اور ان سے ملاقات نہیں کرتا۔ اس سے پہلے وہ ان سے معاہدہ کرنے سے انکار بھی کر چکا ہے۔ گویا ناول کا زمانہ وہ عہد ہے جب سسلی پر سے اسلامی حکومت ختم ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ ناول کے زمانی دور کو ہم اسلام کے ابتدائی دور سے متعلق تصور نہیں کر سکتے جیسا کہ اوپر وجہ بیان کی جا چکی ہے۔

ناول کا زمانہ متعین کرنے میں ایک دقت یہ بھی ہے کہ یہ نہیں بتایا گیا کہ مسلمان سفیر کس حاکم یا بادشاہ نے بھیجے تھے ورنہ اس سے ہی کوئی زمانہ متعین کیا جا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں

الفانسو نام بھی ایک عام نام ہے جو کئی بادشاہوں کا رہا۔ اشخاص قصہ کے نام جو تاریخی تصور کیے جا سکتے ہیں ایسے ہیں کہ وہ کسی بھی دور کے ہو سکتے ہیں اور ناول کا زمانہ متعین کرنے میں مدد نہیں دیتے۔

ناول کے واقعات زیادہ تر رومانی ہیں اور کوئی ایسا تاریخی واقعہ درمیان میں نہیں آتا جس سے تجزیہ کیا جا سکے۔ سسلی پر مستند کتب تواریخ مثلاً فری مین اور ریاست علی ندوی کی تالیفات بھی اس ضمن میں خاموش ہیں۔ خود شرر کا بھی اس ضمن میں کوئی ایسا بیان یا مضمون نہیں ملتا جس سے اس کے دور کا تعین کیا جا سکے۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شرر نے بعض ایسے ناموں کو لے کر جو کسی ملک کے لوگوں میں عام ہیں اس قصے کی تخلیق کی ہے۔

۱۸- مفتوح فاتح

یہ ناول ۱۹۱٦ء میں شائع ہوا۔ اس میں شرر نے دوسری صدی ہجری کے اوائل کے حالات بیان کیے جب مسلمان اسلامی علم لہرا چکا تھا اور عساکر اسلامیہ پیرینیز کی چوٹیوں سے دوسری طرف فرانس میں پیش قدمی کر رہی تھیں۔ ناول میں بیان کردہ واقعات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۱۰ھ کے موسم بہار میں پیرینیز کے گھاٹیوں میں شہر بشکنس میں عربی فوج کا بڑا کیمپ تھا جہاں فرانس پر حملے کے لیے دس بیس ہزار فوج ہر زمانے میں موجود رہا کرتی تھی۔ ان دنوں وہاں عثمان بن ابی نسعہ اللخمی خثعمی نامی تیس سالہ نوجوان سالار فوج تھا۔ پہلے پہل جب ہیثم بن عبدالکلابی حاکم اندلس نے عثمان کو ان علاقوں پر متعین کیا تھا تو عثمان بہت خوش تھا، لیکن جب رعایا پر ہیثم کے مظالم بڑھ گئے تو عثمان نے آگے بڑھنے کی بجائے بشکنس میں ہی قیام کر لیا۔ خلیفہ ہشام بن عبدالملک کو ہیثم کے مظالم کا پتہ چلا تو محمد بن عبداللہ اشجعی کو مناسب اختیارات کے ساتھ خفیہ طور پر تحقیقات کے لیے بھیجا۔ محمد بن عبداللہ اشجعی نے اندلس میں دو ماہ تک خفیہ طور پر تحقیقات کی اور پھر اچانک دارالامارت قرطبہ میں پہنچ کر ہیثم کو معزول کرکے گدھے پر بٹھا کر شہر میں گھمایا اور بعد ازاں فوجی حراست میں دمشق بھیج دیا۔ عثمان ان حالات سے باخبر تھا اور خود کو اندلس کی امارت کا حق دار تصور کرتا تھا کیونکہ دو بار پہلے بھی وہ اس منصب پر مامور ہوا تھا۔ اس نے اپنے دو دوستوں لیث بن حنظلہ الفہری اور ابو عامر کو قرطبہ بھیجا کہ محمد بن عبداللہ اشجعی کے سامنے عثمان کی تعریفیں کریں اور اس کی امارت کے لیے کوشش کریں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا لیکن محمد بن عبداللہ سمجھ گیا کہ وہ خود عثمان کے فرستادہ ہیں۔ اس نے جمعہ کی نماز میں خطبہ کے بعد ایک نیک نفس تابعی پرہیزگار بزرگ عبدالرحمن بن عبداللہ الکلبی الغافقی کو امیر اندلس مقرر کر دیا۔

الباب کے قصر امارت میں قیام کے دوران عثمان نے قسطلہ اور نربونہ کی خوب صورت لونڈیوں سے اکوی طانی کی شہزادی مینینہ کے حسن کی تعریف سنی، وہیں اسے بشکنس کے قاید کے پیغام سے معلوم ہوا کہ عبدالرحمن امیر اندلس مقرر ہوگئے ہیں۔ عثمان ان کی پرہیزگاری کا تو معترف تھا لیکن انھیں حکومت کا اہل نہ تصور کرتا تھا۔ یہیں لیث اور ابو عامر نے واپس پہنچ کر اسے حالات سنائے، چند دنوں میں اس کے پاس امیر کا تحریری فرمان آ گیا جس کی رو سے اسے امیرالجہاد مقرر کیا گیا تھا اور بیس ہزار لشکر نو کی کمک بھیجی گئی تھی۔ عثمان نے

خود بھی بشکنس میں پندرہ ہزار سپاہی جمع کر لیے تھے۔

پیرینیز کے شمالی علاقے میں جاگیرداری نظام تھا، اس کا ایک کونہ جس کا صدر مقام نربونہ تھا مسلمانوں کے قبضے میں تھا، اس سے ملحقہ اکوی طانی کے علاقے میں پرانے مرادی جین خاندان کے بادشاہ یودیز کی حکومت تھی۔ بردی غالہ (بورڈو) اس کا دارالسلطنت تھا۔ عربوں نے کئی بار اس پر حملے کیے لیکن مستقل قبضہ نہ کر سکے۔ یودیز ان دنوں بہار کا لطف اٹھانے کے لیے پورے خاندان سمیت مغربی کوہسار کے شہر انوس میں قیام پذیر تھا۔ انوس میں عالی شان گرجے اور پرشکوہ سرائیں تھیں، فرانس کے لاکھوں زائرین وہاں آیا کرتے تھے، انوس سے مشرق کی طرف دو میل پر ولی یوحنا کی زیارت گاہ تھی۔ زیارت گاہ سے ایک میل اوپر چشمے کے قریب یودیز کا قصر تھا۔ مسلمانوں کے حملے کی تیاری کی خبر سن کر یودیز اپنے خاندان سمیت فوراً دارالسلطنت کو لوٹا۔

اسلامی لشکر عثمان کی سرکردگی میں طراسقو سے تین میل جنوب کی طرف پہنچ چکا تھا۔ اس لشکر میں اس وقت بیس ہزار سوار اور بیس ہزار پیادہ تھے۔ طراسقو سے بھی اسلامی لشکر ان سے آ ملا اور عثمان نے نربونہ کے حاکم خلف بن عباس الخزاعی کو پیغام بھیجا کہ وہ نربونہ سے مدینہ طولوس پر قبضہ کرتا ہوا بردی غالہ کی طرف بڑھے اور تاکید کی کہ جب تک عثمان لغ دونی (سنتا برطرانده) پہنچے اس وقت تک خلف کو چاہیے کہ طولوس کو فتح کر کے دریائے عرونہ کے پار اتر جائے۔ عثمان وہاں سے آگے بڑھا تو چار میل بعد یودیز کی قلمرو میں تھا۔ عثمان پیش قدمی کرتا ہوا قصرانی (سبنتالیزیز) پہنچا۔ عیسائی شہری اور لشکری بلا مقابلہ بھاگ نکلے۔ عثمان نے آگے بڑھ کر عیسائیوں کو شکست دے کر سنتا برطرانده پر قبضہ کر لیا۔ پانچ دن وہاں قیام کے بعد عثمان مزید تیس میل سفر کر کے شہر انور کے قریب پہنچا جہاں یودیز کے سپہ سالار فریڈرک نے پچیس ہزار کے لشکر سے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ عثمان اتور میں ایک ہفتہ قیام کے بعد شہر ال بورو (اولیرون) کی طرف بڑھا جو دریائے اردوبہ کی دو چھوٹی چھوٹی شاخوں کے سنگم پر تھا۔ عیسائیوں نے یہاں بھی پچاس ہزار کے لشکر سے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔

یودیز کو عثمان کی ان فتوحات کی خبروں نے بردی غالہ میں متردد کر دیا تھا۔ مینبنہ نے باپ کو مشورہ دیا کہ توسیو، سوتیوم اور قوقوسیہ کے قلعوں میں خوراک جمع کر کے قلعہ بند ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ یودیز بردی غالہ کے قریب قوسیو میں ٹھہرے اور شہزادی سوتیوم اور قوقوسیہ جائے۔ کانفرنس کے مشورے سے شہزادی پچاس ہزار فوج کے ساتھ قوقوسیہ کی طرف روانہ ہوئی۔ عثمان نے اولیرون پر قبضے کے بعد مدت تک وہاں قیام کر کے ارد گرد کے علاقے فتح کیے اور ان کا نظام درست کیا۔ اندلس سے مزید تیس ہزار کمک کے آ جانے سے اب پھر اس کے پاس پچاس ہزار کا لشکر مرتب ہو چکا تھا۔ خلف بھی طولوس کو فتح کر کے عرونہ کے پار اتر چکا تھا اور شہر لقورہ کے قریب تھا۔ عثمان نے سرداروں سے مشورہ کر کے مجاہد بن علقمہ السیبانی کو بیس ہزار کے لشکر کے ساتھ قوقوسیہ کی طرف روانہ کیا جو اولیرون سے ستر میل کے فاصلے پر تھا اور خود تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ طربیس کے راستے سوتیوم پہنچنے کا قصد کیا۔ یودیز عثمان کی اس حکمت عملی سے بے خبر تھا اس لیے اس نے سوتیوم میں معمولی فوج چھوڑ کر قوقوسیہ کے دفاع پر ہی زیادہ زور دیا۔ شہزادی خود سوتیوم میں تھی اور اس نے قلعہدار کی مدد سے ہیلنا نامی ایک خوب رو لڑکی کو قوقوسیہ میں عربوں کے لشکر کا حال معلوم کرنے پر مامور کیا۔

ہیلنا خود کو طولوس کے اطراف کے ایک مسیحی سردار کی بیٹی نتالی تھی اور الباب سے عثمان کے قصر سے بھاگ آئی تھی ۔ ہیلنا عثمان کی ایک دوسری لونڈی ریحانہ سے ملنے کے لیے قوقوسیہ روانہ ہوئی، اسے اور سلوریا کو گئے تین دن ہوئے تھے کہ عثمان نے اچانک سوتیوم پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا ۔ شہزادی نے فوری طور پر لودیز اور قلعہ دار قوقوسیہ کو کمک کے لیے لکھا ۔

ہیلنا اور سلوریا راہبات کے لباس میں قوقوسیہ سے ابھی پانچ میل ادھر ہی تھیں تو انھیں معلوم ہوا کہ عثمان خود لشکر کے ساتھ سوتیوم پہنچ چکا ہے اور قوقوسیہ کے محاصرے پر مجاہد بن علقمہ مامور ہے ۔ یہ دونوں وہیں سے سوتیوم کی طرف لوٹیں ۔ قلعے کا محاصرہ ہو چکا تھا ۔ ہیلنا نے اپنی موجودگی کو چھپاتے ہوئے سلوریا کے ذریعے ریحانہ کو خط بھیجا اور لکھا کہ وہ عثمان کو شہزادی سے ملوا سکتی ہے ۔ سلوریا عثمان سے بھی ملی اور ہیلنا کو قلعے سے لانے کے بہانے قلعے میں داخلے کا اجازت نامہ حاصل کیا ۔ سوتیوم کے اندر صرف آٹھ ہزار فوج تھی اور قلعے پر عثمان کے حملے جاری تھے کہ سلوریا اور ہیلنا قلعے کے اندر پہنچ کر شہزادی سے ملیں، عثمان کا خط دیا ، سب نے مل کر غور کیا اور طے پایا کہ ہیلنا عثمان کے پاس جائے اور اسے بتائے کہ شہزادی دوسرے دن میدان جنگ میں آئے گی ۔ نیز شہزادی مقررہ دن باہر نکل کر لڑے اور عثمان کے سامنے نقاب اٹھا کر بجلی گرانے والا حربہ استعمال کرے ۔

ہیلنا پروگرام کے مطابق عثمان سے ملی ۔ عثمان نے ہیلنا سے اس کی بے وفائی کی شکایت کی ، ہیلنا نے شہزادی کے لیے عثمان کی آتش شوق کو بھڑکایا اور وعدہ کیا کہ دوسرے دن میدان جنگ میں وہ شہزادی کے قریب ہوگی، اگر عثمان وہاں تک پہنچ آئے تو وہ اسے شہزادی سے ملوا دے گی ۔ قلعے میں پہنچ کر ہیلنا نے شہزادی کو پروگرام سے مطلع کیا اور عثمان کے مزاج سے آگاہ کرتے ہوئے پھولوں کا تاج ، پھولوں کا زیور اور پھولوں کا لباس پہننے اور زلفیں کھلی چھوڑنے کا مشورہ دیا ۔ دوسری صبح اس گھنٹے میں شہزادی بن سنور کر تیار ہوئی اور آب رواں کا برقع پہن کر چھ ہزار فوج کے ساتھ سہیلیوں کے جھرمٹ میں قلعے سے باہر نکلی ۔ زور کی جنگ ہوئی ۔ دو گھنٹے بعد ہیلنا شہزادی کے گروہ سے سفید جھنڈی لیے ہوئے نکلی، عثمان اسے دیکھ کر بس پچیس سواروں کے ساتھ ادھر لپکا، ہیلنا سے ملا اور پھر اس کی رہنمائی میں شہزادی تک پہنچا ۔ تعارف کے بعد جوںہی شہزادی نے نقاب الٹا عثمان بے ہوش ہو کر تیورایا ، شہزادی کی سہیلیاں عثمان کو فوراً گھوڑے پر ڈال کر لے بھاگیں لیکن پھاٹک کے قریب عربی سواروں کے ایک دستے نے انھیں پکڑ لیا ، عثمان کی بے ہوشی مصنوعی تھی اس نے فوراً آنکھیں کھول کر لشکر کو فرض شناسی پر داد دی اور شہزادی اور اس کی سہیلیوں کو پانچ سو سپاہیوں کی نگرانی میں ایک خیمے میں بٹھا دیا ۔ عثمان نے قلعہ دار سرویطوس کو شہزادی کی گرفتاری کی خبر بھیج کر ہتھیار ڈال دینے کا مشورہ دیا مگر وہ آمادہ نہ ہوا ۔ دریں اثنا چار ہزار فرانسیسیوں نے ہتھیار ڈال کر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا ۔ عثمان نے دو دن کے لیے التوائے جنگ کا حکم دے دیا ۔

عثمان اور لیث میں تبادلہ خیال ہوا ، پھر عثمان نے شہزادی سے گفتگو کے بعد اس کے تمام قیدی سپاہیوں کو رہا کر دیا اور اسلحہ واپس کرا دیا ۔ سرویطوس کو بلا کر کہا کہ قلعے میں جا کر انتظام کرے ، عثمان دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ قلعے میں ان کا مہمان ہوگا لیکن اس سے پہلے کہ عثمان قلعے میں جائے سرویطوس پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ آ کر شہزادی کو عزت و حرمت کے ساتھ قلعے میں لے جائے ۔ لیث نے اس حد سے بڑھی ہوئی مہربانی کو خطرناک قرار دیا لیکن

عثمان نہ مانا، شام کو پر شکوہ جلوس کے ساتھ شہزادی سوتیوم میں واپس گئی، جلوس کے پیچھے پیچھے عثمان بھی تھا۔ عثمان نے دوسرے دن مجاہد کے لیے حکم بھیجا کہ قوقوسیہ میں جنگ بند کرکے وہ بھی وہیں آ جائے۔ عثمان نے یودیز کو خط لکھا کہ وہ شہزادی کی خاطر صلح قبول کر رہا ہے، تمام مفتوحہ علاقہ واپس کر دیا جائے گا، یودیز معمولی سا سالانہ خراج ادا کرنا، سپاہیوں کے لیے کچھ نذرانہ دینا اور عثمان سے شہزادی کی شادی کر دینا قبول کرے۔

یودیز چار پانچ دن میں سوتیوم آ پہنچا، باپ بیٹی میں گفتگو ہوئی، مینینہ کی خواہش کے پس نظر غور و فکر کے بعد اس نے اسے عثمان سے شادی کی اجازت دے دی۔ شرائط صلح طے ہو گئیں اور یودیز نے پچاس ہزار سالانہ خراج اور فوج کے لیے پانچ لاکھ اشرفیاں نذرانہ دینا قبول کیا، معاہدہ تحریر ہوگیا۔ اس دوران معلوم ہوا کہ خلف توسو سے دس میل کے فاصلے پر پہنچ گیا ہے، عثمان نے فوراً خلف کے نام جنگ بندی کا حکم جاری کیا۔ قاضی ابو ساعد خولانی نے عثمان اور شہزادی مینینہ کا نکاح پڑھایا۔ خلف بھی سوتیوم آ پہنچا۔ اب کل اسلامی لشکر کی تعداد اسی ہزار ہو چکی تھی اور یودیز کی رعایا پر ناقابل برداشت بوجھ پڑ رہا تھا، چنانچہ شہزادی نے فوج کے نذرانے کی رقم فوراً ادا کروائی اور لشکر کے ہمراہ خود بھی ہنی مون منانے کے لیے الباب کی طرف روانہ ہوگئی۔

امیر عبدالرحمن اندلس میں امن و امان بحال کرنے کے بعد اب خود بھی جہاد کرنے کے پہلو پر غور کر رہا تھا کہ اسے نربونہ سے خلف کا خط موصول ہوا اور یہ معلوم کرکے اسے سخت غصہ آیا کہ خلف نربونہ کو اور دیگر اسلامی لشکر بشکنس کو واپس لوٹ چکا ہے۔ امیر عبدالرحمن اس صورت حال کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے ابھی غور ہی کر رہا تھا کہ لبث بھی عثمان کا خط لیے ہوئے آ پہنچا۔ امیر نے برہم ہوکر عثمان کے معاہدے کو کالعدم قرار دیتے ہوئے لبث کے ہاتھ یہ حکم لکھ بھیجا کہ عثمان اپنی وفاداری کے ثبوت کے لیے فوراً دوبارہ یودیز پر حملہ کرے۔ لیث نے انوس میں عثمان کو امیر کا خط پہنچایا جسے پڑھ کر وہ بھی بگڑا اور معاہدے کو جائز قرار دینے کا جواب لکھ بھیجا۔ بسویں دن اسے امیر کی طرف سے جواب ملا کہ معاہدہ ناجائز ہے عثمان حکم کی تعمیل کرے۔ اب عثمان نے ادب سے خط لکھ کر معافی چاہی جس کے جواب میں انیسویں دن حکم ملا کہ مراسلات میں وقت ضائع نہ کیا جائے اور اگر عثمان فوراً حملہ آور نہ ہوا تو دوسرا سالار مقرر کیا جائے گا۔

امیر کے آخری خط پر عثمان متردد ہوا اور مینینہ کو حالات سے آگاہ کیا نیز یودیز کو خط لکھ کر اپنی حفاظت کے انتظامات کرنے کی تاکید کی۔ انوس میں عثمان کے ساتھ صرف دو سو سپاہی تھے۔ مینینہ نے ہر حال میں عثمان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ عثمان مینینہ کی ترغیبات کے باوجود اپنے ہم مذہبوں سے لڑنے یا مذہب چھوڑنے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ عثمان کو پتہ چلا کہ عدی بن زبان پچاس ہزار سواروں کے ساتھ آ پہنچا ہے تو وہ شہزادی اور چند ساتھیوں کو لے کر پہاڑوں میں نکل گیا اور ایک دن انوس سے دس میل جنوب میں ایک غار کے پاس مسطح چٹان پر جب شہزادی عثمان کے زانو پر سر رکھے سو رہی تھی تو عدی کے ہمراہیوں نے وادی کو گھیر لیا۔ عثمان کو اطلاع ملی لیکن شہزادی کی نیند میں خلل پڑنے کے خوف سے اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی حتیٰ کہ عدی اس کے سر پر آ پہنچا۔ عثمان نے عدی کو آہستہ بولنے کے لیے کہا کہ مبادا شہزادی کی نیند اچاٹ ہو جائے۔ عدی نے اسے عبدالعزیز بن موسیٰ کا

واقعہ یاد دلاتے ہوئے طنزیہ قہقہہ لگایا جس پر بے بسی سے عثمان کے آنسو نکل پڑے ۔ شہزادی اپنے رخساروں پر اچانک آنسوؤں کے قطرے پڑنے سے بدحواس ہو کر اٹھ بیٹھی ۔ عدی نے عثمان کی گرفتاری کے لیے امیر کا حکم سنایا، عثمان غصے میں خنجر لے کر عدی کی طرف لپکا لیکن کئی نیزوں نے اس کا جسم چھلنی کر دیا ۔ شہزادی کی خودکشی کی کوشش ناکام رہی اور اسے عثمان کے سر کے ساتھ سہیلیوں سمیت ایک ہزار کے لشکر کی نگرانی میں قرطبہ بھیج دیا گیا ۔ عثمان کا سر تو قرطبہ میں دفن ہوا اور شہزادی دمشق بھیج دی گئی ۔

عثمان سے فارغ ہو کر امیر عبدالرحمن الغافقی خود بھی ایک لاکھ فوج لے کر بڑھا اور عدی کے لشکر کو ساتھ لیتا ہوا تین ماہ میں یودیز کے شہروں طریس، اولیرون، طراسقو، اغن، فوتوسہ، سوسوم، قوسمو وغیرہ پر قابض ہو گیا ۔ امیر نے بردی غالہ کا محاصرہ کر لیا اور جب یودیز وہاں سے نکل بھاگا تو بردی غالہ پر بھی قبضہ ہو گیا ۔ اسلامی لشکر کے سپاہیوں کے پاس اب اتنا مال غنیمت جمع ہو چکا تھا کہ وہ اسے اٹھا لے جانے سے بھی معذور تھے اور جہاد کی بجائے اس کی حفاظت کے خیال میں لگے رہتے ۔ اس وقت امیر عبدالرحمن سے یہ عاقبت نااندیشی ہوئی کہ وہ چند دن کے لیے ہسپانیہ لوٹنے کی بجائے آگے ہی بڑھتا رہا اور علاقہ ہائے پیری غورو اور بموسین کے بعد الطوسا، بواطہ، مارس، بیری وغیرہ پر قابض ہوتا ہوا صوبہ طورسن میں جا پہنچا ۔ اس طرح نصف سے زیادہ فرانس پر اس کا تسلط قائم ہو چکا تھا لیکن کوئی تازہ دم کمک نہ آئی ۔ والی افریقہ عبیدہ بھی امیر سے حسد کرنے لگا تھا، اس کے برعکس مفرور عیسائی سپاہی فرانس میں جمع ہونے لگے تھے ۔

یودیز کشتی کے ذریعے شاہ پے پن کے بیٹے چارلس کے علاقے میں پہنچا ۔ چارلس اکوی طانیہ کے باشندوں کا جانی دشمن تھا اس لیے یودیز نے اپنی اصلیت کو چھپاتے ہوئے کوسپانیا کے ایک نائٹ سے دوستی پیدا کر کے اسے اپنی سپہ گری کا گرویدہ بنایا اور اس کے ذریعے چارلس تک رسائی حاصل کی ۔ یودیز نے چارلس کو اکوی طانیہ کی تباہی کا حال سنایا اور عربوں کے مقابلے کے لیے آمادہ کیا ۔ اس نے چارلس کو مشورہ دیا کہ وہ شاہ تھیری پر بھی عربوں کے مقابلے کے لیے دباؤ ڈالے ۔ چارلس نے شاہ تھیری کو ہر طرح اطمینان دلا کر اور تحریری معاہدے کے ذریعے بڑی مشکل سے آمادہ کیا اور پھر ملک کا دورہ کر کے لوگوں کو جنگ کے لیے جمع کرنے لگا ۔ چارلس کو یہ معلوم کر کے قدرے اطمینان بھی ہوا کہ عرب لشکر بیسیوں گروہوں میں بٹا ہوا اور مال غنیمت سے لدا پھندا ہے ۔

امیر عبدالرحمن نے لشکر سمیت شہر بورحس میں موسم سرما گزارا ۔ عدی اگرچہ اس وقت جنگ کے مخالف تھا اور امیر کو واپس لوٹنے کی ترغیب دیتا تھا لیکن عبدالرحمن نہ مانا اور شاہ تھیری کے پاس اتمام حجت کے لیے پیغام بھیج کر طوروس تک جا پہنچا ۔ مقابلے کے لیے دشمن کی آمد کی خبر سن کر اس نے دریائے لوار کے کنارے پڑاؤ کیا اور مختلف گروہوں میں تقسیم فوج کے سرداروں کے نام وہاں پہنچنے کا حکم بھیجا ۔ رمضان کا مہینہ تھا ۔ دشمن اچانک دریا عبور کر آیا، اب عبدالرحمن کے ایک طرف دریائے لوار اور تین طرف دشمن تھا ۔ جنگ ہوئی، پہلے دن دس ہزار عرب شہید ہوئے اور پندرہ ہزار عیسائی مارے گئے لیکن مقتول عیسائیوں کی جگہ پر کرنے کے لیے مزید تازہ دم فوج آ گئی ۔ تین مسلمان سردار کلثوم بن حرب شیبانی، عکرمہ بن مجاہد اسکسکی اور عامر بن فحل الحمیری خبر پا کر کمک کو پہنچے لیکن عبدالرحمن اور ان کے درمیان

حائل فرانسیسی لشکر نے انہیں امیر سے نہ ملنے دیا۔ عبدالرحمن اس صورت حال سے مایوس ہوگیا۔ آٹھ دن جنگ جاری رہی، نویں دن پانچواں حصہ فوج بھی باقی نہ رہی تھی، اسی دن عدی بن زیان بھی نیزوں سے چھد کر شہید ہوا، اس منظر کو دیکھ کر عبدالرحمن کو عثمان کی بے بسی کی موت یاد آ گئی۔ بچے کھچے مسلمان پھر بھی مقابلے پر ڈٹے ہوئے تھے کہ عیسائی ان کی پشت پر خیموں میں داخل ہوگئے۔ مسلمان میدان جنگ کو چھوڑ کر اپنے سامان کو بچانے کے لیے لشکرگاہ کے خیموں کی طرف دوڑے۔ اس اثناء میں امیر عبدالرحمن الغافقی تنہا دشمنوں میں گھر کر شہید ہوا۔ صرف گنتی کے چند سپاہی عیسائیوں کے نرغے سے نکل کر کمک پر آتی ہوئی فوج تک پہنچ سکے لیکن انھوں نے بھی جب عبدالرحمن کا سر نیزے پر دیکھا تو بھاگ نکلے۔ عیسائیوں نے نربونہ تک کئی سو میل ان کا تعاقب کیا۔ نربونہ میں خلف نے شکست خوردہ اسلامی لشکر کی دلجوئی کی، قلعے میں ٹھہرایا اور عبدالملک بن قطن کو امیر نامزد کیا۔

چارلس کے لشکر نے نربونہ کے قلعے سے تین میل پر پڑاؤ کیا۔ یودیز نے وہاں چارلس پر اپنی اصلیت ظاہر کی، اس نے خوش ہوکر اکوی طانیہ یودیز ہی کو عطا کردیا۔ دوسرے دن چارلس کا نربونہ پر حملے کا ارادہ تھا لیکن مسلمانوں نے علی الصباح حملہ کر دیا۔ اس دن چوتھائی عیسائی فوج کٹ گئی، دوسرے دن عیسائیوں کے حوصلے مزید پست ہوئے اور تیسرے دن دریائی راستے سے مسلمانوں کی مزید فوج آ جانے پر چارلس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ اکوی طانیہ کی طرف بھاگا، خلف نے نو منزل تک اس کا پیچھا کیا۔ پھر عبدالملک قرطبہ کی طرف روانہ ہوا اور والی افریقہ اور خلیفہ کو حالات سے آگاہ کیا۔ بردی غالہ میں ریحانہ یودیز سے ملی۔ چارلس خلیفہ ہشام سے بدلے کا دعویٰ رکھتا تھا، ریحانہ نے اسے مسلمانوں کو نہ چھیڑنے کی نصیحت کی جس پر چارلس نے دعویٰ کیا کہ وہ اگلے سال بہار کے موسم میں دیکھ لے گی۔ ریحانہ نے کہا شاید وہ آئندہ اسے کبھی نہ دیکھے گی اور یہی ہوا۔ چارلس نے مسلمانوں سے لڑنے کے بہانے عوام اور پادریوں کو خوب لوٹا لیکن ایک سال کے اندر مر گیا اور پادریوں نے اس کے دوزخی ہونے کا فتویٰ دیا۔

تحقیقی جائزہ

مفتوح فاتح کے پہلے باب میں شرر نے عربی زبان میں بعض جانوروں کی کنیتوں کا ذکر کیا ہے مثلاً ابوالحارث (شیر)، ابوالابرو (چیتا)، ابو جہینہ (ریچھ)، ابوجعدہ (بھیڑیا)، ام الشاخ (بلی)، ابوالمجاج (عقاب)، ابوالخطاف (چیل)، ابوالخراب (الو)، ام نافع (مرغی) وغیرہ، یہ کنیتیں درست ہیں۔ اس باب میں بعض جغرافیائی معلومات بھی ہیں اور مختلف شہروں کے باہم فاصلے اور پہاڑی چوٹیاں و ندیاں وغیرہ، ان امور کی جغرافیہ اندلس سے تصدیق ہوتی ہے[1]۔

ناول کے پہلے اور دوسرے باب میں بیان کردہ تاریخی واقعات کے مطابق عثمان ابن ابی نسعۃ ۱۱۰ھ میں فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے اپنے لشکر کے ساتھ پیرینیز میں قیام پذیر تھا۔ ان دنوں اکوی طینیہ جو آج کل گاسکونیہ کہلاتا ہے فتح نہیں ہوا تھا۔ اندلس میں ہیثم بن عبدالکلابی امیر تھا اور اس نے عثمان کو جہاد پر روانہ کیا تھا۔ یہ بات تاریخی اعتبار سے درست ہے کہ ہیثم بن عبدالکلابی کی امارت اندلس کے دور میں عثمان پیرینیز کے علاقوں کی طرف فوج

۱۔ عنایت اللہ: جغرافیہ اندلس، بذیل مادہ ہا۔

کا سپہ سالار تھا لیکن شرر نے اس کے لیے جو سنہ (١١٠ھ) بیان کی ہے وہ درست نہیں - ١١٠ھ میں عثمان ابن ابی نسعة خود امیر اندلس تھا - ہیثم بن عبدالکلابی محرم ١١١ھ کے بعد امیر اندلس مقرر ہوا[1] -

اسی باب میں شرر نے بیان کیا ہے کہ جب ہیثم کے ظلم و ستم کا چرچا بہت پھیل گیا تو امیرالمومنین ہشام بن عبدالملک نے محمد بن عبداللہ اشجعی کو خفیہ طور پر تحقیق کے لیے بھیجا اور حالات کے مطابق فیصلے کے اختیارات بھی دیے - محمد نے تحقیق کی، امیر کو مجرم پایا، خلیفہ کا فرمان دکھا کر معزول کیا اور گدھے پر پھرا کر فوج کی حراست میں دمشق بھیج دیا اور اعلان کر دیا کہ لوگ حاضر ہوکر ہیثم کے مظالم کا تدارک حاصل کریں - کتب تاریخ کی رو سے یہ واقعہ جمادی الاول ١١٣ھ/ اگست ٧٣١ء کا ہے[2] -

سکاٹ کے یہاں اس سلسلے میں یہ بیان ملتا ہے :

"امیر سمح جہاد کرتے ہوئے ایکویٹین کے دارالخلافہ ٹولوس تک جا پہنچے - لڑائی میں شہید ہوئے - عارضی طور پر امیر عبدالرحمن الغافقی کو امیر بنایا گیا اور لشکر پسپا ہوا - سپاہی عبدالرحمن سے خوش تھے اور ملکی حکام ناخوش - بعض مخالفین نے بشر ابن حنظلہ عامل افریقہ کو شکایات کیں اور عنبسہ ابن سحیم امیر اندلس مقرر ہوگئے - عنبسہ نے انتظام کو درست کیا، جہاد کیا - سیپٹیمینیا کے علاقے پر قبضہ کر لیا - ایک جنگ میں عنبسہ زخمی ہو کر چل بسے اور مرتے ہوئے عروہ ابن عبداللہ کو جانشین بنایا مگر اہالی دیوان ان سے ناخوش تھے - پھر یحییٰ ابن سلمہ امیر مقرر ہوئے، وہ سخت مزاج اور عدل و انصاف میں بے انتہا احتیاط رکھنے والے تھے - فوج میں سختی سے نظام رکھنے کی کوشش سے سب لوگ ناراض ہوگئے - عامل افریقہ نے یحییٰ ابن سلمہ کی جگہ عثمان ابن ابی نسعہ اللخمی اور پھر حذیفہ ابن الاحوص القیسی کو یکے بعد دیگرے مقرر و معزول کیا - آخر امیرالمومنین نے خود ہیثم بن عبدالکلابی کو امیر بنا کر بھیجا - اس کے مزاج میں بے رحمی اور خونخواری تھی اس لیے اس کی دست درازی سے کوئی مسلمان نہ بچا - خلیفہ نے شکایات ملنے پر محمد ابن عبداللہ الاشجعی کو ہیثم کے متعلق تحقیقات پر مامور کیا اور بشرط اثبات جرم ان کو معزول کرنے اور سزا دینے کے لیے بھیجا . . . . امیرالمومنین کے یہ معتبر وکیل بھیس بدل کر قرطبہ پہنچے اور انہوں نے بغیر کسی دقت کے بہت جلد ہیثم کے خلاف اثبات جرم کی شہادتیں حاصل کر لیں - اس کے بعد انہوں نے اپنے اور ہیثم کے متعلق فرمان شاہی ظاہر کیا اور علی رؤس الاشہاد ان کو معزول کر دیا اور ان کا سر منڈوا کر اور گدھے پر چڑھا کر تشہیر کیا - جن لوگوں پر کہ انہوں نے ظلم کیا تھا انہوں نے ان پر خوب پھبتیاں اڑائیں اور بے عزتی کی - ان کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی اور جہاں تک محمد سے ہو سکا انہوں نے مظلوموں اور ان کی اولاد کو اس روپیہ سے معاوضہ دیا جو ہیثم نے از راہ ظلم و ستم ان لوگوں سے جمع کیا تھا - پھر انہوں نے ہیثم کو پابجولاں چند لوگوں کی حفاظت میں افریقیہ بھیج دیا - ادھر دو ماہ کے اندر اندر محمد نے لوگوں کی ان شکایات کو رفع کیا جن کا انجام یہ ہونے والا تھا کہ شاید غدر ہو جائے - جو لوگ کہ لوٹے گئے تھے ان کو معاوضہ دلوایا - قیدیوں کو رہا کیا، جن کو اذیتیں دی گئی تھیں ان کی تلافی کی، ظالم کے آدمی جن جن محلوں پر قابض ہو بیٹھے تھے ان کو نکالا، عام طور پر لوگ محمد سے خوش ہوگئے اور ان کو بہت دعائیں دیں . . . پھر وہ عبدالرحمن کو امیر بنا کر شام کو چلے گئے -"[3]

شرر نے لکھا ہے کہ عثمان ابن ابی نسعة اس سے پہلے دو مرتبہ اندلس کا والی رہ چکا تھا اور والیٔ افریقہ اسے پسند کرتا تھا، لیکن ہیثم چونکہ براہ راست دربار خلافت سے فرمان لایا تھا اس لیے اسے معزول ہونا پڑا تھا - اس بیان میں عثمان ابن ابی نسعہ کے دو مرتبہ امیر اندلس

١- سکاٹ : اخبارالاندلس، (ترجمہ)، ج ١، ص ٢٦٨ -
٢- ایضاً : ص ٢٦٩ -
٣- ایضاً : ص ٢٧٠ تا ٢٨٧ -

مقرر ہونے کی تصدیق کتب تاریخ سے نہیں ہوتی۔ محسوس ہوتا ہے کہ شرر کو عثمان ابن ابی نسعة سے پہلے کے امیر اندلس عثمان بن ابی عبدہ کے سلسلے میں التباس ہوا ہے اور انھوں نے عثمان کے نام کی یکسانیت سے تصور کر لیا ہے کہ وہ دو بار امیر اندلس مقرر ہوا۔

دوسرے باب میں شرر نے فتح ہسپانیہ کے بعد کے کچھ حالات کو تاریخی پس منظر کے طور پر استعمال کرتے ہوئے انھیں یوں بیان کیا ہے کہ ۹۱ھ میں طارق جبرالٹر پر اترا تھا۔ اس کے بعد انیس برس کے قلیل عرصے میں اندلس کے چودہ والی مقرر ہوئے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ خلفاء اندلس کی وسعت و عظمت کے حال سے بے خبر تھے اور یہ والی افریقہ کے سپرد ہوتا تھا وہ جسے چاہتا حاکم اندلس مقرر کرتا۔ ۱۰۵ھ میں ہشام بن عبدالملک خلیفہ ہوا تو اس وقت بشر بن حنظلہ کلبی والی افریقہ تھا اور اس کا عزیز عنبسہ بن سحیم کلبی حاکم اندلس۔ عنبسہ جہاد میں زخمی ہوکر شہید ہوا تو اس نے سپہ سالاری کا علم حفیر بن عبداللہ فہری کو دیا تھا لیکن بشر نے اس کی امارت کی منظوری نہ دی اور اپنے قبیلے کے رکن یحییٰ بن سلمیٰ کلبی کو امیر مقرر کیا۔ اس کے بعد جلد ہی بشر امارت افریقہ سے معزول ہوگیا اور کلثوم بن عام والی افریقہ مقرر ہوا۔ کلثوم نے بعض خود غرضوں کی شکایات اور اپنی بے عقلی سے یحییٰ کو معزول کرکے حذیفہ بن اخوص قیسی کو حاکم مقرر کیا۔ وہ بے صلاحیت تھا۔ شکایات کی بنا پر کلثوم نے اسے معزول کرکے عثمان بن ابی نسعة کو دوبارہ امیر مقرر کیا لیکن خلیفہ اسے پسند نہ کرتے تھے کہ کسی معزول شدہ کو دوبارہ مقرر کیا جائے اس لیے انھوں نے ہیثم بن عبدالکلابی کو امیر بنا کر بھیجا۔ ہیثم نے آتے ہی عثمان کو جہاد پر روانہ کر دیا اور خود ملک کو لوٹنا شروع کیا۔ کلثوم کے پاس شکایتیں پہنچیں لیکن وہ بے بس تھا، پھر تنگ آ کر لوگوں نے ہیثم کو قتل کرنا چاہا لیکن سازش کھل گئی اور اس کے بدلے وہ خود قتل ہوئے۔ پھر دربار خلافت کے حکم سے محمد بن عبداللہ الاشجعی نے آ کر خفیہ طور پر تحقیقات کیں اور ہیثم کو معزول کرکے گدھے پر سوار کرکے قرطبہ میں پھرایا اور انتظام درست کرکے عبدالرحمن بن عبداللہ الکلبی الغافقی کو امیر مقرر کیا۔

مذکورہ بالا واقعات بہت حد تک تاریخی اعتبار سے درست ہیں، لیکن ان میں بھی شرر کو عثمان بن ابی نسعة کے بارے میں وہی التباس ہوا ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ یحییٰ کے بعد ۱۰۸ھ میں عثمان بن ابی عبدہ والی مقرر ہوا اور شعبان ۱۰۹ھ میں اس کی معزولی پر عثمان بن ابی نسعة کا تقرر ہوا۔ عثمان کو ربیع الاول ۱۱۰ھ میں معزول کرکے حذیفہ بن الاخوص کو مقرر کیا گیا۔ حذیفہ کے معزول ہونے پر محرم ۱۱۱ھ کے بعد ہیثم امیر بنا اور جمادی الاول ۱۱۳ھ میں معزول ہوا۔ شعبان ۱۱۳ھ تک محمد بن عبداللہ الاشجعی نے نظام درست کیا اور پھر عبدالرحمن الغافقی کو امیر مقرر کیا۔[1]

مفتوح فاتح میں بیان کردہ دیگر واقعات سے متعلق سکاٹ کے یہاں یہ بیان ملتا ہے:

" امیر عبدالرحمن نے فرانس کی فتح کا تہیہ کر لیا۔ اس کے لیے ضروری انتظامات کیے۔ تمام والیوں کو حکم تھا کہ وہ اپنی اپنی فوجیں لے کر ایک مقررہ مقام پر جو سرحد جزیرہ نما پر واقع تھا، پہنچ جائیں۔ ان دنوں وہ تمام ضلع جس میں درہائے کوہ اور ان کے قلعے شامل تھے ایک شخص عثمان ابن ابو نسعة باشندہ

۱- اردو انسائیکلوپیڈیا اسلام، ج ۳، ص ۲۲۸، بذیل مادہ الاندلس۔

افریقہ کے تحت حکومت میں تھا ۔ یہ چند ہی ماہ سے یہاں کے والی مقرر ہوئے تھے مگر کچھ ایسے سرکش واقع ہوئے تھے کہ امیر اندلس کے احکام کی چنداں پروا نہ کرتے تھے ۔ یہ بھی امیر عبدالرحمٰن کی نیک دلی تھی کہ اس کو انھوں نے یہاں قائم رکھا تھا ۔ ایک مرتبہ ان کو معزول بھی کر دیا گیا مگر پھر از سر نو بحال کر دیا گیا ۔ عثمان اگرچہ نہایت غصہ ور اور بے اصول سے آدمی تھے، مگر ان میں وہ خوبیاں تھیں جو ایک سپاہی کی شہرت کا باعث ہو سکتی تھیں ۔ ان کو اس کا رنج تھا کہ تقرر کے بعد (امیر اندلس) ان کو معزول کر دیا گیا ۔ ابھی لطف حکومت بھی نہ اٹھانے پائے تھے کہ علیحدہ کر دیے گئے ۔ اس کا بدلہ انھوں نے یوں لینا چاہا کہ وہ خود اپنی حکومت قائم کرکے مستقل بادشاہ بن بیٹھیں ۔ ان کا اقتدار دریائے ایبرو تک بڑھا ہوا تھا ۔ اس کے شمال اور مشرق میں بربری پھیلے ہوئے تھے اور وہ سب ان پر فدا تھے ۔ ان دنوں یوڈس، ڈیوک آف ایکویٹین، بہت زوروں پر تھے اور ادھر ادھر مار دھاڑ کرتے پھر رہے تھے ۔ وہ ایک مدت سے اہالی فرانس سے لڑ رہے تھے مگر ان لڑائیوں کا نتیجہ مشتبہ ہی رہتا چلا آ رہا تھا ۔ چونکہ فرانس کی قوت بہت بڑھی ہوئی تھی اس لیے یہ خطر آ رہا تھا کہ ان کو اہالی فرانس کا مطیع ہونا پڑے گا ۔ جنوب کی طرف سے عرب حملہ آور ان کو دبائے چلے آتے تھے اور ان کی مہموں سے ان کی حکومت میں ہر وقت فتنہ و فساد برپا رہتا تھا ۔ اس طرح ڈیوک دشمنوں کے نرغہ میں تھے ۔ عثمان نے جو ان سے ساز باز کرنا چاہا تو وہ بہت ہی خوش ہوئے ۔ عثمان کی طرف سے یہ کہا گیا کہ یہ گاتھک نواب دوستی کو پختہ کرنے کے لیے اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کر دے ۔ چنانچہ ڈیوک نے یہ بھی منظور کر لیا ۔ معاہدہ تحریری ہوا اور طرفین نے اس پر دستخط کر دیے ۔ نواب زادی (جو ازروئے معاہدہ اپنے ہی مذہب پر قائم رہنے والی تھی) اپنے باپ کے نئے حلیف کے محل میں پہنچ گئی ۔ عثمان مراسم شادی ادا کرکے اپنے دارالحکومت میں آ گئے اور یہیں بیٹھ کر اپنے آقا کی تدابیر کو اپنی ترکیبوں سے ناکام کرنا چاہا ۔ انھوں نے عزم مصمم کر لیا تھا کہ اگر اس سے کام نہ چلے تو اپنی کوہستانی فوج کو امیر کے مقابل کر دیں ۔ ادھر امیر نے حکم دیا کہ وہ اپنی فوج کو لے کر حاضر ہوں ۔ انھوں نے یہ عذر کیا کہ میں نے جو معاہدات اپنے ہمسایہ سے کر رکھے ہیں، ان کے ایفا کے لیے فوج کا ان کے پاس رہنا ضروری ہے ۔ امیر نے بار بار تاکیدی احکام بھیجے مگر جب انھوں نے ایک نہ سنی اور امیر نے یہ دیکھا کہ جو فوج ان کے پاس ہے وہ لڑائی کے لیے بے چین ہو رہی ہے تو انھوں نے ایک افریقی افسر ابن زیان کو ایک دستہ فوج دے کر خفیہ طور پر روانہ کیا کہ نافرمان والی کو زندہ گرفتار کر لیں یا ان کو لے آئیں ۔

عثمان ان دنوں کیسٹرم لیوبا میں آئے ہوئے تھے ۔ ابن زیان اس طرح بہ یلغار پہنچے کہ عثمان کو خبر بھی نہ ہوئی ۔ ان کو صرف اتنا موقع ملا کہ چند معتبر آدمیوں کے ساتھ اپنی نئی دلہن کو لے کر ایک دشوار گزار پہاڑی مقام کی طرف چلے گئے ۔ ابن زیان یہ معلوم کرکے شہر میں نہ ٹھہرے اور اپنے دستہ فوج کو لیے ہوئے ان کے تعاقب میں روانہ ہوگئے ۔ عثمان کا چھوٹا سا قافلہ تھک کر ایک چشمے پر سستانے کے لیے اتر پڑا تھا کہ دشمن پہنچ گئے ۔ باغیوں کو منتشر کر دیا گیا، کچھ لوگ مارے گئے ۔ گاتھک خاتون گرفتار کر لی گئی اور عثمان کے خون سے ان کی نمک حرامی کا دھبہ دھویا گیا ۔ ابن زیان نے ان کا سر امیر عبدالرحمٰن کے قدموں میں جا ڈالا ۔ نواب زادی جس کے حسن و جمال کو دیکھ کر تمام لوگ حیران رہ گئے تھے، محل شاہی کی زیب و زینت بننے کے لیے دمشق بھیج دی گئی ۔

اب پائیرینس کا دروازہ بالکل کھلا ہوا تھا ۔ مسلمانوں کی فوج اس طرح فرانس کے سرسبز میدانوں میں پہنچی کہ جیسے کسی بلند پہاڑ پر سے دریا گرتا ہے ۔ فوج کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی اور اس میں انتشار، بے ضابطگی اور باہم عناد تھا ۔ ڈیوک آف ایکویٹین نے نہایت تہور کے ساتھ پہاڑ کے نشیب پر مقابلہ کیا مگر وہ آندھی کو کیونکر روک سکتے تھے ۔ جو شہر راستے میں پڑے وہ راکھ کا ڈھیر تھے، جو آدمی سامنے آیا وہ غلام تھا، چراگاہوں میں جانوروں کا نام نہیں رہا، دامن کوہ میں کہاں تو پھول کھلے ہوئے تھے اور کہاں خاک اڑنے لگی ۔ گیرون کی سرسبز وادی نہ تھی، ویرانہ تھا ۔ بورڈیو نے جو ایکویٹین کے اجناس کا ذخیرہ اور نہایت آباد مقام تھا، ذرا سا ہی مقابلہ کیا تھا کہ لینے کے دینے پڑ گئے .... مسلمان فوج مال غنیمت سے لدی ہوئی تھی، سست رفتاری سے آگے بڑھی .... دریائے ڈارڈون کے کنارے پر یوڈس نے اپنی فوج کو

دشمنوں کے روکنے کے لیے پھیلا دیا، سخت گھمسان کی لڑائی ہوئی . . . . عیسائیوں کے ٹکڑے اڑا دیے گئے . . . ایکویٹین کو فتح کر لینے کے بعد امیر پای ٹی ارس کی طرف بڑھے ـ سینٹ ہلاری کے گرجے کو تباہ کر دیا . . . شارلے مین کی کوششوں سے اتحاد پیدا ہوا ـ اس وقت فرانس کے تخت پر تھیٹری چہارم تھے . . . ان کو ایک وزیر بادشاہ گر، چارلس نامی نے جو پیپن ڈی ہیر سٹائل، ڈیوک آف ایسٹریاس کا ولدالحرام تھا، برائے نام شیر قالین بنا کر تخت پر بٹھا رکھا تھا ـ[1]

یوڈس چارلس کے پاس مدد کے لیے حاضر ہوا ـ ان سے مل کر جلد فوج جمع کر لی ـ پائیٹرس میں انھوں نے بے جگری سے مقابلہ کیا، چنانچہ مسلمان محاصرہ اٹھا کر ٹورس کی طرف بڑھے . . . ایک بڑے میدان میں مقابلہ ہوا . . . . سات روز فوجیں مقابل رہیں آخر مسلمانوں نے امیر کے حکم سے دیو نژاد، لوہے میں غرق سپاہ پر حملہ کر دیا، مگر یہ لوگ اپنی جگہ سے نہ ہلے گویا ایک پہاڑ تھا کہ ہلنے کا نام بھی نہ جانتا تھا ـ ان کے زرہ و بکتر و خود چار آئینہ پر عربوں کے تیر کچھ بھی اثر نہ کرتے تھے اور چارلس کے آدمیوں کی بوجھل تلواریں اور بھاری نیزے نیم برہنہ عربوں میں آفت مچائے ہوئے تھے ـ رات ہوئی ہتھیار لگا کے سو گئے ـ صبح جنگ اسی زور سے شروع ہوئی . . سہ پہر کو ایکویٹین کے ڈیوک نے ایک طرف سے حملہ کر کے فوج میں آفت برپا کر دی ـ جب اس مصیبت کی خبر مسلمانوں میں پھیلی تو بہت سے لوگوں نے اپنے علم کے نیچے سے بھاگ کے اپنے مال غنیمت کو جا سنبھالا . . . سخت سراسیمگی پھیل گئی اور فوج کے پاؤں اکھڑ گئے ـ یہ کیفیت دیکھ کے فرانس والوں نے اور بھی سختی کی ـ عبدالرحمن نے چاہا کہ بڑھ کر اپنی فوج کا دل بڑھائیں، اسی کوشش میں انھوں نے سینکڑوں زخم کھائے، آخر ان کی جان بھی گئی ـ[2] اتنے میں پھر رات آ گئی ـ مسلمانوں نے اس کو غنیمت سمجھا اور راتوں رات اپنے خیمے اور بوجھل چیزیں چھوڑ کر بھاگ گئے ـ چارلس ایک تو اس سے ڈر گئے کہ کہیں یہ لوگ کمین گاہوں میں نہ چھپے ہوئے ہوں، دوسرے ان کو اپنے دشمنوں کی شجاعت ایسی پسند آئی کہ انھوں نے تعاقب کرنے سے قطعی انکار کر دیا اور مسلمانوں کا متروکہ مال لے کر اپنے دارالسلطنت کو لوٹ گئے ـ

ان دنوں عیسائیوں میں سوا راہبوں کے اور کوئی لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا ـ اس لیے اس زمانے کے تمام واقعات کو قلم بند کرنے کا کام بھی انہیں کذابوں کے ہاتھ میں تھا ـ ان حضرات نے مسلمان مقتولین کی تعداد تین لاکھ پچہتر ہزار لکھی ہے ـ یقیناً یہ تعداد ان کی اصلی تعداد سے بقدر تین گنا کے زیادہ تھی ـ فرانس والوں کا نقصان اتنا خفیف بتلایا ہے کہ اس کا ذکر کرنے ہی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ـ باوجود اس کے کہ دشمن مال مغروقہ سے بوجھل ہو رہے تھے، ان کا سپہ سالار مارا جا چکا تھا اور وہ ہزیمت خوردہ اور دل شکستہ تھے لیکن پھر بھی فرانس والوں کو یہ ہمت نہ پڑی کہ ان کا تعاقب کرتے ـ خود یہ واقعہ اس امر کا شاہد ہے کہ چارلس مارٹل کی فوج کو سخت نقصان پہنچا تھا ـ[3]"

گبن لکھتا ہے:

"The decline of the French monarchy invited the attacks of these insatiate fanatics. The descendents of clovis had lost the inheritance of his martial and ferocious spirit , and their misfortune or demerit has affixed the epithet of lazy to the last kings of the Merovingian race. They ascended the throne without power, and sunk into the grave without a name. A country palace, in the neighbourhood of Compiegne, was allotted for their residence or prison ; but each year in the month of March or May, they were conducted in a wagon drawn by oxen to the assembly of the Franks, to give audience to

---

۱ـ سکاٹ نے چارلس کے حالات، اس کی عادات، سخت گیری وغیرہ اور اس کے مرنے کے بعد پادریوں کا اس کے بارے میں فتویٰ کہ اسے جہنم میں دیکھا گیا، مفصل بیان کیے ہیں ـ (ج ۱، ص ۲۹٦ تا ۲۹۸) ـ

۲ـ ابن حیان نے ابن بشکوال اور حمیدی کے حوالے سے عبدالرحمن کی ولایت اور شہادت کا جو ذکر کیا ہے ان روایات میں تضاد ہے ـ ملاحظہ ہو ص ۳۳۱، ۳۳۲ ـ

۳ـ سکاٹ: اخبارالاندلس (ترجمہ)؛ ج ۱، ص ۲۸۸ تا ۳۰۱ ـ

the foreign ambassadors, and to ratify the acts of the mayor of the palace. The domestic officer was become the minister of the nation and master of the prince. A public employment was converted into the patrimony of the private family: the elder Pepin left a king of mature years under the guardianship of his own widow and her child, and these feeble regents were forcibly disposed by the most actives of his bastards A government, half savage and half corrupt, was almost dissolved, and the tributary dukes, the provincial counts, and the territorial lords, were tempted to despise the weakness of the monarch, and to imitate the ambition of the mayor. Among these independent chiefs, one of the boldest and most successful was Eudes, duke of Acquitain, who, in the southern provinces of Gaul, usurped the authority and even the title of the king"[1]

گبن نے اس کے بعد امیر سمح کے فرانس پر حملے اور شہادت کا مفصل ذکر کیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے:

"But these narrow limits were scorned by the spirit of Abdalrahman, Abderame, who had been restored by the Caliph Hashem to the wishes of the soldiers and people of Spain That veteran and daring commander adjudged to the obedience of the Prophet whatever yet remained of France or of Europe, and prepared to execute the sentence, at the head of a formidable host, in full confidence of surmounting all opposition either of nature or of man. His first care was to suppress a domestic rebel, who commanded the most important passes of the Pyrenees: Munuza, a moorish chief, had accepted the alliance of the duke of Acquitain, and Eudes, from a motive of private or public interest, devoted his beauteous daughter to the embraces of the African misbeliever. But the strongest fortress of Cardagne were invested by a superior force, the rebel was overtaken and slain in the mountains, and his widow was sent a captive to Damascus, to gratify the desires, or more probably the vanity of the commander of the faithful"[2]

اس کے بعد گبن نے عبدالرحمن کی پسپائی، یودیز کی شکست، عبدالرحمن کی فتوحات اور فرانس میں تورز تک پہنچنے کے واقعات اور فرانسیسیوں کا چارلس کے جھنڈے تلے جمع ہونا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آٹھ روزہ جنگ کے بعد عبدالرحمن کی شہادت اور مسلمانوں کی واپسی کا ذکر کرتے ہوئے گبن نے عیسائی مؤرخین کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ اس معرکے میں ساڑھے تین لاکھ مسلمان شہید ہوئے۔ وہ لکھتا ہے کہ زیادہ نقصان میدان جنگ میں نہیں ہوتا بلکہ شکست خوردہ لشکر کو تعاقب کرکے پہنچایا جاتا ہے، لیکن جب مسلمان لوٹے تو عیسائیوں کے حوصلے اتنے پست تھے کہ انھوں نے ان کا تعاقب بھی نہیں کیا۔[3]

سید امیر علی، عبدالرحمن الغافقی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس جیسا قابل، محب وطن اور منصف مزاج حاکم اندلس کو بنی امیہ کے عہد میں نصیب نہیں ہوا تھا۔ تمام لوگ اور قبائل عبدالرحمن کو پسند کرتے تھے اور اس کی تعریف کرتے تھے۔ اس کی نیک دلی، شرافت، سخاوت اور انصاف کے سب مداح تھے۔ عبدالرحمن نے امارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد تمام صوبائی دارالخلافوں اور شہروں کا دورہ کیا اور لوگوں کی شکایات رفع کیں۔ جن منصفوں اور قاضیوں کو مجرم یا فرض ناشناس پایا انھیں برطرف کر دیا اور ان کی جگہ ذمے دار اور قابل اعتماد لوگوں کو

۱- گبن: ج ۷، (باب ۵۲)، ص ۱۵ تا ۱۷ - ۲- ایضاً: ص ۱۷ - ۳- ایضاً: ص ۱۸ تا ۲۲ -

ان عہدوں پر مقرر کیا، ہر شخص کے ساتھ کسی رو رعایت یا اونچ نیچ کے تصور کے بغیر انصاف کیا ۔ عیسائیوں کو وہ کلیسے واپس کر دیے جو ان سے بلا وجہ زبردستی چھین لیے گئے تھے ۔ ان امور کی تکمیل کے بعد اس نے موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے مشن کو پورا کرنے کی طرف توجہ دی ۔ کارڈین کا مسلمان گورنر عثمان بن ابو نسعۃ جسے عیسائی Munuza لکھتے ہیں اکوی طانیہ کے ڈیوک یودیز کی خوب صورت بیٹی سے شادی کرکے اس کے ساتھ دفاعی معاہدات میں شامل ہوگیا تھا ۔ عثمان نے اپنے مسسر کی تائید میں علم بغاوت بلند کیا ۔ عبدالرحمن نے فوراً ایک دستہ الباب روانہ کیا جہاں عثمان اپنی دلہن کے ساتھ رہائش پذیر تھا ۔ عثمان خبر پاتے ہی پہاڑوں میں بھاگ گیا لیکن گرفتار ہوکر قتل ہوا ۔ اس کی بیوہ کو پورے احترام کے ساتھ دمشق بھیج دیا گیا جہاں بعد ازاں اس کی شادی ہشام کے ایک بیٹے سے کر دی گئی ۔

عثمان کی شکست اور قتل سے عیسائی علاقے میں ہلچل پیدا ہونے لگی تھی لیکن عبدالرحمن انھیں تیاری کا موقع دیے بغیر ان کے سروں پر جا پہنچا ۔ وہ اراگون اور نیوارے کے راستے ۷۳۲ء کے موسم بہار میں فرانس میں داخل ہوا ۔ ارلس اور رون کے قریب جنگوں میں فتح حاصل کرنے کے بعد عبدالرحمن بورڈو پہنچا، یودیز کو عبرت ناک شکست دے کر بورڈو پر قبضہ کر لیا ۔ اکوی طانیہ کے بعد عبدالرحمن برگنڈی کو روندتا ہوا لی اون، بسکان اور سسنز پر علم اسلام لہراتا ہوا فرانس کے دارالحکومت کی طرف بڑھا ۔ یودیز شکست کھا کر چارلس کے پاس پہنچ چکا تھا اور اسے مسلمانوں کے مقابلے پر آمادہ کر رہا تھا ۔ چارلس یودیز کی بات مان گیا اور اطراف و جوانب سے فوجیں جمع کرنی شروع کیں ۔ دریں اثنا مسلمان تورز تک پہنچ گئے ۔ اس کے بعد سید امیر علی نے جنگ کی تیاری اور جنگ کی تفصیلات درج کی ہیں ۔ رمضان ۱۱۶ھ (اکتوبر ۷۳۲ء) کی اس آٹھ روزہ جنگ میں مسلمانوں کی توجہ اپنے جمع کردہ مال غنیمت کی طرف منحرف ہوگئی اور عبدالرحمن نے شجاعت سے مقابلہ کرتے ہوئے شہادت پائی ۔ مسلمان رات کے وقت خاموشی کے ساتھ اپنا کیمپ اور چند زخمی وہاں چھوڑ کر شکستہ دل اور ہزیمت خوردہ واپس لوٹ گئے ۔

سید امیر علی نے عیسائی مورخین کی اس غلط بیانی کا ذکر کرتے ہوئے کہ اس جنگ میں تین لاکھ ساٹھ ہزار مسلمان شہید ہوئے لکھا ہے کہ شہیدوں کی یہ تعداد عبدالرحمن کی اصل فوج کی تعداد کے چار گنا ہے ۔[1]

حتی کا بیان ہے کہ:

سمح کی فرانس میں شہادت کے بارہ سال بعد عبدالرحمن ابن عبداللہ الغافقی نے پیرینیز کے پار سب سے بڑی اور آخری مہم کا انتظام کیا ۔ اس نے پہلے دریائے گارون کے کنارے ایکویٹن کے ڈیوک کو شکست دی، پھر بوردو پر حملہ کیا، اسے لے لینے کے بعد وہ شمالی جانب پوتیرز کی طرف بڑھا اور اس کی فصیل سے باہر ایک گرجے کو آگ لگائی، پھر تورز کی طرف نکل گیا ۔ تورز میں گال قوم کے ایک بزرگ سان مارتن کی زیارت تھی ۔ حملہ آور کو خیال ہوا کہ وہاں سے بہت سے قیمتی تحفے اور نذرانے جمع ہوں گے ۔ پوتیرز اور تورز کے درمیان عبدالرحمن کا راستہ چارلس نے روک لیا جو میروونجی بادشاہوں کا ناظم قصر تھا ۔ وہ اگرچہ رسماً نہیں لیکن عملاً بادشاہ تھا ۔ اس نے جواں مردی سے مختلف دشمنوں کو زیر کیا تھا اور ایکویٹین کے ڈیوک سے شمالی فرینکوں کا اقتدار منوایا تھا ۔

۱- سید امیر علی: A Short History of the Saracens، ص ۱۴۶ تا ۱۵۲ ۔

سات روز تک چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں ۔ ۷۳۲ء میں اکتوبر کا مہینہ اور ہفتے کا دن تھا جب فیصلہ کن لڑائی ہوئی ۔ فرینک جنگجو زیادہ تر پیادہ تھے اور انہیں علم تھا کہ سردی سے بچاؤ کا بہترین ذریعہ بھیڑوں کی کھالیں ہیں ۔ گھمسان کا رن پڑا ، فرینک دوش بدوش کھڑے رہے اور وہ مغربی مورخوں کے بیان کے مطابق چٹان کی طرح مستحکم اور برف کے تودے کی طرح بے لچک تھے ۔ جب اسلامی رسالے نے ان پر حملہ کیا تو پیچھے ہٹے بغیر انہوں نے رسالے کو کاٹ کر رکھ دیا ۔ عبدالرحمن بھی مارا گیا ۔ رات ہوگئی جنگ بند کر دی گئی ۔ حملہ آور رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر نکل گئے ۔ صبح تک چارلس کو اندازہ نہ ہو سکا کہ اس نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے ۔ صبح کے وقت معلوم ہوا کہ اسے فتح حاصل ہوئی چنانچہ اس وقت سے مارٹل (ہتھوڑا) اس کے نام کا جز بن گیا ۔

مسلمانوں کے نزدیک یہ جنگ بلاط الشہدا تھی (اخبار ص ۲۵ ، مقری ج ۱ ، ص ۱۴۶) یہ جنگ ایک رومی سڑک پر ہوئی تھی جس پر پتھر بچھے ہوئے تھے) یعنی شہیدوں کا فرش ۔ مسیحیوں نے اس فتح کو اپنی جنگی کارروائیوں میں ایک نقطہ انقلاب قرار دے لیا ۔ یورپی مورخ کہتے ہیں کہ اگر اس لڑائی کا نتیجہ برعکس نکلتا تو لندن اور پیرس میں گرجوں کی جگہ مسجدیں اور یورپی ٹوپیوں کی جگہ ترکی ٹوپیاں رائج ہوتیں ۔[1]

۱۸- بابک خرمی

"بابک خرمی" تاریخی اعتبار سے شرر کا انتہائی مستند ناول ہے ۔ عباسی دور میں ابھرنے والی متعدد ملحدانہ تحریکات میں سے ایک اس کا موضوع ہے ۔ اس تحریک کا زمانہ یوں تو بیس برس سے زیادہ عرصے پر پھیلا ہوا ہے لیکن اس ناول میں زیادہ تر خلیفہ معتصم باللہ کے عہد کے واقعات اور بابک خرمی کو موضوع بنایا گیا ہے ۔ ناول دو جلدوں میں ہے جو علی الترتیب ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء میں چھپیں ۔ ناول میں بیان کردہ واقعات کا خلاصہ یہ ہے :

خلیفہ معتصم کے سامنے ایک عباسی خاتون نے اپنی داستان سناتے ہوئے بتایا کہ ان کے قافلے پر خرمیوں نے حملہ کیا ، مردوں کا قتل عام کیا اور عورتوں کو پکڑ لے گئے ۔ اس موقع پر اس کی بیٹی ریحانہ نے وا معتصما ! پکارا تھا ۔ معتصم نے یہ بات سنتے ہی لبیک کہا اور ترک سپہ سالار افشین حیدر کو بلا کر کہا کہ دو برس پہلے اسحق بن ابراہیم سپہ سالار نے ایک لاکھ جاویدانی قتل کیے، ہزاروں لڑکے عورتیں گرفتار کیے لیکن بابک کی سرازیں ابھی جاری ہیں اس لیے وہ زبردست لشکر لے کر جائے اور بابک کا قلع قمع کرے ۔ اس عباسی عورت عالیہ نے بھی لشکر کے ہمراہ جانے کی اجازت حاصل کی تاکہ ریحانہ کی تلاش کر سکے ۔

ادھر بابک کا ایک سپہ سالار عصمت علاقہ آذربیجان کے قلعہ شاہی کے حاکم محمد بن مغیث کے پاس پہنچا ۔ یہ حاکم اگرچہ خرمی نہ تھا لیکن بابک کے ساتھ ملا ہوا تھا ۔ عصمت نے اسے بتایا کہ خلیفہ نے تازہ لشکر روانہ کیا ہے ۔ ابن مغیث نے عصمت کی مہمان نوازی کی، اس کے ایک ساتھی فرخ چہر کو ساتھ ملایا اور قصر میں عصمت کو گرفتار کر لیا اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا ۔ مقتول سرداروں کے سر اور عصمت کو افشین کے پاس بھیج دیا گیا ۔

اب افشین نے برزند میں پڑاؤ ڈالا ۔ پہاڑوں اور راستوں کے نقشے مرتب کرائے ، ایران و عراق عرب کے درمیان گزرگاہ پر مختلف سرداران فوج کو مقرر کرکے قافلوں کے لیے راستہ صاف کیا اور ایسے انتظامات کیے کہ بابکی لوٹ مار رک گئی ۔ بغا خلیفہ کی طرف سے افشین کے پاس مصارف جنگ لے کر آ رہا تھا جس کی بابک کو بھی اطلاع ہوگئی لیکن افشین بھی باخبر تھا ۔

۱- فلپ کے حتی : تاریخ شام ، ترجمہ غلام رسول مہر ، ص ۳۷۹، ۳۸۰ - حتی کے بیان سے مغربی جانبداری عیاں ہے ۔

بابک کا حملہ ناکام رہا ۔ بابک کو اب علم ہوگیا تھا کہ خود اس کے جاسوس افشین سے مل گئے ہیں ۔ بابک نے غصے میں ایک اور قلعے پر حملہ کرکے ہیثم کو کہا کہ قلعہ اس کے حوالے کر دے لیکن ابھی محاصرہ جاری ہی تھا کہ افشین جا پہنچا ، بابک صرف چند ہمراہیوں کے ساتھ جان بچا کر بھاگ سکا اور موقان پہنچا ۔ پھر بذ سے موقان میں فوج منگوائی اور اس کے ہمراہ اپنے قلعے میں واپس پہنچا ۔

بابک نے افشین کے لشکر کی رسد بند کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک رسد کے قافلے کو لوٹ بھی لیا ۔ افشین نے حاکم مراغہ کو رسد بھیجنے کا لکھا لیکن بابک نے اسے بھی لوٹ لیا ۔ بالآخر افشین نے حاکم شیروان سے کچھ رسد حاصل کی ۔ اب افشین نے حملے کا منصوبہ بنایا ، مختلف سرداروں کو ضروری ہدایات دیں اور لشکر کو مختلف سمتوں میں بڑھ کر مختلف جگہوں پر پڑاؤ کا حکم دیا ۔ بغا نے ہدایات کی پوری تعمیل نہ کی اس لیے اس کے لشکر کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا ۔ افشین نے خبر ملتے ہی اپنے بھائی فضیل کو چند نامور سرداروں کے ساتھ کمک کو بھیجا اور حملے کا وقت مقرر کرکے بغا کو بھی حملہ کرنے کی ہدایت دی ۔ افشین نے تو مقررہ وقت پر بذ پر حملہ کر دیا لیکن بغا سخت سردی اور مینہ کی وجہ سے حملہ آور نہ ہو سکا ۔ افشین نے اپنے دستے کے ساتھ حملہ کرکے خرمیوں کو سخت نقصان پہنچایا ۔ اس حملے میں بابک کی سابقہ ماہ آفرید بھی گرفتار ہوئی اور افشین کو اس کے ذریعے بابک کی عادات و اطوار، عقاید کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں، اس نے ماہ آفرید کو رہا کر دیا لیکن معلوم ہوا کہ وہ مسلمانوں کے لشکر کو دھوکہ دینے کے لیے میدان میں آئی تھی ۔

بغا نے ایک قریبی گاؤں پر قبضہ کر لیا اور بابک کے پیر بھائی ابن جاویدان کو گرفتار کر لیا ۔ رات ایک بلند پہاڑی پر کیمپ لگایا لیکن لشکر شدید برف باری میں پھنس گیا ۔ تین دن بعد اس مصیبت سے نجات حاصل کرکے وہاں سے نکلا ۔ اپنے اندازے پر وہ اس سمت طبل بجاتا ہوا بڑھا جہاں افشین کا لشکر متوقع تھا لیکن وہاں افشین ندارد ۔ معلوم ہوا کہ افشین بابک کے ساتھ ایک زبردست معرکے کے بعد پسپا ہونے پر مجبور ہوگیا تھا ۔ بغا پریشان حال لوٹا، راستے میں ایک جگہ رات کو قیام کیا لیکن رات کو بابکیوں نے گھیر لیا ، فضیل بن کاؤس شدید زخمی ہوا ۔ جناح مسکری اور ابن جوشن مارے گئے، دو ایک بہادر افسر گرفتار بھی ہوئے باقی لشکر بغا سمیت بھاگ نکلا، ابن جاویدان بھی اس افراتفری میں رہا ہوگیا ۔ افشین کو یہ خبر سن کر دکھ ہوا اور اب اس نے نئی منصوبہ بندی شروع کی ۔

اب بغا مراغہ میں قلعہ بذ کی شمالی اور مغربی سڑکوں کی ناکہ بندی پر مامور تھا ، اس سے رسد بہت متأثر ہوئی چنانچہ بابک کا سپہ سالار طرخان بھیس بدل کر مراغہ پہنچا ۔ اس نے وہاں جمعیت تیار کرنا شروع کی، فرخ چہر بھی وہاں پہنچا تھا ۔ طرخان نے پروگرام کے مطابق مراغہ پر حملہ کیا ، شہر میں قتل عام شروع ہوا ، والی کے قصر اور اہل و عیال پر قبضہ کرکے اپنے لیے خواب گاہ پسند کی ۔ ریحانہ کو ہرمزیار بذ سے بھگا لایا ، عین اس موقع پر فرخ چہر اور ماہویہ نے ہرمزیار اور طرخان کو قتل کر دیا ۔ ریحانہ بھاگ نکلی ۔ ماہویہ کے ساتھ وہ طرخان کا سر لے کر ماہویہ کے آقا اسحق بن ابراہیم کے گھر گیا جن کے ذریعے اسے افشین کا حکم ملا تھا کہ طرخان کو قتل کر دیا جائے ۔ اسحق بن ابراہیم کو بغا نے حاکم مقرر کرکے طرخان کا سر افشین کے پاس بھیج دیا ۔

ریحانہ کو مراغہ سے عالیہ لے بھاگی تھی - عالیہ بذ میں ماہ آفرید کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی اور جب طرخان نے ریحانہ کو بذ سے اغوا کرا لیا تو عالیہ ماہ آفرید کے بتائے ہوئے پتے اور تعاون سے وہاں آ پہنچی تھی - اب ان دونوں نے ایک غار میں قیام کیا - وہاں چار خرمیوں نے انھیں گھیر لیا اور گرفتار کر لیا ، اتنے میں پانچ مسلح سپاہی ان چاروں پر ٹوٹ پڑے، یہ فرخ چہر اور اس کے ساتھی تھے - فرخ چہر در اصل علی بن فضل تھا ، اس نے عالیہ کو پہچان لیا - غلط فہمیاں دور ہوئیں اپنی اپنی روداد سنائی - اب ریحانہ، علی ، عالیہ اور ساتھی خوش خوش بغداد کی طرف روانہ ہوئے -

یہ سات افراد کا قافلہ قصر شیریں کے کھنڈرات میں ٹھہرا ہوا تھا، صبح دیکھا تو ریحانہ غائب تھی - ایک ہفتہ وہاں ٹھہر کر انھوں نے ادھر ادھر تلاش کیا پھر آٹھویں دن افشین کے کیمپ کی طرف روانہ ہوئے - راستے میں انھیں جعفر خیاط کی سرکردگی میں افشین کے لیے آنے والی کمک ملی - افشین کو اطلاع مل چکی تھی اس لیے اس نے حفاظتی انتظامات کیے، بابک کے ایک سالار آذین کی ناکہ بندی کا بھی علم ہوا ، افشین نے حکمت عملی سے کام لے کر آذین کے منصوبے کو ناکام بنا دیا اور اس کے اہل و عیال کو گرفتار کر لیا -

افشین کے لشکر کو اس جنگ میں مصروف ہوئے ایک برس گزر چکا تھا - اب افشین نے محاصرے کا دائرہ تنگ کرنا شروع کیا - وہ بذ کے سامنے ایسی جگہ پہنچا جہاں تین پہاڑیاں متصل تھیں - ایک راستے کے سوا باقی سب دروں میں اس نے دیواریں چنوا دیں - پھر لشکر کو مختلف جگہوں پر متعین کر دیا - روز صبح طبل جنگ بجتا جنگ ہوتی اس طرح وہ بابکیوں کی کمین گاہوں کا پتہ لگانا چاہتا تھا - ظہر تک افشین ٹیلے پر رہتا جنگ جاری رہتی، نماز پڑھ کر وہ ٹیلے سے اتر آتا تو اسلامی لشکر واپس ہونے لگتا - ایک دن واپسی کے وقت جعفر کے دستے پر کمین گاہ کے بابکیوں نے حملہ کر دیا - جنگ دوبارہ چھڑ گئی مجاہدوں نے زور کیا اور فصیل تک جا پہنچے - حالت بہت نازک ہوگئی - جعفر اسے فتح سمجھ رہا تھا کہ افشین نے فوراً واپسی کا حکم بھیجا اتنے میں کمین گاہ سے مزید بابکی نکل آئے - اب افشین کو ان کی کمین گاہوں کا پتہ چل گیا - جب جعفر گھر گیا تو افشین نے فوراً علم دار سے جھنڈا لے کر اسے زور زور سے حرکت دی جس کے ساتھ ہی ہر طرف سے اسلامی رسالے اور گارد کے سوار جعفر کی مدد کو لپکے - افشین کے لشکر کا دباؤ بابکی نہ سہار سکے اور بھاگ نکلے اور فصیل قلعہ پر سے شدید سنگ باری شروع کر دی، مجبوراً اسلامی لشکر کو واپس لوٹنا پڑا - افشین نے کہا جعفر نے بہت بڑی غلطی کی تھی لیکن اس طرح افشین کو ان مقامات کا پتہ چل گیا جہاں سے بابکی اچانک نکل کر جھپٹ پڑتے تھے -

اس رات افشین کے خیمے میں جو فوجی کونسل ہوئی اس میں جعفر خیاط نے اس ملال کا اظہار کیا کہ افشین نے بر وقت مدد نہیں کی - افشین نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ جعفر نے ہدایات پر عمل نہیں کیا - پھر دونوں نے اپنے اپنے خیالات بیان کیے تو جلد ہی غلط فہمی دور ہوگئی اور دل صاف ہو گئے - عثمان بن نعمان موصلی سرگروہ مجاہدین تھے - انھوں نے مجاہدین کے مطالبات بیان کیے ، افشین کے جواب پر وہ برہم ہوئے اور واپس چلے جانے کا فیصلہ کیا - اسی دوران ماہ آفرید پھر گرفتار ہو کر پیش ہوئی - اس سے معلوم ہوا کہ ریحانہ اب بابک کی قید میں ہے -

دوسری صبح پھر مجاہدین کا وفد افشین سے ملا - ان کی باتوں اور جذبۂ جہاد سے افشین

بہت متأثر ہوا اور ان کے تمام مطالبات منظور کرکے کہا کہ ایک ہفتے کے اندر حملے کے جملہ انتظامات مکمل ہو جائیں گے ۔ اب اس نے لشکر کو ازسرنو مختلف مقامات پر متعین کیا ، رسد کے انتظامات کا جائزہ لیا ۔ زخمیوں کو میدان جنگ سے اٹھوانے کے لیے خچروں پر محملیں کسوائیں ۔ مجاہدین کو حسب ضرورت سامان حرب دیا ۔ اپنی فوج اور مجاہدین کے لیے حملے کی سمتیں معین کیں ۔ حملہ ہوا اور لشکر بذ کے پھاٹک تک جا پہنچا ۔ افشین انھیں میدان جنگ میں ستو، پانی وغیرہ بھجواتا رہا ۔ بذ کے اندر کے لشکر نے جب دیکھا کہ مسلمان دیواریں اور پھاٹک توڑنے میں بہت سرگرمی سے منہمک ہیں تو مجبوراً باہر نکل کر زور شور سے حملہ کیا ۔ مسلمانوں نے بہت داؤ ڈالا لیکن آخر ناکام پسپا ہونا پڑا ۔

رات افشین نے ماہ آفرید سے احوال پرسی کی ۔ عالیہ کو اس سے ملایا اور بتایا کہ اسے اس نے قلعہ شاہی کے حاکم سے مانگا ہے ۔ ماہ آفرید نے یقین دلایا کہ وہ عالیہ سے بدگمان نہیں اور پھر اسے ساتھ لے کر قلعہ بذ میں چلی گئی ۔ اس کے بعد افشین دو ہفتے چپکے چپکے تیاری کرتا رہا ۔ ایک رات اس نے کسی کو خبر ہونے بغیر ایک ہزار تیر اندازوں کو ایک پہاڑی پر پہنچا دیا ۔ اس پہاڑی کے نیچے آذین اپنی فوج کے ساتھ کمین گاہ میں بیٹھا کرتا تھا ۔ اس فوج کو حملے وغیرہ سے متعلق ضروری ہدایات دیں اور سب اونچ نیچ سمجھا دی ۔ پھر رات کو ہی بقیہ تمام فوج کو ضروری ہدایات دیں اور مختلف دستوں پر سردار مقرر کر دیے ۔ صبح حسب پروگرام حملہ ہوا ۔ بابک کی کمین گاہ والی فوج کا انتظام افشین نے رات کو ہی کر دیا تھا ۔ صبح ہر طرف سے حملہ شروع ہوا اور خرمی بے بس ہوگئے ۔ آذین نے ہتھیار رکھ دیے ۔ بابک نے افشین سے امان مانگی ۔ افشین اس سے شرائط طے ہی کر رہا تھا کہ معلوم ہوا اسلامی لشکر بذ کے اندر داخل ہو گیا ہے، افشین حملہ کرتا ہوا بذ کے پھاٹک سے داخل ہوا اور فوراً گھوڑے سے کود کر سربسجود ہوا ۔ بابک بھاگ نکلا ۔ دو گھنٹے تک بابکی قتل ہوتے رہے ۔ قصر و ایوان منہدم ہونے لگے ، عورتیں گرفتار کی جانے لگیں ۔

افشین نے بابک کے محلات دیکھے ، قید خانوں سے سات ہزار چھ سو عورتیں اور بچے برآمد ہوئے ۔ حرم سے کئی سو نازنین برآمد ہوئیں ۔ ان میں بابک کی تیئیس بیٹیاں اور خاص بیویاں بھی تھیں ۔ ایک بیٹا بھی گرفتار ہوا ۔ ریحانہ کا پتہ نہ چلا ۔ معمر عورت سے ریحانہ کا حال معلوم ہوا ۔ جب اسلامی لشکر بذ میں داخل ہو رہا تھا بابک دو حرموں، ریحانہ ، عالیہ اور ماہ آفرید کو لے کر سرنگ کے راستے غائب ہوگیا تھا ۔ افشین قصروں اور قلعوں کو اڑانے کا حکم دے کر لشکرگاہ میں لوٹا ۔

دوسرے دن بذ میں پہنچ کر افشین کو معلوم ہوا کہ بابک رات پھر قلعے میں آیا تھا اور جو کھانے پینے کا سامان ملا لے کر چلا گیا ۔ افشین نے بیسیوں سرنگیں دریافت کیں ۔ انھیں بند کرکے ان پر پہرے بٹھائے ۔ اس کے بعد ملوک ارمن، گرجستان، والیان مراغہ و عجم کو بابک کی شکست و فرار اور عباسی شہزادی کی قید کی تفصیلات لکھ بھیجیں اور انھیں ہر طرف ناکہ بندی کرنے کا حکم دیا ۔

اسی شام اسے معلوم ہوا کہ بابک قریب کی گھاٹی کے جنگل میں چھپا ہوا ہے ۔ جنگل کا ایک سرا آذربیجان اور دوسرا ارمن تک جا پہنچتا ہے ۔ افشین نے ابو سعید کی سرکردگی میں فوجی دستے تلاش میں بھیجے اور ریحانہ اور بابک کے لیے دوہرے انعام کا اعلان کیا ۔ پھر خود

بھی مختلف راستوں کی ناکہ بندی کی ۔ فوجی دستے کے کچھ سپاہی عالیہ کو زخمی حالت میں لائے۔ فوری طبی تدابیر اختیار کی گئیں ۔ دو خرمی امیر افشین کا خط بابک تک پہنچانے پر آمادہ ہو گئے اور افشین نے وعدہ کیا کہ ان کے قتل کی صورت میں ان کے بچوں کی کفالت کی جائے گی ۔

عالیہ کو ہوش آیا ، افشین نے تسلی دی ۔ دوسرے دن عالیہ نے ریحانہ کی قید اور بذ کی فتح کے وقت ان کے زبردستی لے جائے جانے کا ماجرا سنایا ۔ پھر سرنگ کے راستے جب جنگل میں پہنچے تو بابک نے عالیہ کے قتل کا حکم سنایا اور چار وحشیوں نے اس پر وار کرکے اپنی طرف سے اسے بے جان کرکے پھینک دیا ۔ اب عالیہ صحت یاب ہو رہی تھی ۔ اسی دوران بابک کی طرف سے ابو سعید اور افشین کے نام دو دھمکی آمیز خطوط پہنچے اور معلوم ہوا کہ اس نے دونوں نامہ بروں کو قتل کر دیا ہے ۔ افشین نے ان کی عورتوں کو ہزار ہزار درہم دے کر پینتیس دینار وظیفہ مقرر کیا اور آزاد کر دیا ۔ اسی اثناء میں معتصم کی طرف سے بابک کے اعزہ و اقارب اور کل خرمیوں کو جو اطاعت قبول کریں ، امان دینے کا حکم آ گیا ۔

ادھر بابک کے مسمار شدہ قصر میں پھر سے وہ سرنگ تلاش کی گئی جس سے بابک فرار ہوا تھا اور علی ، عالیہ اور سپاہی اس راستے سے جنگل میں پہنچے ۔ ایک غار میں بابک سے آمنا سامنا ہوا ۔ بابک بھاگ نکلا ، ریحانہ اور بذ سے لایا ہوا تمام مال وہاں سے برآمد کر لیا گیا ۔ قیدیوں میں ماہ آفرید بھی شامل تھی ۔ بابک جنگل میں مغرب کی طرف سفر کرتا رہا ۔ جنگل میں کچھ مفرور خرمی ملے ، اس کا بھائی بھی ملا ۔ سب کو لے کر ارمن کی راہ لی ۔ راستے میں سپاہیوں نے دیکھ لیا ، تعاقب کیا ۔ بابک بچ نکلا ، اس کی ماں اور بھائی گرفتار ہوئے جنھیں افشین کے پاس بھیج دیا گیا ۔ بابک جنگل اور پہاڑوں میں آگے بڑھتا رہا ، جہاں وہ باہر نکلنے کی کوشش کرتا اسے معلوم ہوتا کہ ہر طرف مکمل ناکہ بندی ہے ۔ جنگل کے کنارے اسے کچھ کسان نظر آئے ۔ ایک رفیق کو دینار دے کے غلہ لانے بھیجا ۔ اس کی اطلاع مسیحی حاکم ابن سنباط کو پہنچی ، وہ فوراً آ پہنچا ۔ بابک کو پہچانا ، دوڑ کر ہاتھ چومے ، عاجزی سے پیش آیا ، لجاجت اور خوشامد سے اپنے قلعے میں لے آیا ، بڑی تعظیم و تکریم کی ۔ اس کی خواہش پر اس کے بھائی کو قلعہ استفانوس کے مسیحی حاکم عیسیٰ بن یونس کے پاس بھیج دیا گیا ۔ ادھر ابن سنباط نے سازش تیار کر رکھی تھی ۔ بابک کو شکار کے بہانے ایک گھاٹی میں لا کر گرفتار کرا دیا ۔ افشین کے پاس پہنچے تو اس نے ایک لاکھ درہم معویہ کو اور دس لاکھ درہم ابن سنباط کو مع مرصع ڈاب کے بھجوائے ۔ پھر عیسیٰ بن یونس کو خط بھیج کر بابک کے بھائی کو منگوایا ۔ افشین نے بتایا کہ بابک نے بیس سال میں بیس لاکھ پچپن ہزار پانچ سو جانیں لی ہیں ۔

افشین ڈیڑھ ماہ میں امن و امان قائم کرکے بابک اور اس کے خاندان کے تین ہزار تین سو نو خرمیوں کو اسیر کیے اور سات ہزار چھ سو شریف عجمی و عربی نژاد عورتوں اور بچوں کو قید سے چھڑا کر ساتھ لیے روانہ ہوا ۔ برزند سے سامرہ تک ہر منزل پر افشین کو معتصم کی طرف سے خلعت اور اعلیٰ درجے کا گھوڑا عطا ہوا ۔ سامرہ کے باہر ولی عہد شہزادے نے رؤسا سمیت استقبال کیا ۔ سامرہ دلہن کی طرح سجا تھا ۔ شہر میں زبردست استقبال ہوا ۔ معتصم سے ملا اس نے پھر خلعتیں دیں ۔ خلیفہ نے دوسرے دن دربار کیا ۔ بابک کو ہاتھی پر بٹھایا گیا ۔ شاعروں نے نظمیں پڑھیں ۔ سردربار معتصم کے حکم سے پہلے بابک کے ہاتھ پاؤں پھر سر قلم کیا گیا ۔ سر خراسان میں پھرانے اور دھڑ سامرہ میں صلیب پر لٹکانے کا حکم ہوا ۔ ایک بھائی کو

اسحق بن ابراہیم کے پاس بغداد اور ایک کو خراسان اسی برتاؤ کے لیے بھجوایا ۔ دوسرے دن اس کے ہمراہی قتل ہوئے۔ افشین کو دو کروڑ دینار انعام اور جاگیر دی ۔ ریحانہ اور علی کی شادی دھوم دھام سے کی ۔

واقعات کا تحقیقی جائزہ

ناول میں بیان کردہ واقعات کا خلاصہ سطور ما قبل میں بیان کیا جا چکا ہے ۔ "محاربات بابک خرمی" کے عنوان سے تاریخ ابن خلدون کا اقتباس درج ذیل ہے۔ اس اقتباس سے بہت حد تک اندازہ ہو سکتا ہے کہ شرر نے واقعات میں کس حد تک تصرف کیا ہے۔ ابن خلدون لکھتے ہیں:

''بابک نے شہر بذ کو اپنا ملجا و ماوا بنا رکھا تھا ۔ خلیفہ مامون نے اپنے عہد خلافت میں جس قدر فوجیں اس کے مقابلے پر بھیجیں سبھوں کو اس نے نیچا دکھایا ۔ بہت سے سپہ سالاران لشکر کو قتل کر ڈالا اور اکثر قلعات کو جو مابین اردبیل اور آذربیجان کے تھے ، ویران و مسمار کر دیا ۔ جب خلیفہ معتصم تخت خلافت پر متمکن ہوا ، ابو سعید محمد بن یوسف کو اس مہم پر مامور کیا ۔ چنانچہ ابو سعید نے حسب حکم خلیفہ معتصم ان قلعات کو جن کو بابک خرمی نے ویران و مسمار کر دیا تھا ازسر نو تعمیر کرایا ۔ فوج ، آلات حرب اور غلہ کی کافی مقدار سے قلعہ کو مضبوط و مستحکم کیا ۔ اس اثنا میں بابک خرمی کے کسی سردار نے ان بلاد پر شبخون مارا ۔ ابو سعید نے اس کا تعاقب کیا اور نہایت مستعدی سے جو کچھ وہ لوٹ لے گیا تھا اس سے چھین لیا ۔ بہت سے آدمیوں کو قتل کر ڈالا اور اکثر کو گرفتار کر لیا ۔ مقتولوں کے سروں اور قیدیوں کو ایک عرضداشت کے ساتھ دربار خلافت میں خلیفہ معتصم کی خدمت میں بھیج دیا ، (یہ پہلی ہزیمت تھی جو بابک خرمی کے ہمراہیوں کو نصیب ہوئی) دوسری ہزیمت محمد بن بعیث کے ذریعے سے ہوئی ۔ یہ آذربیجان کے ایک قلعے میں، جس کو اس نے ابن داؤد سے لیا تھا، رہتا تھا اور بابک خرمی کا معین و مددگار تھا اور اس کے سرایا اور فوجوں کی رسد رسانی کا کام دیتا تھا۔ اتفاق سے واقعہ مذکورہ کے بعد بابک خرمی کا ایک سپہ سالار عصمت نامی اس قلعہ کی طرف سے ہو کر گزرا ۔ حسب عادت قدیم محمد بن بعیث نے دعوت کی ، عزت و احترام سے ٹھہرایا ۔ رات کے وقت حالت غفلت میں عصمت کو گرفتار کر کے خلیفہ معتصم کی خدمت میں بھیج دیا اور اس کے ہمراہیوں کو قتل کر ڈالا ۔ خلیفہ معتصم نے عصمت سے بابک کے بلاد اور قلعات کے اسرار دریافت کیے ۔ عصمت نے بامید رہائی عرض کر دیے۔ خلیفہ معتصم نے عصمت کو قید کر دیا اور افشین حیدر بن کاؤس کو جبال کی گورنری مرحمت فرما کے جنگ بابک پر روانہ کر دیا ۔

افشین نے میدان کار زار میں پہنچ کے پہلے رسد رسانی کا انتظام کیا اور راستوں کو خطرات سے پاک و صاف کرنے کی نظر سے تھوڑی تھوڑی دور پر چوکیاں بٹھلائیں ۔ کار آزمودہ اور تجربہ کار سپہ سالاروں کو پترول پر متعین کیا جو شب و روز اردبیل سے اس کے لشکر تک گشت کیا کرتے اور رسد و غلہ اور کل مایحتاج الیہ سامان کو بحفاظت تمام لشکر گاہ تک پہنچایا کرتے ، اور جب بابک خرمی کا کوئی جاسوس مل جاتا تو افشین اس سے بابک کے اخلاق ، برتاؤ ، احسانات کو دریافت کرتا اور اس سے دو چند ان لوگوں کو مرحمت کر کے رہا کر دیتا ۔ بعد اس کے خلیفہ معتصم نے بغاالکبیر کو مع کثیرالتعداد فوج اور مال و اسباب کے افشین کی کمک پر روانہ کیا ۔ بابک یہ سنکر بغاالکبیر پر شبخون مارنے پر تیار ہو گیا ۔ جاسوسوں نے افشین تک یہ خبر پہنچا دی ۔ افشین نے بغاالکبیر کو لکھ بھیجا کہ تم قافلہ کے ساتھ نہر تک آؤ اور قافلہ کے روانہ ہو جانے کے بعد مع اپنے ہمراہیوں کے پھر اردبیل واپس چلے جاؤ ۔ بغا الکبیر نے ایسا ہی کیا ۔ بابک یہ خبر پا کے کہ بغاالکبیر کا قافلہ نہر کی طرف روانہ ہو گیا ہے ، شبخون مارنے کے قصد سے مع اپنے چند چنے ہوئے ہمراہیوں کے نکل کھڑا ہوا ۔ افشین چپکے سے جس دن بغا سے ملنے کا وعدہ تھا ، اردبیل کی طرف چلا گیا اور بحفاظت تمام بغا کو مع مال و اسباب کے ابو سعید کے مورچے میں لا کے ٹھہرایا ۔ اس اثنا میں بابک قافلے تک پہنچ گیا ۔ قافلے کے ہمراہ والی قلعہ نہر بھی تھا ۔ بغاالکبیر سے تو مڈ بھیڑ نہ ہوئی والی قلعہ نہر سے سامنا پڑ گیا ۔ لڑائی ہونے لگی ۔ بابک کے ہمراہیوں نے ان لشکریوں کو جو قافلے کے ہمراہ تھے تہ تیغ کر کے جو کچھ مال و اسباب پایا لوٹ لیا ۔ اتفاق یہ کہ اثناء راہ میں افشین کے سپہ سالاروں میں سے ہیثم نامی ایک سپہ سالار

سے دو چار ہوگیا۔ بابک نے اس کو بھی ہزیمت دی۔ ہیثم ایک قلعے میں جا کر چھپ گیا، بابک نے پہنچ کر محاصرہ ڈال دیا۔ اس عرصے میں افشین اپنا لشکر لیے آ پہنچا اور دفعتاً بابک کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ بابک کا لشکر اس ناگہانی حملے سے گھبرا گیا۔ کہاں کے سر و سامانی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ لشکر کا زیادہ حصہ اس معرکے میں کام آ گیا۔ بابک مع معدودے چند آدمیوں کے بھاگ کے موقان پہنچا اور اپنے بقیہ لشکر کو موقان میں طلب کیا۔ دو چار روز قیام کرکے موقان سے روانہ ہو کے مقام بذ میں آ اترا۔

افشین اس کامیابی کے بعد اپنی لشکرگاہ برزند میں آیا۔ لشکریوں کو انعامات اور صلے مرحمت کیے اور بابک کو ہزیمت دینے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ یہ اسی خیال میں تھا کہ بابک نے اپنی حکمت عملی سے افشین کے لشکر کا راستہ کاٹ دیا۔ رسد و غلہ کا آنا موقوف ہوگیا۔ افشین کا لشکر رسد کے نہ آنے سے بھوکوں مرنے لگا۔ افشین نے والی مراغہ سے رسد طلب کی لیکن بد قسمتی سے اثنائے رہ میں بابک کے لشکریوں نے اسے لوٹ لیا۔ بغا الکبیر یہ خبر پا کے مع سامان و مال کے جو اس کے پاس تھا، بابک کے ہاتھوں سے بچا کے افشین کے لشکرگاہ میں آیا اور لشکریوں میں تقسیم کر دیا۔ بعد اس کے افشین نے اپنے سپہ سالاروں کو بابک پر حصار ڈالنے کی غرض سے بڑھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ قلعہ بذ سے چھ میل کے فاصلے پر پہنچ کے مورچے قائم کیے اور بغا الکبیر نے قریہ بذ میں داخل ہو کے لڑائی چھیڑ دی۔ ایک خونریز جنگ کے بعد اپنے ہمراہیوں میں سے ایک جماعت کو اس معرکے کی نذر کرکے محمد بن حمید سپہ سالار کے مورچے میں واپس آیا۔ افشین نے اس کے امداد طلب کرنے پر اپنے بھائی فضل اور احمد بن خلیل بن ہشام اور ابو جوشن اور جناح الاعور کو (یہ حسن بن سہل کے باڈی گارڈ کا افسر تھا) بغا کی کمک پر روانہ کیا اور یہ حکم دیا کہ فلاں روز فلاں وقت بابک کے لشکر پر یہ لوگ حملہ کرنا میں بھی اسی دن اور اسی وقت مقررہ پر اس سمت سے حملہ آور ہوں گا۔ اتفاق یہ کہ بغا وغیرہ نے شدت سرما اور بارش کی وجہ سے حملہ نہ کیا اور افشین نے تیاری کرکے دھاوا کر دیا۔ بابک کا لشکر جو اس کے مقابلے پر تھا۔ تاب مقاومت نہ لا سکا، پیچھے ہٹا، افشین نے بڑھ کے اس مورچے پر قبضہ کر لیا۔ اگلے دن بغا وغیرہ شدت سرما اور بارش وغیرہ سے تنگ آ کے کسی راہبر کی راہبری میں ایک پہاڑی پر چڑھ گئے جو افشین کی لشکرگاہ کے قریب تھی۔ یہاں پر ان کا اسی سرما اور بارش سے سابقہ پڑا، مزید برآں یہ ہوا کہ برف بھی پڑ گئی۔ ہاتھ پاؤں نے کام دینے سے جواب دے دیا، دو روز تک اسی حالت میں مبتلا رہے اور بابک نے موقع پا کے افشین کے لشکر پر شبخون مارا اور لڑ کے پیچھے ہٹا دیا۔ ادھر بغا کے رکاب کی فوج نے رسد و غلہ کے ختم ہونے کی وجہ سے شور و غوغا مچایا۔ بغا نے مجبور ہو کے بقصد قلعہ بذ بہ غرض دریافت حال افشین کوچ کر دیا۔ کچھ دور نکل آنے پر افشین کا حال معلوم ہوا۔ بابک کے خوف کی وجہ سے پھر اسی پہاڑی کی جانب لوٹا اور بوجہ تنگی راہ و کثرت فوج دوسری راہ اختیار کی۔ بابک کے پٹرول نے تعاقب کیا۔ بغا کے ہمراہیوں نے اُن کی جانب مڑ کے بھی نہ دیکھا، نہایت تیزی سے اس تنگ و دشوار راستے کو طے کر گئے۔ اس اثنا میں رات آ گئی۔ بغا نے مال و اسباب کی حفاظت کے خیال سے دامن کوہ میں پڑاؤ کر دیا اور ہر چہار طرف لوگوں کو پہرہ پر مقرر کیا۔ سب کے سب تھکے تو تھے ہی، سو گئے۔ بابک نے موقع پا کے چھاپہ مارا اور جو کچھ اُن کے پاس مال و اسباب تھا لوٹ لیا۔ بغا مع اپنے ہمراہیوں کے خندق اول میں چلا آیا جو نشیبی کوہ میں تھا۔ طرہ خاں بابک خرمی کا ایک نامور سپہ سالار تھا، بہ اجازت بابک مراغہ کے ایک قریہ میں ایام سرما منقضی کرنے چلا آیا۔ افشین نے اپنے سپہ سالار کو جو مراغہ میں تھا، طرہ خان کی گرفتاری کا لکھ بھیجا۔ سپہ سالار مراغہ نے شب کے وقت طرہ خان کے مکان کو جا کے گھیر لیا اور قتل کرکے سر افشین کے پاس بھیج دیا۔

انھیں واقعات پر ۲۲۱ھ رخصت ہو جاتا ہے اور ۲۲۲ھ کا دور شروع ہوتا ہے۔ خلیفہ معتصم نے جعفر خیاط کو بسر افسری ایک عظیم الشان فوج کے افشین کی کمک پر روانہ کیا اور ایتاخ کی معرفت تیس لاکھ دراہم مصارف فوج بھیجے۔ اس مالی اور فوجی امداد سے افشین کی قوت بڑھ گئی اور اوائل فصل ربیع میں بقصد جنگ بابک کی طرف کوچ کیا۔ رود کلاں پر پہنچ کے خندق کھودی، مورچے قائم کیے، اس اثنا میں یہ خبر لگی کہ بابک کا ایک سپہ سالار جس کا نام اذین ہے اس مورچے کے مقابلے پر صف آرائی کر رہا ہے اور اپنے اہل و عیال کو کسی پہاڑی پر بھیج دیا ہے۔ افشین نے ایک سپہ سالار کو مع ایک دستہ فوج کے

آذین کے اہل و عیال کو گرفتار کر لانے کے لیے بھیج دیا۔ چنانچہ اس سپہ سالار نے نہایت مستعدی اور ہوشیاری سے اس حکم کی تعمیل کی۔ آذین کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بھی ان کے روک ٹوک کو سوار ہو کے نکلا۔ اثنائے راہ میں ملاقات ہو گئی۔ فریقین ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ آذین نے کچھ عورتوں کو چھین لیا۔ افشین کے آدمیوں نے سیاہ جھنڈیوں کے ذریعے سے اس واقعے سے افشین کو آگاہ کیا جو پہلے سے مختلف اور بلند مقامات پر سیاہ جھنڈیاں لیے ہوئے بیٹھے تھے اور ان کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ اگر کوئی حادثہ یا مخالف فریق کو حملہ آور دیکھنا تو انہیں جھنڈیوں سے اطلاع دینا۔ افشین نے فوراً ایک گروہ کو ان کی کمک پر روانہ کیا۔ اس گروہ کے آنے سے آذین کے ہوش و حواس جاتے رہے، گھبرا کے بھاگ کھڑا ہوا اور افشین کے ہمراہی مع آذین کی عورتوں کے واپس آئے۔

اس واقعہ کے بعد افشین آہستہ آہستہ قلعہ بذ کی طرف بڑھنے لگا۔ رات کے وقت لوگوں کو پہرہ مقرر کرتا اور خود بھی شب کے وقت بابک کے خوف سے پترول کے ساتھ گشت کرنے کو نکلتا۔ اگرچہ لشکری شب کی بیداری اور دن کے سفر سے تھک گئے، مگر امیر لشکر کے حکم کی تعمیل بڑی خوش دلی سے کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ قلعہ بذ کے روبرو ایسے مقام پر پہنچے جہاں نہ قدرتی طور سے تین پہاڑیاں ایک دوسرے سے متصل واقع ہوئی تھیں اور ان تینوں پہاڑیوں کے درمیان ایک وسیع میدان تھا۔ افشین نے اپنے لشکر کو اسی میدان میں مع علم اور جملہ اسباب ضروری کے ٹھہرایا اور کل راستوں کو باستثنا ایک کے پتھروں سے چن دیا۔ انہیں پہاڑوں کے قریب بابک کا لشکر بھی پڑا ہوا تھا۔ افشین روزانہ اول وقت میں نماز صبح ادا کرکے نقارہ بجواتا۔ لشکری اس نقارہ کی آواز سن کے تیار ہو جاتے۔ افشین جب تک مصروف جدال و قتال رہتا نقارہ بجتا رہتا اور جب جنگ کا روکنا مقصود ہوتا، نقارہ کا بجانا بند کرا دیتا۔ غرض لشکری نقارہ کی آواز پر کام کرتے تھے اور جب اس کا ارادہ آگے بڑھنے کا ہوتا تو درہ کوہ پر ایک لشکر متعین کر جاتا جو اس قدرتی قلعہ کی محافظت کرتا، جس کو اس نے اپنی ضرورت کے لیے بنا لیا تھا اور بابک یہ انتظام کرتا کہ جس وقت افشین حملہ آور ہوتا، چند آدمیوں کو اس گھاٹی کے نیچے کمین گاہ میں بٹھا دیتا۔ افشین نے ہر چند اس کی تجسس کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اکثر اوقات ابو سعید، جعفر خیاط اور احمد بن خلیل بن ہشام کو تین تین دستے فوج کے ساتھ جنگ کرنے کو روانہ کرتا کہ یکے بعد دیگرے میدان کار زار میں جائیں اور خود ایک بلند مقام پر بیٹھا ہوا لڑائی کا منظر دیکھتا رہتا۔ اس مقام سے بابک کا قلعہ اور محل سرائے بھی دکھائی دیتا تھا۔ بابک ہمیشہ ان کے مقابلے پر معدودے چند آدمیوں کو لے کے آتا اور باقی فوج کمین گاہ میں رہتی۔ ہر وقت اس کے لشکری شراب پیتے، گلچھرے اڑاتے، گاتے اور بانسری بجاتے۔ ظہر تک افشین اس منظر کو دیکھتا رہتا۔ بعد ادائے نماز ظہر اپنے خندق میں واپس آتا۔ اس کے واپس ہوتے ہی یکے بعد دیگرے اس کی فوجیں بھی میدان جنگ سے ترتیب وار واپس آ جاتیں۔ بابک کا گروہ اس طول و طویل جنگ سے گھبرا گیا۔ ایک روز حسب دستور افشین کا لشکر واپس ہوا۔ اتفاق سے جعفر پیچھے رہ گیا۔ بابک کا لشکر میدان خالی سمجھ کے بذ سے نکل پڑا۔ جعفر نے بڑھ کے حملہ کیا اور بلند آواز سے اپنے ہمراہیوں کو پکارا۔ افشین کا لشکر ٹوٹ پڑا۔ لڑائی پھر دوبارہ چھڑ گئی۔ جعفر کے ہمراہیوں میں سے ابودلف کے ساتھ ایک گروہ مطوعہ (والنٹیرز) کا تھا۔ ان لوگوں نے بلا حکم افشین بابک پر اس زور شور کا دھاوا کیا کہ دیکھنے والے یہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ کمندیں ڈال کے قلعہ پر چڑھ جائیں گے۔ جعفر نے میدان کار زار سے افشین سے پانچ سو تیر اندازوں کی مدد طلب کی۔ افشین نے کہلا بھیجا تم امدادی فوج کا انتظار نہ کرو، جہاں تک ممکن ہو آہستہ آہستہ حکمت عملی واپس چلے آؤ۔ جنگ کا عنوان خطرناک ہو رہا ہے۔ اس عرصہ میں مطوعہ حملہ کرتے ہوئے بذ تک پہنچ گئے۔ فریقین کے شور و غل سے میدان جنگ گونج رہا تھا۔ بابک کے ان لشکریوں نے جو کمین گاہ میں تھے، یہ سمجھ کر کہ قلعہ تک فریق مخالف پہنچ گیا کمین گاہ سے نکل آئے، افشین پر اس قلعہ کا راز اور کمین گاہ کا حال منکشف ہو گیا۔ لڑائی طویل ہو گئی تھی۔ فریقین لڑتے لڑتے تھک گئے تھے اور آفتاب بھی گوشۂ مغرب میں پہنچ گیا تھا۔ جعفر لڑتے لڑتے آہستہ آہستہ اپنے مورچے کی طرف واپس ہوا۔ مغرب کے وقت تک لڑائی بالکل بند ہو گئی۔ دونوں حریف اپنی اپنی قیام گاہ پر آئے، کمریں کھولیں، جعفر ہاتھ منہ دھو کے افشین کے پاس گیا۔ افشین نے عدول حکمی اور خلاف مرضی جنگ کرنے سے ناراضی

ظاہر کی ، جعفر نے افشین کے امداد نہ بھیجنے سے اظہار ملال کیا ۔ غرض دونوں نے وجوہات معقول بتلائے ، صفائی ہو گئی ۔ بعد اس کے مطوعہ نے کمی خرچ و رسد کی شکایت کی ۔ افشین نے جواب دیا ، جو شخص اس کمی مصارف اور گرسنگی کی تکالیف برداشت کر سکے وہ ہمارے ساتھ دشمنوں کے مقابلے پر رہے ، ورنہ اپنا رستہ لے ۔ امیرالمومنین کے لشکر میں بفضلہ تعالیٰ جنگ آوروں کی کمی نہیں ہے ۔ مطوعہ یہ کہتے ہوئے واپس ہولیے کہ ہم تو قلعہ بذ کو بات کی بات میں مفتوح کر لیتے مگر امیر لشکر نے مدد نہ کی اور نا حق ہم لوگوں کو ثواب جہاد سے محروم کرتا ہے ۔ اب بھی اگر ہم کو حملہ کرنے کا حکم دے تو ہم اپنی قوت کا نتیجہ دکھلا دیں ۔

افشین کے کان تک یہ باتیں پہنچ گئیں ، مطوعہ کو طلب کرکے تسلی دی ، جنگ کا حکم دیا اور جس وقت ان لوگوں نے دھاوا کرنے کا ارادہ کیا تھا اسی وقت خود بھی حملہ کرنے کا وعدہ و اقرار کیا ۔ مال اسباب ، خوراک ، پانی اور آلات حرب خاطر خواہ ان لوگوں کو دیا ۔ زخمیوں کو میدان جنگ سے اٹھا لانے کے لیے خچروں پر محملیں رکھوا دیں اور جعفر کو اسی مورچے کی طرف بڑھنے کو کہا جہاں تک کل بڑھ گیا تھا ۔ اگلے دن جعفر نے تیراندازوں ، نفاطوں اور نامی نامی جنگ آوروں کو منتخب کرکے ایک لشکر مرتب کیا اور مطوعہ کو اپنے ہمراہ لیے ہوئے میدان جنگ میں آیا ۔ بابک کے لشکر نے قلعہ سے تیر باری شروع کی ۔ جعفر کے ہمرکاب فوج اپنے کو بابک کے حملوں سے بچاتی ہوئی قلعہ بذ کی فصیل تک پہنچ گئی اور جعفر کمال مردانگی و استقلال سے دروازہ بذ پر پہنچ کے لڑنے لگا ۔ لڑتے لڑتے دوپہر ڈھل گئی۔ افشین نے حسب ضرورت ان لوگوں کے لیے کھانا اور پانی روانہ کیا اور قلعہ بذ کی فصیلوں کو توڑنے کی غرض سے مزدوروں کو مع پھاوڑے اور کدالوں کے جعفر کے پاس بھیجا ۔ اس اثنا میں بابک کا لشکر قلعہ کا دروازہ کھول کے نکل آیا اور مطوعہ کو اپنے پر زور حملے سے قلعہ کی فصیل سے پیچھے ہٹا دیا ۔ عنوان جنگ نہایت خطرناک تھا ۔ کبھی بابک کا لشکر مطوعہ کو قلعہ کی فصیل سے پسپا کر دیتا تھا اور کسی وقت مطوعہ بابک کے لشکر کو لڑ کر قلعہ کے اندر داخل کر دیتا تھا، غرض فریقین اسی حالت میں تھے کہ شام ہو گئی اور رات نے اپنے سیاہ دامان سے آفتاب عالمتاب کو چھپا لیا ۔ افشین نے لشکریوں کو میدان جنگ سے مراجعت کا حکم دیا ۔ دونوں حریف اپنی اپنی قیام گاہ میں آئے ۔ لطف یہ کہ ہر فریق کو اس جنگ کے بعد اپنی کامیابی سے نا امیدی سی ہو گئی ۔ اکثر مطوعہ اپنے شہروں کو لوٹ گئے ۔ دو ہفتے بعد افشین نے پھر جنگ کی تیاری کی ۔ لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کیا ۔ ایک حصے کو جس میں ایک ہزار تیر انداز تھے آدھی رات کے وقت اسی پہاڑ کی جانب روانہ کیا جو قلعہ بذ کے قریب تھی اور جس کے دامن میں بابک کا نامی سپہ سالار آذین صف آرائی کرتا تھا اور ان کو یہ ہدایت کر دی کہ جس وقت جعفر کو بذ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھنا ، تیر باری کرتے ہوئے بابک کے لشکر پر حملہ کر دینا ۔ دوسرے حصے کو اسی ٹیلے کے نیچے کمین‌گاہ میں چھپا دیا جس کی چوٹی پر بابک کے آدمی کمین‌گاہ میں بیٹھتے تھے ۔ تیسرے حصے کو محافظت کی غرض سے لشکرگاہ میں چھوڑا اور چوتھے حصے کو مسلح اور مرتب کرکے صبح ہوتے ہی سوار ہو کے اس مورچے کی طرف آیا جہاں پر حسب عادت گزشتہ لڑائیوں میں ٹھہرتا تھا ۔

جعفر خیاط مع چند نامی سپہ سالاروں کے اس پہاڑ کی طرف بڑھا جس کے دامن میں آذین سپہ سالار بابک نے صف آرائی کی تھی ۔ آذین نے جعفر کو بڑھتے ہوئے دیکھ کے تیر باری شروع کی ۔ ادھر سے جعفر کے ہمراہیوں نے بھی جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ ادھر سے ان تیر اندازوں نے تیروں کا مینہ آذین پر برسانا شروع کیا جو نصف شب سے اس پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے تھے ۔ آذین کے ہمراہی اس دو طرفہ مار سے گھبرا گئے وادی کی طرف بڑھے تو ٹیلے کے نیچے سے دوسری کمین‌گاہ والوں نے ہمارا نشگاف تیروں سے استقبال کیا ۔ بابک نے عنوان جنگ بگڑا ہوا دیکھ کر افشین سے درخواست کی کہ مجھے اس قدر جنگ سے مہلت دیجیے کہ میں اپنے اہل و عیال کو کسی دوسرے مقام پر منتقل کر دوں ۔ بعد ازاں قلعہ بذ کی کنجیاں میں آپ کے حوالے کر دوں گا ۔ ہنوز یہ مرحلہ طے نہ ہونے پایا تھا کہ کسی نے افشین تک یہ خبر پہنچا دی کہ عساکر اسلامیہ نے قلعہ بذ پر قبضہ کر لیا ہے اور بفضلہ تعالیٰ اس کے بلند میناروں پر امیر کی کامیابی کا پھریرا اڑا دیا گیا ہے ۔ افشین سجدۂ شکر ادا کرکے قلعہ بذ میں داخل ہوا اور بابک کے محل سراؤں میں آگ لگا دی ۔ جس قدر امراء کے لشکری سامنے آئے قتل کر ڈالے گئے ۔ عورتیں اور بچے قید کر لیے گئے ۔ مال و اسباب جو کچھ پایا لوٹ کے قریب مغرب اپنی

لشکرگاہ میں واپس آیا ۔ اس کی مراجعت کے بعد بابک نے اپنے اہل و عیال کو دوسرے مقام میں منتقل کر دیا اور جس قدر مال و اسباب اٹھا سکا اٹھا لے گیا ۔ اس کے دوسرے دن افشین پھر قلعہ بذ کے ملاحظے کو آیا ۔ پہلے روز کی آتشزدگی سے جو مکان بچ گئے تھے ان کو بھی جلوا دیا اور ملوک ارمینیہ اور ان کے بطریقوں کو بابک کے بھاگنے کا حال تحریر کرکے اس کی گرفتاری کی سخت تاکید کی ۔ بعد اس کے کسی جاسوس نے آ کے یہ خبر دی کہ بابک اس وقت وادی میں ہے جس کا ایک کنارہ آذربیجان سے ملحق ہے اور دوسرا کنارا آرمینیہ تک پھیلا ہوا ہے ۔ افشین نے اسی وقت چند آدمیوں کو اس کی گرفتاری پر متعین کیا مگر گنجان درختوں اور جھاڑیوں نے ان لوگوں کی نظروں سے بابک کو بچا لیا ۔ اس اثنا میں خلیفہ معتصم نے بابک کے امان دینے کا حکم بھیج دیا ۔ افشین نے اس فرمان کو بابک کے ہمراہیوں میں سے ایک شخص کو جو اس کے امان کا مستدعی تھا حوالہ کرکے بابک کے پاس بھیجا ۔ بابک نے اس امان کو منظور نہ کیا بلکہ طیش میں آ کے دو ایک آدمیوں کو جو افشین کے لشکر کے تھے قتل کر ڈالا اور اس وادی سے مع اپنے بھائی عبداللہ و معاویہ اور اپنی ماں کے بقصد آرمینیہ نکل کھڑا ہوا ۔ اتفاق سے کسی کی نظر پڑ گئی جو اس کی گرفتاری پر متعین کیے گئے تھے۔ اس نے اپنے سردار ابوالسفاح سے جا کے کہہ دیا ۔ ابوالسفاح نے تعاقب کا حکم دے دیا ۔ ایک چشمے پر جا کر ان لوگوں نے گھیر لیا ۔ بابک سوار ہو کے بھاگ گیا مگر اس کی ماں اور بھائی معاویہ گرفتار ہو کے افشین کے پاس بھیجے گئے ۔

بعد اس واقعہ کے بابک جبال آرمینیہ میں جا کے روپوش ہوا ۔ جاسوس اس کے پیچھے پیچھے تھے، زاد راہ ختم ہوگیا تھا ۔ ایک شخص کو اپنے ہمراہیوں میں سے کچھ روپیہ دے کے کھانا خریدنے کو بھیجا ۔ کسی افسر پولیس کی اس شخص پر نظر پڑ گئی ۔ چال ڈھال سے تاڑ گیا ۔ سہل بن سباط کے پاس کہلا بھیجا کہ مجھے اس پر شبہ ہوتا ہے کہ وہ بابک کے ہمراہیوں میں سے ہے ۔ سہل بن سباط یہ سن کے دوڑا آیا اور اس شخص کے ساتھ بابک کے پاس گیا ۔ بابک کا چہرہ اس کو دیکھتے ہی فق ہوگیا ۔ سہل بن سباط بابک کو بہ تملق و چاپلوسی دم پٹی دے کے اپنے قلعے میں لایا اور چپکے سے افشین کو اس کی اطلاع کر دی ۔ افشین نے دو سپہ سالاروں کو بابک کے گرفتار کرنے پر مامور کیا ۔ روانگی کے وقت یہ ہدایت کر دی کہ ابن سباط کی رائے پر چلنا ، ذرہ بھر اس کی مخالفت نہ کرنا ۔ ابن سباط نے ان لوگوں کو قلعے کے ایک جانب چھپا دیا اور بابک کو شکار کھیلنے کے حیلے سے میدان کی طرف لے چلا ۔ ان دونوں سپہ سالاروں نے موقع پا کے غفلت کی حالت میں بابک کو گرفتار کر لیا ۔ افشین کے پاس لائے ، ان لوگوں کے ہمراہ معاویہ بن سہل بن سباط بھی تھا ۔ افشین نے بابک کو قید کر دیا اور اس حسن خدمت کے صلے میں معاویہ بن سہل کو ایک ہزار دراہم اور سہل کو ایک لاکھ دراہم اور پیٹی جواہر نگار مرحمت فرمائی ۔ بعد اس کے افشین کی طلبی پر عیسیٰ بن اسطقانوس والی بلقان نے عبداللہ برادر بابک کو جو ایک مدت سے اس کے پاس پناہ گزین تھا افشین کے پاس بھیج دیا ۔ افشین نے بابک کے ساتھ اس کو بھی قید کر دیا اور ایک اطلاعی عرضداشت خلیفہ معتصم کی خدمت میں روانہ کر دی ۔

خلیفہ معتصم نے افشین کو مع ان دونوں کے سامرہ میں طلب فرمایا ۔ یہ واقعہ ماہ شوال ۲۲۲ھ کا ہے ۔ برزند سے سامرہ تک ہر منزل پر خلیفہ معتصم کے حکم کے مطابق افشین کی کمال عزت و احترام سے استقبال مشایعت کی جاتی تھی اور ایک قاصد خاص خلیفہ کا مع خلعت فاخرہ اور ایک راس عربی گھوڑے کے افشین سے ملتا تھا ۔ افشین جس وقت سامرہ کے قریب پہنچا خلیفہ معتصم کا بیٹا واثق مع سرداران و اراکین سلطنت کے استقبال کی غرض سے باہر آیا اور کمال توقیر سے قصر مطھرہ میں ٹھہرایا ۔ افشین نے اس قصر میں بابک کو بھی اپنی حراست میں رکھا ۔ خلیفہ معتصم کے حکم سے افشین کے سر پر تاج رکھا گیا ، قیمتی خلعت پہنائی گئی ۔ بیس لاکھ دراہم بطور صلے کے مرحمت فرمائے اور دس لاکھ دراہم اس کے لشکریوں میں تقسیم کیے گئے ۔ یہ واقعہ ماہ صفر ۲۲۳ھ کا ہے ۔ اس زمانے میں جبکہ بابک قصر مطھرہ میں مقید تھا احمد بن ابی داؤد بابک کے دیکھنے کو آیا ۔ تھوڑی دیر تک بہ نظر غور دیکھتا رہا ، بعد ازاں چند باتیں کرکے واپس گیا ۔ بعدہ' ایک روز خلیفہ معتصم خود تشریف لایا ، سر سے پاؤں تک دیکھ کے لوٹ گیا ۔ اگلے دن خلیفہ معتصم دربار میں رونق افروز ہوا ۔ لوگوں کو حسب مراتب دربار عام سے قصر مطھرہ تک بٹھایا اور بابک کو ہاتھی

پر سوار کرا کے دربار میں حاضر کرنے کا حکم دیا - جس وقت بابک دربار شاہی میں پہنچا خلیفہ معتصم نے حکم دیا کہ ہاتھ پاؤں کاٹ کے اس کو ذبح کر ڈالو - اس حکم کی ان لوگوں نے کمال تیزی سے تعمیل کی جو اس کام پر پہلے سے مامور تھے - سر کو خراسان بھیج دیا ، لاشہ کو سامرہ میں صلیب پر چڑھایا اور اس کے بھائی عبداللہ کو بغداد میں اسحاق بن ابراہیم کے پاس روانہ کردیا تاکہ اس کے ساتھ بھی اسی قسم کا برتاؤ کیا جائے -

افشین اس مہم میں بزمانہ حصار بابک ، علاوہ علہ اور مصارف سفر و قیام کے جس روز میدان جنگ میں جاتا تھا دس ہزار درہم یومیہ حرچ کرتا تھا اور جس دن اپنے مورچے میں رہتا پانچ ہزار ---- بابک نے اس بیس برس کی مدت میں ایک لاکھ پچپن ہزار آدمیوں کو قتل کیا - سپہ سالاروں میں یحیی بن معاذ ، عیسیٰ بن محمد بن ابی خالد ، احمد بن جنید ، زریق بن علی بن صدقہ ، محمد بن حمید طوسی اور ابراہیم بن لیث کو ہزیمت دی - تین ہزار تین سو آدمی اس کے ہمراہ قید کیے گئے اور سات ہزار چھ سو نو مسلمان عورتیں اور ان کے بچے اس کے پنجہ عضب سے چھڑائے گئے - یہ لوگ ایک احاطے میں ٹھہرا دیے گئے - جو شخص ان لوگوں میں سے کسی کا والی و وارث آتا اس کی شہادت لی جاتی اور بعد ثبوت ولایت و وراثت حوالہ کر دیا جاتا - اس معرکے میں افشین نے بابک کے اہل و عیال سے سترہ مرد اور تیس عورتیں گرفتار کی تھیں -'

ابن خلدون کے اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شرر نے اس ناول کے تاریخی واقعات میں بہت کم تصرف کیا ہے اور بہت حد تک انھیں واقعات کو معمولی زمانی رد و بدل سے ترتیب دیا ہے- اس نقطہ نظر سے یہ ناول تاریخی واقعات کی صحت کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم ناول ہے- بابک کی شخصیت اور حالات زندگی نیز عقاید وغیرہ کے بارے میں شرر نے جو کچھ لکھا ہے اس کی بھی کتب تواریخ سے من و عن تصدیق ہوتی ہے - یہاں ہم سطور ذیل میں انسائیکلوپیڈیا اسلام کا ایک اقتباس درج کرتے ہیں جس سے شرر کے بیان کا بخوبی موازنہ کیا جا سکتا ہے - بذیل مادہ بابک انسائیکلوپیڈیا اسلام میں لکھا ہے کہ :

''بابک : (م ۸۳۸ء) المامون اور المعتصم (۸۱۳ تا ۸۴۲ء) کے دور خلافت میں آذربیجان کی نیم سیاسی نیم مذہبی خرمی تحریک [رک بہ خرمیہ] کا سرغنہ - یہ تحریک تقریباً ربع صدی تک جاری رہی اور دنیائے اسلام کے لیے ایک شدید خطرہ بنی رہی - مزدکیوں نے جو ایران میں ساسانیوں کے عہد سے زیر قہر و عتاب تھے ، اپنی اشتراکی تحریکات مختلف ناموں سے جاری رکھیں - دنیائے اسلام کے لیے خطرناک ہونے کے اعتبار سے خروج بابک کو ان تحریکوں میں اہم ترین درجہ دیا جا سکتا ہے - خرمیہ اپنی خفیہ سرگرمیوں میں مسلسل مصروف اور ہر وقت بغاوت کے لیے موقع کی تلاش میں رہتے تھے - انھیں یہ موقع اضطراب و فتنہ کے اس زمانے میں مل گیا جس کا آغاز امین اور مامون کی باہمی آویزشوں سے ہوا اور جس کا سلسلہ المامون کی فتح (۸۱۳ء) کے بعد تک بھی جاری رہا - اس لیے کہ حسن بن سہل والی عراق و ایران غربی کا عہد حکومت کمزور تھا ، پھر یہ ہوا کہ امام علی الرضا کو ولی عہد مقرر کر دیا گیا تھا - جب حاتم والی ارمینیہ نے بغاوت کی تو خرمیوں کو خروج کے لیے موقع ہاتھ آیا - عرب فوج کے سپہ سالار ہرثمہ اور ایرانی وزیر فضل بن سہل کی باہمی رقابت کا انجام یہ ہوا کہ ہرثمہ کو قتل کر دیا گیا - جب قتل کا حال ہرثمہ کے بیٹے حاتم کو معلوم ہوا تو وہ برذعہ سے کسال کی جانب روانہ ہوا (کسال برذعہ سے چالیس فرسخ پر ہے اور طفلس سے بیس فرسخ پر ، دیکھیے البلاذری، ص ۲۰۷) اور اس نے بغاوت کی تیاری مکمل کر لی - اس نے ارمنی سرداروں (بطارقہ) اور رئیسوں اور خرمیوں کے قائد بابک کو خط لکھے کہ وہ بھی بغاوت کر دیں - اگرچہ انھیں دنوں ہرثمہ کا انتقال ہوا تھا ، لیکن بابک نے، جو خوب جانتا تھا کہ اس صورت حال سے کیسے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ، ۲۰۱ھ/۸۱۶ء

۱- تاریخ ابن خلدون، ترجمہ حکیم احمد حسن، مطبوعہ یونانی دواخانہ پریس الہ آباد، ۱۹۲۲ء، ج ۷، ص ۱۳۰ تا ۱۳۲ -

میں بغاوت کر دی ، (دیکھیے الیعقوبی : تاریخ ، طبع ھوتسما ۲ : ۵۶۳) اور اس نے عساکر خلافت کو ۲۲۳ھ/ ۸۳۷ء تک مصروف رکھا ۔ المسعودی کی یہ روایت (مروج ، طبع باربیرڈی مینارڈ ، ۷ : ۱۳۰) کہ بابک کا اسلامی نام حسن تھا کسی اور ماخذ میں موجود نہیں ۔ الدینوری ، یہ لکھنے کے بعد کہ بابک کے نسب اور مذہب سے متعلق آرا کا اختلاف موجود ہے ، کہتا ہے کہ اس کا باپ مطہر بن فاطمہ بنت ابی مسلم تھا حرمیوں کی شاخ فاطمہ اس فاطمہ سے منسوب ہوئی ۔ (دیکھیے الاخبار الطوال ، قاہرہ ص ۳۹۷، اردو ترجمہ لاہور) اگرچہ اس کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ ابن الزیاب نے ایک شعرمیں (الطبری ، طبع ڈخویہ ، ۳ : ۱۲۳۰) بابک کے لیے ''شیطان حراسان'' کی ترکیب استعال کی ہے لیکن اسے فراموش نہ کرنا چاہیے کہ کچھ آگے چل کر (الطبری، ص ۱۳۰۳) یہی شعر مازیار پر چسپاں کیا گیا ہے ۔ ایک حکایت کی رو سے جسے الطبری (ص ۱۲۳۲) نے نقل کیا ہے بابک مطر نامی ایک صعلوک (کرائے کے سپاہی) کا ناجائز بچہ تھا ۔ المقدسی کا بیان کم و بیش وہی ہے جو ابن الندیم نے بحوالہ واقد بن عمروالتمیمی دیا ہے ۔ وہ بیان یہ ہے کہ بابک کا باپ اہل مدائن میں سے تھا اور پیشے کے لحاظ سے تیلی تھا ۔ اس نے آذربیجان کے رستاق میمذ کے ایک گاؤں بلال آباد میں سکونت احتیار کر لی تھی اور بابک کی ماں سے جو ایک نابینا عورت تھی ، عقد کر لیا تھا (الفہرست ، قاہرہ ، ص ۴۸۰ [لائپزگ ، ص ۳۴۳] ، کتاب البدء والتاریخ ، ہوارٹ کا فرانسیسی ترجمہ ۶ : ۱۱۲) اسی میں یہ بھی مذکور ہے کہ ایک دفعہ اسے نبطی گیت گاتے سنا گیا اور یہ کہ وہ اہل مدائن سے تھا ۔ اس بیان کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان حکایات سے ایسے رجحان کا سراغ ملتا ہے جس کا مقصد بابک کی اصل کو پست ظاہر کرنا ہو ---- ابن الندیم اور المقدسی کے بیانات کی رو سے، جو زیادہ قابل اعتماد نظر آتے ہیں ہم یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ بابک کی پیدائش اور تربیت آذربیجان میں ہوئی ۔ انھیں مآخذ کی رو سے بابک دس سال تک اپنی ماں کے پاس رہا جو لوگوں کے بچوں کو اجرت پر دودھ پلایا کرتی تھی ۔ اٹھارہ سال کی عمر تک وہ تبریز اور اس کے نواح میں مویشی چراتا اور سائیسی کرتا رہا ۔ پھر وہ اپنی ماں کے پاس واپس آ گیا ۔ ایک دن خرمی قائد ، جاویدان بن سہرک نے بذ جاتے ہوئے بلال آباد میں بابک کو دیکھا اور اس کی صلاحیتوں کو بھانپ کر اسے اس کی ماں سے لے لیا اور اپنے ساتھ لے گیا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھیں دنوں جاویدان اور ابو عمران میں، جو جبال بذ کے خرمیوں کی قیادت کے لیے جاویدان کا رقیب تھا، جنگ ہوئی اور جس میں ابو عمران، جاویدان کے ہاتھوں مارا گیا اور وہ خود بھی نیزے کے زخم سے تین دن بعد مر گیا ۔ جاویدان کی بیوی نے جو بابک کے دام الفت میں گرفتار تھی، بابک کے لیے خرمیوں کی اطاعت ایک افسانہ تراش کر حاصل کر لی، وہ یہ کہ اس کے خاوند نے کہا تھا : میری روح میرے بدن سے نکل کر بابک کے بدن میں داخل ہوگی اور اس کی روح میں شریک ہو جائے گی ۔ لہٰذا اس کی اطاعت کرنا لازمی ہے (الفہرست ، مطبوعہ قاہرہ، ص ۴۸۱ و مطبوعہ لائپزگ، ص ۳۴۱، عوفی : جوامع الحکایات ، در کتاب خانہ فاتح ، شمارہ ۴۳۰۱، ورق ۱۱۶ الف، المقدسی : کتاب مذکور) ۔

بابک کی ابتدائی زندگی افسانویت سے مستور ہے لیکن ۲۰۱ھ / ۸۱۶ء کے بعد سے اس کی تمام جزئیات معلوم ہیں ۔ بابک نے اس موقع سے جو اسے اس سال حاصل ہوا اور ان میلانات سے جو اس کے ۔قلدین میں ہمیشہ سے جاگزین تھے استفادہ کرکے علاقے کی مسلم آبادی پر حملہ کر دیا ، ان کی املاک لوٹیں اور ان کی کثیر تعداد کو تہ تیغ کیا حتکہ عورتوں اور بچوں کو بھی نہ چھوڑا ۔ جوں جوں اس کی شہرت، جس کا آغاز یوں ہوا تھا ، پھیلی خرمیوں کی تعداد بھی، جو جوق در جوق اس کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے تھے، بڑھتی چلی گئی ۔ ''کورہ'' بذ کے مسلمانوں نے مراغہ میں پناہ لی اور اس میں قلعہ بند ہو گئے ۔ (المقدسی : کتاب مذکور، ص ۱۱۴؛ البلاذری : فتوح البلدان ، طبع ڈخویہ ، ص ۳۳۰) جب بغاوت نے شدت اختیار کر لی تو المامون نے یحیی بن معاذ الذہلی کو ارمینیا کا والی مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ بغاوت کا قلع قمع کرے [۲۰۴ھ] ، جب یحیی کو کامیابی نہ ہوئی تو ۲۰۵ھ میں عیسی بن محمد کو اس کی جگہ ارمینیا اور آذربیجان کا والی مقرر کیا گیا لیکن بذ کے ایک درے میں آسے اور مقامی رؤسا کو جو اس کے ساتھ تھے شکست ہوئی اور اسے مجبوراً پسپا ہونا پڑا ۔ (الیعقوبی ، ۲ : ۵۶۴) ۔ ان ناکامیوں نے مسلمانوں کے خلاف بابک کے تمرد میں اضافہ کر دیا ۔ ۲۰۹ھ میں نئے سپہ سالار زریق بن علی الازدی کو کسی موثر کارروائی نہ کر سکنے کی بنا پر برخاست کر دیا

گیا اور اس کی جگہ محمد بن حمید الطوسی کو مقرر کیا گیا ۔ محمد نے پہلے زریق کی ، جو درخاستگی کی وجہ سے باغی ہو گیا تھا ، خبر لی اور پھر ۲۱۴ھ میں اپنا مستقر ہشتاد سر میں قائم کیا ، درہ ہائے بذ کا محاصرہ کیا اور کچھ اور فتوحات بھی حاصل کیں مگر اصحاب بابک کے اچانک حملے کی وجہ سے وہ اور اس کی فوج کے سرداروں کی ایک جماعت اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھی (الیعقوبی ، ۲ : ۵۶۵؛ سیاست نامہ ، ص ۲۰۰) ۔ بابک کی ان پے درپے فتوحات سے بعض مقامی ارمنی سرداروں کو ، جن میں سہل بن سنباط بھی تھا ، یہ حوصلہ ہوا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے کے لیے بابک کے ساتھ شریک ہو گئے (بلعمی ، ترجمہ زوٹن برگ ، ۴ : ۵۴۲) ۔ عبداللہ بن طاہر کو آذربیجان کا والی مقرر کیا گیا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد اسے خراسان بھیج دیا گیا ۔ اس کے جانشین مثلاً عجیف بن عنبسہ اور علی بن ہشام کمزور تھے ، جو ضرورت پڑنے پر بابک سے بھی جا ملتے تھے ۔ ان کے باہمی جھگڑوں نے ۲۱۷ھ / ۸۳۲ء تک صورت حال کو بد تر بنا دیا (الدینوری، ص ۳۷۹؛ الیعقوبی : ۲ : ۵۶۶ الطبری : ۳ : ۱۱۰۸) ۔ مزید برآں مصالحت کا عارضی وقفہ گزرنے کے بعد بوزنطیوں اور بنو عباس میں دوبارہ جنگ چھڑ گئی ، اس پر المامون بذات خود ایک لشکر جرار لے کر بوزنطیوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے گیا ۔ خرمیوں نے اس صورت حال کو اپنے موافق پایا ، وہ اٹھے اور اقلیم فارس اور اصفہان تک پھیل گئے (دیکھیے سیاست نامہ ، ص ۲۱۰) ۔

جب المامون کو اس مہم کے دوران موت نے آ لیا تو اس نے ۲۱۸ھ / ۸۳۳ء میں بمقام طرسوس بستر مرگ پر المعتصم کو خرمیہ کے متعلق اہم وصیتیں کیں ، (الطبری : ۳ : ۱۱۳۸) ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارباب حکومت کو خطرے کی شدت کا قوی احساس تھا ۔ نئے خلیفہ نے ۲۱۸ھ / ۸۳۳ء میں اسحاق بن ابراہیم کی زیر قیادت جو فوجیں بھیجیں انھوں نے خرمیوں کو شکست فاش دی ۔ اسحاق بغداد واپس آ گیا [۲۱۹ھ] اور اس کے جانشین ابو سعید محمد بن یوسف نے بابک کے ویران کردہ قلعوں کو دوبارہ تعمیر کیا اور بابک کے سالار معاویہ کو ، جو غارت گری کی ایک مہم سے واپس آ رہا تھا ، مغلوب کر لیا ۔ والی قلعہ شاہی و تبریز محمد بن البعیث نے جس کا باپ الرواد کے صعلوکوں میں سے تھا ، بابک کے ساتھ مصالحت کی ہوئی تھی ، اگرچہ وہ خود خرمی نہ تھا ، تاہم بعد میں اس نے بابک کے ایک سالار عصمت الکردی صاحب مرند [برزند؟] کو گرفتار کر لیا اور خلیفہ کا طرفدار بن گیا (الطبری : ص ۱۱۷۱ ؛ بلعمی، طبع زوٹن برگ ، ۴ : ۵۲۶؛ الیعقوبی : ۲ : ۵۶۹) ۔ خرمیوں کے خلاف گو چند ایسی مقامی کامیابیاں حاصل کر لی گئی تھیں تاہم اس بغاوت کی توسیع کا انسداد ابھی نہیں ہوا تھا ۔

۲۲۰ھ / ۸۳۵ء میں المعتصم نے افشین کو ، جو مصری بغاوتوں (الیعقوبی : موضع مذکور) کو فرو کرنے میں بڑا نام پیدا کر چکا تھا ، بابک کے استیصال پر مامور کیا ۔ افشین نے اپنا مستقر برزند میں قائم کیا اور اپنے آپ کو صرف فوجی تیاریوں اور حربی حرکات کی تنظیم ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ متعدد اور اقدامات بھی عمل میں لایا مثلاً اس نے خود بابک کے مخبروں کو گرفتار کر لیا ۔ دوسری دفعہ فوجیں بغاالکبیر کی زیر قیادت بھیجی گئیں (بغا خلیفہ کی بھرتی کی ہوئی ترکی فوج کے سپہ سالاروں میں سے تھا) ۔ بابک نے ان پر ناگہانی حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ اس حملے کی خبر ایک جاسوس نے پہلے ہی کر دی تھی ، ارشق (دیکھیے جغرافیائے مفصل ایران ، ۲ : ۲۳) میں بابک اور اس کی فوج کو شکست فاش ہوئی ۔ بابک موقان کے رستے سے بذ کی طرف بھاگ گیا ۔ (الطبری : ص ۱۱۷۴ ببعد) افشین، جو جوسادارسب تک بڑھ آیا تھا ۔ سال بھر خرمیوں سے لڑتا بھڑتا رہا ۔ آخر جاڑے کی شدت سے مجبور ہو کر برزند کی جانب پسپا ہو گیا (الیعقوبی : ص ۵۷۸) ۔

۲۲۱ھ میں افشین اور بغا نے بذ کی طرف پیش قدمی کی ۔ افشین نے درواز میں ڈیرے ڈالے اور بغا نے ہشتادسر میں ۔ بغا کی افواج کے نقصانات کی تلافی کے لیے ، افشین نے اپنے بھائی فضل بن کاؤس کو ، تھوڑی فوج کے ساتھ اس کے پاس بھیج دیا ۔ موسم سرما کی شدت سے بغا واپس ہو گیا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ افشین ابھی برسر پیکار ہے تو وہ بھی دوبارہ حرب و ضرب میں مصروف ہو گیا ۔ کچھ عرصے بعد جب اسے معلوم ہوا کہ بابک کے حملوں کی وجہ سے افشین واپس چلا گیا ہے تو اس نے بھی پسپائی کا ارادہ کر لیا ۔ واپسی کے دوران میں اس کی فوج کا ایک کثیر حصہ بابک کے ایک شب خون کی نذر ہو گیا اور وہ بمشکل

اپنی جان بچا کر بھاگا (بلعمی : ص ۵۲۸ ؛ الطبری: ۳ : ۱۱۸۶ تا ۱۱۹۳)۔

اس موسم سرما میں مشتادسر کے مقام پر ترک کے ہاتھوں (جو اسحاق بن ابراہیم کا مولیٰ تھا) بابک کے مشہور سالار طرخان کا قتل بابک کے لیے ایک صدمۂ عظیم تھا۔ ۲۲۲ھ میں افشین نے کمک حاصل کرکے ایک عام حملے کا اقدام کیا اور آذین شکست کھا کر بذ کی طرف بھاگا (بلعمی : ص ۵۳۱)۔ اس مرحلے پر مسلم مآخذ کے مطابق بابک نے اپنے اوپر سے دباؤ کم کرنے کے لیے، بوزنطی شہنشاہ توفیل بن میخائیل کو خط لکھا کہ چونکہ خلیفہ کے تمام عساکر اس کے خلاف جنگ میں مصروف ہیں، ارض خلافت پر حملے کا یہ موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے، چنانچہ شہنشاہ طرطوس تک بڑھ آیا۔ اس نے قلعہ زبطرہ پر قبضہ کر لیا . . .

انتظار کے طویل عرصے نے، جو درمیان میں آ پڑا عسکریوں میں ایسی غلط افواہوں کو ہوا دی کہ افشین خفیہ طور پر بابک کے ساتھ ساز باز کر چکا ہے۔ بالآخر جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو افواج نے بذ کی طرف پیش قدمی کی اور بابک کو راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ بابک نے پانچ افراد کے ساتھ دریائے ارس عبور کیا اور اقلیم اران میں پناہ لی۔ افشین بذ میں داخل ہوا اور وہ خونریز معرکے جو اس کے بعد ہوئے ان میں حرمیوں کی ایک کثیر تعداد تہ تیغ کر دی گئی اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ اسیران جنگ میں بابک کی کئی بیویاں اور اس کے بچے بھی تھے (الیعقوبی : ۲ : ۵۷۹ ؛ الطبری : ص ۱۲۲۳) اس کی ایک لڑکی معتصم کے حرم میں داخل کر دی گئی (سیاست نامہ، ص ۲۰۴)۔

افشین نے ولاۃ آذربیجان اور سرداران آرمینیا کو اطلاعات بھجوا دیں کہ بابک فرار ہو گیا ہے اور حکم دیا کہ اسے گرفتار کرکے اس کے سامنے حاضر کیا جائے۔ آخرکار بابک کو جب وہ اپنے بھائی عبداللہ کے ساتھ پہاڑوں میں مارا مارا پھر رہا تھا، ایک کسان نے شناخت کر لیا۔ اس امر کی اطلاع سہل بن سنباط والی اران کو دی گئی (المسعودی : مروج، ۷ : ۱۲۴)۔ سہل نے جو کسی وقت بابک کی اعانت کیا کرتا تھا، خلیفہ کی نگاہ میں اس شبہے سے بری ہونے کے لیے بابک کو ترغیب دی کہ وہ روم کی طرف نہ جائے اور اسے شکار کے بہانے لے جا کر افشین کے حوالے کر دیا۔ صفر ۲۲۳ھ میں افشین بابک کو ساتھ لے کر سامرا میں ایک فاتحانہ جلوس کے ساتھ داخل ہوا۔ اس زمانے کی رسم کے مطابق، عالم اسلامی کے اس مہیب دشمن کو تشہیر کے لیے ہاتھی پر سوار کیا گیا اور پیادہ اور سوار فوج کی قطاروں میں سے گزار کر اسے خلیفہ کے حضور میں لایا گیا (الطبری: ص ۱۲۳۰؛ الیعقوبی: ص ۵۷۹؛ المسعودی: ۷ : ۱۲۷)۔ معاصر شعرا نے اس یوم سعید کی تہنیت میں نظمیں پڑھیں اور اسلام کے راستے میں خدمات انجام دینے والے سالاروں کی مدح میں قصیدے لکھے۔ بابک کو اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر قتل کر دیا گیا اور اس کا سر خراسان بھیجا گیا اور مختلف شہروں میں دکھایا گیا اور اس کا دھڑ سامرا کے ایک دور دست محلے میں سولی پر لٹکایا گیا۔ اس کے ایک صدی بعد بھی، گو سامرا اجڑ چکا تھا، اس جگہ کو ابھی تک خشبۃ البابک (= بابک کی سولی، مروج، ۷ : ۱۲۸) ہی کہا جاتا تھا . . .

بابک کی سیرت اس کی بیس سالہ جنگ جوئی سے ظاہر ہوتی ہے، مضبوط ارادے، صلابت اور عزم صمیم کا مالک تھا۔ اس کی صلابت کے ثبوت کے لیے یہ بیان کر دینا چاہیے (المقدسی، متن، ۶ : ۱۱۸ [ترجمہ ص ۱۱۵]؛ سیاست نامہ، ص ۲۰۳؛ لعوفی: ص ۱۵۴) کہ اس کے قتل کے وقت جب اس کا ایک بازو کٹ چکا تھا اس نے وہ خون جو اس کے جسم سے رواں تھا اپنے چہرے پر مل لیا، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اس کا چہرہ، موت جس کی سرخی عنقریب اس سے چھیننے والی تھی، کے خوف سے زرد نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے بے حد دولت فراہم کرلی تھی۔ بذ میں شاہانہ شان و شوکت سے زندگی بسر کرتا تھا اور اپنے حرم کی بے شمار عورتوں کے ساتھ مے نوشی اور راگ رنگ کی محفلیں منعقد کرتا تھا۔ لفظ خرم، جسے مسلم مصنفین نے مسرت اور ہر قسم کی شہوانی بے راہ روی کے معنی دیے ہیں، اسی نوعیت کی زندگی کا ایک نشان بن گیا۔ بذ (مدینۃ البابک) سے اسے جو بے پناہ محبت تھی اس کا اظہار اس نے اپنے قتل کے دوران میں بھی کیا۔ اس کی آخری خواہش یہ تھی کہ وہ شب ماہتاب میں اس جگہ کا نظارہ کرے۔ وہ گفتگو جو اس نے سہل بن سنباط سے کی اور جس کا مفاد یہ تھا کہ اگر اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کے بھائی عبداللہ کو اس کا کام جاری رکھنے کے لیے کسی اور جگہ بھیج دیا جائے اور وہی اس کے مقلدین کا قائد ہو (بلعمی : ۴ : ۵۴۳)، اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس سے اس

کے ارادے عیاں ہوتے ہیں -

مسلم ماخذ کے مندرجات ، ایک تقابلی تجزیے کے بعد ، متبعین بابک کے عقائد پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہیں - بابک کے متبعین کی اپنی کوئی تصنیف اب تک نہیں ملی ، نہ بابک سے پہلے کے خرمیوں کے متعلق عموماً کوئی ایسا ماخذ موجود ہے اور نہ بابک کے متبعین کے عقائد کے متعلق کوئی خصوصی چیز ملتی ہے - پس فرقۂ بابکیہ کا مطالعہ حرمیہ کے حدود و دوائر کے اندر ہی رہ کر کرنا چاہیے . بابک کی اصل کے متعلق حکایات ظاہر کرتی ہیں کہ بابک عقیدہ تناسخ ارواح کے قائل تھے - المقدسی کا یہ بیان کہ اس کے پیرو اسے نبی مانتے تھے، ابن الندیم کے اس بیان کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہے کہ وہ دعوئ الوہیت کرتا تھا . حرمیہ کے جملہ طبقات میں اور مزدکیہ کے باہمی ارتباط کے پیش نظر ان اطلاعات کو درست ہی سمجھنا چاہیے کہ وہ عورتوں اور مردوں کی مخلوط مجالس شراب و طرب منعقد کرتے تھے اور ان کے ہاں نکاح باجماعت کا رواج تھا [1]

معتصم کے بارے میں شرر نے پہلے باب میں ذکر کیا ہے کہ وہ معتزلہ کا قائل تھا اور اس نے ترکی غلاموں کی ایک بڑی کثیر تعداد جمع کر رکھی تھی - یہ امور جو معتصم کے بارے میں بیان ہوئے ہیں تاریخی اعتبار سے صحیح ہیں اور طبری، ابن اثیر اور ابن خلدون سے ان کی تصدیق ہوتی ہے - شرر نے اسی باب کا عنوان جس بنا پر رکھا ہے اس تاریخی پس منظر کا بھی ثبوت ملتا ہے اگرچہ شرر نے تھوڑا سا تصرف کیا ہے - "وامعتصما" پکارنے کا واقعہ رومیوں کے حملے سے متعلق ہے، ابن اثیر کے حوالے سے شاہ معین الدین احمد ندوی نے اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے :

"۲۲۳ھ میں جب بابک کو اپنی شکست کے آثار نظر آئے اور اس نے دیکھا کہ جب تک اسلامی فوجوں کا بادل نہ چھٹے گا ، اس وقت تک اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں تو اس نے توفیل بن میخائیل شہنشاہ روم کو لکھا کہ معتصم نے اپنی تمام قوت، حتیٰ کے اپنا درزی اور باورچی تک میرے مقابلے میں بھیج دیا ہے اور دارالخلافہ بالکل خالی ہے - تم کو حملے کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا - سلطنت روم اور خلافت بغداد دونوں پرانے حریف تھے اس لیے توفیل نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک لاکھ یا پورے دو لاکھ رومی لشکر اس کے علاوہ حرمیوں کی جماعت کو لے کر زبطرہ پر چڑھ آیا اور یہاں کے مسلمان مردوں کو قتل کر کے ان کی عورتیں اور بچے گرفتار کر لیے - ملطیہ وغیرہ کے قلعوں کو خوب لوٹا ، بہت سی مسلمان عورتیں گرفتار کیں اور مردوں کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر کر ناک اور کان کاٹ ڈالے - گرفتار شدہ عورتوں میں ایک ہاشمی عورت بھی تھی اس نے "وا معتصماہ" (اے معتصم میری مدد کر) کی فریاد کی [بحوالہ ابن اثیر: ٦ : ١٦٢] معتصم کو جس وقت توفیل کے ان وحشیانہ مظالم، مسلمانوں کی دردناک حالت اور اس عورت کی فریاد کی خبریں پہنچیں ، اس وقت وہ دربار میں تخت پر بیٹھا تھا ، وہیں سے بیٹھے بیٹھے بولا ، لبیک لبیک (میں پہنچا ، میں پہنچا اور فوراً تخت سے اتر کر کوچ کی منادی کرا دی -"[2]

ابو مسلم خراسانی کے بارے میں شرر نے ناول کے تاریخی پس منظر کے طور پر جو کچھ لکھا ہے، اس کی تصدیق کتب تواریخ سے ہوتی ہے[3]- سنباد اور اس کی بغاوت کے بارے میں جو بیان ہوا ہے اس کی تصدیق بھی کتب تواریخ سے ہوتی ہے اور فرقہ راوندیہ کی شورشوں کی تفصیل بھی ابن الاثیر کے یہاں ملتی ہے[4]- اسی پس منظر کے طور پر عہد عباسیہ کی دیگر شورشوں کا ذکر کرتے ہوئے شرر نے استاذ سیس کے دعوئ نبوت کا ذکر کیا ہے - شرر کے ان بیانات کی تصدیق ابن اثیر سے ہوتی ہے[5]-

---

١- انسائیکلوپیڈیا اسلام (اردو)، بذیل مادہ بابک، ج ۳، ص ۸۲۰ تا ۸۲۷ -

۲- شاہ معین الدین احمد ندوی : تاریخ اسلام ، ۳ : ۱۸۵ -

۳- مسعودی: مروج الذہب، ج ٦، ص ۱۸۱، ۱۸۲، سیوطی: تاریخ الخلفا (ترجمہ) ص ۳۲۷ -

٤- ابن اثیر: ج ٥، ص ۱۸۰ - ٥- ابن اثیر: ج ٥، ص ۲۱۹ ؛ سیوطی: (ترجمہ) ص ۳۲۸، ۳۲۹ -

ان شورشوں کے ضمن میں شرر نے مقنع کے دعوئ الوہیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس خراسانی ملحد کے سلسلے میں دیے گئے بیانات بھی تاریخی اعتبار سے درست ہیں۔[1]

طبری کے یہاں بھی بابک خرمی کی تحریک اور اس کی جنگوں کے بارے میں سیر حاصل بحث موجود ہے۔ ۲۱۹ھ کے واقعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ

اس سال ۱۱ جمادی الاولیٰ اتوار کے دن اسحاق بن ابراہیم علاقہ جبال سے خرمی اور دوسرے امان حاصل کردہ قیدیوں کے ساتھ بغداد آیا، بیان کیا گیا ہے کہ عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر اسحاق بن ابراہیم نے خرمیوں کی اس تمام لڑائیوں میں ان کے تقریباً ایک لاکھ آدمی قتل کیے تھے۔[2]

۲۲۰ھ کے واقعات کے ضمن میں طبری نے خرمیوں سے متعلق بہت زیادہ تفصیلات دی ہیں اور ان میں، تاریخ ابن خلدون میں اور اس ناول میں بیان کردہ واقعات میں کوئی اختلاف نظر نہیں آتا۔ طول طویل اقتباسات سے گریز کرتے ہوئے ہم یہاں صرف عنوانات نقل کرتے ہیں، محمد بن المعیث کی خرمیوں کی مہمان نوازی، عصمہ کی گرفتاری، عصمہ کے ساتھیوں کا قتل، افشین کا برزند میں قیام، افشین کا قافلوں کے لیے حسن انتظام، بابک کے جاسوسوں سے ابو سعید کی پیشکش، معرکہ ارسق، بابک کا بغا الکبیر پر حملہ کرنے کا منصوبہ، بغا الکبیر کو اردبیل میں قیام کا حکم، افشین کی بغا الکبیر کو ہدایت، بغا الکبیر کی روانگی کی بابک کو اطلاع، بغا الکبیر کی مراجعت اردبیل، بابک کا قلعہ حصن النہر پر حملہ، بابک اور اس کی جماعت کی تبدیلی ہیئت، علویہ اور اس کی جماعت کے قتل کی ہیثم کو اطلاع، ہیثم کی مراجعت ارشق، بابک کا محاصرہ ارشق، افشین کا بابک خرمی پر حملہ، بابک خرمی کی شکست و فرار، بابک کا قافلہ خنش پر حملہ، افشین کے پڑاؤ میں قحط، افشین کا حاکم مراغہ کو سامان خوراک بھیجنے کا حکم، افشین کی حاکم شیروان سے امداد طلبی، معتصم کو حربیہ سے اندیشہ،.... وغیرہ اور ۲۲۱ھ کے واقعات کے عنوانات یہ ہیں: ہشتاد سر میں بابک اور بغا الکبیر کا مقابلہ، افشین کی فوج میں تنخواہ کی تقسیم، افشین اور ابو سعید کی دروز میں ملاقات، بغا پر خرمیوں کا حملہ، بغا کی شکست کی افشین کو اطلاع، بغا کو افشین کی کمک، افشین کی بغا کو ہدایت، افشین کا بابک خرمی پر حملہ، بغا کا پہاڑ پر قیام، برف باری سے بغا کی پریشانی، بغا کو بابک کے شبخون کی اطلاع، غلام کی اطلاع کی تصدیق، بغا کی مراجعت، بغا کی فوج پر خوف کا غلبہ، بغا کا بابک کے حملہ کا اندیشہ، فضل بن کاؤس کی رائے، بغا کی فوج کی پست ہمتی، بغا کی فوج کی خستہ حالی، بغا کے پڑاؤ پر خرمیوں کا حملہ، بغا کی شکست و فرار، بغا کو مراغہ جانے کا حکم، بابک کے سردار طرخان کا قتل وغیرہ۔ سنہ ۲۲۲ھ کے واقعات کے عنوانات یہ ہیں: ایتاخ جعفر بن دینار کی کمک، ایتاخ کی مراجعت، ابو سعید کو پیش قدمی کا حکم، خرمی سردار آذین کا زعم، آذین کے خاندان کی گرفتاری، افشین کی کوہبانی جماعت کو ہدایت، کوہبانی جماعت پر آذین کی پیادہ فوج کا حملہ، کوہبانوں کی افشین سے امداد طلبی، افشین کی محتاط حکمت عملی، معتصم کی ہدایت پر عمل، افشین کی رودالروز کی طرف پیش قدمی، محفوظ مقامات کا انتخاب، خندق کی کھدائی، افشین کی پیدل سپاہ کو ہدایت، بابک کی افشین کو پھلوں کی پیشکش، خرمیوں کی مبارزت، خرمی دستہ پر فوجی حملہ، افشین کی فوج کی ترتیب کا

۱۔ ابو الفدا: ج ۲، ص ۹ ؛ ابن خلدون: ج ۳، ص ۲۰۷ ؛ ابن اثیر: ج ۶، ص ۱۳، ۱۷۔
۲۔ طبری: (ترجمہ سید محمد ابراہیم) ج ۸، ص ۳۱۸، ۳۱۹۔

انتظام، نقارہ کی آواز پر فوج کی نقل و حرکت، افشین و بابک کی احتیاطی تدابیر، افشین کی امرائے عساکر کو ہدایت، بابک کو افشین کی نقل و حرکت کا علم، افشین کا دستور عمل، خرمیوں کا جعفر کے دستے پر حملہ، افشین کی جعفر سے برہمی، جعفر کا افشین کو پیغام، جعفر کو مراجعت کا حکم، جعفر کی افشین سے شکایت، جعفر اور فضل بن کاؤس میں تلخ کلامی، رضاکاروں کی واپسی کا حکم، ابو سعید کی افشین کی حکمت عملی کی تعریف، افشین کی مقام مصاف سے مراجعت، رضاکاروں کی افشین سے شکایت، رضاکاروں کی افشین کے طرز عمل پر تنقید، رضاکاروں کے افسروں کی طلبی، ایک مجاہد کا جذبہ شہادت، افشین کا حملہ کرنے کا فیصلہ، افشین کی بذ پر فوج کشی، افشین کا ابو دلف کو پیش قدمی کا حکم، رضاکاروں کا بذ پر حملہ، رضاکاروں کے لیے ستو اور پانی کی فراہمی، خرمیوں کا جعفر پر حملہ، خرمیوں کی شدید مدافعت، پیدل فوج کی کمک، افشین کا فوج کو مراجعت کا حکم، پیدل تیراندازوں کو پہاڑ پر چڑھائی کا حکم، بشیر ترکی کو زیریں حصہ پر قبضہ کرنے کی ہدایت، افشین کی پیش قدمی، آذین والے ٹیلے کا محاصرہ۔ خرمیوں کا سیر و فراغہ پر حملہ، جعفر الخیاط کا حملہ، ابو سعید کے فوجی دستہ کی یورش، بابک کی امان طلبی، بابک کو افشین کی امان، افشین کا بذ پر قبضہ، بذ کی تاراجی، افشین کی بذ سے مراجعت، افشین کا قصروں کے انہدام کا حکم، بابک کا فرار، معتصم کا بابک کے لیے امان نامہ، افشین کے قاصدوں کی روانگی، افشین کے قاصدوں کی بابک سے ملاقات، افشین کے ایک قاصد کا قتل، بابک کا اپنے بیٹے کو پیغام، بابک کی روپوشی، بابک کی والدہ اور بیوی کی گرفتاری، بابک کی آرمینیا کے پہاڑوں میں روپوشی، بابک کے غلام کے خلاف شکایت، سہل بن سنباط اور بابک کی ملاقات، سہل بن سنباط کی بابک سے درخواست، ابن سنباط کی بابک کو قلعہ میں قیام کی دعوت، ابن سنباط کی بابک کے متعلق افشین کو اطلاع، بابک کی سیاحت، ابو سعید اور بوزبارہ کو افشین کی ہدایت، بابک کی گرفتاری کا منصوبہ، بابک کی گرفتاری، بابک کی افشین سے ملاقات، بابک کی اسیری، بابک کے بھائی عبداللہ کی گرفتاری، بابک کی آخری خواہش، امیر حج محمد بن داؤد کی بابک سے ملاقات، افشین کی روانگی سامرا، معتصم کا خبر رسانی کا نظام اور پھر سنہ ۲۲۳ھ کے واقعات میں افشین کا سامرا میں استقبال، بابک کی تشہیر، بابک کا قتل، عبداللہ کی روانگی مدینۃ السلام، عبداللہ کا قتل وغیرہ۔[1]

ان عنوانات سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ بابک سے متعلق مجالس صفحات پر پھیلا ہوا طبری کا بیان کس قدر مفصل ہے اور شرر کے بیانات کہیں بھی ان سے متصادم نہیں۔ اس اعتبار سے شرر کا یہ ناول تاریخ کے اعتبار سے سب ناولوں سے زیادہ مستند ہے۔

۱۹- لعبت چین

یہ ناول ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں شرر نے بنی امیہ کے ابتدائی دور کے واقعات اور ماوراالنہر مسلمانوں کی پیش قدمی کے حالات بیان کیے ہیں۔ ناول میں بیان کردہ واقعات کا خلاصہ یہ ہے:

۶۴ھ کے موسم بہار میں ایک عرب نوجوان موسیٰ بن عبداللہ بن خازم اپنے رفیقوں کے ساتھ سمرقند میں قیام پذیر تھا۔ وہ اپنے والد کے حکم سے توحید کی تبلیغ کے لیے نکلا تھا لیکن

۱- طبری: ج ۸، ص ۱۹م تا ۶۲م۔

جب جیحوں سے ادھر آیا تو سمرقند کے فرماں روا طرخون کے سوا کسی نے اسے اپنی حمایت میں نہ لیا۔ ایک دن اسے قصر طرخون کی سڑک پر ایک کوشک نظر آئی جو اسی روز تیار ہوئی تھی اور طرخون نے وہاں کسی کی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ اس کوشک میں ایک خوب صورت دوشیزہ بیٹھی تھی، مقامی لوگوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دستور کے مطابق نوروز کو سپہ سالار کی طرف سے یہ حجلۂ عروسی تیار کروا کر شہر کی خوب صورت ترین لڑکی لباس عروسی میں بٹھا دی جاتی ہے، دن کو اگر کوئی اس کا دعوے دار پیدا ہو جائے تو پچھلے سال کے شجاع کو خبر کی جاتی، وہ آ کر اس سے مقابلہ کرتا ہے اور جو جیت جائے وہ حجلۂ عروسی پر بھی متصرف ہوتا ہے اور ایک سال کے لیے سپہ سالار اور وزیراعظم بھی مقرر ہو جاتا ہے۔ اگر دن کو کوئی دعوے دار نہ پیدا ہو تو سپہ سالار وہاں شب بسری کرکے صبح اس حسینہ کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

موسیٰ یہ سنتے ہی بے تکلف کوشک کے اندر چلا گیا، اس کے اندر داخل ہوتے ہی ہر طرف ہنگامہ بپا ہو گیا، وزیراعظم و سپہ سالار نوشگین خبر ہوتے ہی ہتھیاروں سے لیس گھوڑا دوڑاتا آ پہنچا اور کوشک کے دروازے پر پہنچ کر موسیٰ کو مقابلے کے لیے للکارا۔ شہر کے باہر جہاں نوشگین اور موسیٰ کا مقابلہ ہوا، انبوہ خلائق موجود تھا۔ مقابلے میں نوشگین مارا گیا اور موسیٰ اس حجلۂ عروسی میں لوٹ آیا۔ تورانی اپنے اس نامور سردار کے مارے جانے اور ایک عرب کے اس حسینہ قتلق خانم کو جست لینے پر مغموم تھے۔

نوشگین کے مارے جانے کے پندرھویں دن طرخون اپنے ولی عہد بیٹے ارسلان کی شادی کے انتظامات میں مصروف تھا جو کاسغر کے فرماں روا بیقرا اولتان کی شاہزادی نوشین سے طے پائی تھی۔ رسم کے مطابق شہزادی نے مسلح ہو کر سسرال کے شہر پہنچنا تھا جہاں اس کے منگیتر اور دیگر دعوے داروں نے اسے پکڑ لینے کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس رسم میں شہزادیاں عموماً اوروں سے خود کو بچاتی اور اپنے منگیتر کو موقع دیا کرتی تھیں کہ وہ پکڑنے میں کامیاب ہو جائے۔ شہزادی نوشین انتہائی حسین تھی اور اس کے سنکڑوں عاشق تھے، اس لیے طرخون کو دھڑکا لگا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے امرا کو ہدایت کی کہ اس موقع پر ارسلان کے کسی اصلی رقیب کو میدان میں نہ جانے دیا جائے۔ مقابلے میں حصہ لینے والے سب قابل اعتماد لوگ اور دکھاوے کے رقیب ہوں اور اگر کوئی بدنیتی پر آمادہ ہو تو سب مل کر اس کا خاتمہ کر دیں۔ طرخون نے یہ بھی تجویز کیا کہ رقیبوں میں موسیٰ کو بھی شامل کیا جائے اور اگر وہ بدنیتی پر آمادہ ہو تو سب اسے قتل کرکے قتلق خانم اور نوشگین کا بدلہ لے لیں۔

لعبت چین شہزادی نوشین چار سو میل کا فاصلہ طے کرکے اپنے عزیزوں اور والدین کے ساتھ سمرقند پہنچی۔ چند دن کی ضیافتوں کے بعد شادی کی رسم کا دن آیا۔ طرخون نے موسیٰ کو بھی حصہ لینے کے لیے آمادہ کر لیا۔ موسیٰ لباس جنگ پہن کر "جوالہ" پر سوار میدان میں پہنچا تو نوشین کو سبز ترکی گھوڑے پر سوار دیکھا۔ مقابلہ شروع ہوا۔ شہزادی کا گھوڑا بہت سبک رفتار تھا۔ باقی گھوڑے اس کے پیچھے میدان میں چکر کھا رہے تھے۔ موسیٰ بھی ان میں شامل کارروائیاں دیکھ رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے موسیٰ پر وار کیا۔ موسیٰ کو اس بلاوجہ وار پر سخت طیش آیا اور اس نے پلٹتے ہی ایک ہی وار میں حملہ آور کو شانے سے جگر تک کاٹ دیا اور اس سے پہلے کہ دیگر سب اس پر جھپٹیں "جوالہ" اسے لے کر ایک سمت کو ہوا ہو گیا، کچھ دور جا کر موسیٰ پلٹا اور شہزادی کے سامنے آ گیا۔ نوشین نے راستہ کاٹا لیکن کوئی

ترکی گھوڑا جوالہ سے کب بازی لے جا سکتا تھا ۔ پل بھر میں اس نے شہزادی کو اس کے گھوڑے سے اچک کر اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا ۔ اب اس نے بڑھتے ہوئے حریفوں کو للکارا کہ رسم کے مطابق وہ بازی جیت گیا لیکن ان کے تیوروں کو سمجھ کر اس نے گھوڑے کو پھر ایڑ دی اور شہزادی کو اپنے ساتھیوں کے حوالے کر کے بادشاہوں کے پاس پہنچا ۔ طرخون دل میں بہت برہم تھا لیکن موسیٰ کی طرف بڑھنے والوں کو اس نے اشارے سے روکا اور کہا نکاح کا تصفیہ ہو چکا ہے ۔ اس نے ارسلان کو بھی مصلحتاً خاموش رہنے کی تاکید کی۔

اسی شام موسیٰ اپنے خیمے میں خوف زدہ نوشین کی خبرگیری کر رہا تھا کہ اسے طرخون کا خط ملا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ صبح سے پہلے اس کی قلم رو سے نکل جائے ۔ موسیٰ نے کچھ سوچ کر فوراً کوچ کا حکم دے دیا اور چار سو افراد کا یہ قافلہ آدھی رات سے پہلے ہی چل کھڑا ہوا ۔ تین دن تک موسیٰ جنوب کی طرف سفر کرتا رہا اور چوتھے دن قسلہ نامی شہر میں جا پہنچا ۔ وہاں کے حاکم نے قیام کی اجازت نہ دی تو دو دن مزید سفر کر کے شہر سبز پہنچا لیکن وہاں بھی پناہ کی جگہ نہ دیکھ کر دو دن مزید سفر کیا اور کس جا پہنچا ۔ حاکم ان کے وہاں قیام پر رضامند نہ ہوا تو موسیٰ نے مقابلے کا فیصلہ کیا اور تھوڑی دیر میں لڑ بھڑ کر شہر پر قبضہ کر لیا ۔ فرماں روا قلعے میں محصور ہو گیا اور طرخون سے مدد مانگی ۔ طرخون نے فوراً ارسلان کو دو ہزار تورانیوں کے ساتھ روانہ کیا ۔ ادھر موسیٰ کے پاس کچھ اور مسلمان بھی آ گئے اور کل تعداد سات سو ہو گئی ۔ ارسلان نے پہنچ کر شدید مقابلہ کیا، غروب آفتاب تک کئی مسلمان شہید ہوئے ۔ کوئی چارہ نہ دیکھ کر موسیٰ نے رات کو سب خون مارا اور تورانیوں کو مارتا کاٹتا ہمراہیوں سمیت ان کے نرغے سے نکل گیا ۔ اس رات موسیٰ نے بیس کوس سفر کیا ۔

دوسری دوپہر کو موسیٰ اور اس کے ہمراہیوں نے ایک ندی کے کنارے ایک گھاٹی میں پڑاؤ کیا ۔ نووارد عربوں میں سے ثابت بن قحطبہ لیثی نے بلخ چلنے کی تجویز پیش کی تو موسیٰ نے اسے اپنی داستان سنائی اور بتایا کہ اس کا والد عبداللہ بن خازم والی خراسان ہے جو سخت جھگڑوں میں الجھا ہوا ہے ۔ ۶۴ھ میں خلیفہ یزید بن معاویہ کے انتقال پر معاویہ بن یزید تخت خلافت پر بیٹھا جو تین ماہ میں مر گیا ۔ یزید کے آخری دنوں میں خراسان کا والی مسلم بن زیاد تھا ۔ اس کے کہنے پر لوگوں نے مہلب بن ابی صفرہ کو حاکم بنا لیا لیکن بعد میں جب نزاری سرداران عرب نے اس کی مخالفت کی تو مسلم نے عبداللہ بن خازم کو حکومت خراسان کی سند لکھ دی ۔ مہلب مرو میں اپنا تمیمی نائب مقرر کر کے عراق چلا گیا ۔ عبداللہ نے اس تمیمی الاصل نائب کو شکست دی ۔ یمانی عربوں میں بھی شورش پھیلنے لگی ۔ ہرات کے قریب دریائے سبزوار کے کنارے مدت تک لڑائیاں ہوئیں جن میں آٹھ ہزار یمانی مارے گئے اور ہرات پر عبداللہ کا قبضہ ہو گیا ۔ تورانیوں نے عبداللہ کو جھگڑوں میں الجھا دیکھ کر قلم رو خراسان کے سرحدی قلعے پر حملہ کر دیا ۔ عبداللہ نے زہیر بن حیان کو کمک پر بھیجا اس نے نہ صرف ترکوں کو مار بھگایا بلکہ رات بھر ان کا تعاقب بھی کیا ۔ تمیمیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے جو سختی کی گئی اس کے نتیجے میں انھوں نے عبداللہ کے، ایک تمیمی بیوی کے بطن سے، بیٹے محمد کو قتل کر دیا ۔ عبداللہ نے انتقام لیا جس کے نتیجے میں پورے خراسان کے تمیمی بگڑ گئے، اور مدت تک لڑائیاں جاری رہیں آخر تمیمیوں کو شکست ہوئی ۔

اب نیشاپور میں تمیمیوں کا ایک گروہ باقی رہ گیا تھا ۔ خلافت کا مسئلہ بھی متنازعہ تھا ۔

شام میں بنی امیہ کا زور تھا۔ ۶۵ھ میں مروان کے مرنے پر اس کے بیٹے عبدالملک نے زیادہ قوت حاصل کر لی تھی ۔ عراق میں انتقام خون حسینؓ کا ہنگامہ بپا تھا ۔ مکہ معظمہ میں عبداللہ بن زبیر کی خلافت کی بیعت لی جا رہی تھی ۔ عبداللہ بن خازم نے بھی اس مرحلے پر ان کا ساتھ دیا ۔ نیز دگرگوں حالات کے پیش نظر اس نے موسیٰ کو ماوراالنہر کے علاقے میں بھیج دیا کہ وہاں کی سرزمین کفار میں اپنی جگہ آپ پیدا کرے ۔

موسیٰ نے جب ثابت کو یہ حالات سنائے تو ثابت نے مشورہ دیا کہ شہر ترمذ اپنے محل وقوع اور آب و ہوا کے اعتبار سے موزوں جگہ ہے ۔ وہاں چل کر قدم جمانے چاہییں ۔ دوسری صبح سب ثابت کی راہنمائی میں ترمذ کی طرف روانہ ہوئے ۔ تیسرے دن ترمذ کے پہلو پر جا پڑاؤ کیا ۔ حاکم شہر سے بہت مختصر عرصے کے لیے شہر سے باہر قیام کی اجازت ملی ۔ موسیٰ نے نہایت قرینے سے لشکرگاہ مرتب کر لی ۔ کچھ دنوں بعد حاکم ترمذ سے راہ و رسم پیدا ہوگئی ۔ وہ اکثر موسیٰ کی لشکرگاہ میں آتا ۔ ایک دن اس نے قلعہ ترمذ میں موسیٰ اور اس کے ایک سو ساتھیوں کی دعوت کی ۔ آدھی رات تک جشن رہا ۔ آدھی رات کو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں نے قلعے پر قبضہ کر کے حاکم کو نکال باہر کیا ۔ موسیٰ نے ترمذ پر قبضہ کر لینے کے بعد قلعے کو مضبوط کیا ، خندقیں گہری اور چوڑی کرائیں اور ان میں ہر وقت دریائے جیحوں کا پانی بھرا رہنے لگا ۔

اس دوران ارسلان کئی بار بھیس بدل کر ترمذ تک آیا لیکن اسے ایک بار بھی قلعے تک پہنچنے کا موقع نہ ملا ۔ ایک روز موسیٰ، شاہزادی نوشین اور قتلق خانم کے ساتھ شکار کو گیا ہوا تھا اور جب وہ ایک زخمی ہرن کا پیچھا کر رہا تھا ارسلان فقیروں کے بھیس میں نوشین اور قتلق خانم سے ملا اور چاہا کہ وہ اس کے ساتھ چلی جائیں، قتلق خانم آمادہ تھی لیکن نوشین نے ہر اعتبار سے موسیٰ کو ارسلان پر ترجیح دی ۔ اتنے میں موسیٰ شکار لیے لوٹا ۔ نوشین نے اس فقیر کی اصلیت بتائی ۔ موسیٰ نے نوشین کی خواہش کے مطابق ہتھیار کھول کر صرف تلوار سے ارسلان کا مقابلہ کیا ۔ اس نے ارسلان کے سینکڑوں وار روکے لیکن خود وار نہ کیا آخر ارسلان پسینے پسینے ہوگیا اور اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی ۔ پھر کشتی میں بھی موسیٰ نے اسے اٹھا کر پٹک دیا اور آخر نوشین کی خواہش پر اسے زندہ چلے جانے دیا ۔

موسیٰ کو ترمذ میں اپنے تینوں بھائیوں نوح ، سلیمان اور خازم، بھتیجے نضر بن سلیمان اور اپنے والد کے جان نثار دوست ہلال ضبی کی کئی ہمراہیوں کے ساتھ آنے کی اطلاع ہوئی ۔ ان سے اسے اپنے والد کی شہادت کی خبر ملی ۔ ہلال نے موسیٰ کو بتایا کہ جب عبداللہ بن زبیر کا زور ٹوٹنے لگا اور عبدالملک کا تسلط ہر جگہ ہوگیا تو موسیٰ کے والد نے عبدالملک کی اطاعت تسلیم نہ کی چنانچہ نیشا پور کا تمیمی حاکم بحر بن ورقا لشکر لے کر مقابلے کو آیا ۔ جنگ میں عبداللہ بن خازم وکیع بن عمرو افریقی کے ہاتھوں مارے گئے ۔ اس سے چھ ماہ قبل عبداللہ بن زبیر مکہ معظمہ میں محصور ہو کر شہید ہو چکے تھے اور ان کا سر عبدالملک نے عبداللہ بن خازم کے پاس بھی بھیجا تھا جسے دیکھ کر وہ روئے تھے اور کہا تھا اب دنیا رہنے کی جگہ نہیں رہی ۔

موسیٰ اب روز بروز اپنی قوت بڑھانے میں مصروف رہا اور ہر طرح کے سامان جنگ فراہم کرتا رہا ۔ اس کے والد کے جان نثار رفقا بھی خراسان چھوڑ کر اس کے پاس آتے گئے ۔ ۷۴ھ میں جب بکیر کی بجائے امیہ بن عبداللہ بن خالد قریشی والی خراسان ہوئے تو ارسلان باپ کا سفیر بن کے گیا اور فرمان روایان توران و ترکستان کی طرف سے وفاداری کا یقین دلایا ۔ اس نے امیہ

کو موسیٰ کے خلاف بھڑکایا اور امیہ نے بنی خزاعہ کے ایک نامور سردار کو بھاری لشکر کے ساتھ ترمذ پر حملے کے لیے بھیجا۔ اس لشکر کے آتے ہی اہل ترمذ نے دیگر فرماں روایان توران کو بھی بلا لیا تاکہ موسیٰ کی بیخ کنی کے بعد عرب وہاں مستقل قیام اختیار نہ کر سکیں۔ طرخون کی فوجیں بھی آ پہنچیں۔ موسیٰ ہر روز قلعے سے نکل کر صبح سے دوپہر تک خزاعی لشکر سے اور پھر ترکوں سے مقابلہ کرتا۔ تین ماہ جنگ جاری رہی، حملہ آوروں کا کافی نقصان ہوا۔ موسیٰ نے بالآخر سرداروں کے مشورے سے ترکوں پر شب خون مارنے کا پروگرام بنایا۔ شب خون بہت کامیاب رہا اور بے شمار ترک قتل ہوئے۔ عربوں کے صرف سولہ آدمی کام آئے۔ تورانی صبح بھاگ نکلے اور ان کا سارا مال اسباب موسیٰ کے ہاتھ لگا۔ دو تین سو ترک جو گرفتار ہوئے ان میں خود ارسلان بھی تھا۔ عمرو بن خالد نے موسیٰ کو عربوں کے مقابلے میں اطاعت قبول کر لینے کا مشورہ دیا تو موسیٰ نے اسے زد و کوب کرکے قلعے سے نکال دیا۔ عمرو نے خزاعی لشکر میں جا کر امان طلب کی اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ خزاعی نے اطمینان کر لینے کے بعد عمرو کو قلعے کا نقشہ تیار کر دینے پر آمادہ کر لیا۔ دو چار روز میں اس کے خزاعی سے تعلقات بڑھ گئے جن سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک شب خزاعی کو اسی کی تلوار سے اس کے خیمے میں قتل کر دیا اور اس کے گھوڑے پر سوار ہوکر قلعہ ترمذ میں جا پہنچا۔ عربوں کو بعد میں معلوم ہوا کہ عمرو کا زد و کوب کرکے نکالا جانا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ عمرو کے پہنچتے ہی موسیٰ نے قلعے سے نکل کر عربوں پر حملہ کر دیا۔ ہزاروں قتل ہوئے، ہزاروں نے امان مانگی اور بہت کم بچ کر امیہ کے پاس خراسان بھیج سکے۔ اس کے بعد موسیٰ نے جشن فتح منایا اور اس موقع پر نوشین کی سفارش پر ارسلان کو رہا کر دیا۔

امیہ نے ۷۶ھ کی اس شکست کو عبدالملک سے چھپانے کی کوشش کی لیکن بکیر نے اپنے نامہ بروں کے ذریعے یہ خبر دربار خلافت میں پہنچا دی جہاں سے عتاب نامہ آیا اور اسی انتقام میں امیہ نے ۷۷ھ میں بکیر کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد ارسلان پھر امیہ کے پاس جا پہنچا۔ امیہ نے خزاعی لشکر کی تباہی کی ذمے داری تورانیوں کی بزدلی کے سر ڈالی اور ارسلان سے برہمی کا اظہار کیا۔ ارسلان یہ مایوس کن جواب پا کر خراسان کے شہروں میں پھر کر لوگوں کو امیہ کے خلاف ابھارنے لگا اور اس کے خلاف دربار خلافت میں بھی درخواستیں بھجوائیں۔ عبدالملک نے عاجز آ کر تمام مشرقی ممالک خراسان، سیستان، مازندران، فارس، سندھ وغیرہ حجاج بن یوسف کے زیر انتظام دے دیے۔ حجاج نے ۷۸ھ میں مہلب بن ابی صفرہ کو خراسان کا والی مقرر کیا۔ ارسلان بھی فوراً مہلب سے ملا لیکن مہلب بہت زیرک اور عاقبت اندیش شخص تھا۔ وہ ارسلان کی باتوں میں نہ آیا اور اسے نہ صرف صاف جواب دے دیا بلکہ کہا کہ اگر تورانی فرماں رواؤں نے موسیٰ کے خلاف ایکا کرنے کی کوشش کی تو وہ موسیٰ کی کمک پر فوج بھیجے گا۔

ارسلان مہلب سے مایوس ہوا تو اس کے عیش پسند بیٹے یزید کو شیشے میں اتارنے لگا۔ مہلب نے یزید کا رنگ دیکھ کر اسے سمجھایا کہ ارسلان کی دوستی بے غرض نہیں اور موسیٰ خلافت کو تقویت پہنچانے کے لیے بہت کار آمد ہے۔ ارسلان نے یزید کو عورتوں کے حسن و جمال کا شیدائی بنا کر بتایا کہ موسیٰ ترکستان کی دو حسین عورتوں کی خاطر ہی وہاں رہ پڑا ہے۔ اس نے یزید کو نوشین اور قتلق خانم کے حسن کا غائبانہ عاشق بنا کر ترمذ پر لشکرکشی کی اجازت لینے پر آمادہ کر لیا۔

مہلب کو خراسان پر حکومت کرتے چار سال ہو چکے تھے ۔ موسیٰ نے دریائے جیحوں کے دوسرے کنارے بہت سے علاقے فتح کر لیے تھے ۔ قلعہ ترمذ کے نیچے سے جنگل تک جانے والی دس میل لمبی سرنگ کو اس نے انتہائی خفیہ طریق پر اور بھی چوڑا کرا لیا تھا ۔ اس کا علم اس کے چند معتبر غلاموں اور حرم کے سوا کسی کو نہ تھا ۔ سابقہ لڑائی میں جو خزاعی سردار مارا گیا تھا اس کے بھائیوں حریث و مغیث نے کئی ہزار ہمراہیوں کے ساتھ موسیٰ کے پاس پناہ لی ۔ اسے ارسلان کی سازشوں، مہلب کے انکار اور یزید کے اصرار کا حال سنایا اور بتایا کہ یزید انھیں مجبور کر رہا تھا کہ ترمذ پر حملہ آور ہوکر نوشین اور قتلق خاتم کو اٹھا لائیں لیکن ان کے انکار پر وہ دشمن ہوگیا اس لیے حریث و مغیث کو ہمراہیوں سمیت خراسان سے بھاگنا پڑا ۔

موسیٰ نے حریث و مغیث کی وفاداری کا امتحان لینے کی بجائے، محبت اور اعتماد سے ان کا دل جیتنے کی کوشش کی ۔ مغیث نے اپنے اہل خاندان کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے یزید کے خلاف کارروائی کے لیے لشکر فراہم کرنے کی اجازت لی اور موسیٰ سے رخصت ہوکر ترکستان میں نکل گیا ۔ مغیث نے تقریباً آٹھ ماہ ترکستان، چین اور مغربی تبت کے شہروں کا سفر کرکے ترکوں کا ایک لاکھ لشکر بخارا میں جمع کر لیا اور پھر ہفتہ بھر میں ترمذ آ پہنچا ۔

موسیٰ بھی اپنا لشکر لے کر ان کے ساتھ ہوا اور وہ تمام علاقے فتح کر لیے جو امیہ نے خلافت میں شامل کیے تھے ۔ چھ ماہ بعد جب یہ لشکر واپس لوٹے تو موسیٰ کی سلطنت بہت وسیع ہو چکی تھی اور حریث و مغیث اس کے کرتا دھرتا تھے جن سے حسد کھا کر موسیٰ کے عزیز اسے ان کے خلاف بھڑکاتے لیکن وہ ایک نہ سنتا ۔ ارسلان نے پھر مہلب کو اکسانا چاہا لیکن اس نے کوئی توجہ نہ دی ۔ ارسلان واپس لوٹا اور ایک بڑا لشکر جمع کرکے ترمذ کی طرف بڑھا ۔ ستر اسی ہزار کے اس لشکر میں سے ارسلان اور طرخون نے دس ہزار کے ساتھ ایک اونچے ٹیلے پر قیام کیا اور باقی نے قلعہ اور شہر کا محاصرہ کر لیا ۔ موسیٰ نے حریث کو دس ہزار سپاہ کے ساتھ طرخون کے مقابلے پر مامور کیا اور پھر پانچ ہزار کے ساتھ خود کمک کو پہنچا ۔ حریث ارسلان کے تیر سے زخمی ہوا اور موسیٰ کا تیر ارسلان کی آنکھ میں پیوست ہوگیا ۔ ترک بھاگ نکلے، عربوں نے ان کا تعاقب کرکے ان کے اتنے سر کاٹے کہ قلعے پر قصر کے سامنے ان سے دو برج بنائے گئے ۔ حریث زخموں کی تاب نہ لا کر دوسرے دن مر گیا ۔

موسیٰ کے عزیز مغیث کے درپے تھے ۔ مغیث نے اپنا ایک جاسوس غلام کے روپ میں دربار میں متعین کر رکھا تھا ۔ جاسوس سے اسے معلوم ہوا کہ موسیٰ کی مخالفت کے باوجود اس کے عزیزوں نے مغیث کے قتل کا منصوبہ بنایا ہے تو وہ رات کو چند معتمد ساتھیوں کے ساتھ بھاگ نکلا ۔ موسیٰ کو یہ سن کر افسوس ہوا اور اس نے عزیزوں کو برا بھلا کہا ۔ مغیث نے ترمذ سے تین منزل مغرب کی طرف جوسرا نامی ایک زبردست قلعے پر قبضہ کر لیا ۔ قلعے کے چاروں طرف جیحوں کا پانی تھا ۔ قبضے کی خبر سنتے ہی تورانی عربی عجمی بہادر مغیث کے طرفدار ہو کر وہاں جمع ہونے لگے ۔ موسیٰ بھائیوں کے اصرار پر لشکر لے کر جوسرا پہنچا لیکن وہاں اس نے مغیث سے صلح کی درخواست کی جو مسترد کر دی گئی ۔ ایک ماہ قلعہ کا محاصرہ رہا ۔ طرخون بھی بیس ہزار کا لشکر لے کر مغیث کی کمک کو جا پہنچا ۔ موسیٰ مجبوراً محاصرہ ترک کرکے ترمذ کو لوٹ گیا ۔ چند دن بعد مغیث اور طرخون کے لشکروں نے ترمذ کا محاصرہ کر لیا ۔ ایک ہفتے بعد ارسلان بھی مختلف شاہان بخارا، کش وغیرہ کا اسی ہزار کا لشکر لے کر جا پہنچا ۔ مغیث کے ہمراہ کشتیاں

بھی تھیں اس لیے ہر طرف سے ناکہ بندی ہوگئی ۔ یزید کے بےحد اصرار پر مہلب نے مغیرہ بن مہلب کو بس ہزار سپاہیوں کے ساتھ ارسلان کی کمک پر بھیج دیا ۔ موسیٰ کے بھائی نوح کے ایک رفیق یزید بن ہذیل نے قسم کھائی کہ وہ مغیث کو ہر طرح قتل کرے گا ۔ وہ اپنے غلاموں اور بیٹوں کے ساتھ قلعے سے نکل کر مغث کی پناہ گاہ میں گئے ۔ طرخون نے اس کے بیٹوں کو کفیلوں کے طور پر حراست میں رکھا ۔ ایک دن نماز مغرب کے وقت موقع دیکھ کر یزید بن ہذیل نے مغث کو قتل کر دیا اور قلعے میں پہنچ گیا ۔ طرخون نے یزید کے دونوں بیٹوں کو قتل کر دیا ۔

مغیث کے مرنے سے بےدلی پیدا ہو چلی تھی، موسیٰ نے ایک رات شب خون مارنا چاہا لیکن تمام تر رازداری کے باوجود طرخون کو خبر تھی اور وہ ہوشیار تھا ۔ اس کے چار دن بعد موسیٰ نے پھر انتہائی رازداری سے کام لے کر شب خون مارا جس میں ہزاروں ترک قتل ہوئے ۔ صبح ہوتے ہی سب بھاگ نکلے ۔ شکست کی وجہ نئے سردار ظہیر اور طرخون میں نااتفاقی بھی تھی ۔ مغیرہ بن مہلب زخمی ہوکر واپس گیا اور چوتھے روز مر گیا ۔ موسیٰ نے خازم کو طرخون کے تعاقب میں اور سلیمان کو ظہیر کے تعاقب میں روانہ کیا اور جوسرا کے قلعے پر بھی قبضہ کر لیا ۔ یہ لڑائی ۸۲ھ میں ہوئی اور اسی سال مہلب ابن ابی صفرہ کا انتقال ہوا جس کے بعد یزید بن مہلب والی خراسان ہوا ۔

یزید نے والی بنتے ہی ارسلان کو اطلاع دی اور لشکر کشی کی تیاری کرنے لگا ۔ تین سال تیاری میں لگ گئے اور ۸۵ھ میں لشکر کشی کا ارادہ ہو ہی رہا تھا کہ حجاج نے یزید کو معزول کر کے اس کے بھائی مفضل کو والی مقرر کیا ۔ یزید نے اپنے بھائی کو لشکر کشی پر آمادہ کر لیا ۔ ایک ماہ بعد عثمان بن مسعود کی سرکردگی میں ایک لاکھ خراسانی فوج جمع ہوگئی ۔ یزید نے اپنے بھائی مدرک بن مہلب حاکم بلخ کو لکھا کہ وہ اپنا لشکر لے کر خود مدد پر جائے ۔ مدرک دس ہزار سواروں کے ساتھ پہنچا ۔ ارسلان و طرخون بھی شاہان توران سے مل کر ایک لاکھ فوج لے آئے ۔ موسیٰ حالات کو دیکھ کر مایوس ہوگیا اور اب سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس کے تمام راز دشمن تک پہنچ جاتے تھے ۔ آخر نوشین نے اسے مطلع کیا کہ قتلق خانم نے ارسلان سے ساز باز کر رکھا ہے ۔ موسیٰ نے ایک ماہ تک بھر طور مقابلہ کیا ۔ ایک سردار زرعہ بن علقمہ فریب سے عثمان بن مسعود کے قتل کے لیے گیا لیکن چھٹے دن خود زرعہ کا سر دشمن نے قلعے میں پھینک دیا ۔ موسیٰ نے ایک رات شب خون مارا ، غنیم کے دس بارہ ہزار سپاہی قتل ہوئے لیکن پندرہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ اتنے عظیم لشکر کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا ۔ ایک دن موسیٰ نے اپنے بھتیجے کو پانچ ہزار سپاہ کے ساتھ قلعے میں ضروری ہدایات دے کر چھوڑا اور نوشین و قتلق خانم کو سرنگ کے راستے نکل جانے کا مشورہ دے کر، غلام کوکب کو بھی ضروری ہدایات دیں اور خود دس ہزار ہمراہیوں کے ساتھ فیصلہ کن معرکے کے لیے میدان میں کود پڑا ۔ زبردست جنگ ہوئی ۔ انھیں چاروں طرف سے گھیر کر مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا گیا ۔ کوکب کو جو موسیٰ کے لباس میں تھا گھیر لیا گیا اور موسیٰ کے باپ کے قاتل افریقی غلام نے اسے بھی قتل کر کے چہرہ مسخ کر دیا ۔ موسیٰ کے بیشتر ہمراہی کٹ مرے ۔ ارسلان چاروں طرف سے لشکر کو اکسا کر غائب ہوگیا ۔ شام تک جنگ رہی رات کو موسیٰ کے بھتیجے نضر بن سلیمان نے حسب ہدایت مدرک کو قلعے کا قبضہ لینے کے لیے پیغام بھیجا ۔ طرخون مدرک اور عثمان وغیرہ جب قلعے میں داخل ہوئے تو انھوں نے حرم کی تلاشی لی ۔ نوشین اور قتلق خانم کی شناخت

کے لیے ارسلان کی ضرورت محسوس ہوئی تو موسیٰ کی لونڈی جلاجل نے بتایا کہ خود ارسلان ہی انھیں بھگا لے گیا ہے ۔ اب مدرک پر اصلیت کھلی کہ ارسلان یزید کو نوشین کا عاشق کیوں بنا رہا تھا ۔ چنانچہ ہر طرف ارسلان کی گرفتاری کے احکام جاری ہوگئے ۔

اس روز جنگ شروع ہوتے ہی نوشین نے چکنی چپڑی باتوں سے قتلق خانم سے معلوم کر لیا کہ اس نے ارسلان کو سرنگ کے دہانے کا پتہ دے کر وہاں بلوا رکھا ہے ۔ نوشین نے قتلق خانم سے وعدہ لیا کہ وہ فرار کے دوران راستے میں ارسلان کے سامنے اسے بولنے پر مجبور نہیں کرے گی اور نوشین ارسلان کے سامنے اس وقت تک نقاب نہ الٹے گی جب تک وہ اسے خراسان نہ بھیجنے کا وعدہ نہ کر لے گا ۔ فرار کے وقت نوشین نے قتلق خانم کے سامنے مخصوص رنگ کا نقاب اور چادر اوڑھی لیکن طے شدہ منصوبے کے مطابق سرنگ میں سے گزرتے ہوئے وہ پیچھے رہ گئی اور اس کے نقاب اور چادر میں اس کی حبشن ملازمہ مسو کہ قتلق خانم کے ہمراہ سرنگ سے باہر نکلی ۔ سرنگ کے باہر ارسلان تین مسلح سواروں کے ساتھ موجود تھا ۔ قتلق خانم حبشن کا نقاب اور چادر دیکھ کر نوشین کے بارے میں مطمئن ہوگئی اور یہ سب کیمپ کی طرف چلے ۔ ارسلان کو راستے میں سے دو سو عرب سواروں کا دستہ عورتوں سمیت گرفتار کر کے مدرک کے سامنے لے گیا ۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ نوشین کی جگہ حبشن ملازمہ تھی ۔ مدرک نے ارسلان، قتلق خانم اور کنیزوں کو گرفتار کر کے منصور کی حراست میں خراسان روانہ کر دیا جہاں ارسلان قتلق خانم اور حبشن ملازمہ قتل کرا دیے گئے ۔

نوشین سرنگ سے نکل کر قریبی غار میں چھپی ہوئی تھی کہ موسیٰ کوکب کے لباس میں وہاں پہنچا ۔ پہلے تو نوشین نے اسے کوکب سمجھا لیکن پھر اسے اصلیت کا پتہ چلا ۔ رات وہاں غار میں مشورے کرتے گزری، نوشین مسلمان ہوگئی اور صبح دونوں بت پرستوں کی وضع میں کاشغر کے لیے روانہ ہوئے جہاں دو ماہ بعد پہنچے ۔ نوشین کے باپ شاہ کاشغر نے پرجوش استقبال کیا اور چاہا کہ موسیٰ وہاں حکومت کرے لیکن موسیٰ نے انکار کیا، پھر مصلحتاً اپنا نام عیسیٰ رکھ کر چھ ماہ بعد نوشین کے ہمراہ وادی جنت نظیر کشمیر میں چلا گیا اور وہیں دونوں نے تمام عمر بسر کی اور وہیں ہم آغوش خاک ہوگئے ۔

تحقیقی جائزہ

شرر نے ناول میں تاریخی پس منظر کے طور پر موسیٰ بن عبداللہ کے والد عبداللہ بن خازم کی امارت خراسان کا ذکر کیا ہے ۔ عبداللہ بن خازم کی امارت کے بارے میں طبری لکھتے ہیں کہ:

جب مسلم نیشاپور میں پہنچا تو عبداللہ ابن خازم نے سوال کیا کہ تو نے خراسان میں کسے چھوڑا ۔ مسلم نے سارا حال بیان کر دیا تو ابن خازم نے یہ سنکر کہا کہ شہر میں تجھے کوئی نہ ملا کہ اسے والی خراسان بنائے ۔ تو نے خراسان کو ہی بنی بکر و مزون اہل یمن میں تقسیم کر دیا ۔ خراسان کا فرمان میرے نام پر لکھ دے میں خراسان کی حکومت کروں گا . . . . مسلم نے اس کے نام فرمان لکھ دیا . . . . ابن خازم مرو کی طرف متوجہ ہوا ۔ مہلب کو خبر ہوگئی ۔ اس نے بنی جشم میں سے ایک شخص کو اپنا جانشین بنایا اور خود ابن خازم کی طرف متوجہ ہوا ۔ ابن خازم جب خراسان میں پہنچا تو جشمی اسے مانع ہوا . . . . جشمی زخمی ہو کر مر گیا . . . . ابن خازم کا تسلط خراسان پر ہوگیا اور آتش حرب مشتعل ہوگئی ۔ ابن خازم نے مرو پر قبضہ کر کے سلیمان بن مرشد پر مرو رود میں چڑھائی کی ۔ کچھ دنوں تک لڑائی ہوتی رہی ۔ پھر وہ سلیمان بن مرشد کو قتل کر کے عمرو بن مرشد سے لڑنے کو طالقان کی طرف بڑھا . . . . لڑائی میں عمرو بن مرشد مارا گیا ۔ یہاں

سے قبیلہ بکر بن وائل کے سب لوگ بھاگ کر ہرات میں چلے آئے اور اس خاندان کے لوگ جو نواحی خراسان میں تھے وہ بھی سب آ کر ان سے مل گئے - بکر بن وائل کا ایک جم غفیر ہرات میں جمع ہو گیا - اوس بن ثعلبہ ان سب کا رئیس تھا . . . ابن خازم اپنے بیٹے موسیٰ کو اپنا جانشین کرکے ان لوگوں کو قتال کرنے کو روانہ ہوا . . . ابن حازم ان لوگوں سے کوئی سال بھر لڑتا رہا . . . ہلال ضبی نے مصالحت کی کوشش کی لیکن بنی صہیب نے قطعی انکار کر دیا . آخر ایک دن بنی ربیعہ جوش دلانے پر خندق کو چھوڑ کر باہر نکل آئے . . . . اس معرکے میں آٹھ ہزار بنی بکر قتل ہوئے - اوس بن ثعلبہ بھی زخمی ہو کر بھاگ نکلا اور سجستان کے قریب پہنچ کر مر گیا - ابن خازم ہرات پر قابض ہو گیا اور وہاں اپنے بیٹے محمد کو حاکم مقرر کیا - شماس کو اس کے پاس چھوڑا اور بکیر کو اس کا رئیس شرطیہ مقرر کیا . . . خود نصیحتیں کرکے مرو کی طرف پلٹا -[1]
طبری نے یہ واقعات ۶۴ھ کے واقعات کے ضمن میں بیان کیے ہیں -

عبداللہ ابن خازم کے تقرر، مہلب بن ابی صفرہ کے نائب بنو جشم ابن سعد بن زید مناہ بن تمیم کے ایک سخص سے مقابلے، حسمی کی ہلاکت، سلیمان سے جنگ، اوس بن ثعلبہ سے ہرات میں جنگ، محمد بن عبداللہ بن خازم کے حاکم ہرات کی حیثیت سے تقرر وغیرہ کے سلسلے میں ابن خلدون کا بھی وہی بیان ہے جو طبری کا ہے - دونوں کے یہاں تفصیلات و جزئیات بھی یکساں ہیں -[2]

۶۵ھ کے واقعات کے ضمن میں طبری لکھتے ہیں کہ :

جب خراسان میں عبداللہ بن خازم کا کوئی مخالف نہ رہا تو اس نے بنی تمیم کے ساتھ ظلم و زیادتی کی . . محمد بن عبداللہ بن خازم کی ماں صفیہ بنی تمیم میں سے تھی - یہ محمد کے پاس ہرات آئے - ابن خازم نے بکیر و شماس کو لکھا کہ بنی تمیم کو ہرات میں نہ آنے دیں - شماس نے تو اس حکم کی بجا آوری سے انکار کر دیا اور ہرات چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو لیا البتہ بکیر نے انھیں ہرات میں نہ آنے دیا - جب بکیر نے ہرات نہ آنے دیا تو وہ اس علاقے میں قیام پذیر ہو گئے مگر شماس ان کے پاس آ گیا - بکیر نے شماس کو کہلا بھیجا کہ میں تم کو تیس ہزار درہم دیتا ہوں اور ہر تمیمی کو ایک ایک ہزار دوں گا بشرطیکہ وہ یہاں سے چلے جائیں - بنی تمیم نے اس تجویز کو مسترد کر دیا اور زبردستی شہر میں داخل ہو گئے اور محمد بن عبداللہ بن خازم کو قتل کر دیا -

طبری نے اس قتل اور اس کے رد عمل کے سلسلے میں کافی تفصیل سے لکھا ہے[3]- اس کے بعد بنی تمیم سے دو سال تک مرو میں ابن خازم کی جنگ رہی - بنی تمیم سے اس جنگ کی تفصیلات طبری اور ابن خلدون کے یہاں یکساں ہیں -[4]

بنی تمیم کے خلاف ابن خازم کی کارروائی کے سلسلے میں شرر کے بیانات کی تصدیق ۶۶ھ کے واقعات کے ذیل میں دیے گئے طبری کے بیانات سے ہوتی ہے - طبری نے لکھا ہے کہ :

اسی سنہ میں عبداللہ بن خازم نے اپنے بیٹے محمد کے قاتلوں کا جو بنی تمیم سے تھے محاصرہ کر لیا - ان کے ستر یا اسی شہسوار قصر فرتنا میں اترے -

زہیر بن زویب کی شجاعت، محصورین کو اس کا مشورہ، اس کا اکیلے قلعے سے نکل کر ابن خازم کی صفوں کو درہم برہم کرکے لوٹ جانا، محصورین کو غیرت دلانا، ابن خازم کی زہیر کو پیشکش، اس کا جواب، بنی تمیم کی شرائط صلح اور ابن خازم کی شرائط، جنگ اور زہیر کی گرفتاری، موسیٰ بن عبداللہ کا اصرار کہ زہیر کو قتل کیا جائے اور پھر اس کا قتل وغیرہ جملہ واقعات جو شرر کے یہاں بیان ہوئے ہیں، طبری کے بیانات سے ان کی تصدیق ہوتی ہے -[5]

۱- طبری : ترجمہ سید حیدر علی طباطبائی، ج ۴، ص ۳۷۹ تا ۳۸۴ -
۲- ابن خلدون : ج ۵، ص ۱۳۹ تا ۱۴۱ -
۳- طبری : ج ۴، ص ۴۵۶ تا ۴۵۹ -
۴- ابن خلدون : ج ۵، ص ۱۸۷ بعد -
۵- طبری : ج ۴، ص ۵۳۶ تا ۵۴۰ -

عبدالملک کے خلیفہ بننے کے بعد ابن خازم کے حالات کے سلسلے میں طبری لکھتے ہیں کہ

ایک واقف حال کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر غرۂ ماہ ذی قعدہ ۷۲ھ میں محصور کیے گئے ۔ اسی سنہ میں عبدالملک نے عبداللہ بن خازم السلمی کو خط بھیج کر اپنی بیعت کی دعوت دی اور وعدہ کیا کہ سات سال تک خراسان تمھاری جاگیر میں رہے گا . . . . عبدالملک نے سورہ بن الشم النمری کو اپنا خط دے کر ان کے پاس بھیجا جس میں انہیں دعوت دی تھی کہ اگر تم میری بیعت کر لو گے تو سات سال تک خراسان تمھاری جاگیر میں رہے گا ۔ خط پڑھ کر ابن خازم نے سورہ سے کہا کہ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ بنی سلیم اور بنی عامر کے درمیان فساد برپا ہو جائے گا تو ضرور تمہیں قتل کر ڈالتا ۔ مگر تم اس خط کو نگل جاؤ ۔ چنانچہ سورہ نے خط کو کھا لیا ۔[۱]

طبری نے اس سلسلے میں ایک اور روایت بیان کرکے اس میں قاصد کا نام مختلف بیان کیا ہے لیکن واقعات یہی درج کیے ہیں[۲] ۔ ابن خلدون کے یہاں بھی عبدالملک کے خط کے مضمون اور اس کے رد عمل میں ابن خازم کا قاصد کو یہی حکم مذکور ہوا ہے[۳] ۔

طبری نے ان واقعات کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے جن کے مطابق بکیر نے حضرت عبداللہ بن زبیر کی بیعت سے انحراف کرکے عبدالملک کی بیعت کر لی ۔ ابن خازم کی بحیر سے جنگ ہوئی، اس جنگ میں ابن خازم وکیع بن عمیرہ القریعی کے ہاتھوں قتل ہوا ۔ بکیر نے سر کاٹنا چاہا کہ عبدالملک کے پاس بھیجے لیکن بحیر نے منع کیا تو بکیر نے ڈنڈا مار کر اس کا سر توڑ دیا ۔ طبری نے یہ روایت بھی درج کی ہے کہ ابن خازم کا قتل حضرت عبداللہ بن زبیر کی شہادت کے بعد ہوا اور عبدالملک نے ابن زبیر کا سر ابن خازم کے پاس بھیجا تھا جسے اس نے غسل دے کر خوشبو لگا کر کفن پہنایا اور ابن زبیر کے اہل و عیال کے پاس مدینہ منورہ واپس بھیج دیا اور عبدالملک کے قاصد کے ہاتھ پاؤں قطع کراکے سر قلم کر دیا[۴] ۔ ابن خلدون کے یہاں بھی یہ بیانات اسی طرح ہیں[۵] ۔ یہ واقعات ۷۲ھ کے ہیں ۔ ابن خازم کے قتل کے بعد بکیر بن وشاح خراسان کا گورنر مقرر ہوا لیکن بنی تمیم اس کی مخالفت پر اڑے رہے ۔ بالآخر دو سال بعد عبدالملک نے اسے معزول کرکے امیہ بن عبداللہ بن خالد بن اسید کو گورنر مقرر کیا[۶] ۔ بکیر بن وشاح ۷۷ھ میں امیہ بن عبداللہ والی خراسان کے ہاتھوں قتل ہوا[۷] ۔ ۷۸ھ میں عبدالملک نے امیہ کو معزول کرکے سجستان اور خراسان کے دونوں صوبے حجاج کے ماتحت کر دیے ۔ حجاج نے مہلب بن ابی صفرہ کو خراسان کا حاکم مقرر کیا ۔ ۸۲ھ میں حریث بن قطنہ کو مہلب نے ترکوں کی سرکوبی پر مامور کیا تھا ۔ حریث نے اس مہم کے دوران ایک فقرہ یزید کے بارے میں کہا جو مہلب تک پہنچ گیا ۔ مہلب نے اسے برہنہ کرکے بیس کوڑے لگوائے ۔ اس کے بعد حریث نے مہلب کو قتل کرنے کی قسم کھا لی ۔ مہلب کو اس کا بھی علم ہوگیا چنانچہ اس نے حریث کو طلب کیا ۔ آخر حریث اور ثابت دونوں بھائیوں نے باہم مشورہ کرکے اپنے تین سو سواروں کے ساتھ موسیٰ بن عبداللہ بن خازم کے پاس جا کر پناہ حاصل کر لی[۸] ۔

۱- طبری : ج ۵، ص ۱۳۳ ۔ ۲- ایضاً ۔ ۳- ابن خلدون : ج ۵، ص ۱۸۷ ۔
٤- طبری : ج ۵، ص ۱۳۳ تا ۱۳٦ ۔ ۵- ابن خلدون : ج ۵، ص ۱۸۸ ببعد ۔
٦- ایضاً : ج ۵، ص ۱۹۷ ؛ طبری : ج ۵، ص ۱۵۵ تا ۱۵۸ ۔
۷- طبری : ج ۵، ص ۲۹۷ تا ۳۰۷ ؛ ابن خلدون : ج ۵، ص ۱۹۷ ۔
۸- طبری : ج ۵، ص ۳۰۸، ۳۴۳ تا ۳۴٦ ؛ ابن خلدون : ج ۵، ص ۲۲۹ تا ۲۳۱ ۔

اب ہم ناول کے اصل پلاٹ اور اس کے ہیرو موسیٰ بن عبداللہ سے متعلق بیان کردہ واقعات کا جائزہ لیتے ہیں ۔ شرر نے موسیٰ بن عبداللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے والد نے اسے ماوراالنہر کے کسی علاقے میں جا کر پناہ لینے کو کہا تھا ۔ موسیٰ کو طرخون والی صغد نے پناہ دی لیکن پھر ایک خاص واقعے کی بنا پر اسے وہاں سے نکلنا پڑا اور بالآخر اس نے ترمذ میں قدم جما لیے ۔ ابن خلدون نے موسیٰ بن عبداللہ کے واقعات اس طرح بیان کیے ہیں :

”جن دنوں عبداللہ بن خازم بنو تمیم کے ساتھ خراسان میں لڑ رہا تھا اسی زمانہ میں ان لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے اس نے نیشاپور کا قصد کیا اور پھر اس خیال سے کہ بنو تمیم اہل مرو سے سازش نہ کر لیں اپنے لڑکے موسیٰ کو حکم دیا کہ اسباب و مال لے کر نہر بلخ عبور کر جاؤ تاکہ کسی بادشاہ کے یہاں جا کر ہم پناہ گزیں ہوں یا کسی محفوظ قلعہ میں قیام اختیار کریں ۔ پس موسیٰ مرو سے دو سو سواروں کے ساتھ روانہ ہوا ۔ راستے میں اس کے ہمراہیوں کی تعداد چار سو ہو گئی ۔ علاوہ ان کے کچھ اور لوگ بنو سلم کے بھی آ ملے ۔ قم پر پہنچا تو لڑائی ہوئی ۔ موسیٰ نے کامیابی کے ساتھ اہل قم کے مال و اسباب کو لوٹ کر نہر بلخ عبور کیا اور بخارا میں پہنچ کر والی بخارا سے امن کا خواستگار ہوا ۔ والی بخارا نے عبد الملک کے خوف سے انکار کر دیا ۔ تب وہ ملوک ترک کے پاس گیا ۔ انہوں نے بھی ڈر کر انکاری جواب دیا ۔ سمرقند پہنچا ۔ طرخون والی صغد نے ٹھہرنے کی اجازت دی ۔ ایک مدت تک مقیم رہا ۔ اسی زمانہ قیام میں اس کو اپنے والد عبداللہ بن خازم کے مارے جانے کی خبر ملی مگر اس نے اپنے مقام سے حرکت نہ کی ۔

شدنی[1] امر کسی شخص نے اس کے ہمراہیوں میں ایک صغدی کا مقابلہ کیا ۔ اتفاق یہ کہ صغدی اس کے ہاتھ سے مارا گیا ، جس کی وجہ سے طرخون والی صغد نے موسیٰ کو مع اس کے ہمراہیوں کے اپنے شہر سے نکال دیا ۔[2] وہ کش پہنچا ۔ والی کش اس کی مدافعت نہ کر سکا اور طرخون سے امداد چاہی ۔ موسیٰ اس کے مقابلے پر نکلا اس وقت اس کے ہمراہ سات سو سوار تھے ، لڑائی ہوئی ، صبح سے شام تک لڑائی کا بازار گرم رہا ۔ موسیٰ کے اکثر آدمی زخمی ہوئے . . . . موسیٰ کش سے نکل کر ترمذ پہنچا اور قلعہ کے باہر قیام کیا ۔ قلعہ نہر کے کنارے پر بنا ہوا تھا ۔ والی ترمذ نے اس کو قلعے میں نہ داخل ہونے دیا ۔ موسیٰ نے تحائف و ہدایا بھیج کر اس سے راہ رسم بڑھائی ۔ اکثر سیر و شکار میں اس کے ہمراہ رہنے لگا ۔ ایک روز والی ترمذ نے موسیٰ کی دعوت کی ۔ موسیٰ مع اپنے ایک سو سواروں کے شریک دعوت ہوا ۔ کھانا کھانے کے بعد والی قلعہ نے موسیٰ کو واپس جانے کے لیے کہا ، اس نے نکلنے سے انکار کر دیا اور کہا ”اس قلعہ میں یا تو میں رہوں گا یا میری قبر بنے گی ۔“ والی قلعہ نے سختی کی ۔ لڑائی ہوئی ۔ موسیٰ نے اہل قلعہ کے بہت سے آدمیوں کو مار ڈالا اور بادشاہ ترمذ کو نکال کر قلعہ پر قبضہ کر لیا ۔ بعد اس کے بادشاہ ترک کے پاس گیا اور امداد چاہی ۔ اس

۱۔ ابن اثیر نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ : ”اہل صغد کا قدیم دستور تھا کہ سال میں ایک روز سوار صغد کے لیے دسترخوان پر شراب اور عمدہ عمدہ کھانے چن کر رکھتے تھے ۔ کوئی شخص اس کے قریب نہ جانے پاتا تھا ۔ اور جو شخص اس میں سے کھا لیتا تھا اس سے معرکہ آرائی ہوتی تھی، جو حریف اپنے مقابل کو مار ڈالتا وہی دسترخوان کا مالک ہوتا تھا ۔ موسیٰ کے ہمراہیوں میں سے ایک شخص نے اس رسم کی کیفیت دریافت کی لوگوں نے بتلایا اس نے دسترخوان پر بیٹھ کر جو کچھ تھا کھا لیا ۔ دسترخوان بچھانے والے کو معلوم ہوا تو وہ غصے میں بھرا ہوا آیا اور اس عربی نژاد کو جنگ کے لیے طلب کیا ۔ مقابلہ ہوا صغدی مارا گیا ۔ والی صغد نے موسیٰ کو بلا کر کہا ”میں نے تم کو ٹھہرایا ، پناہ دی اس کے معاوضے میں تم نے میرے سوار کو مار ڈالا ۔ اگر میں نے پناہ نہ دی ہوتی تو میں تم کو مار ڈالتا ، پس اسی میں خیر ہے کہ شہر چھوڑ کر نکل جاؤ ۔“ چنانچہ موسیٰ مع اپنے ہمراہیوں کے صغد سے نکل کھڑا ہوا ۔ (ابن اثیر : کامل ، ج ۴ ، ص ۳۰۴) ۔

۲۔ طبری نے بھی صغد سے نکالے جانے کے واقعے کو لکھتے ہوئے اہل صغد کی اس رسم کو تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا ذکر ابن اثیر کے یہاں بھی موجود ہے اور شرر نے اس روایت میں تھوڑی سی رنگ آمیزی کی ہے ۔ ملاحظہ ہو طبری : ج ۵ ، ص ۳۹۶ ، ۳۹۷ ۔

نے انکار کیا ۔ رفتہ رفتہ ابن خازم کے ہمراہی موسیٰ سے آ ملے جس سے اس کی قوت بڑھ گئی ۔ اکثر اوقات وہ قلعہ سے نکل کر نواح پر متصرف ہو جاتا ۔

جب امیہ گورنر ہوکر خراسان گیا اور موسیٰ پر فوج کشی کے قصد سے روانہ ہوا اور بکیر نے مخالفت پر کمر باندھی تو وہ بکیر کی بغاوت فرو کرنے کو لوٹ آیا ۔ پھر ایک خزاعی سپہ سالار کے ساتھ موسیٰ کی گوشمالی کو فوجیں روانہ کیں ، جنھوں نے موسیٰ کا ترمذ میں محاصرہ کیا ۔ والی ترمذ دوبارہ بادشاہ ترک کے پاس استعانت و استمداد کو گیا ۔ وہاں سے ایک عظیم الشان لشکر لے کر واپس ہوا اور قلعہ کے ایک طرف مورچہ قائم کیا ۔ موسیٰ اول وقت عربوں سے لڑتا اور دوسرے وقت ترکوں سے ۔ تین مہینے تک اسی عنوان سے لڑائی جاری رہی ۔ ایک روز شب کے وقت موسیٰ نے ترکوں پر حملہ کر دیا اور بہت سے سپاہیوں کو مار ڈالا ۔ لشکرگاہ میں مال و اسباب و آلات حرب جو کچھ تھا لوٹ لیا ۔ موسیٰ کے ہمراہیوں میں سے صرف سولہ آدمی کام آئے ۔ صبح ہوئی تو خزاعی اور عرب کے لشکر نے ترکوں کو ہزیمت خوردہ و پامال دیکھ کر تاسف کیا اور خود بھی موسیٰ کی ان چالوں سے ڈرے ۔ اگلے دن عمر بن خالد بن حصین کلابی نے جو موسیٰ کے دوستوں میں تھا ، حاضر ہو کر کہا ''چونکہ ہم لوگ مکر ہی کے ذریعے سے فتح یاب ہوئے ہیں اس وجہ سے مناسب ہے کہ تم ہم کو کوڑے مار کر چھوڑ دو ۔'' موسیٰ نے اس کو پچاس کوڑے پٹوائے ۔ عمر بن خالد اٹھ کر خزاعی کے پاس آیا اور یہ ظاہر کیا کہ ''مجھے ابن خازم نے تمھاری دوستی و حمیت و جاسوسی سے متہم کیا ہے اور کوڑے پٹوائے ہیں ۔'' خزاعی نے عمر بن خالد کو امان دی ۔ چند دن یہ اس کے پاس ٹھہرا رہا ۔ ایک روز عمر بن خالد، خزاعی کے پاس گیا ۔ اتفاق سے اس وقت وہ تنہا بیٹھا ہوا تھا ، نصیحتانہ کہنے لگا ''تم کو ایسے نازک وقت میں بغیر ہتھیار کے خالی نہ رہنا چاہیے ۔'' خزاعی نے فرش کا کنارہ اٹھایا تو اس کے نیچے برہنہ شمشیر رکھی ہوئی تھی ۔ عمر نے اٹھا کر وار کر دیا ۔ خزاعی نے دم تک نہ لیا ، فوراً ٹھنڈا ہو گیا ۔ عمر بن خالد بھاگ کر موسیٰ کے پاس آیا ۔ خزاعی کا لشکر متفرق و منتشر ہو گیا ۔ اکثر سپاہی امن حاصل کرکے موسیٰ کے لشکر میں مل گئے . . . اس کے بعد جب مہلب امیر خراسان ہو کر آیا تو اس نے موسیٰ سے کوئی تعرض نہ کیا بلکہ اپنے لڑکوں کو نصیحتانہ کہتا تھا کہ تم موسیٰ سے احتراز کرتے رہنا کیونکہ اگر یہ مر گیا تو خراسان کی امارت پر کوئی شخص بنو قیس کا آئے گا ۔

اس کے زمانہ امارت میں حریث و ثابت پسران قطبہ خزاعی جو اس کے ہمراہ تھے، موسیٰ کے پاس چلے آئے ۔ مہلب کے مرنے کے بعد یزید بن مہلب گورنر خراسان ہوا ۔ اس نے حریث و ثابت کے مال و اسباب کو ضبط کر لیا اور ان کی لونڈیوں کو گھر میں ڈال لیا اور ان کے برادر اخیافی کو قتل کر دیا ۔ ثابت فریادی صورت بنائے ہوئے طرخون کے پاس گیا اور یزید بن مہلب کے ظلم کی شکایت کی ۔ چونکہ ترکوں کو ثابت سے ایک قسم کی محبت تھی اس لیے طرخون کو یزید بن مہلب کی زیادتیوں پر غصہ آیا نیزک اہل صغد، اہل بخارا اور صاغان کو ثابت کی امداد پر جمع کر دیا ۔ ثابت ان سبھوں کو لیے ہوئے موسیٰ کے پاس آیا جبکہ عبدالرحمان بن عباس کا گروہ ہرات سے اور ابن اشعث کی جماعت عراق سے اور کابل سے آ کر اس کے پاس مجتمع ہو گئی ۔ ان سب لوگوں کے جمع ہو جانے سے آٹھ ہزار کی تعداد پوری ہو گئی ۔ ثابت و حریث نے موسیٰ سے کہا ''آؤ ہم اور تم اس لشکر کو مرتب کرکے اٹھ کھڑے ہوں اور یزید کو خراسان سے نکال کر تم کو اس کا امیر بنائیں ۔'' موسیٰ نے اس خیال سے کہ یہ دونوں خود خراسان پر متصرف ہو کر مجھے مغلوب کر دیں گے اور نیز بعض دوستوں کے سمجھانے سے ثابت و حریث سے کہا ''بفرض محال اگر تم نے یزید کو خراسان سے نکال باہر کیا تو عبدالملک کا دوسرا گورنر آ پہنچے گا ۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ یزید کے عمال کو ماوراءالنہر سے نکال کر اس پر قبضہ حاصل کر لو ۔ چنانچہ ان لوگوں نے ان کو نکال دیا ۔ طرخون اور ترک اپنے اپنے ملک لوٹ گئے اور اہل عرب کی حکومت کو ترمذ میں گونہ استقلال ہو گیا ۔ کچھ مال و اسباب بھی جمع ہو گیا ۔ حریث و ثابت ملکی و مالی انتظام کرتے تھے اور موسیٰ برائے نام ان کا امیر تھا ۔ اس وجہ سے موسیٰ کے مشیروں نے کچھ سنکر حریث و ثابت کے قتل پر اس کو آمادہ کیا ۔ اس اثنا میں عجمیوں کا ایک گروہ جس میں ہسیاطلہ و اہل تبت و ترک تھے حملہ آور ہوا ۔ موسیٰ اپنے ہمراہیوں کو لے کر ان کے مقابلے پر آیا ۔ بادشاہ ترک دس ہزار فوج لیے ایک ٹیلے پر صف آرا تھا ۔ حریث بن قطبہ نے اس پر حملہ کیا اور بادشاہ

ترک کو اپنے پر زور حملہ سے پسپا کر دیا ۔ اسی دارو گیر میں ایک تیر حریث کے چہرے پر آ لگا ، زخم کاری پڑا تھا ، دو دن کے بعد حریث مر گیا ۔ شام ہو گئی تھی لڑائی موقوف ہو گئی ۔ رات کے وقت موسیٰ نے ترکوں پر شبخون مارا ، ایک گروہ کثیر ترکوں کا کام آ گیا - موسیٰ کے سپاہی بہت کم مقتول ہوئے اور وہ مظفر و منصور مال غنیمت لیے ہوئے میدان جنگ سے شہر کو واپس ہوا ۔ اس کے مشیروں نے کہا ''حریث کا کام تمام ہو گیا اب تم ثابت کا بھی وارا نیارا کر دو ۔'' موسیٰ نے انکار کیا رفتہ رفتہ یہ خبر ثابت تک پہنچ گئی ۔ اس نے محمد بن عبداللہ خزاعی کو مخبری کی غرض سے موسیٰ کی خدمت میں بھیجا اور یہ سمجھایا کہ ''عربی میں گفتگو نہ کرنا ، کوئی دریافت کرے تو یہ کہہ دینا کہ میں بامیان کے قیدیوں میں سے ہوں اور روزانہ جو خبریں ہوا کریں مجھ سے آ کر کہہ جایا کرنا ۔'' چنانچہ محمد بن عبداللہ عرصہ دراز تک اس خدمت کو انجام دیتا رہا ۔ ایک روز شب کے وقت بوقت تذکرہ موسیٰ کہنے لگا ''تم لوگ بے حد اصرار کر رہے ہو ، اچھا یہ تو بتاؤ کہ اس کو (یعنی ثابت کو) کس وجہ سے اور کیوں قتل کیا چاہتے ہو حالانکہ اس سے کوئی بد عہدی اس وقت تک نہیں ہوئی ۔'' کسی نے کچھ جواب نہ دیا ۔ اس کا بھائی نوح بولا ''جس وقت وہ کل تمہارے پاس آئے گا اس سے پیشتر کہ ہم تک پہنچے ہم اس کو اپنے ہمراہ لیے ہوئے کسی نشست گاہ میں چلے جائیں گے اور وہیں قتل کر ڈالیں گے ۔'' موسیٰ نے جواب دیا ، ''واللہ اس میں ہم لوگوں کی ہلاکت ہے ۔'' محمد بن عبداللہ یہ سب باتیں سن رہا تھا ، مجلس برخاست ہوتے ہی ثابت سے جا کر ہو بہو کہہ دیا ۔ غریب ثابت اسی شب کو بیس سواروں کو لے کر نکل کھڑا ہوا ۔ صبح ہوئی تو ان لوگوں نے نہ ثابت کو پایا اور نہ اس لڑکے (یعنی محمد بن عبداللہ خزاعی) کو ۔ اس سے ان پر یہ امر ثابت ہو گیا کہ وہ ثابت کا جاسوس تھا ۔

ثابت ترمذ سے نکل کر حشورا میں جا ٹھہرا اور عرب و عجم کا ایک گروہ کثیر اس کے پاس جمع ہو گیا ۔ موسیٰ یہ خبر پا کر ثابت سے جنگ کرنے چلا ۔ ثابت نے قلعہ بندی کر لی ۔ لڑائی چھڑ گئی ۔ اس اثنا میں طرخون اس کی کمک پر آ گیا ۔ مجبوراً موسیٰ محاصرہ اٹھا کر ترمذ لوٹ گیا ۔ بعد اس کے ثابت ، طرخون اہل بخارا ، نسف اور کش نے متفق ہو کر اسی ہزار کی جمعیت سے ترمذ میں موسیٰ کا محاصرہ کر لیا ۔ موسیٰ اور اس کے ہمراہی دل توڑ توڑ کر لڑے لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا ۔ یزید بن ہذیل نے قسم کھائی کہ میں یا تو ثابت کو مار ڈالوں گا یا خود مر جاؤں گا ۔ چنانچہ اس غرض کے حاصل کرنے کے لیے ثابت کے پاس آیا اور اس سے امن کا خواستگار ہوا ۔ ثابت کے بعض دوستوں نے یزید بن ہذیل کی بد عہدی و بیوفائی سے ڈرایا جس سے اس نے یزید کے دونوں لڑکوں قدامہ و ضحاک کو بطور رہن کے رکھ لیا ۔ مگر بایں ہمہ یزید بن ہذیل ، ثابت کی فکر میں لگا رہا ۔ اتفاق یہ کہ زیاد قصیر خزاعی کا لڑکا مر گیا ۔ ثابت معمولی کپڑے پہنے ہوئے بلا ہتھیار اس کی ماتم پرسی کو جا رہا تھا ، یزید بن ہذیل نے پہنچ کر سر پر تلوار چلائی ۔ زخم پورا پڑا ۔ ثابت تو زمین پر بے ہوش ہو کر گر پڑا اور یزید بن ہذیل بھاگ گیا ۔ طرخون نے قدامہ و ضحاک پسران یزید کو قتل کر ڈالا اور ثابت نے زخم کھانے کے ساتویں روز وفات پائی ۔ بجائے اس کے طرخون امارت کرنے لگا ۔

ثابت کے مرنے کے بعد اس کے ہمراہیوں کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے ۔ چستی و چالاکی باقی نہ رہی آپس میں کچھ نا اتفاقی بھی ہو گئی ۔ موسیٰ نے تین سو آدمیوں کے ساتھ ان پر شبخون مارا ۔ طرخون نے کہلا بھیجا کہ تم اپنے ہمراہیوں کو قتل و غارت سے روک لو ہم صبح ہوتے ہی چلے جائیں گے ، چنانچہ موسیٰ اسی وقت لوٹ آیا اور طرخون اور کل عجمی کوچ کر گئے ۔

پھر جس وقت مفضل امیر خراسان ہوا تو اس نے عثمان بن مسعود کو بسرافسری ایک لشکر موسیٰ بن عبداللہ پر حملہ کرنے بھیجا اور مدرک بن مہلب کو بھی جو بلخ میں تھا روانگی کا لکھ بھیجا ۔ پس اس نے پندرہ ہزار کی جمعیت سے نہر عبور کی ۔ دوسری طرف سے رتبیل و طرخون بھی مفضل کے لکھنے کے مطابق عثمان کی کمک پر آ پہنچے ۔ سبھوں نے چاروں طرف سے موسیٰ کا محاصرہ کر لیا ۔ دو مہینے تک نہایت سختی سے حصار کیے رہے ۔ عثمان نے شبخون مارنے کے خوف سے اپنے لشکر کے ارد گرد خندق کھدوائی تھی ۔ موسیٰ نے محاصرے سے تنگ ہو کر اپنے ہمراہیوں سے کہا ''ہم سے اب صبر نہیں ہو سکتا آؤ ہمارے ساتھ خروج کرو اور دفعتاً ترکوں پر جا پڑو ۔'' کل ہمراہیوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور اس کے ساتھ حملہ کی غرض سے نکلے ۔ خروج کے وقت نضر بن سلیمان (اپنے برادر زادہ) کو شہر میں چھوڑ گیا

اور یہ سمجھا گیا کہ اگر میں مارا جاؤں تو دیکھنا شہر عثمان کے سپرد نہ کرنا بلکہ مدرک بن مہلب کے حوالہ کرنا۔
موسیٰ نے اپنے ہمراہیوں میں سے ثلث آدمیوں کو عثمان کے مقابلہ پر رکھا اور یہ حکم دیا کہ جب تک وہ ہم سے نہ لڑیں تم پیش دستی نہ کرنا اور بقیہ آدمیوں کو لے کر طرخون اور اس کی رکاب کی فوج پر حملہ کر دیا۔ موسیٰ اور اس کے ہمراہیوں نے ایسا پر زور اور قوی حملہ کیا کہ طرخون سے سوائے بھاگنے کے کچھ نہ بن پڑا۔ ترک و صغد یورش کرکے قلعہ اور موسیٰ کے مابین آ کر حائل ہو گئے۔ شدت کے ساتھ لڑائی ہونے لگی۔ ترکوں نے موسیٰ کے گھوڑے کو زخمی کر دیا۔ اس کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) نے گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ جس وقت موسیٰ کا گھوڑا گرا تھا اور لوگ اس پر حملہ کر رہے تھے اسی وقت عثمان نے اس کو پہچان لیا تھا اور اس پر حملہ کا قصد کیا لیکن اس سے پہلے ترکوں نے گھوڑے کو زخمی کرکے موسیٰ کو قتل کر ڈالا تھا۔ عرب کا ایک گروہ کثیر اس معرکہ میں کام آیا۔ جس نے موسیٰ کی مردانہ زندگی کا خاتمہ کیا وہ واصل عنبری تھا۔ عثمان کے منادی نے قتل و غارت سے رکنے اور لوگوں کے قید کر لینے کی منادی کی۔ نضر بن سلیمان نے ترمذ کو مدرک بن مہلب کے سپرد کر دیا اور مدرک نے عثمان کے حوالے کر دیا۔ مفضل نے فتح و قتل موسیٰ کی بشارت حجاج کو لکھ بھیجی لیکن وہ اس سے خوش نہ ہوا کیونکہ موسیٰ قبیلہ قیس سے تھا۔ یہ واقعہ ۸۵ھ کا ہے جبکہ پندرہ برس ترمذ پر موسیٰ کو تصرف کرتے ہوئے گزر چکے تھے۔"[۱]

مذکورہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ شرر نے اس ناول کے واقعات میں بہت کم تاریخی تصرف کیا ہے۔ انہوں نے لعبت چین شہزادی نوشین اور قتاق خانم کا اضافہ کرکے واقعات میں دلچسپی پیدا کر لی ہے اور اس کے لیے انہیں طرخون کے بیٹے ارسلان کا کردار اور رقابت کا عنصر بھی تخلیق کرنا پڑا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس اور ناول کے انجام کے اعتبار سے موسیٰ کے انجام کے بارے میں اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ ہو سکتا ہے شرر کے پیش نظر کوئی ایسی روایت بھی ہو جس کی رو سے انہوں نے موسیٰ کے لباس میں قتل ہونے والے کو غلام بتایا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ موسیٰ خود چونکہ غلام کے لباس میں تھا اس لیے بچ نکلا اور اب چونکہ وہ گم نامی کی زندگی گزارنا چاہتا تھا اس لیے اس نے اپنا نام تک بدل دیا۔ اس کے لیے انہوں نے ناول کے پلاٹ میں بھی گنجائش پیدا کی ہے۔
اس ناول میں جو چیز سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ بعض سنین کا غلط اندراج ہے۔ ناول کا آغاز کرتے ہوئے شرر نے لکھا ہے کہ ۶۴ھ میں موسیٰ صغد میں پناہ گزین تھا، جب کہ تاریخ کی رو سے موسیٰ ۶۶ھ میں بھی اپنے والد کے پاس تھا۔ اس کے بعد (۶۴ھ کے واقعات کے فوراً بعد) شرر، عبداللہ بن خازم کی شہادت کی خبر سناتے ہیں جب کہ عبداللہ بن خازم ۷۲ھ میں شہید ہوئے۔ اسی طرح ایک دو اور مقامات پر سنین غلط ہیں۔

۲۰۔ عزیزہ مصر

"عزیزہ مصر" شرر نے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا۔ یہ ناول مصر میں امارت طولونیہ کے عہد سے متعلق ہے اور اس میں احمد ابن طولون اور خمارویہ بن احمد بن طولون کے دور کے واقعات مذکور ہیں۔ ناول میں بیان کردہ واقعات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ ابن خلدون: ترجمہ حکیم احمد حسن الہ آبادی، ج ۵، ص ۲۳۵ تا ۲۴۲، طبری کے یہاں بھی یہ واقعات اسی طرح اور اس سے زیادہ مفصل طور پر بیان ہوئے ہیں، ج ۵، ص ۳۹۶ تا ۴۱۲۔

۲۵۴ھ کا واقعہ ہے کہ مصر کا اعلیٰ افسر خراج (کلکٹر) کچھ متردد ہے کہ نیا والیٔ مصر احمد بن طولون انصاف پسند اور رعایا پرور ہے، اس لیے شاید رعایا ابن مبرد کی رشوت رستانی کی اس سے شکایت کر دیں اور وہ اسے برطرف کر دے۔ ابن مبرد حبشی نژاد تھا اور حرص و طمع کے علاوہ کبر و نخوت بھی اس میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ یہ منصور کا غلام تھا جس نے اسے نہ صرف آزاد کر دیا بلکہ اپنے دور ولایت مصر میں اپنے خلیفہ بھائی سے اس اسامی پر اس کے تقرر کا حکم بھی حاصل کیا اور اس وقت سے ابن مبرد اس عہدے پر برقرار تھا۔ وہ عوام کو خوب لوٹتا لیکن نہ صرف حاکم کو بلکہ مرکزی دارالخلافہ کو بھی نذرانے بھیجتا رہتا اس لیے اس کے خلاف کوئی شنوائی نہ ہوتی۔

ابن مبرد نے نئے والی احمد بن طولون کو بھی شیشے میں اتارنے کے لیے فیصلہ کیا کہ اسے ایک لاکھ دینار کا نذرانہ پیش کیا جائے۔ اس رقم کے حصول کے لیے اس نے اپنے مالک منصور کی مصریہ بیوی جولیانا کو یا کا جو عزیزہ مصر کہلاتی تھی اور اس کا شوہر منصور ایک خلیفہ کا بیٹا اور ایک خلیفہ کا بھائی ہونے کے باوجود موجودہ خلافت کا معتوب تھا۔ خلافت نے اسے اشتہاری مجرم قرار دے رکھا تھا۔ ابن مبرد اپنے مصاحبین سے اپنے منصوبوں اور پریشانیوں کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہا تھا کہ اسے عزیزہ مصر کی آمد کی اطلاع ملی۔ ابن مبرد نے اس کی دولت اور حسن کی تعریف شروع کی تو وہ متحیر ہوئی اور جب ابن مبرد نے اسے نقاب الٹ دینے کو کہا تو وہ برہم ہو گئی اور اسے سخت سست کہنے لگی۔ ابن مبرد نے جولیانا کو ایک دن کی مہلت پر پانچ لاکھ دینار اور وہ قیمتی قالین پیش کرنے کا حکم دیا جو منصور بغداد سے اڑا لایا تھا۔ عزیزہ مصر نے انکار کیا تو اس نے منصور کے گرفتار کر لینے کی دھمکی دی۔ اس کے بعد ابن مبرد نے جب مزید توہین آمیز زبان استعمال کی تو عزیزہ مصر بے قابو ہو گئی اور صدری کے اندر سے نمچہ نکال کر پہلے ہی وار میں اس کا ایک کان اڑا دیا، دوسرا وار کرنے سے پہلے ہی ابن مبرد کے مصاحب اور غلام درمیان میں حائل ہوگئے اور جولیانا کو گھیر لیا۔

جولیانا کے گرفتار ہوتے ہی معلوم ہوا کہ ابن طولون آ رہا ہے۔ ابن مبرد نے فوراً جولیانا کو تہہ خانے میں قید کے لیے بھیجا اور خود پٹی بندھوا کر استقبال کو دوڑا۔ ابن طولون اور اس کے درمیان انتظامی امور پر گفتگو ہوئی۔ ابن طولون نے شکایت کی کہ رعایا پر خراج کے معاملے میں سختی کی جاتی ہے۔ ابن مبرد نے کہا کہ وہ دو چار دن میں ایک لاکھ دینار نذرانہ پیش کرے گا۔ ابن طولون نے کہا پہلے اس نذرانے کے حصول کا ذریعہ بتائے۔ ابن مبرد بہت گھبرایا۔ اتنے میں ابن طولون کی نظر اس کے ترک غلاموں پر پڑی، اس نے ان کی تعداد دریافت کی۔ گفتگو ہو رہی تھی کہ بلوائیوں کا ایک گروہ اندر داخل ہوگیا اور انھوں نے ابن مبرد کو پکڑ کر پیٹنا شروع کر دیا۔ ابن طولون نے مداخلت کی، ماجرا سنا اور ابن مبرد کو حکم دیا کہ فوراً شہزادی عزیزہ مصر کو پیش کرے۔ لوگوں نے اس کے غلاموں کے ساتھ جا کر شہزادی کو تہہ خانے سے بےہوش حالت میں برآمد کیا۔ ہوش آنے پر شہزادی سے کیفیت سنی، اس نے بتایا کہ ابن مبرد اس کے شوہر منصور ابن المتوکل علی اللہ کا آزاد کردہ غلام ہے، شہزادی کو دھوکے سے بلا کر رقم کے لیے مجبور کر رہا تھا۔ ابن طولون نے شہزادی کو اپنے بیٹے خمارویہ اور اس کے آدمیوں کے ساتھ رخصت کیا۔ ابن مبرد نے بتایا کہ المنتصر نے جب اپنے والد خلیفہ المتوکل کو قتل کرایا تو اس نے منصور کو بھی مصر سے بلوایا۔ منصور نے ابن مبرد کے سپرد

یہ کام کیا کہ وہ جولیانا سے اس کی شادی کرا دے ۔ اسی خدمت کے صلے میں منصور بغداد سے ابن مبرد کے لیے پروانۂ امارت خراج لایا تھا ۔

ابن طولون نے سننے کے بعد فیصلہ کیا کہ بغداد سے ابن مبرد کے بارے میں حکم آنے تک وہ لوگوں کی قید میں رہے گا ۔ اس نے بلوائیوں سے اس کی تحویل کی رسید لے لی اور کوتوال شہر ابن دغنہ کو بلوا کر ابن مبرد کے زن و فرزند اور مال مکان اس کی حفاظت میں دے دیے ۔ اس فیصلے سے ابن طولون لوگوں میں فوراً مقبول ہوگیا ۔

گھر پہنچ کر جولیانا نے منصور کو تمام ماجرا سنایا اور استفسار کیا کہ امرائے بغداد منصور کے خلاف کیوں ہوگئے ہیں ۔ منصور نے بتایا کہ اس کے دادا معتصم باللہ نے غلطی سے ترک غلام جمع کرنے شروع کیے ۔ جب ان غلاموں نے رعایا کو ستانا شروع کیا تو اس نے ان کے لیے نیا شہر سامرہ آباد کیا ۔ معتصم کے بعد پانچ چھ سال تک اس کا بیٹا الواثق باللہ خلیفہ رہا ۔ پھر ۲۳۲ھ میں اس کا بیٹا جعفر متوکل (منصور کا باپ) خلیفہ بنا ۔ اس نے بڑے بیٹے محمد کو نظرانداز کرکے منصور کو والی مصر مقرر کیا ، محمد نے ترک غلاموں کے ساتھ مل کر متوکل کو قتل کرا دیا اور خود خلیفہ بن گیا اور المنتصر باللہ لقب اختیار کیا ۔ ایک موقع پر جب منصور بھی اپنے بھائی کے پاس بغداد میں تھا، اس نے جشن کا اہتمام کیا اور ایک ایرانی قالین منگوا کر بچھایا جس پر تاجدار عجم شیرویہ بن پرویز کی تصویر بنی تھی اور نیچے لکھا تھا "میں شیرویہ بن پرویز ہوں میں نے سلطنت کی ہوس میں اپنے باپ کو مار ڈالا مگر چھ ماہ سے زیادہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوا"۔ منتصر یہ پڑھ کر افسردہ و ملول ہوا ، اس نے قالین منصور کو دے کر فوراً مصر چلے جانے کا حکم دیا ۔ اس فقرے کے پڑھنے کے بعد سے خلیفہ بخار اور درد سر میں مبتلا ہوگیا ، طبیب خاص ابن طفور کو فصد کھلوانے کے لیے بلایا ، اس نے ایک ہزار اشرفی رشوت لے کر زہریلا نشتر لگا دیا جس سے المنتصر چل بسا ۔ پھر ترکوں نے متوکل اور مستنصر کی اولادوں کو محروم کرکے معتصم کے بیٹے احمد ابوالعباس کو المستعین باللہ کے لقب سے خلیفہ بنا دیا جو اس وقت برائے نام خلیفہ ہے اور سب کچھ ترک سردار کرتے ہیں ۔ اس کے بعد منصور اور جولیانا نے ابن طولون اور اس کے بیٹے کی دعوت کا اہتمام کیا ۔

عبدالعزیز بن مروان نے اپنی ولایت مصر کے زمانے میں فسطاط سے دو میل کے فاصلے پر نیل کے کنارے ایک خوب صورت باغ بنایا تھا جہاں آج کل خمارویہ تفریح میں مصروف رہتا اور اس کا شیر ببر زریق بھی ہمراہ ہوتا ۔ خمارویہ نے جس دن سے جولیانا کو دیکھا تھا اس کا عاشق ہوگیا تھا ۔ اس نے اپنے ایک عیار دوست جمیل سے مشورہ کیا تو اس نے بتایا کہ اگر ابن مبرد بچ جائے اور ابن دغنہ کو آلہ کار بنا لیا جائے تو جولیانا حاصل ہوسکتی ہے اور یہ کام جمیل نے اپنے ذمے لیا ۔

جمیل نے ابن دغنہ کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر اسے چالاکی سے باور کرایا کہ ابن طولون خود بھی ابن مبرد کو بچانا چاہتا ہے اسی لیے اسے لوگوں کی سپرد داری میں دیا ہے ۔ نیز امیر کو منصور سے کوئی ہمدردی نہیں صرف جولیانا کی دلداری کے لیے اسے ابھی تک بغداد نہیں بھجوایا ۔ اس کے بعد دو چار ملاقاتوں میں ہی اس نے ابن دغنہ کو شیشے میں اتار لیا اور اسے شہر والوں کو ابن مبرد کا طرف دار بنانے پر لگا دیا ۔ جلد ہی کئی با اثر تاجر ابن مبرد کے علانیہ طرف دار ہوگئے ۔ جمیل نے ابن دغنہ کے ذریعے ملک‌التجار ابوالحوفل دمیاطی سے بھی

راہ و رسم پیدا کر لی جس کے پاس ابن مبرد اسیر تھا ۔ اب ابن مبرد صرف قید تھا زنجیریں جمیل نے کھلوا دی تھیں ۔ پھر جمیل، ابن حوقل کے گھر میں ابن مبرد سے ملتا رہا، آخر ابن حوقل سے ایک درخواست خلیفہ کے نام لکھوائی کہ ابن مبرد کا جلد کوئی فیصلہ کیا جائے ورنہ وہ اسے رہا کر دے گا ۔ جمیل نے ابن مبرد کو خمارویہ کی آرزو سنائی، اس نے پورا کرنے کا وعدہ کیا ۔

ایک روز اچانک خبر مشہور ہوئی کہ ابن مبرد ابن حوقل کی قید سے نکل بھاگا ۔ لوگ شکایت لے کر امیر کے پاس گئے، اس نے کہا قیدی ان کی حراست میں تھا اس پر وہ لاجواب لوٹ گئے ۔ ابن طولون اپنی جگہ پر متردد تھا کہ اب وہ اس کے خلافت سے کشیدہ تعلقات سے فائدہ اٹھائے گا ۔ منصور اور جولیانا بھی پریشان تھے ۔ دو ماہ بعد جمیل نے خمارویہ کو بتایا کہ ابن مبرد بغداد سے منصور کی گرفتاری کے لیے لشکر لائے گا اور ابن طولون کے مزاحم ہوئے بغیر رات کو ہی منصور اور جولیانا کو گرفتار کر کے لوٹ جائے گا ۔ راستے میں ابن حوقل شہزادی کو خرید منگوائے گا اور خمارویہ کے پاس بھیج دے گا ۔

ابن حوقل کے غلام کافور نے ایک دن آ کر بتایا کہ ابن مبرد سکیم میں کامیاب رہا ہے، وہ ترک سرداروں باغر اور وصیف سے مل کر ایک ہزار بہادروں کے ساتھ آ رہا ہے، منصور جولیانا اور ان کی تمام دولت کو لے جائے گا ، اس کے بعد باغر فوج کشی کرکے ابن طولون کو سزا دے گا ۔ اس نے ابن حوقل کو پیغام دیا کہ وہ ابن مبرد کو رات جبل مقطم کی گھاٹیوں میں ملے ۔ ابن حوقل جب جمیل کے ہمراہ جبل مقطم کی گھاٹیوں میں پہنچا تو ابن مبرد جولیانا اور خوب صورت ترک کنیزوں کو مال و اسباب کے ساتھ لیے واپس آ رہا تھا ۔ اس نے بتایا کہ منصور اور وہ تاریخی قالین نہیں مل سکا ۔ اس کے بعد ابن مبرد اس قرارداد کے ساتھ روانہ ہوگیا کہ وہ عسقلان میں ٹھہرے گا، ابن حوقل خود آئے اور شہزادی سمیت کنیزیں خرید لے ۔

جولیانا کے اغوا کے ایک ہفتہ بعد باغر دس ہزار ترک سواروں کے ساتھ فسطاط پہنچا لیکن جبل مقطم سے نکلتے ہی اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مصری لشکر تیار کھڑا ہے ۔ مصری لشکر چار ہزار تھا ۔ جنگ شروع ہوئی ۔ لڑتے لڑتے رات ہوگئی، خمارویہ نے بیس شیر اور پچیس چیتے ترکوں پر چھوڑ دیے ۔ ترک بھاگ نکلے، باغر گرفتار ہوگیا ۔ ابن طولون نے باغر کو حکم دیا کہ وہ اسیرشدگان میں سے اپنے پانچ آدمی جہاں چاہے بھیج دے اور ان سے کہے کہ پندرہ دن کے اندر منصور، جولیانا، اس کے محل کے سب لوگوں اور دولت کو یہاں پہنچائیں ۔ اس نے باغر کو کڑی نگرانی میں تاریک قید خانوں میں رکھنے کا حکم دیا ۔

جمیل اور ابن حوقل نے اب خمارویہ کو بھی ابن طولون کے خلاف سازش میں شریک کر لیا، اسے مصر کی ولایت کے سبز باغ دکھائے اور کہا کہ باغر نہ لوٹا تو ابن مبرد جولیانا کو لے کر رو پوش ہو جائے گا ۔ طے پایا کہ خمارویہ قیدیوں کا معائنہ کرے، داروغہ سے کہہ دے کہ جمیل جس قیدی کو خمارویہ کے پاس لانا چاہے اس کے ہمراہ کر دیا جایا کرے ۔ ابن طولون کو معلوم ہوا کہ خمارویہ قیدیوں کو شیروں کے آگے ڈالتا ہے تو اسے اس نے غیر مستحسن قرار دیا، بالآخر ترک اسیروں کی حد تک داروغہ کو پروانہ لکھ دیا کہ جنہیں خمارویہ طلب کرے انہیں اس کے پاس بھیج دیا جایا کرے ۔

عسقلان میں آبادی سے باہر عین ساحل پر ابن حوقل اور ابن مبرد خیموں میں تھے ۔ ابن حوقل نے ابن مبرد کو باغر کی ناکامی کی تفصیل سنائی اور بتایا کہ خمارویہ سے مل کر انہوں

نے باغر کو چھڑا لیا ہے، دمیاط تک اسے کشتی میں لایا گیا تھا وہاں سے جمیل روئی کے جہاز میں اسے لا رہا ہے۔ جہاز پہنچا، باغر اور جمیل بھی ان سے آ ملے، روئی اترنے لگی۔ معلوم ہوا کہ جولیانا کو بھی دوسرے لونڈی غلاموں کے ساتھ شہر میں ٹھہرا رکھا ہے۔ اتنے میں کچھ لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا، باغر اور ابن حوقل زخمی ہوکر بھاگ نکلے، ابن مبرد اور جمیل مارے گئے۔ حملہ آور خود ابن حوقل کے ملاح اور ان کے ساتھی تھے۔ حاکم شہر یحییٰ بن موسیٰ آ پہنچے، حالات پوچھے، ابن شمسون نے تفصیل سنائی۔ اس نے داد دی اور شہر کی ناکہ بندی کرائی مگر معلوم ہوا کہ ابن حوقل جولیانا اور غلاموں کو لے کر غائب ہوگیا ہے۔

ابن شمسون اور ابوالہول یحییٰ کی ہدایت کے مطابق ابن طولون کو اطلاع دینے جا رہے تھے کہ کوہسار مقطم کی گھاٹیوں میں انھوں نے پرشکوہ جنازہ دیکھا، معلوم ہوا کہ ابن طولون کا انتقال ہوگیا ہے۔ چار پانچ روز بعد ابن مبرد کے قاتلوں کے نام کا ڈھنڈورا پٹوا کر اشتہاری مجرم قرار دیا گیا۔ ابوالہول وغیرہ نے خفیہ طور پر معلوم کیا تو پتہ چلا کہ باغر زخمی ہوکر بغداد پہنچا ہے اور اس نے خمارویہ کو حکم بھیجا ہے کہ مصر کی حکومت اور جولیانا کا وصال چاہتے ہو تو قاتلوں کو اسیر کرکے بغداد بھیجو۔ بغداد سے یحییٰ کی گرفتاری کے احکام بھی جاری ہوئے۔ ابوالہول اور اس کے ساتھیوں نے یک جہتی کا حلف اٹھایا اور سب خفیہ طور پر ایک کشتی کے ذریعے دمیاط اور وہاں سے جہاز میں شام کو روانہ ہوگئے۔

ادھر ابن حوقل راہبوں کا لباس پہنے سب لونڈی غلاموں کو اسی روپ میں لیے حاضر ہوا۔ ان میں جولیانا بھی راہبہ کے لباس میں تھی۔ سو راہبات تھیں جو دراصل سب لونڈیاں تھیں۔ خمارویہ نے ابن حوقل کو اس لباس کی داد دی۔ جولیانا نے خمارویہ سے ابن حوقل کی شکایت کی کہ وہ سازش میں شریک تھا۔ ابن حوقل نے کہا وہ منصور کی تلاش کرے گا اس لیے قصور معاف کر دیا جائے۔ شہزادی نے خاوند کے آنے تک اسی جوگنوں کے لباس میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ابن حوقل نے خمارویہ کو تنہائی میں بتایا کہ منصور کی تلاش محض ایک چکمہ ہے اس کی بغداد سے واپسی تک جولیانا خمارویہ سے مانوس ہوگئی تو وہ منصور کے قتل کی خبر سنا دے گا ورنہ کچھ ناامیدی کے کلمات کہہ کر پھر دو چار ماہ کے لیے نکل جائے گا۔ اب خمارویہ نے روزانہ شہزادی کو سیر شکار میں مصروف رکھ کر اس کے دل سے منصور کا خیال مٹانے کی کوشش شروع کر دی۔

ان واقعات کے تین ماہ بعد ابوالہول وغیرہ کو بیت المقدس میں ایک عیسائی سے معلوم ہوا کہ ابن حوقل عزیزہ مصر کو خمارویہ کے پاس پہنچا کر ایک ہفتہ ہوا خود بغداد کو گیا ہے، انھوں نے طے کیا کہ تین آدمی افریقہ میں منصور کی تلاش میں جائیں، دو وہاں رک کر ابن حوقل کی واپسی کا انتظار کریں، ایک بغداد جا کر دریافت حال کرے کہ ابن حوقل کس مشن پر گیا ہے۔ اس دوران مصر کے پانچ سو آدمیوں کو مختلف لوگوں کی طرف سے خط بھجوائے جائیں کہ خمارویہ عزیزہ مصر سے زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے، اس طرح شورش پیدا ہوگی اور خمارویہ خائف رہے گا۔ یہ بھی طے ہوا کہ ابن حوقل کو قتل کرکے مشہور کیا جائے کہ وصیف اور باغر نے قتل کرا دیا تاکہ بغداد و مصر کے تعلقات خراب ہو جائیں۔ ابوالہول ایک رفیق کے ساتھ وہاں ٹھہرا، ایک بغداد روانہ ہوا اور ابن شمسون دو رفیقوں کے ساتھ افریقہ چلا گیا۔

شہزادی کو وہاں ٹھہرے ایک برس گزر گیا، اس نے خمارویہ کی خواہشات کے سامنے

ہتھیار نہ ڈالے - ابن دغنہ نے بتایا کہ ابن حوقل کا خط آیا ہے کہ باغر وغیرہ بہت لالچی ہیں - رقم مانگتے ہیں اور ابن مبرد کے قاتلوں کی گرفتاری کے متقاضی ہیں - جلد ہی لشکر کشی کرنے والے ہیں - اس نے ترک افسروں کو رقم دے کر ساتھ ملایا ہے وہ خود بھی فوج کے ساتھ ہوگا - عین جنگ میں ترکوں کی اکثریت ان کے ساتھ مل جائے گی - اس مقصد کے لیے پانچ لاکھ دینار بھجوائے جائیں ، نیز فوج مرتب کر کے دمشق پہنچیں - خمارویہ نے سرداروں کو فوج مرتب کرنے کا حکم دیا - ابن دغنہ کو کہا کہ وہ عاملوں کو خط لکھیں کہ مصر میں شاہزادی کے بارے میں خطوط لکھنے والوں کو گرفتار کریں - ابن دغنہ نے بتایا کہ ابن مبرد کے قاتلوں نے افریقہ میں منصور کو ڈھونڈ نکالا ہے اور معلوم ہوا ہے وہ اسے لے کر آ رہے ہیں -

ان واقعات کے دو ماہ بعد دمشق کے باہر غوطہ دمشق میں وہ چھ دوست اور منصور یک جا بیٹھے تبادلہ خیال کر رہے تھے - ایک دوسرے کی کارکردگی اور حالات کا جائزہ لیا گیا - معلوم ہوا بغداد سے لشکر روانہ ہونے والا ہے اور مصر سے پچاس ہزار کا لشکر چل پڑا ہے - پھر انھوں نے اپنے آیندہ پروگرام کا خاکہ مرتب کیا - سب ابوالہول کی فرودگاہ پر چلے گئے - چند دن بعد دمشق کے مشرقی میدان میں دونوں لشکر آمنے سامنے تھے - عزیزہ مصر خاموش ہے اور خمارویہ اسے تسلی دیتا ہے کہ اس معرکے کے بعد وہ اسے منصور سے ملا دے گا جو افریقہ میں زندہ ہے - جنگ شروع ہوئی، ایک گھنٹے بعد ابن حوقل لشکر بغداد سے مصری جھنڈا لیے نکلا ، اس کے ساتھ نصف سے زیادہ ترک، لشکر بھی خمارویہ سے آ ملا - اس طرح بغداد کے لشکر کو شکست ہوئی - فتح کے بعد خمارویہ نے بغدادی لشکرگاہ کا معائنہ کیا ، لشکریوں سے خطاب کیا ، انعامات دیے ، تنخواہ میں اضافے کا اعلان کیا - ابن حوقل نے رات خمارویہ سے کہا آج شہزادی کو شادی پر مجبور کیا جائے کیونکہ لشکری آج خوش ہیں اور کوئی مداخلت نہ کرے گا - شہزادی کو بلایا تو اس نے کہا اسے منصور کی خیریت کا پیغام ملا ہے وہ دمشق میں ہے - خمارویہ نے کہا یہ غلط ہے وہ شہید ہو چکا ہے - پھر اس نے قاضی کو بلا کر زبردستی نکاح پڑھوا لیا - لشکر میں فوراً مبارک سلامت کی دھوم مچی - آدھی رات کو جب وہ حجلۂ عروسی میں گیا تو دلھن نے پہلے تو منہ نہ کھولا، پھر خود ہی وہ اس سے لپٹ گئی اور ایک ہاتھ سے خنجر اس کے سینے میں پیوست کر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا - جب وہ مر گیا تو اس نے دلھن کا لباس اتار کر غلاموں کا لباس پہنا - وہ دراصل شہزادی کی لونڈی قہرمانہ تھی جسے ناواقف مشاطاؤں نے دلھن بنا دیا تھا - شہزادی باہر غلاموں کے لباس میں موجود تھی - دونوں خاموشی سے چلتی ہوئیں لشکرگاہ سے باہر نکلیں جہاں منصور موجود تھا - قہرمانہ نے ہی یہ سارا انتظام کیا تھا - ابوالہول وغیرہ بھی آ گئے ، انھوں نے بتایا کہ ابن حوقل جب خمارویہ کے خیمے سے نکلا تو انھوں نے فوراً اسے قتل کر دیا - پھر وہ فوراً روانہ ہوئے - فسطاط میں پہنچ کر دربار کیا اور لوگوں کو مطلع کیا ، انھوں نے پورے تعاون کا یقین دلایا - دوسری صبح لشکری حیران رہ گئے - ابن حوقل اور خمارویہ کی لاشیں لیے خمارویہ کے بیٹے کو جانشین بنائے ہوئے لوٹے - شہر والوں نے انھیں اس شرط پر داخل ہونے کی اجازت دی کہ حکومت عزیزہ مصر اور منصور کی نگرانی میں ہوگی -

تحقیقی جائزہ

عزیزہ مصر کے پہلے چار ابواب میں شرر نے جو واقعات بیان کیے ہیں ان میں پہلی بات تو یہ کہ ابن مبرد مصر کا حاکم خراج تھا ، دوسری یہ کہ ۲۵۴ھ میں احمد بن طولون والی مقرر

ہو کر آیا ، تیسرے یہ کہ ابن مبرد کو منصور نے اپنے بھائی المنتصر کو کہہ کر حاکم خراج مقرر کرایا تھا اور اس وقت وہ خود امیر مصر تھا ، چوتھے یہ کہ یہ دور المستعین کی خلافت کا تھا ، پانچویں یہ کہ ترک اس قدر قوت حاصل کر گئے تھے کہ وہ خلیفہ گر بن گئے تھے ، چھٹے یہ کہ المتوکل علی اللہ کے قتل میں اس کے بیٹے المنتصر کا ہاتھ تھا اور وہی المتوکل کے بعد خلیفہ بنا ، ساتویں یہ کہ ۲۵۴ھ میں احمد بن طولون کے بیٹے خمارویہ کی عمر تقریباً سترہ برس تھی، اور آٹھویں یہ کہ حاکم خراج ابن مبرد بڑا ظالم تھا ، اس نے احمد بن طولون کو رشوت دینے کی کوشش کی لیکن اس نے نہ لی بلکہ اس کے وہ ترک غلام لے لیے جن کی بدولت اس کی آن بان قائم تھی ۔

یہ امر تاریخی اعتبار سے درست ہے کہ احمد بن طولون ۲۵۴ھ میں امیر مصر مقرر ہوا اور یہ بھی کہ اس وقت ابن مدبر مصر کا حاکم خراج تھا (شرر نے نام ابن مبرد لکھا ہے) ۔ ابن مدبر بہت راشی اور ظالم تھا ۔ یہ امر بھی صحیح کہ اس نے احمد بن طولون کو بھی نذرانہ دے کر اپنا ہم نوا بنانا چاہا لیکن اس نے نذرانہ قبول نہ کیا ، جس سے دونوں میں چپقلش شروع ہوگئی ، لیکن بالآخر ابن مدبر کو ہار ماننی پڑی اور یہ بھی صحیح ہے کہ ابن مدبر کی شان شوکت اس کے ترک غلاموں کی بدولت تھی جنھیں ابن طولون نے بڑی حکمت سے اس سے حاصل کر لیا ۔ اس ضمن میں کتب تواریخ کے بیانات یہ ہیں :

۲۵۴ھ میں مصر میں دولت طولونیہ کی بنیاد پڑی ۔ اس کا بانی احمد بن طولون تھا ۔[1] رمضان ۲۵۴ھ میں ابن طولون مصر میں داخل ہوا ۔ اس وقت یہاں کے حاکم خراج ابن مدبر کا مصر میں سکہ جما ہوا تھا ۔[2] ۲۵۴ھ میں جب ازجور حج کو چلا گیا تو معتز نے ابن طولون کو مصر میں امامت کے منصب پر مامور کیا ۔[3]

مقریزی کا بیان ہے کہ ابن مدبر بڑا بد دماغ اور بد طینت شخص تھا ۔ اپنے عہدے کو قائم رکھنے کے لیے اس نے ہدایا اور تحائف کے ذریعے ابن طولون کو ملانے کی کوشش کی لیکن ابن طولون اس سے بھی زیادہ عالی دماغ تھا ، اس نے واپس کر دیا ۔ اس سے ابن مدبر ابن طولون سے بدگمان ہوگیا اور شقیر خادم اور مصر کے عباسی نامہ نگار کو ملا کر بغداد میں اس کے خلاف سازش شروع کر دی ۔ ابن مدبر کی شان و شوکت غوری غلاموں سے قائم تھی ۔ ابن طولون نے انھیں حسن تدبیر سے اپنے یہاں بلا لیا ۔ ان کے ہٹتے ہی ابن مدبر کی ساری ہیبت جاتی رہی ۔ اس وقت اس نے ابن طولون کو مصر سے ہٹانے کی خفیہ کوشش شروع کر دی ۔ ابن طولون کو اس کا علم ہو گیا لیکن اس نے ابن مدبر پر اس کو ظاہر نہ ہونے دیا ۔ یہ معتز کی خلافت کا آخری زمانہ تھا ۔ اس کے بعد مہتدی خلیفہ ہوا ۔ اس نے مصر کے ساتھ اسکندریہ بھی اس کے متعلق کر دیا ۔ ابن طولون نے یہاں کے عامل اسحق بن دینار کو اپنے ماتحت کی حیثیت سے اس کے عہدہ پر برقرار رکھا ۔ اسکندریہ کی ولایت کے بعد ابن طولون کا وقار اور زیادہ بڑھ گیا ۔ ابن مدبر کو اس کا یہ اعزاز بہت شاق گزرا لیکن سوائے خاموشی کے کچھ نہ کر سکتا تھا ۔ چنانچہ آخر میں اس کو ابن طولون کے سامنے جھکنا پڑا ۔[4] مقریزی نے ابن مدبر کی سازش اور اس کے قید ہونے کے حالات بہت تفصیل سے لکھے ہیں ۔[5]

۱- ابن خلکان : ج ۱ ، ص ۵۵- ۲- مقریزی : خطط ، ج ۲ ، ص ۱۰۵ ؛ ابن اثیر : ج ۷ ، ص ۶۱ -
۳- الکندی : کتاب الولاۃ ، ص ۲۱۱ ، ۲۱۲ - ۴- مقریزی : ج ۲ ، ص ۱۰۵ ، ۱۰۶ -
۵- ایضاً : ج ۲ ، ص ۱۰۵ تا ۱۰۷ -

کندی کا بیان ہے کہ مصر کا شعبہ خراج ابن مدبر کے ہاتھوں میں تھا - ایک مرتبہ معتمد نے مصر کا خراج جلد بھیجنے کے متعلق ابن طولون کو تاکید کی، اس نے جواب دیا کہ خراج کا شعبہ دوسرے شخص کے ہاتھ میں ہے اس لیے اس حکم کی تعمیل سے قاصر ہوں - اس جواب پر معتمد نے مصر کا شعبہ خراج اور اس کے ساتھ شامی سرحدوں کی حفاظت بھی اس سے متعلق کر دی اور وہ مصر، اسکندریہ اور شام کی وسیع ولایت کا حاکم ہو گیا -[1]

منصور کا کردار شرر کا تخلیقی معلوم ہوتا ہے کیونکہ المتوکل کے بیٹوں میں اس نام کا کوئی بیٹا نظر نہیں آتا - المتوکل کے تین بیٹوں کے نام کتب تواریخ میں ملتے ہیں - المعتز، المنتصر اور موید - المتوکل نے خلافت کے لیے جانشینی کے سلسلے میں المنتصر کے مقابلے میں المعتز کو ترجیح دی تھی -[2] المعتز سے متعلق واقعات کو شرر نے منصور سے منسوب کر دیا ہے -

یہ امر تاریخی اعتبار سے درست ہے کہ المتوکل نے جب المعتز کو ولی عہد بنانا چاہا تو المنتصر نے باپ کی مخالفت شروع کی - المتوکل نے سر دربار المنتصر کو طمانچے لگوا کر اس کی اہانت کی - بعض کتب تواریخ کی رو سے المنتصر بھی اپنے باپ کے قتل کی سازش میں شریک تھا اور شرر نے المنتصر کی وفات کے بارے میں جو بیان دیا ہے اس کی بھی کتب تواریخ سے تصدیق ہوتی ہے کہ ابن طیفوری نے زہرآلود نشتر سے اس کی فصد کھولی جس سے وہ صرف چھ ماہ خلافت پر متمکن رہنے کے بعد مر گیا -[3]

اس امر کی بھی کتب تواریخ سے تصدیق ہوتی ہے کہ ترک غلام اور سپاہی اس قدر قوت حاصل کر گئے تھے کہ درحقیقت ترک سرداروں کو خلیفہ گر کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی -[4]

ابن طولون کے امیر بننے کے وقت خمارویہ کی جو عمر بیان کی گئی ہے ہو سکتا ہے وہ صحیح ہو لیکن اس کے بارے میں کوئی صحیح سن پیدائش نہیں ملتا - شرر نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ خلیفہ المستعین کا دور خلافت تھا - یہ امر تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں - ابن طولون المعتز کے عہد میں امیر مصر مقرر ہوا، المستعین اس سے تین برس پیشتر معزول ہو چکا تھا -

چھٹے باب میں "خلافت بغداد کی پولٹیکل حالت" کے عنوان سے المعتز سے پہلے کے کچھ تاریخی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ معتصم کو ترک غلام جمع کرنے کا شوق تھا جو بظاہر بڑے فرماں بردار تھے - رفتہ رفتہ ان کا پورا ایک لشکر بن گیا - انھوں نے عرب شرفا اور رعایا کو ستانا شروع کیا کہ معتصم کو ترک غلاموں کے لیے نیا شہر سامرہ آباد کرنا پڑا -[5] دوسرے یہ کہ معتصم کے بعد پانچ چھ سال تک اس کا بیٹا الواثق باللہ خلیفہ رہا - تیسرے یہ کہ ۲۳۲ھ میں واثق کی وفات پر معتصم کا دوسرا بیٹا یعنی واثق کا بھائی جعفر الملقب بہ متوکل علی اللہ تخت خلافت پر متمکن ہوا جسے اس کے بیٹے المنتصر نے ترک غلاموں باغر وغیرہ کے

۱- کندی : کتاب الولاۃ، ص ۲۱۳ تا ۲۱۷ -

۲- طبری و ابن اثیر : حالات بذیل سنہ ۲۳۵ھ ' ابن اثیر، ج ۷، ص ۲۹ -

۳- ابن خلدون : ج ۳، ص ۲۸۰ بعد ؛ یعقوبی : ج ۲، ص ۶۰۱ بعد : سیوطی : ص ۲۴۲ بعد -

۴- ایضاً - ۵- سیوطی : ۱۴۲ ؛ تاریخ الخلفا، ۳۴۰ بعد -

ساتھ مل کر ۲۴۸ھ میں قتل کروا دیا۔[1] شرر نے ناول میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دن المنتصر کے دربار میں ایک قیمتی ایرانی قالین بچھایا گیا جس پر شیرویہ کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس کے نیچے عبارت لکھی تھی کہ اس نے اپنے باپ کو مل کیا لیکن خود بھی حکومت پر زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ اس بیان کے سلسلے میں جلال الدین سیوطی کے یہاں روایت ملتی ہے اور یہ بھی کہ اس کے بعد المنتصر نے بیماری کی وجہ سے فصد کھلوائی اور ابن طیفوری نے زہر آلود نشتر سے فصد کھولی جس کی بنا پر المنتصر بھی شیرویہ کی طرح باپ کے قتل کے بعد صرف چھ ماہ حکومت کر کے مر گیا۔

آٹھویں تا گیارہویں باب میں کوئی امر تاریخی حقائق سے متعلق نہیں، ان ابواب کا بیشتر حصہ خیالی اور رومانی ہے۔ بارہویں باب میں شرر نے بیان کیا ہے کہ ابن مدبر کے فرار کے بعد سے باغر لشکر لے کر ابن طولون پر حملہ آور ہوا اور فسطاط پہنچ کر مقابلہ کیا۔ یہ واقعات بھی تاریخی اعتبار سے مستند نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مصر کی امارت پر متعین ہونے کے دس بارہ سال بعد ابن طولون نے دو تین جنگیں لڑیں، لیکن کسی جنگ میں بھی یہ صورت نہیں ہوئی کہ کسی لشکر نے احمد ابن طولون پر چڑھائی کی ہو اور مصر پہنچا ہو، بلکہ خود ابن طولون نے انطاکیہ اور دیگر شہروں کی طرف پیش قدمی کی۔ علاوہ ازیں اس باب میں بیان کردہ یہ امر بھی تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں کہ ۲۶۲ تا ۲۶۶ھ کے دوران کسی لسکر کی قیادت باغر ترکی نے کی کیونکہ باغر اس سے بہت عرصہ قبل ۲۵۱ھ میں قتل ہو گیا تھا۔[2] یہ امر ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ابن طولون کے امیر مصر مقرر ہونے کے وقت المعتز کی خلافت تھی نہ کہ المستعین کی، اس لیے اس امارت کے دس بارہ برس بعد بھی یہ ظاہر کرنا کہ المستعین باللہ ہی خلیفہ ہے بہت بڑا تاریخی سہو ہے، تیرہویں باب میں ابن طولون کی شوکت اور قوت کا جو بیان ہے کتب تواریخ اس کی تصدیق کرتی ہیں۔

چودھویں باب میں ابن طولون کے غلاموں کی شان اور خود ابن طولون کے مزاج کا ذکر ہے، پندرھویں باب میں بعض مقامات کا ذکر ہے جو جغرافیائی اعتبار سے درست ہیں۔ سولھویں باب میں کوئی تاریخی واقعہ نہیں۔ سترھویں باب میں ابن طولون کی اچانک وفات اور خمارویہ کے امیر مقرر ہونے کا ذکر ہے، ابن طولون کا انتقال ۲۷۰ھ میں ہوا۔ اٹھارہویں باب میں شرر نے لکھا ہے کہ خمارویہ امیر مقرر ہوگیا لیکن بغداد میں اس کے خلاف فضا تیار ہو رہی تھی۔ باغر بغداد میں وصیف سے مل کر خمارویہ کو دھمکی آمیز پیغامات بھجوا رہا تھا۔ یہ بات تاریخی اعتبار سے دوست نہیں۔ سطور ماقبل میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ خمارویہ ۲۷۰ھ میں ابن طولون کی وفات پر امیر مقرر ہوا اور باغر، ابن طولون کے امیر مقرر ہونے سے بھی پہلے ۲۵۱ھ میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح وصیف بھی ۲۵۳ھ میں باغی سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔[3] ان حالات میں شرر کے بیانات تاریخی اعتبار سے بے بنیاد ہیں۔

انیسویں تا بائیسویں باب کے واقعات ماسوائے چند مقامات کے ناموں کے تخیلی ہیں۔ تیسویں باب میں شرر نے دکھایا ہے کہ خمارویہ مصر سے لشکر جرار لے کر نکلا اور دمشق

۱- تاریخ الخلفاء ۳۴۶؛ طبری: ج ۳، ص ۹۸ ببعد۔ ۲- طبری: ج ۳، ص ۱۳۵ ببعد۔
۳- یعقوبی: ج ۲، ص ۶۱۴؛ طبری: ج ۳، ص ۲۴۹، ۲۵۰۔

کے باہر امرا کا عساکر خلافت سے مقابلہ ہوا - ترکوں میں سے ایک بڑا گروہ عین دوران جنگ خمارویہ سے مل گیا جس سے عساکر خلافت کو شکست ہوگئی - باغر اور وصیف بھاگ نکلے - اسی رات خمارویہ اپنے خیمے میں قتل ہوا -

اس باب میں بیان کردہ سارے واقعات تاریخی اعتبار سے بے بنیاد ہیں - سطور ماقبل میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ باغر اور وصیف، ابن طولون کی امارت سے بھی پہلے قتل ہو چکے تھے اس لیے تقریبا تیس سال بعد انھیں پھر میدان جنگ میں لانا محض ایک فرضی داستان ہے -

خمارویہ نے عساکر خلافت کے خلاف ۲۷۱ھ میں لشکر کشی کی تھی - اس سلسلے میں کتب تواریخ کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے : ابن طولون کے بعد اس کا لڑکا ابوالجیش خمارویہ باپ کا جانشین ہوا - اس کو (خلیفہ) موفق کی شام پر لشکر کشی کا خطرہ تھا - اس لیے احمد واسطی اور سعدالایسر کو فوجیں دے کر شام روانہ کیا - موفق خود بھی فوج لے کر بڑھا - قنسرین اور عواصم کے باشندوں نے دونوں مقام بغیر مزاحمت کے حوالے کر دے - دمشق میں مقابلہ ہوا لیکن موفق انھیں شکست دے کر شہر میں داخل ہوگیا - خمارویہ اس وقت مصر میں تھا - اس کو یہ خبریں ملیں تو وہ صفر ۲۷۱ھ میں شام پہنچا - فلسطین میں لب نہر دونوں کا مقابلہ ہوا - خمارویہ نے بھی شکست فاش کھائی اور فسطاط لوٹ گیا - اس کی واپسی کے بعد سعد الایسر خمارویہ کی محفوظ فوج لے کر بڑھا اور موفق کو شکست دے کر دمشق واپس لے لیا اور یہاں خمارویہ کا خطبہ پڑھا جانے لگا[۱]، اس کے بعد خمارویہ ذی قعدہ ۲۷۲ھ میں شام آیا اور ایک جرم میں سعد کو قتل کرکے محرم ۲۷۳ھ میں دمشق میں داخل ہوا اور اسحاق بن کنداجیق کو ناحروان میں شکست دے کر سرمن‌رائے تک اس کا تعاقب کرتا چلا گیا ، لیکن پھر فوجی افسروں نے دونوں میں صلح کرا دی اور اسحاق نے اپنے حدود حکومت میں خمارویہ کے نام کا خطبہ جاری کر دیا - اس کے بعد خمارویہ اور موفق میں بھی صلح ہوگئی اور موفق نے تیس سال کے لیے خمارویہ اور اس کی اولاد کے نام مصر و شام کی حکومت کا قبالہ لکھ دیا اور خمارویہ نے اس کے نام کا خطبہ جاری کر دیا -[۲]

شروع کے زیر بحث بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دمشق کے باہر جنگ خمارویہ کے قتل سے ایک روز پیشتر ہوئی - خمارویہ ۳ ذی الحجہ ۲۸۲ھ کو قتل ہوا اور سطور بالا میں جس جنگ کا ذکر ہے وہ ۲۷۱-۲۷۲ھ میں ہوئی - قتل سے ایک روز پہلے کی جنگ کا سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا کہ خلافت بغداد کے ساتھ اس کے اختلافات کا خاتمہ معتمد ہی کے زمانہ میں ہو چکا تھا - معتضد کے زمانے میں دونوں کے روابط میں اور ترقی ہوئی - خمارویہ نے معتضد کی تخت نشینی کی تبریک میں بیش قیمت ہدایا پیش کیے تھے - معتضد نے اس کے صلے میں مصر کے خراج کی باقی ماندہ رقم میں سے کل دو لاکھ دینار سالانہ کے حساب سے لے کر مزید تین لاکھ سالانہ پر فرات سے برقہ تک کی حکومت کا سی سالہ قبالہ خمارویہ اور اس کے لڑکے کے نام لکھ دیا اور ۲۸۰ھ میں بارہ پارچے کا خلعت ، تلوار ، تاج اور مالائے مروارید عطا کیا - ۲۸۲ھ میں خمارویہ کی لڑکی "قطرۃ الندی" (قطرہ شبنم) سے شادی کرکے طولونی خاندان کی عزت افزائی کی -[۳] اس لیے اس دور

۱- ابن اثیر : ج ۷، ص ۱۳۷، ۱۳۸ - ۲- کندی : کتاب الولاۃ، ص ۲۳۳ تا ۲۳۸-
۳- ایضاً: ص ۲۴۰ تا ۲۴۲ ؛ مقریزی : ج ۲ ، ص ۱۱۶، ۱۱۷ -

میں عساکر خلافت سے کسی جنگ کا سوال ہی خارج از تصور ہے۔

۲۸۲ھ میں خمارویہ کو اس کے غلاموں نے سوتے میں ذبح کر دیا۔[1] ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ناول کا تقریباً بشتر پلاٹ اور واقعات محض تخلیقی اور تخییلی ہیں۔

۲۱- جویائے حق

جویائے حق تین جلدوں میں شرر کا ضخیم ترین ناول ہے۔ یہ پہلی بار ۱۹۱۷ء، ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۱ء میں دل افروز میں بالاقساط چھپا۔ جویائے حق اپنی تکنیک اور زمانی پھیلاؤ کے اعتبار سے نہ صرف شرر کے ناولوں میں بلکہ اردو ناول نگاری میں ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ شرر نے ایک بہت وسیع کینوس کا انتخاب کیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اس میں تنوع ہے، اسے حضرت سلمان فارسیؓ کی سوانح بھی کہا جاسکتا ہے، خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور طلوع اسلام کے قبل سے لے کر حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے آغاز تک کی اسلامی تاریخ اورعربوں کی معاشرت کا مرقع بھی کہا جا سکتا ہے۔

شرر نے جس ہنروری سے ان سب پہلوؤں کو نباہا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ جس ترتیب یا انداز میں انھوں نے یہ ناول پیش کیا ہے اگر اسی ترتیب سے واقعات کی تحقیق اور ان کی بحث کی جائے تو طوالت اور خلط مبحث کا اندیشہ ہے، اس لیے ہم واقعات کو ان کی نوعیت کے اعتبار سے الگ الگ ترتیب دے کر بحث کریں گے۔ پہلے ہم حضرت سلمانؓ کی زندگی سے متعلق بیان کردہ واقعات کا جائزہ لیں گے، پھر اس عہد کی عام عرب معاشرت، سیاسی حالات اور عقاید، پھر طلوع اسلام سے آخر تک بیان کردہ تاریخی واقعات اور سیرت رسول مقبولؐ سے متعلق بیانات کا جائزہ لیں گے۔

شرر نے ناول میں حضرت سلمان فارسیؓ کی زندگی کے جو حالات و واقعات بیان کیے ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

حضرت سلمان فارسیؓ کا اصل نام ماہ بہ تھا، وہ علاقہ رام ہرمز کے شہر جبز میں (موجودہ اصفہان کے قریب) ایک پارسی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا والد بودرخشان اپنے گاؤں کا سردار تھا اور اس وقت کے ساسانی تاجدار فارس کا رشتہ دار تھا۔ عقیدے کے اعتبار سے وہ مجوسی تھا اور شہر جیز کے آتشکدے کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ماہ بہ بودرخشان کے اکلوتے ناز پروردہ بیٹے تھے۔ انھیں گھر میں ہی زرتشتی عقاید کی تعلیم دی گئی اور لڑکیوں کی طرح گھر میں ہی پالا گیا۔ ایک دفعہ مکان کی تعمیر میں والد کی مصروفیت کی وجہ سے ماہ بہ کو کھیتوں کی خبر گیری کے لیے جانا پڑا۔ راستے میں مسیحیوں کا گرجا نظر آیا، مسیحیوں کے جوش عقیدت کو دیکھ کر ماہ بہ بھی گرجے میں چلے گئے۔ مقتدا کے حسن سلوک اور عیسائیوں کے طریق عبادت سے متاثر ہوئے اور کھیتوں پر جانے کی بجائے شام تک وہیں بیٹھے رہے۔ ماہ بہ کو عیسائیت پسند آئی لیکن ساسانی قلمرو میں مجوسیوں کو عیسائی بنانے کی سزا موت تھی، اس لیے مقتدا نے مشورہ دیا کہ اگر ماہ بہ دین مسیحی قبول کرنا چاہتے ہیں تو ملک شام میں چلے جائیں۔ واپسی پر والد نے تاخیر کے بارے میں استفسار کیا تو ماہ بہ نے سچ سچ بتا دیا اور

۱- طبری: ج ۳، ص ۶۱۹ تا ۶۲۳۔

عیسائیوں کے طریق عبادت کی تعریف کی - اس سے والد کو اندیشہ لاحق ہوا اور ماہ بہ کو زنجیریں پہنا کر قید کر دیا گیا - اسیری کے دوران ماہ بہ کے بعض ہم سنوں کو ان کے پاس بھیجا جاتا کہ ماہ بہ کو مجوسیت کے برحق ہونے پر قائل کریں - ان میں سے ایک دو خود ماہ بہ کے ہم خیال ہو گئے اور انہیں کی وساطت سے مقتدائے نصاریٰ سے نامہ و پیام ہوا اور ایک دن ماہ بہ کو قید سے چھڑا کر ارض شام کی طرف جانے والے قافلے کے ہمراہ کر دیا گیا - اس وقت ماہ بہ کی عمر پندرہ برس تھی -

دو ماہ کی صحرا نوردی کے بعد ماہ بہ دمشق پہنچے اور مانطنوس فرقے کے سب سے بڑے مسیحی مقتدا لینوس سے مل کر اس کے پیروؤں میں شامل ہو گئے - ماہ بہ نے پہلے انہیں جتنا بے نفس اور بے ریا سمجھا تھا اتنا ہی ان میں مل کر ان کی ریاکاریوں کو دیکھ کر اپنی شمولیت پر افسوس ہوا - لینوس بہت خود غرض اور لالچی تھا، اس نے سونے چاندی کی مٹھوریں بھر رکھی تھیں - جب وہ مرا تو ماہ بہ نے اس کی ریاکاریوں کا انکشاف کیا - لوگوں نے ثبوت پا کر لینوس کی لاش کو سولی پر لٹکا کر سنگ باری کی اور یوحنا کو اس کا جانشین بنایا - چند روز بعد جب یوحنا مر گیا تو لوگوں نے ماہ بہ کو اس کا جانشین بنانا چاہا لیکن وہ نہ مانے بلکہ یوحنا کی وصیت کے مطابق موصل میں جیروم نامی عابد و مرتاض شخص کے پاس پہنچے، لیکن اس کی بے علمی نے ماہ بہ کی تشنگی کو اور بڑھا دیا اور وہ مارے مارے پھرنے لگے، پھر مانوی فرقے کے مقتدا سرزنہ سے ملے اور اس کے فرقے کے عقاید سیکھے - پھر جیروم کے بتائے ہوئے اسقف بطرس سے ملنے عموریہ گئے اور جب وہ بھی مر گیا تو انطاکیہ کے راہب بونی فیس کے پاس گئے - دس برس وہاں رہے اور اس کے مرنے پر اس کی وصیت کے مطابق بحیرا کے پاس بصریٰ گئے - اس طرح ماہ بہ ۱۵ برس کی عمر میں گھر سے نکل کر ستر برس سے زیادہ کی عمر تک حق کی جستجو میں سرگرداں رہ چکے تھے لیکن بحیرا نے خود بھی دلی بے اطمینانی کا اظہار کیا اور کہا کہ چالیس برس سے وہ ایک نئی رسالت کا منتظر ہے اور نجات کا راستہ یہی ہے کہ ماہ بہ جنوبی صحرا میں گھس کر اس شمع رسالت کو تلاش کرے جو قرین قیاس ہے کہ منور ہو کر نور پھیلا رہی ہو گی -

ماہ بہ بحیرا کی ہدایت کے مطابق بصریٰ سے روانہ ہو کر گرتے پڑتے شہر تبوک سے آگے بنی غسان کی سرزمین میں پہنچے، قوم ثمود کے آثار دیکھے، بنی کنانہ کے شیخ سے معلوم ہوا کہ دومة الجندل سے مشرق کی طرف دس فرسخ پر پہاڑ کے دامن میں چشمے کے کنارے بنی کلب کے خیمے ہیں - ان سے ایک فرسخ پر پہاڑ کی گھاٹیوں میں زکریا نامی سینکڑوں برس کی عمر کا بوڑھا مدتوں سے بالکل خاموش بیٹھا ہے - ماہ بہ زکریا کے پاس پہنچے تو اس نے کوئی توجہ نہ دی - ماہ بہ بھی قریب ہی مراقبے میں بیٹھ گئے - چوبیس گھنٹے تک مراقبے کی حالت رہی - آخر زکریا نے ماہ بہ سے کہا کہ اس کی روحانی زبردستیوں نے پچاس برس بعد زکریا کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا ہے - اپنی گفتگو میں زکریا نے ماہ بہ کے استفسار پر بتایا کہ اصل مسیحیت توحید ہے - پولوس نے ختنہ کو موقوف، خنزیر کو حلال اور مسیح کو خدا کا بیٹا بنا کر مذہب کو مسخ کر دیا، اب اصل مذہب کی آخری یادگار خود زکریا ہے - اس نے کہا کہ اب وہ دوسری صبح طلوع ہونے سے پہلے مر جائے گا تاکہ نئی نبوت کا سلسلۂ تبلیغ شروع ہوتے وقت یہ حجت پوری ہو کہ کوئی سچا پیرو مسیح باقی نہیں رہا - زکریا نے یہ بھی

کہا کہ مرنے کے بعد اسے غسل دے کر دفن کر دیا جائے اور پھر ماہ بہ ارض حجاز کو جائے ، نئے نبی کی پہچان یہ ہو گی کہ وہ مکہ چھوڑ کر یثرب جائیں گے ، ان کی پشت مبارک پر مہر نبوت ہو گی ، وہ ہدیہ قبول کریں گے لیکن صدقہ کی چیز خود نہیں لیں گے ۔ پھر زکریا نے ماہ بہ کو گواہ کر کے کلمہ توحید پڑھا اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا اقرار کیا ۔ اس کے بعد زکریا مر گیا ، ماہ بہ نے وصیت کے مطابق اسے غسل دے کر قبر کھود کر دفن کیا اور اس کی بکریاں لے کر بنی کلب میں آئے ۔

دو چار دن بعد بنی کلب کا ایک قافلہ مکہ جا رہا تھا ، ماہ بہ نے اپنی بکریاں قافلے کے سردار کی نذر کر کے ساتھ لے چلنے کی درخواست کی ۔ انھوں نے ماہ بہ کو ایک اونٹ پر بٹھا لیا لیکن وادی القریٰ میں پہنچ کر انھیں اپنا زر خرید غلام بتا کر شمعون نامی ایک یہودی کے ہاتھ بیچ دیا ۔ ماہ بہ نے یہودی کی اس غلامی میں سخت ترین اذیتیں برداشت کیں ، سخت مشقت کی اور یہودیوں کی مار بھی سہی ۔ وادی القریٰ میں اس غلامی کے زمانے میں ماہ بہ کو آنحضرت ؐ کی رسالت اور اس کے بعد کے حالات کا علم ہوا ۔ لوگوں سے انھیں یہ بھی پتہ چلا کہ آپ ؐ کے ساتھیوں نے مکہ سے یثرب ہجرت فرما لی ہے ۔ شمعون کی بیٹی ان دنوں یثرب میں تھی اور اس نے ایوب نامی یہودی سے شادی کے لیے آپ ؐ کے قتل کی شرط لگا رکھی تھی ۔ شمعون نے ماہ بہ کو یثرب روانہ کیا کہ وہ ہرڈویہ (بنت شمعون) کو اس کے ارادوں سے باز رہنے کی تاکید کر کے واپس لے آئے ۔ ماہ بہ یثرب پہنچے اور ایک دن ایوب کے باغ میں کھجوریں توڑنے میں مصروف تھے کہ آپ ؐ کی ہجرت یثرب کی خبر سنی ۔ ایک شام ماہ بہ اپنے آقاؤں سے چھپ کر قبا میں آپ ؐ کی خدمت میں پہنچے ، صدقے کے طور پر کچھ کھجوریں پیش کیں جو آپ ؐ نے خود نہ لیں بلکہ احباب سے کہا کھا لیں ۔ کچھ عرصہ بعد ماہ بہ کچھ کھجوریں لے کر پھر آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہدیہ کے طور پر پیش کیں ، آپ ؐ نے قبول فرمائیں ۔ ایک دن آپ ؐ ایک جنازے کے ساتھ قبرستان میں گئے ہوئے تھے کہ ماہ بہ نے موقع پا کر پشت مبارک پر خاتم نبوت دیکھی اور آپ ؐ کے قدموں میں گر پڑے ، اپنی روداد سنائی ۔ آپ ؐ نے سن کر پھر سب اصحاب کو جمع کر کے دوبارہ ماہ بہ سے حال سنانے کی فرمائش کی ۔ ماہ بہ اسی دن اسلام لے آئے اور بارگاہ نبوت سے سلمان نام پایا ۔ اس واقعے کے ایک ہفتے بعد جنگ بدر ہوئی ، جس کے فوراً بعد یہود بنی قینقاع کو معاہدے کی خلاف ورزی پر مدینے سے نکال دیا گیا ۔ حضرت سلمان رض نے وادی القریٰ میں جا کر آپ ؐ کے ارشاد کے مطابق شمعون سے مکاتبے کی بات کی ۔ شمعون نے چالیس اوقیہ سونا مانگا اور تین سو کھجور کے درخت اگانے کی شرط لگائی ۔ آپ ؐ نے اصحابہ رض کو پودے جمع کرنے کا اور حضرت سلمان رض کو گڑھے کھودنے کا حکم دیا ۔ گڑھے کھد گئے تو آپ ؐ نے اپنے دست مبارک سے پودے بٹھا دیے جو ایک ماہ میں اتنے بڑھے کہ سال میں نہ بڑھتے ۔ حضرت سلمان رض پھر حاضر ہوئے تو آپ ؐ نے سونے کا ایک انڈا ، جو کسی نے نذر کیا تھا ، حضرت سلمان رض کو دیا ، وہ اسے شمعون کے پاس لے گئے ۔ ہرڈویہ نے بد نیتی سے اسے پہلے چالیس، پھر اسی اور پھر سو اوقیہ کے باٹوں سے تولا لیکن وہ ہر بار بھاری رہا اور اس طرح مکاتبے کی رقم ادا ہونے پر حضرت سلمان رض کو غلامی سے نجات ملی ۔

حضرت سلمان رض آزادی پا کر استفانوس کے ساتھ مدینہ پہنچے تو مسلمان اس وقت آپ ؐ کی قیادت میں میدان احد میں داد شجاعت دے رہے تھے ۔ اس کے بعد حضرت سلمان رض کا قیام مدینہ

ں ہی رہا اور تمام واقعات ان کی نظر سے گزرتے رہے - ہجرت کے ساتویں سال جنگ خندق کے
قع پر حضرت سلمانؓ نے ہی خندق کھودنے کا مشورہ دیا تھا - حضرت سلمانؓ آنحضرتؐ کی
ں مہم میں بھی شریک ہوئے جو ہرقل کے خلاف روانہ ہوئی تھی لیکن رومی اسلامی لشکر
ے پہنچنے سے پہلے ہی بھاگ نکلے تھے اور آپؐ تبوک میں ایک ماہ قیام کر کے لوٹ آئے تھے -
ں کے بعد اس ناول میں حضرت سلمان فارسیؓ کی زبانی حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے ابتدائی
ور اور فتح بصریٰ تک کے حالات بیان ہوئے ہیں -

حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی کتاب محاضرۃ الابرار
یں دی گئی معلومات درج ذیل ہیں :

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سلمان فارسیؓ نے اپنے اسلام لانے کے حالات اس طرح بیان
یے ہیں کہ میں ملک اصبہان (اصفہان) کے ایک گاؤں کا باشندہ تھا۔[1] میرے والد[2] اپنے گاؤں کے ایک رئیس اعظم
ہے[3] اور دنیا میں کوئی چیز ایسی نہ تھی کہ جس سے اُن کو مجھ سے زیادہ محبت ہو - اُن کی زیادہ محبت میرے
ے وبال جان ہو گئی کیونکہ آدھر میں اُن کی نظر سے اوجھل ہوا اور ان کے میرے متعلق توہمات شروع
وئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے مجھ کو گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت کر دی، جس طرح لڑکیوں
و ممانعت کر دی جاتی ہے، اور میں نے اپنی زندگی مرد ہونے کے باوجود والد کی محبت کے ہاتھوں سے
نانہ انداز سے گزاری شروع کر دی - ہمارا خاندان مجوسی آتش پرست تھا، میں اپنی لا دینی کے زمانے میں
جوسیت میں سرگرم تھا اور اپنے معبود (آتش) کی خدمت میں رات دن اس طرح مصروف رہتا تھا کہ ہر
قت اس کو روشن رکھتا تھا -[4] رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں کسی گھنٹہ میں تو بڑی بات ہے کسی
یکنڈ میں بھی وہ بجھنے نہ پاتی تھی اور میری انتہائی اطاعت یہی تھی کہ میں سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے،
کھاتے پیتے، غرض کہ ہر وقت اس کا خیال رکھوں -

میرے باپ چونکہ اپنے گاؤں کے رئیس تھے اس لیے ان کے متعلق بہت سی جاگیریں بھی تھیں - ایک
قت انھوں نے ایک بڑے مکان کی تعمیر شروع کی - چونکہ کام بڑا تھا اور بہت سے معمار، مستری اور
زدور لگے ہوئے تھے اور اس کی تعمیر والد کی منشا کے موافق کرنے والا کوئی نہ تھا، اس لیے ان کو
ن میں متعدد دفعہ کھیت سے گھر اور گھر سے کھیت پر آنا جانا پڑتا تھا - بالآخر مجبور ہو کر ایک روز
جھ کو بلایا اور کہا : جان پدر! تم کو معلوم ہے کہ میں نے چند دنوں سے ایک مکان کی تعمیر شروع کی
ہے اور میں اس میں بہت زیادہ مشغول ہوں اور اس تعمیر نے مجھ کو حد سے زیادہ عدیم الفرصت کر رکھا
ہے - آج تک تو میں نے کسی نہ کسی طرح دونوں کاموں کو نباہا - کھیتی کی دیکھ بھال کی اور تعمیر
کان کی نگرانی بھی کی لیکن آج تو مجھ کو مکان پر رہنا ضروری ہے - اگر میں آج کچھ دیر کو بھی یہاں
سے غائب رہا تو خدا جانے یہ معمار کس قسم کی غلطی کریں اور میرے سارے کیے کرائے، دنوں کی
حنت برباد ہو جائے - اس لیے آج کھیت پر تم ہی چلے جاؤ اور وہاں کی دیکھ بھال تم ہی کرو - مگر وہاں
جا کر کسی اور تماشہ وغیرہ میں مصروف ہو کر دیر نہ لگانا ورنہ میری جان پر بن جائے گی - اس قدر
جھ کو اپنی جائداد کے خاک میں مل جانے کا صدمہ نہ ہوگا جس قدر تمہارے دیر میں آنے کی وجہ سے

۱- اکمال فی اسماء الرجال میں لکھا ہے کہ اصفہان کے مضافات رامہرمزجی کے باشندے تھے (ص ۷۰۵)،
معارج النبوۃ، اوصاف محمدی اور سیر الصحابہ کا بھی یہی بیان ہے اور شرر نے بھی یہی لکھا ہے -

۲- ان کے والد کا نام مختلف تاریخوں میں بوذ خشان، بو درخشان اور نور خشان وغیرہ آیا ہے -

۳- ابن حیان اور حاکم نے حضرت عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت سلمان ایک بادشاہ کے
بیٹے تھے - حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی فتح الباری میں یہی روایت نقل کی ہے - غالباً بادشاہ سے مراد
کسی قبیلے اور علاقے کا سردار اور رئیس اعظم ہے -

٤- اوصاف محمدی کے مطابق اس کام کے لیے ایک ضعیفہ مجوسیہ بھی اُن کے ساتھ ہوا کرتی تھی (ص ۱۶۲)

تکلیف ہوگی اور اپنے تمام ضروری کاموں کو چھوڑ کر مجھ کو تمھاری خیریت معلوم کرنی ہوگی ۔
میں والد سے جلد آنے کا وعدہ کرکے ان کھیتوں کو جانے کے ارادہ سے گھر سے چلا کہ جن کا اہتمام میرے سپرد والد نے کیا تھا ۔ راستہ میں ایک گرجا پڑا۔ میں نے باہر سے عیسائیوں کی آوازیں سنیں، گھر سے باہر نکلنا تو عمر بھر میں فقط آج ہی نصیب ہوا تھا ، اس لیے دل نے تقاضا کیا کہ چل کر دیکھیے کہ اس خوبصورت عمارت کے اندر کیا ہو رہا ہے ۔ میں گرجا میں جا گھسا ۔ وہاں دیکھا کہ عیسائیوں کا بڑا مجمع ہے جو اپنے طریقہ کی نماز میں مصروف ہے ۔ میں چونکہ قیدیوں کی طرح گھر کے جیل خانے میں نظر بند تھا اس لیے مجھ کو اپنے معبود (آتش) کے سوا کسی اور چیز کی خبر نہ تھی ۔ گرجا میں اس طرح جا پہنچا جس طرح کوئی شخص عجائب خانہ میں پہنچتا ہے ۔ میں نے ان کو اور ان کی نمازوں کو بہت غور اور استعجاب سے دیکھا اور ان کے خضوع و خشوع کے انداز و بارگاہ خداوندی میں تضرع و الحاح ، خالق عالم کی حمد و ثنا ، غرض یہ تمام چیزیں دل نے بہت پسند کیں اور میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ خدا کی قسم یہ دین ہمارے دین سے بدرجہا برتر ہے ۔ اُن کی یہ عبادت مجھ کو اس قدر پسند آئی کہ نہ مجھ کو یہ خیال رہا نہ میں کہاں جا رہا تھا نہ یہ یاد آیا کہ والد سے جلد واپسی کا وعدہ کرکے آیا تھا ، نہ یہ پروا ہوئی کہ میرے انتظار میں والد پر کیا گزرے گی ۔ میں تو ان عیسائیوں کی نماز میں ہی محو تماشا رہا ۔ حتیٰ کہ سارا دن ختم ہو گیا اور میں گرجے سے باہر نہ آیا ، آفتاب غروب ہو گیا ۔ جب عیسائی اپنی اپنی نمازوں سے فارغ ہوئے تو میں نے ان سے باتوں میں دریافت کیا کہ تمھارے اس دین کا مرکز کہاں ہے ۔ انھوں نے کہا ہمارا مذہبی مرکز ملک شام ہے ۔

میں یہ سن کر واپس آیا ۔ والد میری اس تاخیر کی وجہ سے سخت پریشان ہو چکے تھے اور میری پریشانی میں ایک یا دو نہیں کئی آدمیوں کو میرا پتہ لگانے کے لیے روانہ کر چکے تھے ، اور میری پریشانی میں وہ اپنی ان ضرورتوں کو بھی بہ احسن وجوہ انجام نہ دے سکے تھے جن کے لیے مکان پر ٹھہرے تھے ۔ جب میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ پدرانہ انداز میں فرمانے لگے : لخت جگرم ! کیا تم ہم سے وعدہ کرکے نہ گئے تھے کہ ہم جلد از جلد واپس آئیں گے ؟ بتاؤ کہ تم اب تک کہاں تھے ؟ میں نے ان سے واقعہ کو مخفی رکھنا پسند نہ کیا اور صاف صاف کہہ دیا : ابا جان ! میں یہاں سے چلا تو راستے میں ایک گرجا ملا ۔ اس میں میں نے عیسائیوں کو نماز پڑھتے دیکھا اور اُن کا طریقہ عبادت مجھ کو بہت ہی زیادہ پسند آیا اور خدا کی قسم ان کی عبادت کے دیکھنے میں میرا دل ایسا مصروف ہوا کہ مجھ کو یہ خبر بھی نہ ہو سکی کہ آفتاب کس وقت غروب ہوا ۔

والد یہ سن کر دیر میں آنے پر زجرو توبیخ کرنی تو بھول گئے اور اُن کو میری مجوسیت کی خیر منانی پڑی ۔ چنانچہ میرے دل سے عیسائیت نکالنے کی غرض سے قسم کھا کر کہنے لگے کہ عیسائیت تو کوئی عمدہ دین ہی نہیں ۔ حقیقت میں دین تو فقط وہی ہے جس کو تم اختیار کیے ہوئے ہو ، اور جو تمھارے آباو اجداد سے تم تک پہنچا ہے ۔ ان کی یہ باتیں میرے مشاہدے کو رد کرنے کے لیے کیوں کر کافی ہو سکتی تھیں ؟ اس لیے اُن کے جواب کو سن کر خاموش نہ رہ سکا اور فوراً بول اُٹھا کہ ابا جان ! یہ تو آپ نے صحیح نہیں فرمایا ۔ خدا کی قسم عیسائیت ہمارے دین سے بہت زیادہ فائق ہے ۔ والد نے جب عیسائیت کے استحسان پر اس قدر مصر دیکھا تو انھیں خوف ہوا کہ بیٹا ہاتھ سے نکلا ، اس لیے فقط گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت پر اکتفا نہ کیا بلکہ لوہے کی زنجیریں میرے پاؤں میں ڈال دیں اور اب اچھا خاصا قیدی بن گیا ۔

میں نے اپنی تمام عمر ناز و نعم میں گزاری تھی ۔ گھر کی ہر چیز کو اپنا تابع حکم دیکھتا تھا ۔ میرے غلام اور خدمت گار اس کے منتظر رہتے تھے کہ میں ان سے کسی کام کو کہوں اور وہ اس کی تعمیل سر آنکھوں سے کریں ۔ لیکن آدھر والد کی چشم محبت بدلی اور ادھر نوکر چاکر تو درکنار گھر کے در و دیوار بھی دشمن معلوم ہونے لگے اور سب سے زیادہ تکلیف دہ یہ کہ بھگوڑے جانور یا سرکش غلام کی طرح سے پا بہ زنجیر ۔ یہ تمام تکلیفیں تھیں مگر میرا قلب اس کی اجازت نہ دیتا تھا کہ جس دین کی عمدگی کا تجزیہ خود کر لیا ہے اس سے منحرف ہو جاؤں ۔

ایک روز موقع پا کر میں نے کسی کے ذریعے سے عیسائیوں سے کہلا بھیجا کہ اگر تم کو کسی

شامی قافلے کی آمد کا حال معلوم ہو جائے تو مجھ کو خبر کر دینا ۔ چنانچہ بمشکل تمام ان کی خبر مجھ تک پہنچ سکی کہ شامی قافلہ آیا ہے ، میں نے اُن سے کہلا بھیجا کہ جس وقت وہ لوگ اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر ملک شام کی واپسی کا ارادہ کریں تو مجھ کو روانگی کے ٹھیک وقت سے ضرور مطلع کرنا ۔ انھوں نے مجھ کو اپنا ہم مذہب سمجھ کر کسی پوشیدہ طریقہ پر اُن کی روانگی کے وقت کی اطلاع کی ۔ میں نے بمشکل تمام خود ہی ان زنجیروں سے رہائی حاصل کی اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور قافلے سے مل گیا اور انھیں کے ہمراہ ملک شام میں داخل ہو گیا ۔ وہاں پہنچ کر میں نے لوگوں سے تفتیش شروع کی کہ عیسائیت کا سب سے بڑا عالم کون ہے، چنانچہ بہت زیادہ چھان بین کرنے کے بعد گرجا کے ایک پادری کا حال معلوم ہوا ، جس کے زہد و تقویٰ پر اکثر شامیوں نے گواہی دی ۔ اس کی خدمت میں پہنچا اور اپنا حال اس سے کہا اور آخر میں اس سے یہ بھی کہا کہ میں نے عیسائیت کو خود اپنی رضا و رغبت سے قبول کیا ہے اور اب میں آپ کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ اس گرجا میں رہ کر آپ کی کفش برداری کا فخر حاصل کروں اور دین عیسوی کے مسائل معلوم کروں اور آپ کے ساتھ ہی بقیہ عمر عبادت میں گزاروں ۔ اس نے میری اس راستبازانہ درخواست کو منظور کرکے گرجا میں رہنے کی اجازت دے دی ، وہاں رہ کر مجھ کو کچھ اور ہی معلوم ہوا ۔ یعنی یہ کہ یہ شخص بظاہر کچھ اور باطن کچھ اور ہے ۔ لوگوں کو صدقہ دینے اور خیرات دینے کا وعظ کرتا ہے اور خیرات صدقہ کے عمدہ عمدہ بدلے سنا کر لوگوں کو صدقہ دینے کی رغبت دلاتا ہے لیکن لوگ جب چندہ کرکے اس کو مال اس غرض سے دیتے ہیں کہ وہ مصارف صدقہ سے زیادہ واقف ہے تو وہ خود اس کو گھر میں دبا رکھتا ہے اور فقرا اور مساکین کو اس میں سے ایک حبہ بھی نہیں دیتا ۔

میں گھر کا بھیدی تھا اور اس کی یہ ابلیسانہ کارروائی دیکھتا رہا ۔ کچھ دنوں کے بعد وہ مر گیا ، اس وقت میں نے اس کی کیادی (مکر و فریب) کا راز طشت از بام کیا اور تمام عیسائیوں سے اس کی برائیاں بیان کیں اور سننے والوں نے میری تکذیب کی تو میں نے کہہ دیا کہ اس میں جھگڑے کی بات ہی کیا ہے ۔ چلو میں تم کو اس کا خزانہ بتلاؤں۔ وہ ایک تارک الدنیا راہب تھا ، اس کے پاس خزانہ کہاں سے اور کیونکر آیا ؟ علاوہ ازیں اس میں تو تمام‌تر وہی چیزیں برآمد ہوں گی جو تم لوگوں نے اس کو صدقہ کرنے کے لیے دی تھیں ۔ عیسائیوں نے کہا کہ بے شک اگر یہ بات درست نکلی تو ہم تمھاری ان باتوں کو تسلیم کریں گے جو تم اس کی نسبت کہتے ہو ۔ میں اُن میں سے ذی عزت اشخاص کو لے کر اس جگہ آیا جہاں اس کا خزانہ مدفون تھا ، انھوں نے اس کو نکالا تو سارا مال اپنا دبا ہوا ہی جمع دیکھا ۔ جب وہ مال نکالا تو بڑے بڑے سات مٹکے سونے اور چاندی اور مختلف قسم کے زیورات سے بھرے ہوئے دیکھے ۔ یہ دیکھ کر اُن کو اس قدر غصہ آیا کہ اُن سب نے ایک زبان ہو کر کہا اور قسم کھائی کہ ہم اس کو دفن نہ کریں گے بلکہ اس کو سولی پر چڑھا کر پتھروں سے ماریں گے تاکہ آئندہ کسی اور کو ایسے قبیح کاموں کی جرأت نہ ہو چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا ۔

گرجا خالی ہو چکا تھا اور ضرورت تھی کہ مرنے والے پادری کا قائم مقام کسی کو بنایا جائے اور چونکہ ایک جو فروش سے دھوکا کھا چکے تھے ، اس مرتبہ زیادہ تحقیق و تدقیق منظور تھی ، اس لیے ایک عرصہ کے بعد اُن کو ایک پادری کا اعتبار آیا اور اس کو قائم مقام مرنے والے پادری کا بنایا ۔ میں نے عیسائیت کا بڑا عالم سمجھ کر اس کی بھی خدمت شروع کر دی جیسی کہ سابق مرنے والے پادری کی کیا کرتا تھا ۔ میں جوں جوں اس کی خدمت کرتا جاتا تھا دوں دوں میرا تجربہ اس کی عزت و عظمت میرے دل میں زیادہ کرتا جاتا تھا ۔ بالآخر مجھ کو یقین ہو گیا کہ جس قدر عباد و زہاد میں نے دیکھے تھے اُن میں سے کوئی شخص بھی نماز کے ادا کرنے ، دنیا سے بے رغبتی، آخرت کی رغبت میں اس سے بڑھا ہوا نہیں ۔ وہ شب و روز عبادت خداوندی میں مصروف رہتا تھا گویا کہ دنیا میں اطاعت خداوندی کے سوا کوئی دوسرا کام لے کر ہی نہ آیا تھا ۔ اس کی اس حالت نے میرے دل میں اس کی ایسی محبت پیدا کی کہ میں بسا اوقات گھنٹوں غور کیا کرتا تھا اور دل ہی دل میں کسی ایسی چیز کو ڈھونڈتا تھا کہ جس کی محبت مجھ کو اس مخدوم سے زیادہ ہو مگر کوئی بھی نہ ملتا تھا ۔ یہ زمانہ میرا زیادہ خوشحالی میں گزرا ۔ کچھ دنوں بعد وہ بیمار ہو

کر مرض الموت میں گرفتار ہوا ۔ میں اس کی ان گھڑیوں کو پہچان کر سخت مضطرب ہوا ، اگرچہ ہمت نہ ہوتی تھی مگر ایک دن دل کڑا کرکے اس سے کہہ ہی دیا کہ جناب آپ کو معلوم ہے کہ مجھ کو آپ سے اس قدر محبت تھی کہ دنیا کی کسی چیز سے اس قدر محبت نہ تھی ۔ اب تو آپ جوار رحمت خداوندی کے طالب ہیں اور بہت جلد مجھ کو چھوڑ کر دنیا کے مصائب کو خیر باد کہہ دیں گے مگر یہ تو بتائیے کہ آپ مجھ کو کس پر چھوڑے جاتے ہیں -

میری اس حسرت آمیز گفتگو کو سن کر اس کے آنسو نکل آئے اور کہنے لگا : عزیزم ! موجودہ زمانے میں دینداری عنقا صفت ہو گئی اور فسق و فجور کا بازار گرم ہو گیا ہے ۔ خدا کی قسم اس وقت میرے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں جو کہ صحیح طریقہ سے اس دین عیسوی پر قائم ہو جس پر میں قائم تھا ۔ دیندار تو برباد ہو چکے اور ان پر موت کا قابو چل گیا ، جو عیسائی زندہ رہے انہوں نے اپنی نفسانی خواہشوں کے موافق آسمانی احکام میں تغیر و تبدل شروع کر دیا ، اور جو آسمانی حکم ان کی طبیعت کے خلاف معلوم ہوا ، انہوں نے اس میں تراش خراش شروع کر دی ۔ ہاں اب یاد آیا ، ایک شخص جس کا نام فلاں ہے موصل میں رہتا ہے ، وہ بے شک اسی طریقہ پر ہے جس پر میں تھا ، میرے مرنے کے بعد تم اس کے پاس چلے جانا ۔

مرنے والے کے آخری الفاظ نے میری تسکین کی اور اس کی زندگی تک تو میں اسی خدمت کی کرتا رہا اور جب وہ مر گیا اور لوگ اس کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے تو میرا دل وہاں نہ لگا اور وہاں سے سیدھا موصل روانہ ہو گیا ۔ شبہا شب کے سفر نے مجھ کو جلد موصول پہنچا دیا اور پتہ لگاتے لگاتے اس پادری کے پاس آیا جس کے شوق خدمت نے مجھ کو کشاں کشاں موصل تک پہنچایا تھا ۔ میں اس سے ملا اور اپنا سارا حال اس سے کہہ کر کہا کہ شام کے فلاں پادری نے مجھ کو اپنے مرنے کے وقت نصحیت کی تھی کہ تم موصل کے فلاں پادری کی خدمت میں جانا اور انہیں کی خدمت گزاری کرنا اور مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ موصل کے فلاں پادری بھی اسی طریقہ پر ہیں جس طریقہ پر میں ہوں ۔

موصل کے اس پادری کو میری اس وارفتگی پر رحم آ گیا اور مجھ کو اپنے پاس ٹھہرنے کی اجازت دی ۔ میں اس کے پاس ٹھہر کر اس کی خدمت میں بھی اسی طرح مصروف رہنے لگا جس طرح اس سے پہلے پادری کی خدمت میں مصروف رہا کرتا تھا ۔ مجھ کو تجربے نے یہ بتا دیا کہ یہ شخص بھی پہلے پادری سے کسی طرح کم نہیں اور جو جو اوصاف شام کے پادری میں تھے ، قریب قریب تمام کے تمام اس میں دیکھے ۔ زیادہ دن نہ گزرنے پائے کہ اس پادری کی حیات مستعار نے بھی اس کو جواب دے دیا اور بظاہر آثار اس کا پیمانہ حیات لبریز معلوم ہونے لگا ۔ میں نے بالآخر اس سے بھی کہا کہ جناب شام کے پادری کی وصیت نے مجھ کو آپ کے سپرد کیا تھا اور آپ کی خدمت گزاری کی نصحیت کی تھی اب موت نے آپ کو بھی مجھ سے چھڑانے کا تہیہ کر لیا ہے تو اب آپ بتلائیں کہ میں آپ کے بعد کس کی خدمت گزاری کروں ۔ وہ بولا کہ خدا کی قسم شہر نصیبین میں ایک شخص کے سوا کسی دوسرے ایسے شخص کا حال مجھ کو معلوم نہیں جو اس طریقہ پر ہو جس پر میں تھا ۔ تم میرے مرنے کے بعد اس کے پاس چلے جانا ، اس شخص کا نام فلاں ہے ، اس سے تم کو دینی منافع ہوں گے ۔

مرض موت میں اس کی خدمت حد سے زیادہ کرتا رہا بالآخر جب وہ بھی مر گیا تو اس کے دفن کے بعد ہی نصیبین چلا آیا اور اس پادری کی جستجو کی جس کا نام مجھ کو بتایا گیا تھا ۔ جب اس کے پاس پہنچا تو اس سے بھی اپنی مصیبت اور ساری داستان سنائی ۔ آخر میں اپنے آخری مخدوم کی وصیت سنا کر اس سے درخواست کی کہ وہ بھی اس وصیت کا لحاظ کرکے اپنے پاس ٹھہر جانے کی اجازت میں بخل نہ کرے ۔ چنانچہ میری اس درخواست کو یہاں بھی شرف قبولیت بخشا گیا اور نصیبین کے اس زاہد پادری نے بھی اپنے پاس ٹھہرنے کی اجازت دی ۔ میں مکار پادری کو بھی دیکھ چکا تھا اور زاہد پادری بھی میری نظر سے گزر چکے تھے ، اس لیے میری نظر کو مردم شناسی کا اچھا خاصا ملکہ حاصل ہو گیا تھا ۔ میں اس پادری کی خدمت میں بھی شب و روز بجان و دل مصروف رہنے لگا اور تجربے نے بتا دیا کہ یہ بھی اپنے پیشروؤں سے کسی بات میں کم نہیں ، مگر میری تقدیر میرے ساتھ تھی ۔ یہاں بھی ٹھہر کر زیادہ دن نہ گزرے

تھے کہ اس پادری نے بھی سفر آخرت کی تیاری شروع کی اور وہ وقت زیادہ قریب معلوم ہونے لگا جس میں میری اور اس کی دائمی مفارقت ہو جائے۔

اس قسم کے واقعات مجھ پر کئی گزر چکے تھے اس لیے ان کے آخری چند لمحوں میں میں نے اپنے اس مخدوم سے بھی کہا کہ میرے بزرگوار! وصیت در وصیت ہوتے ہوتے میں آپ تک پہنچا تھا۔ اب آپ بھی مجھ کو چھوڑ کر چلے تو خدارا یہ تو بتاتے جائیے کہ آپ کے بعد میں کس کا دامن پکڑوں اور آپ کے بعد کیا کروں؟ اس نے کہا عزیز من! سر زمین روم میں ایک مقام عموریہ ہے، اس میں ایک پادری بہت زیادہ صاحب ورع و تقویٰ ہے۔ اس شخص کے سوا میرے علم میں ایک شخص بھی ایسا نہیں کہ جس کے پاس جا کر رہنے اور خدمت گزاری کرنے کی وصیت تم کو کر سکوں۔ اس شخص کا طریقہ ہمارا سا ہے، اگر تمہارا دل یہی چاہے کہ تم کسی نہ کسی کی خدمت گزاری ہی کرو تو اس کے پاس چلے جانا، میں اس وقت تک تو اسی کے پاس رہا جب تک موت کے زبردست ہاتھوں نے اس سے مجھ کو جدا نہ کر دیا۔ لیکن اس کی تجہیز و تکفین کے بعد مجھ سے نصیبین میں ایک گھڑی بھی گزاری نہ جا سکی اور میں دفن کرنے کے بعد ہی جانب عموریہ روانہ ہو گیا۔

عموریہ کے پادری کے پاس پہنچ کر میں نے اس کو بھی رام کہانی سنائی اور اجازت و اقامت کی درخواست کی اور درخواست یہاں بھی منظور ہوئی۔ میرے تجربے اور خدمت گزاری کے چند دنوں ہی نے بتلا دیا کہ مجھ کو نعم البدل مل گیا ہے اور یہ شخص بھی میرے انہیں مخدوموں کے صحیح طریقہ پر ہے جن کے استحسان کا میرا قلب عادی ہو چکا ہے۔ اس جگہ نسبتاً کچھ زیادہ عرصہ تک رہا اور میں نے کسب حلال کی کوشش بھی کی، اس کوشش کی وجہ سے میرے پاس چند گائیں اور چند بکریاں ہو گئیں۔

میری تقدیر یہاں بھی رنگ لائے بغیر نہ رہی اور تھوڑے ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ میرے اس مخدوم نے بھی سفر آخرت کا ارادہ کر لیا ہے اور جب آثار و علامات نے اس سفر کا یقین دلا دیا تو بالآخر اس سے بھی یہی کہا کہ جناب من! میں اولاً فلاں کی خدمت میں رہا، انہوں نے مجھ کو فلاں کی خدمت میں رہنے کی وصیت کی، انہوں نے مرنے سے پہلے فلاں شخص کے پاس رہنے کی وصیت کی، میں ان کے پاس رہا انہوں نے مرنے سے پہلے آپ کی خدمت گزاری کی وصیت کی۔ اب آپ بھی تو میرے لیے کوئی ٹھکانہ تجویز کرتے جائیں۔

وہ بولے میرے عزیز دلبند! خدا کی قسم میرے علم میں تو اس وقت صفحۂ ہستی پر کوئی شخص ایسا نہیں جو کہ صحیح طریقہ سے اس دین عیسوی کا اتباع کرتا ہو جس پر ہم اور وہ لوگ تھے جن کی خدمت گزاری میں تم نے عمر عزیز کا بڑا حصہ صرف کیا ہے۔ ایسی حالت میں اب تم ہی بتاؤ کہ میں کس کی خدمت میں رہنے کی تم کو وصیت کروں۔ ہاں تمہارے لیے خوشی کی ایک بات ضرور ہے، وہ یہ کہ موجودہ زمانہ اس نبی کا زمانہ ہے جو دین ابراہیمی لے کر خدا کی طرف سے رسول بن کر تشریف لائیں گے۔ یہ نبی ملک عرب میں پیدا ہوں گے۔ ان کا اصلی وطن تو عرب کا کوئی اور شہر ہوگا مگر اس کو ترک کر کے ایک ایسی سر زمین کو وطن بنائیں گے جو دو پتھریلی زمینوں کے درمیان آباد ہوگی اور اس میں کھجور کے بہت سے باغات ہوں گے۔ ان کی نبوت کی علامتیں بہت کھلی اور صاف ہوں گی۔ من جملہ اور بہت سی علامتوں کے ایک علامت یہ ہوگی کہ اگر کوئی شخص ان کی خدمت میں بطور ہدیہ کوئی چیز پیش کرے گا تو وہ اس کو قبول کر لیں گے اور اس میں سے خود بھی کھائیں گے لیکن اگر کوئی چیز ان کے پاس صدقہ کے طور پر لائی جائے گی تو وہ خود اس کو نہ کھائیں گے۔ ایک علامت یہ بھی ہوگی کہ ان کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔ اگر تم سے ہو سکے کہ تم اس قدر طویل سفر برداشت کر کے وہاں جا سکو تو ضرور جانا۔ اس قدر کہنے کے بعد جان شیریں جان آفرین کے سپرد کر دی اور ان کی تجہیز و تکفین سے فراغت کے بعد میں کچھ دنوں عموریہ میں پڑا رہا۔ اس عرصہ میں مجھ پر ایک طرف اپنے اس مخدوم کی مفارقت بجلیاں توڑتی تھی اور اس کے کسی قائم مقام کی صحیح خبر نہ ملنے سے دل کو پارہ پارہ کرتی تھی تو دوسری طرف نبی کے ظہور کی بشارت ڈھارس بھی بندھاتی تھی اور میں اس فکر میں تھا کہ کسی طرح کوئی ایسی تدبیر ہو سکے کہ میں کسی قافلے کے ساتھ سر زمین عرب میں پہنچ سکوں۔

میں اس جستجو میں تھا کہ اتفاقاً مجھ کو معلوم ہوا کہ قبیلہ بنو کلب کے کچھ لوگ برائے تجارت یہاں آئے ہوئے ہیں اور وہ جلد از جلد واپس چلے جائیں گے - میں شدت اشتیاق کی وجہ سے ان کے پاس جا پہنچا ان سے درخواست کی کہ تم مجھ کو اپنے ہمراہ عرب کی سر زمین تک لے چلو، اس کے عوض میں تم کو اپنی یہ مملوکہ گائیں اور تمام بکریاں دے دوں گا - انھوں نے میری درخواست منظور کی اور میں نے اپنا تمام مملوکہ مال اس صلہ میں ان کے حوالے کر دیا اور ان کے ساتھ ہو لیا - یہ لوگ وادی القریٰ تک مجھ کو اپنے ساتھ چپ چاپ لے آئے لیکن وادی القریٰ میں پہنچتے ہی انھوں نے میرے ساتھ بے ایمانی کی اور یہ ظاہر کر کے کہ میں ان کا زر خرید غلام ہوں ایک شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا - میں چار و ناچار اپنے اس مالک کے پاس رہا مگر اسی زمانے میں میری نظر نے مجھ کو اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ یہ ملک وہی ہے جس کی مجھ کو تلاش تھی کیونکہ یہاں پر کھجوروں کے بکثرت باغ دکھائی دئے - بناء علیہ مجھ کو امید ہو گئی کہ یہ ملک وہی ملک ہے جس کی مجھ کو وصیت کی گئی تھی -

غلامی کا طوق میرے گلے میں تھا اور میں ذلیل سے ذلیل غلاموں کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا کہ اتفاقاً میرے مالک کا چچا زاد بھائی جو قبیلہ بنو قریظہ میں سے تھا ، اس کے پاس آیا اور مجھ کو اپنے کام کے قابل سمجھ کر میرے مالک سے مجھ کو خرید لیا اور اپنے ساتھ مدینہ لے آیا - میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مدینہ منورہ کو دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا کہ یہی وہ ملک ہے جس کا حال میرے کانوں نے اپنے آخری مخدوم سے سنا تھا - میں غلاموں کی طرح عمر بسر کر رہا تھا ، سوائے اپنے مالک کی خدمت کے دوسرا کوئی کام نہ تھا - اب وہ زمانہ آ گیا جس میں حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نبوت کا دعویٰ کیا اور جب تک خداوند عالم کی مشیت نے آپؐ کے لیے وہاں کی اقامت مقرر کر رکھی تھی اس وقت تک آپ نے وہاں اقامت کی مگر اس زمانہ میں میرے کانوں نے آپؐ کے متعلق کوئی بات نہ سنی ، اس کی دو وجہیں تھیں :

۱- میں غلام بنا لیا گیا تھا اور مالک کی ہر وقت کی خدمت اس کا موقع ہی نصیب نہ ہونے دیتی تھی کہ کسی سے کوئی بات کروں اور باتوں باتوں میں آپؐ کا ذکر آ جائے -

۲- مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا درمیانی فاصلہ مدینہ میں آپؐ کی شہرت کا مانع تھا جس سے مدینہ کے اکثر لوگ واقف ہو جائیں اور ہر شخص کے کان آپؐ کے دعوے سے آشنا ہو سکیں -

اس کے بعد وہ مبارک زمانہ آیا جس میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی- آپؐ کی ہجرت کا ابتدائی زمانہ تھا، میں اپنے مالک کے باغبانی کاموں میں لگا ہوا تھا ، میرا مالک درخت کے نیچے آرام کر رہا تھا (اور میں درخت خرما پر چڑھا تھا) کہ اتفاقاً میرے مالک کا چچا زاد بھائی اس کے پاس آیا اور کہنے لگا، خداوند عالم بنی اوس و خزرج کا برا کرے انھوں نے ایک عجیب حرکت کی ہے کہ سب کے سب مقام قبا میں ایک شخص کے ساتھ ہو لیے ہیں جو کہ آج ہی مکہ سے آیا ہے اور اپنے آپ کو خدا کا فرستادہ قرار دیتا ہے - میں نے اس کے یہ الفاظ سنے ہی تھے کہ میری عجیب حالت ہو گئی ، بالکل اسی طرح معلوم ہوا کہ مجھ کو بہت زور سے جاڑا چڑھا ہے اور میں بالکل بے اختیار ہو گیا اور قریب تھا کہ میں بہت زیادہ زور سے اپنے مالک پر گر پڑوں ، مگر میں نے بہت زیادہ ہمت کر کے اپنے آپ کو سنبھالا (اور درخت سے اتر کر) اور سنبھل کر اپنے مالک کے چچا زاد بھائی کی طرف متوجہ ہوا اور بصد ادب دریافت کرنے لگا کہ آپ ابھی کیا فرما رہے تھے - خدا جانے میری اس بات میں کون سی گستاخی مضمر تھی کہ میرے گنوار مالک کو سخت غصہ آ گیا اور ایک طمانچہ بہت زور سے میرے رسید کیا اور کہنے لگا کہ احمق ! تجھ کو ان باتوں میں دخل در معقولات سے کیا سروکار ، اپنے کام میں لگ - اس طمانچہ سے میرے تمام بدن میں رعشہ پڑ گیا اور میں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر فقط اس قدر کہنے پر اکتفا کی کہ ایک ضروری بات کی وجہ سے میں اس امر کو دریافت کر رہا تھا جو جناب کے چچا زاد بھائی نے کہی تھی ، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ میں تو کبھی آپ کے کسی کام میں بغیر آپ کے حکم کے دخل دیتا ہی نہیں -

یہ بات تو ختم ہوئی مگر میرے دلی شوق کی آگ کچھ زیادہ بھڑک گئی - میرے پاس اس غلامی میں چند چیزیں تھیں جن کو لے کر میں شام کے وقت آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا - آپؐ اس وقت قبا میں تھے

میں خفیہ طور پر اپ ص کی خدمت میں پہنچا تھا کہ آج دن میں تو آپ ص کے متعلق ذرا سی بات دریافت کرنے پر طمانچہ کھایا تھا ، اگر میری حاضری کی خبر ہو گئی تو خدا خبر وہ گنوار کس قدر جھلائے گا ۔ میں مسجد ہی میں آپ ص کے پاس جا پہنچا اور عرض کیا کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ ایک نیک شخص ہیں اور آپ کے ساتھ فقرا اور مساکین کا مجمع رہتا ہے ۔ میرے پاس کھانے کی فلاں فلاں چیزیں ہیں جن کو میں نے اس غرض کے لیے رکھ چھوڑا تھا کہ کسی کو بطور صدقہ دے دوں گا ۔ آپ لوگوں کے حالات جو کچھ مجھ کو معلوم ہوئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ لوگوں کے ہوتے ہوئے میں کسی اور کو یہ چیزیں دے دوں ، یہ کہہ کر میں نے وہ چیزیں آپ ص کی خدمت میں پیش کر دیں ۔

آپ ص نے اپنا دست مبارک تو ان میں ڈالا نہیں ، ہاں آپ ص نے اصحاب کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اس کو کھا لو ۔ میں نے اپنے دل میں اسی وقت کہا کہ یہ ایک علامت اور صحیح نکلی ۔ میں وہاں سے چلا آیا اور حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم قبا سے مدینہ منورہ تشریف لے آئے ، تو میں آپ ص کی خدمت میں اپنی چند چیزیں پھر لے گیا ، اور عرض کیا : میں نے آپ کی نسبت تجربہ کیا ہے آپ صدقے کا مال تناول نہیں فرماتے ہیں تو میں آپ کی خوشنودی مزاج حاصل کرنے کی غرض سے یہ چیزیں بطور ہدیہ کے پیش کرتا ہوں ۔ آپ ص نے یہ سنکر میری پیش کردہ چیزیں خود بھی کھائیں اور اپنے صحابہ کو بھی کھلائیں اور سب نے ساتھ مل کر کھائیں ۔ اس وقت میں نے اپنے دل میں کہا یہ ایک اور علامت صحیح نکلی ۔ خاتم النبوت کی ابھی اور تحقیق باقی تھی جس کی جستجو میرا دل کر رہا تھا ۔ چنانچہ ایک روز موقع پا کر آپ ص کی خدمت میں پھر حاضر ہوا ۔ اس وقت آپ ص کسی جنازہ کی تجہیز و تکفین کی غرض سے بقیع غرقد کے قبرستان میں تشریف فرما تھے ۔ آپ ص کے سر پر عمامہ تھا جس کے دونوں شملے پشت پر تھے ۔ میں نے آپ ص کو سلام کیا اور نظر بچا کر ذرا پیچھے کو گیا تاکہ موقع ہو تو خاتم نبوت کو دیکھ لوں، کیونکہ میرے آخری مخدوم کی بتائی ہوئی یہی ایک علامت باقی رہ گئی تھی ۔ پیچھے ہو جانے کی یہ حرکت آپ ص سے مخفی نہ رہ سکی اور آپ ص نے خداوند عالم کے دیے ہوئے نور فراست سے معلوم کر لیا کہ میں آپ ص کے متعلق کسی بات کی جانچ کر رہا ہوں ۔ چنانچہ آپ ص نے اپنی پشت مبارک سے ردائے مبارک کو نیچے گرا دیا ۔ پشت مبارک سے چادر ہٹتے ہی خاتم نبوت دکھلائی دینے لگی اور میں نے ٹھیک اسی طرح پایا کہ جس طرح میرے آخری مخدوم نے بیان کیا تھا ۔ اس کے بعد اب کونسی گنجائش باقی تھی کہ میں تاخیر کرتا ۔ اپنی ساری مصیبتیں سامنے آ گئیں ۔ اطاعت خداوندی کی غرض سے عزیز و اقارب، والد والدہ کو چھوڑ کر تنعم اور تعیش پر لات ماری، شہر بہ شہر کی خاک چھانی، رہی سہی مصیبت یہ کہ آپ ص ہی کی جستجو میں غلامی کی ذلت بھی برداشت کرنی پڑی ۔ اب اپنا مطلوب ملا بھی تو ایسی حالت میں کہ میں غلام ہوں ۔ مالک سن لے تو خدا جانے کیا کچھ نہ کرے، اور اگر کچھ بھی نہ کرے تو کم از کم آپ کی خدمت سے مہجوری تو ضروری ہے ۔ یہ خیال آنا تھا کہ میں آپ ص کے قدموں پر گر پڑا اور آپ ص کے دست و پا کو بوسہ دیا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر ایمان لے آیا ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری اس خود رفتگی کو دیکھ کر فرمایا کہ سامنے آؤ۔ میں سامنے آیا اور میں نے آپ ص کی خدمت میں سرگزشت از اول تا آخر بیان کی ۔ آپ ص نے تعجب کیا۔ میری ساری سرگزشت سننے کے بعد مناسب سمجھا کہ یہ سارا حال صحابہ کرام بھی سن لیں ۔ چنانچہ میں نے اُن کو بھی سنا دیا ۔ اس کے بعد آپ ص نے مجھ سے فرمایا کہ تم اپنے مالک کو اس پر راضی کر لو وہ تم سے کچھ روپیہ لے کر آزاد کر دے ۔ میں نے اپنے مالک سے ذکر کیا ۔ اس گنوار نے یہ دیکھ کر کہ اس سے منہ مانگا ملے گا، عجیب طرح طرح کی شرطیں لگائیں، پہلی شرط تو یہ تھی کہ تین سو دینار، چالیس اوقیہ سونا دوں، دوسری شرط یہ تھی جو پہلی سے بھی زیادہ سخت تھی کہ تین سو قلمی درخت کھجور کے دوں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب میرے اس معاملے کی خبر سنی تو صحابہ کو حکم دیا کہ وہ کھجور قلمی درخت جمع کریں ۔ آپ ص کے حکم میں دیر کیوں کر ہو سکتی تھی اسی وقت کھجور کے قلموں کا ذخیرہ جمع ہوگیا ۔ کسی نے تیس قلم پیش کیے کسی نے پندرہ، غرض یہ کہ جس سے جو کچھ ہو سکا وہ لے آیا ۔ اور تین سو قلم تھوڑی دیر میں جمع ہو گئے ۔ اس کے بعد آپ ص نے مجھ سے فرمایا کہ سلمان

ان کے لیے گڑھے کھودو تاکہ ان میں درخت لگائے جائیں اور جب گڑھے کھود کر فارغ ہو جانا تو مجھ کو مطلع کرنا میں اپنے ہاتھ سے درخت زمین میں لگاؤں گا۔

میں نے آزادی کی خوشی میں گڑھے کھودنے شروع کیے۔ صحابہ کرام رض نے اس میں بھی پوری امداد کی اور جب ان گڑھوں کے کھودنے سے فارغ ہو گیا تو میں نے آپ ص کو مطلع کیا۔ آپ ص خود تشریف لائے۔ ہم لوگ آپ ص کے دست مبارک میں ایک ایک قلم دیتے جاتے تھے اور آپ ص خود اپنے دست مبارک سے گڑھے میں ان کو رکھتے جاتے (اور ہاتھ سے مٹی ڈالتے) چنانچہ اُن تمام درختوں کو آپ ص ہی کے دست مبارک سے زمین میں لگائے جانے کا شرف حاصل ہوا۔ میں اس خالق اکبر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان تمام قلموں میں سے ایک بھی تو خشک نہ ہوا بلکہ سب کے سب ہرے ہو گئے۔

کھجور کے قلم تو اس طرح ادا ہوئے اب رہا سونے کا قصہ تو وہ یوں طے ہوا کہ آپ ص نے سونے کا ایک ٹکڑا جو شاید مرغی کے انڈے کے برابر ہو (اور یہ مال غنیمت سے لایا گیا تھا) لے کر فرمایا کہ سلمان کہاں ہیں؟ لوگ مجھ کو بلا کر لائے۔ آپ ص نے فرمایا کہ یہ سونا لو اور جو مال تمھارے مالک کا ہے، تمھارے ذمہ، اس کو اس سے ادا کر دو۔ میں نے دبی زبان سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلعم بھلا یہ اس وزنی قرض کو کیا ادا کر سکے گا، جو میرے مالک کا مجھ پر ہے (آپ ص نے بیضۂ مرغ کو لے کر زبان مبارک کو اس پر پھیر کر) ارشاد کیا کہ خدا کے بندے تم اس کو لو اور اسی میں سے اس کو ادا کرو۔ خداوند عالم اسی میں برکت دے گا اور اسی میں تمھارا قرض ادا ہو جائے گا۔ آپ ص کے فرمانے کے موافق میں نے اس کو لیا، اس کو وزن کیا تو خدا کی قسم اُن کا سارا قرض اسی میں ادا ہو گیا اور سلمان کو خداوند عالم نے غلامی کے بعد آزادی کی نعمت عطا فرمائی۔" (انتہی)[۱]۔

جوبائے حق میں اسلام سے پہلے عیسائیوں اور عربوں کے عقاید اور معاشرتی حالات سے متعلق جو بیانات ہیں اُن کا خلاصہ ہم سطور ذیل میں درج کر رہے ہیں اور اختصار کی خاطر ان واقعات کی صحت سے متعلق تاریخی حوالہ جات حواشی میں درج کر رہے ہیں۔ ناول میں دیے گئے واقعات کا خلاصہ یہ ہے:

اس عہد میں عیسائیوں کے غالب گروہ، مانی، آریوس اور نسطوریوس کے پیروؤں کے تھے۔ مانی نے تیسری صدی مسیحی میں مسیحیت اور مجوسیت کو ملا کر ایک نیا مذہب بنایا۔ وہ توراہ اور انبیائے سلف کی توہین کرتا، اپنے آپ کو مسیح کا فارقلیط موعود کہتا اور اپنی تصویر دار کتاب ارتنگ کو آسمانی کتاب قرار دیتا۔ مانی ۲۹۴ ق محمدی میں مجوسی تاجدار عجم کے حکم سے قتل ہوا لیکن اس کا بنایا ہوا مذہب پھیلتا رہا۔ دوسرا گروہ آریوس کے پیروؤں کا تھا۔ آریوس پکا مسیحی اور سچا پیرو مذہب تھا، وہ تثلیث کا منکر اور توحید کا زبردست حامی تھا، مگر نیقیہ کی کونسل تثلیث نے اسے ۲۴۶ ق محمدی میں ملحد و بے دین قرار دے کر جلا وطن کر دیا اور وہ بصریٰ میں آ رہا۔ قسطنطین نے اگرچہ چند روز بعد اس کا قصور معاف کر کے اسے واپس چلے آنے کی دعوت دی لیکن تثلیث پرست عیسائیوں نے ہر جگہ اس کے پیروؤں پر زندگی دشوار کر دی اور وہ سب بصریٰ کی طرف چلے۔ تیسرا گروہ نسطوریوس کے پیروؤں کا تھا۔ نسطوریوس اگرچہ آریوس کی طرح پکا موحد تو نہ تھا مگر مسیح کو انسانی کاموں کے ساتھ خدا نہ مانتا تھا اور نہ حضرت مریم ع کو خدا کی ماں جانتا تھا۔ شہر افسوس میں منعقد

۱۔ بحوالہ اعزاز علی دیوبندی، سلمان فارسی اور ان کا اسلام، (ص ۱ تا ۱۳)۔

یہی حالات سیرت ابن ہشام میں چھتیسویں باب میں حضرت سلمان کا اسلام کے عنوان سے عبداللہ بن عباس رض کی روایت سے درج ہیں جنھوں نے یہ حالات خود حضرت سلمان فارسی رض سے سنے تھے۔ (ص ۲۰۶ تا ۲۱۵، ترجمہ عبدالجلیل صدیقی و غلام رسول مہر)۔

ہونے والی تیسری مسیحی کونسل نے اسے بھی بے دین قرار دیا اور اس کے پیروؤں کو بھی پناہ کے لیے بصریٰ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اس کے ایک صدی بعد مانطنوس نے خود کو فارقلیط ظاہر کیا اور دو حسین جادو بیان عورتوں کو پیغمبرنیاں بنا کر ساتھ لیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ مسیح کی ہزار سالہ بادشاہی کا دور شروع ہونے والا ہے۔ ۱۵۰ء میں اس مذہب کے پیرو مجرم قرار پائے اور توبہ نہ کرنے والے واجب القتل ٹھہرائے گئے۔ ان کی اکثریت نے بھی بصریٰ میں پناہ لی اس طرح بصریٰ میں مختلف مسیحی فرقوں کے لوگ آباد تھے ان کے علاوہ یہودی، مجوسی، اور بت پرست بھی۔ سچی مسیحیت کے پیروؤں کا خیال ہے کہ سچے عیسائی مذہب کو پولوس نے مسخ کیا۔ اس نے خالص توحید کے بجائے حضرت عیسیٰ[ع] کو خدا کا بیٹا بنا کر تثلیث شروع کی، ختنہ کو موقوف کرا دیا اور خنزیر کو حلال قرار دے دیا، اس طرح مذہب کو اس نے اور بھی مختلف امور میں مسخ کیا۔ بت پرستوں نے اسلام کو صائبیت کے نام سے پکارنا شروع کیا تھا، دراصل صائبی مذہب عقلی دلائل سے کام لیتا تھا اور بابل میں بخت نصر اور اس سے پہلے کے بادشاہوں کا مذہب تھا۔ جب ویرس (سائرس) نے بابل کو ختم کیا تو کواکب پرستوں کا مذہب بھی ختم ہو گیا۔ بصریٰ کی خانقاہ کا ولی بحیرا اور انطاکیہ کی خانقاہ کا راہب اعظم یونی فیس مدرسہ علوم الٰہی میں ہم درس تھے، بحیرا نسطوریوس کا پیرو تھا اور نسطوریوس کے ایک شاگرد سنٹ آرین کے پاس بصریٰ میں چلا آیا۔ سینٹ آرین کے مرنے پر اس کا جانشین مقرر ہوا۔

عرب کی عام حالت اور عقاید کے متعلق ناول میں شرر کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

صحرائے عرب میں آبادی بہت کم تھی اور پیداوار بھی کم تھی۔ ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا لیکن حد درجہ کے مہمان نواز، شجاع اور دلیر تھے۔ قبائل اپنے شیوخ کا احترام اور فرماں برداری کرتے تھے، قبیلے کے افراد کا باہمی اتحاد مثالی ہوتا اور حلف قبائل ایک دوسرے کا ہر مرحلے پر ساتھ دیتے۔ یہ لوگ خود کو اسماعیل[ع] بن ابراہیم[ع] کی نسل سے بتاتے تھے اور انساب کے حافظ و ماہر تھے۔ وہ بت پرست تھے اگرچہ انھیں یہ معلوم تھا کہ جن لوگوں کی اولاد وہ خود کو بتاتے ہیں وہ بت پرست نہیں بلکہ توحید پرست تھے۔ ان لوگوں نے مختلف بزرگوں کی یاد میں بت بنا لیے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے۔[1] یہ بتوں کے لیے چوٹیاں رکھتے اور سر منڈاتے، بتوں کے نام پر اونٹوں کو سانڈ کرکے چھوڑ دیتے۔ سفر میں ہوتے تو دو چار گول پتھر ساتھ رکھ لیتے اور انھیں بتوں کا نمائندہ تصور کرکے سفر میں ان کی پرستش کرتے۔[2] ان میں حلال و حرام کا کوئی امتیاز نہیں تھا، جوا کھیلتے، شراب پیتے اور آزادی سے لوٹ مار کرتے[3] البتہ سال کے وہ چار ماہ ان امور اور قتل و غارت گری کے لیے حرام تصور کیے جاتے تھے جن میں لوگ خانہ کعبہ کے حج کے لیے آتے تھے۔ بعض قبائل میں باہمی یک جہتی اور مودت پر قسم ہو جاتی تو پھر وہ قبائل کی لڑائیوں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے۔ اس طرح طاقتور قبیلوں کا کمزور قبیلوں پر دباؤ رہتا تھا۔ عرب کی عورتیں بہادر تھیں اور میدان جنگ میں مردوں کو غیرت دلاتیں۔ مرد جتنی عورتیں چاہتے رکھتے لیکن بعض عورتوں کو بھی مردوں کو طلاق دینے کا حق حاصل تھا۔ لڑکوں کو ورثے میں باپ کی بیویاں اور حرم بھی ملتے۔

۱- ابن ہشام: ص ۸۰ تا ۹۰۔ ۲- ایضاً۔ ۳- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۶۲۔

شرفاء بیٹیوں کو باعث ننگ تصور کرتے ہوئے پیدا ہوتے ہی دفن کر دیتے ۔ ان میں حج کا جو طریقہ مروج تھا اس کے مطابق وہ بھی بے سلے کپڑے پہن کر طواف کرتے تھے ، سر منڈاتے ، طواف کرتے ، صفا و مروہ کے درمیان اچکسے پھرتے ، منیٰ اور مزدلفہ پر بعض ارکان حج ادا کرتے لیکن مکہ کے باہر سے جو لوگ حج کے لیے آتے اُن کے لیے ضروری تھا کہ وہ قریش کے دیے ہوئے کپڑے پہن کر طواف کعبہ کریں ۔ قریش ان کپڑوں کی انپی رقم وصول کرتے کہ اکثر لوگ ادا نہ کر سکتے ۔ ایسے لوگ جو قریش سے کپڑے نہ حاصل کر سکتے تھے وہ بالکل برہنہ طواف کرتے ۔

کعبہ کی حرمت و عظمت کا پورے عرب کو پاس تھا اور اصحاب فیل کے واقعہ کے بعد سے یہ عظمت اور بڑھ گئی تھی ۔ ہوا یوں کہ حبش کے مسیحی بادشاہ نجاشی نے اپنے سپہ سالار ابرہہ کے ذریعے یمن پر قبضہ کر لیا جو عرب کے جنوب میں ہے اور وہیں سے ملکہ سبا حضرت سلیمانؑ کے پاس آئی تھیں ۔ ابرہہ نے یمن میں ایک گرجا بنایا جس کی بہت شہرت ہوئی لیکن اُسے علم ہوا کہ عرب میں کعبے کی حرمت سب سے بڑھ کر ہے تو اُس نے اپنے گرجے میں جبری عبادت کا حکم جاری کیا ۔ ایک عرب نے گرجے میں جا کر اس کی توہین کی ۔ ابرہہ نے فیصلہ کیا کہ اپنے گرجے کے حریف کو ہی صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے ۔ وہ ہاتھیوں کا ایک بہت بڑا لشکر لے کر مکہ پر چڑھ دوڑا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب اس وقت سردار مکہ تھے ۔ ابرہہ نے مکہ کے نواح میں پہنچ کر اہل مکہ کے مویشی پکڑ لیے ، حضرت عبدالمطلب مویشی چھڑانے کے لیے ابرہہ کے پاس گئے، اس نے کہا تمھیں مویشیوں کا تو فکر ہے لیکن خانہ کعبہ کا فکر نہیں جسے میں ڈھانے کے لیے آیا ہوں ۔ حضرت عبدالمطلب نے جواب دیا مویشی میرے ہیں اس لیے مجھے اُن کی فکر ہے، خانہ کعبہ خدا کا گھر ہے اس کی فکر خدا خود کرے گا ۔ ابرہہ نے مویشی چھوڑ دیے اور وہ اس بات پر خوش تھا کہ اہل مکہ مداخلت نہیں کریں گے ، پھر اس نے ہاتھیوں کو بڑھایا لیکن وہ خانہ کعبہ سے ٹکر مارنے کی بجائے الٹے پاؤں پیچھے ہٹ آتے ، بہت دیر ابرہہ نے زور مارا لیکن ہاتھی نہ بڑھے ۔ اتنے میں چڑیوں کا غول نمودار ہوا جن کی چونچوں اور پنجوں میں کنکریاں تھیں، انھوں نے ابرہہ کے لشکر پر وہ کنکریاں برسائیں ، ان کنکروں کے لگنے سے سب کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں ۔ لشکر جب بھاگا تو چڑیوں نے تعاقب کیا اور سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا حتیٰ کہ خود ابرہہ بھی اُن کا نشانہ بنا ۔[1]

ان کے علاوہ ناول میں عرب سے متعلق شرر نے جو باتیں بیان کی ہیں وہ متفرق نوعیت کی ہیں مثلاً بعض قبائل کا باہمی حلیف ہونا ، ان کی عداوتیں وغیرہ ۔ مختصراً وہ یہ ہیں : قبیلہ بنی کنانہ کی سر زمین قدیم الایام میں عمالقہ کی تھی ، ان کا آخری حکمران سمیدع بن ہوثر تھا جسے حضرت موسیٰ کے بعد یوشع بن نون نے قتل ۔ یوشع کے بعد پھر عمالقہ کی حکومت قائم ہو گئی جس کا خاندان بنی ظرب بن حسان حاکم تھا ، انھیں میں سے مشہور ملکہ زبا بھی گزری ہے ، پھر اس سر زمین پر بنی قضاعہ آباد ہوئے، اس قبیلہ کے فرماں روا نسل سلیح کے لوگ تھے جنھیں طیطوس قیصر روم نے بیت المقدس تباہ کرنے کے بعد حاکم عرب بنایا تھا ۔ پھر اُن کے بنی عم ضجعمی حاکم ہوئے اُن کا آخری فرماں روا زیادہ بن ہمبولہ تھا جس سے بنی غسان نے

۱- ابن ہشام: ص ۴۰ تا ۶۳ ؛ رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۶۲ تا ۱۶۳ ۔

حکومت چھینی۔ بنی غسان کا مذہب مع تاجدار کے مسیحی اور نسطوری تھا اور شہر تبوک سے، جو رومیوں کے زیر اثر تھا ، ذرا آگے بڑھ کر عرب حاکم بنی غسان کی سر زمین شروع ہوتی تھی۔

یثرب میں رومیوں کے ظلم و ستم خوردہ بہت سے یہودی سام سے آکر آباد ہوئے تھے۔ اُن کے تین گروہ تھے بنی نصیر، یثرب کے شمال مشرق میں خیبر میں ، بنی قریظہ فدک نامی بستی میں اور بنی قینقاع یثرب میں آباد ہوئے۔ وادیٔ القریٰ کا بشتر علاقہ انھیں یہود کے پاس تھا۔ یمن کے عرب عاربہ یعنی آل قحطان کے معزز قبیلے حمیر کی نسل کے دو قبیلے اوس و خزرج بھی یثرب میں آ کر آباد ہوئے۔ اول اول تو یہود اُن کے آنے سے خوش ہوئے لیکن جلد ہی اُن میں لڑائیاں شروع ہو گئیں جن میں اوس و خزرج یہود پر غالب آ گئے۔ یہود کو اپنی آسمانی کتب کے ذریعے نبی آخر الزمان ؐ کی بعثت کا انتظار تھا اور اُن کا خیال تھا کہ وہ اُن کی اطاعت کریں گے اور اس طرح قوت حاصل کرکے اوس و خزرج کو دبا لیں گے' لیکن قدرت کو ایسا منظور نہ تھا ، اس لیے آپ ؐ پر ایمان لانے میں اوس و خزرج نے پہل کی اور یہود اوس و خزرج کی ضد میں اسلام سے بے بہرہ رہے اور دل میں آپ ؐ کی نبوت کی صداقت کا یقین ہوتے ہوئے بھی اسی پر اڑے رہے کہ اگر خدا کو نبی پیدا کرنا ہوتا تو اُن میں پیدا کرتا ، وہ صاحب علم اور صاحب کتاب تھے نہ کہ قریش میں سے ایک اُمی کا انتخاب کرتا۔

یوم ذی قار میں خسرو عجم نے عربوں سے شکست کھائی تھی اور جن خودوں اور زرہوں کے لیے جنگ ہوئی تھی وہ سرداران عرب میں تقسیم ہوئے تھے اور سارے قبائل انھیں پہچانتے تھے۔ بنی غطفان قریش کے قرابت دار تھے۔ بنی لخم کی ایک شاخ چشمہ مار معین کے کنارے آباد تھی ، اس چشمے کے نکلنے کی عام روایت اور اس کے لیے شاہان بنی غسان کی بار بار لشکر کشی لیکن بنی لخم کے حلیف قبائل کی وجہ سے قبضہ نہ کر سکنا وغیرہ ایسے متفرق امور عربوں کی معاشرت اور قبل اسلام تاریخ سے متعلق بیان ہوئے ہیں۔

سیرت رسول مقبول ؐ سے متعلق بیان کردہ واقعات میں پہلا واقعہ آپ ؐ کا حضرت ابوطالب کے ہمراہ لڑکپن میں تجارتی قافلے کے ساتھ جانا ، بصریٰ میں بحیرا کی خانقاہ کے قریب قافلے کا پڑاؤ ، بحیرا کا آپ ؐ میں نبوت کی نشانیوں کو پہچاننا ، آپ ؐ کے ساتھ ساتھ ابر کے ٹکڑے کا چھاؤں کرنے کے لیے حرکت کرنا اور بحیرا سے آپ ؐ کی گفتگو شامل ہے۔ بحیرا نے حضرت ابوطالب سے کہا کہ آپ ؐ کی کوئی ایسی شان جلد ہی ظہور میں آنے والی ہے کہ اگر یہودیوں نے آپ ؐ کو ابھی سے دیکھ کر پہچان لیا تو شاید نقصان پہنچانے کی کوشش کریں اس لیے آپ ؐ کی حفاظت کا خاص خیال رکھا جائے۔ یہ باتیں بحیرا نے الہامی کتب کی معلومات پر کہی تھیں۔

ابن ہشام نے ابن اسحاق کی روایت پر اس واقعے کو درست قرار دیا ہے۔[۲] محمد سلیمان سلمان (منصور پوری) نے اس واقعے پر تنقید کی ہے لیکن اسی تنقیدی بحث کے سلسلے میں حاشیے میں تقریباً یہ تسلیم کیا ہے کہ بحیرا نصرانی سے آپ ؐ کی لڑکپن میں ملاقات ہوئی۔[۳] البتہ اس پر عیسائیوں نے جو حاشیہ آرائی کی ہے اس سے نہ صرف قاضی سلمان منصور پوری بلکہ ہر صاحب عقل کے لیے بدیہی اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔

۱۔ ابن ہشام: ص ۲۲۲۔ ۲۔ ابن ہشام: ص ۱۷۳ تا ۱۷۷۔ ۳۔ رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۳۵، ۳۶۔

سیرت سرور کائناتؐ اور تاریخ اسلام سے متعلق جو دیگر واقعات ناول میں وقتاً فوقتاً بیان ہوئے آن کا مرتب خلاصہ اور حواسی میں ان سے متعلق تاریخی حوالہ جات درج ذیل ہیں :
آپؐ مکے کے شریف ترین گھرانے میں پیدا ہوئے ، اپنی شرافت و شائستگی اور تہذیب کی بنا پر تمام اہل مکہ آپؐ کے گرویدہ تھے۔ آپؐ حضرت عبدالمطلب کے پوتے تھے جو کعبہ کے متولی تھے۔ آپؐ کے والد حضرت عبداللہ آپؐ کی پیدائش سے چند ماہ پیشتر انتقال کر گئے تھے۔ زندگی کے ابتدائی ایام سے ہی آپؐ سب آل قریش کے لیے محترم تھے ، اپنی راست بازی کے لیے مثالی شہرت رکھتے تھے ۔ کعبے میں اس وقت سینکڑوں بت رکھے ہوئے تھے اور سب سے بڑا بت ہبل تھا، آپؐ کو شروع ہی سے بتوں سے نفرت تھی ۔ آپؐ اُمی تھے ۔ چالیس برس کی عمر میں آپؐ کو نبوت ملی تو آپؐ نے بت پرستی کے خلاف تبلیغ شروع کی، لوگوں کو بتوں کی بے حسی پر وعظ کرکے شرک کے انجام سے ڈرایا اور کہا کہ خانہ خدا کو ان نجاستوں سے پاک کریں ۔ اس پر آپؐ کے چند احباب تو فوراً ایمان لے آئے لیکن قوم نے، جو اس سے پہلے آپؐ کو انتہائی راست باز کہتی تھی (نعوذ باللہ نقل کفر، کفر نہ باشد) جھوٹا اور مکار کہنا شروع کیا ۔[1]
ایک دن آپؐ کوہ صفا پر گئے اپنے قبیلے کے لوگوں اور دیگر معززین کو بلا کر فرمایا کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑی کی دوسری طرف سے ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونے کے لیے آ رہا ہے تو ؟ انھوں نے کہا وہ تسلیم کریں گے کیونکہ آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں کہا ۔ اس پر آپؐ نے انھیں توحید کی دعوت دی اور آخرت کے عذاب سے ڈرایا، اس پر وہ برہم ہوئے[2] اور آپؐ کے ایک چچا ابولہب نے آپؐ کے دوسرے چچا ابوطالب سے کہا کہ یہ خود بڑا بننا چاہتے ہیں اس لیے بزرگوں کی تکذیب کر رہے ہیں ۔ اب آپؐ نے علانیہ تبلیغ شروع کر دی تو قریش مکہ نے حضرت ابوطالب کے پاس مختلف وقفوں میں دو وفد بھیجے اور دھمکی دی کہ وہ آپؐ کو یا تو سمجھائیں یا خود آپؐ سے الگ ہو جائیں ۔ حضرت ابوطالب نے آپؐ سے فرمایا تو آپؐ نے جواباً فرمایا کہ اگر قریش میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج لا کر رکھ دیں تو بھی میں تبلیغ حق سے منہ نہ موڑوں گا ۔ اس سے حضرت ابوطالب متاثر ہوئے اور ہر طرح کی حمایت اور مدد کا وعدہ کیا اور بنی ہاشم کو بھی آپؐ کی حمایت کے لیے آمادہ کیا ۔[3]
اب آل قریش آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو اذیتیں دینے پر اتر آئے ۔ آپؐ کو پتھر مارتے، خاک اڑاتے، ہجویں لکھتے، دھمکاتے اور عورتیں تک اس بغض سے باز نہ آئیں اور آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھا دیتیں ۔[4] ایک روز آپؐ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص نے گلے میں چادر ڈال کر کھینچ لیا، آپؐ گر پڑے اور آپؐ کے ایک دوست نے آ کر چھڑایا ۔[5]
ایک بار آپؐ خانہ کعبہ میں سربسجود تھے کہ کافروں نے اونٹ کی بھاری اوجھڑی لا کر پیٹھ پر رکھ دی اور تلواریں سونت کر کھڑے ہوگئے کہ جو ہٹانے کی کوشش کرے اسے قتل کر دیں ۔ آپؐ اس کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے کہ کسی نے حضرت فاطمہؓ کو خبر کی وہ دوڑتی ہوئی آئیں اور تلواروں میں گھس کر بڑی مشکل سے اوجھڑی کو آپؐ کی پیٹھ سے گرایا ۔[6] ان

١- ابن ہشام: ص ٢٧٩ -　　　٢- رحمۃ للعالمین، ج ١، ص ٦٠ -
٣- ابن ہشام: ص ٢٣٧ تا ٢٣٩، ٢٥٢؛ رحمۃ للعالمین، ج ١، ص ٧١ تا ٧٦ -
٤- رحمۃ للعالمین، ج ١، ص ٦٥ -　　　٥- ابن ہشام: ص ٢٨٠، ٢٨١؛ رحمۃ للعالمین، ج ١، ص ٦٥ -
٦- رحمۃ للعالمین، ج ١، ص ٦٥، ٦٦ -

ساری مشکلات اور اذیتوں کے باوجود راہ حق میں آپ ؐ کو ثابت قدم دیکھ کر قریش نے باہم مشورہ کرکے عتبہ بن ربیعہ کو آپ ؐ کے پاس بھیجا تاکہ وہ آپ ؐ کو حکومت، دولت اور خوبصورت عورتوں سے شادی کا لالچ دے کر بتوں کی تکذیب سے باز رکھے - آپ ؐ نے عتبہ کی باتیں سن کر جواب میں چند آیات پڑھیں ، وہ لاجواب ہو کر چلا گیا اور قریش سے آپ ؐ کی سچائی اور تعریف بیان کی -[1]

مسلمانوں پر جب کفار کی سختیاں بہت بڑھ گئیں تو آپ ؐ نے انھیں ہجرت کرنے کا حکم دیا - بحر قلزم کے پار حبشہ کا ملک تھا جہاں کا بادشاہ نجاشی بہت نیک دل اور عادل تھا - نجاشی کا مذہب عیسائیت تھا۔ حضرت عثمانؓ کی قیادت میں بہت سے مسلمان مرد و زن نے حبشہ کو ہجرت کی -[2] عربوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے نجاشی کے پاس ایک سفارتی مشن بھیجا تاکہ کچھ سن کر مسلمانوں کو وہاں سے نکلوا دیں - نجاشی نے سفیروں کا بیان سن کر مسلمانوں کو بلا کر اظہار لیا اور انھیں سچا قرار دے کر دشمنوں کو ذلیل کرکے نکلوا دیا -[3] اس واقعہ کے بعد ایک موقع پر ابوجہل نے (جو آپ کا چچا تھا) آپ ؐ کو رو در رو گالیاں دیں - آپ ؐ سن کر خاموش رہے - حضرت حمزہ (آپ ؐ کے چچا) کو معلوم ہوا تو بہت برہم ہوئے اور آپ ؐ کے پاس جا کر ایمان لے آئے -[4] مکہ میں اب ابوجہل بن ہشام اور عمر بن الخطاب دو شخص سب سے زیادہ با اثر اور آپ ؐ کے سب سے زیادہ دشمن تھے - آپ ؐ نے دعا فرمائی کہ خدایا ان میں سے ایک کو مسلمان کرکے اسلام کو تقویت دے۔ اسی دوران ابوجہل نے آپ ؐ کے قتل کے لیے ایک ہزار سرخ جوان اونٹ اور ایک ہزار اوقیہ سونے کے انعام کا اعلان کیا - عمر بن الخطاب اسی ارادے سے آپ ؐ کی طرف روانہ ہوئے۔ راہ میں ایک صحابی سے معلوم ہوا کہ خود عمر کی بہن اور بہنوئی بھی مسلمان ہیں - وہیں سے سیدھے بہن کے گھر لوٹے ، وہ اور اُن کے شوہر قرآن پاک پڑھ رہے تھے - عمر کو دیکھ کر انھوں نے تلاوت بند کر دی - عمر نے انھیں بہت زد و کوب کیا لیکن اس کے باوجود دیکھا کہ ان کی زبان پر کلمہ توحید جاری تھا - متاثر ہوئے ، اُن سے کلام پاک کی چند آیات سنیں اور اسی طرح شمشیر علم کیے بارگاہ رسالت میں پہنچے - دروازہ بند تھا کھٹکھٹایا تو لوگوں نے ان کو تلوار بے نیام کیے دیکھ کر خوف ظاہر کیا - حضرت حمزہ نے فرمایا دروازہ کھول دو اگر عمر بری نیت سے آئے ہوں گے تو اسی تلوار سے ان کا سر قلم کر دیا جائے گا - دروازہ کھلا آپ ؐ نے بڑھ کر عمر کا بازو تھاما اور پوچھا کیسے آئے - عمر پر رعب سے لرزہ طاری ہو گیا ، ادب سے عرض کیا اسلام لانے - حضرت عمر کے اسلام لانے سے اسلام کو بہت تقویت پہنچی، انھیں کے مشورے پر سب مسلمان خانہ کعبہ میں نماز ادا کرنے کے لیے اس شان سے گئے کہ آگے حضرت حمزہ و حضرت عمر تلواریں علم کیے ہوئے تھے - حضرت ابوبکر و حضرت علی آپ ؐ کے دائیں بائیں تھے - مشرکوں کو حضرت عمر نے کعبے سے نکال باہر کیا اور علانیہ سب نے نماز ادا کی - اسی دن سے حضرت عمر کو آپ ؐ نے فاروق کا

۱- ابن ہشام: ص ۲۸۳ تا ۲۸۵، رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۶۹، ۷۰ -
۲- ابن ہشام: ص ۳۲۲ تا ۳۳۳ - ۳- ابن ہشام: ص ۳۳۳ تا ۳۳۴، رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۶۷ تا ۶۸-
۴- ابن ہشام: ص ۲۸۱، ۲۸۲، رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۷۶ -

لقب دیا[1] -

اب مسلمانوں کی تعداد کافی ہو چکی تھی لیکن ان میں زیادہ تر غریب بے کس اور غلام تھے - غلاموں کو ان کے مالک تپتی بالو پر لٹا کر سینے پر سلیں رکھ دیتے اور اسلام ترک کرنے کا کہتے لیکن وہ یہ سب اذیتیں برداشت کرتے رہے حتیٰ کہ ان سے بعض نے یہ سختیاں سہتے سہتے جان جان آفریں کے سپرد کر دی اور بعض کو آپؐ کے صاحب حیثیت دوستوں نے خرید کر آزاد کر دیا -

حبشہ میں پناہ گزین مسلمانوں کو یہ غلط خبر پہنچی کہ مکہ میں مسلمانوں اور آل قریش کے درمیان صلح کا معاہدہ ہو گیا ہے -[2] یہ سن کر وہ سب اپنے وطن لوٹ آئے لیکن وہاں حقیقت برعکس تھی اور اب ان پر پہلے سے بھی زیادہ سختیاں ہونے لگیں، چنانچہ آپؐ کے حکم سے مسلمانوں نے دوبارہ حبشہ کی ہجرت کی اور اس بار تقریباً ایک سو مسلمان حبشہ گئے - اس کے فوراً بعد قریش نے ایک مشاورت کرکے بنی ہاشم سے مقاطعہ کا فیصلہ کر لیا - ایک عہد نامہ تحریر ہوا جس پر سب سرداروں نے دستخط کیے اور اسے خانہ کعبہ میں آویزاں کر دیا گیا - اب بنی ہاشم کے ساتھ لین دین بند ہو گیا چنانچہ حضرت ابوطالب بنی ہاشم کو لے کر ایک گھاٹی میں چلے گئے جس کا نام شعب ابی طالب پڑ گیا - تین برس اس گھاٹی میں سخت اذیتوں میں طلح کے پتے چبا چبا کر کاٹے - اس اثنا میں معاہدے کو دیمک چاٹ گئی اور بعض سرداران قریش کو خود ہی بنی ہاشم کی حالت پر رحم آ گیا اور یہ مقاطعہ ١٠ نبوی میں ختم ہوا -[3] اسی سال آپؐ کو دو بھاری صدمے اٹھانے پڑے، حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور حضرت ابوطالب چند ماہ آگے پیچھے اس دار فانی سے رخصت ہو گئے -[4]

اب آپؐ نسبتاً زیادہ بے یار و مددگار تھے لیکن اشاعت دین کا کام پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے ہونے لگا - آپؐ نے مکے والوں کی مخالفت کو دیکھ کر اپنے خادم زید بن حارث کے ساتھ دوسری بستیوں میں جانا شروع کیا - اسی سلسلے میں تین دن میں پچاس میل کا سفر طے کرکے آپؐ طائف پہنچے - اہل طائف نے آپؐ پر سنگ باری شروع کی اور آپؐ پتھروں کی بوچھاڑ میں خدا کا پیغام سناتے رہے حتیٰ کہ پنڈلیاں اور پاؤں لہولہان ہو گئے اور جوتے خون سے بھر گئے - زید آپؐ کو سہارا دے کر ایک باغ میں لائے - ایک یہودی کے کنویں سے پانی پینا چاہا لیکن اس نے منع کر دیا - اس حالت میں بھی آپؐ نے خدا سے اپنی قوم کی بہتری کے لیے دعا کی -[5] اسی برس آپؐ نے حضرت سودہ سے شادی کی، وہ بیوہ تھیں، ان کے خاوند مسلمان ہونے کی پاداش میں قتل ہوئے تھے -

اب آپؐ موسم حج میں دور دور نکل جاتے اور جہاں قافلوں کا پڑاؤ ہوتا ان سے مل کر دعوت اسلام دیتے - مکے کے شریر آپؐ کے پیچھے پیچھے لگے رہتے، جہاں آپؐ تبلیغ کرتے وہ لوگوں کو گمراہ کرتے - آپؐ وعظ کرتے وہ شور مچاتے، گالیاں دیتے، پتھر مارتے، لیکن آواز

١- ابن ہشام: ص ٣٤٣ تا ٣٥١، رحمۃ للعالمین، ج ١، ص ٧٧ - ٢- ابن ہشام: ص ٣٦٩، ٣٧٠ -
٣- ابن ہشام: ص ٣٥١ تا ٣٥٥ و ٣٧٦ تا ٣٨٤ -
٤- ابن ہشام: ص ٤٢٨ تا ٤٣١: رحمۃ للعالمین، ج ١، ص ٧٧ تا ٨٠ -
٥- ابن ہشام: ص ٤٣١ تا ٤٣٤، رحمۃ للعالمین، ج ١، ص ٨٠ تا ٨٣ -

حق ان کے دبائے نہ دبتی ۔ عربوں کو اپنی شاعری پر ہمیشہ سے ناز تھا لیکن جہاں آپؐ کلام الٰہی سناتے سب کو چپ لگ جاتی ۔[1] اسی سال یعنی ہجرت سے تین سال قبل یثرب سے چھ آدمی مکہ آئے اور مسلمان ہو کر لوٹے ، دوسرے برس حج کے موقع پر بارہ افراد آئے ، مسلمان ہوئے آپؐ نے نصیحتیں فرمائیں اور وہ یثرب لوٹ گئے یہ قبیلہ خزاج کے لوگ تھے ۔ تیسرے برس پچھتر آدمی مکہ آ کر آپؐ کے ہاتھ پر ایمان لائے اور آپؐ کو یثرب تشریف لانے کی دعوت بھی دی۔ قریش کو علم ہوا تو بہت برہم ہوئے، اس گروہ کا پیچھا کیا لیکن صرف ان کے ایک سردار کو پکڑ سکے جسے بعد میں مصلحتاً چھوڑ دیا ۔[2] اب چونکہ کفار مکہ کے مظالم حد سے بڑھ گئے تھے ، آپؐ نے مسلمانوں کو یثرب کو ہجرت کر جانے کا حکم دیا ۔ کفار نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان کسی امن کی جگہ میں جمع ہو کر قوت پکڑیں اور ان کے لیے خطرہ بن جائیں اس لیے ہجرت کرنے والوں کے مزاحم ہونے لگے جس کے نتیجے میں مسلمان ایک ایک دو دو کر کے چھپ کر یثرب چلے گئے اور مکہ میں آپؐ کے چند مخصوص ساتھیوں کے سوا کوئی نہ رہا اور یہ لوگ بھی چونکہ آپؐ کو تنہا نہ چھوڑنا چاہتے تھے اس لیے رکے رہے ۔[3]

مکہ مسلمانوں کی ہجرت سے اجڑتا جا رہا تھا ۔ کافروں نے دارالندوہ میں جمع ہو کر مشورہ کیا اور ابوجہل کی تجویز پر ہر قبیلے کا ایک ایک آدمی منتخب کر لیا تاکہ سب مل کر رات کو یلغار کر کے آپؐ کو قتل کر دیں اور کسی ایک قبیلے پر الزام نہ آئے کہ بنی ہاشم بدلہ لے سکیں ۔ آپؐ کو خداوند تعالیٰ نے کافروں کی سازش سے با خبر کر دیا چنانچہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو اپنی ردا میں سلا دیا اور خود مشرکوں کے نرغے سے نکل کر حضرت ابو بکر صدیقؓ کے یہاں پہنچے جہاں پہلے سے ہی سامان سفر تیار تھا ، اسی وقت یثرب کی راہ لی ۔ ایک شخص نے آپؐ کو جاتا دیکھ لیا ، کافروں کو خبر کی ، انھوں نے گھر میں گھس کر دیکھا تو حضرت علیؓ سو رہے تھے ، ابوجہل نے سو اونٹ انعام دینے کا اشتہار دیا چنانچہ مکے کے تمام گھروں ، گھاٹیوں ، وادیوں ، پہاڑوں اور غاروں کی تلاشی لی گئی۔ آپؐ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بچوں پر تشدد بھی کیا گیا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔

آپؐ مکہ سے نکل کر رفیق صادق کے ہمراہ غار ثور کے پاس پہنچے ، حضرت صدیقؓ نے غار میں جا کر جائزہ لیا ، اسے صاف کیا اور پھر جب آپؐ بھی اندر تشریف لے گئے تو مکڑی نے فوراً غار کے دہانے پر جالا تن دیا۔ دوسرے دن مکے والے تلاش کرتے ہوئے وہاں بھی پہنچے لیکن مکڑی کا جالا دیکھ کر کہا کہ یہاں کوئی نہیں ہو سکتا ۔ تین دن حضرت ابو بکر صدیقؓ کے گھر سے وہاں کھانا پہنچتا رہا ۔ تیسرے دن رات کو صدیق اکبرؓ کا غلام دو اونٹ لے آیا اور ایک پر آپؐ اور حضرت ابو بکرؓ اور دوسرے پر عامر بن فہیرہ اور عبداللہ بن اریقط سوار ہو کر روانہ ہوئے ۔[4] راستے میں سراقہ نامی ایک شخص آپؐ تک جا پہنچا ۔ اسے دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ نے خوف ظاہر کیا ، آپؐ نے تسلی دی ۔ سراقہ کے گھوڑے کے قدم زمین میں دھنس گئے۔

۱- ابن ہشام: ص ۴۳۵ تا ۴۴۱ -
۲- ابن ہشام: ص ۴۴۳ تا ۴۶۷؛ رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۹۴ تا ۱۰۲ -
۳- ابن ہشام: ص ۴۷۷ تا ۴۹۰؛ رحمۃ اللعالمین، ج ۱، ص ۱۰۲ تا ۱۰۵ -
۴- ابن ہشام: ص ۴۹۰ تا ۵۰۰ -

اس نے منت سماجت کی اور لوٹ جانے کا وعدہ کیا تو پاؤں آزاد ہوئے لیکن پھر بد عہدی کی اور اب کی بار پہلے سے بھی زیادہ دھنس گئے ، پھر منت کی اور کہا کہ راستے میں کوئی اور بھی ملا تو اسے واپس لے جائے گا ، آزاد ہوا اور اس نے ایسا ہی کیا ۔ مکہ کے قریب پہنچ کر ہمراہیوں کو اصلیت بتائی تو انھوں نے کہا سراقہ پر جادو چل گیا ۔[1] سراقہ کے بعد ایک شخص بریدہ بن الخصیب آپ تک پہنچا لیکن آپ کی چند باتوں سے ہی متاثر ہو کر اسلام لے آیا ، اپنے ساتھیوں کو بھی بلایا اور اب سب اس شان سے چلے کہ بریدہ نے اپنے نیزے پر اپنے عمامے کا جھنڈا بنایا ہوا تھا اور اس کے ساتھی جلوس کی شکل میں آپ کے آگے آگے تھے ۔ راستے میں ایک تجارتی قافلہ بھی ملا جس کے سالار حضرت طلحہ بن عبداللہ تھے ۔ انھوں نے بھی آپ کے ساتھ چلنا چاہا لیکن آپ نے فرمایا کہ قافلہ کو مکہ پہنچا کر لوٹو ۔ غرض آپ مدینہ سے دو میل کے فاصلے پر قبا میں پہنچے ، وہاں قیام کیا ، یثرب کے لوگوں نے حاضر ہو کر اطاعت کی، آپ نے قبا میں ایک مسجد تعمیر کی ، حضرت علیؓ بھی پا پیادہ سفر کرتے وہیں آ پہنچے ۔[2] جب آپ یثرب میں داخل ہوئے تو ہر کوئی چشم براہ تھا ، لڑکیاں دف بجا کر خوش آمدید کہہ رہی تھیں، ہر ایک کی خواہش تھی کہ آپ اسے میزبانی کا شرف بخشیں لیکن آپ نے فرمایا، اونٹ کی مہار چھوڑ دی جائے جہاں قدرت کو منظور ہوا رک جائے گا ۔ اونٹ ایک افتادہ قطعہ میں رک گیا اور وہاں سے نہ ہلا ۔ اس کے قریب حضرت ابو ایوبؓ کا گھر تھا، آپ ان کے مہمان ہوئے ۔ یہ افتادہ قطعہ زمین دو یتیم بھائیوں سہل و سہیل کی تھی ، انھوں نے مفت پیش کرنی چاہی لیکن آپ کے حکم پر حضرت ابو بکرؓ نے دس مثقال سونا دے کر اسے مسجد کے لیے خرید لیا ۔ آپ اور آپ کے رفقا نے مل کر وہاں ایک سیدھی سادی مسجد تعمیر کی جس کی چھت کھجور کی ٹہنیوں اور دیواریں کچے گارے کی اینٹوں کی تھیں ۔ مسجد کے گرد اہل بیت کے حجرے تعمیر ہوئے اور دو صحابی جا کر مکہ سے آپ کی صاحبزادیوں ، بی بی اور حضرت ابو بکرؓ کے اہل و عیال کو لے آئے ۔ آپ کی بدولت یثرب کا نام مدینۃ الرسول ہو گیا ۔[3]

مدینہ پہنچ کر آپ نے اوس و خزرج کے باہمی جھگڑے ختم کرائے ، مہاجرین سے مدینہ کے مسلمانوں کا بھائی چارہ کرایا[4] ، جس سے مہاجرین و انصار میں حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ محبت پیدا ہوئی ۔ ایک معاہدہ کیا جس کے مطابق تمام مسلمان ایک قوم قرار پائے ، صلح و جنگ کا اختیار ایک یا دو شخصوں کو نہ تھا ۔ یہود کو معاہدے میں شمولیت کے باعث مساوی حقوق اور کامل مذہبی آزادی ملی اور بیرونی حملوں سے ان کی حفاظت کا یقین دلایا گیا اور مدینہ پر حملے کی صورت میں یہود کو مسلمانوں کا ساتھ دینے پر پابند کیا گیا ۔ یہود کے قبائل بنو قریظہ و بنی قینقاع وغیرہ نے معاہدے پر دستخط تو کر دیے لیکن ان کی بد نیتی بدستور قائم رہی ۔[5] مدینہ میں عبداللہ بن ابی سلول آپ کی آمد سے پہلے با اثر سردار تھا ، وہ بظاہر تو مسلمان ہو گیا لیکن اندر سے اس کی دشمنی اور منافقت ہمیشہ قائم رہی ۔ اسی دوران ایک واقعہ یہ بھی ہوا کہ

۱- ابن ہشام : ص ۵۰۱ تا ۵۰۳ - ۲- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۰۶ تا ۱۱۶ -
۳- ابن ہشام : ص ۵۰۵ تا ۵۱۲؛ رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۲۰ تا ۱۲۳، ۲۵۱، ۲۵۲ -
۴- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۲۵۶، ۲۵۷ -
۵- ابن ہشام : ص ۵۱۶ تا ۵۲۹؛ رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۲۸ تا ۱۳۰ -

یہودیوں میں عبداللہ بن اسلام نامی ایک عالم تھا، اس نے حضورؐ کے پاس آ کر آپؐ کو غور سے دیکھا، پرکھا اور اسے آپؐ کی نبوت پر یقین آ گیا ، اسی کے مشورے پر آپؐ نے اسے چھپا کر بٹھایا اور یہود کو طلب کر کے پوچھا عبداللہ بن اسلام کیسا آدمی ہے ؟ انھوں نے کہا عالم فاضل ، دانا اور ان کا سردار زادہ ہے ۔ اس پر عبداللہ بن اسلام سامنے آ گئے اور یہود کے سامنے کلمہ توحید پڑھا لیکن یہود بجائے اس کی پیروی کرنے کے اسے برا بھلا کہتے ہوئے چلے گئے ۔[1]

یثرب کی آب و ہوا ناقص تھی ، اکثر بیماریاں پھیلی رہتیں ، آپؐ نے دعا فرمائی تو آب و ہوا اچھی ہو گئی اور بیماریاں دور ہو گئیں ۔ بنی قینقاع نے یہ مشہور کیا کہ جادو کر دیا گیا ہے اس لیے مسلمانوں کی اولاد نہ ہو گی اور اتفاق سے ایک سال تک کسی کے یہاں لڑکا نہ پیدا ہوا ، بعض مسلمان مشوش ہونے لگے تھے کہ حضرت زبیرؓ کے گھر بیٹا پیدا ہوا ، مسلمانوں نے خوشی منائی اور یہود کو یہ خوشی ناگوار گزری ۔ ان کی سازشیں اب زور پکڑنے لگیں ۔[2]

یہود مدینہ نے معاہدے کے باوجود قریش کو خفیہ خطوں کے ذریعے مدینہ پر حملے کی دعوت دی اور اپنی مدد کا یقین دلایا ۔ ان خطوں کی شہ پر ابو جہل نے آپؐ کو دھمکی آمیز خطوط بھیجے ۔ آپؐ نے حفظ ماتقدم کے طور پر مکہ اور مدینہ کے درمیانی قبائل کو ہم خیال بنانے کی مہم شروع کی ۔ ہجرت کے ایک سال کے بعد مکے کے راستے پر ابواء سے آٹھ میل پر دوران کے مقام پر گئے ۔ ہم نسب قبیلہ بنی ضمرہ بن بکر بن عبد مناف سے معاہدہ کیا ۔[3] ایک ماہ بعد کوہسار جہینہ تک سلبعی مہم پر گئے ۔ اس کے فوراً بعد قریش کا ایک شخص کرز بن جابر الفہری اہل یثرب کے مویشی چرا کر لے گیا ۔[4] دو ماہ بعد آپؐ نے پھر سفر کیا ، قبائل بنی کنانہ سے معاہدے کے لیے ذی العشیرہ گئے جو مکہ مدینہ کے درمیان ساحل ینبع کے قریب ہے ۔ بنی مدلج سے معاہدہ کیا ۔[5] اسی زمانے میں چند مسلمانوں کو ابواء کی طرف مقام رابغ میں بھیجا ۔ انھیں ایک قافلہ ملا جس میں دو مسلمان مقداد و عتبہ تھے اور انھیں مدینہ آنے کا موقع نہیں مل رہا تھا ، یہاں موقع پا کر مسلمانوں سے آ ملے ۔ اس دوران آپؐ نے عبد اللہ بن حجش کے ساتھ چند مسلمانوں کو مقام نخل میں بھیجا ۔ یہ سر سبز مقام مکہ سے ایک منزل تھا ۔ یہ لوگ وہاں حالات معلوم کرنے گئے تھے لیکن انھیں وہاں طائف سے میوہ جات لاتا ہوا اہل مکہ کا ایک قافلہ مل گیا ۔ انھیں اپنے مویشیوں کی چوری کا واقعہ یاد آ گیا اور وہ انتقاماً قافلے پر ٹوٹ پڑے ۔ قافلہ سالار عمرو بن الحضرمی مارا گیا ، دو اسیر ہوئے اور سب اسباب ان کے قبضے میں آ گیا ۔ مدینہ پہنچے تو آپؐ سن کر ناراض ہوئے ، اسیروں کو رہا کر دیا اور مقتول کا خون بہا اپنے پاس سے دیا ، لیکن اس کے باوجود قریش حملے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے ۔[6] اسی دوران قریش کا ایک تیس چالیس آدمیوں کا تجارتی قافلہ جس کا سردار ابوسفیان تھا شام سے مکہ جا رہا تھا ۔ ابو سفیان نے خائف ہو کر مکہ پیغام بھیجا کہ پوری قوت سے آ کر ان کی مدافعت کی جائے ۔[7]

۱- ابن ہشام : ص ۵۳۷، ۵۳۸ ' رحمۃ للعالمین' ج ۱، ص ۲۵۳، ۲۵۴ -
۲- ابن ہشام : ص ۶۳۳ تا ۶۳۸ - ۳- ابن ہشام : ص ۶۳۹ -
۴- ابن ہشام : ص ۶۵۲؛ رحمۃ للعالمین' ج ۱، ص ۱۳۲ -
۵- ابن ہشام : ص ۶۵۰؛ رحمۃ للعالمین' ج ۱، ص ۱۳۰ - ۶- ابن ہشام : ص ۶۵۳، ۶۵۵ -
۷- ابن ہشام : ص ۶۵۹، ۶۶۰؛ رحمۃ للعالمین' ج ۱، ص ۱۳۲ -

ابو جہل کو موقع مل گیا اور وہ پورے لشکر کے ساتھ چل پڑا ۔ اس لشکر میں ایک ہزار نبرد آزما ، سات سو اونٹ ، ایک سو گھوڑے تھے ۔ آپؐ کو علم ہوا تو یہودیوں کی بد عہدی کے خیال سے ایک دو منزل آگے مقابلے کے لیے نکلے ۔ آپؐ کے ساتھ ۳۱۳ جاں نثار (۷۷ مہاجر ۲۳۶ انصار) تھے ۔ اور سارے لشکر میں تین گھوڑے اور ستر اونٹ تھے ۔ سامان حرب بھی ناقص تھا ۔ آپؐ کی دعا پر خدا نے فتح کا یقین دلایا ۔ ابو جہل کو ابو سفیان کا پیغام ملا کہ وہ بخیریت مکہ پہنچ گیا ہے لیکن ابو جہل نہ مانا اور مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے بدر میں تین دن جشن منانے کا ارادہ کیا ۔ ابو سفیان بھی قافلے کو پہنچا کر آ ملا ۔ کفار بدر کے کنوؤں اور اچھی زمین پر قابض ہو گئے ، آپؐ نے ذخران کے مقام پر ہمراہیوں سے رائے لی تو انھوں نے عرض کی کہ ہم بنی اسرائیل نہیں کہ کہیں آپؐ اور آپؐ کا خدا لڑے ۔ یہ جواب چونکہ مہاجرین کی طرف سے تھا اس لیے آپؐ نے پھر سوال دہرایا تو حضرت سعد بن معاذ انصاریؓ اشارہ سمجھ گئے اور انصار کی طرف سے انھوں نے جواب دیا کہ وہ ہر حال میں آپؐ کے ساتھ ہیں ۔ بدر میں پہنچ کر آپؐ کو اور مسلمانوں کو بالو کے ٹیلوں پر ٹھہرنا پڑا جہاں گھٹنوں تک پاؤں دھنستے تھے ، تائید ایزدی شامل حال تھی ، بادل آئے ، مینہ برسا ، سب تازہ دم ہو گئے اور حوصلے بلند ہو گئے ۔ صبح صفیں درست ہوئیں تو کفار سے عتبہ ، اس کا بھائی ربیعہ اور عتبہ کا بیٹا ولید میدان میں نکل کر للکارے ، اہل یثرب میں سے تین اصحاب مقابلے کو نکلے لیکن انھوں نے طعنہ دیا کہ وہ کسانوں سے لڑنا کسر شان سمجھتے ہیں اور اپنے قریشی بھائیوں میں سے مقابل مانگتے ہیں ۔ چنانچہ آنحضرتؐ کے دو چچا حضرت حمزہؓ و حضرت عبیدہؓ اور حضرت علیؓ مقابلے کو نکلے ۔ حضرت علیؓ نے ولید کو حضرت حمزہؓ نے عتبہ کو اور حضرت عبیدہؓ نے ربیعہ کو قتل کیا ، عبیدہؓ خود بھی زخمی ہوئے اور میدان سے اٹھا کر لائے گئے ۔ اب قریش نے یکبار حملہ کیا ، خونریز لڑائی ہوئی ۔ حضرت علیؓ ، حضرت حمزہؓ ، حضرت زبیرؓ بن عوام اور حضرت ابو دجانہ انصاریؓ نے شمشیر خارا شگاف کے ناقابل فراموش جوہر دکھائے ۔ آپؐ نے فتح و نصرت کی دعا فرمائی اور آپؐ کو یوں محسوس ہوا کہ آسمان سے فرشتوں کی کمک آ گئی ہے ۔ اچانک ہوا کے چند جھونکوں نے اہل مکہ کے منہ پھیر دیے ۔ ابوجہل دو انصاری بھائیوں معاذؓ اور معوذؓ کی تلواروں سے کیفر کردار کو پہنچا ۔ عکرمہ بن ابوجہل کی تلوار سے معاذ کا ایک بازو کٹ کر لٹکنے لگا تھا جسے انھوں نے پاؤں تلے دبا کر تسمہ توڑ کر الگ کیا اور بدستور لڑتے رہے ، کفار کو شکست ہوئی تو مسلمانوں نے تعاقب کیا ۔[1] سب سامان جنگ مسلمانوں کے قبضے میں آیا ، مقتولین کے علاوہ ستر اسیر ہوئے ۔ آپؐ نے اسیروں سے اچھے سلوک کا حکم دیا چنانچہ مسلمانوں نے ان کے ساتھ بھائیوں کا سا سلوک کیا ۔ انھیں سوار کیا خود پیدل چلے ، انھیں گیہوں کھلایا آپ خرمے کھائے ۔ آپؐ تین دن بدر میں مقیم رہے اور اس جنگ کے چھ مہاجر اور آٹھ انصار شہیدوں کو وہیں دفن کیا ۔ تیسرے دن وادی صفرا میں پہنچ کر مال غنیمت تقسیم کیا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مشورے پر فدیہ لے کر قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا ۔[2]

۱- ابن ہشام : ص ٦٦٥ تا ٦٩٨ ، رحمۃ للعالمین ، ج ۱ ، ص ۱۳۲ تا ۱۳۷ -
۲- ابن ہشام : ص ٦٩٩ تا ۷۱۲ -

مدینہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ کسی گلی سے کوئی مسلمان خاتون گزر رہی تھی کہ ایک یہودی نے دست درازی کی ۔ ایک مسلمان نے طیش کھا کر یہودی کو قتل کر دیا ۔ یہودیوں نے اس مسلمان کو گھیر کر شہید کر دیا اس سے مدینہ میں برہمی پیدا ہو گئی ۔ آپؐ نے یہود بنی قینقاع سے معاہدے کی خلاف ورزی پر جواب طلب کیا تو انھوں نے معذرت کی بجائے یہ کہلا بھیجا کہ بدر کی فتح پر گھمنڈ نہ کریں ان سے مقابلہ ہوا تو قدر عافیت معلوم ہو گی اور ساتھ ہی عہد نامے کی نقل واپس بھیج دی ۔ آپؐ کے حکم سے مسلمانوں نے بنی قینقاع کے محلے کا محاصرہ کر لیا ، آپؐ نے اسلام قبول کرنے کی شرط پیش کی لیکن عبداللہ بن ابی سلول نے یہ صلح کرائی کہ بنی قینقاع مع اہل و عیال و مال اسباب مدینہ سے نکل جائیں، ان کی غیر منقولہ جائداد اور ہتھیار ان سے لے لیے جائیں ، چنانچہ بنی قینقاع مدینہ چھوڑ کر خیبر میں جا آباد ہوئے ۔[1]

بدر سے ابوسفیان زخمی بھاگا ، مکہ میں قبیلے نے اسے سردار بنایا اور اس نے مقتولین پر رونے سے منع کر دیا کہ اس سے جوش انتقام سرد پڑتا ہے ۔ پھر وہ دو سو سواروں کو ساتھ لے کر یثرب سے تین میل پر عریض میں پہنچا ، دو مسلمانوں کو مار ڈالا اور ان کے باغ جلا دیے ۔ آپؐ خبر سنتے ہی دو سو سواروں کے ساتھ نکلے ، ابوسفیان بھاگ گیا اور ستو کے کئی بورے ہاتھ آئے جن کی وجہ سے یہ "غزوہ السویق" کہلایا ۔[2] یہ ذی الحجہ کا واقعہ ہے ۔ محرم میں بنی سلیم کے یہودیوں نے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا، آپؐ خبر سن کر مدینہ سے آٹھ میل مقام قرقرہالکر میں گئے لیکن یہودی تین دن وہاں قیام کر کے ناکام لوٹ گئے ۔ ربیع الاول میں نواح نجد کے قبیلہ بنی ثعلبہ نے ہنگامہ مچایا۔ ایوب یہودی بنی قینقاع نے وعشور کا لقب اختیار کیا۔ آپؐ ساڑھے چار سو جاں نثاروں کے ہمراہ مقابلے کو نکلے لیکن وعشور کے ساتھی اسے چھوڑ کر بھاگ گئے ۔ برسات ہوئی ، آپؐ نے بھیگے کپڑے پھیلائے اور درخت کے سائے میں لیٹ کر آرام فرما رہے تھے کہ ایوب آ پہنچا ، تلوار اٹھائی لیکن لرزہ براندام ہو گیا ۔ آپؐ نے تلوار چھین لی ، پھر اسے بخش دیا اور وہ بظاہر مسلمان ہو گیا ۔

کفار مکہ بدر کا انتقام لینے کے درپے تھے ۔ عمرو بن عاص اور ابوعزی شاعر نے مختلف قبائل کو اکسایا اور اسی طرح ابوسفیان کی بیوی ہندہ اپنے باپ عتبہ کا بدلہ لینے کے لیے پندرہ محملوں میں عورتوں کو سوار کرا کے لائی تاکہ دف بجا کر جوش ابھاریں ، کعبہ سے بڑا بت ہبل بھی برکت کے لیے لاد کر ہمراہ لایا گیا ۔ مدینہ میں خبریں پہنچیں تو جنگ کے بارے میں دو مختلف آرا پیدا ہوئیں لیکن آپؐ نے مدینہ سے نکل کر مقابلے کا فیصلہ کیا ۔ کفار مقام عنین میں پہنچ گئے ۔ آپؐ نماز جمعہ کے بعد ایک ہزار آدمیوں کو لے کر نکلے لیکن ان میں سے تین سو منافق عبداللہ بن ابی کے ساتھ راستے سے لوٹ آئے ۔ آپؐ نے احد کو پیٹھ پیچھے رکھ کر اور عنین کو بائیں ہاتھ رکھ کر صفیں مرتب کیں ۔ ایک گھاٹی مخدوش تھی وہاں عبداللہ بن جبیر کو پچاس تیر اندازوں کے ساتھ متعین کر کے ہدایت فرمائی کہ آپؐ کے حکم کے بغیر کسی صورت میں اپنی جگہ نہ چھوڑیں ۔ جنگ شروع ہوئی ، قریش کا علمبردار طلحہ بن ابی طلحہ حضرت علیؓ کے ہاتھوں واصل بہ جہنم ہوا اور پھر یکے بعد دیگرے نو آدمیوں نے جھنڈا سنبھالا اور

۱- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۶۹ ۔
۲- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۳۰ ۔

قتل ہوئے۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت زبیرؓ بن عوام نے بے انتہا شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ آپؐ نے میان سے تلوار کھینچ کر مسلمانوں سے فرمایا تم میں سے کون ہے جو اس کا حق ادا کرے۔ جانثاران رسالت لپکے اور یہ سعادت حضرت ابودجانہ انصاریؓ کی قسمت میں تھی۔ انھوں نے واقعی اس تلوار کا حق ادا کیا اور ایک بار لشکر کفار کو درمیان سے چیرتے ہوئے دوسری طرف وہاں تک جا پہنچے جہاں ہندہ کھڑی تھی، آپ کو طیش تو بہت آیا لیکن آنحضرتؐ کی تلوار کو عورت کے خون سے رنگنا مناسب نہ سمجھا اور پھر اسی طرح مارتے کاٹتے دوسری طرف آ نکلے۔ کافر بھاگ نکلے اور مسلمان مال غنیمت جمع کرنے لگے۔ عبداللہ بن جبیر کے ساتھی باوجود ان کے منع کرنے کے اب اسی گھاٹی میں اپنا قیام غیر ضروری سمجھ کر لپکے اور عبداللہ بن جبیر کے ساتھ دس بارہ آدمی رہ گئے۔ خالد بن ولید مخزومی نے موقع دیکھ کر اس گھاٹی کی طرف سے حملہ کیا، عبداللہ بن جبیر اور ان کے باقی ماندہ ساتھی داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے۔ خالد کے ہمراہی مال غنیمت جمع کرنے والوں پر پیچھے سے جا پڑے اور بھاگے ہوئے ساتھیوں کو بھی جمع کیا، عمرو بنت علقمہ نے خالد کو لڑتا دیکھ کر پھر قریش کا علم بلند کیا۔ اب مسلمانوں کے پاس صفیں درست کرنے کا وقت نہ تھا۔ ہنگامے میں کئی مسلمان خود مسلمانوں کی تلواروں سے زخمی ہوئے اور حذیفہ انصاریؓ کے والد یمانؓ بھی دوستوں کی تلواروں سے شہید ہوئے۔ حضرت حمزہؓ کافروں پر ٹوٹ پڑے، ان کے ایک بہادر سباع بن عبدالعزی کو قتل کیا، جبیر بن مطعم کا حبشی نیزہ باز غلام ایک پتھر کی آڑ میں چھپا کھڑا تھا۔ حضرت حمزہؓ اس کے گھات کے وار سے شہید ہوئے۔ ہندہ نے اس غلام سے حضرت حمزہؓ کے قتل پر آزادی کا وعدہ کیا تھا، وہ ان کا کلیجہ نکال کر ہندہ کے پاس لے گیا، اس نے دانتوں سے چبا کر تھوک دیا اور اپنا زیور اتار کر حبشی کو انعام دیا۔

اس وقت صرف تیس چالیس جانثار علم رسالت کے نیچے رہ گئے۔ کفار نے ہر طرف سے آپؐ پر یورش کی۔ حضرت علیؓ ان کی یورش کی مدافعت کر رہے تھے۔ نسیبہ نامی ایک خاتون جو مشکیزے میں پانی لاتی تھیں یہ حال دیکھ کر ڈھال تلوار لے کر ڈٹ گئیں اور تیرہ زخم کھائے لیکن منہ نہ موڑا۔ مصعبؓ بن عمیر علمبردار تھے، ان کا پہلے ایک بازو کٹا، پھر قمیہ نے دوسرا کاٹا تو اس حال میں بھی انھوں نے علم تھامے رکھا آخر نیزے سے شہید ہوئے۔ اب صرف چودہ سربکف جانثار باقی تھے۔ حضرت عاصمؓ اور سعدؓ بن ابی وقاص تیر اندازی سے، حضرت زبیرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابودجانہؓ اپنی جانبازی سے اور حضرت ابوبکرؓ، حضرت سعدؓ بن ابی معاذ اور حضرت طلحہؓ اپنی جانثاری سے کوشش کر رہے تھے کہ آپؐ کو کوئی صدمہ نہ پہنچے۔ یہ سب حضرات زخم کھاتے کھاتے کمزور پڑ گئے تھے۔ ایک کافر مالک بن زبیر نے آپؐ پر تیر پھینکا تو حضرت طلحہؓ نے ہاتھ بڑھا کر روکا جو ان کی انگلی میں چھد کر رہ گیا۔ کفار پتھروں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ ابن قمیہ کے ایک پتھر سے خود کی کڑیاں آپؐ کی جبین مبارک میں پیوست ہو کر رہ گئیں اور چہرہ انور خون آلود ہو گیا۔ دوسرا پتھر عبداللہ بن شہاب کا لگا جس سے کہنی زخمی ہوئی۔ عتبہ بن ابی وقاص کے پتھر سے دندان مبارک شہید ہوئے اور ان سے خون جاری ہو گیا۔ آپؐ چادر سے خون پونچھتے جاتے اور قوم کی ہدایت کے لیے دعا فرماتے جاتے تھے۔ ابن قمیہ نے قریب پہنچ کر تلوار کا وار کیا جسے حضرت طلحہؓ نے اپنے ہاتھ پر لیا

اس نے دوسری تلوار کمر پر ماری جو زرہوں کی وجہ سے کارگر نہ ہوئی لیکن آپ گھوڑے سے ایک گڑھے میں گر گئے ۔ ابن قمیہ نے نعرہ مارا کہ اس نے آپ کو قتل کر دیا ہے ۔ اس سے مسلمان اور بھی بدحواس ہو گئے لیکن بعض نے آپ کے بغیر زندگی کو بے معنی سمجھ کر سر دھڑ کی بازی لگا دی ۔ مدینہ یہ خبر پہنچی تو بنی ہاشم کی خواتین حضرت فاطمہ سمیت روتی ہوئی آئیں ۔ انس بن نصر انصاری جو کسی وجہ سے جنگ میں شریک نہ ہو سکے تھے سنتے ہی یہ کہہکر عینین کی طرف دوڑے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ شہید ہو جائیں اور ہم زندہ رہیں ۔ حنظلہ بن ابو عامر کا اسی شب نکاح ہوا تھا وہ بھی خبر ملتے ہی دوڑے اور لشکر کفار پر ٹوٹ پڑے، مارتے کاٹتے ابوسفیان تک جا پہنچے لیکن کفار نے نرغے میں لے کر شہید کر دیا ۔

حضرت طلحہ نے گڑھے میں اتر کر آپ کو گود میں اٹھا لیا، حضرت علی کے سہارے باہر نکالا ۔ ابوعبیدہ بن الجراح نے پیشانی مبارک میں پیوست خود کی کڑیوں کو دانتوں سے کھینچ کر نکالا جس میں خود ان کے سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے ۔ اب ہر طرف آپ کے زندہ ہونے کی خبر پھیلی تو سب منتشر مسلمان جمع ہونے لگے جنھیں ہمراہ لے کر آپ احد کی گھاٹی کی طرف گئے ۔ ہندہ اور اس کی ہمراہی عورتوں نے شہیدوں کے ناک کان کاٹ کر ہار بنا کر گلے میں پہنے اور طربیہ نغمے گاتیں لشکر کفار کے ساتھ مکہ کو لوٹ گئیں ۔[1]

دوسرے دن آپ مدینہ تشریف لے گئے لیکن چند لمحوں بعد مخبر نے خبر دی کہ کفار کچھ دور چل کر رک گئے ہیں، ابوسفیان اور عتبہ بن ابوجہل کی رائے مدینہ پر حملے کی ہے اور صفوان بن امیہ اس کے خلاف ہے ۔ آپ نے ان لوگوں کو جو پہلے دن جنگ میں شریک ہوئے تھے پھر تیار رہنے کا حکم دیا اور ان کے ہمراہ آٹھ میل کی مسافت طے کرکے حمرالاسد میں قیام پذیر ہوئے ۔ کفار یہ عزائم دیکھ کر بھاگے اور ان میں سے ابوعزی اور معاویہ بن المغیرہ گرفتار ہوئے ۔ ابوعزی کو جنگ بدر میں اس عہد پر رہائی ملی تھی کہ وہ آئندہ اپنے اشعار سے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف نہیں بھڑکائے گا، اب کی بار وہ بد عہدی کے جرم میں قتل ہوا ۔ معاویہ بن المغیرہ کو حضرت عثمان کی سفارش پر اس شرط پر رہا کر دیا گیا کہ وہ تین دن کے اندر مدینہ سے نکل جائے لیکن وہ چوتھے دن وہیں پایا گیا اور قتل ہوا ۔

غزوہ احد کی کامیابی پر اہل مکہ نے خوشیاں منائیں لیکن ان میں سلافہ بنت سعد مبتلائے رنج تھی کیونکہ اس کے کئی عزیز اور بیٹے اس جنگ میں قتل ہوئے تھے ۔ اس نے ان کے قاتلوں خصوصاً عاصم بن ثابت کا سر لانے والے کے لیے دو سو اونٹ انعام مقرر کیے ۔ سفیان بن خالد ہذلی مکہ میں مبارکباد دینے گیا تھا، انعام کے لالچ میں آگیا ۔ گھر جا کر قبیلے کے سات بدمعاشوں کو سکھا کر مدینے بھیجا ۔ انھوں نے خود کو مسلمان ظاہر کیا اور قبیلے میں تبلیغ کے لیے آپ سے صحابہ مانگے ۔ آپ نے عاصم کو چھ صحابہ کے ساتھ ان کے ہمراہ کر دیا ۔ سرحد حجاز کے ایک چشمے رجیع پر پہنچے تو سفیان ہذلی دو سو سفاکوں کے ساتھ آ گیا ۔ پانچ صحابہ شہید اور دو زخمی حالت میں گرفتار ہوئے لیکن اسے عاصم کی لاش کہیں نہ ملی کہ ان کا سر کاٹ کر سلافہ سے انعام حاصل کرتا ۔ اس نے دونوں اسیروں حبیب بن عدی اور زید بن وثنہ کو کفار کے ہاتھ بیچ دیا جنھوں نے انھیں مکہ میں صلیبوں کے ساتھ باندھ کر بیک وقت چالیس نیزوں سے

۱- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۴۰ تا ۱۴۴ -

چھلنی کرکے شہید کیا ۔[1] ابوبراء عامری نے بھی اہل نجد میں تبلیغ کے لیے آپؐ سے صحابہ مانگے اور حفاظت کی ذمہ داری لی ۔ آپؐ نے چالیس عابد و زاہد قاری اس کے ساتھ کر دیے ۔ معونہ نامی کنوئیں پر قیام کرکے اس نے اپنے بھتیجے عامر بن طفیل حاکم نجد کو آپؐ کا ہدایت نامہ بھیجا ۔ اس نے بے گناہ قاصد کو شہید کر دیا اور بیر معونہ پر چڑھائی کی ۔ صرف دو قاری ساتھیوں کی لاشوں میں زندہ بچ رہے ۔ ان میں سے ایک عمرو بن امیہ مدینے کو لوٹے تو راہ میں انھیں بنو عامر کے دو شخص ملے جن کے ساتھ آپؐ کا معاہدہ تھا ۔ عمرو نے انھیں بھی قاتلوں کا ساتھی سمجھ کر قتل کر دیا ۔ سریہ رجیع اور بیر معونہ کے واقعات کا آپؐ کو ایک ہی شب علم ہوا، آپؐ نے بد دعا دی ۔[2] حاکم نجد طاعون میں مبتلا ہوکر مرا اور عبداللہ بن انیس انصاری خفیہ طور پر جا کر سفیان ہذلی کا سر کاٹ لے آئے ۔

آپؐ نے بنو عامر کے دونوں مقتولوں کا خون بہا بنو نضیر کے ذریعے دینا چاہا کیونکہ وہ بھی اُن کے حلیف تھے ۔ اس غرض سے آپؐ چند صحابہ کے ہمراہ اُن کے محلے میں گئے اور ایک دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے ۔ یہودیوں نے عمرو بن جحاش کو کوٹھے پر چڑھایا کہ بڑا سا پتھر آپؐ پر لڑھکا دے ۔ خدا نے آپؐ کو اُن کے منصوبوں سے آگاہ کر دیا اور آپؐ خاموشی سے اٹھ کر چلے آئے ۔[3] صحابہ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد لوٹے تو آپؐ نے ماجرا سنایا اور اس امر کا بھی واضح ثبوت موجود تھا کہ بنو نضیر نے اُحد میں قریش کو مدد دینے کا وعدہ کیا تھا اس لیے آپؐ نے انھیں مدینہ چھوڑ دینے کا حکم دے دیا لیکن وہ عبداللہ بن ابی کے بہکانے میں آ کر مقابلے پر تیار ہوئے تو اُن کے محلے کا محاصرہ کر لیا گیا ۔ پندرہ دن محاصرہ رہا، آخر اُن کی درخواست پر انھیں ان شرائط پر امان ملی کہ وہ ہتھیار حوالے کر دیں اور اپنے سامان کے ساتھ نکل جائیں ۔ چنانچہ بنو نضیر چھ سو اونٹوں پر اپنا سامان لاد کر لے گئے اور جاتے ہوئے اپنے مکانات خود ہی منہدم کر گئے ۔ ان کی جائداد مہاجرین اور دو نادار انصاریوں میں تقسیم ہوئی اور وہ خود خیبر میں جا کر آباد ہوئے ۔[4]

اطراف حجاز کے ایک مشہور شخص نعیم بن مسعود سے معلوم ہوا کہ ابو سفیان نے پھر جنگ کی تیاریاں کی ہیں اور کافی اسلحہ منگوایا اور قبائل کو جمع کیا ہے ۔ آنحضرتؐ نے یہ سن کر مدینے سے کوچ کیا اور بدر میں جا پہنچے جہاں بازار لگا ہوا تھا ۔ ابو سفیان کو علم ہوا تو دہشت طاری ہوگئی اور راستے سے ہی یہ بہانہ بنا کر لوٹ گیا کہ قحط سالی ہے، چھوٹی بستیوں میں ٹھہرنا مناسب نہیں ۔ آپؐ آٹھ دن وہاں ٹھہرے ۔ معلوم ہوا کہ نعیم کو خود ابو سفیان نے ہی بھیجا تھا کہ حملے کی اطلاع دے کر مدینے میں روکے رکھے اور ابوسفیان بدر تک آ کر اپنی شان و شوکت اور قوت کا اظہار کر کے لوٹ جائے ۔

ہجرت کے پانچویں سال بنی المصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار نے قریش کے اکسانے پر لشکر جمع کر کے فوج کشی کی ۔ شعبان میں آپؐ نے قدید کی جانب مریسیع کے مقام پر بنی المصطلق کا مقابلہ کیا ، وہ شکست کھا کر بھاگے اور مال اسباب کے ساتھ بال بچوں کو بھی چھوڑ گئے ۔ مسلمانوں نے انھیں تقسیم کر لیا ۔ حارث بن ضرار کی بیٹی برہ ، ثابت بن قیس نامی

۱۔ رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۴۴ تا ۱۴۸ ۔ ۲۔ رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۴۸ ۔
۳۔ ابن ہشام : ص ۵۹۹ ۔ ۴۔ رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۶۹، ۱۷۰ ۔

ایک صحابی کے حصے میں آئی - اس نے آپؐ سے فریاد کر کے مدد چاہی ، آپؐ نے خرید کر آزاد کر دیا، پھر نکاح کا پیغام دے کر عقد کر لیا جو حضرت ام المومنین جویریہ کہلائیں - یہ دیکھ کر مسلمانوں نے بنی مصطلق کے تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ بیشتر بنی مصطلق مسلمان ہو گئے اور آخر سردار حارث بھی اسلام لے آیا -

اس واقعہ کے چند ماہ بعد یہودیوں نے ابو سفیان سے مل کر دس ہزار کا لشکر تیار کرایا - آپؐ نے اطلاع پا کر صحابہؓ سے مشورہ کیا اور حضرت سلمانؓ کی تجویز قبول کی کہ مدینہ کے گرد خندق کھودی جائے - آپؐ نے خود بھی صحابہ کے ساتھ مل کر کام کیا اور چھ دن میں خندق تیار ہوئی - ذیقعدہ ۵ھ میں کفار کا لشکر آ پہنچا - آپؐ نے تین ہزار مجاہدوں کے ساتھ مقابلہ کیا - مدینہ کا محاصرہ ابھی جاری ہی تھا کہ یہودیوں کے قبیلہ بنی قریظہ نے معاہدہ مدینہ توڑ دینے کا اعلان کیا - پانی اور غلے کی قلت تھی ، خود آپؐ نے پیٹ پر دو پتھر باندھ رکھے تھے - سامنے سے کفار کے تیروں کی بارش تھی اور پیچھے یہود اور منافقین کی سازشیں - آپؐ نے تین سو مسلمانوں کو گھروں کی حفاظت پر مامور کیا - ادھر ابوسفیان اپنے بہادروں کو لے کر خندق کے اندر تک آتا اور مار کھا کر لوٹتا - عمرو بن عبدود چند سرداروں کے ساتھ خندق پھاند آیا اور حضرت علیؓ کے ہاتھوں قتل ہوا - دو ہفتے یہی عالم رہا تو قبائل قریش کو چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے - قریش اور بنی قریظہ میں بھی بگڑ گئی - ایک رات شدید طوفان آیا، خیمے اکھڑ گئے ، ہنڈیاں الٹ گئیں اور آگ بجھ گئی - کفار یہ حال دیکھ کر خوفزدہ ہوئے اور راتوں رات بھاگ گئے - یہ محاصرہ بیس دن جاری رہا تھا -[1]

بنی قریظہ نے بدر کے موقع پر بھی غداری کی تھی لیکن معافی مانگ لی تھی - اس مرتبہ بد عہدی کے ساتھ انھوں نے بنی نضیر کے سردار حی بن اخطب کو بھی اپنے قلعے میں چھپا کر ٹھہرایا ہوا تھا جو اس سارے ہنگامے اور فساد کا بانی تھا - آپؐ نے کفار سے فارغ ہوتے ہی ان کا محاصرہ کر لیا اور وہ قلعہ بند ہو گئے - انھوں نے جلا وطن ہونے کی پیشکش کی لیکن حکم ملا کہ ہتھیار چھوڑ دو، آنحضرتؐ خود فیصلہ فرمائیں گے - ابولبابہ کے اشارے پر انھوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا چنانچہ محاصرہ طول پکڑ گیا - بنی اوس فیصلہ کرانے کے لیے درمیان میں آئے تو آپؐ نے فرمایا اگر میرا فیصلہ انھیں قبول نہیں تو بنی اوس کے سردار سعد بن معاذ اگر یہود کو منظور ہو تو فیصلہ کریں - یہود نے اسے بخوشی قبول کیا - سعد بن معاذ نے خود یہود کی مذہبی کتب کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ ان کے تمام مرد قتل کیے جائیں ، عورتیں بچے غلام بنا لیے جائیں اور مال و اسباب مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور اسی فیصلے پر عمل ہوا جس کے بعد مدینہ میں امن قائم ہو گیا -[2]

اس کے بعد ایک سال تک مختلف قبائل کی لوٹ مار کی شورشوں کے خلاف مہمیں جاری رہیں - بنی قریظہ کے انجام کے پانچ ماہ بعد آپؐ نے ربیع الاول ۶ھ میں رجیع کے واقعہ کے بدلے کے لیے قبیلہ بنی لحیان کی طرف کوچ کیا ، وہ خبر سنتے ہی بھاگ کر پہاڑوں میں گئے - ربیع الثانی میں عینیہ بن حصن انفزاری نے بنی غطفان کے چند سواروں کے ہمراہ آکر بنی غفار کے ایک مسلمان کو شہید کیا ، اس کی بیوی کو پکڑ لیا اور آپؐ کے اونٹ ہنکا کر لے گیا - سلمہ

۱- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۷۰ تا ۱۷۳ - ۲- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۷۳ تا ۱۷۵ -

بن عمرو بن الاکوع نے تنہا تعاقب کرکے ایسی تیر اندازی کی کہ وہ اونٹ چھوڑ کر بھاگے۔ خبر ملتے ہی آپؐ نے سعد بن زید کو چند سواروں کے ساتھ روانہ کیا، خود بھی چل کھڑے ہوئے۔ خفیف سی لڑائی کے بعد لٹیرے فرار ہو گئے۔ اسی ماہ شورش پسند بدویوں کی اصلاح کے لیے مختلف مہات مقامات عکاشہ، بنی ثعلبہ، ذی القصہ اور جموم کی طرف بھیجیں جو کامیاب ہوئیں۔ جمادی الاول میں قریش کے ایک تجارتی قافلے کی اطلاع ملی۔ آپؐ نے زید بن حارثہ کو چند لوگوں کے ساتھ بھیجا، انھوں نے قافلے پر قبضہ کر لیا اور چند ایک اہل قافلہ کو گرفتار بھی کیا۔ ذیقعدہ ۶ھ میں آپؐ ہتھیار چھوڑ کر چودہ سو اصحابہؓ کے ساتھ قربانی کے جانور لے کر حج کی نیت سے روانہ ہوئے۔ قریش نے مزاحمت کے لیے لشکر تیار کیا، آپؐ نے راستہ بدلا اور مقام حدیبیہ میں پہنچے جو مکہ سے ایک منزل تھا۔ قریش کے پاس حضرت عثمانؓ کو بھیجا، وہ دیر تک نہ لوٹے تو خبر ملی کہ شہید کر دیے گئے، اس پر سب اصحابہ نے ایک درخت کے نیچے آنحضرتؐ کے ہاتھ پر لڑنے کی بیعت کی جو خدا کو پسند آئی اور وحی سے خوشنودی کا اظہار کیا۔ قریش یہ جوش سن کر گھبرائے، حضرت عثمانؓ کے ساتھ سہیل بن عمرو کو صلح کے لیے بھیجا اور صلح حدیبیہ کی شرائط طے ہوئیں، حضرت علیؓ نے معاہدہ لکھا۔ شرائط کے مطابق چونکہ اس سال حج کی اجازت نہ ملی تھی اور آیندہ ہر برس صرف تین دن کے لیے مکہ میں قیام کی اجازت ہوئی تھی اس لیے آپؐ نے وہیں پر قربانی کے جانور ذبح کیے اور مدینہ لوٹ آئے۔ بعض اصحابہ کو اس صلح کی بعض شرائط پسند نہ تھیں لیکن جلد ہی ان کے مصالح آشکار ہو گئے۔[1]

اب آپؐ نے مختلف بادشاہوں کے نام خطوط ارسال فرمائے۔ قیصر روم ہرقل کے لیے وحیہ کلبی کو، بنی غسان کے حارث بن ابی شمر کے لیے سجاع بن وہب اسدی کو، مقوقس فرمانروائے مصر کے لیے حاطب ابن ملتعہ کو، نجاشی حکمران حبشہ کے لیے عمرو بن امیۃ الضمری کو، ہودہ بن علی الحنفی حاکم یمامہ کے لیے سلط بن عمرو عامری کو، منذر بن ساوی حاکم بحرین کے لیے علاء بن الحضرمی کو اور ایرانی تاجدار آل ساسان خسرو پرویز کے لیے عبداللہ بن حذافہ کو خطوط دے کر روانہ کیا۔ ہرقل دل سے قائل تھا لیکن امراء اور پادریوں سے خائف تھا، وحیہ کلبی کے ساتھ احترام سے پیش آیا اور معذرت کر کے انھیں واپس بھیجا۔ مصر کا شاہ مقوقس بھی اسلام کو قبول نہ کر سکا لیکن اس نے تعظیم کی اور مختلف ہدایہ کے ساتھ چار لونڈیاں بھیجیں۔ خسرو پرویز نے خط پڑھکر برہمی کا اظہار کیا، والی یمن باذان کو حکم بھیجا کہ دو افسروں کو بھیج کر آپؐ تک حکم پہنچائے کہ دربار میں فوراً حاضر ہوں۔ باذان کے دو افسر تابوہ اور خرخسرہ مدینہ پہنچے، آپؐ نے آمد کا مقصد دریافت کیا، آپؐ کو وحی سے فوراً معلوم ہوا اور آپؐ نے فرمایا اب خسرو پرویز کا حکم کیسا وہ تو اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ آپؐ نے ان افسروں کو باذان تک پیغام اسلام پہنچانے کا کہا اور وعدہ کیا کہ اگر وہ اسلام قبول کرے تو اسے قوم کا سردار بنا دیا جائے گا۔ افسر باذان کے پاس لوٹے، ماجرا سنایا، چند دن بعد اس کے پاس شیرویہ کے احکام آ پہنچے کہ وہ فرمانروا ہے اب اس کی اطاعت کی جائے اور پیغمبر حجازؐ سے کوئی مزاحمت نہ کی جائے۔ یہ فرمان ملتے ہی باذان اور یمن میں موجود کئی ایرانی مسلمان ہو گئے۔ نجاشی پیغام ملتے ہی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ ابوسفیان کی بیٹی

۱- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۲۷۹ تا ۲۸۵۔

ام حبیبہ جو مسلمان تھیں اور اپنے شوہر عبداللہ بن حجش کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ گئی تھیں لیکن وہ انھیں وہاں چھوڑ کر عیسائی ہو گیا تھا ، ان کے متعلق بھی آنحضرتؐ نے نجاشی کو لکھا کہ اگر وہ قبول کریں تو آپؐ سے عقد کر لیں ۔ نجاشی نے پوچھ کر چار سو دینار مہر کی رقم ادا کر کے آپؐ سے عقد کر کے انھیں مدینہ روانہ کر دیا ۔[1]

شاہ غسان نے نامۂ مبارک پڑھ کر کہا میں خود آ کر جواب دوں گا ۔ آپؐ نے فرمایا اس کی سلطنت غارت ہو گئی ۔ حاکم یمامہ نے جواب میں سفارت بھیجی لیکن انھیں سمجھا دیا کہ اگر آپؐ اپنے بعد اسے جانشین تسلیم کریں تو مسلمان ہو جانا ورنہ مقابلہ کرنا ۔ آپؐ نے پیغام سن کر فرمایا خدایا مجھے اس کے شر سے بچا، چنانچہ چند روز بعد وہ مر گیا ۔ بحرین کے حاکم منذر نے فوراً اسلام قبول کر لیا اور اس کے اثر سے بحرین کے تمام عرب مسلمان ہو گئے ، یہودیوں مجوسیوں اور نصرانیوں نے جزیہ دینا قبول کیا ۔

یہود بنی نضیر، قینقاع وغیرہ اپنی دشمنی سے باز نہ آئے اور مختلف قبائل عرب کو حلیف بنا کر دس ہزار کا لشکر تیار کیا ۔ خیبر میں دس مضبوط قلعے تھے، آپؐ نے چودہ سو اصحاب کو لے کر فوراً کوچ کیا اور اس سے پہلے کہ منافقین انھیں خبر کرتے اور وہ کھلے میدان میں مقابلے کے لیے نکلتے، ان کے سروں پر جا پہنچے ۔ اس کے نتیجے میں ان کے حلیف قبائل مدد کو نہ پہنچ سکے ۔ یہود قلعوں میں محصور ہوئے ۔ ایک دو قلعے فوراً فتح ہوئے ۔ حصن القموص بہت مضبوط تھا ۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو علم دیا، حارث اور مرحب زبردست لشکر کے ساتھ مقابلے کو باہر نکلے ۔ حضرت علیؓ نے حارث کو قتل کر دیا ۔ اس کے بھائی مرحب نے طیش میں حضرت علیؓ پر حملہ کیا، آپؐ نے وار بچا کر ذوالفقار کے ایک ہی ہاتھ سے مرحب کے دو ٹکڑے کر دیے ۔ یہودی بھاگ اٹھے، کسی نے تلوار کا وار کیا اور حضرت علیؓ کے ہاتھ سے ڈھال گر گئی جسے کوئی یہودی لے کر قلعے میں بھاگا اور پھاٹک بند کر دیا ۔ حضرت علیؓ جوش میں لپکے اور قلعے کے دروازے کو اس زور سے کھینچا کہ پٹ اکھڑ آیا ۔ اس کی فتح کے بعد حصن العصب حصن الواطح پر بھی قبضہ ہوگیا ۔ یہودیوں نے امان چاہی ۔ طے پایا کہ سارا مال بطور تاوان جنگ دیں، خیبر کی ساری زمین مسلمانوں کی ملکیت ہوگی اور یہودی اپنے گھروں میں رعایا رہیں گے ۔ پیداوار کا نصف بطور خراج دیں گے ۔ بد عہدی کی صورت میں انھیں جلا وطن کیا جا سکے گا ۔ یہود کا بڑا سردار حی ابن اخطب لڑائی میں مارا گیا ، داماد کنانہ بن ربیع مال چھپا کر رکھنے کے جرم میں قتل ہوا ۔ حی کی بیٹی صفیہ لونڈیوں میں اسیر ہوئی تو آپؐ نے ان کی عزت کے خیال سے آزاد کر کے نکاح کر لیا ، جس کا یہود پر اچھا اثر ہوا ۔ صفیہ نے دو تین روز پیشتر خواب میں ماہتاب کو اپنی آغوش میں دیکھا تھا اور جب یہ خواب کنانہ نے سنا تو زور کا تھپڑ مار کر کہا تمھیں محمدؐ سے ملنے کی امید ہے اور جب آپ آنحضرتؐ کی خدمت میں آئیں تو ابھی تھپڑ کا نشان موجود تھا ۔[2]

اس فتح کے بعد حارث کی بیٹی زینب نے ہرڈویہ کے اکسانے پر آپؐ کی دعوت کی، آپؐ نے قبول کی ۔ زینب نے بکری کا بھنا ہوا گوشت بھیجا، آپؐ کے ساتھ بشر بن براء بھی تھے، وہ دو

---

۱ ۔ رحمۃ للعالمین، ج ۱ ، ص ۱۹۳ تا ۲۱۰؛ ابن ہشام : ص ۲۱۶، ۲۱۷ ۔
۲ ۔ رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۲۸۵ تا ۲۹۲ ۔

چار لقمے کھا گئے لیکن آپؐ نے پہلا لقمہ حلق سے اتارنے سے پہلے ہی فرمایا کہ جس بکری کا یہ گوست ہے وہ مجھ سے کہتی ہے کہ اس میں زہر ملایا گیا ہے۔ زینب سے پوچھا تو اس نے کہا وہ نبوت کی آزمائش چاہتی تھی، بشر تو اسی زہر سے انتقال کر گئے اور آپؐ پر بھی کچھ نہ کچھ اثر ہوا۔ واپسی آپؐ نے وادی القریٰ کی طرف سے کی، وہاں کے یہودیوں نے بھی مطیع ذمی بن کر رہنا قبول کیا، فدک کے یہود نے بھی خراج گزار بننا قبول کیا۔

ذی الحجہ میں آپؐ نے حدیبیہ میں موجود اصحاب کو لے کر احرام باندھے، ستر اونٹ ساتھ لیے۔ مشرکین مکہ گھروں سے نکل کر جبل ابوقیس پر چڑھ گئے، آپؐ نے حج کے بعد وہاں میمونہ بنت حارث سے نکاح کیا، قریش کو دعوت دی، وہ نہ آئے تو حسب معاہدہ آپؐ تیسرے دن لوٹ آئے۔ آپؐ کی خلوص نیت کا بڑا اثر ہوا۔ خالد بن ولید، عثمان بن ابی طلحہ (کلید بردار خانہ کعبہ) اور عمرو بن عاص مدینہ منورہ میں حاضر ہو کر اسلام لائے۔[1] چند روز بعد آپؐ نے عمرو بن عاص کو ارض بلی اور قبیلہ بنی عذرہ کی طرف مہم پر بھیجا۔ کمک میں ابو عبیدہؓ بن الجراح اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے ساتھ مہاجرین اولین کی ایک جماعت بھی بھیجی، یہ مہم کامیاب رہی۔ اس کے بعد عمرو بن عاص حکام عمان کے مقابلے کو گئے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ابوعبیدہ بن الجراح تین سو مہاجر و انصار کے ساتھ سمندر کے کنارے کنارے ایک سریہ پر گئے۔ رفاعہ بن قیس کی عداوت کی خبریں آنے لگیں، آپؐ نے ابوقتادہ کے ہمراہ دو آدمیوں کو خبر لانے بھیجا انھوں نے رفاعہ کا سر کاٹ لیا اور ان کے گروہ کو منتشر کر کے ان کے اونٹوں کو ہنکاتے ہوئے مدینہ لوٹ آئے۔

بصریٰ کے حاکم کے پاس حارث ازوی نامۂ مبارک لے کر گئے تھے جنھیں بنی غسان کے سردار شرحبیل نے راستے میں شہید کر دیا۔ آپؐ نے تین ہزار مسلمانوں کو زید بن حارثہ کی سرکردگی میں روانہ کیا، خالد بن ولید بھی لشکر کے ساتھ تھے۔ دشمنوں نے مختلف قبائل کے ایک لاکھ آدمی جمع کیے، قیصر روم سے بھی ایک لاکھ کی کمک طلب کی۔ موتہ کے قریب جنگ ہوئی۔ سپہ سالار اسلام زیدؓ بن حارثہ پھر ان کے بعد دوسرے سپہ سالار جعفرؓ ابن ابی طالب، پھر تیسرے سپہ سالار عبداللہؓ بن رواحہ یکے بعد دیگرے شہید ہوئے۔ مسلمانوں میں مایوسی پھیلنے لگی تو خالدؓ بن ولید نے علم سنبھالا۔ اس جنگ میں نو تلواریں ان کے ہاتھ میں ٹوٹیں۔ ادھر جنگ جاری تھی ادھر آپؐ مسجد نبوی میں مسلمانوں کو واقعات جنگ سنا رہے تھے، تینوں شہیدوں کے لیے دعا کی۔ دوسری صبح حضرت خالدؓ نے صفوں میں رد و بدل کیا اور حملے میں خاص شان دکھائی، دشمن شکست کھا کر بھاگے، آپؐ نے اسی دن سے خالد کو سیف اللہ کا لقب دیا۔ غزوۂ موتہ جمادی الاول ۸ھ میں ہوا۔[2]

ذیقعدہ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا۔ قریش نے بنو بکر کو بنو خزاعہ کے خلاف مدد دے کر صلح حدیبیہ کی ایک شق کی خلاف ورزی کی تھی۔ بنوبکر کے ساتھ مل کر بنو خزاعہ پر شبخون مارا اور جب انھوں نے خانہ کعبہ میں پناہ لی تو انھیں وہاں بھی پناہ نہ ملی۔ عمرو بن سالم خزاعی نے مدینہ پہنچ کر اپنی بپتا سنائی، آپؐ نے مدد کا وعدہ فرمایا۔ ابوسفیان خوف کے مارے تجدید عہد کے لیے مدینہ گیا لیکن کوئی بھی اس کی سفارش پر آمادہ نہ ہوا۔

۱۔ رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۲۹۲۔ ۲۔ رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۷۵، ۱۷۶۔

آپؐ نے جہاد کی تیاری کا حکم دیا ۔ حاطب نے ایک عورت کے ذریعے قریش کو اطلاع کرنی چاہی، آپؐ کو علم ہوا، حضرت زبیرؓ کو دوڑایا گیا، وہ خط چھین لائے۔ حضرت عمرؓ کے جلال و برہمی کے باوجود آپؐ نے حاطب کا عذر سن کر معاف کر دیا ۔ ابو دہم کلثوم بن حصین غفاری کو مدینے میں نائب بنا کر آپؐ دس ہزار کے لشکر کے ساتھ دس رمضان المبارک کو چل پڑے ۔ مقام ذی الحلیفہ کے قریب حضرت عباسؓ ہجرت کرکے مدینہ جاتے ہوئے ملے، انھیں بھی ساتھ واپس لیا ۔ مکہ سے چار فرسخ پر مرالظہران کے لق و دق میدان میں پڑاؤ ڈالا ۔ حضرت عباسؓ کو ابو سفیان قریب ہی جنگل میں مل گیا، اسے سمجھایا، آپؐ کے حضور پیش کیا ۔ آپؐ نے فرمایا، جا کر اعلان کر دو جو ابوسفیان کے گھر میں، خانہ کعبہ میں پناہ لے امان میں ہے یا اپنے گھروں کے دروازے بند کرکے بیٹھ رہے امان میں ہوگا، صرف نو آدمیوں کے لیے امان نہیں ۔ دوسری صبح لشکر اسلام بغیر کسی مزاحمت کے فاتحانہ مکہ میں داخل ہوا ۔ قریش گھروں میں جا چھپے ۔ جس سمت سے حضرت خالدؓ داخل ہوئے ادھر تھوڑی دیر لڑائی ہوئی لیکن کفار اٹھائیس لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے دو مسلمان شہید ہوئے ۔ آپؐ سدھے خانہ کعبہ میں گئے ۔ بت نکال کر پھینک دیے ۔ قریش خائف لرزاں و ترساں آ کر حاضر ہوئے ۔ آپؐ نے فرمایا جاؤ آج تم سے کوئی باز پرس نہیں، تم آزاد ہو، خدا تمھارے گناہ معاف کرے ۔ پھر خطبہ دیا ، بعد نماز ظہر کوہ صفا پر جلوہ فرما ہوئے ۔ سب قریش مرد مسلمان ہوئے ۔ پھر عورتوں کی باری آئی، آپؐ نے ہندہ کو بھی معاف کر دیا ۔ اب قریش کے حلیف قبائل بھی اسلام لانے لگے ۔[1]

فتح مکہ کے ایک ماہ بعد حضرت خالد کو آپؐ نے ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ بنی خزیمہ کو دعوت اسلام دینے بھیجا، لیکن وہاں ایک غلط فہمی کی بنا پر حضرت خالد نے ان کے قتل کا حکم دے دیا ۔ آپؐ سن کر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا خداوندا خالد نے جو کچھ کیا ہے میں اس سے بالکل بری ہوں ۔ پھر حضرت علیؓ کو بنی خزیمہ کے پاس بھیجا، انھوں نے مقتولین کا خون بہا ادا کیا، تسلی دی اور راضی کرکے لوٹے ۔

فتح مکہ کے بعد طائف کے قبیلے ثقیف و ہوزان اپنی طاقت کے گھمنڈ میں قبائل کو جمع کرکے مالک بن عوف نفری کو سالار بنا کر اہل و عیال، مال اسباب کو اونٹوں پر لاد کر چار ہزار سپہ گروں کے ساتھ اوطاس کی سنگستانی گھاٹی میں آ خیمہ زن ہوئے ۔ آپؐ نے بارہ ہزار کی جمعیت کے ساتھ کوچ کیا ۔ سخت مقابلہ ہوا، دشمن دو حصوں میں بھاگے، کچھ طائف کے قلعے کی طرف اور کچھ اوطاس کی طرف ۔ اوطاس پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا اور کفار کا مال اسباب بال بچے قبضے میں آ گئے ۔ آپؐ نے قلعہ طائف کا محاصرہ کر لیا ۔ اسی دوران ابن عمرو چار سو مجاہدوں کے ساتھ دود کے بت خانے ذوالکفین کے بت توڑ کر قلعہ شکن آلات کے ساتھ آ پہنچے ۔ آپؐ نے محصورین کو سوچنے کا موقع دینے کے لیے محاصرہ اٹھا دیا اور جعرانہ میں آ گئے ۔ مال غنیمت تقسیم کیا اور نو مسلموں کا زیادہ خیال رکھا ۔ جلد بعد ہی بنی ہوزان کے سردار درخواست لے کر آئے کہ ان کے اسیروں اور بال بچوں کو رہا کر دیا جائے ۔ آپؐ نے فجر کی نماز کے بعد درخواست پیش کرنے کے لیے فرمایا ۔ دوسری صبح ان کی درخواست پر آپؐ نے اعلان فرمایا کہ میں نے اپنے اور بنی عبدالمطلب کے حصوں کے قیدی بلا معاوضہ بخش دیے ۔ مہاجرین و انصار نے بھی تقلید کی ۔

۱- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۴۸ تا ۱۶۲ ۔

قبائل بنی سلیم، بنی فزارہ اور اسی طرح کے قبائل رہ گئے جو اسلامی رحم اور فیاضی سے نا آشنا تھے ۔ آپ ؐ نے ان لوگوں کو مال خمس سے چھ چھ اونٹ فی فدیہ دے کر انہیں چھڑایا ۔ قیدیوں میں آپ ؐ کی رضاعی بہن شیما، حلیمہ سعدیہ کی بیٹی بھی تھیں، انہیں پہچان کر بڑی شفقت سے اپنی چادر پر بٹھایا اور احترام سے قبیلے میں واپس بھیجا ۔ اس فیاضی کا یہ اثر ہوا کہ بنی ثقیف و بنی ہوزان کا سردار مالک بن عوف جو طائف میں قلعہ بند تھا گرتا پڑتا دربار رسالت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوا ۔ اس طرح آپ ؐ حنین، مکہ اور طائف میں نور اسلام کی شمعیں روشن کرتے ہوئے دو ماہ سولہ دن بعد ذی قعدہ ۸ھ میں پھر وارد مدینہ ہوئے ۔[1]

اس سال آپ ؐ خود حج کے لیے تشریف نہ لے گئے، حج کی پرانی رسم جاری رہنے دی اور عتاب ابن اسید کو امیر حج مقرر فرمایا ۔ طائف کے بنی ثقیف کے سردار عروہ بن مسعود ثقفی نے حاضر ہو کر اسلام قبول کیا اور تبلیغ کی اجازت چاہی تو فرمایا تمہارا قبیلہ بہت متعصب ہے، پھر اس کے اصرار پر اجازت دی، اس نے واپس جا کر قوم کو دعوت اسلام دی اور شہید ہوا ۔[2]

مسیحی حاکم بنی غسان کی جنگی تیاریوں کا سنکر آپ ؐ نے تیس ہزار کے لشکر کے ساتھ مدینے سے کوچ کیا اور تبوک میں قیام کیا ۔ رومی آگے بڑھنے کی ہمت نہ پا کر سرحد شام سے ہی لوٹ گئے ۔ آپ ؐ نے تبوک میں ایک ماہ قیام کر کے گرد و نواح میں دستے بھیجے ۔ ایلہ کا مسیحی فرمانروا یوحنا اور چند مسیحی قبائل حاضر ہوئے ۔ خالد بن ولید دومتہ الجندل کے حاکم اکیدر بن عبدالملک کو پکڑ لائے اور واقعی جیسا آپ ؐ نے ارشاد فرمایا تھا وہ خالد کو رات کو جنگلی بیلوں کا شکار کھیلتا ہوا مل گیا تھا ۔[3] تبوک سے واپسی پر وادی مشقق میں چشمہ پھوٹا اور مدینے کے قریب منافقوں نے جو نئی مسجد بنائی تھی اسے آپ ؐ نے خدا کے حکم سے جلوا دیا ۔ جو دین صادق العقیدہ مسلمان اس مہم میں کاہلی کی وجہ سے نہ شریک ہوئے اُن کے مقاطعے کا حکم دے دیا اور آخر انہیں معاف فرمایا ۔[4] رمضان کے مہینے میں بنی ثقیف کے کچھ سردار مدینہ منورہ آئے چند دن قیام کے بعد مسلمان ہوئے ۔ عثمان بن ابی العاص کو انہیں میں سے سردار مقرر کیا اور مغیرہ بن شعبہ اور ابوسفیان بن حرب کو ساتھ کیا کہ جا کر لات کی مورت کو توڑ دیں ۔[5]

قبیلہ بنو طے کے لوگ سلمیٰ اور اجا کے پہاڑوں کے درمیان آباد تھے، دیوتا فلس کی پرستش کرتے تھے ۔ آپ ؐ نے حضرت علی رضؓ کو ایک لشکر کے ساتھ دعوت توحید دینے بھیجا ۔ قبیلہ بنی طے نے مقابلہ کیا اور شکست کھا کر بھاگے ۔ حضرت علی رضؓ نے ان کی عورتوں اور بچوں کو اسیر کیا اور دیوتا فلس کے گلے سے شاہ غسان حارث بن شمر کی نامی تلواریں مخذم اور رسوب اتاریں اور مدینے لوٹ گئے ۔ اسیروں میں حاتم طائی کی بیٹی سفانہ بھی تھی، اس نے جب رو رو کر آپ ؐ کے سامنے درخواست کی تو آپ ؐ نے اس کے ساتھ اس کے قبیلے کے کئی دوسرے لوگوں کو بھی آزاد کر دیا اور آپ ؐ کے حکم سے حضرت علی رضؓ نے انہیں اونٹ اور زاد سفر دے کر وطن روانہ کر دیا ۔ آپ ؐ کے اس حسن سلوک سے سفانہ کا بھائی عدی بن حاتم طائی متأثر ہو کر مدینہ پہنچا اور اسلام لے آیا ۔[6] اس دوران کئی قبائل مدینہ میں اسلام قبول کرنے آئے ۔ ان میں قبائل بنی اسد

۱- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۶۴ تا ۱۶۸ -

۲- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۲۱۴ تا ۲۱۶ -

۳- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۷۶ تا ۱۷۹ -

۴- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۱۸۵ تا ۱۹۰ -

۵- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۲۱۶ تا ۲۲۲ -

۶- رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۲۹۳ تا ۲۹۵ -

ولی، بھراء، بکا، بنی فزارہ، زرابین اور ثعلبہ بن منقد کے لوگ شامل تھے۔ بنی تمیم اپنے خطیب عطارد اور شاعر زبرقان کو مباہلے کے لیے ساتھ لائے تھے، ثابت بن قس نے تقریر اور حسان بن ثابت نے شاعری میں مباہلہ کیا ۔ ان کے سردار اقرع بن حابس نے عجز تسلیم کرکے اسلام قبول کیا ۔ شاہان حمیر کی تحریریں یمن سے آئیں آن میں اسلام کا اقرار تھا ۔ قبیلہ اسعد بن بکر کا سردار ضمام بن ثعلبہ مسلمان ہوا اور پھر اس کی کوشش سے اس کا پورا قبیلہ اسلام لایا۔

۹ھ میں بھی آپ خود حج کے لیے تشریف نہ لے گئے بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رض کو امیر حج مقرر کیا ۔ ان کی روانگی کے بعد سورہ براہ نازل ہوئی جس کے مطابق برہنہ حج منع ہوا، گھر کے کنڑوں میں حج کی اجازت ہوئی ۔ پرانی رسم کا حج موقوف اور غیر مسلموں کے لیے زیارت ممنوع ہوئی ۔ آپ نے حضرت علی رض کو بھیجا کہ جاکر حج کے موقع پر یہ سورۃ لوگوں کو سنا دیں ۔[1] انھیں دنوں عبداللہ بن ابی مر گیا ۔ اس کے بیٹے کی درخواست پر آپ نے اس کے کفن کے لیے اپنا کرتا عنایت فرمایا ۔ جنازے میں شرکت کے لیے جا رہے تھے کہ حضرت عمر رض نے راستے میں عبداللہ بن ابی کی منافقتیں گنوائیں ۔ آپ سنکر مسکراتے جاتے تھے ۔ آخر آپ نے فرمایا کہ میں جتنی بار بھی استغفار کروں اس کی مغفرت نہ ہوگی لیکن اگر مجھے علم ہو کہ کتنی بار استغفار سے اس کی مغفرت ہوگی تو میں ضرور کرتا ۔ دفن کے بعد ابھی مٹی دے کر لوٹے نہ تھے کہ آپ کو خدا نے وحی کے ذریعے ایسے بے دینوں کے جنازوں میں سرکت سے منع فرما دیا ۔

سلطنت روم کے زیر اثر معان کے شہر کا حاکم فروہ بن عمرو جذامی مسلمان ہو گیا تو رومیوں نے اسے گرفتار کر لیا، ارض فلسطین میں عضری نام ندی کے کنارے اسے لے جا کر مصلوب کیا، اس وقت اس نے اپنے ایک شعر کے ذریعے کہا، سرداران اسلام کو خبر کر دو کہ میری ہڈیاں اور میرا وطن پروردگار کے سپرد ہیں ۔ آپ نے سنکر دعائے مغفرت کی اور فرمایا اس کی ہڈیوں اور اس کے شہر کو اس کی التجا کے مطابق خدا نے اپنی امانت میں لے لیا ، عنقریب سارے شام و فلسطین پر اسلام کا قبضہ ہوگا ۔

ہجرت کے دسویں سال خالد بن ولید نے علاقہ نجران میں بنی حارث بن کعب کو دعوت اسلام دی۔ وہ سب مسلمان ہو گئے، مدینے حاضر ہوئے، واپسی میں عمرو بن حزم آپ کے حکم سے ان کے ہمراہ گئے ۔ اسی علاقے سے عیسائیوں نے عاقب اور سید نامی دو راہب چند رفقا کے ساتھ بھیجے ، انھوں نے آپ کو مباہلے کی دعوت دی، آپ نے قبول فرمائی لیکن وہ خود ہی باز آگئے اور ہر سال دو ہزار قبائیں جن میں سے ہر ایک کم از کم چالیس دینار کی ہو دینا قبول کر کے صلح کی ۔[2] ان کے علاوہ قبائل بنی غیثان ، بنی عامر ، بنی زبید ، بنی عبدالقیس ، بنی کندہ ، بنی محارب ، بنی صدف ، بنی خولان بھی حلقہ بگوش اسلام ہوئے ۔ شہر حرش کے قریب بنی ازد اور بنی خثعم میں جنگ ہوئی ۔ آخر دونوں قبائل نے اسلام قبول کیا ۔ شاہان کندہ کی قلمرو کا قبیلہ مراد اسلام لایا، خالد بن سعید بن عاص کو ان کے ہمراہ تبلیغ کے لیے بھیجا ۔ یمامہ اور بحرین سے بنی حنیفہ کا وفد آیا، ان کے ساتھ مسیلمہ بھی تھا جس نے واپس جا کر نبوت کا دعویٰ کیا اور آپ کو خط لکھ کر نصف حکومت طلب کی، آپ نے اسے کذاب قرار دیا ۔[3] طے کا ایک

۱۔ رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۲۹۷ ۔
۲۔ ابن ہشام: ص ۶۱۳ تا ۶۳۳، رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۲۳۹ تا ۲۴۸ ۔
۳۔ رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۲۲۳ ۔

سردار زیدالخیل حاضر ہوا ، آپ ؐ نے اس کے اوصاف کی بنا پر اسے زید الخیر کا لقب دیا اور قبیلے پر سردار مقرر کر کے واپس کیا ۔[1] مہاجر بن ابی امیہ کو صنعا و یمن ، زیاد بن ولید انصاری کو حضر موت ، زبرقان بن بدر اور قیس بن عاصم کو بنی سعد بن تمیم ، علاء بن الحضرمی کو بحرین ، حضرت علی رض کو یمن و بجران میں جزیہ و خراج وصول کرنے روانہ کیا ۔ حضرت علی رض کے اثر سے سارے بنی ہمدان مسلمان ہو گئے ۔

اس سال ماہ ذی قعدہ ختم ہونے سے پہلے ابو دجانہ ساعدی کو والی مدینہ مقرر کر کے حج کو روانہ ہوئے ۔ ذی الحلیفہ میں قیام کیا ۔ دوسرے دن ایک لاکھ چودہ ہزار کے لگ بھگ خلقت ہمراہ تھی ، مکہ پہنچے ۔ اپنے طرز عمل سے حج سکھایا ۔ مناسک حج کی تعلیم دی ۔ خطبہ ارشاد فرمایا اور مدینہ لوٹ آئے ۔[2] ہجرت کا گیارہواں سال شروع ہوتے ہی اسامہ بن زید کو سپہ سالار مقرر کر کے ارض فلسطین و شام کے لیے لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ تمام مہاجرین اول کو اس کے علم کے نیچے روانگی کا حکم تھا۔ اسی ماہ کے آخر میں آپ ؐ کی طبیعت ناساز ہوئی۔ حضرت عائشہ کے گھر سے رات غلام کے ساتھ جنت البقیع گئے ۔ دعائے مغفرت فرمائی ۔ پھر مرض بڑھنے لگا، شدت سے درد سر ہوا۔ خبر آئی کہ یمن میں اسود عنبسی، یمامہ میں مسیلمہ اور بنی اسد میں طلیحہ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ مسجد میں تشریف لائے فرمایا میں نے خواب میں بازوؤں پر دو سونے کے بازو بند دیکھے تھے جو پھونک سے اڑ گئے وہ یہی کذاب یمامہ اور کذاب صنعا ہیں ۔ پھر وعظ فرمایا اور جیش اسامہ کی روانگی کی تلقین کی ۔ مرتدوں کے مقابلے کو چند انصار روانہ کیے اور اسامہ روانہ ہو کر جرف میں پہنچے ۔ پھر نقاہت بڑھی تو حضرت ابوبکر صدیق رض کو امامت کا حکم دیا۔ خود بھی دو آدمیوں کے سہارے ابوبکر رض کے پاس آ کر بیٹھے ۔ پھر چند نصیحتیں کر کے حجرے میں گئے ۔ کچھ لوگوں کو حجرے میں بلوایا ، ضروری ہدایات دیں ۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو خالق حقیقی سے جا ملے ۔ حضرت عمر رض کی مجنونانہ کیفیت تھی، تلوار لیے مدینے کی گلیوں میں پھرتے کہ جس کسی نے آپ ؐ کے وصال کا نام لیا سر قلم کر دوں گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رض نے مسجد میں تقریر کی تو حضرت عمر رض کو ہوش آ گیا، حالت سنبھلی ۔ حضرت عائشہ کے حجرے میں ہی قبر کھودی گئی اور جملہ امور آپ ؐ کی ہدایت کے مطابق کر کے دفن کر دیا گیا۔[3]

آپ ؐ کے بعد خلافت کا معاملہ نازک صورت اختیار کرنے والا تھا ۔ تین گروہ بن گئے تھے لیکن حضرت عمر رض کی زیرکی نے صورت حال خراب نہ ہونے دی اور حضرت ابوبکر صدیق رض کے ہاتھ پر بیعت کر لی گئی ۔ بیعت کے دوسرے روز آپ نے منبر پر خطبہ دیا اور عام بیعت ہوئی، بعض لوگوں نے حضرت علی رض کو امیدوار بنانا چاہا لیکن انھوں نے گریز کیا ۔ مکہ میں آپ ؐ کے وصال کی خبر پہنچی تو سہیل بن عمرو کے خطاب نے لوگوں کو ارتداد سے بچا لیا ۔ اسود عنبسی نے مسلمان حاکموں کو یمن کے علاقوں سے نکال دیا تھا، وہ خود آپ ؐ کے وصال سے ایک دن پہلے مارا گیا اور یمن پھر اسلام کے تسلط میں آ گیا ۔ ابوبکر صدیق رض نے منصب خلافت سنبھالتے ہی

۱۔ رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۲۲۴ ۔

۲۔ رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۲۹۸ تا ۳۱۴، شرر نے خطبہ حجۃ الوداع تفصیل سے ناول میں درج کیا ہے ۔

۳۔ رحمۃ للعالمین، ج ۱ ، ص ۳۱۵ تا ۳۲۸ ۔ سیرت کی دیگر جملہ کتب میں بھی یہ امور اسی طرح بیان ہوئے ہیں ، ہم نے طوالت کے خوف سے حوالے نہیں دیے۔

اسامہ کے جیش کو اصحاب اور بالخصوص حضرت عمرؓ کی مخالفت کے باوجود مہم پر روانہ کیا اس وقت تمام قبائل عرب سوا قریش اور بنی ثقیف کے مرتد ہو رہے تھے۔ مسلمہ اور طلیحہ کی شورشیں بڑھ رہی تھیں، یمامہ اور بنی اسد کے لیے مقرر کردہ حاکم مدینے واپس لوٹ آئے تھے۔ لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس بات پر سختی سے اڑ گئے کہ امور دین میں کوئی نرمی نہ کی جائے گی۔ بنی اسد، بنی فزارہ، بنی غطفان اور بنی طے نے طلیحہ کی پیروی کر کے مدینہ پر حملے کی تیاری کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت طلحہؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور عبداللہ بن مسعود کو انصار پر سردار مقرر کر کے شہر کی حفاظت سپرد کی اور خود دیگر مسلمانوں کو ہر وقت مسجد نبوی میں جمع رہنے کا حکم دیا۔ تیسرے دن مدینہ پر حملہ ہوا، حفاظتی فوج نے روکا، حضرت ابوبکرؓ بھی اہل مسجد کے ہمراہ جا پہنچے، حملہ آوروں کے دونوں گروہ شکست کھا کر بھاگے۔ اسامہ مرتدین بنی قضاعہ کی سرکوبی کرتے ہوئے سرحد شام سے ہو کر چالیس دن میں واپس آ گئے۔ ان کے لشکر کو آرام کا موقع دے کر حضرت ابوبکرؓ خود مرتدوں کے خلاف لشکر کشی کو نکلے۔ ذی حسی، ذی قصہ ہوتے ہوئے براق پہنچے اور مرتدوں کے زبردست لشکر کو شکست دے کر ان کے سردار حطہ کو پکڑ لیا اور بنی ذبیان کی سرکوبی کرتے ہوئے لوٹ آئے۔ واپس آ کر اسامہ کے لشکر کو گیارہ حصوں میں تقسیم کر کے خالد بن ولید کو طلیحہ، علاوہ بطاح اور مالک بن نورہ کی طرف، عکرمہ بن ابی جہل کو مسیلمہ کی طرف، مہاجر بن امیہ کو یمن اور حضرموت، خالد بن سعید کو سرحد شام کی طرف، عمرو بن عاص کو بنی قضاعہ، حذیفہ بن محصن الغطفانی کو اہل وبا کے مقابلے پر، عرفجہ بن ہرثمہ کو قبائل مہرہ و حذیمہ کے بعد حذیفہ کی کمک پر، شرحبیل بن حسنہ کو عکرمہ کی تقلید پر، معن بن حاجر کو بنی سلیم و بنی ہوزان کے مقابلے پر، سوید بن مقرن کو یمن کے علاقہ تہامہ اور علاء بن الحضرمی کو بحرین کے علاقہ پر لشکر کشی کے لیے مامور کیا۔

حضرت خالدؓ کے بڑھتے ہی بنی طے و بنی جدیلہ مرتدوں سے کٹ کر لشکر اسلام سے آ ملے۔ طلیحہ شکست کھا کر سرحد شام کی طرف بھاگا اور بنی کلب میں ٹھہرا۔ بنی عامر نے توبہ کی، بنی اسد سے نقصان لیا گیا، ان کے سرکش سردار گرفتار اور ام زبل قتل ہوئی۔ یمامہ اور عکرمہ کے لشکروں نے مسیلمہ کے خلاف موثر کارروائی شروع کی۔ تمیمہ عورت سجاع بنت حرث ارض جزیرہ سے نبیہ ہونے کے دعوے کے ساتھ جرار لشکر لے کر تباہی مچاتی ہوئی آئی۔ مسیلمہ کے ساتھ تین روزہ شادی کر کے دو نمازیں مہر میں اس سے معاف کروا کر لوٹ گئی۔ بنو کلب بھی طلیحہ سے الگ ہو گئے۔ خالد نے بنی فزارہ، بنی غطفان اور بنی اسد کے فتنے مٹا دیے۔ مالک بن نویرہ پشیمان ہوا لیکن ایک غلط فہمی میں قتل ہوا اور خالدؓ نے اس کی بیوہ ام تمیم سے نکاح کر لیا جس کے بارے میں حضرت عمرؓ کی شکایت پر خالدؓ کو اظہار وجوہ کے لیے مدینہ حاضر ہونا پڑا اور عذر قبول ہوا۔ پھر مسیلمہ کے مقابلے پر لوٹے سخت جنگ میں مسیلمہ قتل ہوا۔ اس جنگ میں مدینہ کے مہاجرین و انصار سے ۳۶۰ اور مہاجرین غیر مدینہ سے ۳۰۰ صحابی شہید ہوئے بنی حنیفہ کے اکیس ہزار آدمی قتل ہوئے۔ علاء بن الحضرمی نے بحرین کی مہم میں منذر بن نعمان کو گرفتار کیا، سمندر پر پیدل سفر کر کے دارین فتح کیا۔ پھر عمان اور مہرہ کے علاقے میں جب تین اسلامی لشکر جمع ہوئے تو دس ہزار مرتد مقابلے میں قتل ہوئے۔ صنعاو یمن میں بنی مدلج بنی خزاعہ اور بنی کنانہ کے مرتدوں کا قلع قمع ہوا۔ بنی نخع اور بنی حمیر نے بھی توبہ کر لی۔

عکرمہ نے حضرموت پہنچ کر بنی کندہ کے مرتدوں کو شکست دی ۔ بحرین و عمان کے مرتدوں کی سرکوبی کے بعد مثنیٰ بن حارثہ کو عراق پر لشکر کشی کی اجازت مل گئی ۔ خالد اور عیاض بن غنم بھی اپنے لشکروں کے ساتھ ان کی کمک کو پہنچے۔ خالد نے سرحدی شہروں کو مطیع کر کے آل نعمان کی تمام سلطنت کو ساسانی غلامی سے نکال کر عرب میں شامل کیا۔ اردشیر والی عجم کے سردار ہرمز سے مقابلہ ہوا وہ شکست کھا کر قتل ہوا ۔ حوئے ثنا کے قریب ایرانیوں کے دوسرے لشکر سے مقابلہ ہوا جہاں ایرانی تیس ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگے، یہیں حسن بصری مسیحی بھی اسیر ہوئے ۔ دلجہ میں تیسرے زبردست ایرانی لشکر کو شکست ہوئی ۔ چوتھا ایرانی لشکر جو بنی بکر بن وائل کی کمک پر آیا تھا فرات کے کنارے خالد کے ہاتھوں تباہ ہوا، اس میں دسمنوں کے ستر ہزار آدمی مارے گئے اور فرات کا نام اس وقت سے نہرالدم ہوا ۔ پھر خالد نے حیرہ کے باغیوں کی سرکوبی کی ۔ حاکم ساباط شیرزاد نے شکست کھائی ، شہر انبار فتح ہوا، دومتہ الجندل میں اکیدر کو شکست ہوئی ۔ اہل جزیرہ کے عربوں کی دعوت پر آنے والے ایرانی لسکروں کو شکست دی۔ فراض میں رومیوں سے زبردست جنگ ہوئی جس میں ان کے ایک لاکھ آدمی مارے گئے ۔ عراق سوق بغداد پر قبضہ ہوگیا ۔ خالد بن سعید نے سرحد شام سے پیش قدمی کی ۔ دربار خلافت سے یزید بن سفیان اور ابوعبیدہ بن الجراح دو لشکر لے کر چلے ۔ ہرقل کی فوجوں سے مقابلے جاری تھے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ دو سال تین ماہ دس دن مسند خلافت پر متمکن رہ کر خالق حقیقی سے جا ملے ۔ حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ مقرر ہوئے۔ انھیں دنوں حضرت خالدؓ نے یرموک میں شاندار فتح حاصل کی ۔ یرموک کی جنگ میں رومی دو لاکھ چالیس ہزار زبردست آہن پوش سہ گروں کا لشکر لے کر آئے تھے ۔ شکست خوردہ رومیوں کا مدائن تک تعاقب کیا گیا ۔ اس کے فوراً بعد ہی خالدؓ نے بصریٰ پر بھی قبضہ کر لیا ۔

سیرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھی ہوئی تمام مستند کتب اور طبری، ابن الاثیر، ابن خلدون ، اور قدیم اسلامی کتب تواریخ سے ان جملہ واقعات کی تصدیق ہوتی ہے ۔ شرر نے اس ناول میں انتہائی مستند واقعات کو شامل کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے ۔

۲۲- طاہرہ

یہ ناول ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں شرر نے تاریخ کا عنصر اور تاریخی واقعات کو بہت کم استعمال کیا ہے اور ایک خاتون کی داستان بیان کی ہے جو غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے دور سے متعلق ہے ۔ ناول میں بیان کردہ واقعات کا خلاصہ یہ ہے :

لائق الدولہ بہادر نے اپنا قصہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ایک دن بچپن میں والد کے ساتھ نصیر الدین حیدر کی ڈیوڑھی پر گیا اور سب سے چھپ کر اندر گھس گیا ۔ آہستہ آہستہ بادشاہ کے قریب جا پہنچا۔ بادشاہ نے اسے دیکھ کر اس کے کپڑوں پر پیک کی کلی کر دی ۔ اس نے ناک بھوں چڑھائی ۔ بادشاہ نے کہا تم نے ناک کیوں چڑھائی تو اس نے فوراً کہا تم نے کلی کیوں کی ۔ بادشاہ نے تلوار کھینچ لی کہ مار دوں گا، اس نے جواب دیا مارو دیکھوں کیسے مارتے ہو! یہ فقرہ سنتے ہی بادشاہ کا غصہ ایک دم اتر گیا اور اس کے باپ کو بلا کر کہا تمھارا لڑکا بڑا بہادر ہے، ہم نے اسے رسالہ نادری کا رسالدار مقرر کیا ۔ اس کے بعد اسے شہسواری کی تعلیم دی جانے لگی اور فنون جنگ سکھائے جانے لگے ۔ لائق الدولہ ۱۸۵۷ء تک رسالدار رہا ۔ لائق الدولہ نے اپنی

تعلیم کے بارے میں بتایا کہ انھوں نے بچپن میں ایک بیگم صاحبہ کے مہربان ہو جانے سے علم حاصل کیا اور انھیں سے پڑھا ۔ اس کے بعد لائق الدولہ نے اس بیگم یعنی طاہرہ کی داستان یوں بیان کی ہے :

لکھنئومیں لوہے کے پل کے قریب بیلی گارد (ریذیڈنسی) کی مشرقی دیوار کے نیچے لائق الدولہ کا مکان تھا اور اُن کے مکان سے ملا ہوا ایک عالیشان محل تھا جس میں طاہرہ بیگم اکیلی رہتی تھیں ۔ اُن کے دروازے پر دو خدمت گار چار پہرے والے اور اندر پیش خدمتیں، مغلانیاں سب موجود تھیں لیکن سوائے چند انگریز عورتوں کے کبھی اور نہ کوئی اُن سے ملنے آتا نہ وہ کسی کے یہاں جاتیں ۔ اس لیے شہر میں اُن کے متعلق طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں، بعض کہتے عیسائی ہو گئی ہیں ۔ لائق‌الدولہ کی عمر آٹھ سال تھی اور انھیں رسالدار بے ہوئے مہینہ ہی ہوا تھا کہ بیلی گارد سے دو انگریز عورتیں آئیں ۔ لائق‌الدولہ اپنے دروازے کے آگے کھیل رہا تھا، ان میموں کو دیکھتے ہی نہ جانے دل میں کیا سمائی کہ تلوار کھینچ کر جرنیلی سلام کیا ۔ وہ بہت ہنسیں پوچھا کون ہو؟ بتایا نادری رسالے کا رسالدار، وہ اپنے ساتھ اُسے بھی طاہرہ بیگم کے پاس لے گئیں ۔ لائق‌الدولہ نے طاہرہ بیگم کو بھی سلام کیا ۔ وہاں انھوں نے شفقت سے بٹھایا، پھر پہرے داروں سے کہلوا دیا کہ اس بچے کو اندر آنے سے نہ روکیں ۔ چنانچہ طاہرہ بیگم کے یہاں آنا جانا شروع ہوگیا ۔ گھنٹوں اُن کے پاس بیٹھتا ۔ انھوں نے پڑھانا شروع کیا ۔ ایک روز والدہ نے ٹوکا کہ وہاں مت جایا کرو، وہ خود تو اپنا مذہب خراب کر بیٹھی ہیں، تمھیں بھی گمراہ کر دیں گی ۔ لائق‌الدولہ نے بچپن کے بھولپن سے یہ بات طاہرہ بیگم سے جا کہی ۔ انھوں نے اس کی والدہ کی تیسرے دن دعوت کی ۔ دعوت کے بعد اُسے اپنی آپ بیتی سنائی ۔ لائق الدولہ بھی پاس بیٹھا سنتا رہا ۔ وہ آپ بیتی یہ تھی :

طاہرہ بیگم چھوٹی سی تھیں کہ سندیلے میں ان کی والدہ، بھائی طاعون سے مر گئے ۔ والد صفی‌اللہ نے اپنے چھوٹے بھائی مولوی عزیز اللہ کے سپرد کر دیا جو ریذیڈنسی کے ملازم تھے اور ریذیڈنٹ کے مددگار کپتان مکنتاش اور ان کی بیگم اُن کے حال پر بڑے مہربان تھے ۔ مولوی عزیزاللہ کے والد چونکہ انگریزوں کے خدمت گار تھے اس لیے عزیزاللہ کی تربیت بھی صحن میں وہیں ہوئی اور رشتہ داروں نے انھیں انگریزی خواں سمجھ کر ملنا جلنا چھوڑ دیا، وہ خود بھی کسی سے نہ ملتے ۔ طاہرہ کو لیڈی مکنتاش روز آ کر انگریزی، عربی اور فارسی پڑھاتیں، وہ اسے بیٹی کی طرح سمجھتی تھیں ۔ عزیزاللہ کا ایک ہی بیٹا تھا، جو فرنگی محل میں مولوی محمد معین کے زیر درس تھا ۔ جب طاہرہ کی عمر اٹھارہ سال کی ہوئی تو عزیزاللہ نے ولی‌اللہ سے اس کی شادی کا فیصلہ کیا ۔ کپتان اور لیڈی مکنتاش نے طاہرہ کا تمام جہیز خود تیار کرنے کا ذمہ لیا ۔ ولی‌اللہ کو خبر ہوئی تو اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرے گا جو میموں سے ملتی ہے، انگریزی خواں ہے ۔ اس کے عقائد بھی مشکوک ہوں گے ۔ والد نے سمجھایا، والدہ روئی پیٹیں، کپتان مکنتاش نے بلا کر نصیحت کی مگر بے سود ۔ والد اُسے فرنگی محل لے کر گئے تو معلوم ہوا کہ اس کے اُستاد صاحب ہی نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ نکاح جائز نہیں ۔ مولوی محمد معین نے بلا سوچے سمجھے یہاں تک کہہ دیا کہ مولوی عزیزاللہ بھی انگریز کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں اس لیے خود اُن کے بارے میں بھی ارتداد کا شبہ ہو سکتا ہے ۔ مولوی عزیزاللہ نے غصے میں ولی‌اللہ کو برا بھلا کہا اور دفتر چلے گئے ۔ ولی‌اللہ بھی گھر سے نکل گیا اور کپتان مکنتاش کو

خط لکھا کہ وہ ملک چھوڑ کر جا رہا ہے، اپنی آنکھوں سے مصر و عرب میں جا کر دیکھے گا کہ وہاں علما کا اہل کتاب کے ساتھ کیا سلوک ہے ۔ ولی اللہ کے گھر چھوڑ جانے کی خبر پر اس کی والدہ بہت چیخی چلائیں اس لیے عزیزاللہ اس کی تلاش میں بہت ادھر اُدھر دوڑے، وزارت کے ذریعے بھی تلاس کروائی مگر بے سود ۔ ولی اللہ کے فراق کے غم میں پندرہ دن کے اندر اندر اس کی والدہ اور والد دونوں چل بسے ۔ عزیز اللہ نے مرتے ہوئے طاہرہ کو لیڈی و کپتان مکنتاش کے سپرد کیا ۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی بٹی کی طرح رکھیں گے ۔ چالیسویں پر کپتان صاحب نے ایک مکان جو لائق الدولہ کے پڑوس میں تھا، طاہرہ کو خرید دیا ۔ خدمت گار مقرر کر دیے اور ریذیڈنسی سے اس کا پانچ سو روپے ماہوار خرح مقرر ہوگیا ۔ عزیزاللہ نے سات ہزار روپیے نقد اور زیورات وغیرہ چھوڑے تھے وہ بھی طاہرہ کے سپرد ہوئے ۔ لیڈی مکنتاش روز اس کی احوال پرسی کو آتیں ۔ شادی کے بارے میں انھوں نے ایک دو بار کہا تو طاہرہ نے انکار کر دیا اور کہا بس ایک بار جس کے ساتھ نام لگ چکا عمر بھر اس کے نام پر کنواری رہوں گی ۔ اس دوران شہر سے بعض عورتیں روز نیا پیغام لاتیں، انکار کرتے کرتے طاہرہ نے تنگ آ کر گھر میں عورتوں کا داخلہ بھی بند کرا دیا ۔ اس طرح پانچ سال گزرے تھے کہ کپتان مکنتاش ریٹائر ہو گئے اور گفمن نے ان سے چارج لیا ۔ کپتان صاحب نے اسے طاہرہ کے متعلق سب کچھ بتایا ۔ لیڈی مکنتاش مسز گفمین کو طاہرہ سے ملانے لائیں ۔ طاہرہ کی نگہداشت اُن کے سپرد کرکے کپتان اور لیڈی مکنتاس کلکتہ چلے گئے ۔ طاہرہ کو ریذیڈنسی سے مقررہ وظیفہ ملتا رہا ۔

ان واقعات کے تین سال بعد ایک شخص نے خود کو صفی اللہ کا بیٹا اور طاہرہ کا سوتیلا بھائی ظاہر کرکے زبردستی طاہرہ کے گھر میں گھسنے کی کوشش کی ۔ طاہرہ نے ملنے سے انکار کر دیا اور ایک آدمی کو خفیہ اس کے پیچھے لگا کر اس کی جائے رہائش معلوم کرائی ۔ ایک ہفتے بعد اسی شخص نے پھر آ کر دروازے پر شور مچایا کہ وہ شرعاً طاہرہ کا ولی ہے اس سے ضرور ملے گا ۔ مسز گفمین بھی آ پہنچی، اس شخص نے ان سے بھی ہتک آمیز گفتگو کی لیکن جب انھوں نے گارد بلا لی تو وہ بھاگ نکلا ۔ گفمین نے ریذیڈنٹ سے ذکر کرکے اس آدمی کے گھر چوکی بٹھا کر اسے گرفتار کروا لیا ۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ وہ شخص کسی طرح طاہرہ کے گھر داخل ہو کر طاہرہ پر قبضہ کرکے شادی کرنا چاہتا تھا، اسے پانچ سال کی سزا ہوئی ۔

اس واقعے کے چھ سات ماہ بعد خبر آئی کہ کپتان صاحب انتقال کر گئے ہیں اور اُن کی وصیت کے مطابق ان کے پانچ لاکھ پونڈ کے حصص، جن کی مالیت پچاس لاکھ روپے تھی، کی واحد وارث طاہرہ قرار پائی ہے، حصص کا ماہوار منافع پچیس ہزار تھا جس میں سے لیڈی مکنتاش کو پانچ ہزار ماہوار مہتمم کی حیثیت سے دینا قرار پایا تھا باقی رقم ماہ بہ ماہ طاہرہ کو ملنے لگی ۔ طاہرہ اُن بیس ہزار میں سے پانچ ہزار خرچ کے لیے لے کر ایک ہزار میں خرچ چلاتی اور چار ہزار راہ خدا میں بیواؤں، غریبوں اور مساجد میں تقسیم کرا دیتی ۔

طاہرہ خانم کی یہ داستان سن کر لائق الدولہ کی والدہ کو اُن سے ایک گونہ انس پیدا ہو گیا ۔ اس کے بعد پانچ چھ برس گزر جانے پر طاہرہ کے مزاج میں یکایک چڑچڑاپن پیدا ہو گیا ۔ کچھ عرصے بعد ولی اللہ نامی ایک شخص حاجیوں کے لباس میں آیا ۔ طاہرہ نے اسے اندر بٹھا کر حالات سنے ۔ ولی اللہ اپنے سابقہ رویے پر نادم تھا ۔ اسے عراق ایران مصر وغیرہ میں پھر کر علماء سے درس لینے کے بعد طاہرہ سے شادی کا انکار کرنے کی غلطی کا شدید احساس ہوا ۔ سید مرتضیٰ زبیدی کو

اس نے اپنا ماجرا سنایا تو انھوں نے حکم دیا فوراً واپس جاؤ شاید تمھارے والدین زندہ نہ ہوں لیکن اگر اس لڑکی نے عقد نہ کر لیا ہو تو اس سے عقد کرو اسی میں بہتری ہے۔ طاہرہ نے ولی اللہ کو اچھی طرح پرکھا، پھر وہ خود ہی مولوی محمد معین سے فتویٰ لکھوا لایا کہ یہ شادی جائز ہے وہ سابقہ فتوے سے رجوع کرتا ہے۔ شادی ہوئی۔ کچھ عرصہ وہاں قیام رہا، پھر دونوں مکان طاہرہ نے لائق الدولہ کو دے دیے اور ریذیڈنٹ سے کہلوا کر اپنے حصص مصر منتقل کرا لیے اور ولی اللہ کے ساتھ وہیں چلی گئیں۔ طاہرہ بیگم ایک بیٹا اور دو بیٹیاں چھوڑ کر مصر میں انتقال کر گئیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد لائق الدولہ کا گھر بار لٹا اور وہ کلکتہ جا کر منشیوں اور نثاروں میں ملازم ہو گیا۔

تحقیقی جائزہ

"طاہرہ" میں شرر نے تاریخی عنصر کو بہت کم استعمال کیا ہے۔ انھوں نے تاریخ سے صرف چند نام لیے ہیں اور جغرافیائی حقیقتوں سے بعض مقامات کے نام۔ اس ناول میں بیان کردہ واقعات میں سے جن کا تھوڑا بہت تاریخ سے تعلق ہو سکتا ہے وہ یہ ہیں کہ لائق الدولہ بہادر کے والد نصیرالدین حیدر کے دربار میں ملازم تھے، نصیرالدین حیدر نے لائق الادولہ بہادر کو اس کے ایک جواب میں خوش ہو کر آٹھ برس کی عمر میں رسالہ نادری کا رسالدار مقرر کیا تھا۔ نصیرالدین حیدر کی بیگانہ حرکات کا کتب تواریخ برملا ذکر کرتی ہیں۔ نجم الغنی کی تاریخ اور شرر کا گذشتہ لکھنؤ بھی نصیر الدین حیدر کی عباسی، زنانہ صحبتوں اور بیگانہ حرکتوں کی شہادت دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں شرر نے لکھنؤ کے ریذیڈنٹ جنرل لو ان کے اسسٹنٹ کپتان مکنتاس، لیڈی مکنتاس، مولوی عزیزاللہ کے والد، مولوی عزیزاللہ۔ مکنتاس کی ریٹائرمنٹ پر مسٹر گف مین کے تقرر کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ نام ہیں جو تاریخ میں مل جاتے ہیں، فرنگی محل کے بارے میں بیان کردہ روایات بھی تاریخی اعتبار سے درست ہیں۔ ناول میں کچھ نام لکھنؤ کے مختلف مقامات کے بھی آتے ہیں مثلاً بیلی گارد کا محلہ، حیدر گنج، دہرے مناروں والی مسجد وغیرہ ان کا ذکر بھی کتب تواریخ سے ثابت ہے۔

جغرافیائی مقامات کا ذکر ولی اللہ کے سیاحت نامے میں آتا ہے۔ افغانستان سے غزنین، غزنین سے دریائے ہلمند کے پار اتر کر ہرات پہنچنا جو میر زاہد ہروی کا وطن تھا۔ پھر دریائے سبزوار کے پار خراسان پہنچنا جس کے راستے خطرناک تھے اور قزاقوں کا خوف رہتا تھا۔ پھر مشہد، وہاں امام علی رضا کا روضہ، پھر شہر طوس پہنچنا وہاں ہارون الرشید کی قبر، پھر نیشاپور جو کبھی علم و فن کا مرکز تھا لیکن تاتاریوں نے اسے نیست و نابود کر دیا۔ پھر وہاں سے شمال مشرق کی طرف جاجرم، پھر استر آباد اور بحر قزوین کے کنارے کنارے ہوتے ہوئے شہر آمل پہنچنا جو علامہ بہاء الدین آملی کا وطن تھا۔ یہ مقام مازندران کے ملک میں ہے اور بحر قزوین کی بندرگاہ مازندران کو ایرانیوں کی قدیم کتب تواریخ میں دیووں کا مسکن بیان کیا گیا ہے۔ آمل سے طہران کی طرف کوہ البرز میں سفر۔ البرز کی چوٹیوں کا سارا سال برف سے ڈھکا رہنا۔ طہران سے ہمدان اور پھر اصفہان اور وہاں سے اصطخر کے کھنڈروں سے ہوتے ہوئے جو ساسانیوں کی یاد دلاتے تھے شیراز پہنچنا۔ شیراز کو سعدی، حافظ، ابواسحق اور ملا صدر کا وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ وہاں گلگشت موصلی اور نہر رکنی دیکھنا۔ پھر شمال کی طرف گذروں، شوستر، خرم آباد، کرمان شاہ کی طرف سفر کرتے ہوئے ان پہاڑوں میں پہنچنا جہاں بابک خرمی نے خلافت عباسیہ کو مدتوں پریشان کیے رکھا۔ علاقہ آذربیجان سے تبریز، کوہ ارارات اور کوہ قاف کی طرف بڑھتے ہوئے شہر اروان اور شہر باکو دیکھنا، پھر کوہ قاف کے مغرب میں تفلس میں پہنچنا وہاں

سے فارس اور ارض روم ہوتے ہوئے دجلہ کے ساتھ ساتھ بڑھ کر بطلیس اور موصل پہنچنا ، وہاں سے تکریت ، بغداد ، کوفہ اور بصرہ کا سفر ، کوفہ و بصرہ کی اہمیت ، عربی صرف ونحو اور رسم الخط کے سلسلے میں ان شہروں کی خدمات پھر دریائے فرات کے پار اتر کر کربلا اور مشہد حسنؓ سے ہوتے ہوئے بابل کے کھنڈرات ، تل نمرود ، بیرنابل اور شہر حلہ دیکھتے ہوئے آگے بڑھنا اور قافلوں کے ساتھ سفر کر کے مدینہ منورہ پہنچنا ۔ غرض اس سیاحت نامے میں جتنے جغرافیائی مقامات بیان ہوئے ان کا محل وقوع اور ان کی تاریخی اہمیت مستند ہے ۔ ان مقامات سے متعلق بیان کردہ امور کی تصدیق لی سٹرینج کی خلافت بلاد مشرق اور تاریخ فلسطین و شام ، ایران کے جغرافیوں وغیرہ سے ہوتی ہے ۔ ان کتب کے حوالہ جات قبل ازیں فردوس بریں کے سلسلے میں دیے جا چکے ہیں ۔

۲۳۔ مینا بازار

یہ ناول ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا ۔ اس کے طبع اول کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے "۱۹۲۳ء و ۱۹۲۴ء کے خریداران دلگداز کی نذر کیا گیا . . . . اور ۱۹۲۵ء میں دلگداز پریس واقع کٹرہ بزن بیگ خان لکھنؤ میں طبع ہو کر شائع ہوا۔" یہ ناول عہد شاہجہانی سے متعلق ہے اور اس کا مرکزی کردار خود شاہجہان ہے ۔ ناول کے نام سے اس کا موضوع ظاہر ہے ۔ شرر کے تاریخی ناولوں میں تاریخی واقعات کے اعتبار سے اس ناول کو سب سے کمزور ترین ناول قرار دیا جا سکتا ہے ۔ اس ناول کے موضوع کو اختیار کرتے ہوئے شرر نے تاریخی حقائق کی جستجو کی طرف چنداں توجہ نہیں دی ۔ ناول میں بیان کردہ واقعات کا خلاصہ یہ ہے :

درباریوں نے شاہجہان کے سامنے اکبر کی مصلحت بینی کا ذکر کرتے ہوئے دیگر باتوں کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ اکبر نے مینا بازار کا آغاز اس لیے کیا کہ اس طرح پردے میں بیٹھنے والی خواتین کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملے ۔ مسلمان عورتیں ہندو عورتوں سے مل کر شوہر پرستی سیکھیں اور ہندو عورتیں ان سے شائستگی کا سبق لیں ، اسلام سے متاثر ہو کر اپنے خاوندوں کو بھی اسلام کی طرف مائل کریں۔ پھر شاہجہان کے استفسار پر اسے اکبر کے میناباز ار کی تفصیلات بتائی گئیں ۔ بادشاہ نے تاج محل ممتاز الزمانی ارجمند بانو بیگم سے بھی اس سلسلے میں گفتگو کر کے اسے ہمنوا بنا لیا اور مینا بازار کے لیے عمارت کی تیاری کا حکم دے دیا گیا ۔ بادشاہ نے اس کی تعمیر میں خصوصی دلچسپی لی اور تین ماہ میں عمارت مکمل ہو گئی اور مینا بازار کے افتتاح کی تاریخ مقرر کر کے اس کا اعلان کر دیا گیا ۔ مینا بازار کا اعلان شہر میں موضوع بحث اور وجہ اختلاف بن گیا ۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے اس کے خلاف فتویٰ دیا ، علماء کی بحث کے بعد نقاب کے استعمال کی اجازت دے دی گئی ۔ بارہ سو دکانیں سجیں ، افتتاح ہوا ۔ شاہجہان خود بھی مینا بازار میں گیا، آدھی رات تک سیر کی پھر دوسرے دن دوبارہ گیا۔ اسی دن ایک خوبرو اور شوخ ادا دوشیزہ کی گفتگو اور حسن نے اس پر جادو کر دیا ۔ بادشاہ نے اسے محل میں رات کے کھانے پر طلب کیا ۔ یہ نازنین جس کا اصل نام گل رخ بیگم تھا پنج ہزاری منصب دار اور نامی رسالدار جمال خان کی بیوی تھی ۔ شادی کے بعد خاوند نے اس کا نام جمال آرا رکھا تھا ۔ وہ خود بھی اس کے حسن کا دیوانہ تھا اور اسے کہیں آنے جانے نہیں دیتا تھا۔ مینا بازار میں اس نے اسے بڑی مجبوری سے بھیجا تھا لیکن تاکید کر دی تھی کہ کسی کے سامنے بھی بغیر نقاب کے نہ آئے۔

بادشاہ نے محل میں واپس جا کر ملکہ سے بھی گل رخ بیگم کا ذکر کیا۔ ملکہ نے افسوس ظاہر کیا کہ بادشاہ نے بغیر سوچے سمجھے نہ معلوم کسے طلب کر لیا ہے۔ اس سے قبل کہ گل رخ جمال خان کو کوئی اطلاع دے سکتی اس کے لینے کے لیے شاہی سواری وہاں پہنچ گئی اور اسے مجبوراً آنا پڑا۔ اس نے بادشاہ کو بتایا کہ اس کا خاوند بہت وہمی ہے اور اس طرح آ جانے پر اسے جو بدگمانی ہوگی اسے دور نہیں کیا جا سکے گا۔ ملکہ نے بادشاہ کو گل رخ سے تنہائی میں ملنے کا موقع فراہم کیا۔ بادشاہ نے اس کے ساتھ بے تکلفی کا انداز اختیار کر لیا اگرچہ وہ طوعاً و کرہاً جواب دے رہی تھی۔

دوسری صبح بادشاہ نے جمال خان کو دربار میں طلب کیا۔ اسے رات ہی بیوی کے محل میں جانے کی خبر ہو چکی تھی اور تمام رات غیرت میں جلتا رہا تھا۔ جمال خان کو بادشاہ نے کہا کہ اس کی بیوی کی تہذیب اور شائستگی اسے پسند آئی ہے وہ اسے ملکہ سے ملانے لایا ہے، تین دن مہمان رکھ کر واپس کر دے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، چوتھے دن گل رخ بیگم کو انعام و خلعت دے کر رخصت کیا گیا۔

دربار سے واپس جانے کے بعد بھی جمال خان کی بدگمانی بدستور تھی۔ اسے جہانگیر اور مہرالنساء کا قصہ یاد آیا۔ اس کے دوست جان سپار خان نے اس کی بدگمانی کو دور کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ گل رخ کی بہن شوکت آرا نے بھی اس کی بے بسی اور مجبوری کی وکالت کی لیکن اتنے میں جب گل رخ واپس پہنچی تو جمال خان نے اس سے تلخ ترش باتیں کر کے اسے طلاق بائن دے دی۔ شوکت آرا گل رخ کو اپنے گھر لے گئی۔

گل رخ عجب کشمکش میں تھی، شوکت آرا کی تجویز تھی کہ بادشاہ سے فریاد کی جائے لیکن اس نے اختلاف کیا، وہ جمال خان کو سزا نہیں دلوانا چاہتی تھی۔ جان سپار خان خود امیدوار بن کر آیا لیکن ٹھکرا دیا گیا۔ دوسرے دن جان سپار خان نے بادشاہ کو جا خبر کی۔ بادشاہ نے جمال خان کی گرفتاری اور گل رخ کی تلاش کا حکم دیا۔ جمال خان گرفتار کر لیا گیا اور گل رخ کو بھی فوراً ملکہ کے پاس بھیجا دیا گیا جہاں اسے مجبوراً سب ماجرا بیان کرنا پڑا۔ گل رخ نے بہت چاہا کہ بادشاہ جمال خان کو معاف کر دے اور یہ بھی کہا کہ وہ اب صرف اسی کے نام پر بیٹھی رہے گی لیکن بادشاہ نہ مانا اور کہا علماء کے فتوے پر فیصلہ ہوگا۔

دوسرے دن دربار میں بادشاہ نے علامی افضل خان کو علماء کے فتوے کے لیے مسودہ لکھوایا دوسرے دن فتویٰ پیش ہوا بادشاہ نے پڑھ کر تین بار مستوجب قتل کہا اور ہاتھی کے پاؤں کے نیچے کچلوا دینے کا حکم دیا۔ سہ پہر کو سزا دینے کا حکم ہوا۔ گل رخ سزا سن کر بے ہوش ہو گئی۔ ہوش میں آئی تو ملکہ نے کہا گل رخ پھر سفارش کرے اور بتایا کہ جب جمال خان کو قتل گاہ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو اس نے اپنی آخری آرزو بادشاہ سے بالمشافہ گفتگو بیان کی ہے اس لیے ایک دن کے لیے سزا ملتوی ہو گئی ہے۔ گل رخ رات کو بادشاہ سے پھر سفارش کرے۔

رات کھانے پر جب گفتگو ہوئی تو گل رخ کا یہی اصرار تھا کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گی۔ آخر بادشاہ نے ملکہ کی موجودگی میں گل رخ سے صاف کہہ دیا کہ اگر وہ بادشاہ سے شادی قبول کر لے تو جمال خان کی سزائے موت ٹل سکتی ہے۔ گل رخ نے صبح تک فیصلے کے لیے مہلت چاہی۔ تنہائی میں ملکہ نے بھی گل رخ کو اونچ نیچ سمجھا کر اسے بادشاہ سے شادی پر آمادہ کرنا چاہا اور صبح سویرے پھر گفتگو کی۔ گل رخ نے حالات کے تمام پہلوؤں پر غور

کر کے مجبوراً بادشاہ کے سامنے اقرار کر لیا۔
اس دن دربار لگا تو بادشاہ مسرور نظر آرہا تھا۔ جاں سپار خان جمال خان کے مارے جانے کا متمنی تھا کہ شاید اس طرح گل رخ سے اس کی شادی ہو جائے۔ جمال خان دربار میں پیش ہوا تو جان سپار خان نے گواہی دی کہ اس نے بادشاہ کو زانی اور گل رخ کو زانیہ کہا تھا۔ بادشاہ بھانپ گیا اور جان سپار خان سے اس نے اقرار کرا لیا کہ وہ گل رخ کا امیدوار ہے اور جمال خان سے اس کی دوستی اور بادشاہ سے شکایت اسی مقصد کے پیش نظر تھی۔ بادشاہ کے حکم سے جان سپار کا ایک کان کاٹ دیا گیا۔ جمال خان نے تنہائی میں کہا کہ اسے بدگمانی ضرور ہوئی تھی لیکن طلاق دینے میں یہ مصلحت تھی کہ جو بادشاہ کو پسند آ جائے اس پر تصرف گستاخی ہے۔ دربار میں بادشاہ نے جمال خان کی جاں بخشی لیکن منصب اور خطاب سے محرومی کا حکم سنایا، پھر عدت کے بعد گل رخ سے نکاح کر لیا اور اس کی سفارش سے جمال خان کے مراتب میں ترقی کر دی گئی۔

تحقیقی جائزہ

سطور ماقبل میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ شرر کے تاریخی ناولوں میں تاریخ کے نقطہ نظر سے کمزور ترین ناول ہے۔ اس ناول میں جو قصہ بیان ہوا ہے عہد شاہجہانی سے متعلق مستند کتب تاریخ اس کے بارے میں خاموش ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ اس ناول کا موضوع اور پلاٹ شرر نے غیر ذمہ دار مغربی سیاحوں کے بیانات سے لیا ہے۔ بعض یورپین سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں بد نیتی سے ایسے افسانے تراشے ہیں جن کا اصل مقصد اسلامی تاریخ کے روشن حصوں کو مسخ کرنا تھا۔ ان غیر ذمے دار اور بدنیت سیاحوں میں رسوائے زمانہ سیاح نکولائی منوچی بھی شامل ہے۔ اس نے اسلام کے بارے میں اپنی دریدہ دہنی کا پورا مظاہرہ کیا ہے۔ مسلمان بادشاہوں کو رسوا کرنے کی بھی پوری کوشش کی ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں اس نے اپنی بدباطنی کا پورا ثبوت دیا ہے، اس کی یہی بدنیتی شاہجہان کے سلسلے میں بھی کارفرما ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شرر کے سامنے نکولائی کی طرح کے کسی ہرزہ سرا کی روایت تھی۔ نکولائی لکھتا ہے:

''امراء اور بادشاہ اپنی تھوڑی سی بیویوں پر قانع نہ ہو کر اپنی آتش شہوت کو دیگر ذرائع سے فرو کرنا چاہتے تھے۔ شاہجہان بھی اس پہلو میں عام لوگوں سے بہتر نہیں، کیونکہ اپنے محل کی عورتوں پر صبر نہ کرتے ہوئے اس نے اپنے امراء کی بیویوں سے خفیہ تعلقات قائم کر کے امراء کے دل سے اپنی محبت کو بہت کچھ کم کر لیا۔ یہی آخر میں اس کی تباہی اور موت کا باعث ہوا۔ ان سب کی سردار اور وہ جس کی محبت میں شاہجہان بہت سرشار تھا، جعفر خان کی بیوی تھی جس کی محبت میں اندھا ہو کر شاہجہان بے چارے جعفر خاں کی جان ہی لینا چاہتا تھا، لیکن اس نے التجا کی کہ آپ اسے مارنے کی بجائے پٹنہ کا حاکم بنا کر بھیج دیں ... اسی طرح کچھ عرصہ تک اس کا خلیل اللہ خاں کی بیوی سے تعلق رہا۔[۱]

شاہجہان نے اپنے سالے شائستہ خاں کی عورت کو بھی نہیں چھوڑا گو اس کے لیے اسے فریب سے کام لینا پڑا کیونکہ وہ مانتی نہیں تھی۔ چنانچہ اس مطلب کے لیے شاہجہاں کی بیٹی بیگم صاحبہ دلالہ بنی اور اس نے مذکورہ بالا عورت کو ایک ضیافت میں اپنے محل میں بلا بھیجا جس کے خاتمہ پر بادشاہ نے زبردستی ---- (اسی قسم کی دو صفحات پر پھیلی ہوئی مزید خرافات درج ہیں)۔[۲]

ایسا معلوم ہوتا کہ شاہجہان کو اپنی نفسانی خواہشات کی سیری کے سوائے دوسرا کام کوئی نہیں

۱- نکولائی منوچی: ہندوستان عہد مغلیہ میں (ترجمہ ملک راج شرما)، ج ۱، ص ۱۸۳۔
۲- ایضاً: ج ۱، ص ۱۸۴، ۱۸۵۔

تھا ۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک میلے کی بنیاد ڈالی جو آٹھ دن تک رہتا تھا ۔ عورتوں کے سوائے وہاں کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا ۔ ادنیٰ اور اعلیٰ سب طبقے کی مستورات وہاں جاتیں اور جو جو مال لے جا سکتیں لے جا کر بیچا کرتی تھیں ۔ لیکن ان سب میں اگر کوئی چیز گراں ہو سکتی تھی تو آن کا اپنا آپ ۔ جانے والیوں کا مقصد سوائے اس کے کوئی نہیں ہوتا تھا کہ کسی طرح بادشاہ کی نظر ان پر پڑ جائے اور یہی وجہ تھی کہ معزز عورتیں وہاں جانا پسند نہیں کرتی تھیں ۔

ان آٹھ ایام میں بادشاہ ہر روز اس بازار میں جاتا ۔ اس کا چھوٹا سا خوبصورت تخت چند تاتاری عورتیں اٹھائے ہوتی تھیں، اردگرد کئی عورتیں ہاتھوں میں سنہری عصا لیے نیز کئی خواجہ سرا جاتے تھے جو سب کے سب ان سودوں کی خرید فروخت میں خوب ماہر ہوتے تھے ، نیز کئی گانے والی عورتیں بھی ہوتی تھیں ۔

شاہجہان اپنی توجہ کو خوب جمائے ہوئے چلا جاتا ہے کہ اسے کوئی خوبصورت عورت نظر آتی ہے ۔ بادشاہ ادھر ہی کا رخ کر دیتا ہے اور اس کے پاس جا کر میٹھی میٹھی باتوں سے اس کی اشیا میں سے چند پسند کرکے حکم دیتا ہے کہ منہ مانگی قیمت ادا کی جائے ۔ جس کے بعد ایک مقررہ اشارہ کرکے وہ آگے چل پڑتا ہے اور ساتھ والی عورت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ اس عورت کو جس سے بادشاہ نے خود اشیا خریدی ہیں مقررہ وقت پر بادشاہ کے حضور میں پیش کرے ۔

محل میں سے ایسی عورتیں جس وقت واپس آتی ہیں تو ان میں سے کئی تو خوب امیر ہو کر نکلتی ہیں اور بعض حرم میں ہی داخل کر لی جاتی ہیں ، ان آٹھ ایام میں محل میں خوب راگ رنگ ناچ تماشے وغیرہ وغیرہ ہوتے ہیں ۔ قلعہ بند رہتا ہے اور بادشا کے سوا کوئی دوسرا اندر نہیں جا سکتا ۔ ایک دفعہ محل سے باہر آنے والی عورتوں کو جو گنا گیا تو آن کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ (اتنا لکھنے کے باوجود منوچی کی تسلی نہیں ہوئی اور اس سے آگے اس بیان کو مزید پھیلایا ہے) ۔"[1]

شرر نے ایسی ہی روایات پر اپنے ناول کا پلاٹ مرتب کیا ہے، معلوم نہیں شرر نے کس مقصد کے تحت ایسا کیا ہے ۔ نکولائی منوچی کا خبث باطن اور اس کے مترجم ملک راج شرما کی بدنیتی تو ظاہر ہے اور منوچی کی ان خرافات اور اورنگ زیب عالمگیر کے بارے میں اس کی دریدہ دہنی کے حصے کو یک جا جمع کر کے "داستان مغلیہ" کے نام سے شائع کرنے والے، شرما کے دور جدید کے مقلد، کے عزائم بھی ہم پر واضح ہیں، لیکن شرر کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا ۔ شرر جیسے مورخ اور اسلامی تاریخ سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے کوشاں ادیب و ناول نگار سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ ایسی روایات پر کسی ناول کا ڈھانچہ کھڑا کرنے سے پہلے ان کی حقیقت کا تجزیہ کریں گے ، کیونکہ ایسے افسانوں کے راوی منوچی کے یہاں بذات خود تضاد پایا جاتا ہے ۔ منوچی نے ایک جگہ شاہجہان کے بارے میں لکھا ہے :

"مگر اس سے یہ نہ سمجھ لیا جاوے کہ شاہ جہان کی عیاشیاں اس کے انتظام سلطنت میں بھی مخل ہوتی تھیں ۔ نہیں ہرگز نہیں ۔ شاہ جہان کے پیش نظر ہمیشہ وہی اصول رہتا تھا جو اس کے باپ کے رہا ۔ یعنی انصاف کرنا، اچھے کام کرنے والے کو انعام دینا اور بروں کو سزا ۔"[2]

ناطقہ سربگریباں ہے کہ نکولائی کے ان دونوں بیانات میں سے کسے صحیح تصور کیا جائے ۔ جو شخص دوسروں کی بیویوں کو زبردستی چھین لیتا ہو وہ منصف کیسے ہوگا ، جو اس قدر خود بدکاریوں میں مبتلا ہو وہ نیکی بدی میں کیسے تمیز کرے گا اور اگر واقعی اس میں وہ صفات موجود تھیں جو دوسرے اقتباس میں بیان ہوئیں تو پھر یہ افسانے کسی پراگندہ ذہن کی بد فطرتی کی اختراع کے سوا کچھ بھی نہیں ۔

۱- نکولائی منوچی: (ترجمہ شرما)، ج ۱، ص ۱۸۶، ۱۸۷ ۔

۲- ایضاً: ج ۱، ص ۱۸۸ ۔

پانچواں باب

شرر کے تاریخی ناولوں کا تنقیدی جائزہ

۱۔ ملک العزیز ورجنا

''ملک العزیز ورجنا'' کے موضوع اور قصے کی بحث چوتھے باب میں ہو چکی ہے اس لیے یہاں اس کے تکرار کی بجائے براہ راست ''ملک العزیز ورجنا'' کے پلاٹ کی فنی خصوصیات سے بحث کی جا رہی ہے -

پلاٹ :

ملک العزیز ورجنا کا پلاٹ نہ صرف ربط و نظم کا ابتدائی نمونہ ہونے کی حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے بلکہ اپنی دلچسپی کی بدولت بھی اہم ہے - شرر نے ملک العزیز ورجنا کے پلاٹ کو بیس ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ان میں ایسا ربط و تسلسل قائم کر دیا ہے کہ پلاٹ اور قصہ بتدریج بڑھتے دکھائی دیتے ہیں - اس کی جاذبیت اول سے آخر تک بدستور قائم رہتی ہے - اس دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے شرر نے قدم قدم پر حیرت و استعجاب، امید و بیم، تجسس اور تذبذب کی کیفیتوں کو ابھارا ہے - پہلے باب ''لڑائی'' میں جہاں قاری ایک اجنبی فضا میں پہنچ جاتا ہے وہاں بڑے اشتیاق سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ چھوٹی سی سربکف فوج کیوں تیزی سے بڑھ رہی ہے ؟ کس مقصد سے اور کس منزل کی طرف بڑھ رہی ہے؟ اس کا یہ خوبرو نوجوان سردار کون ہے ؟ یہ تذبذب اور الجھنیں اس باب کے خاتمے پر ڈرامائی انداز میں ختم ہو جاتی ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ نوجوان سردار سلطان صلاح الدین کا بیٹا عزیز نور الدین ہے - اب اس نوجوان کے متعلق اس کے سرفروشانہ جذبے اور عالی نسب ہونے کی بدولت زیادہ سے زیادہ جاننے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے - دوسرے باب ''اچھے پھنسے'' میں یہ تذبذب اور تجسس اور زیادہ ہو جاتا ہے - قاری رات کو تاریکی میں گھوڑا دوڑانے والے سوار ، عیسائی لڑکی اور یہودی عورت سے سوار کی ملاقات ، سوار اور یہودی عورت کا عیسائیوں کے ہاتھ گرفتار ہونے کا ماجرا دیکھتا ہے لیکن اس کا ذہن یہ سوچتا رہتا ہے کہ وہ مسلمان سوار کون تھا ؟ عیسائی لڑکی کون تھی ؟ مسلمان نوجوان اور یہودیہ کی گرفتاری کے بعد وہ کہاں گئی ؟ عیسائی ان دونوں قیدیوں کو کہاں لے گئے اور ان کا کیا حشر ہوا ؟ تیسرے باب میں یہ معمے اور بھی دل چسپ ہو جاتے ہیں جب قاری کے ذہن میں یہ شک پیدا ہو جاتا ہے کہ قید ہو جانے والا مسلمان شاہزادہ عزیز ہی ہوگا - اس باب میں ایک عیسائی کنیز بھی ایک بدوی کی وساطت سے معمہ بن کر سامنے آجاتی ہے - قاری اس کے متعلق بھی معلومات حاصل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے - چوتھے باب میں وہ مسلمان نوجوان اور یہودیہ ، رچرڈ کے کیمپ میں مقید نظر آتے ہیں - قاری کا گمان اسے شاہزادہ عزیز تصور کرنے پر مصر ہے - سلطان خود بھی شاہزادے

کی گمشدگی پر مغموم ہے۔ یہاں کچھ الجھنیں رفع ہو جاتی ہیں اور قاری کے ذہن کو ایک تسکین محسوس ہوتی ہے کہ عیسائی کنیز وہی لڑکی (ورجنا) ہے جسے مقبرے میں ایک یہودی کے ہاتھ سے مسلمان نوجوان نے بچایا تھا اور وہ مسلمان نوجوان شاہزادہ عزیز ہی تھا۔ لیکن کچھ سوال ابھی حل طلب ہیں ۔ ورجنا کون ہے ؟ شاہزادے کا کیا بنے گا ؟ ورجنا کو سلطان نے شاہزادے کی مدد کی اجازت دے دی ہے لیکن یہ کیا کر سکے گی ؟ ورجنا نے ملک العادل سے کیا مشورہ کیا ؟ پانچویں باب میں ایک الجھن تو دور ہو جاتی ہے ، اور معلوم ہو جاتا ہے کہ ورجنا شاہ رچرڈ کی بھانجی تھی اور اس سے جا ملی لیکن قاری اس تذبذب میں مبتلا رہتا ہے کہ اب وہ کیا کرے گی ؟ چھٹے اور ساتویں باب میں شرر سادگی و پرکاری سے حیرت انگیز طور پر قاری کے تذبذب کو ختم کرکے اس کی تسکین کر دیتے ہیں ۔ ورجنا رومال ہلا کر شاہزادے کے خیمے کی نشان دہی کرتی ہے، ملک العادل شاہزادے کو چھڑا لیتا ہے، ورجنا اور آسیہ اسلام قبول کر لیتی ہیں اور سلطان شاہزادے کو ورجنا سے شادی کی اجازت دے دیتا ہے ۔

اصولی طور پر یہاں کہانی کا خاتمہ ہو جانا چاہیے تھا لیکن شرر کے پیش نظر ورجنا اور شاہزادہ عزیز کا رومان ہی بیان کرنا نہیں بلکہ صلیبی جنگ کے واقعات کو پیش کرنا ہے اس لیے یہاں سے پلاٹ ایک نیا رخ اختیار کرتا ہے اور قصے کی اٹھان از سر نو شروع ہوتی ہے ۔ شاہزادہ عزیز اور ورجنا سلطان کے مشورے پر چند دن آرام کرنے کے لیے کچھ سواروں کی معیت میں مصر روانہ ہو جاتے ہیں ۔ راہ میں عیسائیوں کی آمد کی خبر سن کر شاہزادہ طرطورہ کے شہر میں رک جاتا ہے (آٹھواں باب)، شہر خالی کرا دیتا ہے اور خود قلعۃ العتیق میں داخل ہو جاتا ہے ۔ نویں باب میں شرر کی چابک دستی قاری کی دلچسپی کے لئے سامان پیدا کرتی ہے ۔ شاہزادہ ورجنا اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ قلعۃ العتیق میں داخل ہوا تھا لیکن آدھی رات کو عیسائی فوج نے قلعے پر قبضہ کر لیا، صبح تک مورچے لگائے، علی الصباح سلطان آ پہنچا اور دونوں فوجوں میں جنگ شروع ہو گئی ۔ اس وقت تک قاری کا ذہن اسی تذبذب میں مبتلا رہتا ہے کہ شاہزادہ کہاں ہے؟ شرر بڑی تیزی سے اور ڈرامائی انداز میں شہزادے کو قلعے کے تہ خانوں سے اور طرطورہ کے باشندوں کو ایک پہاڑی سے "یا نصراللہ انزل" کے نعرے لگاتے ہوئے برآمد کرکے انبساط و تسکین کی صورت پیدا کر دیتے ہیں ۔

گیارھویں باب میں رچرڈ کی بہن کی گرفتاری سے پلاٹ میں ایک نیا موڑ پیدا ہوتا ہے اور بارھویں باب سے جو تعطل (Suspense) ، تذبذب اور تجسس پیدا ہوتا ہے وہ ناول کے خاتمے تک برقرار رہتا ہے ۔ ورجنا اپنی خالہ کی سازش سے دوبارہ عیسائیوں کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ شاہزادے کی بے قراریاں بڑھ جاتی ہیں ۔ ورجنا کو قید کرکے عکہ بھیج دیا جاتا ہے جہاں اسے روزانہ پچاس کوڑے لگائے جاتے ہیں ۔ قاری انجام کے متعلق سوچنے لگ جاتا ہے ۔ شرر کی فن کاری کا کمال یہ ہے کہ وہ ورجنا کی سزا کے منظر کو بہت زیادہ دیر تک منتہا پر نہیں رکھتے کیونکہ اس طرح اشتیاق ختم ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو سکتا ہے اس لیے یوشع نامی پادری ورجنا کو عیسائیت کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی سزا موقوف (ملتوی) ہو جاتی ہے ۔ شاہزادہ عزیز قاری کی نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے ۔ یہ یوشع کون ہے؟ شاہزادہ کہاں ہے؟ ورجنا پھر عیسائیت کی طرف کیوں مائل ہو رہی ہے؟ یوشع سے اس نے کیوں وعدہ کیا کہ وہ رچرڈ کے سامنے عیسائی ہونے کا اقرار کر لے گی؟ رچرڈ نے یوشع کی کن شرائط کو پورا کرنے کا اقرار کیا؟

یوشع کو یہ اعتماد کیوں ہے کہ ملک العادل اس کی بات (صلح کے متعلق) رد نہیں کرے گا؟ یہ سب سوالات قاری کے ذہن میں یک بیک ابھر آتے ہیں اور ناول کے صفحات پر اس کی نگاہیں بڑے اشتیاق سے انجام کے لیے اور ان معموں کے حل کی دریافت کے لیے تیزی سے دوڑتی جاتی ہیں۔ یہ تذبذب اور تجسس آخری باب میں منتہا پر پہنچ جاتا ہے جب صلح نامے پر دستخط ہو جاتے ہیں۔ ورجنا بھرے دربار میں یوشع سے ہار کر عیسائی مذہب قبول کر لیتی ہے اور رچرڈ ان دونوں کی شادی کرا دیتا ہے۔ قاری مایوس ہونے لگتا ہے لیکن شرر چار پانچ سطور میں نقشہ ہی بدل دیتے ہیں۔ یوشع ملک العزیز تھا، ورجنا دوبارہ مسلمان ہو گئی اور عیسائی اس ڈرامائی اختتام پر منہ دیکھتے رہ گئے۔ یہاں ناول تجسس کے منتہا سے اس قدر اچانک ختم ہو جاتا ہے کہ قاری پر تھوڑی دیر کے لیے حیرت و انبساط کی ملی جلی کیفیت سے ایک سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ پھر قاری کا ذہن ان لطف اشاروں کی طرف مائل ہوتا ہے کہ ورجنا اور ملک العادل یوشع کی اصلیت سے واقف تھے لیکن شرر نے ان حقائق کی طرف بڑے ہی لطف اور ہلکے اشارے کیے تھے۔

بلاشبہ اس ناول کے پلاٹ میں شرر کی سادگی و پرکاری اور فنی مہارت نے ابتدا سے انتہا تک جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ اس میں واقعات کا تسلسل اور ربط دلچسپی کے علاوہ منطقی اسباب پر مبنی ہے لیکن ایک آدھ جگہ زود نویسی کی بدولت شرر سے لغزشیں بھی ہوئیں۔ مثلاً نویں باب میں طرطورہ کے ساحل پر قاری کے دیکھتے دیکھتے عیسائی فوج جہازوں سے کشتیوں کے ذریعے اترتی ہے لیکن کچھ وقفے کے بعد اسی میدان کار زار میں یہ فوج گھوڑوں پر سوار دکھائی دیتی ہے، اس فوج کا جو سردار ورجنا کے ہاتھوں مارا جاتا ہے وہ بھی گھوڑے پر سوار تھا۔ قاری یہاں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ گھوڑے اچانک کہاں سے آ گئے۔ اسی باب میں شہزادہ عزیز اور اس کے ساتھی قلعے کے تہہ خانوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ یہ سب لوگ عکہ سے طرطورہ تک گھوڑوں پر آئے تھے۔ سوچنا پڑتا ہے کہ وہ گھوڑے کہاں گئے۔ اگر گھوڑے رات کو تہہ خانوں سے باہر تھے تو انہیں اسی رات عیسائیوں کے ہاتھ لگنا چاہیے تھا اور پھر یہ شبہ عیسائی فوج کے دل میں ابھرتا کہ ان سے پہلے مسلمان وہاں پہنچ چکے ہیں۔ اگر یہ گھوڑے بھی سپاہیوں کے ساتھ تہہ خانوں میں تھے تو کس طرح تہہ خانوں میں لے جائے گئے اور کیا ان پر بھی اس قسم کی کوئی پابندی تھی کہ وہ تقریباً سولہ گھنٹے سپاہیوں کی طرح خاموش دبکے بیٹھے رہیں؟ اگر گھوڑے تہہ خانوں میں نہیں تھے تو کہاں تھے اور شاہزادے اور اس کے ساتھیوں کے باہر نکلتے ہی انہیں کہاں سے دستیاب ہو گئے؟ ہمیں اس کا کوئی منطقی جواز نظر نہیں آتا۔ شاید یہ لغزش اس لیے ہوئی کہ روانی میں بے تکلف لکھتے ہوئے شرر نے معمولی جزئیات پر توجہ نہیں دی۔ لیکن ایسی جزئیات ہی در اصل ناول میں واقعیت پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ شرر نے جہاں ان باتوں کا خیال رکھا ہے وہاں ان کی مبالغہ آمیزی بھی حقیقت کا روپ دھار لیتی ہے۔ مثلاً شاہزادے کو جب ورجنا کی کوشش سے رہائی ملتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ملک العادل اپنا گھوڑا ورجنا کے سپرد کرتا ہے، خود ایک عیسائی سوار کو قتل کر کے اس کے گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے اور اس طرح آنکھوں کے سامنے ایک حقیقی تصویر کھنچ جاتی ہے۔

دسویں باب میں بھی ایک ایسی ہی لغزش دکھائی دیتی ہے کہ رچرڈ عکہ سے قیساریہ کے ساحل تک تو سمندر کی راہ پہنچتا ہے لیکن ساحل پر اترتے ہی رچرڈ سمیت اس کی فوج ہمیں گھوڑوں پر سوار دکھائی دیتی ہے۔ اگر یہ گھوڑے بھی جہازوں پر ہمراہ تھے تو ایک فقرے

میں ان کے اتارنے چڑھانے کا ذکر کرکے ناول میں حقیقت کے رنگ کو مزید گہرا کیا جا سکتا تھا ۔

چوتھے باب میں بھی شرر کی زود نویسی اور ذرا سی بے توجہی قاری کے اشتیاق کو قدرے کم کر دیتی ہے ۔ یہ وہ مقام ہے جب نوجوان ترک (شاہزادہ عزیز) اور آسیہ دوروہن کیمپ میں مقید ہیں ۔ نوجوان ترک جنگ کے منظر دیکھ دیکھ کر جذبہ جہاد سے بے قرار ہوا جاتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے کہ "اگر ان مسلمانوں کو علم ہو کہ میں یہاں ہوں تو وہ جان کی بازی لگا کر ایک ہی ریلے میں یہاں پہنچ آئیں"۔ آسیہ چونک پڑتی ہے اور پوچھتی ہے کہ آخر اس کے لیے مسلمان اتنی بڑی قربانی کیوں دیں گے؟ نوجوان ترک اپنی اصلیت کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا اور آسیہ کو ٹال دیتا ہے ۔ جس طرح آسیہ اس کی اصل شخصیت سے بے خبر ہے اسی طرح قاری بھی اس کی شخصیت کے متعلق متذبذب ہے، لیکن شرر خود ہی اس کی شخصیت کو قاری پر بے محل طور پر بے نقاب کر دیتے ہیں حالانکہ وہ ورجنا کے اس خیمے میں پہنچنے تک قاری کے اس تذبذب اور تجسس کو برقرار رکھ کر دلچسپی کو بڑھا سکتے تھے ۔ ان ایک دو لغزشوں کے علاوہ شرر نے پلاٹ اور واقعات میں منطقی ربط و تسلسل اور جاذبیت کا بڑا خیال رکھا ہے اور بڑی خوبی سے اس فن کو نبایا ہے ۔

کردار :

ناول کے فنی لوازم کے بیان میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ کردار نگاری بھی اس کا بنیادی عنصر ہے اور ملک العزیز ورجنا میں شرر نے پہلی مرتبہ کردار اور پلاٹ میں ایک ربط و توازن کی اہمیت کو محسوس کیا اور اسے برتا ۔ بعض نقادوں نے شرر کی کردار نگاری کے متعلق لکھا ہے کہ "ان کے ہاں تاریخ کے زندہ کردار بالکل مردہ اور بے جان ہوتے ہیں"۔[1] در حقیقت شرر کو ان تاریخی ناولوں میں کردار نگاری کی چنداں ضرورت نہیں تھی ۔ ان کا مقصد تاریخی واقعات کو دل چسپ صورت میں پیش کرنا تھا ۔ شرر اگر کردار نگاری کی کوشش بھی کرتے تو شاید کامیاب نہ ہوتے کیونکہ کوئی تاریخی ناول نگار اس فن میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتا ۔

تاریخی ناولوں کے نقاد شیپرڈ کی رائے ہے کہ

"حقیقی عظیم تاریخی ناول نویس وہ ہیں جو اپنے کرداروں و عہد گم گشتہ کے مردوں اور عورتوں کے ارد گرد ایسی چمک اور عظمت کا رنگ چڑھاتے ہیں جو زمانہ قبل از تاریخ کے اوزاروں اور آلات کے رنگ کی تابانی سے مشابہ ہو جو صرف مرور ایام سے پیدا ہوتی ہے اور جس کی نقالی کسی انسانی اوزار یا عمل سے ممکن نہیں۔"[2]

گویا تاریخی ناولوں میں صحیح تاریخی ماحول اور عہد گم گشتہ کے انسانوں کی تخلیق ناممکن ہے ۔ کردار نگاری کے متعلق شیپرڈ، رالف فاکس اور ہل ہاؤس کی آرا کو اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ تاریخی ناول نگار کے کردار ہمیشہ دو خطرات سے دو چار ہوتے رہتے ہیں ۔ تاریخی ناول نگار کے لیے ایک راستہ تو یہ ہے کہ وہ تخیل سے کام نہ لے اور تاریخی کرداروں کو اپنے عہد کے انسانوں کی خصوصیات عطا کر دے ۔ اس صورت میں

۱۔ علی عباس حسینی : ناول کی تاریخ اور تنقید ، ص ۳۰۷ ۔
۲۔ شیپرڈ : Art & practice of Historical Fiction ، ص ۱۷ ۔

ان میں قاری کے لیے جاذبیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ناول نگار اپنی قوت تخییل سے کام لے کر ان میں ایسی رنگ آمیزی کرے کہ وہ موجودہ انسانوں سے مختلف دکھائی دیں اور اس صورت میں کردار صرف ناول نگار کے چند خیالات کی علامات بن کر رہ جاتے ہیں۔ عام تاریخی ناول نگاری کی طرح شرر بھی ان ہی دو خطرات سے دو چار رہے۔

ملک العزیز ورجنا میں سلطان صلاح الدین، شاہ رچرڈ، ملک العادل، ملک العزیز، ملک الافضل، ورجنا، آسمہ اور جین کئی کردار ہیں جن میں ورجنا اور ملک العزیز بنیادی اہمیت رکھتے ہیں لیکن ان دونوں پر بھی تاریخی ناول کی کردار نگاری کے مندرجہ بالا دو رجحانات اثر انداز ہوئے۔ شرر شہزادہ عزیز کا تعارف پہلے باب میں ان الفاظ میں کراتے ہیں:

"۔ نہایت حسین اور خوش رو جوان ہے۔ عمر اکیس بائیس سے زیادہ نہ ہوگی۔ ڈاڑھی ابھی نکل نہیں چکی ۔ اس کا خوبصورت اور دل ربا چہرہ ترکی وضع کا ہے کشادہ پیشانی، اونچی اور ستواں ناک، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، نازک ہونٹ، چکنے اور صاف گلابی رخسارے، بھرا بھرا عبعبہ اور ان سب پر کبھی کبھی بکھر جانے والے کچھ کچھ خمدار کالے کالے بال ۔ نوجوان کا قد بہت پورا ہے مگر اسی کے مناسب جسم کا خوش نما چوڑاں اور بھرے بھرے قوی ہاتھ پاؤں ۔"[۱]

اس کے بعد شرر نے اسی صفحے پر اس کی وضع قطع کا نقشہ بھی کھینچا ہے جس سے شاہزادہ کی جنگجویانہ شان اور دبدبہ ظاہر ہوتا ہے۔ اسی پہلے باب میں شہزادے کے مزاج کا یہ پہلو بھی ہم پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ بہادری کے ساتھ ساتھ وہ انتہائی جوشیلا بھی ہے اور جب شوف عامر کا بوڑھا اپنی اور مسلمانوں کی حالت زار بیان کرتا ہے تو شاہزادہ عزیز، سلطان صلاح الدین (اپنے باپ) کی حکمت عملی پر بھی ان الفاظ میں تنقید کر دیتا ہے: "سلطان سے یہ ہو سکا! میں تو اپنی اور ان ظالموں کی جان ایک کر دیتا"۔[۲] شرر نے شہزادے کے کردار میں یہ شدید جذباتی پہلو خاص مقصد کے تحت پیدا کیا ہے۔ یہ جذباتی کیفیت ہی پلاٹ کو آگے بڑھاتی ہے۔ شوف عامر کی پہاڑیوں میں رات کے سناٹے میں ورجنا سے اتفاقی ملاقات، اور چند لمحوں کی ملاقات، شہزادے کو فوراً اس کے عشق میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ساتویں باب میں جب شاہزادے اور ورجنا میں راز و نیاز ہو رہا ہوتا ہے تو عشق کا جادو اس طرح سر چڑھ کر بولتا ہے کہ شاہزادہ ہمیں لکھنؤ کا بانکا دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ مختلف مکالمے ملاحظہ ہوں:

۱۔ عزیز: ہائے ہماری عاشقی اور معشوقی کا مزا تو جب تھا جب یہ کم بخت منحوس لڑائی نہ ہوتی۔

۲۔ عزیز: پھر بھلا میرا عشق کب گوارا کرے گا کہ تمھارے ہم وطن اس طرح میدان جنگ میں قتل کیے جائیں.... میرا دل کہتا ہے کہ لڑائی سے دست بردار ہوں اور تمھیں لے کر اپنے وطن ملک مصر چلا جاؤں۔

۳۔ عزیز: آؤ ہم تم یہاں سے ملک مصر چلیں، اطمینان کی زندگی وہیں نصیب ہو گی لیکن میں بدنام ہوں گا کہ اپنے ہم مذہبوں کو جاں بازی کرتے چھوڑ کر بھاگ گیا....[۳]

یہ شہزادہ عزیز کے کردار کا کمزور ترین پہلو ہے، ایک عجیب تضاد دکھائی دیتا ہے یا تو جہاد کا وہ ولولہ تھا یا ایک عورت کے لیے میدان جنگ سے منہ پھیر لینے کا یہ منصوبہ! اسی طرح ورجنا کے گرفتار ہو جانے کے بعد شاہزادے کے کردار کے اسی پہلو کو شرر نے ایک فقرے

۱۔ ملک العزیز ورجنا، ص ۱، ۲۔

۲۔ ملک العزیز ورجنا، ص ۷۷۔

۳۔ ایضاً، ص ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴۔

میں نمایاں کیا ہے :

''یہ غنیمت ہوا کہ فوجی ضرورت اور سلطانی حکم سے بھی شاہزادہ عزیز کو یافا میں جانا چاہیے تھا ، ورنہ اگر کہیں اور جانے کا حکم ہوتا تو عشق کی کششیں بمشکل اجازت دیتیں ۔''[1]

یہ رنگ بتدریج گہرا ہوتا جاتا ہے، جنگ کی ذمہ داریوں کو تج کر شاہزادے کے ذہن میں خودکشی جیسے بھیانک اقدام کا خیال آتا ہے اور بالآخر شرر کردار کے اس پہلو کو منتہا پر پہنچا کر شاہزادے کو توسیع کے روپ میں پیش کرکے آخری مہر ثبت کر دیتے ہیں لیکن یہ تضادات شرر کی مقصدیت کا نتیجہ تھے۔

اس ناول کے دوسرے بنیادی کردار ورجنا کا تعارف شرر کے الفاظ[2] میں یوں ہے :

''. . یہ مجسم حسن عالم فریب اور پیاری دل ربا صورت چوں کہ ایک عالیشان مقبرے کے دروازے پر رات کے وقت کھڑی ہے، اس سے بآسانی خیال کر لیا جا سکتا ہے کہ کسی دنیا سے گزرے ہوئے مقبول مسلمان یا شہید کی آرزوئیں پوری کرنے کے لیے خدا نے آسمان سے حور کو بھیج دیا ہے ۔ حقیقت میں اس کا حسن انسانی دائرے سے گزرا ہوا ہے، قدرت کی صناعی کا سب سے بڑا نمونہ اگر ڈھونڈا جائے تو اسی صورت پر سب کا اتفاق ہو جائے گا جو اس وقت ملک شام کے پہاڑوں پر اپنا جلوہ دکھا رہی ہے، بیحد کے ہاتھ کا اول درجے کا کام اگر ہے تو یہی ہے، خدا نے یورپ اور ایشیا کے دونوں مذاق ملا کر کچھ ایسی صباحت اور ملاحت یک جا کر دی ہے کہ دربار حسن سے انحراف کرنے والے نے حسنوں کے حسن پرست بنانے کو صرف یہی چہرہ کافی ہے ، گول اور محراب دار پیشانی جو نازک ریشم کے ایسے بھورے بالوں کے پاس شروع ہوئی ہے اور اس وقت ایک دل خراش ادا سے نیچے کی طرف جھکی نظر آتی ہے ، دیکھنے والے کو بڑی مشکل سے موقع دیتی ہے کہ نگاہ اور کسی طرف بھی لے جائے۔ وہ نگاہ کو ٹھہرا لیتی ہے اور ہرگز نہیں اجازت دیتی کہ اس حور وش کی کسی اور ادا کو بھی دیکھے ۔ بھویں الگ الگ ہیں اور عجب خوش نمائی سے ان پیاری آنکھوں پر سایہ کیے ہوئے ہیں جنھوں نے کبھی سرمے کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے ۔ آنکھیں نہ ایشیا کے آہوچشم دلبروں کی طرح گہری سیاہی مارتی ہیں اور نہ عام نازنینان یورپ کی طرح زرد ہیں ۔ ان کا رنگ نہایت صاف اور شگفتہ آسمانی ہے ۔ صبح کا آسمان جسے شبنم دھو چکی ہے اور جس پر آفتاب کی کچھ کچھ کرنیں پڑنے لگی ہوتی ہیں ان بڑی بڑی آنکھوں کی سچی تصویر ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ آنکھیں شوخ نہ ہوں گو اس وقت نے کسی اور مصیبت اور شرم نے ایک قسم کی متانت اور سنجیدگی پیدا کر دی ہے مگر اصل میں ان آنکھوں کو للچائی ہوئی نظر سے دیکھنے والوں کے ساتھ شوخیاں کرنا خوب آتا ہے ۔ اپنے قدر دان ہی کے ساتھ شوخی کرتی ہیں ۔ گوری اور یونانی نقشے کی ناک جو بلند ہے اور پھیلنے نہیں پاتی ہے ، ان نازک اور پتلے ہونٹوں پر جھک پڑی ہے جنھیں ایشیائی مذاق میں چشمۂ حیوان کا خوش نما اور پیارا گھاٹ کہنا چاہیے ۔ ملائم گورے اور چکنے رخسارے جن کے گورے رنگ کے نیچے سے اس شرم اور خوف کے عالم میں خون نے اپنی سرخی کھینچ لی ہے ، اس افسردگی کی ادا میں بھی ایسے ہیں کہ نظر پھسلی پڑتی ہے ۔ نازک چھوٹی سی ٹھڈی جو زاہد فریب چہرے کی آخری حد ہے ، اس وقت ندامت کے باعث گورے سینے سے ملی ہوئی ہے ۔ اس ٹھڈی کے درمیانی نشیب کو اگر ہمارے شعرا دیکھ لیتے تو انھیں یقین آ جاتا کہ چاہ کنعان وہی ہے ، کیوں کہ ان حوروشوں کے خلاف یہ چاہ عجب ارض کنعان ہی میں دیکھا گیا ہے . . . .''[2]

شرر نے ورجنا کے اس تعارف میں اپنے زور قلم سے حسن کی تمام جزئیات کو یک جا

۱۔ ایضاً ، ص ۲۸۷ ۔

۲۔ ایضاً ، ص ۹۲ تا ۹۸ یہ بیان بہت طویل ہے اور تقریباً چار صفحات پر مشتمل ہے ۔ تفصیل کے لیے ناول کا دوسرا باب ملاحظہ ہو ۔

جمع کر دیا ہے لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسی مجرد صفات اور خیالی تشبیہات سے ایک گوشت پوست کے انسان کی صحیح تصویر بہ مشکل ہی کھنچ سکتی ہے ۔ ورجنا کا کردار شاہزادہ عزیز کے کردار سے کئی گنا بہتر اور جاذب نظر کردار ہے، یہاں شرر نے مشرق اور مغربی تہذیب، روایات اور اقدار کا ایک حسین امتزاجی تصور پیش کیا ہے ۔ ورجنا کے کردار میں نسوانیت، محبت اور خلوص کے جذبے کے علاوہ مستقل مزاجی اور دلیری نمایاں ہے، یہ پہلو شروع سے آخر تک برقرار ہے جس کی بدولت ہم شاہزادہ عزیز کے کردار پر اسے ترجیح دینے پر مجبور ہیں ۔

ورجنا کے کردار میں بعض اوقات یہ کمی جھلکتی ہے کہ سرر کبھی کبھی انسانی نفسیات کو فراموش کر دیتے ہیں اور کردار حقیقت سے دور ہو جاتا ہے ۔ ورجنا پر مظالم کی داستان انھوں نے پر زور انداز میں بیان کی ہے لیکن ایسی سنگین سزا کا اس قدر تحمل کے ساتھ اتنے عرصہ برداشت کرتے رہنا غیر فطری معلوم ہوتا ہے، علاوہ ازیں جب ورجنا پا بجولاں شاہ رچرڈ کے سامنے پیش کی جاتی ہے اگر اس مرحلے پر شرر کردار نگاری پر تھوڑی سی توجہ صرف کرتے تو ورجنا کا کردار زندہ کردار بن جاتا ۔

ابھی ابھی کرداروں کی انسانی نفسیات سے بے توجہی کا ذکر ہوا تھا، اس کی ایک مثال آسیہ کے کردار میں ملتی ہے ۔ آسیہ اور شاہزادہ ایک ہی خیمے میں قید ہیں، آسیہ بار بار کوئی نہ کوئی ذکر چھیڑ کر شاہزادے کی اصل شخصیت کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتی ہے اور وہ ہر بار ٹال جاتا ہے لیکن جب ورجنا اس خیمے میں پہنچ کر اسے شاہزادہ عزیز کہہ کر مخاطب کرتی ہے تو آسیہ پر کوئی رد عمل نہیں ہوتا ۔ نہ چہرے سے تحیر کے کوئی آثار دکھائی دیتے ہیں نہ اس کی گفتگو میں کوئی استعجابی انداز ہے ۔ اسی طرح ورجنا کی خالہ عربی زبان سے نا آشنا ہے لیکن جب دو مسلمان سوار عربی میں گفتگو کرتے ہوئے ورجنا کو عیسائی سوار کی آمد کی خبر سناتے ہیں تو اس کی خالہ فوراً بول اٹھتی ہے اور قاری کو شرر کی اس بے توجہی پر افسوس ہوتا ہے ۔ (بارھواں باب)

شرر نے ملک العزیز ورجنا میں صلاح الدین ایوبی کے کردار کو بہت کم وقفوں کے لیے نظروں کے سامنے لا کر اپنے آپ کو فنی مشکلات سے بچا لیا اور سلطان صلاح الدین کے کردار کی ایک دو جھلکیاں دکھانے پر اکتفا کیا ہے ورنہ اتنے عظیم تاریخی کردار کو اس کے حقیقی رنگ میں پیش کرنا بہت مشکل مرحلہ ہوتا جبکہ انھیں تاریخی حقیقتوں کے علاوہ اپنے قاری کی سلطان سے جذباتی وابستگیوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا اور کسی ایسے تاریخی کردار کو ناول میں پیش کرنا بہت نازک مرحلہ ہوتا ہے جبکہ قارئین کا ایک وسیع حلقہ پہلے سے ہی اس کردار کے بارے میں کوئی جذباتی تخییلی تصورات رکھتا ہو ۔

مکالمے :

ملک العزیز ورجنا میں شرر کے مکالمے ان کے کرداروں کی انفرادی خصوصیات کو پورے طور پر نمایاں نہیں کر سکے ۔ اکثر مکالمے کرداروں کی شخصیات سے مطابقت نہیں رکھتے اور نہ ہی ان مکالموں کے ذریعے کرداروں کے نفسیاتی پہلو پورے طور پر اجاگر ہوتے ہیں ۔ ان مکالموں نے بسا اوقات کرداروں کی شخصیت کی تصوراتی تشکیل و تعمیر کی بجائے برعکس اثرات

پیدا کیے ہیں ۔ نمونے کے طور ملک العزیز اور ورجنا کے باہمی مکالمے پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ خود سلطان صلاح الدین کی زبان سے ادا ہونے والے مکالمے اس کی شخصیت کی صحیح عکاسی میں ناکام رہے ہیں ۔ اس کے باوجود "ملک العزیز ورجنا" کے مکالمے اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ اردو ناول میں یہاں پہلی مرتبہ مکالمہ پلاٹ کے ارتقا کا جز بنا ہے ۔ اس ناول کے مکالمے سرر کے دور کی عصری روح کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان میں وہی منطقیت اور استدلالیت ہے جو اس دور کے مناظروں کا رنگ تھا ۔ نمونے کے طور پر ناول کے آخری باب میں یوشع کے مکالمے ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں ۔

شرر کے مکالموں میں یہ کمزوری بھی دکھائی دیتی ہے کہ ان کی زبان مقاصد اور عصری روح کے تابع ہے نہ کہ کرداروں کی شخصیت اور سماجی ، ذہنی ، فکری سطح کے مطابق ۔

زبان و بیان و منظر نگاری :

سرر نے "پبلک" کی تفریح کے لیے ملک العزیز ورجنا میں حسن و عشق کے معاملات کے بیان پر کافی زور دیا ہے ۔ ان کے یہاں جب حسن کا ذکر آتا ہے تو وہ اس کا بیان بڑے رنگین الفاظ میں کرتے ہیں ۔ نمونے کے طور پر سطور ما قبل میں ورجنا کی سراپا نگاری ملاحظہ کی جا سکتی ہے ۔ ورجنا کے لیے انھوں نے بستر حسن عالم فریب ، حسن ملائیک فریب ، حسن زاہد فریب ، دل ربا ، دل ربا نازنین ، ہوش ربا نازنین ، پری رخ ، حور وش محبوبہ ، باوفا معشوقہ ، وفا کیش محبوبہ وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور جہاں بھی انھیں حسن کے سلسلے میں رنگین بیانی کا موقع ملا ہے انھوں نے اس سے ضرور فائدہ اٹھایا ہے ۔ اس کے نتیجے میں بستر اعتدال اور توازن کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا حتیٰ کہ سلطان صلاح الدین کی زبان سے بھی ورجنا (بہو) کے لیے ایسے ہی رنگین الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ یہ شاید شرر کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور اس کا سبب "پبلک" کی پسند کی حد سے بڑھی ہوئی پاسداری ہے ۔

جذباتی مکالموں کے ماسوا زبان کرداروں اور پلاٹ سے مطابقت رکھتی ہے ، خصوصاً جہاں کہیں مذہبی امور کی بحث ہے وہاں زبان کرداروں کی شخصیت سے بھی ہم آہنگ ہو جاتی ہے ۔

منظر نگاری کے مواقع پر تشبیہ و استعارہ مناظر میں ادبی چاشنی اور رنگینی پیدا کر دیتے ہیں ۔ شرر کی منظر نگاری بھی "پبلک کی پسند" کے خیال سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی ۔ وہ "پبلک" کی پسند کی خاطر پر تکلف منظر نگاری کی طرف خاصا میلان رکھتے ہیں ، جس میں واقعیت کی بجائے شعریت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے ۔ ملک العزیز ورجنا میں اس کے درج ذیل دو نمونے ان کے انداز کی ترجمانی کر سکیں گے ۔

"ابتدائے سرما کی رات ہے اور خزاں کا موسم ہے ۔ دو گھنٹے سے زیادہ رات نہ آئی ہوگی ۔ تارے کھلے ہوئے ہیں اور تین چار روز کا چاند آسمان کے مغربی کونے سے ذرا بلندی پر چمک رہا ہے ۔ ہم جس مقام کا حال بیان کر رہے ہیں وہاں اس وقت عجب کیفیت ہے ۔ مغرب کی طرف جدھر چاند کا گورا چہرہ نظر آ رہا ہے ، ادھر سفید بالو کے سینکڑوں ٹیلے ، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی طرح کوسوں تک پھیلتے چلے گئے ہیں ۔ جہاں یہ ناہموار ٹیلے نہیں ہیں وہاں بھی قدرت نے سفید رنگ کی اجلی چادر بچھا دی ہے جو ہر وقت بچھی رہتی ہے اور کبھی نہیں میلی ہوتی ۔ خصوصاً اس چاند کی دھیمی روشنی میں قدرتی نیچر کے ہاتھ کا دھویا ہوا

اجلا فرش کچھ ایسے روپ پر ہے کہ دیکھتے ہی دل بے اختیار ہو جاتا ہے ، سوا مغرب کے اور سب طرف سنگستانی پہاڑیاں باہم ملی ہوئی اور ایک دوسرے سے الجھی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں ۔ ان پہاڑیوں میں اکثر تو ایسی ہیں جن پر روئیدگی نے نظر فریب مخملی فرش بچھا دیا ہے اور بڑے بڑے درخت جنہیں فصل خزاں ہنوز پتوں سے بالکل برہنہ نہیں کر سکی ہے ، اپنی پژمردہ اور بے ملاپ ٹہنیاں آزاد جنگلی طیور کے شب بسر کرنے کے لیے پھیلائے ہوئے ہیں اور بعض پہاڑیاں اپنی سیاہ ڈراؤنی صورت سے اس سنسان سین سے مسافروں کے لیے وحشت و خوف کا نمونہ دکھا رہی ہیں جن پر ہوا نے سوکھے اور سکڑے خشک پتے لا لا کے بچھا دیے ہیں ۔ اس موسم کی ہوا معمولاً تیز چلتی ہے اور اس کی خاصیت ہے کہ ہر چیز پر ایک افسردگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس وقت بھی ہوا کے جھونکے بڑے زور و شور سے اونچے اونچے قلوں سے ٹکراتے ہیں ۔ افسردگی کے آثار تو رات کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں مگر ہاں سوکھے سوکھے پتوں کے کھڑ کھڑانے سے ہر طرف کرخت آوازیں بلند ہوتی ہیں اور کوہستانی دروں اور قلوں کے سین میں گونج اٹھتی ہیں ۔" (دوسرا باب)

"رات کا وقت ہے اور دو بجا چاہتے ہیں ۔ قمری مہینے کی پچھلی تاریخ ہونے سے آسمان پر چاند کا کسی طرف پتہ نہیں ، تارے خوب کھلے ہوئے ہیں ۔ نسر طائر افق جنوبی کے قریب پہنچ چکا ہے ۔ شام کے نکلے ہوئے تارے چپکے ہی چپکے آسمان کا بہت زیادہ دور طے کر گئے ہیں ۔ ہر طرف سناٹا ہے اور اندھیرا کسی کی زلفوں کی طرح عالم عناصر کو ڈھانکے ہوئے ہے ۔ دنیا والے خواب غفلت میں ہیں ، وقت کی دلچسپی نے چڑیوں تک پر قیامت کی خوشی طاری کر دی ہے ۔

ہوا تیزی کے ساتھ چل رہی ہے اور بحیرہ روم کا پانی زور زور سے موجیں لے رہا ہے ۔ سناٹے کے عالم میں موجوں کے تلاطم کی آواز اندھیرے کے دامن میں چھپی چھپی دور تک جی جاتی ہے اور جہاں کہیں کوئی سننے والا مل جاتا ہے اس پر ایک خوفناک اثر ڈال دیتی ہے ۔ خصوصاً جس مقام کا حال ہم بیان کر رہے ہیں وہاں تلاطم اور زیادہ ہے اور لہروں کی آواز معمول سے زیادہ کرخت اور مہیب سنی جاتی ہے ۔

جو کوئی اس کی وجہ دریافت کرنے کے لیے اس مقام پر کھڑا ہو کر ڈرتی ہوئی نظر کو چاروں طرف دوڑاتا ہے ، اسے تاروں کی کم کم روشنی میں کوئی بلند اور سیاہ عمارت نظر پڑتی ہے ۔ اس عمارت کی سیاہی رات کی تیرگی میں مل کر اور زیادہ مہیب سین پیدا کر دیتی ہے ۔ سمندر کی سطح آب سے بہت زیادہ بلندی تک یہ سیاہ عمارت ایک قوی ہیکل دیو کی طرح آسمان میں سر گڑوے کھڑی ہے ۔ بلندی پر آسمان سے ملے ہوئے کچھ بے ترتیب کنگرے نظر آتے ہیں ۔ بے ترتیبی کی یہ وجہ ہے کہ بہت سے گر پڑے ہیں اور ان کی جگہ پر حسرت یاد دلانے والے رخنے پڑ گئے ہیں جن کی راہ سے آسمان کی تھوڑی سی سیاہی مارنے والی سطح اور دو ایک جھلملاتے ہوئے تارے دکھائی دیتے ہیں ۔ متلاطم پانی پر چھوٹے بڑے تاروں کا عکس بہار دکھا رہا ہے ، مگر وحشی مزاج موجیں ان موہوم تاروں کو جھٹکے دے دے کے اپنی گود سے پھینکتے ہیں ۔"

شرر نے منظر نگاری میں شاعرانہ وسائل کے بکثرت استعمال کے باوجود ملک العزیز ورجنا میں عیسائی بہادروں اور مجاہدین اسلام کی جنگوں کے بڑے بھر پور نقشے کھینچے ہیں ۔ ملک العزیز کا مسیحی کیمپ میں مقید ہونے کا منظر اور ورجنا کا اسے رہا کرانے کا واقعہ ، سلطان صلاح الدین کا عین جنگ میں رچرڈ کے لیے اپنا گھوڑا بھیجنا ایسے مناظر ہیں جن میں زندگی کی روح دوڑتی نظر آتی ہے اور شرر کا فن یہاں اوج کمال پر ہے ۔ اگر کہیں کرداروں میں یا واقعات اور مناظر کی تصویر کشی میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے تو اس کا اصل سبب شرر کا مواد کی تلاش میں اپنے دور سے بہت پیچھے اور ایک دور دراز علاقے میں چلا جانا ہے اور ایسے عہد کا انتخاب ہے جسے ناول نگار تخیل اور تاریخ کے امتزاج ہی سے زندہ کر سکتا ہے ۔

۲- حسن انجلینا

حسن انجلینا کے موضوع اور قصے کا ذکر چوتھے باب میں ہو چکا ہے یہاں اس کے پلاٹ کا ذکر کیا جائے گا -

پلاٹ :

حسن انجلینا شرر کا دوسرا تاریخی ناول ہے اور اس میں بھی واقعات کا ربط و ضبط، دلچسپی تجسس اور پلاٹ کا ارتقا ملک العزیز ورجنا کی طرح بدستور قائم ہے - اگر یہ کہا جائے کہ شرر کے ناولوں کا سب سے بڑا وصف ان کا مربوط پلاٹ ہے تو بے جا نہ ہو گا - اس ناول کو شرر نے ۱۸ ابواب میں تقسیم کیا ہے - پہلا باب جو ۱۸۷۲ء میں بحر اسود کے کنارے روسی فوج اور ترک جہازوں کے درمیان جنگ سے شروع ہوتا ہے، اپنے آغاز سے ہی تجسس، دلچسپی اور تذبذب کی کیفیتیں لیے ہوئے ہے - ایک پرہول فضا میں ایک شکستہ عمارت، میں حس پر روسی جھنڈا لہرا رہا ہے، اچانک آگ بھڑک اٹھتی ہے اور اس میں مقیم فوجی باہر نکل کر بندوقیں چلانے لگتے ہیں لیکن اچانک ان پر ترکی جہازوں سے گولہ باری شروع ہو جاتی ہے -

یہ آگ کس نے لگائی اور کیوں لگائی یہ بات آگے چل کر کھلتی ہے، جب شرر ہمیں ایک ترک دستے سے متعارف کراتے ہیں جو رات کے سناٹے مں سفر کرتا ہوا باطوم جا رہا ہے - اس دستے کے قائد محمود پاشا کی زبانی پتہ چلتا ہے کہ اس نے شہزادہ حسن پاشا کو روسیوں کی قید سے چھڑانے کے لیے یہ تدبیر کی تھی - لیکن حسن پاشا کون ہے ؟ وہ کس طرح اور کب روسیوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوا تھا یہ معمہ ابھی حل طلب ہے - اس باب کے ختم ہونے سے پہلے ایک نیا سوال ابھر آتا ہے کہ اس ترک دستے کے ساتھ سفر کرنے والا شہزادہ حسن پاشا کہاں غائب ہو گیا جسے چھڑانے کے لیے ترکوں نے اس طرح خود کو خطرے میں ڈالا تھا - اسی باب میں شرر نے اصل قصے کے علاوہ محمود پاشا اور حسن پاشا کے کردار کی ابتدائی جھلک، کچھ سیاسی حالات، اور موقع محل کی تصویر کشی بھی کی ہے -

دوسرا باب پھر اسی تجسس کے ساتھ شروع ہوتا ہے کہ رات کے آتش زدہ قلعے سے ایک شخص یکہ و تنہا نکل کر پہاڑوں کی طرف روانہ ہوتا ہے - یہ شخص کون ہے ؟ اس ویران قلعے میں کب اور کیوں آیا اور کدھر جا رہا ہے ؟ ابھی یہ سوال قاری کے ذہن میں گونج رہے ہوتے ہیں کہ اس شخص کی سواروں کے ایک گروہ سے ملاقات ہوئی جو سب عورتیں ہیں - یہ کون ہیں، ان کی ملکہ کون ہے اور وہ بحر اسود کے کنارے تنہا کیوں آباد ہے - یہ سوال دونوں ابواب کے ختم ہونے کے بعد بھی قائم ہیں -

چوتھا باب قصے کو آگے نہیں بڑھاتا بلکہ خود ایک الگ قصہ ہے - لیکن اصل قصے کے ساتھ ایک تعلق ضرور رکھتا ہے - اس باب سے یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ ملکہ یا شہزادی انجلینا کون ہے اور وہ ترک نوجوان حسن پاشا اس وقت کے فرمانروائے ترکی کا بھتیجا ہے - پانچواں باب گم گشتہ کی تلاش اپنے واقعات کے اعتبار سے بالکل الگ تھلگ ہے - ناول کے پلاٹ کے ساتھ اس کا تعلق اس طرح جوڑا گیا ہے کہ سپہ سالار مصطفیٰ پاشا، محمود پاشا سے حسن پاشا کے متعلق باز پرس کرتا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ جس طرح بھی ہو شہزادے کو تلاش کر کے لائے - چھٹے باب میں جہاں راز و نیاز حسن و عشق جاری ہے یہ نیا واقعہ

ظہور پذیر ہوتا ہے کہ کوئی ترک انجلینا کی کوٹھی تک پہنچتا ہے اور دو روسی پہریداروں کو زخمی کر جاتا ہے۔ یہ کون تھا ؟ لیکن یہ عقدہ جلد ہی حل ہو جاتا ہے کیونکہ حسن پاشا اسے پہاڑوں میں ڈھونڈ نکالتا ہے، وہ محمود پاشا تھا ۔ اسی رات کچھ لو وارد آتے ہیں اور یہاں سے ایک نیا ضمنی قصہ شروع ہو جاتا ہے، یعنی ایرانیوں کو جہاد پر آمادہ کرنا ۔ اصل پلاٹ کے ساتھ اس قصے کا اس طرح ربط ہو جاتا ہے کہ ناول کے ہیرو حسن نے مرزا عباس کو اس کام پر آمادہ کیا ہے اور بعد کے واقعات میں ایرانی مجاہدین روسیوں کے خلاف ترکوں کے شانہ بشانہ لڑتے رہے ۔ ساتواں، آٹھواں اور نواں باب اپنی ذات میں مکمل ہیں لیکن اس اعتبار سے ایک تسلسل کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں کہ فتوحات کا سلسلہ یکے بعد دیگرے آگے بڑھتا ہے ۔ دسویں باب میں جب حسن اور انجلینا ترکی کی طرف نکل جانے کا ارادہ کرتے ہیں، شہزادی اچانک غائب ہو جاتی ہے، شہزادی کدھر گئی اور کیوں گئی یہ مسئلہ ایک سوال بن کر ابھرتا ہے ۔ گیارہویں باب میں افسردہ دل شہزادہ حسن پاشا میدان کار زار میں ہے لیکن بارہویں باب کے آخر میں پھر اچانک غائب ہو جاتا ہے ۔ تیرہواں باب واقعات کے دوسرے سلسلے سے متعلق ہے۔ چودھویں باب میں اس بھید سے پردہ اٹھتا ہے کہ شہزادی کہاں غائب ہو گئی تھی ۔ اس باب کا آغاز بھی اپنے اندر بھر پور تجسس لیے ہوئے ہے لیکن بہت سی گرہیں کھلنے کے باوجود یہ بات بڑی دیر بعد کھلتی ہے کہ حسن پاشا اس مقام پر مریم سے ملنے کے لیے کس طرح پہنچ گیا اور اسے کیسے علم ہوا کہ شہزادی اس وقت ادھر سے گزرے گی اور شہزادی نے کس امید پر مریم کو اس وقت اس مقام پر حسن پاشا سے ملنے کی ہدایت کی تھی ۔

پندرہویں باب میں تجسس کا عنصر کمزور پڑ جاتا ہے اور قاری کی زیادہ توجہ روسی ترکی جنگ اور ترکوں ایرانیوں کی مذہبی کشیدگی اور اس کے نتائج کی طرف مبذول ہو جاتی ہے ۔ غرض حسن انجلینا کا پلاٹ مختلف‌النوع واقعات کو یکجا کر کے مرتب کیا گیا ہے ۔ واقعات کے مختلف سلسلے الگ الگ چل رہے ہیں جنھیں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

کردار :

اس ناول کے بڑے کرداروں میں حسن پاشا، انجلینا، مرزا عباس اور مریم ہیں ۔ اس کے علاوہ دیگر کرداروں میں محمود پاشا، مصطفیٰ پاشا، علی پاشا، جمیل پاشا، یوسف پاشا مرزا کاظم والئی آذربیجان، آقا کاظم، کامروف وغیرہ شامل ہیں ۔ بعض ایسے کرداروں کی کچھ جھلکیاں بھی سامنے آتی ہیں جن کا ذکر مریم نے انجلینا کی داستان غم کے سلسلے میں کیا ہے مثلاً ٹامس (انجلینا کا نانا)، سوفیا (انجلینا کی ماں)، سلیمان (انجلینا کا والد)، جین (سوفیا کی خادمہ) عباس ایرانی جس کے ہاتھوں سلیمان قتل ہوا وغیرہ ۔

مصطفیٰ پاشا، علی پاشا وغیرہ دیگر فوجی افسروں کے کردار صرف ان کے جنگی تجربے اور بہادری وغیرہ کو اجاگر کرتے ہیں لیکن ان میں ایک کردار بھی ایسا نہیں جو قاری کے ذہن پر زندہ کردار کے نقوش مرتسم کر سکے ۔ محمود پاشا کا کردار زیادہ جاذب نظر ہے اس میں شیخی اور خودستائی کا جذبہ پایا جاتا ہے، وہ خود کو انتہائی دلیر، زیرک اور جنگی چالوں کا ماہر ظاہر کرتا ہے جبکہ اس کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ گرجستان کے ایرانی

ڈاکوؤں سے خائف ہے اور فوجی دستے کی معیت کے باوجود کسی ویران مقام پر رات گزارنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ مرزا عباس کے کردار میں زیرکی، بہادری اور خلوص کا رنگ جھلکتا ہے۔ باوجودیکہ وہ سنی شیعہ اتحاد کا خواہاں ہے اور چاہتا ہے کہ ترک اور ایرانی دولوں متحد ہو کر روسیوں کو شکست دیں لیکن جب ایرانی "علیا خلیفہ بلا فصل" کا نعرہ لگاتے ہیں تو خود مرزا عباس کی شیعیت کا عنصر بھی کبھی کبھی نمایاں ہو جاتا ہے اور وہ برملا کہہ دیتا ہے کہ ایرانی اپنے عقائد سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ اتحاد کی کوشش اور عقائد کے اختلاف کے باعث کبھی کبھی جو کشمکش کی صورت پیدا ہوتی ہے اس نے مرزا عباس کے کردار میں زندگی پیدا کر دی ہے۔

اس ناول میں شرر نے دیگر کرداروں کی نسبت ہیرو اور ہیروئن کے کرداروں پر زیادہ توجہ دی ہے۔ حسن پاشا کے کردار کی ابتدائی جھلک پہلے باب میں دکھائی دیتی ہے، وہ خوبرو، کشیدہ قامت، متین اور متحمل مزاج نوجوان ہے۔ وہ مودب بھی ہے لیکن دلیر بھی، جب محمود پاشا ایرانیوں کا خوف ظاہر کرتا ہے تو اسے غصہ آ جاتا ہے۔ بہادری کے علاوہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایرانیوں کی نسبت خود کو ہر طرح برتر محسوس کرتا ہے۔ دوسرے باب میں اس کے کردار کی کچھ مزید جھلکیاں سامنے آتی ہیں جن سے اس کی شخصیت میں شرم و حیا کا عنصر اجاگر ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیعیوں کے لیے اس کے دل میں کس قدر نفرت پائی جاتی ہے کیونکہ ان دو ایرانیوں پر حملہ کرتے ہوئے جنھوں نے انجلینا کو اغوا کرنا چاہا تھا وہ یہ کہتا ہے تم ایرانی اور شیعہ ہو تو تمھارا قتل مجھ پر فرض ہے۔ یہاں شرر نے حسن پاشا کا حلیہ بھی بیان کیا ہے۔

"یہ ترک نوجوان شخص تھا، ابھی بیس بائیس برس سے زیادہ عمر نہ ہوگی۔ قدرت نے اسے بھی کچھ ایسی دلربا صورت دی تھی کہ شاید بہتوں کو اس سے بے وفائی کی شکایت ہوگی۔ میانہ قد، سبزہ آغاز، گورا اور روشن چہرہ، پیاری خوبصورت آنکھیں، گلابی رخسارے، لال لال ہونٹ، سرخ سفید رنگت، یہ سب ایسی چیزیں نہیں کہ سنگدلوں کے بھی دل جلد اس کے قبضے میں آ جاتے تھے۔ نازک اور دلفریب چہرے پر ایک ایسی متانت اور سنجیدگی پائی جاتی تھی جس سے وہ کسی بہت بڑے معزز اور شریف خاندان کا شخص معلوم ہوتا تھا۔ وضع کے اعتبار سے بھی اس میں خاص قسم کی دلیری پائی جاتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بالوں پر عنابی ترکی ٹوپی تھی جس کا پھندنا نہایت بانکپن سے پیچھے لٹک رہا تھا۔ باناب کا نیلا فوجی کرتا بدن میں تھا جس پر ڈاب لگی ہوئی تھی۔ سینے پر مجیدی تمغہ آویزاں تھا جس میں ہلال بنا ہوا تھا۔ تمغے کے برابر ہی سینے پر ایک سونے کا خوبصورت ہلال لگا ہوا تھا۔ آڑا تسمہ شانے سے کمر تک پڑا تھا۔ کرتے کے نیچے سیاہ پتلون تھا جس میں دونوں طرف ایک سفید لکیر کمر سے ٹخنوں تک چلی گئی تھی۔ اسلحہ کی قسم سے اس نوجوان کے پاس صرف وہی ایک تلوار تھی . . . . (دوسرا باب)

حسن پاشا میں شرم و حیا، دلیری اور ہمت وغیرہ کی صفات جمع کرنے کے باوجود یہ محسوس ہوتا ہے کہ شرر نے اس کی سیرت نگاری پر خصوصی توجہ نہیں دی، اس لیے اس میں بھی ان کے اکثر دیگر ناولوں کے ہیروؤں کی طرح کی بعض خامیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ مثلاً دوسرے باب میں شرر اس کے نظریات کی عکاسی کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں کہ وہ ایرانیوں کو محض اس لیے واجب القتل سمجھتا ہے کہ وہ شیعہ ہیں لیکن پانچویں باب میں جب وہ مرزا عباس سے گفتگو کرتا ہے تو کہتا ہے:

"اگر اصل پوچھیے تو شیعوں اور سنیوں میں کوئی ایسی بڑی مخالفت نہیں ہے۔ تمام ارکان و اصول

اہمانیہ پر سب کا اتفاق ہے مگر خدا جانے کیا بات ہے کہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور ممکن نہیں کہ دونوں ایک جگہ جمع ہو سکیں ۔"

ناول کے دوسرے باب میں شرر نے حسن پاشا کے جو نظریات بیان کیے ہیں ، ان میں اور زیر نظر مکالمے کے نظریات میں بڑا فرق ہے لیکن ہمیں ناول میں نہ ایسے محرکات ملتے ہیں جن کے زیر اثر یہ تبدیلی رونما ہوئی ہو اور نہ ہی دونوں نظریات کے درمیان کوئی زمانی بعد ہے جس کی بدولت اسے مرور ایام کا ثمرہ سمجھا جائے۔

ناول کے آخری حصے میں جب حسن پاشا اس مورچے کو فتح کر لیتا ہے جس میں انجلینا ہے اور دونوں کی ملاقات کے بعد ترک ایرانی اختلاف کے باعث مسلمان خود کو گھرا ہوا پاتے ہیں تو انجلینا اور مریم ایرانیوں کے خلاف نفرت کا اظہار کرتی ہیں تو حسن پاشا کہتا ہے :

"پیاری انجلینا! تمھیں ایسا نہ کہنا چاہیے، مجھے تعصب برا معلوم ہوتا ہے، اگرچہ تمھاری زبان سے بری بات بھی اچھی معلوم ہوتی ہے یہ خیال کرو کہ اس قسم کے امور سب ہی سے ظاہر ہوتے ہیں .... پیاری انجلینا تم اپنے دل سے ایسے خیالات کو نکال ڈالو، دنیا میں سیکڑوں مذہب ہیں اور ہر مذہب والے اپنے مذہب کو حق اور اچھا خیال کرتے ہیں ۔"

آخری حصے میں نظریات کی اس تبدیلی کے لیے ہو سکتا ہے یہ جواز پیش کیا جائے کہ ترک ایرانی اتحاد کی بدولت حاصل کی ہوئی فتوحات اور انتشار کی بدولت رونما ہونے والی کمزوری کا تقابلی جائزہ اس کا باعث بنا لیکن پھر بھی یہ کہنا پڑے گا کہ حسن پاشا کے کردار میں کشمکش کی کیفیات پر بھی زیادہ توجہ نہیں دی گئی ورنہ ان مواقع پر ذرا سی چابک دستی اسے گوشت پوست کا زندہ کردار بنا دیتی ۔ حسن پاشا کے سلسلے میں زیادہ تر محض جذباتی بیانات ملتے ہیں جن کے ذریعے شرر نے حسب معمول اسے بھی انتہائی عاشق مزاج ہیرو کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ان ناولوں میں ہیرو ہیروئن کی ملاقات عموماً اچانک ہوتی ہے اور ہیرو پہلی نظر میں ہی ہیروئن کی صورت زیبا کا دلدادہ اور درہم ناخریدہ غلام ہو کر رہ جاتا ہے ۔ شرر کے یہاں حسن و عشق کے معیار مبہم ہیں اور ان کی سراپا نگاری سے کوئی خاص تصویر اجاگر نہیں ہوتی ۔ حسن پاشا کا کردار پھر بھی ملک العزیز ورجنا میں ملک العزیز کے کردار سے بہتر اثر رکھتا ہے ۔ ملک العزیز میں بھی دلیری اور بہادری کا رنگ دکھایا ہے لیکن ملک العزیز عکہ کی شکست کے فوراً بعد سلطان کو میدان کار زار میں چھوڑ کر ورجنا کے ساتھ مصر روانہ ہو جاتا ہے جبکہ یہاں حسن پاشا انجلینا کی فرمائش کے باوجود کہ اس مورچے سے ہٹ کر کسی محفوظ مورچے میں چلیں یہ جواب دیتا ہے :

"آہ پیاری انجلینا ! یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے ، اول تو اس پہاڑی سے اور کسی طرف نکلنے کا راستہ ہی نہیں ہے دوسرے اپنے سپاہیوں، اپنے جان نثاروں کو چھوڑ کر میں ہرگز نہیں جا سکتا، چاہے اس میں جان جاتی رہے ۔"

حسن انجلینا میں کردار نگاری کے اعتبار سے انجلینا کا کردار کسی حد تک جاذب نظر ہے ۔ شرر نے انجلینا کی سراپا نگاری اور کردار نگاری پر زیادہ توجہ دی ہے ۔ انجلینا کے کردار میں مشرق کی شرم و حیا اور مغرب کی آزادی کو یک جا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انجلینا کی سراپا نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ملکہ ایک شرمگیں نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگی ۔ ملکہ حقیقت میں نہایت ہی حسین عورت تھی ۔ زلفیں شانوں پر پڑی ہوئی تھیں اور دونوں طرف کی کاکلوں کے درمیان میں پیارے پیارے رخسارے

اور چمکتی ہوئی گوری پیشانی اپنی آب و تاب کی وجہ سے نظر کو جمنے نہیں دیتی تھی - بڑی بڑی سیاہ آنکھوں نے اسے بالکل ایک ہرن بنا دیا تھا کیونکہ اس وقت کہسار کی سیر میں بھی مشغول تھی - چھوٹے پیارے دہانے نازک نازک سرخ اور سکڑنے کے ساتھ اُن میں سے موتی کے ایسے دانتوں کی جھلک کا نظر آ جانا یہ حسن کی دلربا ادائیں اس کے دل پر اثر کر گئی تھیں -"

انجلینا کے کردار میں نسوانیت اور نسوانی شرم و حیا کے پیدا کرنے کے کئی مواقع شرر کو میسر آئے اور انھوں نے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا - مثلاً پہلی ملاقات کے موقع پر حسن پاشا نے جب انجلینا کو اُن ایرانیوں کے ہاتھ سے بچایا جو اُسے اغوا کرنا چاہتے تھے تو شہزادی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

"خدا اگر اس وقت آپ کو نہ بھیج دیتا تو میں اس کی لونڈی ہوتی مگر اب بھی میں لونڈی ہوں، پہلے اس کی ہوتی اب آپ کی ہوں - ہاں اگر اس کی لونڈی ہوتی تو ذلت سے اور آپ کی لونڈی فخر کے ساتھ -"
یہ جملہ سن کے ترک سے ضبط نہ ہو سکا بہت نیچی آواز سے گویا خود اپنی طرف خطاب کرکے کہنے لگا "جو میرے دل کی مالک ہے کیا وہ میری لونڈی ہے ! نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ، وہ تو ایک صورت ہے جس کی پرستش کی جائے -" اتنا سننا تھا کہ مریم نے مسکرا کے ملکہ کی صورت دیکھی اور ملکہ نے اس کی طرف دیکھ کے سر جھکا لیا -"

اس موقعے پر انجلینا نے حسن پاشا کے زخموں سے خون پونچھنے کے لیے اپنی جیب سے ایک رومال نکال کر مریم کو دیا اور کہا کہ لو اس سے خون پونچھ دو اور اپنی ایک دوسری خادمہ کا رومال لے کر دیتے ہوئے کہا اس رومال سے زخم کو باندھ دینا - مریم رومال لے کے خون پوچھنے کو بڑھی تو نوجوان نے ہاتھ سے رومال لے کر کہا "اس رومال سے میرا سر باندھنا شاید کچھ تسکین ہو - خون پوچھنا ہے تو وہ دوسرا رومال دیتی ہیں -" یہ سن کے نازنین اور حور وش ملکہ نے ایک عجیب ناز و ادا کی نگاہ سے نوجوان کی صورت دیکھی اور نظر نیچی کرلی -"

شہزادی کی کوٹھی پر شہزادی اور اس کی خادمہ مریم کے درمیان ان امور پر گفتگو ہو رہی ہے کہ وہ ان مخدوش حالات میں حسن پاشا کو اپنے یہاں کس طرح پناہ دیں ؟ اگر روسیوں کو خبر ہو گئی تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو گا - اس موقع کے مکالمے ملاحظہ ہوں:

"مریم: شہزادی ! تم جو اس کی باتوں کو شوق سے سنتی ہو تو مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا جادو تم پر اثر کر جائے - افسوس بڑی خرابی ہوتی دیکھو خدا کیا کرتا ہے -"
انجلینا: مریم تم اس قدر ڈری کیوں جاتی ہو -
مریم: ڈرنے کی بات ہی ہے - وہ تمھاری صورت پر فریفتہ ہے - تمھاری ہر ادا پر جان دیتا ہے - تم اسے اپنے دام میں گرفتار کرکے لائی ہو ، وہ تمھاری زلف کا اسیر ہے - تمھاری نگاہ ناز جوں جوں پڑتی ہے دوں دوں وہ بے جان ہو جاتا ہے - اب وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے، اس کو تمھارے ذکر کے سوائے کوئی بات بھلی ہی نہیں معلوم ہوتی - میں سچ کہتی ہوں تم اسے اپنا شیدا، اپنا عاشق، اپنا دلدادہ بلکہ گرفتار بنا کے یہاں لائی ہو، میں ڈرتی ہوں کہ خدا نہ کرے کہیں اس کے جذب الفت کا اثر تم پر . . . . ."
مریم جس وقت یہ باتیں کر رہی تھی آنکھیں زمین میں گڑی جاتی تھیں اور پیارے سرخ سرخ ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ نمایاں تھی - دل کبھی اپنے حسن کی تعریف سن کے خوش ہو جاتا ہے اور کبھی شرم غالب آ کے اس کے دل میں یہ ارادہ پیدا کر دیتی تھی کہ مریم کو ان باتوں سے روک دے آخر مریم جب اس جملے پر پہنچی کہ "اس کے جذب الفت کا اثر تم پر . ." تو نہ رہا گیا اور بے اختیار نازک ہاتھ بڑھا کر مریم کا منہ بند کر دیا اور شرم کے لہجے میں کہنے لگی "مریم ایسی باتیں زیادہ نہ کرنا - شرم کے مارے مجھ سے سنی نہیں جاتیں، بس اب چپ رہو -"

اسی طرح چھٹے باب میں حسن پاشا اور انجلینا میں راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں، حسن

اچانک کہہ اٹھتا ہے :

''اپنے مہمان پر ظلم نہ کرو، دنیا میں لوگ مہمانوں کی خاطر اور دلدہی کرتے ہیں ۔

انجلینا : کیا مجھ سے کوئی خطا ہوئی؟ اگر کوئی قصور ہوا ہو تو معاف کیجیے ۔

حسن : خدا جانے کس کا قصور ہے، تم ساعت بہ ساعت میرے دل پر قبضہ کرتی جاتی ہو ۔ میں لحظہ بہ لحظہ اپنے اختیار سے باہر ہوا جاتا ہوں اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ کس کا قصور ہے ۔ مجھے ظاہر میں تو آپ کا قصور معلوم ہوتا ہے مگر اصل میں یہ میرا ہی قصور ہے'' یہ جملہ سن کر پیاری انجلینا نے شرما کر سر جھکا لیا ۔ حسن : نہیں معلوم جو لوگ دل چھین لیتے ہیں اس کے معاوضہ میں کیا احسان کرتے ہیں ۔

انجلینا : (سنجیدگی کے ساتھ مگر دبی زبان سے) میں نے خود اپنا دل حوالے کر دیا، اپنی تمام خوشیاں تمھارے خیال پر قربان کر دیں اب اس سے زیادہ مجھ سے کیا ممکن ہے ۔

حسن : خوشی میرے پاس بھی بہت تھی اور تمھارے پاس بھی تھی مگر دونوں کے پاس نہیں ہے، آخر یہ کہاں گئی ۔

انجلینا : وہ ہم دونوں کے دل سے چلی گئی اور اب پھر اس روز آئے گی جب اطمینان سے ۔'' شرم نے زبان پکڑ لی ۔

حسن : ہاں کیا ؟ اطمینان سے کیا ہو گا ۔

انجلینا : کچھ نہیں میں یہ کہتی ہوں کہ خوشی اگر ہمارے دلوں سے جاتی رہی تو پھر آ جاوے گی ۔''

سولھویں باب میں جب مسلمان روسیوں کے نرغے میں گھر جاتے ہیں تو حسن پاشا فیصلہ کرتا ہے کہ لڑ بھڑ کر نکل جائیں ۔ اس موقع پر انجلینا کا ذکر کرتے ہوئے شرر لکھتے ہیں :

''اس نے نہایت حسرت سے اپنے پیارے عاشق شہزادہ حسن کی صورت دیکھی جو بڑی سرگرمی سے اس کشت و خون کے دریا میں کودنے کا اہتمام کر رہا تھا اور صورت دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ایسا دل بھر آیا کہ بے اختیار یہی چاہا کہ اس کے سینے سے لپٹ جائے مگر ایشیائی شریفانہ شرم آمیز خون جو اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا اس نے یہ جرأت نہ کرنے دی ۔''

مکالمے :

حسن انجلینا میں شرر کی مکالمہ نگاری کے بعض نمونے سطور بالا میں موجود ہیں جن سے آن کی مکالمہ نگاری کا انداز عیاں ہوتا ہے ۔ مریم کے مکالمے اس کی اپنی شخصیت اور معاشرتی سطح سے ہم آہنگ نہیں دکھائی دیتے ۔ اسی لیے ان مکالموں کے ذریعے مریم کے کردار کی تکمیل اور اس کی شخصیت اجاگر نہیں ہوتی ۔ مریم کے مکالموں میں بے ساختگی اور بے تکلفی کے بجائے ایک گونہ تصنع اور تکلف ملتا ہے ۔ سادگی کے بجائے ادبیت کا عنصر نمایاں ہے البتہ حسن پاشا اور انجلینا کے مکالمے ایک حد تک آن کی شخصیت کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ حسن پاشا سے زیادہ انجلینا کے مکالمے اس کی شخصیت سے ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں ۔ حسن پاشا کے مکالموں میں حسب معمول شرر نے ''پبلک کی دلچسپی کے لیے'' سستی جذباتیت کا رنگ بھر دیا ہے لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ حسن پاشا کی عاشق مزاجی کا جو رنگ انھوں نے پیش کیا ہے مکالمے اس سے مناسبت رکھتے ہیں ۔

حسن انجلینا کے مکالمے بحیثیت مجموعی اس کے پلاٹ سے ہم آہنگ ہیں اور اسے آگے بڑھانے میں ممد و معاون ہیں ۔ عاشقانہ مکالموں میں بھی ادبیت کا رنگ موجود ہے مثلاً چھٹے باب ''خوب ملے'' میں حسن اور انجلینا کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھے سمندر کی سیر دیکھ رہے ہیں ، انجلینا کہتی ہے :

''اچھا اب اس وقت سمندر کی بہار دیکھو یہ مقام لطف سے خالی نہیں ہے بلکہ میرے نزدیک تو عجب بہار کا عالم نظر آ رہا ہے - دیکھو آفتاب سامنے ڈوب رہا ہے اور اس کی شعاعوں کا سنہری زیور پہن کر یہ موجیں کیسی اترا رہی ہیں . . . . حسن : جس طرح اس وقت کی دھوپ کا سنہرا لباس تمھیں پہنے دیکھ کر میں اپنے دل میں محظوظ ہو رہا ہوں . . . .''

منظر نگاری اور جزئیات نگاری :

حسن انجلینا میں شرر نے منظر نگاری پر خصوصی توجہ دی ہے- چونکہ ناول کا بیشتر حصہ میدان جنگ ، پہاڑوں اور کھلی فضا سے متعلق ہے اس سے شرر کے قلم کو موشگافی کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملے ہیں - اس ناول کے بیشتر مناظر میدان جنگ میں معرکہ کار زار سے متعلق ہیں ، جن میں جزئیات نگاری کی گنجائش کافی تھی ، شرر نے ان جزئیات کو بڑے سلیقے سے ترتیب دیا ہے - مورچہ بندی ، مورچوں کے محل وقوع ، پیش قدمی کے نقشے اور معرکہ آرائی سب جزئیات کو ان مرقعوں میں خوبصورتی سے سمویا ہے - میدان کار زار کے علاوہ جو مناظر ہیں وہ اپنی بھر پور ادبیت کے باعث اپنے اندر ایک گونہ جاذبیت رکھتے ہیں - سطور ذیل میں منظر نگاری کے بعض نمونے پیش کیے جاتے ہیں - ناول کے آغاز میں پہلے باب میں لکھتے ہیں :

''شہر باطوم سے دس میل شمالی جانب ایک گاؤں ہے - یہ گاؤں ایک نہایت عمدہ موقع پر واقع ہے - مشرق کی طرف سنگی بلند کراروں کے نیچے بحراسود ابھریں لے رہا ہے جس میں ایک طرف دور پر بہت سے جنگی جہاز سلسلہ وار لنگر ڈالے پڑے ہیں اور ان کے لمبے مستولوں پر رنگین جھنڈیاں جن پر ہلالی نشان بنے ہوئے ہوا میں اڑ رہے ہیں - مشرق کی طرف کوہ قاف کا سلسلہ اپنے اونچے اونچے دشوار گزار اور مہیب ٹیلوں سے آزاد رو کی نظر کی حد بندی کر رہا ہے - اگرچہ زمین پتھریلی ہے مگر جا بجا سبزہ اگا ہوا ہے اور باغبان قدرت کی معجزہ نما صناعی نے سنگستانی دشت کو ایک پر بہار باغ کا نمونہ بنا دیا ہے - دور سے کھڑے دل پر ایک پر شہرت گاؤں کے مختلف اجڑے ہوئے مکان اور منہدم آثار کی مجموعی وضع ایک پر مسرت اثر ڈالتی ہے کیونکہ صحرائی سادہ مزاج لوگوں اور سیدھی سادی بے تکلف زندگی بسر کرنے والے دہقانوں کو بھی زمانے نے کچھ ایسا ستایا کہ غریب ان کم حیثیت اور ذلیل مکانوں میں بھی زندگی نہ بسر کر سکے -

گاؤں سے ملحق مغرب کی طرف ہٹ کے عین ساحل بحراسود پر کوئی ٹوٹی پھوٹی عمارت نظر آتی ہے - عمارت بالکل شکستہ حال ہے اور گویا تھک کے اور مجبور ہو کے اب زمانے کا ساتھ چھوڑا چاہتی ہے - محرابیں اپنی وضع پر نہیں رہیں - پتھر ہر طرف سے گر کر چاروں طرف ڈھیر ہو گئے مگر قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت کے لیے بالفعل یہ عمارت مختصر سا قلعہ بن گئی ہے کیونکہ روسی جھنڈا اس کی بلندی پر اڑ رہا ہے - ہر چہار طرف دمس بندی ہے اور ان کی آڑ میں دور ایک چھوٹا سا خوش نما شہر بحراسود کے مشرقی ساحل پر ہے، یہ پہلے ترکوں کی سرحد میں تھا اب روس کا قبضہ ہے - ایک دو توپیں بھی آدھی آدھی نظر آتی ہیں -

وقت آخر ہو چلا ہے کیونکہ آفتاب کی کرنیں زرد ہو گئی ہیں - مغرب کی جانب نظر کی انتہائی اوپر ایک بد نما تیرگی نے آسمان کو بحر اسود کے پانی سے جدا کر دیا ہے اور طیور اپنے آستانوں میں اطمینان سے بیٹھنے کی خوشی میں چہچہا کے اڑنے لگے - کوہ‌قاف کے دامن میں آباد ہوئے والے دہقانوں کی دو ایک پری جمال اور سادہ مزاج لڑکیاں جو اپنے مویشیوں کو چراتے ہوئے ایک چھوٹے قلعے کی دمسوں تک چلی گئی تھیں وہ بھی پلٹ کے مشرق کی طرف ہوئیں کہ آفتاب کے ڈوبنے سے پہلے اپنے گاؤں میں پہنچ جائیں - جس طرح آفتاب بحراسود کے پانی میں غوطہ زنی کے لیے جلدی کر رہا ہے اسی طرح یہ نازک بدن لڑکیاں اپنے گاؤں کو جلد جلد مار مار کے کوہ قاف کی طرف بھگائے لیے جاتی ہیں - شعاعیں کچھ دیر تک سمندر

کی لہروں پر شوق کے ساتھ مچلیں، آخر تاریکی نے ان سنہری کرنوں کو غائب کر دیا ۔ آفتاب غروب ہو گیا، صحرائی وسیع سین پر تیرگی کا نقاب پڑنے لگا اور دھندلی نظر آتے آتے کوہ قاف کی بلند چوٹیاں نظروں سے غائب ہونے لگیں ۔ ادھر ادھر جگنو چمکتے نظر آنے لگے، اب بالکل اندھیرا ہو گیا ۔ قدرت کی ہر چیز رات کے پردے میں چھپ گئی اور پہاڑوں کے دامن میں پہاڑیوں نے دور دور بیٹھ کر ہاتھ پاؤں گرم کرنے کے لیے جو آگ جلائی اس کے شعلے غول بیابان کا دھوکا دینے لگے ۔''

''دو گھڑی رہے کا وقت ہے، نیلگوں آسمان پر ابر کے پھٹے پھٹے ٹکڑے پھیلے ہوئے ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ پھر فلک نے اپنی پھٹی پرانی گدڑی اوڑھنے کو نکالی ہے، مگر اس کہگی پر آسمان کی قبائے نیلگوں کا رنگ نکھرا ہوا جہاں جہاں سے نمودار ہو رہا ہے اس قیامت کا ہے کہ آنکھوں میں کھبا جاتا ہیں ۔ بزم قدرت کے قدر دان متحیر ہیں کہ اسے کس نے بتا دیا جو کسی فرنگستان کی دلربا دوشیزہ لڑکی کی دھوئی ہوئی آنکھوں یا شبنم صبح سے دھوئے گل سوسن کا رنگ اڑا لایا ۔ ہوا تیز چل رہی ہے اور اس کے جھونکے جس طرح دست گستاخ کسی نازک چہرے کے نقاب کے ساتھ پیش آتے ہیں اسی طرح ابر کو اڑا اڑا کر سر ہر لاتی ہے اور بڑھ کے بحراسود کی شوخ ادا موجوں پر جھک پڑتی ہے جہاں اس کے رقیب آفتاب کی آڑی کرنیں بے تکلفی سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہیں ۔ طیور اس تیز ہوا کی مدد سے فضا کے دور کو زیادہ سہولت سے طے کر رہے ہیں ۔''

زبان و بیان :

حسن انجلینا کی زبان و بیان پر شرر کی ادبیت کی گہری چھاپ موجود ہے ۔ یہ ادبیت محرکات اور منظر نگاری میں اپنا رنگ نمایاں طور پر دکھاتی ہے ۔ پہاڑوں، میدانوں اور وادیوں کے مناظر میں انھوں نے مرقع کشی کرتے ہوئے بڑی خوبصورت تشبیہات و تمثیلات کو وسیلہ اظہار بنایا ہے جس کا نمونہ مذکورہ بالا اقتباسات ہیں ۔ ناول میں دلچسپی اور عام قاری کی خوشنودی کے لیے انھوں نے حسن و عشق کے بیان میں رومانی الفاظ کا سہارا لیا ہے ۔ ملک العزیز ورجنا کی طرح یہاں بھی ہیروئن کے لیے بیاری، دلربا، مہوش اور نازنین وغیرہ کے الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں ۔ اس انداز بیان کی بدولت ہی ان کے مناظر اور کرداروں کے حلیے حقیقی رنگ و روغن کی بجائے تخیلی دھندلکوں کے پس منظر سے جھانکتے دکھائی دیتے ہیں ۔ پہلے بحث ہو چکی ہے کہ ناول سہ گونہ مقاصد رکھتا ہے ۔ یہ ایک رومانی داستان بھی ہے اور روسیوں کے خلاف ترکوں کی نبرد آزمائی کی تاریخ بھی اور مسلمانوں میں سنی شیعہ اختلاف کے باعث پیدا ہونے والے انتشار کی عبرت ناک حقیقت بھی، لیکن شرر نے اس ناول میں ان تینوں مقاصد کو خوبصورتی کے ساتھ فن کے سانچے میں ڈھالا ہے ورنہ اندیشہ تھا کہ سنی شیعہ اختلاف کے بیان میں ان کا انداز خطیبانہ یا واعظانہ ہو جاتا لیکن انھوں نے اپنے آپ کو فن کی حدود کے اندر رکھتے ہوئے ان نازک مقامات کو انداز بیان کی حسن و خوبی سے نباہا ہے ۔

۳۔ منصور موہنا

منصور موہنا شرر کے بہترین تاریخی ناولوں میں سے ایک ہے ۔ تاریخی اعتبار سے اس میں بیان کردہ واقعات کی صداقتوں کا ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے ۔ فنی اعتبار سے یہ ناول شرر کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے ۔ ناول اپنے انجام کے اعتبار سے بھی شرر کے دیگر ناولوں میں انفرادیت رکھتا ہے، اس کا ذکر انھوں نے خود بھی کیا ہے :

"منصور موہنا ۱۸۹۰ء کے ساتھ تمام ہوگیا اور افسوس کی بات ہے کہ ناظرین کے دلوں پر ایک سخت چوٹ لگا کے تمام ہوا جس کی حسرت انھیں بہت دنوں تک یاد رہے گی . . . ."[۱]

منصور موہنا پر چونکہ حسن انجلینا کی طرح دوہری مقصدیت غالب نہیں اس لیے ناول میں فنی لطافت کہیں زیادہ ہے -

پلاٹ :

شـرر نے اس ناول کے پلاٹ کو ۱۷ ابواب میں تقسیم کیا ہے - ناول کا آغاز حسب معمول کسی بیانیے کے بغیر ایک تجسس سے ہوتا ہے - پانچ چھ سو سواروں کی جمعیت کسی کا پیچھا کر رہی ہے - یہ سوار کون ہیں اور کس کے تعاقب میں ہیں ؟ باب کے آخر تک پہنچتے پہنچتے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی بجے رام کو سرکشی کی سزا دینے آیا تھا، بجے رام بھاگ نکلا ہے اور سلطان کے پانچ سو سپاہیوں کا دستہ ایک نوجوان سردار منصور کی سرکردگی میں سندھ کی طرف بجے رام کے تعاقب میں روانہ ہے - لیکن آخر تک پہنچتے پہنچتے ایک اور تجسس پیدا ہو جاتا ہے کہ بجے رام تو منصور کی فوج کے ساتھ ایک معرکے میں گرفتار ہو گیا لیکن خود منصور لڑائی سے بھاگنے والے راجپوتوں کے تعاقب میں نکل گیا تھا، واپس نہیں لوٹا - منصور کدھر گیا ؟ یہ سوال ایک خلش بن جاتا ہے - دوسرے باب کا آغاز ایک تاریخی پس منظر سے ہوتا ہے اور آخر میں منصور کی موجودگی کا علم ہو جاتا ہے لیکن اب یہ سوال قاری کے سامنے ہے کہ سلطان محمود غزنوی منصور کی گمشدگی سے مطلع ہو کر کیا اقدام کرے گا - اس کے بعد قصہ منصور کے ساتھ ساتھ چلتا ہے - میزبان قبیلے کی دو لڑکیاں اس کے متعلق گفتگو کرتی ہیں - ایک آدھ واقعہ مثلاً ایک شیر کا رات کو حملہ آور ہونا اور منصور کے ہاتھوں ہلاک ہونا، ایسا ہے جس سے پلاٹ میں منطقی اور نفسیاتی ارتقا ہوتا ہے - اس باب کے آخر میں یہ سوال حل طلب ہے کہ عذرا اور لیلیٰ کا باہمی رشتہ کیا ہے اور قبیلے میں عذرا کی کیا حیثیت ہے اور وہ کس کی بیٹی ہے ؟

چوتھے باب میں قاری منصور کی گمشدگی پر سلطان کے رد عمل کا منتظر ہے - پانچویں باب میں قصے میں کچھ نئے واقعات شامل ہوتے ہیں جو آگے چل کر پلاٹ میں اہم رول ادا کرتے ہیں - والیٔ اجمیر، جے رام اور موہنا کی شخصیتیں بھی پہلی بار پلاٹ میں رونما ہوتی ہیں - چھٹے باب میں تجسس، کشمکش اور دلچسپی کے عناصر زیادہ ہیں - پہلے سین میں سواروں کا ایک گروہ دکھایا گیا ہے، اس کے بارے میں جلد ہی تجسس ختم ہو جاتا ہے کیونکہ یہ منصور کا میزبان انصاری خاندان ہے اور اس گروہ کا جے رام اور موہنا کی فوج سے مقابلہ ہوتا ہے - لڑائی کا انجام ناول میں دلچسپی کو مزید گہرا کر دیتا ہے- ساتویں، آٹھویں اور نویں باب میں پلاٹ بہت تیزی سے ارتقا کے مراحل طے کرتا ہے - ان چار ابواب (چھٹے تا نویں) کا ایک دوسرے سے بڑا گہرا ربط ہے - واقعات بہت تیزی سے بدلتے ہیں، پلاٹ میں کشمکش کی کیفیت بڑھتی جاتی ہے اور نشیب و فراز کی صورتیں ہر لحظہ بدلتی ہیں - چھٹے باب میں انصاری خاندان کی شکست سے جو ایک بڑی فوج کے مقابلے میں بالکل یقینی اور فطری امر تھا، قارئین

۱- اداریہ دلگداز، آغاز سال ۱۸۹۱ء -

دل پر بوجھ سا محسوس کرنے لگتے ہیں لیکن اس باب کے اختتام سے پہلے ہی شرر قیدیوں کے لیے موہنا کے دل میں پیدا ہونے والی ہمدردی کی ایک جھلک دکھا کر نہ صرف یاس و غم کی کیفیت کو زیادہ ابھرنے نہیں دیتے بلکہ قاری کے اشتیاق کو اور بھی بڑھا دیتے ہیں۔ قاری جلد از جلد یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ موہنا نے قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ؟ پھر کیا ہوا ؟ یہاں یہ امر بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پلاٹ میں یہ نشیب و فراز اور موڑ غیر فطری نہیں معلوم ہوتے۔ شرر نے فنی مہارت اور چابکدستی سے اُن کے لیے فطری، نفسیاتی اور منطقی جواز پیدا کر دیے ہیں۔ پلاٹ کی اس خوبصورتی اور فنی حسن کو برقرار رکھنے میں اس ناول میں ان کی اچھی کردار نگاری نے بھی بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ ساتویں باب میں عذرا اور لیلیٰ کی شخصیت کے بارے میں پیدا ہونے والے سوالات کا اور عذرا کے دل میں منصور کے لیے غائبانہ پیدا ہونے والی محبت کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ پلاٹ میں یہاں یہ نیا موڑ بھی واقع ہو جاتا ہے کہ موہنا بھی منصور پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ اب کشمکش زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ موہنا کو منصور سے اور منصور کو عذرا سے محبت ہے۔ عذرا بھی منصور کے لیے چاہت رکھتی ہے۔ عذرا اور منصور موہنا کے احسان مند بھی ہیں۔ جے رام بھی موہنا کی زلف کا اسیر ہے اور ایک بار منصور پر قاتلانہ حملہ بھی کر چکا ہے۔ قاری سوچتا ہے کہ دیکھیے آگے پلاٹ کیا رخ اختیار کرتا ہے اور تقدیر کیا گل کھلاتی ہے۔

آٹھویں باب میں پلاٹ میں پھر موڑ واقع ہوتا ہے یا بالفاظ دیگر اتار چڑھاؤ کا ایک سلسلہ پھر تکمیل پذیر ہوتا ہے۔ اب جے رام منصور کی قید میں ہے۔ سلطان کی فوج فتح پا چکی ہے۔ منصور موہنا کے احسانات کا بدلہ دینا چاہتا ہے لیکن نویں باب کے آغاز میں تذبذب اور کشمکش کی کیفیت اپنے عروج پر ہے۔ وہ موہنا کے لیے ہمدردی کا جذبہ بھی محسوس کرتا ہے لیکن اُسے ساتھ رکھنا وہ اپنی اور عذرا کی محبت کے درمیان رکاوٹ تصور کرتا ہے۔ یہ کشمکش اپنی منتہیٰ پر پہنچ کر اس طرح ختم ہوتی ہے کہ موہنا کو جے رام سمیت واپس اجمیر بھیج دیا جاتا ہے اور سلطان کی فوج غزنین روانہ ہو جاتی ہے۔ اب کچھ نئے سوالات ابھرتے ہیں، کیا منصور نے عذرا سے شادی کرلی، ان کی محبت کا انجام کیا ہوا ؟ کیا منصور کی موہنا سے پھر ملاقات نہیں ہوئی ؟ کیا موہنا نے اجمیر پہنچ کر جے رام یا کسی اور کو اپنا لیا ؟ انھیں سوالات کے جواب کے لیے ناول آگے چلتا ہے اور پھر از سر نو تجسس کی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں اور قاری اسی اشتیاق و انہماک کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔

دسویں باب سے واقعات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں یحییٰ بن زکریا مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے مہاراج کرشن کا روپ اختیار کر رکھا ہے۔ اس باب کے آخر تک موہنا اور یحییٰ ایک دوسرے کے راز دار ہو گئے، یحییٰ نے منصور تک اس کا پیغام پہنچانے کا وعدہ کیا جو اب پھر سلطان کی فوج کے ہمراہ ہندوستان آ چکا تھا۔ گیارہویں باب میں سلطان متھرا کو فتح کر چکا ہے اور وہاں ابھی قیام پذیر ہے کہ منصور کو کوئی نوجوان فقیر کسی جوگی سے ملانے کے لیے کیمپ سے لے چلتا ہے۔ قاری کا دل اس مرحلے پر زور زور سے دھڑکتا ہے، دیکھیں یہ فقیر منصور کو کدھر لیے جا رہا ہے کہیں اس کے پس منظر میں موہنا تو نہیں، یحییٰ تو نہیں؟ قاری راہ تجسس میں شوق سے قدم بڑھاتا ہے۔ باب کے آخر میں کئی ہندو جوگی منصور کو مٹھ کے اندر قید کر دیتے ہیں۔ یہ کیا ہو گیا ؟ یہ جوگی کون ہیں ؟ انھیں منصور

سے کیا پرخاش ہے ؟ اس باب کے آخر میں منصور کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ عذرا بھی آسے چھوڑ کر لیلیٰ کے ہمراہ کہیں چلی گئی تھی ۔ عذرا نے ایسا کیوں کیا ؟ منصور نے تو عذرا کی خاطر موہنا کی محبت کو نظر انداز کر کے آسے اس کے باپ کے پاس واپس بھجوا دیا تھا ۔ عذرا نے بے وفائی کیوں کی ؟ اور کدھر چلی گئی ؟

بارہویں باب میں جے رام نے مہاراج کرشن اور اس کے دو چیلوں کو موہنا کی مزاحمت کے باوجود مسلمان ہونے کے شبے میں گرفتار کر لیا ۔ اس نے موہنا کو بھی راجا سے شکایت کی دھمکی دی ، لیکن جس تیزی سے ادھر حالات نے پلٹا کھایا اسی قدر جلد پھر موڑ واقع ہوا اور یحییٰ اور اس کے دونوں مسلمان چیلے رات کو ہی جے رام کی قید سے نکل بھاگے ، لیکن کس طرح؟ موہنا کی شکایت کرنے کی بجائے خود جے رام کو راجا سے ڈانٹ کھانی پڑی ۔ تیرہویں باب میں موہنا تک یہ خبر پہنچتی ہے کہ منصور مار ڈالا گیا اور سلطان نے اس کے انتقام کی خاطر متھرا سے غزنین واپسی کا ارادہ ترک کر دیا ہے ۔ قاری سوچتا ہے کیا منصور کے قتل کی خبر صحیح ہے ؟ اسے جوگیوں نے قید کر لیا تھا کیا واقعی انھوں نے قتل کر دیا ؟ موہنا پر اس خبر نے بہت اثر کیا تھا ، قاری موہنا کے رد عمل کا منتظر ہوتا ہے ، اور جے رام سے اس کی شادی کی بات چیت کا انجام بھی دیکھنا چاہتا ہے ۔

چودہویں باب میں اجمیر کے شمالی پہاڑوں میں ایک معمر جوگی اور اس کے چیلے دکھائی دیتے ہیں ، یہ کون ہیں کہیں یحییٰ اور اس کے ساتھی تو نہیں ؟ ایک اور نو عمر جوگی بھی وہاں آ پہنچتا ہے ۔ بہت دل چلا معلوم ہوتا ہے ، یہ کون ہے ؟ جوگیوں نے جھونپڑے میں صندوق سے ایک قیدی کو نکال کر کھانا کھلایا ، یہ قیدی کون ہے ؟ منصور تو نہیں ؟ شاید وہی ہو ! نووارد نوعمر جوگی اس قیدی کو دیکھ کر بد حواس کیوں ہوا ؟ کیا وہ آسے جانتا تھا ؟ اگر وہ منصور ہے تو یہ نووارد جوگی خود کون ہے ؟ معمر جوگی سلطانی فوج کے افسر سے تنہائی میں کیا گفتگو کرتا رہا اور وہ افسر جوگی کے سامنے مودب کیوں تھا ؟ قاری کا ذہن ان اسرار و رموز کی حقیقت جاننا چاہتا ہے اس لیے وہ پورے انہاک سے پلاٹ کے ارتقا کا جائزہ لیتا ہے ۔

پندرھواں اور سولہواں باب سلطان محمود غزنوی اور راجا اجمیر کے لشکر کی معرکہ آرائی کو سمیٹے ہوئے ہے لیکن اس کے باوجود جنگ کے نتائج کے بارے میں تجسس برقرار رہتا ہے ۔ سترھویں باب میں لڑائی ابھی عروج پر تھی کہ جے رام کو ایک اجنبی نے گھائل کر دیا اور وہ حملہ آور خود جے رام کے ہاتھوں قتل ہوا ۔ حملہ آور کون تھا ؟ وہ دونوں جوگی کون تھے جنھوں نے اچانک پہنچ کر تڑپتے ہوئے جے رام کو ختم کیا اور خود اس کے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ؟ تیسرے نوعمر جوگی نے وہاں پہنچ کر خودکشی کیوں کی ؟ معمر جوگی کو سلطان کے یہاں باریابی کیوں حاصل تھی ، ایسے بہت سے سوال پیدا ہو جاتے ہیں لیکن ان سارے سوالات کا جواب آخری دو صفحات میں مل جاتا ہے اور قاری کی ذہنی الجھنیں رفع ہو جاتی ہیں ۔ اگرچہ عذرا ، لیلیٰ ، منصور ، موہنا اور جے رام کے اس طرح یک جا قتل ہو جانے سے قاری کو صدمہ پہنچتا ہے جس کا خود شرر کو بھی احساس ہے ۔ بحیثیت مجموعی ناول کا پلاٹ مربوط ، منطقی اور ارتقا پذیر ہے ۔ اس میں کہیں غیر ضروری ڈھیل نہیں دکھائی دیتی اور نہ ہی یہ کہیں اکھڑا اکھڑا محسوس ہوتا ہے ۔

کردار نگاری :

منصور موہنا میں شرر کی کردار نگاری بحیثیت مجموعی ان کے دیگر تمام ناولوں کی نسبت بہتر ہے ۔ اس ناول کے اہم کرداروں میں موہنا ، عذرا ، منصور ، اور سلطان محمود غزنوی شامل ہیں ۔ دیگر کرداروں میں والیٔ اجمیر کے وزیر کا بیٹا جے رام ، یحیٰی بن زکریا ، لملی ، عبد اللہ طائی اور التونتاش قابل ذکر ہیں ۔ ان کے علاوہ بعض کرداروں کا ذکر تاریخی پس منظر میں بھی ہوا ہے مثلاً یوسف انصاری ، محمد بن قاسم ، سلطان کا وزیر احمد حسن میمندی ، دربار کے شعراء ، جے رام اور جے پال وغیرہ ۔

موہنا کا کردار اس ناول کا سب سے زیادہ جاندار کردار ہے ۔ موہنا کی شخصیت کی تعمیر میں ہندوستانی عورت کی فطرت سے شرر کی براہ راست واقفیت نے اہم حصہ لیا ہے اگرچہ موہنا کی سراپا نگاری میں ان کی ادبیت اور پبلک کی پسند کا رنگ زیادہ جھلکتا ہے ۔ لکھتے ہیں :

''اپنے حسن و جمال کے اعتبار سے تو ایسی تھی کہ اس کے نازک اور پتلے ہونٹوں اور نشیلی شرمگیں آنکھوں کی دور دور شہرت تھی، اس کی تمنا اور آرزو تو بڑی بات تھی، صرف ایک جلوہ دیکھ پانے کے لیے اکثر شہزادے مختلف سلطنتوں سے آتے تھے اور ناکام و نامراد واپس جاتے تھے ۔ بچپن ہی سے اس کو مقدس زبان سنسکرت کی کتابیں پڑھائی گئی تھیں اور اس کے تیز ذہن اور نکتہ رس طبیعت نے نو دس برس ہی میں اس کو ایک بہت بڑے پنڈت کے رتبے کو پہنچا دیا تھا اس کے بعد خاندانی رسوم کے مطابق اس نے سپہگری کی تعلیم پائی اور اس حیثیت سے بھی کمال کو پہنچ گئی کہ گھوڑے پر سوار ہو کے ایک اعلیٰ درجے کے سپہ سالار کی طرح پھرتی اور چالاکی سے لڑائی کے کرتب دکھاتی تھی ۔ ان دنوں کی باہمی لڑائی اور اس غیر منتظمی اور بے امنی کے عہد کی روزانہ خونریزیوں نے اسے ایک شجاع اور بہادر سپاہی بنا دیا ۔ جب وہ گھوڑے پر سوار ہو کے اور کالی کالی زلفیں شانوں پر بکھرا کے نکلتی تھی اور شاہی فوج دو طرفہ سے سلامی لے کے دعائے دولت دیتی تھی اس وقت کا عالم بہت سے لوگوں کو بے تاب کر دیتا تھا اور ان نئی بے تابیوں نے ملک میں ایک تازہ شورش پیدا کر دی تھی . . . . اس زمانے تک ہندوؤں میں پردے کی رسم نہیں جاری تھی اور موہنا ہمیشہ شاہی دربار میں تخت کے داہنی جانب نہایت شان و شوکت سے جلوہ افروز نظر آیا کرتی تھی ۔ راجا نے اپنی حور وش بیٹی موہنا کو اپنی شادی کا ایک حد تک اختیار دے دیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب اس کو اٹھارہواں سال تھا اور ہنوز شادی کی نوبت نہیں آئی تھی ۔ بہت سے شاہزادے اور راجا سالہا سال کی کوششوں کے بعد مایوس ہوئے تھے . . ''[1]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں ۔

''پیاری موہنا کی وضع اور صورت ایسی نہ تھی کہ کسی شخص کے قریب جا کے وہ کھڑی ہو جاتی اور وہ شخص اس کو حیرت سے نہ دیکھنے لگتا ۔ آہ کس کی مجال تھی کہ موہنا کی اٹھتی جوانی، دلربا صورت دلدوز نظر اور عالم فریب حسن و جمال کو دیکھتا اور وقف حیرت نہ ہو جاتا ۔ خصوص اس موقع پر جب کہ معشوقانہ پیارے پیارے ہاتھ پاؤں کے سپاہیانہ تیوروں نے قیامت کا بانکپن پیدا کر دیا تھا ۔ بالوں کا جوڑا بندھا تھا اور شہزادگی کی علامت کے طور پر پیشانی کے اوپر ایک سونے کا مرصع زیور تھا جس پر کلغی لگی تھی ۔ ایک چست کرتی بدن میں تھی اور ریشمی ساری جس پر طلائی کام بنا تھا ایسی خوشنما شکنوں سے اس ابھار کو چھپا رہی تھی جو دولت حسن کے ساتھ ساتھ ابتدائے شباب کو بھی عالم آشکارا کیے دیتا تھا ۔ ساری کے اوپر کمر میں مرصع ڈاب تھی اور اس میں ایک نہایت ہی نازک تلوار لگی ہوئی تھی جو جانستانی کا جوہر دکھانے میں خود اسی کے تیغ ابرو کے ہم پایہ تھی ۔ اس کے نازک پاؤں پر قدیم ہندو سوسائٹی کے اصول ظلم کر رہے تھے اس لیے کہ آہ ! برہنہ پا تھی ۔''[2]

---

۱ ۔ منصور موہنا، ص ۴۳ ۔ ۲ ۔ منصور موہنا، ص ۱۷ تا ۲۷ ۔

موہنا کے کردار میں جرأت، بہادری اور جفاکشی کا عنصر بدرجہ اتم ہے - اس کے مکالمے اس صفت کو اجاگر کرتے ہیں - راجا جب سلطان کی پیش قدمی روکنے کے لیے جے رام کی سرکردگی میں بیس ہزار کا لشکر بھیجنے کا فیصلہ کرتا ہے تو :

''شاہزادی موہنا جو تخت کی داہنی طرف بیٹھی تھی اٹھ کے باپ کے قدموں پر گر پڑی - باپ نے اس کا سر اٹھا کے سینے سے لگا لیا اور پوچھنے لگا 'موہنا بتا تو کیا کہتی ہے ؟ کیا تو نہیں چاہتی کہ میرے بہادر ترکوں کے مقابلے کو روانہ ہوں -' موہنا : مہاراج نہیں میں یہ نہیں کہتی ، میرا مطلب یہ ہے کہ مجھے بھی جانے کی اجازت ملے اکثر لوگوں کی زبانی میں نے سنا ہے کہ مسلمان لڑے بہادر اور لڑنے والے ہوتے ہیں - ایک عرصے سے ان کی بہادری کے جوہر دیکھنے کی مشتاق ہوں - مہاراج چند روز کے لیے مجھے اپنے قدموں سے جدا فرمائیے کہ جا کے دیکھوں کہ وہ کیونکر لڑتے ہیں اور کیسی جرأت دکھاتے ہیں -''[1]

راجا کے پس و پیش پر اصرار کرتی ہے :

''مہاراج یہ تو دھرم کا کام ہے، مسلمان ہندو دھرم کو نقصان پہنچا رہے ہیں، جس کے دل میں دھرم کی محبت ہو اس کا تو فرض ہے کہ جان پر کھیل کے لڑے اور ان ملکشوں کو آریہ ورت سے نکال باہر کرے -''

راجا مختلف خدشات کا اظہار کرتا ہے تو وہ اطمینان دلاتی ہے کہ ''اگر راجندر جی نے کرپا کی تو میرے بارے میں آپ کو صدمہ نہ پہنچے گا''-[2]

جے رام کے لشکر کا سامنا جب منصور اور انصاری قبیلے کے مسلمانوں سے ہوتا ہے تو موہنا بھی مقابلے پر نکلنے کے لیے اصرار کرتی ہے لیکن جے رام منت سماجت کر کے اسے باز رکھتا ہے - مسلمانوں اور ان کی عورتوں کا بے جگری سے لڑنے کا منظر دیکھ کر موہنا کے دل میں ان کے لیے وہی جذبہ پیدا ہوا جو ایک سچا بہادر دوسرے بہادر کے لیے محسوس کرتا ہے ، چنانچہ جب جے رام نے اسے فتح کی خوشخبری سنائی تو اس نے بگڑ کر کہا :

''جے رام ! تجھ سے تعجب ہے کہ اس لڑائی پر خوشی ظاہر کرتا ہے - یہ چند مسلمان اگر اتنی دیر تک بہادری دکھا کے تیرے بیس ہزار سپاہیوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئے تو تیرے لیے کوئی فخر کا موقع نہیں - تو نے کیا نہیں دیکھا کہ ان کی عورتیں بھی اونٹوں سے کود کود کے لڑنے لگی تھیں - جو کام ان لوگوں نے کیا اگر ان کے مقام پر تو یا تیری طرف کے کچھ لوگ ہوتے تو ان سے ہرگز نہ بنتا - یہ فخر ذلت کا فخر ہے -''[3]

موہنا کے کردار میں رحمدلی کا وصف بھی موجود ہے جو ایک سچے بہادر کی شخصیت کا جزو ہوتا ہے اسی لیے وہ مسلمان اسیروں کے لیے ان کی بہادری اور مظلومیت کے باعث انتہائی رحمدلی کا جذبہ محسوس کرتی ہے اور اس کا جے رام سے بھی برملا اظہار کرتی ہے - وہ منصور کو بھی اس کی بہادری کی داد دیتی ہے -

موہنا اگرچہ ایک ہندو شہزادی ہے ، خود مختار ہے ، لیکن اس کے باوجود منصور سے اپنے عشق کا اظہار محض اشاروں کنایوں میں کرتی ہے - شرر نے موہنا کے کردار کے اس پہلو کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے، اس کی بے قراریوں اور صبر و ضبط کے درمیان مسلسل کشمکش جاری رہتی ہے اور بالآخر جب وہ سلطانی کیمپ سے اجمیر روانہ ہونے لگتی ہے تو ضبط کا دامن

۱- ایضاً، ص ۴۸ - ۲- ایضاً، ص ۴۹ - ۳- ایضاً، ص ۵۹ -

ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے ۔ موہنا کے کردار کا یہ پہلو سب سے زیادہ قابل قدر ہے کہ یہ جاننے کے باوجود کہ منصور اسے اپنے اور عذرا کے راستے سے ہٹانے کے لیے واپس بھیج رہا ہے وہ عذرا کے لیے نفرت یا رقابت کا جذبہ نہیں رکھتی اگرچہ عذرا کو بڑے سلیقے سے جتا ضرور دیتی ہے کہ اس فراق اور اس کی محرومی کا باعث عذرا کی ذات ہے ۔

موہنا کے کردار میں شرم و حیا کا عنصر بھی ایک ہندوستانی عورت کے کردار کی پوری ترجمانی کرتا ہے ۔ مہارانی جب راجا سے موہنا کی شادی کا تذکرہ چھیڑتی ہے تو موہنا کے کردار کو شرر کی فنی چابکدستی جیتا جاگتا کردار بنا دیتی ہے ۔ موہنا کے کردار میں خلوص اور وفا کا جذبہ بھی بدرجہ اتم موجود ہے ۔ شرر نے یہ صفات موہنا کے کردار میں اس خوبصورتی اور ایسی ہنروری سے جمع کی ہیں کہ اسے گوشت پوست کا زندہ کردار بنا دیا ہے ۔

منصور کا کردار بھی شرر کے دیگر ناولوں کے ہیروؤں کے کرداروں سے مختلف ہے ۔ منصور میں جرأت اور دلیری کے ساتھ ساتھ احسان مندی ، خلوص اور شرم و حیا کی صفات بڑی عمدگی سے جمع کی گئی ہیں ۔ اظہار محبت میں بھی مشرقی رکھ رکھاؤ اور وضع داری ہے ۔ اس میں کہیں بھی گراوٹ کا پہلو راہ نہیں پاتا ۔ اس کی محبت میں محبوب کا احترام بھی شامل ہے ۔ منصور یہ سمجھ جانے کے باوجود کہ موہنا اس سے محبت کرتی ہے ، پہلوتہی کرتا ہے ۔ موہنا کا خلوص اور جذب صادق اس کے دل پر اثر کرتا ہے لیکن وہ ایسے جذباتی مواقع کو بچانے کی کوشش کرتا ہے جو موہنا یا خود اس کے ضبط کے بند کو توڑ دیں ۔ ان نازک مراحل پر منصور کے کردار میں کشمکش کے عنصر کو نمایاں کر کے شرر نے منصور کو گوشت پوست کے انسان کے روپ میں پیش کیا ہے ۔ موہنا جب سلطانی کیمپ میں اشارتاً منصور سے اپنی چاہت کا اظہار کرتی ہے تو وہ تذبذب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور بہت غور کے بعد فیصلہ کرتا ہے کہ سلطان سے کہہ کر موہنا کو اجمیر واپس بھجوا دے ۔ سلطان جب اجازت دے دیتا ہے تو منصور اس نئی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ موہنا کو کس دل سے سلطان کے فیصلے سے آگاہ کرے ۔ موہنا کا بچشم گریاں سلطانی کیمپ سے روانگی کا مرحلہ منصور کے کردار میں جان ڈال دیتا ہے ۔

عذرا کا کردار اپنی نسوانی صفات کے اعتبار سے اپنے اندر انفرادیت رکھتا ہے ۔ وہ ایک کمزور دل ، ڈرپوک لڑکی ہے ۔ منصور کی شجاعت کی داستان اس کے دل میں ایک خلش پیدا کرتی ہے لیکن وہ رسوائی کے خوف سے اس جذبے کو سختی سے دبا دیتی ہے اور منصور کے سامنے آنے سے گریز کرتی ہے تاکہ اپنی دلی کیفیات کو آشکارا ہونے سے بچائے ۔ اس کی شخصیت میں شرم و حیا ، پردہ داری ، عفت مآبی اور پاکیزگی کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ۔ وہ اپنی عزت اور پاکدامنی برقرار رکھنے کا ہمیشہ خیال رکھتی ہے ۔ جے رام کی قید میں بھی جبکہ اس کا کوئی بزرگ اور والی زندہ نہیں بچا وہ اپنے مونس و ہمدرد کے سامنے آنے سے اجتناب کرتی ہے ۔ اس قید میں بھی اسے زندگی سے زیادہ عزت و آبرو کا فکر دامنگیر ہے ۔ عذرا میں خلوص اور احسانمندی کا جذبہ بھی نمایاں ہیں ، وہ موہنا کے لیے غمگین ہے اور اسے اس بات کا انتہائی صدمہ ہے کہ منصور نے موہنا کی محبت اور وفا کی قدر نہ کرتے ہوئے اسے واپس بھجوا دیا ۔ موہنا کی دلشکنی کا عذرا کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ خود بھی منصور کو چھوڑ کر لیلیٰ کے ہمراہ جوگیوں کے روپ میں موہنا کی جستجو میں نکل گئی اور آخر منصور پر اپنی جان قربان کر بیٹھی ۔

سلطان محمود غزنوی کے کردار میں شرر نے شجاعت ، بہادری ، جذبہ جہاد اور جہاد فی

سبیل اللہ کا جذبہ بڑی خوبصورتی سے سمویا ہے۔ سلطان کو منصور سے اس کی بہادری اور خاندانی فضیلت کے باعث بہت محبت تھی۔ منصور خاندان انصار سے تھا اور سلطان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت کی بدولت خاندان انصار سے بھی عقدت تھی جنھوں نے آنحضرت کا ساتھ دیا تھا، لیکن اس کے باوجود سلطان پہلی قدمی میں متذبذب تھا کہ کہیں اس کا جہاد فی سبیل اللہ کی بجائے منصور کی بازیابی کے لیے نہ تصور کیا جائے چنانچہ اپنی الجھن کا اظہار کرتے ہوئے سلطان کہتا ہے:

"عبداللہ ہم لوگوں کی جرأت اور تمھارے حوصلوں سے مجھے ایسی ہی امید ہے مگر میں سچ کہتا ہوں کہ اس وقت تک جب میں نے ہندوستان پر حملے کے لیے تلوار ہاتھ میں لی اور رکاب میں پاؤں رکھا ہے، صرف جہاد کی خالص نیت سے اور خدا کے مبارک دین اسلام کی خدمت کے لیے اور اسی وجہ سے خدا نے میری مدد کی اور کفار کو ذلیل و خوار کیا۔ میں نہیں پسند کرتا کہ اپنی اس خالص نیت کو خراب کروں اور آئندہ فوج کشی سے خدمت دین اسلام کے علاوہ منصور کا بدلہ لینا بھی میری غرض ہو۔"[1]

سلطان ایک مطلق العنان بادشاہ ہونے کے باوجود دوسروں کی رائے کی قدر کرتا ہے اور اہم امور پر سرداروں اور وزراء کی مشاورت طلب کرتا ہے۔ وہ اپنے سپاہیوں کے لیے شفیق باپ کی مانند ہے اور دل سے ان کی قدر کرتا ہے۔ منصور کی بازیابی کے سلسلے میں سپہ سالار فوج سے کہتا ہے:

"بے شک میں اپنے ان وفادار سپاہیوں کی مستعدی اور سچی شجاعت کا شکرگزار ہوں لیکن التونتاش اگر وہ اپنے جوش شجاعت میں اپنی ماندگی کا خیال نہیں کرتے یا اپنی گزشتہ مشقتوں کو بھول گئے ہیں تو کیا یہ مناسب ہے کہ میں بھی خیال نہ کروں۔ دیکھو! تم سب لوگ سن لو! منصور میری فوج کا ایک سپاہی تھا۔ اس کو کوئی ترجیح نہیں۔ میری نظر میں میرا ہر سپاہی وہی وقعت رکھتا ہے جو منصور کی وقعت ہے۔ یہ مجھے کبھی گوارا نہیں ہو سکتا کہ اس ایک شخص کے لیے میں اپنے بہادر اور وفادار سپاہیوں کی اکثر جانیں بے سلیقی سے اور بے جا طور پر کٹوا دوں۔"[2]

سلطان اہل علم کا قدر دان ہے اور اس کے دربار میں چوٹی کے شعراء و فضلا جمع رہتے ہیں۔ وہ انصاف پسند بھی ہے اور رحمدل بھی۔ راجا اجمیر کی فوج کے سردار سے مقابلے کے لیے پہلے التونتاش نکلا تھا اور دوسرے دن جب پھر ایک راجپوت نے للکارا اور سلطانی فوج سے التونتاش کے سوا اور کوئی نہ نکلا تو سلطان نے اسے انصاف سے بعید قرار دیتے ہوئے خود مقابلے میں جانے کا ارادہ کیا۔

راجا اجمیر کے کردار میں شرر نے راجپوتوں کی بہادری کی روایتی صفات کو بہ احسن طریق جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ راجا دلیر بھی ہے اور غیور بھی، وسیع النظر بھی ہے اور شریف النفس بھی۔ وہ جب بجے رام کے فرار کی خبر سنتا ہے تو بے اختیار کہہ اٹھتا ہے: "بھاگ گیا، اس نے چھتری برن میں داغ لگا دیا۔" وہ جے رام کو فوج دے کر رخصت کرتے ہوئے ہدایت کرتا ہے کہ:

"جے رام دیکھو خبردار محمود کے مقابلے میں ہمیشہ شریفانہ برتاؤ کرنا۔ اگر وہ ظالم ملکش لوٹ کھسوٹ کرتا ہے تو کرنے دو مگر تم اپنی شرافت اور پاک نفسی کو نہ چھوڑنا، بے وفائی اور بد عہدی نہ ہونے پائے۔ جب تک حریف لڑائی پر آمادہ نہ ہو تمھاری طرف سے سبقت نہ کی جائے۔ مظلوم پر تلوار نہ

۱۔ ایضاً، ص ۶۳۔ ۲۔ ایضاً۔

بلند کرنا - مسلمانوں کا کوئی سردار یا کوئی شہزادہ گرفتار ہو تو اس کو عزت کے ساتھ رکھنا، پورے آداب اور پاس و لحاظ کے ساتھ میرے پاس لے آنا - سوا اسلحہ لے لینے کے اور حراست میں رکھنے کے معزز قیدیوں پر کوئی جبر نہ کیا جائے۔ مگر ہاں محمود کی طرف سے اگر ان اصول کے خلاف کارروائی کی جائے تو تجھے بھی اختیار ہوگا کہ جو چاہے کرے اور جس قسم کی شدت سے چاہے پیش آئے۔ لیکن اس میں بھی اپنی شرافت کی حد سے نہ گزر جانا -''[1]

جے رام کے کردار کے بعض پہلو بھی بعض موقعوں پر چمک اٹھتے ہیں ، دیگر کرداروں میں وزیر احمد بن حسن میمندی کی زیرکی اور معاملہ فہمی ، مہاراج کرشن کی دانائی بھی اجاگر ہیں - بحیثیت مجموعی منصور موہنا اپنی کردار نگاری کے اعتبار سے شرر کے ناولوں میں نمایاں مقام رکھتا ہے -

مکالمے، زبان و بیان :

منصور موہنا کی کامیابی میں اس ناول میں اختیار کی گئی زبان بھی بہت اہمیت رکھتی ہے- سرر نے مختلف کرداروں کے مکالموں میں ان کی شخصیت کی مناسبت سے ہندی کے الفاظ سمو کر نہ صرف کردار اور مکالمے میں مطابقت پیدا کر کے کردار کو حقیقی رنگ دیا ہے بلکہ ناول کی حقیقی فضا سازی میں بھی ہنروری کا مظاہرہ کیا ہے - موہنا ، جے رام، راجا اجمیر اور مہاراج کرشن کے مکالموں میں پرمیسر ، دھرم ، ملکتش ، آریہ ورت ، کرپا ، چھتری بون ، ہندو دیس ، بھاشا ، دکھن ، دیس ، درشن ، سورما کے الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں - یہی کیفیت مختلف بیانیہ حصوں میں بھی ہے- ہندو لشکر وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے بھی جے کارے ، لڑائی کی بانیاں وغیرہ کے الفاظ استعمال کر کے فضا سازی میں مدد لی ہے -

مکالمے کرداروں کی فطرت اور شخصیت سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں ماسوائے ایک مکالمے کے جہاں راجا موہنا کو لڑائی میں شرکت سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے - یہاں راجا اسی انداز میں ایک فقرہ بیٹی کی نزاکت اور حسن کی تعریف میں کہتا ہے[2] جس طرح "فردوس بریں" میں بلغان خاتون کو التمونت پر لشکر کشی سے باز رکھنے کے لیے اس کے بھائی منقو خاں کی زبان سے شرر نے بیان کیا ہے -

منظر نگاری و مرقع کشی :

منصور موہنا اور شرر کے دیگر ناولوں کی منظر کشی اور مرقع نگاری میں ایک بین فرق نظر آتا ہے - دیگر ناولوں میں ان کی منظر نگاری زیادہ تر ان کی ادبیت کی مرہون منت ہوتی ہے لیکن یہاں ادبیت کے ساتھ ساتھ گہرے مشاہدے کا عنصر بھی شامل ہے جس کی بدولت مناظر اور مرقعوں میں دلکشی کے علاوہ جان بھی پڑ گئی ہے - منصور موہنا میں شرر نے مرقع کشی اور بیانیے میں اہم جزئیات پر گہری نظر رکھی ہے جن کے باعث یہ مرقعے اپنے اندر زندگی کا بھرپور عکس رکھتے ہیں - سادھوؤں اور جوگیوں کے حلیے ، ان کے لباس ، ان کے رہن سہن کے آداب و عادات، ہندو راجا کا دربار ، کیمپ ، راجپوتوں کی جنگ کے مناظر، سلطان اور اس کے ساتھیوں کے حلیے ، سلطانی دربار ، میدان جنگ ، افغانستان اور بلوچستان کے پہاڑوں ، دروں ، وادیوں ، چشموں اور آبشاروں ، پنجاب کے سرسبز میدانوں اور سندھ کے صحراؤں کے مناظر بڑے جاندار ہیں۔

۱- ایضاً، ص ۵۱ - ۲- ایضاً، ص ۹۴ -

۴- فردوس بریں

پلاٹ:

فردوس بریں فن کے کئی پہلوؤں سے شرر کا شاہکار ہے اور اس کی فنی اہمیت میں اس کے پلاٹ کی تنظیم و ترتیب کا بھی بڑا حصہ ہے۔ شرر نے فردوس بریں کا پلاٹ بڑی فنی ہنروری کے ساتھ مرتب کیا ہے اور اس کے مختلف ٹکڑوں میں ایسا فنکارانہ منطقی ربط قائم کیا ہے کہ پورا قصہ ایک وحدت بن گیا ہے، کوئی چیز نہ تو غیر ضروری اور زائد ہے اور نہ کوئی خلا باقی ہے، شروع سے آخر تک ایک مسلسل اٹھان اور تدریجی ارتقا ہے۔

فردوس بریں کا پلاٹ انتہائی مرزوں نو ابواب میں نقسم کیا گیا ہے۔ پہلے باب "پریوں کا غول" میں ایک پرخطر اور خوفناک وادی سے دو اجنبی مسافر گزرتے دکھائی دیتے ہیں، اس مقام کی ہیبتناکی کا منظر شرر نے بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ ان دو جیالے مسافروں کی اصلیت اور پر خطر سفر کے بارے میں قاری کا تجسس بیدار ہونے لگتا ہے اور یہ معلوم کرکے قاری کی دلچسپی اور بڑھنے لگتی ہے کہ ان دو نو عمر مسافروں میں ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ قاری ان کے باہمی رشتے اور منزل مقصود کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ اس جوڑے کی باہمی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں گھر سے نکلے ہوئے ایک ہفتہ ہو چلا ہے اور وہ نو عمر عورت اگرچہ حج کی نیت سے اپنے منگیتر کے ساتھ سفر پر نکلی ہے لیکن گھر والوں سے چوری چھپے چل پڑنے کے باعث بے چین ہے۔ اس کا یہ احساس فطری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عزیز اور اہل شہر اس کے متعلق طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرتے ہوں گے۔ ان کی گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قزوین پہنچ کے دونوں باہم عقد کر لینے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔

یہ نوعمر ہم سفر اس راستے کی خطرناکی سے پوری طرح باخبر ہیں، اس لیے قدرے خوفزدہ ہیں۔ مرد (حسین) اپنی منگیتر (زمرد) سے والہانہ محبت رکھتا ہے اور سادہ لوح بھی ہے۔ زمرد متلون مزاج ہے اور ضدی بھی، حسین سے محبت بھی رکھتی ہے اور بدنامی سے خائف بھی ہے، اچانک زمرد نے اپنے گدھے کو کچی سڑک سے ایک پگڈنڈی پر موڑ دیا ہے۔ حسین کے سمجھانے کے باوجود کہ ادھر آگے گھاٹی میں راستہ نہیں اور وہاں پریوں کا مسکن بتایا جاتا ہے، زمرد وہاں جانے پر مصر ہے، کیونکہ کچھ عرصہ پہلے اسی گھاٹی میں اس کا بھائی موسیٰ پریوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا اس لیے وہ اس کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جانے پر بضد ہے۔

دونوں سنگلاخ دشوار گزار گھاٹی سے گزر کر وادی میں مبینہ قبر تک جا پہنچتے ہیں، لیکن اب زمرد کچھ مایوسی کی باتیں کر رہی ہے۔ گویا شرر اپنے قارئین کو آئندہ بیان کیے جانے والے واقعات کے لیے ذہناً تیار کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ان دونوں کرداروں کے کچھ کچھ اوصاف کو بھی اجاگر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اچانک حسین اور زمرد کو دور سے پندرہ بیس مشعلیں اپنی طرف آتی دکھائی دیتی ہیں اور جب وہ مشعلیں ذرا قریب آ جاتی ہیں تو ان کی روشنی میں پندرہ بیس حسین و جمیل عورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ دونوں "پریاں" کہہ کر بے اختیار چیخ اٹھتے ہیں اور بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اس اچانک منظر پر قاری کو متجسس چھوڑ کر شرر پہلے باب کا اختتام کر دیتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قاری کا اشتیاق

اسے فوراً دوسرے باب کے صفحات کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ پہلے باب کا یہ خاتمہ ایک جذباتی مرحلے پر ہے اور اپنے اندر ایک ڈرامائیت بھی رکھتا ہے، قاری متحیر بھی ہے اور مشتاق بھی کہ آیا وہ واقعی پریاں تھیں یا کوئی زمینی مخلوق اور پھر اُن کا حسین اور زمرد کے ساتھ کیسا سلوک رہا؟ اس تحیر اور اشتیاق کے ساتھ قاری دوسرے باب کی وسعتوں میں کھو جاتا ہے جس کا عنوان ہے "بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرمغاں گوید!"

دوسرے باب کا ایک ذیلی عنوان "پیاری زمرد تو کہاں ہے" بھی ہے اور یہی عنوان ہر قاری کے ذہن میں ابھرنے والا سوال ہے۔ شرر کے فن کی یہ بڑی کامیابی ہے کہ قاری پر اُن کی گرفت پہلے باب سے ہی پوری مضبوط ہے۔ "زمرد کہاں گئی؟" کا سوال پورے باب میں پلاٹ کے طلسم کو اور گہرا کر دیتا ہے۔ حسین ہوش میں آنے کے بعد زمرد کو نہیں پاتا تو ہر طرف تلاش کرتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ اچانک موسیٰ کی قبر پر اس کی نظر پڑتی ہے اور اس میں وہ پہلے کی نسبت کچھ تبدیلی محسوس کرتا ہے۔ کتبے پر موسیٰ اور زمرد کا نام کندہ دیکھ کر حسین پر تو جو گزرتی ہے سو گزرتی ہے لیکن قاری یہ سوچنے لگتا ہے کہ کیا زمرد مر گئی؟ یہ خیال ذہن میں آتے ہی ہیروئن کے ساتھ ذہنی وابستگی کو دھکا سا لگتا ہے، لیکن شرر کے فن کا یہ کمال ہے کہ اس کے باوجود ناول کی دلچسپی کم نہیں ہونے پاتی۔ اب قاری کے تجسس کا مرکز حسین اور اس کی کیفیت ہے۔ آیا کسی روایتی عاشق کی طرح اس نے بھی خود کشی کر لی یا زندگی کے لیے کوئی نیا سہارا ڈھونڈ لیا؟ لیکن ان دونوں صورتوں کے برعکس اس نے تو اسی قبر کا مجاور بن کر زندگی گزار دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ فن کے اعتبار سے اس نازک مقام پر شرر نے اپنے قارئین کی نفسیات کو پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے، اور اس چھ ماہ کے مجاوری کے عرصہ کو انھوں نے دو جملوں میں سمیٹ کر قاری کو پلاٹ کے نئے موڑ پر پہنچا دیا ہے۔

حسین کو ایک دن زمرد کی قبر پر ایک خط ملتا ہے، قاری کے لیے یہ مرحلہ دلچسپی کے بے شمار پہلو رکھتا ہے، کئی سوال ابھرتے ہیں، خط کس نے بھیجا ہوگا، کون لایا ہوگا، کب لایا ہوگا؟ یہ سارے مسائل ایک عقدہ بن جاتے ہیں اور یہ بات اس پر حیرت کی مزید گہری تہیں اور اسرار کے دبیز پردے چڑھا دیتی ہے کہ وہ رسم الخط، طرز تحریر زمرد کی ہے اور حسین اس رسم الخط سے بڑی گہری واقفیت رکھتا ہے، پھر اس میں وہ سب باتیں بھی تو لکھی ہیں جو زمرد کے غائب ہونے سے پہلے ان دونوں کے درمیان ہوئیں اور صرف ان دونوں تک محدود تھیں لیکن زمرد اپنے خط میں خود کو دوسرے عالم میں بلکہ ملاء اعلیٰ پر فردوس بریں میں بیان کر رہی ہے اور یہ خط اس نے وہیں سے بھجوایا ہے، حسین یقین کر لیتا ہے کہ زمرد جنت میں ہے اور یہ اسی کا خط ہے۔ اس کے یقین کر لینے کی کئی وجوہات ہیں اور وہ اپنی جگہ حق بجانب ہے لیکن قاری ایک تذبذب کی کیفیت میں مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگتا ہے اور کسی گہری سازش کے امکانات زیادہ روشن نظر آنے لگتے ہیں۔ قاری اس امر پر یقین نہیں کر سکتا کہ کسی روح نے خط لکھا ہے۔ اس لیے آئندہ واقعات میں اس کے لیے یہ خیال کہ زمرد زندہ ہے اور کسی خطرناک گروہ کے پھندے میں گرفتار ہے، ایک گونہ دلچسپی پیدا کر دیتا ہے۔

پلاٹ پھر ایک سرعت سے آگے بڑھتا ہے، چشم زدن میں ایک ماہ کا طویل وقفہ گزر جاتا ہے اور حسین کو زمرد کا دوسرا خط ملتا ہے جس سے اسرار و طلسمات کا رنگ اور گہرا

ہو جاتا ہے - زمرد خود بھی حسین سے ملنے کے لیے بےقرار ہے اور اسے ملاء اعلیٰ تک پہنچنے کی دعوت بھی دی ہے اور رہنمائی بھی کی ہے ، لیکن جو راستہ اس نے بتادا ہے، بڑا صبر آزما اور کٹھن ہے- یہ خط امید و یاس کی کیفیت کو پل بھر کے لیے اور ہوا دیتا ہے اور قاری سوچتا ہے کہ حسین نے اب تک زمرد کی محبت میں جس پامردی کا مظاہرہ کیا ہے اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ وہ یہ کٹھن راہ طے کر لے لیکن اس بات کی کیا سند کہ ان تمام مراحل کو طے کرنے کے بعد بھی اُن دونوں کی ملاقات ہو سکے گی - اپنے اسی سوال کے جواب کے لیے قاری حسین کا ہمسفر ہو جاتا ہے جو زمرد کی ہدایات پر عمل کرنے کے لیے اس وادی سے چل کھڑا ہوا ہے - حسین تو اس طویل بادیہ پیمائی کے لیے پیدل ہی چل پڑا تھا کیونکہ سات ماہ پہلے درختوں کے ساتھ باندھے جانے والے گدھوں کا زندہ اور وہیں موجود ملنا قرین عقل نہیں اور واقعی ان دونوں گدھوں کے ہڈیوں کے ڈھانچے وہاں پڑے ہیں لیکن ایک نیا حیرت انگیز واقعہ پھر رونما ہوتا ہے - وہاں ایک تازہ دم ، توانا گدھا ایک درخت سے بندھا ہے جس کے بارے میں حسین کی سادہ لوحی اسے یہ قیاس کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ زمرد نے اس کے لیے جنت سے بھجوایا ہے اور قاری کسی گہرے فریب کے امکانات پر غور کرنے لگتا ہے -

حسین زمرد کی ہدایات کے مطابق پہلی منزل پر پہنچ کر کوہ جودی کے تیرہ و تار غار میں چلہ کشی کے لیے اتر گیا ہے - ناول کے پلاٹ کا یہ حصہ ذرا سی بھی بے توجہی سے خشک اور غیر دلچسپ ہو کر سارے ناول کو ختم کر سکتا تھا، لیکن شرر نے ایک اچھے فنکار کی طرح اپنے قارئین کی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے کوہ جودی کے غار تک سفر کی منازل بڑی سرعت سے طے کی ہیں اور ایسی غیر ضروری جزئیات سے از حد اجتناب کیا ہے جو بے جا طوالت کے باعث یکسانیت اور اکتاہٹ کا سبب بن سکتی تھیں - وہ قاری کے اشتیاق کو ان منازل میں زیادہ دیر تک بھٹکنے پر مجبور کرکے اس کے تجسس کو ختم کرنے کا باعث نہیں بنے -

کوہ جودی کے غار میں اترنے کے ساتھ ہی ناول کے پلاٹ میں اسرار و طلسم اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے، ایک خوفناک مقام، مسکن دام و دد ، تاریکی ، چالیس دن کا چلہ اور سب سے زیادہ مشکل امر یہ کہ زمرد کی صورت ہر وقت نظر کے سامنے اور شیخ سے ملنے کا خیال دل میں رہے اور اس پر یہ پابندی کہ اس خیالی پیکر کے دھوکے میں آ کر اس کی طرف بڑھنے کی جسارت نہ کی جائے - یہ پابندی اس لیے ہے کہ اتنا عرصہ مستقلاً ایک صورت کو نگاہوں کے سامنے متشکل کیے رکھنے کی کوشش بے قراری کو اس قدر بڑھا سکتی ہے کہ حسین سب پند و نصائح سے بے نیاز ہو کر اسی خیالی تصویر کے پیچھے دوڑ پڑے - گویا یہ ایک اذیت ناک روحانی اور نفسیاتی تربیت بلکہ سزا ہے - شرر اپنے قاری کو اس خوفناک مقام میں اتارنا نہیں چاہتے اور نہ ہی اسے غار کے باہر زیادہ دیر حسین کے انتظار کی زحمت دینا چاہتے ہیں اس لیے کمال اختصار کے ساتھ اس مرحلے کو ختم کرکے حسین کو دوسری منزل کی طرف گامزن کر دیتے ہیں -

یہ دوسرا مقام بھی کچھ کم خوفناک نہیں ہوگا، شہر خلیل کا تہہ خانہ، پیغمبروں کے جنازے اور اس میں اترنے کی کوشش کی سزا موت —— قاری تذبذب کے عالم میں نتائج معلوم کرنے کے لیے بے قرار ہے، شرر نے یہ مرحلہ بھی بڑی فنی چابک دستی سے طے کیا ہے، اور چلہ ختم کرکے باہر نکلتے ہی حسین مجاوروں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گیا، اس گرفتاری

کا پہلے سے الدیسہ تھا کیونکہ تہہ خانے میں اترنے کے لیے تو حسین کو کئی ہفتے باہر رہ کر موقع ڈھونڈنا پڑا تھا لیکن باہر نکلنے کے مسئلے میں یہ احتیاطی تدابیر ممکن نہیں ہو سکی تھیں ۔ چلہ کشی کے بعد فوراً تہہ خانے سے نکلنا تھا اور دیکھ لیا جانا یقینی تھا ۔ اس موقع پر اگر شسرر حسین کو اس گرفتاری سے بچا لینے کی کوشش کرتے تو پلاٹ غیر فطری نوعیت اختیار کر لیتا ، اس دوسرے مرحلے کو بھی بخیر و خوبی طے کرکے حسین ، شیخ علی وجودی کے پاس پہنچ جاتا ہے ۔

اس کے بعد پلاٹ میں دلچسپی ، تحیر اور تجسس کا سامان اور بڑھ جاتا ہے ، اب حسین کو پیش آنے والے واقعات کے علاوہ شیخ کی سخصیت ، اس کی حرکات و سکنات ، اس کی گفتگو اور عقاید قاری کے استغراق کا باعث بنتے ہیں لیکن ایک سوال ہر وقت قاری کے ذہن میں موجود رہتا ہے کہ شیخ علی وجودی، حسین کو زمرد سے کس طرح ملائے گا ۔ حسین کا عجز و انکسار، اطاعت و فرماں برداری اور شیخ کا جلال ایک طلسماتی فضا پیدا کیے ہوئے ہیں ۔ ایسے میں شیخ کا یہ حکم کہ حسین اپنے چچا اور مرشد شیخ امام نجم الدین نیشاپوری کو قتل کر دے ، حیرت انگیز ہے اور حسین کا بے ہوس ہو جانا قاری کو بالکل فطری امر معلوم ہوتا ہے ۔ حسین کی بے ہوسی کے ساتھ ہی یہ دوسرا باب ختم ہو جاتا ہے اور قاری اس تذبذب میں تیسرے باب کے ورق الٹنے لگتا ہے کہ حسین نے شیخ کے حکم کی تعمیل میں اپنے چچا کو قتل کر دیا یا نہیں اور دونوں صورتوں میں کیا نتیجہ نکلا ؟

تیسرے باب کے عنوان "ملاء اعلیٰ کا سفر" پر نظر پڑتے ہی قاری چونک پڑتا ہے ۔ عنوان ظاہر کر رہا ہے کہ حسین کی آرزوئیں پوری ہو رہی ہیں ، قاری کا تجسس بڑھتا ہے ، کیا حسین نے امام نجم الدین نیشاپوری کو قتل کر دیا ؟ یہ ملاء اعلیٰ کا سفر کیسا ہے ؟ جلد ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ حسین نے امام کو قتل کر دیا ہے ، قاری کو یہ فعل اچھا نہیں معلوم ہوتا اور خود حسین کا ضمیر بھی اسے اس گناہ پر لعن طعن کر رہا ہے ۔ قاری اور حسین کے احساسات اس موقع پر ہم آہنگ ہیں ۔ حسین کو اس کارنامے کے صلے میں ایک رقعے کے ساتھ کاظم جنوبی کے پاس اصفہان بھیجا گیا ہے ۔ کاظم جنوبی کا حلیہ، اس کی گفتگو پراسرار ہونے کے باعث کافی دلچسپی کا سامان رکھتی ہے ۔ کاظم جنوبی نے رات کی تاریکی میں حسین کو آبادی سے باہر ایک غار کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے اور عجیب و غریب جملوں میں کسی کو پکار رہا ہے ۔ بظاہر یہ الفاظ تو خالصتاً تصوف کی اصطلاحیں ہیں لیکن یوں محسوس ہوتا ہے یہ کوئی مخصوص علامتی زبان ہے ۔ پلاٹ میں دلچسپی کا عنصر پورے شباب پر ہے، ہر لحظہ کسی انوکھی اور حیرت انگیز بات کی توقع ہے ۔ قاری اس مرحلے پر خود کو بھی حسین کے پہلو میں اس خوفناک مقام پر سانس روکے کھڑا محسوس کرتا ہے ۔

اچانک تاریکی میں غار کے اندر سے ایک سنسناتی ہوئی آواز آتی ہے جس نے حسین کو "اے جوان آملی مرحبا !!" کے الفاظ سے خوش آمدید کہا ہے ۔ اس مسکن دام و دد سے ایک انسانی آواز کا سنائی دینا جس قدر حیرت انگیز ہے اس سے کہیں زیادہ کاظم جنوبی کا رویہ حیران کن ہے ۔ کاظم جنوبی نے یہ کہہ کر کہ وہ اس مقام سے ایک قدم بھی آگے بڑھانے کی جسارت نہیں کر سکتا ، صورت حال کو اور بھی زیادہ پراسرار بنا دیا ہے ۔ قاری ایک پل کے لیے سوچتا ہے ، کیا حسین تنہا اس پرہول مقام میں اتر جائے گا ؟ پھر کیا ہوگا ؟ یہی تجسس

دل میں شوق و اضطراب پیدا کیے ہوئے ہے کہ حسین کے قدم غار میں اترنے کے لیے بڑھ جاتے ہیں ۔ اس غار کے ماحول، اس کی نعمر، آرائش و زیبائش اور اس کے مکین نے طلسماتی رنگ بہت گہرا کر دیا ہے اور یہاں مسند نشین بوڑھا خود کو طور معنی اور وہ نور ظاہر کرتا ہے جسے موسیٰ نے ستر ہزار حجابوں کے اندر دیکھا تھا ، پھر حسین کو ایک جام پیش کیا گیا جسے پیتے ہی وہ بے ہوش ہو گیا، اور پھر تھوڑی دیر کے بعد نیم بے ہوشی کے عالم میں کسی نامعلوم منزل کی طرف اس کا پراسرار سفر شروع ہو گیا ، مختلف وقفوں کے بعد ہوش میں آنے پر مختلف مناظر نگاہ کے سامنے ہوتے ہیں اور اسے ہر بار ملاء اعلیٰ سے قریب تر ہونے کا یقین دلایا جاتا ہے اور آخر ہم اسے ایک تاجدار شخص کے سامنے دیکھتے ہیں جو خود کو حی لاحی اور لاہوت و ناسوت کا برزخ کبریٰ بتا رہا ہے ۔ اب حسین کو بتایا گیا ہے کہ وہ جنت کے دروازے پر ہے اور اگرچہ وہاں عبادت کی ضرورت نہیں لیکن حسین کو مادی کثافتیں کم کرنے کے لیے تین دن تک وظیفہ کرنا پڑے گا جس کے دوران کچھ پینا منع ہے ، قاری ان سارے معاملات کو دم بخود حیرت سے دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ تین دن میں پیاس سے حسین پر کیا گزرے گی ، تین دن کے بعد پھر اسی تاجدار شخص نے آ کر حسین کو کامیابی پر مبارکباد دی اور ایک جام دیا جسے پیتے ہی حسین بے ہوش گیا ۔ سوچنا پڑتا ہے کہ آخر اس جام میں کیا ہوتا ہے جسے پیتے ہی ہر بار حسین بے ہوش ہو جاتا ہے، جنت کے دروازے پر یہ بے ہوشی کب تک رہے گی اور کیا رنگ لائے گی ۔ مصنف قاری کے ذہن کو ان سوالات کی آماجگاہ بنا کر یہ باب یہیں ختم کر دیتے ہیں تاکہ وہ حسین کے ساتھ اس راہ سوق میں اسی قدر مستعدی سے قدم بڑھانے پر تیار ہو سکے ۔

چوتھے باب کا عنوان "فردوس بریں" قاری کے اس شوق تجسس پر تازیانے کا کام کرتا ہے ۔ یہ عنوان بے شمار سوالات ذہن میں پیدا کرتا ہے،کیا حسین "فردوس بریں" میں پہنچ گیا ، کیا واقعی یہ ممکن ہے ؟ یہ فردوس بریں کیسی ہے ؟ اس فردوس بریں کو ایک نظر دیکھ لینے کے لیے قاری خود بھی شوق کے پروں پر اڑ کر وہاں پہنچنا چاہتا ہے ۔ اس فردوس بریں کی آرائش و زیبائش ، اس کے قصر ، کوشکیں ، باغ اور نہریں ، حسین و خوبرو حوریں اور ان کے نغمات سرور انگیز ، غلمان کی ساقی گری ، خوش رنگ پرندوں کے نغمات مبارکبادی ، ہر طرف نور کا سماں یہ سب ایک سحر آفریں تاثر پیدا کر رہے ہیں ۔ زمرد بھی موجود ہے ۔ حسین نے یہاں بہت اچھا وقت گزارا لیکن اس کی واپسی کے وقت زمرد اسے کچھ کہنا بھی چاہتی ہے اور خوفزدہ بھی ہے ۔ حسین سے کہہ رہی ہے "جو تھوڑا سا وقت مل گیا ہے غنیمت جانو اور توجہ سے سنو!" جنت میں یہ راز داری اور خوف کس بات کا ؟ زمرد کی یہ گفتگو اور رویہ ایک شک کو جنم دیتا ہے اور چشم زدن میں یہ صحبت نشاط ختم ہو جاتی ہے ۔

پانچویں باب "پھر وہی عالم عناصر" میں حسین پھر اسی "آخشیجان" میں لوٹا دیا گیا ہے ۔ اب زمرد کے لیے اس کے دل میں پہلے سے کئی گنا زیادہ تڑپ ہے ۔ دوبارہ زمرد تک پہنچنے کے لیے وہ شیخ کے احکام کی تعمیل پوری مستعدی سے کرتا ہے اور قاری اسی تذبذب میں ہے کہ دیکھیے حسین کی یہ فرماں برداری کہاں تک نتیجہ خیز ہو سکتی ہے ۔ امام نصر بن احمد کے قتل کے بعد اسے سفارشی رقعے کے ساتھ الموت بھیجا گیا ہے ۔ روانگی سے پہلے شیخ شریف علی وجودی نے اسے بتایا تھا کہ حسین کو پہلی بار جنت کے دروازے پر جو تاجدار شخص ملا تھا

اور جس نے خود کو حی لاحی بتایا تھی وہی التمونت کا فرمان روا اور امام قائم قیامت ہے۔ قاری اگرچہ حسین کا ہمسفر ہے لیکن اب اس کے ذہن میں شکوک نے ایک نئی اور قدرے واضح صورت اختیار کر لی ہے۔ قاری سوچتا ہے کہ التمونت، فرقہ باطنیہ اور التمونت کے فرمان روا کا اس جنت کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یقیناً کوئی گہرا فریب ہے، اسی لیے زمرد بھی خوفزدہ تھی۔ اب قاری اپنے شکوک کی تصدیق کے لیے اور یہ جاننے کے لیے کہ رکن الدین خور شاہ حسین کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے، زیادہ بیتاب ہے۔

چھٹے باب کا عنوان "مردود ازلی" چونکا دینے والا ہے۔ یہ مردود ازلی کون ہو سکتا ہے؟ شاید حسین ہے! تو گویا وہ رکن الدین خور شاہ کے ذریعے جنت تک پہنچنے میں ناکام ہوگیا، اب کیا ہوگا؟ ان سارے سوالات کے جواب کے لیے قاری بے چینی سے اس باب کی ورق گردانی کرتا ہے۔ حسین کے راندۂ درگاہ ہونے کا باعث یہ امر ہوا تھا کہ جب رکن الدین خورشاہ نے اس کی موجودگی میں تاتاریوں کے بادشاہ اور بلغان خاتون کے باپ چغتائی خان کے قاتل دیدار کو جنت میں بھیجنے کا حکم دیا تو حسین ضبط نہ کر سکا اور زمرد سے ملنے کے لیے بے قراری گستاخی کا موجب بنی۔ چنانچہ قلعے سے نکال دیا گیا۔ اب حسین مارا مارا پھر رہا ہے اور قاری بھی اس کے حال زار کے پیش نظر مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا ہے۔ اب شیخ علی وجودی کی دستگیری بھی کام نہ آئے گی۔ زمرد نے آخری بار حسین سے راز داری کے ساتھ کہا تھا کہ اگر یہ لوگ دوبارہ اسے جنت میں نہ بھیجیں تو پھر وہ اس کی قبر پر آ کر نئی ہدایات کا انتظار کرے۔ قاری کی دلی خواہش اور حسین کا عمل ہم آہنگ ہیں، وہ پھر زمرد کی قبر پر جا بیٹھتا ہے۔ زمرد کی طرف سے اب کے اسے دو خط موصول ہوئے ہیں۔ ایک حسین کے نام ہے جس میں اسے قراقرم پہنچ کر دوسرا خط بغیر کھولے بلغان خاتون کو تنہائی میں پہنچانے اور اسے ہر بات سچ سچ بتا دینے کی ہدایت ہے۔ بلغان خاتون کا نام پہلی بار قلعہ التمونت میں دیدار کی زبانی سنا گیا تھا، اس کے باپ کو دیدار نے قتل کیا تھا، زمرد نے حسین کو کس مصلحت سے قراقرم بھیجا ہے کوئی خاص بھید ہے! اور اسی بھید کے جاننے کے لیے قاری اس نئے سفر میں حسین کا ہم سفر ہو جاتا ہے۔

بعد از دشواری بسیار حسین، زمرد کا خط بلغان خاتون تک پہنچانے میں کامیاب ہوگیا ہے اور اس خط کے الفاظ سنتے ہی قاری ذہن سے ایک بوجھ ہٹتا ہوا محسوس کرتا ہے، کیونکہ قاری کو پہلے سے ہی اس جنت اور قلعہ التمونت کے بارے میں شکوک پیدا ہو چکے تھے۔ زمرد نے بھی تو یہی لکھا تھا کہ فرقہ باطنیہ کی فردوس بریں قلعہ التمونت میں ہے اور ایک بہت بڑا فریب ہے جس کے ذریعے سادہ لوح انسانوں کو گمراہ کیا جاتا ہے۔ اس نے بلغان خاتون کو دعوت دی تھی کہ اگر وہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینا چاہتی ہو تو ۲۷ رمضان کو حسین کے ہمراہ اس کی قبر پر پہنچ جائے جہاں اسے ایک اور خط رہنمائی کے لیے ملے گا۔ اب قاری اور حسین کے درمیان فکر کی یک جہتی کا پہلا سا عالم نہیں رہا، اب قاری اصلیت سے بہت حد تک باخبر ہو چکا ہے اور حسین پہلے کی طرح حقیقت سے بے خبر۔ شرر کے فن کا یہ کمال مستحق تحسین ہے کہ اتنی دیر تک انھوں نے اپنے ہیرو اور قاری کو ہم نوا، ہم خیال رکھا اور بڑی فنی چابکدستی سے آہستہ آہستہ دونوں کی معلومات میں فرق پیدا کرتے چلے گئے۔ اس سارے عمل میں دلچسپی کو قائم رکھنا ایک مشکل امر تھا جسے شرر نے بطریق احسن نباہا ہے۔ اب

قاری کے سامنے فوری طور پر تجسس آمیز سوال یہی ہے کہ بلغان خاتون کا رویہ، رد عمل کیا ہوگا اور وہ کس حد تک حسین کی مشکل نشائی میں ممد ثابت ہوگی۔ اس سوال کو نمایاں طور پر ابھار کر شرر اس باب کو ختم کر دیتے ہیں۔

ساتویں باب کا عنوان "بلغان خاتون کا سفر" چھٹے باب کے آخر میں پیدا ہونے سوال کا اطمینان بخش جواب لے کر سامنے آتا ہے۔ بلغان خاتون نے اپنے ابن عم منقو خاں شہنشاہ ترکستان سے بمشکل اس سفر کی اجازت حاصل کی ہے اور فوج کے ساتھ اپنی روانگی سے پہلے ایک سانڈنی سوار کو ایک خط دے کر سرزمین ایران کی طرف روانہ کر دیا ہے۔ یہ خط کس کے لیے ہو سکتا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے؟ بلغان خاتون مقررہ وقت سے ایک ہفتہ پہلے رودبار الموت میں پہنچ گئی ہے اور اس کے ہمراہ پانچ سو سوار ہیں۔ ۲۷ رمضان کو صبح سے بلغان خاتون کو کسی کی آمد کا انتظار ہے غالباً کسی کمک کا انتظار ہوگا اور شاید اسی آدمی کی طرف سے کمک کی توقع ہو جسے روانگی سے پہلے خط بھیجا تھا لیکن ابھی تک کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا، بالآخر کے خوف سے وہ زمرد کی ہدایت کے مطابق حسین اور اپنے سپاہیوں کو لے کر زمرد کی قبر پر آ پہنچی ہے اور حسب وعدہ وہاں اسے دوسرا خط مل گیا ہے، اس خط میں کیا لکھا ہے ہمیں نہیں معلوم لیکن وہ خط پڑھ کر مختلف اطراف میں نظر دوڑا رہی ہے اور پھر ایک سمت چل پڑی ہے۔ شاید زمرد نے اس خط میں راستے کی نشان دہی کی ہوگی کیونکہ بلغان خاتون مختلف مقامات پر رک کر پھر اس خط کو دیکھتی ہے اور پھر کسی خاص سمت میں قدم بڑھاتی ہے، یہ مقام فنی اعتبار سے بہت نازک ہے۔ قاری سمیت یہاں موجود افراد کی معلومات کی نوعیت مختلف ہے اس لیے ہر ایک کا رد عمل مختلف ہے، بلغان خاتون، قاری، سپاہی اور حسین ہر ایک اصل صورت حال کے متعلق منفرد ذاتی معلومات رکھتا ہے۔ شرر نے اس پہلو پر کڑی نظر رکھی ہے اور پلاٹ کے اس حصے کو بڑے سلیقے سے نبایا ہے۔ بلغان خاتون راستے کے ہر اہم موڑ پر خط دیکھنے کے بعد کسی ہمراہی سپاہی کے کان میں کچھ کہہ کر واپس لوٹا دیتی ہے۔ یہ بات قاری اور حسین سے مخفی رکھنی مقصود ہے، قاری کو سوچنا پڑتا ہے اور آخر اس سوال کو وہ اس قیاس کے ساتھ حل طلب چھوڑ دیتا ہے کہ ممکن ہے باقی فوج کی رہنمائی کے لیے کوئی پیغام دیا ہوگا یا کسی نگرانی پر مامور کیا ہوگا بہرکیف مختلف وقفوں سے ان تینوں سپاہیوں کی واپسی بڑی دلچسپ اور معنی خیز ہے اور اسی سفر کے دوران جبکہ حسین کے علاوہ ابھی ایک سپاہی بھی موجود تھا انھیں تین گٹھڑیاں ملی تھیں جن میں دو مردانہ لباس اور ایک زنانہ جوڑا تھا۔ بلغان خاتون کے حکم سے ان دونوں نے وہ مردانہ لباس پہنا جو بالکل گوالوں کا سا تھا اور خود بلغان خاتون اپنے لباس پر وہ زنانہ جوڑا پہن کر آگے بڑھی تھی جسے دیکھتے ہی حسین مبہوت رہ گیا اور اس نے کہا کہ وہ اس لباس میں جنت کی حور معلوم ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد حسین نے خود کو اسی جنت میں پایا جہاں ایک بار وہ روحانی سفر کر کے پہنچا تھا۔ وہ جس قدر بھی حیران ہو کم ہے کیونکہ اس مرتبہ وہ خود اپنے قدموں سے زمین پر ہی چل کر آیا ہے اور زمرد ان کی پیشوائی کو وہاں موجود ہے۔ حسین چونکہ اصل حقائق سے ابھی تک بے خبر تھا اس لیے وہ فطری انداز میں سوچ رہا ہے کہ کیا ملاء اعلیٰ زمین پر اتر آئی ہے، کیا زمرد واقعی زندہ ہے؟ اور قاری کے بہت سے شکوک یقین میں بدل چکے ہیں لیکن ابھی کچھ سوالات حل طلب ہیں، کچھ عقدے وا ہونے ہیں اور اس ساری جدوجہد کے نتائج کا بھی انتظار ہے۔

آٹھواں باب "افشائے راز" قاری کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کا ڈرامائی انداز میں جواب ہے۔ قاری ایک طویل اور شوق انگیز سفر کے بعد منزل تک پہنچ چکا ہے اور اس کی نگاہوں کے سامنے سے سارے طلسم اور فریب کے پردے اٹھ چکے ہیں۔ اسے باطنین کی سازشوں اور فریب کارانہ طریق کار کا علم بھی ہو گیا ہے، اور ان مصلحتوں کا بھی جو زمرد نے اختیار کی تھیں۔ شرر نے یہ سارے طلسماتی پردے اس طرح یکے بعد دیگرے سرکا کر اس فرقے کے عیاریوں کو بے نقاب کیا ہے کہ ان کی فنی چابکدستی اور ہنروری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس دوران میں زمرد کے ساتھ جو واقعات پیش آتے رہے یہ باب ان کی بھی روداد ہے اور شیخ علی وجودی کی کرامات کی حقیقت کا انکشاف بھی ہے۔

نویں باب میں وہ آخری عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے جو بلغان خاتون کے کسی کے انتظار کے سلسلے میں قاری کے ذہن میں موجود تھا۔ بلغان خاتون اپنے ابن عم ہلاکو خاں کی منتظر تھی جو بلغان خاتون کے خط پر اپنی مہم کو ملتوی کرکے فوج کے ساتھ ادھر بڑھا تھا اور اب ان ہی سپاہیوں کی بدولت جنھیں بلغان خاتون مختلف اوقات میں واپس بھیجتی رہی تھی اپنے لشکر سمیت فرقہ باطنیہ کی جنت میں موجود تھا۔ نویں باب میں باطنیہ کا قلع قمع ہوگیا اور ان کے قلعے ہلاکو خاں کے لشکر کے ہاتھوں منہدم ہو گئے، اس کے ساتھ ہی قاری کا یہ سارا سفر بغیر کسی تھکاوٹ کے اطمنان کے ساتھ ختم ہوگیا۔ فردوس بریں کے اس سارے پلاٹ میں فنی خوبی کا یہ عالم ہے کہ تمام نشیب و فراز طے کرنے کے باوجود قاری نہ تو کہیں راستے میں اکتاہٹ یا تھکاوٹ کا شکار ہوتا ہے اور نہ آخری منزل پر پہنچ کر کوئی کسلمندی محسوس کرتا ہے۔ آخر میں اس کے چہرے پر سفر کی طوالت کے غبار کی بجائے حیرت و استغراق کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

فردوس بریں کا پلاٹ اس قدر مربوط، منظم، چست اور دلکش ہے کہ شرر کے فن کو کم تر سمجھنے والے نقاد بھی اس پلاٹ کی فنی عظمت اور ان کے سلیقے کے معترف ہیں۔ شروع سے آخر تک اس پلاٹ میں تجسس اور شوق کا یہ عالم ہے کہ قاری مکمل طور پر ناول نگار کی گرفت میں رہتا ہے۔ ہر واقعے کا دوسرے واقعے سے گہرا منطقی ربط موجود ہے اور سارے پلاٹ کا تانا بانا بڑی ہنروری سے تیار کیا گیا ہے۔ پلاٹ میں تعمیر کا حسن بھی ہے جزئیات کی غیر ضروری بھرمار اور تکرار سے اجتناب بھی۔

فردوس بریں کے کردار:

فردوس بریں کے بڑے کرداروں میں حسین، زمرد اور شیخ علی وجودی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ حسین ناول کا ہیرو بھی ہے اور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ حسین سے ہماری پہلی ملاقات کوہ البرز کی گھاٹی میں ہوتی ہے، شرر نے اس کا جو حلیہ بیان کیا ہے (ص ۸۴) اس کے مطابق شرفائے آمل کے لباس میں ملبوس ایک خوبرو نوجوان ہے اور خنجر، تلوار، کمان و ترکش سے مسلح۔ پہلی ملاقات میں حسین کے بارے میں جو باتیں معلوم ہوتی ہیں ان میں اس کی سادہ لوحی، مذہب کی طرف میلان کے علاوہ قدرے کمزور دل ہونے کی صفت شامل ہے۔ کمزور دل ہونے کی یہ صفت غالباً اس لیے زیادہ نمایاں ہو رہی ہے کہ وہ اپنی ضدی مزاج محبوبہ کو موقع محل کی نزاکت اور اس مقام کی خطرناکی کا احساس دلا کر ضد چھوڑ دینے پر آمادہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ

بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمرد سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اس کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہے - زمرد سے یہ محبت اس ناول کے پلاٹ اور حسین کے کردار کے ارتقا میں بہت اہم رول ادا کر رہی ہے - وہی حسین جو اس پرخطر مقام میں پریوں کے خوف سے جانے سے گریز کر رہا تھا، زمرد کے (بظاہر) مارے جانے پر ماحول سے بے خوف ہو کر اس ویرانے اور ہولناک مقام پر زمرد کی قبر کا مجاور بنا بیٹھا ہے - یہ امر اس کی مستقل مزاجی اور محبت میں استقلال کا مظہر ہے - زمرد سے محبت کا نقاضا تو یہ تھا کہ وہ بھی خودکشی کر لیتا لیکن چونکہ مذہبی میلانات کا حامل ہے اس لیے اسے خلاف شرع تصور کرتا ہے اور زمرد کے بغیر زندگی خلاف وضع - یہی وجہ ہے کہ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے زندگی کی یہ ڈگر اختیار کی - زندگی اب اس کے لیے موت سے بدتر تھی اس لیے مارے مارے پھرنے کے بجائے محبوب کی قبر سے جو ایک گونہ تسکین حاصل ہو جاتی تھی اسی کو حاصل زیست تصور کیا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے زمرد کی وصیت پر عمل نہ کیا - معلوم نہیں پروفیسر عبدالسلام کو یہ کیسے محسوس ہوا کہ "شرر کے دوسرے ناولوں کے ہیرو اگر دل نہیں تو دماغ ضرور رکھتے ہیں مگر حسین دماغ سے بھی عاری نظر آتا ہے۔"[1] حالانکہ حسین کا یہ فیصلہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ دماغ بھی رکھتا ہے اور اس سے کہیں زیادہ قوی دل — کسی کی محبت میں اس قدر مستقل مزاجی سے بے رنگ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرنا بڑی جی داری کا متقاضی ہے - اور پھر یہ دل ہی تھا جس نے اسے اس قدر سخت رداستوں سے کامیاب گزارا جن کا صرف تصور ہی "دل والوں" کے دل دہلا سکتا ہے - زمرد کے پہلے خط پر حسین کا رد عمل بالکل فطری ہے، اپنے بچپن کے ساتھی کا طرز تحریر اور خط پہچاننا اس کے لیے مشکل نہیں اور پھر اس خط میں وہ سب باتیں بیان ہیں جو موت سے پہلے اس کے اور زمرد کے درمیان ہوئیں، ایسے میں حسین کی جگہ جو کوئی بھی ہوتا اس کی یہی کیفیت ہوتی - حسین سے اگر کوئی سادہ لوحی یا حماقت سرزد ہوتی ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود کم ہے البتہ زمرد اور فرقہ باطنیہ کے مکاروں کا گروہ زیادہ ہے - حسین بھی ایک انسان ہے، اس سے کمزوری اور ضعیف الاعتقادی کا مظاہرہ ہو سکتا ہے جب کہ اس علاقے کے تمام عوام کوہ البرز کی وادی سے متعلق مروجہ روایات سے از حد متأثر تھے - زمرد کے دوسرے خط کا لہجہ، شکایت آمیز رنگ، کسی عالم بالا سے بولنے کا انداز، علم الغیب کے رموز کا انکشاف ایک پرخلوص عاشق پر جو رد عمل کر سکتا تھا وہی حسین پر ہوا اور پھر اس سکنجے کو مضبوط کرنے کے لیے وہاں ایک تازہ دم گدھا بھی موجود تھا - حسین کا متأثر ہونا اور راہ طلب میں تیزی سے گامزن ہونا ناگزیر تھا - قاری کو یہ دیکھ کر حسین سے ہمدردی محسوس ہونے لگتی ہے کہ وہ بھی عظیم انسانی برادری کے ننانوے فی صد حصے کا فرد ہے جو حالات زمانہ کا شکار ہوتے ہیں اور حوادث کے تھپیڑے کھاتے ہوئے زمانے کی بے رحم موجوں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں -

مذہبی میلانات اور زمرد کی محبت حسین کی دو بڑی کمزوریاں ہیں جن سے مخالف قوتیں ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں - شر کی متحارب قوتوں کو اس امر کا خدشہ ہے کہ کہیں حسین حالات کی سختیوں سے منہ پھیر کر زمرد کی محبت سے دستبردار نہ ہو جائے کیونکہ اس صورت میں شر کے بہت سے منصوبوں کے تشنہ رہ جانے کا اندیشہ ہے - اس لیے اس پر ایک زبردست نفسیاتی اثر ڈالا

۱- عبدالسلام : تخلیق و تنقید ، ص ۴۴

جا رہا ہے ۔ اگر زمرد کی شخصیت درمیان نہ ہوتی تو یہ کسی کے بس کا روگ نہ تھا ، لیکن یہ خود زمرد کا حکم تھا، التماس تھا، آرزو تھی کہ وہ کوہ جودی کے تیرہ و تار غار میں چلہ کشی کر رہا ہے اور وہ بھی اس پابندی کے ساتھ کہ نگاہوں کے سامنے زمرد کی صورت اور دل میں ہر وقت شیخ و مرشد کا خیال رہے ۔ کسی کی محبت میں پہلے ہی خانماں برباد اور فنا فی المحبوب شخص کے لیے یہ کس قدر سخت سزا ہو سکتی ہے اس کا تصور کوئی دل والا ہی کر سکتا ہے ۔ یہ تو بالکل پاگل کر دینے والی بات ہے اور اسی خدشے کے تحت یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ممکن ہے زمرد کا وہ خیالی پیکر اسے اپنی طرف بلاتا محسوس ہو لیکن اسے چلہ موقوف نہیں کرنا چاہیے ۔ دوسرا امتحان اس سے بھی زیادہ کڑا ہے، شہر خلیل کے تہ خانوں کے ذکر اور اس میں انبیاء علیہم السلام کے جنازوں کی موجودگی کے تصور سے ہی عام آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ اس مرحلے سے گزر جانے کے بعد حسین کا زمرد کے نام پر اور شیخ کے حکم سے سب کچھ کر گزرنا عین فطرت کے مطابق ہے، اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مجاوروں کے ہاتھوں گرفتاری اور آزادی کا معجزہ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔ بظاہر یہ واقعہ معمولی تصور کیا جا سکتا ہے لیکن در حقیقت دور رس نفسیاتی اثرات کا حامل ہے ۔

حلب میں پہنچنے کے بعد حسین کا کردار واضح طور پر ارتقائی مراحل سے گزرتا دکھائی دیتا ہے ۔ اب سر کی قوتیں پوری طرح اس پر اپنے پنجے گاڑے ہیں ، اس کا واسطہ شیخ علی وجودی جیسے شاطر اور عیار سے ہے ۔ اہل نظر کے لیے اس سے زیادہ دلچسپ اور مقام کوئی نہیں اور فنکاری کے جوہر بھی یہیں کھلتے ہیں کہ ایک طرف مکمل عقیدت ، خلوص ، نیاز مندی ، جذبۂ اطاعت ہے ، اس اعتقاد میں ذاتی مجبوری اور غرض مندی بھی کار فرما ہے اور دوسری طرف پوری عیاری ، مکاری ، چالاکی اور شیطنت ، لیکن زہد و پارسائی کے دبیز پردوں اور خوبصورت لبادوں میں ۔ ان دونوں متحارب قوتوں کی صحیح صحیح تصویر کشی ہی ہنر وری ہے ۔ حسین جب مسجد شاہین میں تذبذب کی حالت اور بیم ورجا کی کیفیت میں کھڑا ہے تو ایسے آدمی کا جو بظاہر نا واقف ہے اچانک اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنا ، "حسین میں جانتا ہوں تو میری تلاش میں آیا ہے ،" بہت گہرا نفسیاتی اثر پیدا کر سکتا ہے ۔ یہی وہ پہلا فقرہ ہے جس سے شر کی گرفت مضبوط ہوتی ہے ۔ پھر علی وجودی کا لہجہ ، اپنی برتری کا اظہار ، مخصوص الفاظ جن کے ذریعے دنیا کی ہر شے کے بارے میں حقارت اور انسان کی بے وقعتی کا اظہار ہوتا ہے ، پورا جادو جگاتے ہیں ۔ اس کا یہ بتانا کہ وہ صرف آج اس مسجد میں آیا ہے اور اتفاقاً نہیں بلکہ قصداً اور پھر اپنے علم غیب کا اظہار کرتے ہوئے حسین کی زندگی کے گزشتہ واقعات کی روداد بے نیازی سے بیان کرنا ، گرم لوہے پر چوٹ لگانے کے مصداق ہے ۔ اب اس لوہے کا ضارب کی مرضی کے مطابق ڈھل جانا کوئی غیر فطری امر نہیں ۔

فولاد پگھل کر مسلسل ضربوں کے ساتھ ضارب کے حسب منشا ڈھلتا جا رہا ہے لیکن اس سے جو نقش و نگار بنانے مقصود ہیں ان کے لیے اسے مختلف سانچوں میں سے گزارنا درکار ہے اور کسی بھی وقت درجہ حرارت کی کمی اس میں سختی کے آثار پیدا کر سکتی ہے ۔ اس لیے اب زیادہ محتاط طریقے پر عمل کی ضرورت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سلسلۂ عمل گیارہ ماہ تک جاری رہتا ہے ۔ کبھی کبھی رد عمل بھی ظاہر ہوتا ہے ۔ علی وجودی جب حسین کو یہ درس دے رہا ہے کہ مرید کو مرشد کے حکم کی بلا حجت تعمیل کرنی چاہیے تو حسین کے ذہن

میں شکوک و شبہات کی کشمکش ابھرتی ہے اور وہ پوچھ بیٹھتا ہے : ''مگر کیا معاصی اور برے کاموں کا بھی بے سمجھے ارتکاب کر لینا چاہیے'' ۔ اس کا جواب منفی یا مثبت صورت نہیں رکھتا بلکہ ایک نفسیاتی اثر رکھتا ہے اور جواب بذات خود سوال ہے کہ : ''کیا تجھے گمان ہے کہ مرشد برے کام کا حکم دے گا'' ۔ حسین کے بجائے شرر کے معترضین میں سے بھی کوئی ہوتا تو غالباً یہ جواب دیتا ، ''ہرگز نہیں'' ۔ لیکن ایسا نہیں ہوا ، شرر حسین کی انگلی پکڑ کر نہیں چلاتے بلکہ حالات کے ناپیدا کنار سمندر میں انھوں نے اسے اکیلا چھوڑ رکھا ہے ۔ پروفیسر عبدالسلام کی یہ بات زیادہ با وزن نہیں معلوم ہوتی کہ ''حسین کے کردار میں کوئی جان نہیں ، وہ شروع سے آخر تک بے جان آلے کی طرح حرکت کرتا ہے''۔[1] ہم دیکھتے ہیں کہ اس موقع پر حسین کا جواب اس کی انفرادیت ، زندگی اور شخصیت کا مظہر ہے ، وہ کہتا ہے : ''لیکن ممکن ہے کہ مرید اور عقیدت کیش کو وہ فعل گناہ نظر آتا ہو ۔'' یہ فقرہ اپنے لہجے اور انداز کے اعتبار سے کتنا ہی نرم اور عقیدتمندانہ کیوں نہ دکھائی دے اپنی روح کے اعتبار سے علی وجودی سے گھرے اختلاف کی شان رکھتا ہے ۔

امام نجم الدین کے قتل کا حکم سن کر حسین کا رد عمل اس کی زندگی کا پورا ثبوت ہے ۔ اس کے ذہن میں بیسیوں سوالات جنم لیتے ہیں ، وہ خود ان متضاد سوالات کا جواب دے کر ان میں مفاہمت کی صورت پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہے ۔ یہ ذہنی کش مکش شرر نے بڑی خوبصورتی سے پیش کرکے حسین کو گوشت پوست کا ایسا انسان بنا دیا ہے جس کے سینے میں دل بھی دھڑکتا ہے ، جذبات و احساسات بھی ہیں اور جس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی ہے ۔ یہاں بالآخر حسین بالکل فطری انداز میں حالات سے مطابقت پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے ، تو بازمانہ بساز کا قول اپنے اندر حکمت اور دانش رکھتا ہے تو حسین کا فیصلہ بھی ہرگز غیر دانشمندانہ نہیں ۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حسین کا کردار ایک مسلسل ارتقا پذیر کردار ہے اور اس ارتقا کی ایک حسین تصویر امام نجم الدین کے قتل سے کچھ پہلے اور قتل کے کچھ بعد کے حالات ہیں ۔ حسین کی اس شب کی بے قراری ، تذبذب اور مکمل سکوت اس کے اندر عقل و جذبات کے طوفانوں کی باہمی آویزش کے مظہر ہیں ۔ طرح طرح کے خیالی پیکروں کا اسے خوفزدہ کرنا انھیں اندرونی کیفیات کی آئینہ داری ہے اور قتل کے بعد اس کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہیں ، خوف ہے اور بدی کا احساس بھی ۔ اب جو ہونا تھا ہوچکا ، طوفان تھم چکے ہیں لیکن طوفان کی تباہ کاریوں کے نشان تو باقی ہیں ، جنھیں دیکھ کر حسرت و افسوس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔ اب حسین بھی اس ندامت ، افسوس ، احساس گناہ کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے ۔ ضمیر کے کچوکے اور ارتکاب گناہ کا شدید احساس ایک زندہ انسان کا احساس ہے اور اس ذہنی اذیت سے بچنے کے لیے تاویلیں بھی فطری ہیں ۔

اب حسین کی شخصیت تقریباً بدل چکی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اب جنت میں زمرد آسانی سے کوئی نئی بات اسے نہیں سمجھا سکتی ۔ اب امام نصر بن احمد کا قتل اس کے لیے ایک معمولی بات ہے لیکن ان سب باتوں سے زمرد کے لیے اس کی بے قراری میں مزید اضافہ ہو گیا ہے ،

۱۔ عبدالسلام : تخلیق و تنقید ، ص ۴۴

آخری حصے میں جب زمرد اسے یقین دلانا چاہتی ہے کہ یہ سب فریب تھا تو باوجود اس کے کہ بہت سی باتوں نے اسے پریشان کر دیا تھا ، وہ اس جنت تک اپنے پاؤں سے چل کر آیا تھا ، آسانی سے زمرد کی باتوں کا قائل نہیں ہوتا اور ہر بات پر زمرد سے پوری بحث کرتا ہے۔ یہ انکشاف جہاں گزشتہ زندگی کے بارے میں ندامت کا رنگ پیدا کرتا ہے وہاں انتقام کا جذبہ بھی شدت سے ابھرتا ہے۔ آخری موقع پر کاظم جنوبی ، طور معنی ، اور شیخ علی وجودی کے ساتھ اس کا سلوک بھی اس کے کردار کی بدلی ہوئی کیفیتوں کا آئینہ دار ہے۔ اور یہی جذبہ انتقام اسے خور شاہ پر حملہ کرنے کے لیے بھی اکساتا ہے۔

زمرد ابتدائی ملاقات میں اس جذبے سے مغلوب دکھائی دیتی ہے کہ لوگ اس کے نا محرم کے ساتھ چلے آنے پر اسے الزام دیتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اپنی زندگی سے مایوس بھی ہے ، پریوں اور ظالم ملاحدہ سے خوف زدہ بھی۔ پھر جب وہ راستہ چھوڑ کر نہر کے کنارے جانا چاہتی ہے تو حسین اسے جتاتا ہے کہ ادھر تو پریوں کا مسکن ہے لیکن اب اس کے مزاج کا دوسرا رنگ سامنے آتا ہے کہ "ہونے دو"۔ زمرد کا یہ کہنا کہ وہ حسین کی شرافت کی قائل بھی ہے اور بچپن سے اس سے محبت کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ آنے کی وجہ وہ محبت نہیں صرف بھائی کی قبر پر فاتحہ پڑھنا ہے ، حج کا مقصد بھی ثانوی ہے ، اس کے فرار اور پھر نسوانی سرم و حیا کا کوئی ٹھوس جواز نہیں پیش کرتا۔

اس ابتدائی سرسری سی ملاقات کے بعد زمرد نگاہوں سے غائب ہو جاتی ہے اور ناول کے درمیان میں وہ صرف ایک بار مختصر وقفے کے لیے سامنے آتی ہے۔ اس وقت وہ کسی انجانے خوف سے خائف ہے ، گہری راز داری کا مظاہرہ کر رہی ہے اور اس کے ہر عمل سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ کسی اور کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔ گاہے گاہے اس خارجی خول میں سے داخلی جھلک بھی نمایاں ہوتی ہے جب کہ وہ یہ کہتی ہے کہ وہ اپنے بس میں نہیں اور امام نجم الدین کے قتل میں حسین اسے شامل نہ کرے۔ ان باتوں کو دانائی ، زیرکی ، عقلمندی وغیرہ بہت سے اچھے نام دیے جا سکتے ہیں جیسا کہ دیے گئے لیکن یہ ایک بے بس اور کٹھ پتلی کردار سے زیادہ کچھ نہیں۔ آخر اس فرقہ باطنیہ کی دوسری حوریں بھی تو اسی دوہری شخصیت کی حامل ہوں گی اس کی ایک مثال خود مرجان کی ہے۔

آخری حصے میں پھر زمرد سے ملاقات ہوتی ہے اور اس کے بارے میں جو باتیں معلوم ہوتی ہیں ان میں سے زیادہ تر بیانیہ ہیں اور خود زمرد کی زبانی بیان ہوئی ہیں۔ عملی طور پر ایک یہ مظاہرہ جاذب نظر ہے کہ حسین جب اسے کہتا کہ اس کے بوسے کا نشان اسے بہت عزیز رہا ہے تو وہ شرما کر نظر نیچی کر لیتی ہے اور کہتی ہے : "حسین نہ بوسہ لینے سے کسی شخص کے جسم پر داغ لگ جاتا ہے اور نہ میں اتنی بے حیا ہوں"۔ حسین کے مزید اصرار پر کہتی ہے : "اب مجھ سے بے شرمی کی باتیں نہ کہلواؤ"۔ اس سے زمرد میں نسوانیت کی ایک چمک پیدا ہوتے ہوتے رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے محبوب سے لپٹ لینے کو عار نہیں سمجھتی لیکن بوسہ دینے کو بے شرمی تصور کرتی ہے۔ قاری کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حسین کی زبان سے بوسہ کا لفظ سن کر شرمانے والی زمرد اپنی اور خور شاہ کی گفتگو کی تفصیلات جب حسین سے بیان کر رہی ہے تو باوجود یہ کہنے کے کہ وہ خور شاہ کی زبان سے وہ باتیں سن کر شرما رہی تھی اس کی کسی ادا سے شرم و حجاب کا اظہار نہیں ہوتا۔ وہ بڑی بے حجابی اور بے تکلفی سے

یہ سب روداد سنا رہی ہے -

باطنیوں کا قتل عام دیکھ کر پھر ایک مرتبہ اس کا زنانہ پن ابھرتا ہے اور وہ چیخ اٹھتی ہے کہ یہ خون اور غارتگری نہیں دیکھ سکتی - اس کے کردار میں محبت ، وفاداری اور ثابت قدمی کے عنصر کو بھی خوب سراہا گیا ہے لیکن محبت اور وفاداری کے ساتھ جو خلوص اور ہمدردی کا رنگ لازمی ہوتا ہے اس کی کافی حد تک کمی دکھائی دیتی ہے ، اور شبہ ہونے لگتا ہے کہ محبت میں یہ سارا استقلال اور وفاداری محض ضدی مزاج کا پرتو تھا ، وگرنہ حسین کی تباہی اور بربادی میں خود زمرد کا بھی کافی ہاتھ دکھائی دیتا ہے جسے وہ اپنی بے بسی اور مجبوری کے نام سے یاد کرتی ہے ، لیکن اس کی زیرکی کسی مقام پر بھی یہ فیصلہ نہیں کر پاتی کہ جن راہوں پر وہ حسین کو چلا رہی ہے اس کا انجام کیا ہوگا اور اس غریب کو کتنی مشکلات سہنی ہوں گی - حسین پر چلائی جانے والی بندوق کے پیچھے کوئی بھی شخصیت کارفرما رہی ہو ہمیں وہ بندوق زمرد ہی کے کاندھے پر دکھائی دیتی ہے -

فردوس بریں کا آخری بڑا اور سب سے زیادہ متأثر کرنے والا کردار شیخ علی وجودی کا کردار ہے - ناول میں ہم اس سے اس وقت متعارف ہوتے ہیں جب کہ وہ اپنی شخصیت کی تکمیل کر کے ایک ایسے مقام پر پہنچ چکا ہے کہ اس کی عادات و اوصاف راسخ ہو کر فطرت ثانیہ بن چکی ہیں - ماحول اور حالات ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتے بلکہ وہ اپنے ماحول اور حالات پر چھایا ہوا ہے - ایسے کرداروں کو فن کی اصطلاح میں جامد کردار کہا جاتا ہے اور حالات ان کی مرضی کے مطابق ڈھلنے پر مجبور ہوتے ہیں - علی وجودی نے اس منزل تک پہنچنے کے لیے کون کون سے مراحل طے کیے ، ہم ان سے بے خبر ہیں - ناول میں وہ مکمل شخصیت کے ساتھ جلوہ گر ہوا - علی وجودی کو اس کے خالق نے وہ تمام صلاحتیں بخش دی ہیں جو ماحول اور حالات پر اثر انداز ہونے اور انہیں اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال لینے کے لیے ضروری ہیں - علی وجودی اپنی ان صلاحیتوں سے پورے طور پر باخبر بھی ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کس موقع پر اسے کون سی صلاحیت سے کام لینا چاہیے - موقع شناس بھی ہے اور اپنے اقوال و افعال پر بھی قدرت رکھتا ہے - حالات کتنی بھی تیزی سے رنگ بدلنا چاہیں اس سے آگے نہیں نکل سکتے - وہ بڑی سرعت اور کمال چابک دستی سے اپنے لہجے ، چہرے سے جذباتی کیفیتوں کے انعکاس اور افعال کے ذریعے حاوی ہو جاتا ہے - ظاہری کیفیتوں میں ساحرانہ انداز میں تبدیلی پیدا کر لینے کی بدرجہ اتم صلاحیت ہی اس کی کامیابی کی ضامن ہے - اسے جو رول دیا گیا ہے وہ اس کی اونچ نیچ سے پوری طرح باخبر ہے - علوم متداولہ سے واقفیت اور عالمانہ و صوفیانہ اصطلاحوں میں گفتگو کا ملکہ اسے ایک بڑا ساحر بنا دیتا ہے - صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنے مخاطب انسانوں کی نفسیات کا بھی کافی علم رکھتا ہے اور ان کی کمزوریوں سے واقف ہے - وہ بخوبی جانتا ہے کہ مخاطب پر کس وقت کون سا نفسیاتی حربہ کامیاب ہو سکتا ہے ، کب غیظ و غضب کی ظاہری کیفیتیں کام دے سکتی ہیں اور کب شفقت رنگ لاتی ہے اور ان کیفیتوں کے بدلنے میں چند ثانیوں کی تاخیر بھی نہیں ہوتی - علی وجودی زندگی کے سٹیج پر ایک بہت بڑا اور بہت کامیاب اداکار ہے -

شیخ شریف علی وجودی سے پہلی ملاقات حلب کی مسجدالشاہین میں ہوتی ہے جب کہ حسین شیخ کی جستجو میں تقریباً مایوس ہو چلا ہے - اس وقت باوجود اس کے کہ ان دونوں میں کوئی

ملاقات نہیں، علی وجودی پیچھے سے آ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے : "حسین میں جانتا ہوں کہ تو میری تلاش میں آیا ہے"۔ یہ فقرہ حسین کو گرویدہ بنا لینے کے لیے کافی ہے اور اس کا وہی رد عمل ہونا ہے جو علی وجودی چاہتا ہے ۔ لیکن پھر ایک پل میں وہ شفقت جلال میں بدل جاتی ہے جب کہ حسن شیخ سے درخواست کرتا ہے کہ اسے اس صراط مستقیم پر چلائیں جس سے انسان خدا اور عالم ارواح کو پہچان سکے ۔ شیخ کا پرجلال جواب مخاطب کے دل پر شیخ کی عظمت اور عقیدت کے نقوش اور گھرے کر دیتا ہے :

"اے بحر وجود اور دریائے وحدت کے ذلیل و ناپاک قطرے ! تیرا کیا حوصلہ ہے کہ اس وجود غیر موجود اور لاہوت غیر متنوع کے رموز سمجھ سکے ۔"

مخاطب کو حقیر ظاہر کرنے اور بے نیازانہ انداز میں کائنات و مافیہا سے پیش آنے کے بڑے عمدہ نمونے ملتے ہیں ۔ حسین کی زبان سے یہ سوال سن کر کہ کیا شیخ روز اس مسجد میں تشریف لے جاتے ہیں، بڑی لاپروائی سے کہا :

"نہیں صرف آج گیا تھا !" حسین : "تو شاید کسی کام کے لیے ادھر تشریف لے جانے کا اتفاق ہوا ہوگا ۔" اس کا جواب شیخ قدرے برہمی سے دیتے ہیں : ولا تجسسو ، ان رموز کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے اگر سچا شوق ہے تو کبھی خود ہی سارا راز کھل جائے گا ۔ اب حرف سوال تیری زبان سے نکل گیا ، لے سنائے دیتا ہوں ۔"

اس کے بعد شیخ ، حسین کی گزشتہ زندگی کے حالات اس پیرائے میں اسے سناتے ہیں کہ گویا ان سے زیادہ بڑا ولی کوئی نہیں اور یہ سب کچھ وہ علم غیب کے اسرار و رموز جاننے کی وجہ سے دیکھتے رہے ۔ لیکن اس بیان کا انداز جیسا کہ مندرجہ بالا فقرے سے ظاہر ہے یہ بتانا ہے کہ شیخ اپنی کرامات کے اظہار کی ضرورت نہیں محسوس کرتے لیکن چونکہ حسین نے ذکر چھیڑ دیا ہے تو وہ سنا رہے ہیں ۔

انسانی نفسیات سے واقفیت کا ایک حسین مظہر مندرجہ ذیل دو مکالمے ہیں، جب شیخ حسین کو تلقین کر رہے ہیں کہ مرشد کے ہر حکم کی تعمیل بے سوچے سمجھے کرنی چاہیے ۔ انھوں نے اس تبلیغ کے لیے بڑا عالمانہ منطقیانہ اور فلسفیانہ لہجہ اختیار کر رکھا ہے ۔ حسن پوچھ بیٹھتا ہے :

"مگر کیا معاصی اور برے کاموں کا بھی بے سمجھے ارتکاب کر لینا چاہیے ۔

شیخ : (نہایت ہی جلال کے ساتھ اور آنکھیں سرخ کر کے) کیا تجھے یہ گمان ہے کہ مرشد برے کام کا حکم دے گا ؟

حسین : (ڈر کے اور اخلاقی کمزوری کی شان سے) لیکن ممکن ہے کہ مرید اور عقیدت کیش کو وہ فعل گناہ نظر آتا ہو ۔

شیخ : ہاں ممکن ہے ، مگر اس کا باطن گناہ نہیں اور نتائج صرف باطن پر مترتب ہوتے ہیں ۔

حسین : مگر اس باطن پر جو مرتکب اور کرنے والے کے دل میں ہو . . .

شیخ : (جلال میں آ کے اور آنکھیں سرخ کر کے) تو کیا تیرے نزدیک شیخ کی نیت پر شبہ کیا جا سکتا ہے اور اس پہلے راز لاہوتی کے تسلیم کرنے سے تجھے انکار ہے ۔"

حسین قدموں پر گر کر معافی مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ صرف اپنے اطمینان کے لیے پوچھ رہا ہے تو شیخ کا جلال ایک پل میں رخصت ہو جاتا ہے اور وہ اسے سینے سے لگا لیتے ہیں ۔

ایک اور موقع پر اس اداکاری کا عمدہ نمونہ ہے جب کہ ایک مرید اس بارے میں شک کا

اظہار کرتا ہے کہ کیا کوئی روح متشکل ہونے کی قدرت رکھتی ہے، علی وجودی کا جواب عالمانہ اور منطقیانہ ہے ۔ اس کے ساتھ ہی وہ حسین کو گواہ کے طور پر پیش کرتے ہیں اور جہاں دیکھتے ہیں کہ کوئی کمی باقی ہے وہاں ان کا جلال، برہمی، غیظ و غضب کا اظہار اسے پورا کر دیتا ہے اور یہی وہ عالم تھا جب شیخ نے برسر عام یہ دعویٰ کیا کہ وہ جسے چاہیں ایک آن میں ملاء اعلیٰ پر پہنچا دیں ۔ حسین موقع غنیمت جان کر قدموں پر گرکر درخواست کرتا ہے تو :

''علی وجودی چند ساعت خاموش کھڑے رہے پھر اس کو اٹھا کر بٹھایا اور کہا :
حسین میرے اس وقت کے جوش سے تو نے بہت بڑا فائدہ اٹھایا . . . . خیر کل تنہائی میں درخواست کرنا۔''

پھر تنہائی میں حسین کی درخواست پر شیخ کا کہنا کہ اس کے لیے امتحان دینا ہوگا تو اچھی طرح تیار ہے ؟

حسین : دل و جان سے تیار !
شیخ : دیکھ تجھے تامل نہ ہو ۔
حسین : ذرا نہیں ۔
شیخ : تیرے دل میں شک اور بدعقیدگی نہ پیدا ہو ۔
حسین : ہرگز نہیں ۔
شیخ : وہ جرأت کا کام ہے ۔
حسین : میں جان لڑا دوں گا ۔
شیخ : اس میں خطرے بھی ہیں ۔
حسین : ہوں ۔
شیخ : تو سن !
حسین : ارشاد !
شیخ : ابھی نہیں دل مضبوط کر لے ۔
حسین : خوب مضبوط ہے ۔

اس کے بعد شیخ علی وجودی نے شیخ امام نجم الدین کے بارے میں بتایا کہ اسے معلوم ہے کہ حسین امام کا بھتیجا اور مرید ہے اور ان کی بڑی قدر کرتا ہے، لیکن حکم یہی ہے کہ ان کو جا کر قتل کر دے ۔ یہ خوف ناک حکم سن کر حسین غش کھا جاتا ہے لیکن علی وجودی جو ہمیشہ ماحول کو اپنی مرضی کے مطابق بدل لینے کی صلاحیت رکھتا ہے اس مقام پر ہرگز لغزش نہیں کھاتا اور حسین کو ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے کی بجائے کچھ دیر انتظار کرکے اپنے حجرے میں چلا جاتا ہے ۔

امام کے قتل سے واپس آ کر جب حسین، علی وجودی سے کہتا ہے کہ :

''یا حضرت میرے دل میں اس ظالمانہ فعل کی نسبت طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں ۔

شیخ : (جوش میں آ کر) بے شک پیدا ہوتے ہوں گے ، روح اس مادے کی کثافت سے بڑی دشواریوں سے علیحدہ ہو سکتی ہے اور صرف یہی چیز ہے جو ان شکوک و شبہات کو پیدا کرتی ہے ۔ مرکز اشراق جو باوجود لاحی ہونے کے حیات سرمدی کا سرچشمہ ہے اس جسمانی روح پر جو قفس عنصری میں مقید ہے اپنے تنوعات عشق کو بمشکل آشکار کر سکتا ہے ۔''

اس کے بعد حسین کی درخواست پر اطمینان بخش نصائح ارشاد ہوتے ہیں اور اس دوران میں بھی بعض مواقع پر حسین کے استفسارات شیخ کی برہمی کا ذریعہ بن جاتے ہیں ۔

حسین جب باطنین کی فردوس بریں سے واپس لوٹتا ہے تو شیخ شفقت سے اسے پاس

بٹھا کر پوچھتے ہیں:

"اے تیرہ و تار مشت غبار! تو نے وہاں کیا دیکھا؟"

اسی دوران میں جب حسین کی زبان سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس نے نورستان کو خوب جی بھر کر دیکھا، شیخ تردید کرتے ہیں اور وہ پھر اصرار کرتا ہے تو شیخ کا جلال دیدنی ہے کہ "منہ میں کف بھر آیا، آنکھیں سرخ ہو گئیں اور ایک دفعہ جوش میں آ کر اٹھ کھڑے ہوئے: "اے متکبر مغرور مشت خاک! تیری کیا مجال ہے کہ اس نورلم یزلی کو ان ذلیل آنکھوں سے دیکھ سکے۔" اور اس طرح شیخ کی جلالی تقریر جاری رہتی ہے۔

اس کے بعد فرقہ باطنیہ کے عقاید ذہن نشین کراتے ہوئے اس کی طرف سے اٹھائے گئے شکوک و شبہات پر شیخ بار بار برہم ہوتے ہیں اور ایک بار غصے میں اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں: "تو عالم نور کی سیر کرنے پر بھی جاہل اور شکی ہے۔ ۔ ۔ ۔"

علی وجودی سے اتنے عرصے کی ملاقات میں ایک بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ بھی دکھائی دیتی ہے جب حسین، امام نصر بن احمد کو قتل کرکے واپس آتا ہے اور شیخ سے پوچھتا ہے کہ اس کے ہم عقیدہ اسے نہ معلوم کس طرح پہچان لیتے ہیں، تو شیخ صندوق سے ایک آئینہ نکال کر اسے اس کی پیشانی کا داغ دکھاتے ہیں اور وہ کہتا ہے شاید بچپن میں گر پڑا ہوں گا۔ اس وقت شیخ مسکرا کر جواب دیتے ہیں: "نہیں یہ حور کے بوسے کا نشان ہے"۔

شیخ علی وجودی کا کردار اس قدر مکمل ہے اور اس نے عیاری اور مکاری کے ایسے پردے اوڑھ رکھے ہیں کہ آخری ملاقات پر بھی جب کہ قلعے میں قتل عام ہو رہا ہے وہ انہیں صلاحیتوں سے کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ پھر اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کرکے حسین پر اثر انداز ہونا چاہتا ہے، لیکن جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کی تمام عیاری و مکاری کا پول کھل چکا ہے تو رحم و کرم کی درخواست کرتا ہے۔

علی وجودی کے کردار کو پر اثر بنانے میں اس کی عالمانہ شان، اس کے الفاظ، لہجے اور مکالمے، منطقیانہ اور فلسفیانہ گفتگو، صوفیانہ اصطلاحیں، مصلحت اندیشی اور موقع شناسی کا بڑا گہرا دخل ہے۔ شرر کی تمام فن کارانہ صلاحیتیں اس کے کردار کی تکمیل میں بیک وقت کارفرما دکھائی دیتی ہیں۔

فردوس بریں کے دیگر کردار کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ کاظم جنوبی اور طور معنی کے کردار ایک صاعقے کی مانند کوند کر ختم ہو جاتے ہیں۔ بلغان خاتون کا کردار زنانہ کم اور مردانہ زیادہ ہے۔ اس میں دلیری، شجاعت، انتقام، بربریت اور سفاکی کی ایسی صفات شرر نے جمع کر دی ہیں کہ منقو خاں کے ان الفاظ پر کہ عورتوں کے ہتھیار دوسرے ہوتے ہیں انہیں تیروتفنگ کی بجائے غمزہ و ادا سے کام لینا چاہیے اس کا شرمانا بالکل اوپرا سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے ماسوا اس میں اور کوئی نسوانی صفت نہیں پائی جاتی۔

مکالمے:

فردوس بریں کے مکالمے فنی اعتبار سے ایک بلند مقام رکھتے ہیں، یہ پلاٹ کے ارتقا، ماحول سازی اور کرداروں کی شخصیتوں کو اجاگر کرنے میں بڑا اہم حصہ لے رہے ہیں۔ بعض عاشقانہ مکالمے قدرے کمزور ہیں لیکن دیگر مکالمے کرداروں کی نفسیات اور شخصیت سے گہری

مناسبت رکھتے ہیں - شیخ علی وجودی، طور معنی، کاظم جنونی، خور شاہ اور حسین کے مکالمے بڑے عمدہ مکالمے ہیں - سطور ما قبل میں شیخ علی وجودی اور حسین کے کردار کی بحث میں ان مکالموں کے بعض نمونے درج کیے گئے ہیں - ان مکالموں کی زبان اور الفاظ پلاٹ کو خاصی تقویت پہنچاتے ہیں -

منظر نگاری :

فردوس بریں اپنی منظر نگاری کے اعتبار سے بھی ایک شاہکار ہے - پہلے باب کے مناظر اور پریوں کے ظاہر ہونے کے بیانات انتہائی پر اثر اور زور دار ہیں - ڈاکٹر احسن فاروقی شرر کے تاریخی ناولوں یا بالفاظ دیگر شرر کے فن کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے لیکن ان مناظر کے بارے میں وہ بھی بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں :

"اس جگہ سے اس میں ایک نیا رومانی لطف اور نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے - یہ تمام بیان ہی اپنے مقام پر نہایت درجہ پر اثر ہے اور شرر کی قوت بیان داد کے قابل ہے -"[۱]

کوہ جودی کے غار، شہر خلیل کے تہہ خانے اور اصفہان کے باہر طور معنی کا زمین دوز غار نما قصر بھی اپنے بیان میں فنکارانہ کمال کے مظہر ہیں لیکن فردوس بریں کا منظر سب سے زیادہ پر اثر، حسین اور منظرنگاری کا شاہکار ہے -[۲] ڈاکٹر احسن فاروقی نے فردوس بریں کے اس منظر کی دل کھول کر داد دی ہے، لکھا ہے :

"... آخر میں حسین کا فردوس میں داخلہ اور اس باغ کی طلسمی بہاروں کا وہ پر اثر بیان آتا ہے جس کے مقابلے میں اردو نظم و نثر کوئی اور بیان نہیں پیش کر سکتی - اس تاریخی جنت کو پھر سے زندہ کر دینا شرر کا حق ہے اور ان کی تمام تاریخی ناول نگاری کا حاصل ہے -"[۳] "... وہ معجز بیانی کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں - حسین کے فردوس کے داخلے سے لے کر اس فردوس کے تمام تاثرات اس زور اور اثر کے ساتھ قائم ہوتے ہیں کہ ناظر خود فردوس میں پہنچ جاتا ہے - بیانات کا طرز ادا بھی ناول نگاری کے سلسلے میں ہمیشہ مشعل راہ رہے گا - یہ ناول نگاری کے لیے مخصوص طرز ہے اور ایسی پختہ راہ جس پر ہر ناول نگار ہمیشہ چلتا رہے گا -"[۴]

۵- فلورا فلورنڈا

فلورا فلورنڈا شرر کے مقبول و معروف ناولوں میں شمار ہوتا ہے - اس میں ایک طرف تو سپین میں اسلامی دور حکومت کے عروج کا زمانہ دکھایا گیا ہے اور دوسری طرف مسیحی خانقاہوں میں ہونے والی بدکاریوں اور چیرہ دستیوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے -

پلاٹ :

فلورا فلورنڈا کا پلاٹ بھی شرر کے دیگر ناولوں کی طرح چست، مربوط اور ارتقا پذیر پلاٹ ہے، واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور کہیں بھی جھول دکھائی نہیں دیتی - ناول تیس ابواب پر مشتمل ہے - پہلے باب میں اگرچہ ناول کے واقعات سے ڈیڑھ سو برس پہلے کے ایسے واقعات بیان ہوئے ہیں جو تاریخی روایات کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن شرر نے انھیں

۱- احسن فاروقی : اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ص ۱۴۹ - ۲- فردوس بریں، ص ۱۳۱ تا ۱۴۵ -
۳- اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ص ۱۵۱ - ۴- ایضاً : ص ۱۶۲، ۱۶۳

ایسے موقع محل سے بیان کیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ پلاٹ کی بندش پر اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ فضا سازی میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں ۔ طلسمی برج کے واقعات اگرچہ تاریخی روایات کی حثیت رکھتے ہیں لیکن یہ واقعات بذات خود ایسا طلسماتی رنگ لیے ہوئے ہیں کہ ان کی تحیر آمیزی شروع سے ہی قاری کو ناول میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیتی ہے، اس خوفناک ماحول میں جس سازش کی بنا رکھی جا رہی ہے وہ بھی قاری کے تجسس کو زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے ابھارتی ہے ۔ دوسرا باب ایک تاریخی پس منظر سے شروع ہوتا ہے لیکن قاری ناول کے ماحول اور پس منظر سے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کی خاطر اسے غیر متعلق تصور نہیں کرتا ۔ شرر نے اس تاریخی پس منظر کو بھی ناول کے واقعات کے ساتھ فنی چابکدستی سے مربوط کر دیا ہے ۔ پہلے باب میں یولاجیس کی سازشوں اور دوسرے باب میں فلورا نامی مسلمان لڑکی کو ورغلانے کی کوششوں کے بارے میں ابتدائی معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔ یہ نیا مسئلہ بھی تجسس کو بیدار کرتا ہے ۔

تیسرے باب میں پہلے اور دوسرے باب کے واقعات میں ربط پیدا ہو جاتا ہے اور یولاجیس ہی فلورا کو بھگانے کی کوششوں کا محرک نظر آتا ہے ۔ گرجے میں خفیہ اجلاس میں فلورا کے لیے ایک نئی سازش مرتب ہوتی ہے جو تجسس کو اور بھی مہمیز کرتی ہے ۔ چوتھا باب پرسکون ہے لیکن تاثر کو گہرا کرتا ہے ۔ پانچویں باب میں فلورا اور زیاد کی نئی پڑوسن ایک سوال بن کر ابھرتی ہے ۔ قاری بھی اس پڑوسن (حلاوہ) کے رویے کے بارے میں اسی طرح متذبذب ہے جس طرح خود زیاد ۔ فرق صرف یہ ہے کہ زیاد ایک مسلمان عورت کے اس قدر جلد بے تکلف اور بے باک ہو جانے پر متحیر ہے اور قاری اس کے فلورنڈا ہونے کے امکانات پر غور کر رہا ہوتا ہے ۔ چھٹے باب میں حلاوہ کے میلے ہاتھوں کو دیکھ کر زیاد جو اعتراض کرتا ہے اس پر حلاوہ کے رد عمل سے قاری کا شبہ یقین میں بدلتا جاتا ہے کہ یہ یولاجیس کی بھیجی ہوئی نن فلورنڈا ہی ہے اور ساتویں باب میں قاری کے لیے حلاوہ اور حمیدہ کی شخصیتوں پر سے پردہ اٹھ جاتا ہے ۔ اب یہ نئے سوال کہ آیا فلورنڈا زیاد کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جائے گی ؟ فلورا تک اس کی رسائی ہو سکے گی ؟ اور وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوگی ؟ یہ سوالات دلچسپی کے نئے سامان ہیں ۔ اسی باب کے آخر میں پلاٹ ایک نیا موڑ اختیار کرتا ہے اور وہ یہ کہ یولاجیس نے فلورنڈا کو اجازت دے دی ہے کہ وہ گرجے کی خدمت اور اپنے مشن کی تکمیل کی خاطر نن ہونے کے باوجود زیاد سے شادی کر لے ۔ آٹھویں اور نویں باب میں یہ مراحل تکمیل پا جاتے ہیں اور حلاوہ (فلورنڈا) زیاد کی بیوی بن کر اس کے گھر پہنچ جاتی ہے ۔ ناول میں دلچسپی کا عنصر اور گہرا ہو جاتا ہے ۔ دسویں باب میں فلورا فلورنڈا ایک دوسرے کی راز دار بن جاتی ہیں اور فلورنڈا اسے وہاں سے نکال لے جانے کے منصوبوں پر غور کرتی دکھائی دیتی ہے ۔

گیارھواں اور بارھواں باب اس اعتبار سے دلچسپ اور تجسس آمیز ہے کہ زیاد کو یہ علم ہو گیا ہے کہ فلورنڈا نامی کوئی نن اس امر پر مامور کی گئی ہے کہ زیاد کو چکمہ دے کر فلورا کو نکال لے جائے ۔ زیاد اس فلورنڈا کو محلے بھر میں تلاش کرتا پھر رہا ہے جبکہ وہ خود اس کی بیوی کی حیثیت سے اس کے گھر میں موجود ہے ۔ کشمکش کا یہ مرحلہ لطیف دلچسپیاں لیے ہوئے ہے ۔ قاری سوچتا ہے، کیا زیاد حلاوہ کی اصلیت سے باخبر ہو جائے گا، یا وہ اپنا

کام کر گزرے گی ؟ تیرہویں باب میں پلاٹ میں اس امر کی گنجائش پیدا کی گئی ہے کہ فلورنڈا کو اپنا مشن پورا کرنے کا موقع مل جائے اور چودہویں باب میں وہ فلورنڈا کو لے کر غائب ہو گئی - پندرہواں باب ان دونوں کی جستجو پر مشتمل ہے جس میں قاری بھی شـرر کا ہمرکاب ہے - سولھویں باب میں فلورا اور فلورنڈا، یولاجیس کے ہمراہ پیرنیز کی گھاٹیوں میں مقیم دکھائی دیتی ہیں، اب تجسس کا عنصر ایک اور رنگ میں ابھرتا ہے، یولاجس فلورا کو تسکین ہوس کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے اور فلورنڈا بھی اس کی شریک کار ہے - قاری کے جذبات فلورا کے ساتھ ہیں - سترہواں باب اگرچہ یولاجیس کی تحریک مجاہدین سے متعلق ہے لیکن شـرر نے ان واقعات کا بیان ایسے سلیقے سے کیا ہے کہ وہ پلاٹ میں جھول پیدا نہیں کرتے - اٹھارہویں باب میں الفانسو ڈیوک آف سان سبسطین کی بیٹی ہیلن کا تعارف ہوتا ہے - یہ شہزادی بھی ناول کے پلاٹ کے ارتقا میں اہم عنصر کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، اس کی تمام تر ہمدردیاں فلورا کے ساتھ وابستہ ہیں لیکن فلورا یولاجیس سے اپنی عزت بچانے کے لیے نن بن جانے کو آخری ذریعہ نجات تصور کرتی ہے - انیسویں باب میں زیاد ایک راہب کے روپ میں انھیں گھاٹیوں میں محو جستجو ہے لیکن زیاد کے وہاں پہنچنے سے پہلے (اکیسویں باب میں) فلورا ایک راہبہ مرتھا کے ساتھ نن بننے کے لیے طلیطلہ جا چکی ہے - اس باب کے آخر میں یہ نئے سوال پیدا ہو جاتے ہیں کہ آیا فلورا اس خانقاہ میں پہنچ کر عزت بچا سکے گی ؟ کیونکہ فلورا کی روانگی کے بعد فلورنڈا نے ہیلن سے خانقاہ کے اندر ہونے والی بدکاریوں اور راہبوں کی ننوں پر دست درازیوں کی جو داستان بیان کی تھی وہ افسوس ناک اور تشویشناک تھی - علاوہ ازیں زیاد پھر کبھی فلورا سے مل سکے گا ؟ اور یولاجیس نے فلورا کو جو دھمکی دی تھی وہ کیا صورت اختیار کرے گی ؟ بائیسویں باب میں خانقاہ کے کچھ اسرار و رموز کے انکشاف کے بعد شـرر نے ناول کے پلاٹ کو اس منتہی پر پہنچا دیا کہ جسے دیکھ کر قاری دل پر بوجھ محسوس کرنے لگتا ہے - خانقاہ میں پہنچنے کے بیسویں دن فلورا کو مجبوراً یولاجس کی خواہشات کے سامنے سر جھکانا پڑا - اس افسوسناک واقعے کے بعد شـرر پھر پلاٹ میں موڑ پیدا کرتے ہیں اور زیاد تئیسویں باب میں پیرنیز کی گھاٹیوں میں اسی خانقاہ تک جا پہنچتا ہے جہاں ہیلن اب بھی فلورا کی جدائی میں سوگوار ہے - چوبیسویں باب میں ہیلن ایک رات کو زیاد کے ساتھ بخوشی وہاں سے بھاگ نکلتی ہے - اب ان نئے واقعات کو تکمیل پذیر دیکھنے کی آرزو میں قاری آگے قدم بڑھاتا ہے -

پچیسواں باب خانقاہ کی کنواری ماؤں کے بچوں کے ساتھ ہونے والے سلوک سے متعلق ہے اور یہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فلورا خود بھی ماں بننے والی ہے اور ذلت و رسوائی کی المناک زندگی بسر کر رہی ہے - اس باب میں اس کے لیے پھر یولاجس کا بلاوا آتا ہے اور وہ اس رات خندہ پیشانی سے یولاجیس سے ملتی ہے اور بظاہر اپنی سابقہ ہٹ دھرمی پر نادم ہے لیکن رات کو موقع پاکر وہ یولاجیس کے گلے پر خنجر پھیر کر بھاگ نکلتی ہے - خانقاہ کی منتظمہ سینٹ کرسٹین خانقاہ کو بدنامی سے بچانے کے لیے نیم جان یولاجیس کو جنازے کی شکل میں خانقاہ سے منتقل کرا دیتی ہے - اب قاری کے سامنے یہ سوال ہیں کہ فلورا کا کیا بنا ؟ یولاجیس بچ گیا یا مر گیا ؟ یولاجیس کے خانقاہ سے منتقل ہونے کی تھوڑی دیر بعد زیاد اور ہیلن نے امیر طلیطلہ عبدالرؤف کے ہمراہ شاہی فوجوں کے ساتھ خانقاہ کا محاصرہ کر لیا لیکن وہ فلورا، فلورنڈا اور یولاجیس میں سے کسی کا بھی پتہ نہ لگا سکے - چھبیسواں باب اسی جستجو سے متعلق ہے جس میں ناکام رہ کر

زیاد اور ہیلن قرطبہ چلے گئے ۔ ستائیسویں باب میں پتہ چلتا ہے کہ یولاجیس زندہ بچ گیا ہے، اس کے زخم مندمل ہوگئے ہیں ، فلورنڈا تیار داری کر رہی ہے اور اس نے کسی خاص ترنگ میں یولاجیس کے سامنے اعتراف کر لیا کہ اس نے ہیلن کو بتا دیا تھا کہ خانقاہ میں کوئی نن بھی کسی پادری یا راہب سے اپنی عزت نہیں بچا سکتی اور اگر کوئی ایسا کرے تو قتل کر دی جاتی ہے ۔ اب وہ دونوں قرطبہ پہنچ کر خفیہ طور پر "تحریک شہادت" کو چلانے کے علاوہ ہیلن کے قتل کے منصوبے بنا رہے ہیں اور یہ کام فلورنڈا اور سینٹیا گو نامی راہب کے سپرد ہوا۔ ان معلومات کی روشنی میں تجسس بیدار ہوتا ہے تو پلاٹ میں ایک ڈرامائی موڑ واقع ہو جاتا ہے، زیاد ان دونوں کی باتیں سن لیتا ہے، راہب سنٹیا گو اس کے خنجر کا شکار ہو جاتا ہے اور فلورنڈا گرفتار، ہیلن اور زیاد نے فلورنڈا کو ڈرا دھمکا کر یولاجس کا پتہ معلوم کر لیا ہے اور وہ انہیں اس کے مکان کی نشان دہی کے لیے لے کر چلی ہے ۔ اب تذبذب کی کیفیت منتہیٰ پر پہنچ رہی ہے ، فلورنڈا اور یولاجیس کے انجام کا وقت قریب ہے لیکن شرر تجسس کو برقرار رکھنے کے لیے اس باب کو یہیں ختم کرکے اس ایک دیرینہ مسئلے کے حل کے لیے لوٹ جاتے ہیں جو کافی دیر سے قاری کے ذہن میں موجود ہے کہ فلورا خانقاہ سے نکل کر کدھر گئی ۔ انتسواں باب اسی سوال کا جواب ہے اور اس میں ایک نیا کردار ابو مسلم بھی سامنے آیا ہے جس کے بارے میں قاری زیادہ معلومات نہیں رکھتا ۔ تسویں باب میں فلورا بھی قرطبہ پہنچ چکی ہے، کشمکش اپنی منتہیٰ پر ہے، جس روز وہ بھیس بدل کر یولاجیس کے پاس پہنچنے والی ہے اسی دن اس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے ۔ آخری چند صفحات میں سارے کردار بڑی سرعت سے یک جا ہو جاتے ہیں ، یولاجیس فلورا کے ہاتھوں، فلورا ابو مسلم (ہیلن کے باپ الفانسو) کے ہاتھوں، الفانسو زیاد کے ہاتھوں اور فلورنڈا ایک پادری کے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں ۔ زیاد اور ہیلن گزشتہ حالات کے بارے میں مطلع ہوتے ہیں اور ہیلن فلورا کے بچے کو اپنا لیتی ہے ۔

فلورا فلورنڈا کا پلاٹ اس اعتبار سے شرر کے اچھے پلاٹوں میں سے ہے کہ اس میں منطقی ربط ، ارتقا ، کشمکش اور تجسس کے عناصر بہ افراط موجود ہیں ۔ واقعات کی ترتیب اور ابواب کی تقسیم میں بھی شرر نے دلچسپی اور فن کے عنصر کو بخوبی مد نظر رکھا ہے ۔ لیکن یہ امر ضرور محل نظر ہے کہ ایک دو مقامات پر واقعات محض اتفاقات کے سہارے آگے بڑھتے ہیں۔

کردار :

"فلورا فلورنڈا" کے اہم کرداروں میں زیاد (جرجیس)، فلورا (زہرا)، فلورنڈا (حلاوہ)، ہیلن اور یولاجیس ہیں ۔ دیگر کرداروں میں امیر عبد الرحمن ، عبد الروف بن اسلام، قاضی ابن زیاد یحییٰ لیثی ، مرجانہ ، پلاجس ، مرتھا ، سنٹ کرسٹین ، الفانسو (ابو مسلم) ، برنینڈو ، مارٹل ، جولیانا، سینٹیاگو ، اورلنڈو وغیرہ شامل ہیں ۔

زیاد کے کردار کی تعمیر پر شرر نے زیادہ توجہ صرف نہیں کی ۔ زیاد ایک مسلمان باپ اور عیسائی ماں کا بیٹا ہے ۔ اسلامی اصولوں اور عقاید پر سختی سے پابند ہے ، وہ سادہ مزاج اور غیور ہے ۔ فلورنڈا جب اسے حلاوہ کے روپ میں بھکانے کی کوشش کرتی ہے تو اس کے کردار اور مستقل مزاجی کے بعض پہلو نمایاں ہوتے ہیں ۔ وہ فلورنڈا کی تمام تر ترغیبات کے باوجود خود کو گناہوں کی دنیا سے بچائے رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ فلورنڈا یا حلاوہ کے مکر و فریب

اور عیسائیوں کے ساتھ اس کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے ۔ اسے اپنی بہن فلورا سے محبت ہوتی ہے اور عیسائیوں کے ساتھ اس کے فرار کی بدولت نفرت بھی۔ یہ کشمکش اور تذبذب زیاد کی شخصیت میں زندگی کی روح کو اجاگر کرتے ہیں ۔ وہ انتقام کی آگ میں سلگتا ہوا یولاجیس اور فلورنڈا کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے ۔ اسی لگن میں اسے جرجیس پادری کا روپ بھی دھارنا پڑتا ہے ۔

بعض مقامات پر شرر نے زیاد کی داخلی کیفیتوں، اندرونی انتشار اور ذہنی کشمکش کو اجاگر کرنے کی اچھی کوشش کی ہے ۔ جو تھے باب میں اسی ادھیڑ بن کی کیفیت کی عکاسی ہے، اسے عیسائی راہبات اور راہبوں کی بے حمائیوں کا اور ان کے عماید کا علم ہے اور وہ یہ سوچ سوچ کر کڑھتا ہے کہ اگر فلورا بھی اسی گروہ میں شامل ہو گئی تو اس کے لیے انتہائی باعث ننگ ہوگا ۔ پانچویں باب میں حلاوہ (فلورنڈا) سے پہلی ملاقات کے بعد بھی زیاد کی داخلی کیفیت کو اس انداز میں نمایاں کیا ہے کہ اندرونی کشمکش سے کردار میں زندگی کی روح دوڑ گئی ہے ۔ شرر لکھتے ہیں :

''اگرچہ حلاوہ کی باتوں نے اور اس کی مصیبت کی داستان نے زیاد کو مجبور کر دیا تھا کہ ہر حیثیت سے اسے اچھا سمجھے اور اس کی نظر فریب صورت اور دلربا آواز نے اور بھی سفارش کی تھی کہ اس پر کسی طرح کا شک نہ کیا جائے لیکن حیرت تھی کہ ایک مسلمان شریف عورت مجھ سے اس قدر جلد کیوں بے تکلف ہو گئی ؟ تاہم دل میں خیال کیا کہ مصیبت انسان کو ہر بات پر مجبور کر دیا کرتی ہے ۔ زیاد کو حلاوہ کے چال چلن اور اس کی پاک دامنی پر ایک گونہ شبہ تھا مگر اس کے دل پر حلاوہ کی صورت نے ایسا قبضہ کر لیا تھا کہ وہ بار بار خود ہی اپنے شبہ کو دور کرتا تھا اور دل میں کہتا تھا کہ ایسی دلفریب صورت پر اس قسم کی بدگمانیاں کرنا گناہ ہے ۔ سچ یہ ہے کہ اس کے دل میں حلاوہ کی محبت پیدا ہو گئی تھی ۔ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اور حلاوہ کی ایک ہی ملاقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ اگر اس وقت اپنے لیے وہ کوئی بی بی تجویز کرتا تو سب سے پہلے اس کا خیال حلاوہ ہی کی طرف جاتا بلکہ شاید حلاوہ کے سوا اور کسی طرف نہ جاتا ۔'' (ص ۵۶)

آٹھویں باب میں ایسے ہی ایک مرحلے پر کردار کی مضبوطی اور اندرونی کشمکش کی تصویر کشی کرتے ہوئے شرر لکھتے ہیں :

''فلورنڈا آج ایسی بن سنور کے بیٹھی ہے اور اس کے حسن میں اس وقت کچھ ایسی کرشمہ خیزیاں تھیں کہ زیاد کے دل میں آئی کہ آج دو گھڑی بیٹھ کے اس کے حسن کی سیر کر لینا چاہیے، لیکن فوراً طبعیت کو روکا اور خیال کیا کہ یہی بیٹھنا قیامت ہے ۔ اتنا خیال کرتے ہی اس نے حلاوہ سے کہا ''کوئی ضروری کام ہو تو فرمائیے میں ٹھہر نہیں سکتا ۔''

حلاوہ : اے ہے تو کیا میرے یہاں بیٹھنے کی قسم کھائی ہے ۔

زیاد : ہاں قسم ہی کھائی ہے ۔

حلاوہ : معاذ اللہ اس بدگمانی کی بھی کوئی انتہا ہے ۔

زیاد : کوئی کام ہو تو جلدی بتاؤ مجھے بیٹھنے کی فرصت نہیں ۔

حلاوہ زیاد کی روکھی صورت دیکھ کے مسکرائی اور بڑھ کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ زیاد نے کسی قدر چیں بجبیں ہو کے کہا ۔ ''دیکھو حلاوہ سنبھلو تم نے پھر اسی دن کی سی بے تکلفیاں شروع کیں ۔'' . . . .

زیاد : تو وہیں بیٹھے بیٹھے کہہ دو ۔ میرے پاس آنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔

فلورنڈا : تو ایسی باتیں یہاں کیونکر کہہ دوں ؟ حمیدہ سامنے بیٹھی ہوئی ہے ادھر دوسرے کمرے میں چلو ۔

زیاد : (ایک ٹھنڈی سانس بھر کے) آہ ! اب ایسے راز و نیاز کا زمانہ نہیں رہا ۔ حلاوہ میں اب اس قابل

نہیں ہوں کہ تنہائی میں تم سے باتیں کروں ۔ میں نے اس روز جس قدر ضبط کیا اب دشوار ہے ، جو کچھ کہنا ہو یہیں کہو ۔

حلاوہ : تو آخر جو بات یہاں کہنے کی نہ ہو اسے کیونکر کہہ دوں ؟ تم تو عجیب طرح کی الٹی باتیں کرتے ہو ۔

زیاد : حلاوہ ! جب مجھے تمہاری طرف سے نا امیدی ہی ہو گئی تو پھر میں ایسی کوئی بات سننا نہیں چاہتا جو تنہائی میں کہنے کی ہو ۔

حلاوہ : اور اگر وہ مایوسی ہی رفع ہو جائے ؟

زیاد : ''کیا ایسا ہو سکتا ہے ؟'' یہ کہہ کے زیاد نے غور سے حلاوہ کی صورت دیکھی جسے مسکرانے کی اداؤں نے بہت ہی دلفریب بنا دیا تھا ۔ مگر پھر کچھ سوچ کے کہنے لگا ''مگر ابھی تو میں تم سے تنہائی میں نہ ملوں گا ۔''

حلاوہ : زیاد یہ بھی نہیں اچھا ہے کہ انسان کسی کی طرف سے ہر وقت بدگمان رہے ۔

زیاد : مجھے تم پر بد گمانی نہیں ہے ، سچ کہتا ہوں ، میں اپنی طرف سے بدگمان ہوں ۔'' (ص ۷۴، ۷۵)

فلورنڈا اور فلورا کے کردار اس ناول میں سب سے زیادہ جاذب نظر کردار ہیں ۔ فلورنڈا میں مکاری، عیاری اپنے حسن پر اعتماد، موقع محل کی نزاکت کا احساس، مقصد براری کے لیے ہر قسم کا طریقہ اختیار کرنا اور اس قسم کی جملہ دیگر صفات موجود ہیں جو ایک عیار اور شاطر عورت میں ہو سکتی ہیں اور اس پر بلا کی خود اعتمادی بھی ہے ۔ اس کی شخصیت اس کے ذاتی مقصد کے تابع ہے ۔ وہ اس قسم کے آداب اور انداز اور لہجہ اختیار کر لیتی ہے جیسا حالات کا تقاضا ہو ۔ اس کی چالیں اتنی گہری ہوتی ہیں اور اس نے اپنے چہرے پر فریب کا اس قدر دبیز خول چڑھا رکھا ہے کہ اس کی اصلیت مشکل سے ہی آشکار ہوتی ہے ۔

''حلاوہ کا لباس اس وقت اس قدر پر تکلف تھا کہ معمول سے زیادہ بدرجہا زیادہ حسین معلوم ہوتی تھی ۔ ریشمی آبی پائجامہ پاؤں میں تھا ، دمشقی کریب کا کرتہ اس کے جسم میں تھا اور اس پر المریا کی اعلیٰ اطلس کا ایک شلوکہ پہنے تھی جس پر سنہرے بیل بوٹوں کا نہایت خوشنما شجر بنا ہوا تھا اور اس پر خاص قرطبہ کی بنی ریشمی زرد خمار سر پر پڑی تھی ۔ ایک طلائی موتیوں کا ہار اس کے گلے میں تھا اور کانوں میں خوش رنگ نیلم کے آویزے لٹک رہے تھے ۔ ملک کے فیشن کے اعتبار سے یہ نہایت ہی پر تکلف لباس تھا اور اس وقت حلاوہ پر خوب پھب رہا تھا ۔

حلاوہ کی صورت سے اس کا سن کم معلوم ہوتا تھا ۔ ایک تجربہ کار قیاس کرنے والا بھی کبھی اس کی عمر بیس بائیس برس سے زیادہ نہ بتا سکتا تھا ۔ کافوری شمع کی روشنی میں اس کے آتشیں رخسار جھلک رہے تھے جن پر خمار کے رنگ کا عکس ایک نئی دلفریبی پیدا کر رہا تھا ۔ خصوص اس وقت مسکرانے میں جو خفیف سرخی اس کے چہرے سے نمایاں ہوتی اور قیامت کر رہی تھی . . . .'' (ص ۵۳، ۵۴)

زیاد سے پہلی ملاقات میں حلاوہ (فلورنڈا) اپنی ملازمہ حمیدہ (ایولینٹ) پر اس وجہ سے برہم ہوتی ہے کہ حمیدہ گھر کے کام کاج میں الجھ کر نماز قضا کر دیتی ہے اس طرح فلورنڈا ، زیاد کے دل پر اپنا پہلا نقش ایک پابند شرع مسلمان عورت کی حیثیت سے ڈالتی ہے ۔ زیاد فلورنڈا کے حسن و جمال کو اور پھر اس کے ان دھلے ہاتھوں کو دیکھ کر ٹوکتا ہے تو ایک لمحے کے لیے فلورنڈا کو بھید کھل جانے کا شبہ ہوتا ہے لیکن فوراً ہی خود کو سنبھال کر بات بنا لیتی ہے ۔ زیاد کو مائل کرنے کے لیے وہ تمام حربے استعمال کرتی ہے ۔ اس موقع پر اس کی گفتگو اور عمل اس کے کردار کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں ۔ اسے ہر لحظہ اپنے مشن کا احساس ہے اور وہ کافی محتاط ہے ۔ اپنی ساتھی نن ایولینٹ کو وہ تنہائی میں بھی اسے فلورنڈا کے نام سے پکارنے کی اجازت

نہیں دیتی - فلورنڈا خانقاہوں کے گھناؤنے ماحول میں رہ کر سرد و گرم زمانہ چشیدہ ہے اور مردوں کی فطرت و نفسیات سے بھی پورے طور پر باخبر ہے اس کا یہ تجربہ بھی اس کی شخصیت کی تعمیر میں کارگر دکھائی دیتا ہے - زیاد کے اعتماد کو زیادہ سے زیادہ بحال کرنے کے لیے شادی کے بعد وہ بہت زیادہ محتاط ہے - زیاد اپنی بہن کو فلورا کے نام سے پکارتا ہے تو فلورنڈا کہتی ہے "مگر تعجب یہ ہے کہ تم بھی فلورا ہی کہتے ہو، زہرہ کیسا اچھا اور کس قدر پیارا نام ہے - میں تو ان کو اسی نام سے یاد کیا کروں گی اور تم بھی اب ان کے کافروں کے نام کو چھوڑ دو -" پھر وہ اپنی حکمت عملی سے زہرہ کے متعلق بھی زیاد کے نظریات کو بدلتی ہے اور ماحول کو اپنا تابع کر لیتی ہے - ایک موقع پر جب زیاد کو پتہ چلتا ہے کہ فلورنڈا نامی کوئی نن گرجے والوں نے اسے دھوکہ دے کر فلورا کو نکال لے جانے کے لیے بھیجی ہے تو وہاں بھی فلورنڈا کی چال کامیاب ہو جاتی ہے اور زیاد کو اس بات کا احساس تک نہیں ہو پاتا کہ جس فلورنڈا کی وہ تلاش کر رہا ہے وہ خود اس کی بیوی حلاوہ ہے - اسی ضمن میں دونوں کے درمیان یہ گفتگو ہوتی ہے :

حلاوہ : اب تو تم کو روز دروز گھر بھولتا جاتا ہے -

زیاد : کیا کہوں ایسے چکر میں پڑ گیا ہوں کہ دیکھو کب نجات ملتی ہے -

حلاوہ : میں دیکھتی ہوں فلورنڈا کو تمھاری اتنی جستجو نہ ہو گی جتنی تم اس کے لیے خاک اڑاتے پھرتے ہو -

زیاد : ہاں مجھے اس کے دیکھنے کا تو بڑا شوق ہے -

حلاوہ : شوق کیسا یہ کہو کہ اس کے لیے بے قرار ہو رہے ہو - دانا پانی چھوٹ گیا ہے -

زیاد : ہوا ہی چاہیے ، تم سے سن چکا ہوں کہ وہ بڑی خوبصورت ہو گی - تم نے بات دل میں لگتی کہی تھی -

حلاوہ : پھر رات کو جو آ کے پڑ رہتے ہو اتنا احسان بھی اس کے لیے اٹھا رکھو -

زیاد : اس کی تو یہ وجہ ہے کہ وہ ابھی تک ملی نہیں - مل جائے گی تو خواہ مخواہ رات کا آنا چھوٹ جائے گا -

حلاوہ : ہاں ہاں حلاؤ ، خوب سا حلاؤ - اب تو تمھارے بس میں ہوں نا - یا تو وہ قول و قسم تھے یا یہ باتیں ، کوئی کسی کا اعتبار کرے ؟" (اتنا کہہ کے حلاوہ آبدیدہ ہو گئی اور اس کی آواز سے بھی معلوم ہوا کہ جی بھر آیا ہے) -

فلورا کو بھائی کے گھر سے نکال لے جانے سے پہلے اس کا فلورا کے ساتھ رویہ اور پھر پیرینیز کی گھاٹیوں میں اسے یولاجس کی خواہشات پوری کرنے کی دھمکی آمیز ترغیب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے - اس ساری عیاری اور مکاری کے باوجود ، جو شروع سے آخر تک فلورنڈا کے کردار میں دکھائی دیتی ہے ، دو مرحلے ایسے بھی آتے ہیں جب اس کا کردار ایک زندہ نسوانی کردار بن جاتا ہے - ایک مرحلہ تو وہ ہے جب زیاد اس سے ابتدائی چند ملاقاتوں کے بعد اس کی ترغیبات گناہ کے دام میں نہیں آتا اور شادی کے بغیر اس کے قرب سے انکار کر دیتا ہے تو جہاں ایک طرف اس کے پندار حسن کو ٹھیس پہنچتی ہے وہاں زیاد کی پاکدامنی اور کردار کی بلندی سے اسے محبت بھی ہو جاتی ہے اور وہ ایک عجیب تذبذب اور کشمکش کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہے - شرر نے اس مرحلے کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے اور یہاں فلورنڈا گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان دکھائی دیتی ہے - دوسرا مرحلہ وہ ہے

جب فلورا یولاجس سے اپنے دامن عفت کو بچانے کے لیے طایطلہ کی خانقاہ میں جانے کا فیصلہ کرتی ہے تو فلورنڈا اسے اس ارادے سے باز رہنے کا مشورہ دیتی ہے، وہ کھل کر فلورا کو یہ بھی نہیں بتا سکتی کہ خانقاہوں کا ماحول ایسا ہے کہ فلورا کسی طرح خود کو نہیں بچا سکے گی اور اس کی نسوانیت یہ بھی گوارا نہیں کرتی کہ فلورا کو اسی طرح نادانستگی میں تباہی کے منہ میں جانے دے۔ اسی تذبذب کی حالت میں وہ دبی زبان سے اسے منع کرتی ہے اور اس کے چلے جانے کے بعد وہ کسی طرح بھی اپنی ... کو ... نہیں پا سکتی اور بدر ... کو سارا راز بتا دیتی ہے۔ اس اعتبار سے فلورنڈا کا کردار ... کردار بن جاتا ہے۔

فلورا کا کردار اپنے اندر ایک ... کشمکش لیے ہوئے ہے۔ اس میں شرم و حیا، عفت و عصمت، سادگی اور خلوص کا ... وہ ... اسے ایک مسلمان گھرانے اور اسلامی ماحول سے ملا لیکن ماں کی تربیت نے اسے عیسائیت کی طرف مائل کر دیا۔ دونوں عقیدوں کی باہمی کشمکش بھی اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسے بھائی سے محبت ہے، نہ وہ بھائی سے جدا ہونا چاہتی ہے اور نہ ہی اسے یہ گوارا ہے کہ اس کی خاطر اس کا بھائی کسی دکھ میں مبتلا ہو، لیکن نجات اخروی کی خاطر وہ فلورنڈا کے ساتھ نکل بھاگتی ہے۔

پیرینیز کی گھاٹیوں میں اس پر پادریوں کی اصلیت آشکار ہونے لگتی ہے، وہ بھائی کا گھر چھوڑ کر سخت نادم ہے، نہ واپس جا سکتی ہے اور نہ موجودہ گناہ آلود ماحول سے اس کا نباہ ہو سکتا ہے۔ وہ عزت کو دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز جانتی ہے لیکن جس ماحول میں وہ پہنچ چکی ہے وہاں اس شے کی کوئی قیمت نہیں۔ اس مرحلے پر فلورا کے کردار میں ارتقا دکھائی دیتا ہے۔

پیرینیز کی گھاٹیوں سے نکل کر طلیطلہ کی خانقاہ میں پہنچنے کے بیسویں دن تک اس کی جذباتی کشمکش میں قدرے ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس کے بعد وہ مظلومی اور بیکسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یولاجس سے انتقام اور وہاں سے فرار یہ بھی اس کے ارتقا پذیر کردار کے زیر اثر ہے۔ بھائی کے کپڑے ایک غار میں دیکھ کر اس کی بھائی سے محبت پھر عود کر آتی ہے اور اب وہ اپنے دکھ بھول کر بھائی کا انتقام لینے چل نکلتی ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ فلورا کا کردار اس اعتبار سے اپنے اندر کشش رکھتا ہے کہ شروع سے آخر تک قاری کی ہمدردیاں اس کے ساتھ وابستہ رہتی ہیں اور اس کی شخصیت میں جملہ تبدیلیوں کے لیے منطقی اور نفسیاتی جواز موجود ہے۔

یولاجس کا کردار شروع سے آخر تک اپنی جملہ صفات برقرار رکھتا ہے۔ اس کی سازشیں بدنیتی، مکاری، مذہبی لبادے میں گناہ آلود زندگی، موقع شناسی اور ابن الوقتی شروع سے آخر تک قائم ہیں۔ شرر نے اس کے کردار اور شخصیت میں مطابقت پیدا کر دی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یولاجس شیخ علی وجودی کا ہم پلہ ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ اس میں بھی بعض صفات شیخ علی وجودی کی طرح کی ہیں اگرچہ شرر نے اس کی کردار نگاری پر اتنی توجہ نہیں دی جتنی کہ شیخ علی وجودی کی کردار نگاری پر دی ہے۔

بسلن ایک سادہ لوح، صاف دل، غیور، باضمیر اور نیک طینت شہزادی ہے۔ وہ نڈر بھی ہے اور جس بات کو وہ اپنے ذہن میں درست سمجھتی ہے اسے بے دھڑک کر گزرتی ہے۔ فلورا سے اس کی محبت اور پھر زیاد سے محبت اسے بڑے سے بڑا کام بھی کر گزرنے پر آمادہ کر دیتی ہے

اور وہ اپنے مستقبل کے بارے میں رتی بھر سوچے بغیر زیاد کے ساتھ نکل بھاگتی ہے اور آخر دم تک پورے خلوص کے ساتھ زیاد کا ساتھ دیتی ہے۔

مکالمے :

ناول کی زبان معیاری اور سادہ ہے۔ کرداروں کے مکالمے ان کی شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور ان کی داخلی کیفیتوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مکالموں کے بیشتر نمونے کردار نگاری کے ضمن میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ یولاجیس، فلورا، فلورنڈا اور زیاد و ہملن کے باہمی مکالمے اس اعتبار سے بہتر مکالمے ہیں کہ ان میں سرر نے غیر ضروری ادبیت یا شاعری کو راہ نہیں پانے دیا۔

منظر نگاری :

فلورا فلورنڈا میں شرر کو مرقع کشی اور منظر نگاری کے اکثر مواقع ملے ہیں اور انہوں نے ان مواقع سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ چند اقتباسات درج ذیل ہیں :

''شہر طلیطلہ اور کوہ طلیطلہ کے درمیان جو کوہستانی سلسلہ چلا گیا ہے اس میں اکثر پہاڑ ایسے ہیں جن پر قدیم الایام کی کچھ نہ کچھ یادگاریں ضرور نظر آتی ہیں اور یاد دلاتی ہیں کہ کبھی رومیوں کی سطوت و عظمت کس درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔ ان بلند ٹیلوں میں ایک مقام ہے جس نے چاروں طرف مختلف برہنہ پہاڑیوں کے جمع ہو جانے اور بڑی بڑی سیاہ چٹانوں کے لٹک آنے کی وجہ سے بہت ہی ہیبتناک وضع پیدا کر لی ہے۔ جا بجا جلی ہوئی خاکستر اور چٹخی ہوئی سلیں بکثرت پڑی ہیں۔ ان میں دیر کے مطالعے کے بعد کسی مسمار شدہ عمارت کے آثار نظر آنے لگتے ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے شاید عمارت کسی کبریتی مادے سے اڑائی گئی ہے۔ مقام ایسا مہیب واقع ہوا ہے کہ رات تو رات دن کو بھی اگر انسان یہاں سے گزرتا ہے تو بے اختیار رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور چاہے وہ دل کا کیسا ہی مضبوط ہو اس جگہ کی خوف بھری ہوئی فضا اسے ڈرا دھمکا کر بزدل بنا دیتی ہے۔

یہ سنگستانی مقام چونکہ ایک آباد اور قدیم شہر کے جوار میں واقع ہے، لہذا ممکن تھا کہ یہاں اکثر آدمیوں کا گزر ہوتا رہے مگر اس کی رعب دار ہیئت نے لوگوں کو اس قدر خائف کر دیا ہے کہ ہر شخص ادھر آتے ڈرتا ہے۔ چرواہے جو مویشیوں کو لے کر ادھر آ نکلتے ہیں وہ بھی ان سیاہ ٹیلوں کی صورت دیکھ کر دور ہی سے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ الغرض لوگوں کے دلوں میں اس مہیب مقام کا اثر اس قدر بیٹھا ہے کہ امید نہیں کہ برس میں کبھی ایک دفعہ بھی انسان کا یہاں گزر ہوتا ہو۔''

اس خوفناک منظر کا تفصیلی نقشہ پیش کیا ہے اور پھر لکھا ہے :

''آخر ایک دن رزریق اپنے مصاحبوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر اس برج کی طرف روانہ ہوا۔ قریب جا کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ برج ایک اونچی پہاڑی پر قائم ہے اور چاروں طرف سے اسے اونچی نیچی چٹانیں اور چھوٹے بڑے ٹیلے گھیرے ہوئے ہیں۔ برج کی دیواریں زبرجد، سنگ مرمر کی ہیں اور ان میں بڑی صناعی سے نقش و نگار بنائے گئے ہیں، جو آفتاب کی کرنوں سے خوب چمکتے ہیں۔ راستہ ایک پتھر میں کاٹ کر بنایا گیا ہے۔''

اسی واقعے سے متعلق یہ بیان ملاحظہ ہو :

''بادشاہ اور اس کے ہمراہیوں نے پھر ان تصویروں کو غور سے دیکھا تو یکایک جنگ کا ہنگامہ سنائی دیا۔ آنکھوں کے آگے ایک تیرگی معلوم ہوئی اور اس تیرگی میں دھندلا دھندلا یہ نظر آیا کہ ان اجنبی سواروں کی تصویروں نے حرکت کرنا شروع کی اور یکایک وہ کاغذ جنگ کا مرقع بن گیا۔ اب ان لوگوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ایک بڑا میدان نظر آنے لگا جس میں عیسائی اور مسلمان کشتی جانکاہ لڑائی میں مشغول تھے۔ گھوڑوں کے دوڑنے اور قرنا و بوق پھنکنے، جلاجل کے جھنجھنانے اور ہزارہا طبل پر زور زور سے چوبیں پڑنے کی صدائیں کانوں میں آتی تھیں، شمشیر، گرز و تبر کی چمک، تیروں کے اڑنے کا سناٹا، نیزوں اور برچھوں کی کھٹا کھٹ

سب سامان جنگ آنکھوں اور کانوں پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ آخر نظر آیا کہ عیسائی اپنے حریف کے سامنے ترساں و لرزاں ہیں۔ مسلمان ان پر پل پڑے اور دم بھر میں سب کو مار کر منتشر کر دیا۔ صلیبی جھنڈا سر نگوں تھا اور ہسپانیہ کا علم قدموں کے نیچے پامال۔ ہوا میں خوشی کے نعرے، غیظ کی چیخیں اور دم توڑنے والوں کی آہیں گونج رہی تھیں۔"

مندرجہ بالا چند نمونوں سے اس ناول میں شرر کی حسین منظر نگاری اور مرقع کشی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ ناول شرر کے مقبول ترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ شرر نے ہی حسن کاری سے کام لیتے ہوئے ناول میں کوئی ایسا کمزور پہلو نہیں پیدا ہونے دیا جو اس کے معیار، دلچسپی، اثر آفرینی اور مقبولیت پر اثرانداز ہو سکے۔

۶۔ ایام عرب

"ایام عرب" شرر کے تاریخی ناولوں میں اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں شرر نے دور جاہلیت کی زندگی اور ماحول کو زندہ صورت میں پیش کرنے کے لیے جملہ وسائل سے کام لیا ہے اور بہت حد تک اس عہد آفرینی کی کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔ یہ ناول دو جلدوں میں شائع ہوا اور کل تیس ابواب پر مشتمل ہے۔ باوجودیکہ شرر نے ماحول کی عکاسی اور فضا سازی کی طرف زیادہ توجہ دی ہے، ناول کے پلاٹ کی چستی، ارتقا اور دلچسپی برقرار رہی ہے۔

پلاٹ:

پہلے باب میں دور جاہلیہ کے مشہور بازار "سوق عکاظ" کی مختلف رونقوں اور تفریحات کو اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ تاریخ بھی قصے کی سی شیرینی لیے ہوئے ہے۔ مختلف قبائل، مختلف تفریحات، مشہور شعرائے عرب کے مشاعرے اور جاہلیت کے مذاق کے مطابق چھیڑ چھاڑ کے واقعات اس انداز میں پیش کیے ہیں کہ صدیوں پہلے کی اس تہذیب کے نقوش چشم تخیل کے سامنے ابھرنے لگتے ہیں۔ انہیں تفریحات میں سے ناول کا اصل پلاٹ جنم لیتا ہے اور مشاعرے کے سامعین میں سے دو عذری نوجوان عمرو اور زہیر سے تعارف ہوتا ہے۔ زہیر کی حبیبہ بنت نعمان (شاہ حیرہ کی بیٹی) سے محبت اور عمرو کا حلیمہ بنت حارث اعرج سے غائبانہ عشق دلچسپی کے عنصر کے ساتھ پلاٹ کا آغاز کرتا ہے۔ اس باب کے آخر میں طلح بن مرہ کلبی کی شخصیت بھی سامنے آتی ہے اور خولہ بنت عمیر بن عامر تغلبیہ سے بھی تعارف ہوتا ہے۔ خولہ عمرو کو اپنے باپ کی بیویوں میں ورثے میں ملی تھی۔ خولہ کا عمرو کے خیمے سے برہمی کے انداز میں کہیں نکل کر چلے جانا تجسس پیدا کرتا ہے۔ دوسرے باب میں طلح اور خولہ دونوں اتفاقاً ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں اور دونوں زہیر اور عمرو سے اپنا اپنا انتقام لینے کے لیے ایکا کر لیتے ہیں۔ طلح اور خولہ کی سازش سے بے خبر یہ دونوں سادہ دل اور عاشق مزاج دوست طلح کے فریب میں آ جاتے ہیں اور اس کے ہمراہ حارث اعرج کے ملک کی طرف چل پڑتے ہیں۔

تیسرے باب میں شاہان حیرہ و غسان کی سلطنتوں کے تاریخی پس منظر سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ مزید کرداروں مثلاً طلح کی کنیز مرجانہ، حلیمہ، حارث کی ماں ماریہ، مشہور شاعر عرب لبید، شاعر عروہ وغیرہ سے بھی تعارف ہوتا ہے۔ اس باب میں پلاٹ ارتقا کے مراحل طے کرتا ہے۔ طلح اور خولہ اپنی سازش کے ایک مرحلے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، خولہ شاہ حارث

کے مصاحبین خاص میں شامل ہو جاتی ہے - چوتھے باب میں حلیمہ اور عمرو کا ڈرامائی انداز میں آمنا سامنا ہوتا ہے اور عمرو کا عشق محبوب کی جھلک دیکھ کر اور شدت اختیار کر جاتا ہے - اس باب میں سازش کی دوسری کڑی بھی کامیاب ہو جاتی ہے اور حارث، نعمان بن منذر کے پاس حبیبہ کے لیے پیغام بھیجتا ہے - تجسس کا ایک عنصر ابھرتا ہے - پانچویں باب میں حلیمہ اور عمرو کا ایک بار پھر آمنا سامنا ہوتا ہے اور اسی باب میں نعمان کی طرف سے منظوری کا جواب آ جاتا ہے - اب یہ امر قاری کو متجسس بناتا ہے کہ آیا حبیبہ اور حارث کی شادی ہو جائے گی، اس صورت میں حبیبہ اور زبیر کا رد عمل کیا ہوگا، عمرو نے زبیر سے جو وعدہ کیا ہے اس کے ایفا کی کیا صورت ہوگی ؟

چھٹے باب میں نعمان کی محبوبہ زینب، نعمان کی ماں سلمیٰ اور حبیبہ کے کردار سامنے آتے ہیں اور اس باب میں پلاٹ مزید ترقی کرتا ہے، واقعات نیا رخ اختیار کرتے ہیں اور سلمیٰ، زینب اور کلثوم کی کوشش سے نعمان حارث کے ہدایا واپس بھیجتے ہوئے حبیبہ کا رشتہ دینے سے انکار کر دیتا ہے -

ساتواں باب چھٹے باب کے واقعات کا رد عمل ہے اور حارث پوری تیاری سے نعمان پر لشکر کشی کے لیے اس کی سرحدوں پر پہنچ جاتا ہے - آٹھویں باب میں نعمان کی جوابی تیاری ہے، نویں باب میں حارث کی فوج کے میدان میں اترنے کا منظر ہے اور یہیں اد ب نیا واقعہ یہ رونما ہوتا ہے کہ عمرو نے افسران فوج اور سرداروں کی موجودگی میں حلیمہ کو گود میں اٹھا لیا ہے - اس موقعے پر آ کے خولہ کی موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے، حالات قدرے پیچیدگی اختیار کرنے لگتے ہیں، دلچسپی بڑھتی ہے اور حلیمہ کی عمرو سے شادی کا انحصار میدان جنگ میں عمرو کی کارگزاری پر ٹھہرتا ہے - اس باب کے آخر تک پہنچتے پہنچتے حارث عمرو کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے، طلح کی چال کا ایک حصہ نا کام ہوتا دکھائی دیتا ہے جس کا تعلق خولہ کے انتقام سے ہے -

دسویں باب میں نعمان شکست کھا کر قتل ہو جاتا ہے لیکن حبیبہ ہاتھ نہیں آتی - عین اس موقع پر جبکہ میدان جنگ سے کئی میل دور حارث کے سپاہی طلح کی سرکردگی میں حبیبہ کو زبردستی حارث کے پاس اٹھا لانے کی کوشش کرتے ہیں، پلاٹ موڑ مڑتا ہے، زبیر حبیبہ کو گھوڑے پر بٹھا کر لے اڑتا ہے -

گیارھواں باب تذبذب لیے ہوئے ہے - حارث نے عمرو کی حلیمہ سے شادی کی اجازت دے دی ہے لیکن عمرو کو اپنے دوست سے کیا ہوا وعدہ یاد ہے - اسی حالت میں واقعات پھر تیزی سے بدلتے ہیں اور زبیر حارث کے کیمپ میں گرفتار ہو جاتا ہے - قاری ہر سطر پورے انہاک سے پڑھتا ہوا آگے بڑھتا ہے - حلیمہ کی کوشش سے زبیر اور عمرو دونوں رات کی تاریکی میں کیمپ سے نکل بھاگتے ہیں - اب حلیمہ کے بارے میں تجسس پیدا ہوتا ہے - قاری اس کے آئندہ منصوبے سے باخبر ہونا چاہتا ہے - تیرھویں باب میں حلیمہ اور مرجانہ بھی ڈرامائی طور پر اسی تالاب کے کنارے جا پہنچتی ہیں جہاں عمرو، زبیر اور حبیبہ ہیں - حلیمہ اور مرجانہ کے اچانک پہنچ آنے سے طلح اور خولہ کی ایک اور سازش نا کام ہو جاتی ہے جو انھوں نے حبیبہ کو اغوا کر لے جانے کے لیے تیار کی تھی - اب عشاق کے یہ دونوں جوڑے اپنی مراد کو پہنچ چکے ہیں اور یہیں ناول کا پہلا حصہ ختم ہو جاتا ہے - واقعات کو آگے بڑھانے کے لیے اور پلاٹ میں تسلسل

پیدا کرنے لیے شرر ناول کے دوسرے حصے میں طلح اور خولہ کی بدطینتی کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں۔

پندرہویں باب سے آخری (اکسویں) باب تک کے واقعات کے سلسلے میں عمرو، زبیر، حسنہ اور حلیمہ پس منظر میں چلے جاتے ہیں لیکن طلح اور خولہ کی منافقانہ مہم جاری رہتی ہے۔ اس کے سلسلے میں نئے نئے واقعات رونما ہوتے ہیں، چودہویں باب میں طلح اور خولہ کی زید بن عدی سے ملاقات ہوتی ہے، پندرہویں باب میں وہ زید کو اس کے باپ عدی بن زید کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے منذر بن نعمان کے خلاف اکساتے ہیں۔ سولھویں باب میں طلح اپنے منصوبے کے مطابق منذر بن نعمان کے پاس جا پہنچتا ہے، اس کی ہمدردیاں حاصل کرتا ہے پھر اسے ممنون احسان کر لیتا ہے۔ اس باب میں منذر کی بہن "ہند" سے بھی تعارف ہوتا ہے جو اداس بن قبیصہ کے خوف سے محل چھوڑ کر تبدیل مذہب کر کے کلیسا میں پناہ لینے چلی جاتی ہے۔

سترہویں باب میں منذر سے متعلق واقعات تیزی سے بدلتے ہیں، ایاس حیرہ میں داخل ہوتا ہے، وہ دربار عجم سے حیرہ کا فرما روا مقرر ہو کر آتا ہے، حالات دیکھ کر وہ اصلیت چھپاتا ہے اور غلط خبر مشہور کرتا ہے کہ منذر کی فرمانروائی کا حکم لایا ہے، لیکن طلح اور خولہ کی سازشیں پانسہ الٹ دیتی ہیں۔ اس باب میں ڈرامائیت کا عنصر زیادہ ہے، اٹھارہویں باب میں پلاٹ موڑ کھاتا ہے، اداس خود ہی اپنے دام میں آ جاتا ہے اور جو جال اس نے منذر کے لیے بچھایا تھا خود اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ منذر بن نعمان حیرہ کا تخت سنبھال لیتا ہے۔ انیسویں باب میں پلاٹ کی پھر نئی اٹھان شروع ہوتی ہے۔ طلح خولہ اور زید بن عدی منذر کے سفیروں کی حیثیت سے پائے تخت کسریٰ کی طرف روانہ ہیں لیکن یہ تینوں اپنی اپنی ذاتی اغراض رکھتے ہیں اور تینوں کو منذر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بیسویں باب میں شیریں ملکہ ارمن کا کردار سامنے آتا ہے۔ منذر کے تین مکار سفیروں میں سے طلح کوہ قاف کی شکارگاہ تک جا پہنچتا ہے اور شیریں کو شیشے میں اتارتا ہے۔ اکیسویں باب میں خسرو اور شیریں کی محبت کا قصہ ضمنی قصے کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ بائیسویں باب میں دربار خسروی کے بعض واقعات کے بیان کے ساتھ طلح کو خسرو پرویز تک پہنچ دیا گیا ہے اور طلح نے اپنی عیاری اور مکاری کے ذریعے نہ صرف خسرو پرویز بلکہ درباریوں اور امراء کو رام کیا اور تئیسویں باب میں نہ صرف زید بن عدی کو خسرو پرویز کے دربار میں اہم مقام مل گیا بلکہ انھوں نے ایاس بن قبیصہ کے خلاف بھی پوری فضا تیار کر لی۔ چوبیسویں باب میں واقعات پھر تیزی سے ارتقا پذیر ہیں۔ طلح ملکہ مریم کو بھی فریب دیتا ہے اور ایک راہبہ ملکہ مریم کو زہر دے کر شیریں کے ملکہ عجم بنائے جانے کے لیے راہ ہموار کر دیتی ہے۔ پچیسویں باب میں واقعات میں ٹھہراؤ پیدا ہو جانے کا امکان تھا لیکن شیریں کو ملکہ عجم بنانے کے بعد اس باب میں فرہاد کے کردار کو سامنے لا کر شرر نے پھر سے ایک کشمکش کی صورت پیدا کر دی ہے۔ مدائن سے قصر لے ستون تک نہر بنانے کا کام فرہاد کے سپرد کر دیا گیا ہے اور وہ کوہکنی کر کے امتحان عشق و وفا میں پورا اترنے میں کوشاں ہے۔ اسی باب میں یہ عقدہ بھی کھلتا ہے کہ ملکہ مریم کو زہر دینے والی راہبہ خولہ تھی۔ چھبیسویں باب میں طلح اپنے اصل مقصد کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ وہ خسرو پرویز کو حبیبہ کے حسن کا دیوانہ بنا دیتا ہے، پلاٹ اب پھر اصل بنیادی واقعات کی طرف مڑتا ہے۔ منذر حبیبہ کے سلسلے میں خسرو کے پیغام کے جواب میں معذوری بھی ظاہر

کرتا ہے اور اسے عربوں کی غیرت کے منافی بھی قرار دیتا ہے ۔ ستائیسویں باب میں واقعات کا رخ اصل مرکز کی طرف مڑتا ہے، منذر قبائل عرب کو اپنی امداد پر آمادہ کرنے کے لیے صحرائے عرب کی خاک چھانتا پھرتا ہے اور بالآخر وہیں آ پہنچتا ہے جہاں زہیر، عمرو، حبیبہ اور حلیمہ موجود ہیں ۔ اپنے بیوی بچوں کو وہاں چھوڑ کر خسرو کے دربار میں پہنچ کر قتل ہوتا ہے ۔ اٹھائیسواں باب فرہاد کی موت کے ضمنی واقعے پر مبنی ہے، اس کا اصل پلاٹ کے ساتھ صرف اسی قدر ربط ہے کہ اس میں خولہ اور طلح کی عیاری، سازش اور بد طینتی کا رونا ہے ۔ انتیسواں باب عجمی لشکر کی قبائل عرب سے مقابلے کی تیاری سے متعلق ہے اور تیسویں باب میں سارے واقعات سمٹ سمٹا کر انجام بخیر ہو جاتا ہے ۔ ساسانی لشکر نہ صرف بری طرح شکست کھا کر تباہ ہوتا ہے بلکہ طلح اور خولہ بھی اپنے کیفر کردار کو پہنچ جاتے ہیں ۔

ایام عرب کے مرکزی کردار اگر عمرو، زہیر، حلیمہ اور حبیبہ تصور کیے جائیں تو ناول کے پہلے حصے اور دوسرے حصے میں کمزور سا باہمی ربط رہ جاتا ہے لیکن اگر طلح اور خولہ کو مرکزی کردار تصور کیا جائے جیسا کہ وہ اس ناول کے دونوں حصوں پر چھائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ دونوں حصے ایک دوسرے کے ساتھ پورے طور پر مربوط ہیں بلکہ ناول کا پورا پلاٹ اپنے تمام ضمنی واقعات اور تمام نشیب و فراز کے باوجود مربوط اور ارتقا پذیر پلاٹ دکھائی دیتا ہے ۔ ان مرکزی شخصیتوں سے متعلق جملہ واقعات کا ایک دوسرے سے منطقی ربط ملتا ہے ۔

کردار :

اس ناول کے بڑے کرداروں میں طلح ، خولہ ، حلیمہ ، حبیبہ ، زہیر ، عمرو ، نعمان ، حارث ، زند ، خسرو اور شیریں شامل ہیں ۔ دیگر کرداروں میں مرجانہ ، ایاس ، ملکہ مریم ، فرہاد ، سلمیٰ ، زینب ، کلثوم ، ماریہ ، منذر اور ہانی وغیرہ شامل ہیں ۔ علاوہ ازیں بعض تاریخی شخصیتوں کے نام بھی مختلف وقفوں کے لیے سامنے آئے ہیں جن میں کچھ ایام جاہلیت کے شعرا اور کچھ مختلف قبائل عرب کے سردار ہیں ۔

طلح کا کردار اپنی کیادی ، عیاری، سازشوں، خبث باطن اور بے رحمی کی وجہ سے پورے ناول پر چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ اس کے مکالمے ہر جگہ اس کی شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ ہیں ۔ وہ موقع محل کے مطابق بہروپ بھرتا ہے ۔ بظاہر عاجزی اور انکسار ، خلوص اور ہمدردی کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے لیکن اپنے مشن کو نہیں بھولتا ۔ اس کی چالیں بڑی گہری ، دور رس اور سوچی سمجھی ہوئی ہوتی ہیں ۔ زہیر سے انتقام لینے کے لیے وہ عمرو اور زہیر کا قرب حاصل کرتا ہے ۔ حسن اتفاق سے اسے اپنی طرح کا ایک ساتھی (خولہ) بھی مل جاتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنے منصوبوں کو بہ احسن طریق عملی جامہ پہناتا ہے ۔ ضرورت پڑنے پر وہ جھوٹی قسمیں بھی کھا سکتا ہے، فرضی داستانیں بھی سنا سکتا ہے، محبت بھی جتا سکتا ہے، وفاداری اور فرماں برداری کا یقین بھی دلا سکتا ہے اور مقصد پورا ہونے کے بعد اسے کسی وعدے ، کسی قسم ، کسی دوستی کا لحاظ نہیں رہتا ۔ طلح موقع شناس ہے ، موقع کی نزاکت کے مطابق عمل کرتا ہے ۔ وہ ایک ایسا شاطر ہے جسے بازی جیتنے کے بجز اس امر کی پروا نہیں ہوتی کہ اس کا کون سا مہرہ اس بساط پر کس جگہ پٹ جاتا ہے ۔ اس کے کردار کی ایک جھلک کے لیے اس کا ایک مکالمہ

درج کیا جاتا ہے جس کا مخاطب زید ہے :

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم لوگوں نے کیسے موم کے دل پائے ہیں کہ ذرا میں پگھل جاتے ہیں ۔ میرے دل پر نہ کسی کی چشم فتان کا اثر ہوتا ہے اور نہ کسی کی نگاہ ناز کا ۔ حسن و جمال سے میں بس اسی طرح فائدہ اٹھاتا ہوں جس طرح کوئی ایک خوبصورت پھول کو سونگھ کے پھینک دے ۔'' (انیسواں باب)

اسی باب میں وہ ایک جگہ خولہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے :

''ہوشیار اور عقلمند آدمی کو کبھی کسی پر ترس نہ آنا چاہیے ۔''

خولہ کا کردار اس ناول کا دوسرا بڑا کردار ہے ۔ وہ اپنی بہت سی عادات کے اعتبار سے طالح سے ملتی جاتی ہے لیکن نہ تو وہ طالح جیسی چالاک و عیار ہے اور نہ ہی طالح جتنی سفاک ۔ خولہ عمرو سے انتقام لینے کے لیے ہر اچھے برے کی تمیز کو اٹھا دیتی ہے ، طالح کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے وہ خود کو مظلوم ظاہر کرتی ہے اور اسے رام کرنے کے لیے اپنے عورت پن سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہے ۔ وہ طالح کی سکیموں کو عملی جامہ پہنانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے ، اور تمام منصوبوں کی تکمیل کے لیے بے چون و چرا کام کرتی ہے ، یہ اس کے اپنے جوش انتقام کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے اور طالح کی شخصیت کا اثر بھی ۔ بہر کیف خولہ حصول مقصد کے لیے ہر روپ دھار لیتی ہے ۔ ایاس کو فریب دینے کے لیے وہ خرادہ کا ، مریم کو زہر دینے کے لیے راہبہ کا اور فرہاد کو فریب دینے کے لیے بڑھیا کا روپ اختیار کر لیتی ہے ۔ مکر و فریب ، جھوٹ دغا اور بے حیائی کے ان اوصاف کے باوجود کبھی کبھی خولہ میں نسوانیت کی جھلک ابھر آتی ہے اور یہی وہ لمحات ہیں جب اس کے کردار میں چمک اور جان پیدا ہو جاتی ہے ۔ خولہ اپنی جملہ عیاری کے باوجود احسان مندی کا جذبہ رکھتی ہے اور اپنی تمام سفاکی کے باوجود سینے میں عورت کا دل لیے ہوئے ہے ۔ فرہاد کو فریب دے کر خودکشی کرا دینے کے بعد وہ طالح سے کہتی ہے :

''سچ تو یہ ہے کہ میں نے تمہارے کہنے سے فرہاد کی جان لی ورنہ مجھے اس کے جوش بے خودی اور اس کے سچے عشق پر بڑا ترس آیا ۔''

طالح کا جواب دونوں کے کرداروں کے فرق کو ظاہر کرتا ہے ۔ طالح زید کے قتل کا منصوبہ بناتا ہے تو اس موقع پر خولہ کا رد عمل اس کے کردار میں جان ڈال دیتا ہے وہ کہتی ہے:

''اور اس کے احسانوں کو بھول جاؤ گے ، اس دشت بے آب و گیاہ کو یاد کرو جہاں ہم دونوں تشنہ لبی کی تکلیف سے زمین پر پڑے ایڑیاں رگڑ رہے تھے ، اتنی بھی طاقت نہ تھی کہ زبان سے العطش پکاریں اور زید ایک فرشتہ بن کے آیا تھا اور ہماری جان بچائی تھی ۔''

طالح کا جواب طالح کے کردار کی تکمیل کر دیتا ہے ۔

آخری باب میں خولہ کا کردار جاندار کردار بن جاتا ہے جب وہ دم توڑتے ہوئے اپنے ماضی پر نظر ڈالتی ہے ۔ ناکامی کا اعتراف کرتی ہے ، طالح کی تقلید میں اپنے آپ کو برباد کر لینے کا احساس اسے بے چین کر دیتا ہے ۔ شرر نے اس مقام کو خوبصورتی سے نبایا ہے ۔

شہزادی حلیمہ کا سراپا بیان کرتے ہوئے شرر لکھتے ہیں :

''قصر کی کھڑکی میں کھڑی لڑکی کا رنگ خوب کھلتا ہوا گندم گوں ہے ۔ گول چہرہ، چوڑی اور کشادہ پیشانی، باریک اور نہایت خوبصورتی سے خم کھاتی ہوئی بھویں ۔ مستانہ اور بڑی بڑی غزالان دشت کی سی آنکھیں جن میں قدرت نے گویا خود ہی سرمہ لگا دیا ہے اور ان پر لمبی اور نکیلی پلکوں کا

ایک شرم کی ادا سے جھکا رہنا، مدور اور سانچے میں ، ڈھلی ہوئی ناک اور اس کے نیچے نہ بہت چوڑے اور نہ بہت پتلے سرخ ہونٹوں کا قدرتی اور پیدائشی تبسم، ہنستے وقت خوبصورت اور پیارے چھوٹے دہانے کے اندر سے بجلی کی طرح دانتوں کا چمک جانا، گالوں سے عنفوان شباب کے چراغ کا لو دینا، ابھرا ہوا سینہ، بھرے بھرے دست و بازو، پتلی کمر اور بوٹا سا قد، یہ سب کچھ ایسی چیزیں ہیں کہ ممکن نہیں کوئی ایک نگاہ دیکھے اور دیکھتا نہ رہ جائے۔

صورت تو خدا نے اچھی دی ہے مگر بانکی وضع جس میں سادگی اور تکلف، بناؤ بگاڑ سب ہی کچھ ملے ہوئے ہیں اس کے سڈول جسم اور ساری صورت پر کچھ ایسی پھبت رہی تھی، کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ آدھے بالوں سے تو چھوٹی چھوٹی چوٹیاں گوندھ کے جمدیا پر ایک خوبصورت جوڑا بنایا گیا ہے جس پر اس وقت کل شام کے مرجھائے ہوئے پھول نسون سمن . . . ہوئے ہیں اور آدھے بال دو حصوں میں بانٹ کے پیٹھ پر ادھر ادھر ناگنوں کی طرح کمر تک لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک نہایت ہی نازک گلابی رنگ کے ریشمی کپڑے کا کرتہ زیب تن ہے اور کمر کے نیچے تک لٹکا ہوا ہے جس کے نیچے نیلے شگفتہ رنگ کے اطلس کی ریشمی اور زرتار ازار ہے۔ سر پر ایک زرد رنگ کا رومال پڑا ہوا ہے مگر اس قدر پیچھے ہٹا ہے کہ پیشانی کے بال کھلے ہیں جن میں ایک بڑا ہیرا لٹکا ہے اور اس وقت آفتاب کی روشنی میں ایک روشن ستارے کی شعاعیں دے رہا ہے۔ بازوؤں میں بازو بند اور گلے میں مونگے اور موتیوں کے ہار پڑے ہیں۔ نازک اور گول گول کلائیوں میں سونے کے کنگن جو نہایت بھدے ہیں سے مرصع کیے گئے ہیں اور پتلی پتلی خالی انگلیوں میں انگوٹھیاں ہیں۔ یہ شہزادی حلیمہ ہے جس کے حسن کا شہرہ دور دور تک ہے۔"

اسی قسم کا سراپا یوم حلیمہ کے موقع پر بھی بیان کیا گیا ہے جب شہزادی فوج کو میدان جنگ میں اتارتے ہوئے سرداروں کے گلے میں ہار ڈالتی اور عطر لگاتی ہے۔ حلیمہ کے کردار میں شرر نے ابتداً شرم و حیا کے عنصر کو خصوصیت سے ابھارا ہے۔ حلیمہ اور عمرو کا جب پہلی مرتبہ آمنا سامنا ہوا تو حلیمہ عمرو کی نظروں کی تاب نہ لا کر کھڑکی سے سر اندر کر لیتی ہے، شرر لکھتے ہیں :

"لیکن جھار کھسک کر سر سے محل کے نیچے گر پڑی اور بدحواسی میں دونوں طرف کی کاکلیں سینے اور شانے پر بکھر گئیں، چہرہ پسینے پسینے ہوگیا دونوں گوشوارے تاروں کی طرح چمک اٹھے، جس طرح گرد و جوار کی ریگ میں کندن دمکتا ہے اسی طرح اس وقت اس کے پسیجے ہوئے چہرے پر نمی کے ذرات دمک اٹھے جس پر شرم و ندامت ایک اور رنگ پھیر رہی تھی۔"

دوسری مرتبہ دربار میں اور تیسری مرتبہ یوم حلیمہ کے موقع پر بھی یہی کیفیت ہوتی ہے لیکن جب عمرو نعمان کے خلاف بہادری کے جوہر دکھا کر لوٹتا ہے تو وہ بے اختیار اس سے لپٹ پڑتی ہے۔ حلیمہ میں عرب کی ایام جاہلیہ کی شہزادیوں کی شجاعت اور صاف گوئی کی صفات کو بھی جمع کیا گیا ہے۔ حلیمہ دلیر و بے باک ہے۔ یوم حلیمہ پر عمرو سے سرزد ہونے والی حرکت کی معافی کے لیے وہ خود حارث سے سفارش کرتی ہے۔ عمرو اور زہیر کے فرار میں مدد دیتی ہے اور پھر خود بھی مرحلہ کے ساتھ ان کے پیچھے چل پڑتی ہے۔ وہ خولہ کی کنادی سے باخبر ہو چکی ہے اور اس کے جرم کو ناقابل معافی تصور کرتی ہے۔ محبت میں وہ دل پر جبر کرتے ہوئے عمرو کے زہیر سے کیے ہوئے وعدے کی پاسداری میں اس کا ساتھ دیتی ہے۔

حلیمہ کے بعد اس ناول کا دوسرا اہم کردار شہزادی حبیبہ کا کردار ہے۔ ابتدائی تعارف کے طور پر شرر نے شہزادی حبیبہ کا سراپا خولہ کی زبانی بیان کیا ہے جس میں خولہ کی ذہنی سطح کے مطابق الفاظ اور تشبیہات ہیں۔ خولہ حارث سے حبیبہ کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے

کہتی ہے :

"ملک عرب کیا دنیا ایسی دلربا سے خالی ہے، لڑکی کیا ہے جوانی میں بھری دوسال کی ہاکرہ اوٹنی ہے۔ ایک مست اور جوش پر آئی ہوئی ہرنی یا وحشی بکری ہے جو کسی سے مانوس ہی نہیں ہوتی۔ ارادہ نہیں کرتی مگر غزالان صحرا کی سی شربتی آنکھوں کے کناروں سے لوگوں پر سم آلود تیر برس جاتے ہیں۔ گلے میں سونے کا ہار مہمان دار رؤسائے بادیہ کی آگ کی طرح ہمیشہ چمکتا رہتا ہے۔ صبح کو زرد رنگ کی اور شام کو سفید رنگ کی خوشبو چھرے پر لگی رہتی ہے، جسم حریر کا سا نرم اور گدگدا ہے اور ایک تروتازہ اور نرم ٹہنی کی طرح لچکتا رہتا ہے۔ پیٹ میں نازک چھوٹی چھوٹی چار شکنیں ہیں جو سامنے سے چار اور پیچھے سے دیکھیے تو دونوں پہلو پر ان کے چار چار سے مل کے آٹھ ہو جاتی ہیں۔ پورا جسم ایک سنگ مرمر کی بنی ہوئی مورت ہے جس میں عنفوان شباب کی تروتازگی ایک سیلن اور رطوبت کی شان سے نمایاں ہے۔ وہ ایسا اچھوتا اور ناسفتہ موتی ہے جو گویا ابھی سیپی سے نکالا گیا ہے جس کی آب و تاب کو لوگوں کے ہاتھوں نے ابھی ماند نہیں کیا اور جس کے پانے میں غوطہ خور جوش مسرت سے نعرہ خوشی بلند کرکے سجدے میں گر پڑے۔ خوبصورت نصفیہ (خمار) کے نیچے سے گوشواروں کے ہیرے اور باریک وصلیہ (کرتی) کے نیچے سے زیور کا سونا اور ہار کے موتی اس طرح اپنی دھیمی ضو دیتے ہیں جس طرح دریا دل امرائے عرب کی راکھ کے نیچے آگ کی چنگاریاں چمکتی نظر آتی ہوں۔ اس کے پاؤں کے خلخال اپنی دلفریب آواز سے دلوں میں سرور پیدا کرتے ہیں اور اس کی مرصع نعلین اس قابل ہیں کہ کسریٰ اور قیصر انہیں تاج کی طرح سر پر رکھیں۔ . . "

حلیمہ اور حبیبہ کے کردار میں یہ نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے کہ حلیمہ تیز مزاج ہے اور حبیبہ نرم مزاج۔ حبیبہ بدی کا بدلہ بھی نیکی سے دینے کے اصول پر کاربند ہے۔ عمرو اور زبیر کے کردار شرر کے روایتی ہیرو کے کردار ہیں۔ اس ناول میں تو نہ، عذرہ کے روایتی حسن و عشق کے افسانوں کا سہارا لے کر شرر نے ان کے کرداروں میں عاشقی کی جملہ صفات کو شامل کرنے کا جواز پیدا کر لیا ہے۔ دونوں شجاع اور بہادر ہیں، مخلص اور وفادار ہیں، بے فکر اور ہر مصلحت سے بے نیاز ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے کردار میں کوئی ایسی صفت نہیں جو قابل توجہ ہو اور اسی بنا پر یہ دونوں ہیرو اپنی تمام شجاعت، وفا، خلوص اور سچائی کے باوجود بے جان کردار ہیں۔ زید بن عدی کے کردار کا بھی یہی حال ہے لیکن اس میں بعض ایسے پہلو ضرور موجود ہیں جو زندگی کی چمک پیدا کر دیتے ہیں۔

شیریں اور مریم کے کردار بھی بعض نمایاں صفات لیے ہوئے ہیں۔ مریم کی خود پسندی، خسرو پرویز کے خلاف امراء کو ابھارنے کی کوشش اور شیریں اور اس کی بدولت خسرو سے نفرت نے اس کے کردار میں ایک انفرادیت پیدا کر دی ہے۔ شیریں حسین و جمیل ہے، خسرو پرویز کے لیے بے پناہ محبت کا جذبہ رکھتی ہے لیکن خود دار ہے۔ خسرو پرویز سے مکمل وفاداری رکھتی ہے۔ فرہاد کے لیے دل میں کوئی محبت نہ رکھنے کے باوجود انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔ عقل کے معاملے میں مریم، شیریں اور خسرو پرویز ایک ہی صف میں دکھائی دیتے ہیں اور طلح کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ خسرو پرویز کا کردار سب سے زیادہ بے جان ہے۔ اس میں نہ بادشاہوں کی فراست ہے نہ خود کوئی فیصلہ کرنے کی سوجھ بوجھ، اس پر طرہ یہ کہ شرر نے اسے اپنی ملکہ شیریں کے ساتھ طلح کی موجودگی میں بوس و کنار ہوتا دکھا کر رہی سہی کسر پوری کر دی ہے۔ حارث، نعمان اور منذر کے کردار اس اعتبار سے خسرو پرویز کی نسبت زیادہ زندہ اور گوشت پوست کے کردار دکھائی

دیتے ہیں کہ وہ خود سوچتے ہیں ، ان کی اپنی شخصیت ہے اور بعض حالات کے تحت ان کا انفرادی رد عمل ہے ۔

منظر نگاری :

ایام عرب کی منظر نگاری دیگر ناولوں کی منظر نگاری اور مرقع کشی کی نسبت ایک انفرادی شان رکھتی ہے ۔ اس ناول کی منظر نگاری میں شرر نے جو وسائل اختیار کیے ہیں ان سے اس ماضی میں جان پڑ گئی ہے ۔ ایام عرب میں مرقع کشی کرتے ہوئے شرر سوق عکاظ کا منظر اس طرح پیش کرتے ہیں :

''ہجرت نبوی سے تقریباً ۴۰ سال قبل ذیقعدہ کی ۱۵ تاریخ مکہ معظمہ سے ۱۰ میل کے فاصلے پر شہر طائف اور قصبہ نخلہ کے درمیان عکاظ نام ایک چھوٹے سے دشت میں ہر طرف سے قبائل عرب آ کر جمع ہوئے ہیں اور ایام جاہلیت کا مشہور بازار لگا ہے جسے سوق عکاظ کہتے ہیں ۔ اس بازار کے ذریعے لین دین، خرید و فروخت کے علاوہ مبادلہ مذاق ہوتا ہے ۔ کملوں اور دھسوں کے خیمے تانے شہار مخلوق فروکش ہے ۔ اس کے گردا گرد بے آب و گیاہ پہاڑیوں کا سلسلہ جو رسول مقبول ؐ کے قول کے مطابق فیح جہنم کا نمونہ دکھا رہی ہیں، دوزخ کے فرشتوں کی طرح ایک کے پیچھے ایک سر اٹھائے ہوئے ان درشت مزاج اہنائے بادیہ کو گھور رہی ہیں ۔ ان کے پہلوؤں یعنی کھوہی کھوہی گھاٹیوں سے اس پار کا لی و دق ریگزار اپنی پرشکن پیشانی نکالے ہوئے جھانک رہا ہے ۔ باد سموم کے جھونکے گرد کو اڑا اڑا کے جہاں آسماں کی نیلگوں فضا کو میلا کرتے ہیں وہاں قریب کی برہنہ چٹانوں کو سلگھا خلعت پہنا رہے ہیں ۔ قریب ہی چند کھجوروں کے جھنڈ ہیں جن کے نیچے کئی کنوئیں ان صحرائی پیاسوں کو اپنی طرف بلا رہے ہیں اور دراصل زمین کے اسی زندگی بخش خزانے نے اس انبوہ کثیر کو یہاں لا کے جمع کیا ہے ۔ دور دور پر پہاڑوں کی بھول بھلیوں اور صحرا کے نشیب و فراز میں جا بجا ببولوں کے بے برگ ٹھونٹھ کھڑے ہیں جن کے کانٹوں سے دریائے ریگ کے شناور اونٹ اپنی قناعت کے روزے افطار کر رہے ہیں ۔''

ایک اور منظر اس طرح پیش کیا ہے :

''دوپہر کا وقت ہے، دھوپ کی شدت ہے، لو چلتی ہے ۔ ہلکی ہوا اجلے دامن صحرا کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ چن رہی ہے ۔ شہر حیرہ کے قریب ایک دشت بے گیاہ میں بگولے خاک اڑاتے پھرتے ہیں ۔ ریگ رواں متلاطم سمندر کی طرح برہنہ اور سیاہ تاب جھاڑیوں کو تھپیڑے دے رہی ہے ۔ مستانہ آنکھ والی چست و چالاک ہرنیاں جو عربی حسن پرست قیس عامری کی نظر میں ''شبہ لیلی'' ہیں، یار بے وفا ہی کی طرح سے نظر سے غائب ہیں ۔ جنگل کا بادشاہ ابوالحارث کسی تنگ وادی میں سو رہا ہے ۔ ریگ ماہی دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے دوڑ دوڑ کے بالو کی تہ میں چھپتی ہے ۔ ہوشیار گوہ جس کے گوشت پر ابنائے بادیہ کی قناعت کے روزے افطار ہوتے ہیں اپنے سوراخ سے دم باہر نکالے بیٹھی ہے اور عربوں کے خیال کے مطابق اپنے دلی دوست بچھو سے باتیں کر رہی ہے ۔

ناگہاں ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا، گرد اڑی اور گرم گرم بالو آگ سے بھری ہوئی فضا میں کسی پرجوش عاشق کی طرح دیوانوں کا سا ایک چکر لگا کے بیٹھ گئی ۔ جہاں زمین صاف تھی وہاں بالو کے چند تودے نظر آئے اور جس طرف پیشتر ریگ کے کئی تودے سر اٹھائے کھڑے تھے، زمین نکل آئی ۔ ریگ لومڑی جو بالو کے دامن میں چھپی بیٹھی تھی گرد کی چادر ہٹتے ہی گھبرا کے بھاگی اور کئی سانڈے یکایک برہنہ و بے ستر ہو جانے سے شرما شرما کے جھپٹے کہ کسی دوسرے تودے کے دامن میں جا چھپیں ۔''
(چودھواں باب)

اس ناول میں شرر کو مرقع نگاری اور منظر کشی کے کئی مواقع ہاتھ آئے اور ہر جگہ انھوں نے اپنی فنی چابکدستی اور مہارت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے ۔ باب شکار گاہ خسروی میں

کوہ قاف کے مناظر ، خسرو پرویز کا سکاری لشکر ، اس کی آن بان ، خود خسرو پرویز کا اس منظر میں شاہانہ طمطراق کے ساتھ موجود ہونا ، شکار کھیلنا وغیرہ خوبصورت مرقعے لیے ہوئے ہے ۔ اسی طرح منذر بن نعمان کے خسرو پرویز کے دربار میں پیش کیے جانے کے موقع پر ایرانی دربار کی سان و شوکت کا بہت حسین اور کامیاب مرقع پیش کیا گیا ہے ۔ آب ذیقار کے کنارے تالاب پر حلیمہ ، حبیبہ اور عمرو ، زہیر کی موجودگی اور سیر و تفریح کا منظر بھی دلچسپ ہے ۔ یوم حلیمہ اور یوم ذی قار کے موقعے کے مناظر بھی اپنے اندر متحرک تصویریں لیے ہوئے ہیں ۔

فضا سازی اور بیان :

ایام عرب میں سب سے زیادہ قابل تعریف ، جاذب نظر اور دلچسپ حصہ دور جاہلیہ کا عرب تمدن ہے۔ سرر عہد ماضی کی اس زندگی کی ایک جھلک پیش کرنے میں کافی کامیاب رہے ہیں ۔ یہ ناول فضا سازی کے اعتبار سے غالباً فردوس بریں کے بعد سب سے زیادہ کامیاب ناول ہے ۔ شرر نے اس مقصد کے لیے مکالموں میں عرب کی ضرب الامثال ، محاورات اور روزمروں کا بلا تکلف استعمال کیا ہے ۔ مختلف عربی الفاظ مثلاً جاح ، جمہ ، خمار ، ابوالحارث وغیرہ استعمال کرکے فضا سازی کی ہے ۔

زبان اور مکالمے :

ضرب الامثال کا استعمال مکالموں اور گفتگو میں ہوا ہے اس لیے دلچسپی کا عنصر بھی بدستور برقرار ہے ۔ زرقا یمامہ کی سبز آنکھوں کے قصے ، فہد کی نیند ، امراء القیس کے واقعے ، نابغہ زیبانی کے قصیدے کے ذکر میں اس عہد کی زندگی کی جھلک ابھر آتی ہے ۔ مختلف مواقع پر ایام جاہلیہ کے اعتقادات اور رسموں کو بھی خوبصورتی سے پیش کیا ہے ۔ خولہ کو رخصت کرتے ہوئے طلح کا اس کے گلے میں خرگوش کی سوکھی ران باندھنا ، الوداع ہوتے ہوئے پلٹ کر نہ دیکھنے کی تاکید کرنا ۔ عمرو ، زہیر اور طلح کا ایک وبا زدہ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے گدھے کی بولی بولنا ۔ راستہ بھول جانے پر الٹے کپڑے پہننا ۔ کسی کو فوری فریاد رسی کے لیے متوجہ کرنے کے لیے برہنہ ہو جانا ، سانپ کے کاٹے کے علاج کے لیے عورتوں کے زیورات پہنانا اور عدت وغیرہ کے سلسلے میں متعدد رسموں اور اعتقادات کو اس خوبصوتی سے پیش کیا ہے کہ ایام جاہلیہ کی تصویر ابھر آئی ہے ۔

مکالموں میں الفاظ کے استعمال میں بھی شرر نے اس نکتے کو مد نظر رکھا ہے ۔ مختلف قبائل کے لوگ گفتگو کے وقت اپنے قبیلوں کے بتوں کی قسمیں کھاتے ہیں ۔ گفتگو میں تشبیہیں اور استعارے بھی ان کے اپنے ماحول کے ہیں ، سطور بالا میں حبیبہ کا جو حلیہ خولہ نے پیش کیا ہے اس میں بھی ایسی ہی تشبیہات ہیں ۔ اس ناول کے مکالموں ، بیانات اور زبان نے ناول سے متعلق عہد کو اجاگر کرنے میں اور فضا سازی میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے ۔

۷۔ مقدس نازنین

اس ناول کا پلاٹ بہت سیدھا سادا ہے ۔ ایک نوجوان پادری ایک خوبصورت دوشیزہ کو ورغلا کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے ، دوشیزہ کا عاشق آڑے آتا ہے لیکن کئی مشکلات

کا سامنا کرنے کے بعد رقیب کو زخمی جا، بلب چھوڑ کر پادری اسے فرانس لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ دوشیزہ راہبوں کے لباس میں ہے۔ فرانس میں پادری کے خلاف شکایت پہنچتی ہے پادری گرفتار ہو جاتا ہے لیکن دوشیزہ ایک مسلمان غلام کے ساتھ جو اس کا ممنون احسان تھا ایک دینی درسگاہ میں چلی جاتی ہے۔ مسلمان نوجوان بھی وہاں مسیحی روپ میں داخلہ لے لیتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد پادری پاپائے اعظم کی قید سے کسی طرح نکل بھاگتا ہے اور اسی درسگاہ میں جا پہنچتا ہے۔ چند دن بعد سابقہ رقیب بھی وہاں آ پہنچتا ہے۔ پادری کو قتل کر دیتا ہے، مسلمان نوجوان کو بھی اپنے خیال سے مردہ تصور کرکے ایک غار میں جا پھینکتا ہے۔ اب یہ دوشیزہ مردانہ روپ میں سہا رہ جاتی ہے۔ تحصیل علم سے فارغ ہو کر روم پہنچتی ہے، جلد ہی سب سے بڑی دینی درسگاہ کی صدر معلم مقرر ہو جاتی ہے، بہت شہرت پاتی ہے۔ کارڈینل بنتی ہے اور بالآخر پوپ۔ جس دن پوپ مقرر ہوتی ہے جلوس نکلتا ہے، راستے میں وہ سابقہ رقیب اسے دیکھ کر شور مچاتا ہے کہ یہ تو عورت ہے اور اس نے ابھی ابھی ایک بچے کو جنم دیا ہے۔ لوگ پتھراؤ کرنے لگتے ہیں۔ اچانک شمعیں گل ہوتی ہیں، وہ مسلمان نوجوان جو دراصل زندہ تھا اور اس دوشیزہ کا شوہر تھا اپنے باپ کی معیت میں اچانک دوشیزہ، بچے اور اس رقیب کو بھی لے بھاگتا ہے۔ لوگ ان کے غائب ہونے کی حقیقت سے بے خبر پتھراؤ کرتے رہتے ہیں۔ دوشیزہ اپنے شوہر کے ساتھ سپین جا پہنچتی ہے جہاں اس کا خسر ایک علاقے کا والی تھا۔ اسلام قبول کرتی ہے۔ سب حج کو جاتے ہیں اور اپنے اس دشمن کو وہاں ایک بدمزاج بدو کے پاس بیچ کر واپس سپین آ جاتے ہیں۔

اس سیدھے سادے پلاٹ کو دلچسپ پیرائے میں پیش کرنے کے لیے شرر نے قصے میں نشیب و فراز، اتار چڑھاؤ کے ایسے پہلو پیدا کیے ہیں کہ تجسس اور دلچسپی ہر آن بڑھتی جاتی ہے۔ واقعات کی ترتیب میں فنی ہنروری سے کام لیتے ہوئے ان میں مسلسل اٹھان اور ٹھہراؤ، اٹھان اور ٹھہراؤ کا ایسا عالم پیدا کیا ہے کہ ہر بار عروج پر پہنچنے کے بعد واقعات ٹھہراؤ کی طرف رخ کرتے ہیں اور یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب اس ضمن میں اور کوئی الجھن نہیں پیدا ہوگی لیکن پھر کسی اور بات سے واقعات میں اٹھان پیدا ہوتی ہے اور ناول رفتہ رفتہ پھر عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ آخری حصے میں ڈرامائیت کا عنصر چھایا ہوا ہے۔

پہلے باب میں واقعات سیدھے سادے پیرائے میں شروع ہوتے ہیں۔ پادری لزارس اور ایگنس ایک دوسرے سے ایک مذہبی رسم کے سلسلے میں متعارف ہوتے ہیں۔ لزارس ایگنس کے حسن سے متاثر ہوتا ہے اور اسے اپنے خیمے میں لے جاتا ہے۔ اسی باب میں ہنری سے بھی ہم متعارف ہوتے ہیں جو ایگنس کو چاہتا ہے۔ ہنری تو پادری کے حکم سے قید کر لیا جاتا ہے لیکن یہ باب ڈرامائی رنگ میں ختم ہوتے ہوئے تجسس کے کئی پہلو پیدا کر جاتا ہے۔ خیموں میں اچانک آگ لگنا اور نامعلوم لوگوں کا موقع سے فائدہ اٹھا کر ایگنس کو لے بھاگنا، دو ایسے سوال ہیں جن کا حل مطلوب ہے۔ دوسرے باب میں یہ خبر لزارس کے لیے بھی حیران کن ہے کہ ہنری راہبوں کو مار پیٹ کر بھاگ گیا تھا اور جب وہ اس کے تعاقب میں تھے اس کے ساتھیوں نے خانقاہ میں آگ لگا دی اور ایگنس کو لے اڑے۔ دوسرے باب میں ایگنس کی ماں کا کردار بھی سامنے آتا ہے۔ اس باب میں واقعات پھر بہت تیزی سے رخ بدلتے ہیں۔ لزارس ایموجن کے کہنے پر ایگنس کو اس کے گھر سے لانے جاتا ہے لیکن وہاں ہنری اور اس کے

ساتھیوں کے ہاتھوں پٹنے کے بعد کاسیا کے قید خانے میں جا پہنچتا ہے اور سزا بھگت رہا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھی کوشش کرکے اسے نجات دلاتے ہیں ۔

دوسرے باب میں ایموحن کا رویہ ایک سوال بن جاتا ہے، اس کی لزارس سے گفتگو تو یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ ہنری سے نالاں ہے لیکن اس کے گھر در لزارس سے ہونے والا سلوک ظاہر کرتا ہے کہ یہ سب کچھ سوچی سمجھی سکیم کے تحت ہوا ۔ حقیقت کیا ہے ؟ یہ سوال آگے قدم بڑھانے پر مجبور کرتا ہے ۔ تیسرے باب میں ایموحن کا رویہ مزید الجھن پیدا کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی خود ایگنس کا رویہ بھی ایک سوال بن جاتا ہے ، وہ اپنی ماں کی صفائی پیش کرتی ہے کہ وہ بے قصور تھی ۔ جو کچھ لزارس کے ساتھ ہوا ان کے بس سے باہر ہوا ۔ وہ لزارس کے ساتھ مردانہ لباس میں فرانس چلنے پر آمادہ ہو گئی ہے لیکن ہنری کو معاف کر دینے کی بھی سفارش کر رہی ہے ۔ قاری ایگنس کے رویے کے بارے میں مشکوک ہو جاتا ہے اور اس پلان کا انجام دیکھنا چاہتا ہے ۔ لزارس کے ساتھی خیمے ڈیرے اکھاڑ کر چل پڑتے ہیں ۔ لزارس کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ایگنس کو پروگرام کے مطابق لینے جا پہنچتا ہے ۔ وہ راہبوں کے لباس میں ساتھ ہو لیتی ہے لیکن یہ باب پھر ایک نئی الجھن اور ڈرامائیت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے ۔ راستے میں پتہ چلتا ہے کہ ایگنس کی جگہ ہنری کے کسی ساتھی نے لے رکھی ہے اور ہنری اور اس کے باقی دوست بھی راہ میں موجود ہیں ۔ کئی سوال اچانک ابھر آتے ہیں ۔ کیا ایگنس ، ہنری سے ملی ہوئی ہے اور اس نے جان بوجھ کر لزارس کو دھوکا دیا ہے؟ یا ایگنس خود بھی کسی مجبوری کا شکار ہو گئی ہے اور اس کی ماں ایموحن ہنری سے مل کر لزارس کو فریب دے رہی ہے ؟ مزید حالات معلوم کرنے کے لیے تجسس قاری کو کشاں کشاں آگے بڑھاتا ہے ۔

چوتھے باب میں اس واقعے کی کچھ تفصیل معلوم ہوتی ہے ۔ لزارس نے ضد میں رات کو وہاں سرائے میں پڑاؤ ڈال دیا ہے ۔ لیکن پھر ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آتا ہے دو عورتیں اسے پھر ملتی ہیں۔ وہ اسے بھی فریب سمجھتا ہے، جلد ہی غلطی کا احساس ہوتا ہے ۔ پانچویں باب میں حقیقت واضح ہو گئی ہے ۔ ایگنس ایک سہیلی کے ساتھ لزارس کے پاس آ پہنچی ہے ۔ اس باب میں ایک بار پھر پیچیدگی پیدا ہوتی ہے ۔ لزارس اور ایگنس دونوں غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ایک بار پھر ہنری کے فریب کا شکار ہوتے ہیں ۔ باب پھر ڈرامائی انداز میں ختم ہوتا ہے اور ایک بار پھر کئی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔

چھٹے باب میں پہلی الجھنیں ختم ہوتی ہیں ۔ لزارس کی بدگمانی اور غلط فہمی دور ہوتی ہے ۔ ایگنس اب تک کافی تکلیفیں جھیل چکی ہے ۔ اب قافلہ اطمینان کے ساتھ انگلستان کی طرف روانہ ہے ۔ چار دن سفر کیا جا چکا ہے اور انگلستان ایک دن کی منزل پر ہے کہ شرر کی قوت متخیلہ ایک اور پیچیدگی پیدا کر دیتی ہے ۔ یہ باب بھی تذبذب اور تجسس کا رنگ لیے ختم ہو جاتا ہے ۔ لزارس ایگنس اور ان کے تمام ساتھی گدھوں سمیت دلدل میں پھنس چکے ہیں ۔ انہیں غلط راہ دکھانے والے اور ان کے پیچھے گھوڑے دوڑا کر انہیں دلدل میں پھنسانے والے لوگ کون تھے ؟ شاید ہنری اور ان کے ساتھی ہوں ! یہ اس دلدل سے زندہ بچ کر نکل سکیں گے یا نہیں ؟ یہ سوال بنیادی حیثیت رکھتا ہے ۔ قاری نئے باب کے اوراق اسی سوال کے جواب کے لیے پر شوق انداز میں الٹتا ہے ۔

ساتواں باب تذبذب کا رنگ لیے شروع ہوتا ہے لحظہ بہ لحظہ تجسس بڑھتا جاتا ہے ،

واقعات نازک صورت اختیار کرتے جاتے ہیں اور حالات نقطہ عروج پر پہنچ چکے ہیں ۔ جدوجہد جاری ہے آخر موت و زیست کی اس کشمکش پر ایگنس کی حاضر دماغی اور ہمت غالب آ جاتی ہے ۔ سارا قافلہ بمشکل دلدل سے زندہ و سلامت نکلتا ہے اور لندن جا پہنچتا ہے ۔ اب واقعات میں ایک طرح کا سکون اور ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے ۔ اس سے پہلے کی جملہ الجھنیں ختم ہو گئی ہیں ۔

آٹھویں باب میں واقعات میں ازسرنو اٹھان اور پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ بندرگاہ پر ہنری موجود ہے، وہ ایگنس کا دعویدار ہے ۔ لزارس کو ڈوئل (Duel) کی دعوت دے رہا ہے ۔ قانون کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایگنس کے بارے میں دونوں زور آزمائی کریں جس کی قسمت یاوری کرے وہ جیتا ۔ شروع میں حالات ہنری کے لیے سازگار دکھائی دیتے ہیں ۔ لیکن پھر بہت جلد پلٹا کھاتے ہیں ۔ ہنری کو زخموں سے چور نزع کی حالت میں چھوڑ کر یہ قافلہ آگے چل پڑتا ہے ۔ یہ باب ہنری کے بارے میں ایک مستقل سوال بن کر ختم ہوتا ہے ۔

نواں باب واقعات کے ایک نئے سلسلے کا آغاز کرتا ہے ۔ لزارس ایگنس اور ساتھیوں سمیت فرانس پہنچ چکا ہے ۔ اب ایگنس اور لزارس کی گفتگو میں باہم لگاوٹ اور راز و نیاز کا عنصر پیدا ہو چلا ہے ۔ سفروں میں نئی امنگیں لیے جب یہ لوٹیشیا پہنچتے ہیں تو وہاں ایک اور راہب سے بھی ہم متعارف ہوتے ہیں ۔ یہ راہب پہچان گیا ہے کہ لزارس کے ساتھ مردانہ لباس میں پھرنے والا نوجوان راہب لڑکی ہے ۔ دسواں باب بظاہر اصل واقعات سے ہٹ کر ایک نیا موضوع لیے ہوئے شروع ہوتا ہے ۔ یہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات سے متعلق ہے ۔ کچھ مسلمان جو وہاں قید کرکے لائے گئے ہیں ماس کے دن ان کی قربانی ہے ۔ اس باب میں اصل قصے سے متعلق واقعات اچانک نیا رخ اختیار کرتے ہیں ۔ لزارس کو نامعلوم جرم کی بنا پر اسقف اعظم کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا ہے ۔ پچھلے باب میں سامنے آنے والا معمر راہب یکہ و تنہا ایگنس کی اعانت کرتا ہے اور اسے زنانی خانقاہ میں پہنچا دیتا ہے ۔ اب منتظمہ بھی اس کے راز سے واقف ہے اور ایگنس ننوں کے لباس میں وہاں ٹھہر گئی ہے ۔ اس باب میں مسلمان اسیروں کی ماس کے دن قربانی کا دردناک منظر ہے اور بوڑھے راہب کے کہنے پر ایگنس نے منتظمہ سے سفارش کرکے اس کے ذریعے اسقف اعظم اور بادشاہ سے ایک مسلمان لڑکی ، ایک نوجوان اور ایک مرد کو بخشوا کر اپنی غلامی میں لے لیا ۔ یہ باب لزارس کے متعلق الجھنیں چھوڑ کر ختم ہو جاتا ہے ۔

گیارہواں باب واقعات کے سلسلے کو اور آگے بڑھاتا ہے ۔ ایگنس ، بوڑھا راہب اور تین مسلمان فوراً لوٹیشیا کو چھوڑ کر فولڈا روانہ ہو جاتے ہیں کیونکہ اب لوٹیشیا میں اسقف اعظم کے حکم سے ہر طرف ایگنس کی تلاش جاری ہے ۔ اب ایگنس یوحنا کے نام سے پھر مردانہ وضع میں آ گئی ہے ۔ بارہویں باب میں ایگنس فولڈا کے مدرسے میں یوحنا کے نام سے داخل ہو گئی ہے نوجوان مسلمان علی، مرقس کے مسیحی نام سے اس کے پاس قیام پذیر ہے۔ معمر راہب علی کی بہن سلمیٰ اور دوسرے مسلمان غلام کو لے کر بیت المقدس کی طرف روانہ ہو گیا ہے ۔

تیرہویں باب کے آغاز میں ٹھہراؤ ہے لیکن یہاں قصے میں اچانک پھر سے موڑ واقع ہوتا ہے ۔ لزارس عورت کے روپ میں فولڈا کی درسگاہ میں جا پہنچتا ہے ۔ ایگنس سے ملتا ہے ، قید خانے سے اپنے فرار کی داستان سناتا ہے اور اپنا لباس بدلتا ہے ۔ چودہویں باب میں اب بظاہر ٹھہراؤ ہے ، لزارس بھی وہاں ایرمینوس کے نام سے طالب علم بن گیا ہے ۔ پھر جب لزارس کی نیت میں فتور پیدا ہونے لگتا ہے تو اس کے اور ایگنس کے درمیان کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے ۔

لزارس بدنیتی سے ایگنس پر دست درازی کرنا چاہتا کہ اچانک ہنری وہاں جا پہنچتا ہے اور مداخلت کرتا ہے ۔ مرقس بھی آ پہنچتا ہے ۔ ایگنس کے اشارے پر وہ عین اس وقت ہنری کو باندھ لیتا ہے جب وہ لزارس کو قتل کرنا چاہتا تھا ۔ ہنری کو باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس کر تینوں خانقاہ کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں ۔

پندرھواں باب درمیان کی کچھ کڑیوں پر روشنی ڈالتا ہے ۔ اب تینوں یونان کے عظیم الشان کالج میں ہیں ۔ ایگنس کا مزاج بالکل بدل گیا ہے ۔ ہر وقت ریاضت میں مصروف ہے اور بے فکر ، لا پروا ، یہاں لزارس کی مجنونانہ حرکتوں سے ایگنس اور اس کے درمیان تلخی بڑھتی جاتی ہے ۔ اب ایگنس کی دلچسپی مرقس یعنی علی کی طرف معلوم ہوتی ہے ۔ سولھویں باب میں جب حالات اس نقطے پر ٹھہرے ٹھہرے اکتاہٹ کا باعث بننے والے ہوتے ہیں تو پھر ایک موڑ واقع ہو جاتا ہے ۔ ہنری وہاں بھی آ پہنچتا ہے ۔ اس نے موقع پا کر پہلے لزارس کو قتل کیا اور پھر مرقس کو ، لزارس کی لاش تو وہ ساتھ نہ لے جا سکا لیکن مرقس کی لاش ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا ۔ لزارس وہیں دفن کیا گیا ۔ یہ باب افسوسناک انجام کے ساتھ ختم ہوا ۔ اب ایگنس کے مزید حالات جاننے کے لیے قاری آگے بڑھتا ہے ۔ سترھویں باب میں ایگنس ہنری کا خط پڑھ کے اس کی سفاکی پر سخت مغموم ہوئی اور پھر نئے عزم کے ساتھ اس نے یونان کو چھوڑ کر روما کا رخ کر لیا ۔ حالات سازگار ہو گئے وہ نہ صرف یہ کہ وہاں بہت جلد سب سے بڑے کالج کی پرنسپل ہو گئی بلکہ پوپ نے اس کی شہرت سن کر خود اس سے ملنے کا شوق ظاہر کیا ۔ ایگنس (یوحنا) کے رتبے اور شہرت میں دن بدن ترقی ہوتی گئی ۔

اٹھارھویں باب میں پھر ایک پیچیدگی واقع ہوتی ہے ۔ ایک لڑکی بڑے اصرار سے اس کے ساتھ اس کے عزلت کدے میں جاتی ہے ۔ وہاں اندر پہنچ کے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہنری تھا ۔ وہاں اچانک ایگنس کے تالی بجانے پر مرقس اور ایرمینوس آ گئے ۔ ہنری خوفزدہ ہوگیا اور بے ہوشی کی حالت میں اسے اٹھوا کر باہر پھینک دیا گیا ۔ اس باب کے آخر میں یہ الجھن پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ مرقس اور ایرمینوس یہاں کس طرح ؟ یہ کون ہیں ؟ وہ دونوں تو ہنری کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے نیز اب ہنری کیا کیا فتنہ پیدا کرے گا ؟

انیسویں باب میں ناول منتہیٰ پر پہنچ جاتا ہے ۔ ایگنس پوپ بن گئی ہے ۔ اس کا مذہبی رسومات کا جلوس روانہ ہو گیا ہے ۔ پلاٹ میں فی الفور نہایت اہم موڑ واقع ہوتا ہے ۔ ایگنس پوپ کی گاڑی میں بیٹھی ہوئی ایک بچے کو جنم دیتی ہے اور ہنری مجمعے کو اکساتا ہے کہ وہ مرد نہیں عورت ہے ۔ اچانک ہنگامہ ہو جاتا ہے اور یہ باب اس حالت میں ختم ہوتا ہے کہ پتھراؤ کی وجہ سے پوپ کی گاڑی کی جگہ پتھروں کی چھوٹی سی پہاڑی بن گئی ہے ؟ ایگنس نے جس بچے کو جنم دیا وہ کس کا تھا ؟ کیا ایگنس کا وہی انجام ہوا جو اس باب سے ظاہر ہوتا ہے ؟ لیکن بیسواں باب نہ صرف ناول کو طربیہ انداز میں ختم کرتا ہے بلکہ ایک تجسس سے شروع ہو کر ہر لحظہ تذبذب کو بڑھاتے بڑھاتے اچانک سب عقدوں کو حل کر دیتا ہے ۔ معمر راہب اور مرقس نے جو مرا نہیں تھا ایگنس اور بچے کو سنگساری سے پہلے ہی اٹھا لیا تھا ۔ بچہ مرقس کا تھا معمر راہب مرقس یعنی علی کا باپ والیٔ بلنسیہ تھا ۔ وہ ہنگامے کے وقت تاریکی سے فائدہ اٹھا کر ہنری کو بھی اپنے ساتھ پکڑ کر سپین لے آئے تھے بعد ازاں اسے عرب میں ایک بدوی کے پاس بیچ دیا گیا ۔

شرر نے اس سیدھے سادے پلاٹ میں اپنی فنکاری سے کام لے کر جو نشیب و فراز، تجسس اور دلچسپی پیدا کی ہے اس سے قاری پورے طور پر ان کی گرفت میں رہتا ہے۔ پلاٹ میں کہیں غیر ضروری طوالت نہیں، نہ ڈھیلا پن ہے اور نہ کوئی خلا، مسلسل نشیب و فراز ہیں۔

کردار :

اس ناول میں یوں تو متعدد کردار ہیں لیکن بڑے کردار صرف چار ہیں۔ ایگنس، لزارس، مرقس (علی) اور ہنری۔ ان کے علاوہ دیگر اہم کرداروں میں معمر راہب (علی کا باپ)، ایموجن (ایگنس کی ماں)، مرتھا اور سلمیٰ شامل ہیں۔ ناول کا سب سے اہم اور مرکزی کردار خود ایگنس کا ہے جس کے مختلف روپ ہیں، ایگنس، نوجوان راہب، ٹن، یوحنا اور پھر گلبرطوس اور پوپ جون۔

ایگنس کا کردار ناول کا انتہائی جاذب نظر اور مکمل کردار ہے۔ جس سخت جدوجہد، آلام و مصائب اور ریاضتوں سے ایگنس کو گزرنا پڑتا ہے اس کا لازمی اثر اس کی شخصیت پر نظر آتا ہے لیکن یہ نہیں کہ وہ کوئی مصنوعی کردار ہو بلکہ وہ ایک زندہ کردار ہے۔ گوشت پوست کا جیتا جاگتا کردار جس پر حالات اثر انداز بھی ہوتے ہیں، اس کا رد عمل بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ خود حالات پر چھا جاتی ہے۔ مختلف قسم کے حالات میں اس کا رد عمل عموماً فطری ہے۔

ایگنس کا کردار ارتقا پذیر کردار ہے۔ انگلستان کی ایک معمولی لڑکی سے پوپ کے مرتبے تک پہنچنے میں جو طویل مسافت اسے طے کرنی پڑی ہے اس میں اس کی شخصیت کی تعمیر ہوتی رہی ہے اور آخری مرحلے پر جب وہ شہرت کے انتہائی عروج پر ہے اس کا کردار غیر فطری نہیں معلوم ہوتا۔ شرر نے ایگنس کی کردار نگاری میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ایگنس کو ہم ابتدائی ملاقات میں انتہائی شرمیلی، سادہ لوح اور نیک دل، پاک دامن لڑکی کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ وہ اعتراف گناہ کے لیے جب پادری لزارس کے سامنے آتی ہے تو لزارس کے سوالات سے کبھی تو وہ مارے شرم کے سرخ ہو جاتی ہے اور کبھی یہ دیکھ کر کہ وہ سوالات کسی مذہبی رسم کی بجائے لزارس کی لذت پرستی کا رنگ رکھتے ہیں، وہ جھنجھلا اٹھتی ہے لیکن مذہبی پیشواؤں کے لیے اس کے دل میں جو احترام ہے وہ مانع رہتا ہے۔ لزارس اس سے اپنے خیمے میں جس قسم کی گفتگو کرتا ہے اس پر ایگنس کی اندرونی کشمکش صاف جھلکتی ہے، وہ حیران ہے کہ یہ پادری جو تقدس اور تجرد کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے اس قسم کا اخلاق رکھتا ہے۔ لزارس کے ساتھ گھر سے نکل پڑنے تک ایگنس کی شخصیت میں تذبذب کی کیفیت صاف نمایاں ہے وہ حصول علم کی خاطر گھر چھوڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ ہنری سے اسے دلی لگاؤ ہے لیکن اس کی حرکتوں سے چڑ۔ اگرچہ وہ ہنری کو چھوڑ کر لزارس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے گھر سے نکل پڑتی ہے اور ہنری قدم قدم پر اسے زک پہنچاتا ہے لیکن وہ ہر بار اسے خود بھی معاف کر دیتی اور اس کی معافی کی سفارش بھی کرتی ہے۔

ہنری جب ایگنس اور اس کے ساتھیوں کو فریب سے دلدل میں پھنسا دیتا ہے اور سب موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں اس وقت ایگنس کی ہمت و جرأت، حاضر دماغی قابل ستائش ہے اور یہ بہت حد تک ہنری کی اس گفتگو کا رد عمل ہے جو وہ کنارے بیٹھا ہوا طعن آمیز

لہجے میں کر رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایگنس نرم دل ضرور ہے لیکن بزدل نہیں، عورت ہونے کے باوجود فعال شخصیت کی مالک ہے، مستقل مزاج ہے۔ ہنری کے اتنے بڑے انتقام کے باوجود انگلستان کی بندرگاہ پر ڈوئل میں ہنری کو شدید زخمی ہوتا دیکھ کر وہ ضبط نہیں کر سکتی اور چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ فوالڈا کی خانقاہ میں وہ ایک بار پھر ہنری کی جان بچا لیتی ہے اور اسے صرف باندھ کر حجرے میں بند کر دینے پر اکتفا کرتی ہے۔ لزارس کے لیے وہ اپنائیت کا جذبہ رکھتی ہے لیکن صاف الفاظ میں اسے بتا دیتی ہے کہ اس کے دل میں لزارس کے لیے وہی محبت ہے جو ایک بیٹی کے دل میں باپ کے لیے ہوتی ہے۔ لزارس کی کوئی کوشش اس کے پائے استقلال کو لغزش دینے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ وہ نہ یہ دیکھ سکتی ہے کہ لزارس کے ہاتھوں ہنری قتل ہو اور نہ یہ گوارا کر سکتی ہے کہ ہنری لزارس کو کوئی نقصان پہنچائے۔ ہنری کی عادتوں سے نفرت کے باوجود وہ ہنری سے اس وقت تک انتقام لینے پر آمادہ نہیں ہوتی جب تک ہنری لزارس اور مرقس کے قتل کا مرتکب نہیں ہوتا۔

مرقس کے لیے وہ اپنے دل میں غیرمحسوس محبت رکھتی ہے۔ اندرونی کشمکش کے باوجود وہ دلی کیفیات کو اپنے اوپر اس طرح حاوی نہیں ہونے دیتی کہ وہ اس کی شخصیت کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیں۔ لزارس کی گرفتاری، مسلمانوں کے بے گناہ قتل اور لزارس اور مرقس کے قتل کے موقعے پر اس کے اندر کی عورت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ یہ کیفیت رودبار انگلستان کو پار کرتے ہوئے اور پھر سپین پہنچتے ہوئے بھی جھلکتی ہے۔ وہ مرقس کی ہو جاتی ہے لیکن اپنی دلی چاہت سے۔ کوئی دوسرا اسے اس کی مرضی کے خلاف استعمال نہیں کرسکتا۔ مرقس کے لیے اس کے دل میں محبت، مرقس کی شخصیت، شرافت، بے لوث خدمت اور وفاداری کا فطری ردعمل ہے۔ نسرر نے ایگنس کے کردار کی تعمیر میں ان نازک نفسیاتی مرحلوں کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے جہاں ذرا سی غفلت اور سہل انگاری اس کردار کو بے جان کردار بنا سکتی تھی۔

لزارس کے کردار میں ہوس پرستی، چاپلوسی، ابن الوقتی کا عنصر موجود ہے۔ مذہبی تقدس کا لبادہ صرف دکھاوے کے لیے ہے۔ ایگنس کے کردار کی عظمت کے مقابلے میں اس کا کردار اور بھی پست ہوگیا ہے۔ وہ موت سے خائف ہے، بزدل ہے، نمائش کا قائل ہے۔ دلدل میں پھنسنے کے موقعے پر اور ہنری سے ڈوئل کے چیلنج کے وقت اس کی شخصیت کا بھرم کھل جاتا ہے۔ ہنری سے جس طرح وہ زندگی کی بھیک مانگتا ہے اس سے بھی اس کے کردار کی پستی اجاگر ہوتی ہے۔ اسے ایگنس کے حصول میں ناکامی کا بھی شدید احساس ہے جس سے وہ حسد اور رقابت کی آگ میں خود ہی جلتا ہے۔

مرقس کا کردار سلجھا ہوا کردار ہے۔ وہ ایک احسان مند نوجوان ہے۔ ایگنس نے اس کی اور اس کی بہن کی جان بچا کر ان پر جو احسان کیا تھا اسے وہ ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔ اس کے باپ نے اسے ایگنس کی نگہداشت پر مقرر کرتے ہوئے جو ہدایات دی تھیں وہ انھیں ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ اپنی حرکات اور گفتگو سے کبھی نہیں ظاہر ہونے دیتا کہ اسے ایگنس سے کس قدر محبت ہے۔ کبھی کبھی ایک پل کے لیے کوئی ایسا مظہر سامنے آتا ہے تو وہ اسے بہت سلیقے سے دبا دیتا ہے۔ لزارس سے اس کی گفتگو دونوں کے کرداروں کا تقابلی جائزہ پیش کرتی ہے۔

ہنری اپنی دھن کا پکا ہے، وہ لزارس کا کھل کر مقابلہ نہیں کر سکتا کیوں کہ اس طرح کلیسا کی قوت لزارس کا ساتھ دیتی، اس لیے وہ قدم قدم پر لزارس کو زک پہنچانے کی کوشش

کرتا ہے - اس کی شخصیت میں عیاری اور مکاری ہے شجاعت اور جرأت نہیں - وہ جب بھی کوئی وار کرتا ہے دھوکے سے کرتا ہے - کھل کر سامنے آنے کی اس میں ہمت نہیں - ڈوئل کے موقعے پر اس کے کردار کے یہ پہلو نمایاں ہوتے ہیں - لزارس کے قتل کے بعد وہ مرقس پر بھی فریب سے ہی وار کرتا ہے -

زبان و بیان :

اس ناول میں جذبات نگاری، تصویر کشی اور منظر نگاری کے اچھے نمونے موجود ہیں - مکالمے اور زبان و بیان موقع محل، کرداروں کی شخصیت اور نفسیات سے مطابقت رکھتے ہیں - شرر نے بعض مناظر کی بڑی بھرپور عکاسی کی ہے اور اس کے لیے جملہ ضروری جزئیات کو مد نظر رکھا ہے، مثلاً دلدل میں پھنسنے کا اور نکلنے کا منظر، ہنری کے ڈوئل کا منظر، رودبار کے طوفان کا منظر، مسلمانوں کے قتل عام کا منظر اور اس مرحلے پر قتل کرتے کرتے جلاد کا آخر میں نفسیاتی طور پر خون سے متاثر ہو کر حاضرین پر ٹوٹ پڑنا اور کئی ایک کے سر قلم کر دینا، لزارس کی قسد اور تہہ خانے کا منظر، روما میں ایگنس کے عزلت کدے کا منظر اور ایگنس کے بوپ بننے کا منظر شرر نے پوری جزئیات کے ساتھ بڑے حسین انداز میں پیش کیا ہے - موقع محل کے مطابق ان مناظر کی ہیبت، شوکت اور رنگینی پوری اجاگر ہوتی ہے -

جذبات نگاری، تصویر کشی اور مرقع نگاری کے ساتھ ساتھ شرر نے کرداروں کی سراپا نگاری بھی کی ہے - ایموجن، ایگنس، مرقس اور سلمیٰ کی سراپا نگاری پر انھوں نے خصوصی توجہ دی ہے - دیگر ناولوں کے برعکس یہاں یہ سراپا نگاری اختصار کے ساتھ کی گئی ہے - اس میں مختلف جذبات اور نفسیاتی کشمکشوں کی کیفیت کے رنگوں نے حسین امتزاج پیدا کیا ہے -

اس ناول میں ایک موقع پر زود نویسی کی وجہ سے تضاد پیدا ہو گیا ہے مسلمان لڑکی کا نام جب اسے رہائی دلائی جاتی ہے، سلمیٰ بیان کیا جاتا ہے اور جب آخری باب میں وہ ایگنس سے ملتی ہے تو اپنا نام عائشہ بیان کرتی ہے اس کی کوئی توجیہہ موجود نہیں -

۸- فتح اندلس

پلاٹ :

فتح اندلس کا پلاٹ اپنے قصے کے اعتبار سے سیدھا سادہ پلاٹ ہے، لیکن شرر نے ہنروری اور فن کاری سے اس میں بعض مقامات پر ایسی الجھنیں پیدا کی ہیں جن کی بدولت اس میں قدرے تجسس کا عنصر پیدا ہو گیا ہے جو دلچسپی کو بڑھاتا ہے - یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تجسس اور نشیب و فراز کی یہ صورتیں ان کے پہلے ناولوں کی نسبت یہاں کم ہیں لیکن اس کے باوجود ناول کی دلچسپی میں فرق نہیں آیا - غالباً اس کی بڑی وجہ اس ناول کے لیے منتخب کردہ عہد اور اسلامی تاریخ کا وہ روشن واقعہ ہے جس نے ہسپانیہ میں صدیوں کے لیے اسلامی حکومت کی بنا ڈالی -

ناول کے واقعات کا خلاصہ چوتھے باب میں بیان کیا جا چکا ہے - سطور ذیل میں ناول کے پلاٹ کے ارتقا کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے - پلاٹ کا آغاز اس واقعے سے ہوتا ہے کہ

عیسیٰ بن مزاحم ایک مختصر سی فوج کے ساتھ والیٔ افریقہ اور اسلام کے نامور جرنیل موسیٰ بن نصیر سے ملنے جا رہا ہے تا کہ دونوں مل کر سبتہ پر چڑھائی کر سکیں لیکن عیسیٰ بن مزاحم کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے شوق کا محرک کچھ اور بھی ہے، جس کے بارے میں وہ چنداں پر اسد نہیں۔ پہلے باب میں قاری اس محرک کو جاننا چاہتا ہے۔

عیسیٰ بن مزاحم اور موسیٰ بن نصیر کی سبتہ پر حملے کی تیاری کی خبر سبتہ کے حاکم جولین کو بھی ہو جاتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عیسیٰ نے یہ مہم جولین کی خوبصورت بیٹی فلورنڈا کے حسن کی شہرت سن کر اس کے حصول کے لیے اپنے ذمے لی ہے۔ جولین نے بادل ناخواستہ بٹی کو شہنشاہ ہسپانیہ راڈرک کے پاس طلیطلہ بھیج دیا اگرچہ وہ سن چکا تھا کہ راڈرک ہوس پرست ہے نیز وہ اس کے سسر شاہ وٹزا کا قاتل بھی تھا۔

اسلامی لشکر نے سبتہ کا محاصرہ کر لیا، جنگ نے طول کھینچا لیکن شدید محاصرے اور ناکہ بندی کے باوجود جولین مقابلے پر ڈٹا رہا تاآنکہ فلورنڈا کی طرف سے اسے یہ پیغام پہنچا کہ اس کی عزت خطرے میں ہے۔ یہاں شرر نے دلچسپی بڑھانے کے لیے تجسس کا عنصر پیدا کیا ہے۔ مریم کا کردار اس مرحلے پر سامنے آتا ہے، وہ راڈرک کے دست ہوس سے بچنے کے لیے فلورنڈا کے کمرے میں پناہ لیتی ہے لیکن راڈرک اسے زبردستی کھینچ لے جاتا ہے۔ قاری مریم کے انجام کے بارے میں سوچتا ہے اور فلورنڈا کی پریشانی کا انجام بھی جلد معلوم کرنا چاہتا ہے۔ مریم تو حیلے بہانے راڈرک کے دست ستم سے بچ جاتی ہے لیکن فلورنڈا کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔

جولین بیٹی کا پیغام ملتے ہی موسیٰ سے صلح کر لیتا ہے اور اسے آمادہ کرتا ہے کہ وہ سپین پر حملہ آور ہو۔ گویا ناول کے پلاٹ میں فلورنڈا کے ساتھ راڈرک کی بدسلوکی ناول کے پلاٹ کو آگے بڑھانے کا باعث بنتی ہے۔ موسیٰ بن نصیر، عیسیٰ بن مزاحم اور دیگر مسلم سالاران لشکر اب سبتہ کے قلعے میں قیام پذیر ہیں اور سپین پر حملے کے لیے امیرالمومنین کی اجازت کے منتظر۔ اسی دوران مریم سبتہ پہنچتی ہے اور ایک آدھ واقعہ ایسا ہوتا ہے کہ عیسیٰ یقین کر لیتا ہے کہ وہ فلورنڈا ہے۔ اب عیسیٰ مریم کا دیوانہ ہے لیکن اس کا تصور یہی ہے کہ وہ فلورنڈا ہے۔ اس اتفاق اور غلط فہمی سے ناول کے پلاٹ میں ایک نیا موڑ واقع ہوتا ہے اور دلچسپی کے نئے سامان پیدا ہوتے ہیں۔

کچھ عرصے بعد فلورنڈا بھی آ پہنچتی ہے اور عیسیٰ اب تذبذب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اصل فلورنڈا کون سی ہے۔ لیکن وہ یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اصل فلورنڈا کوئی بھی ہو وہ اسی کو چاہے گا جس کو پہلے دیکھا ہے۔

فلورنڈا کے واپس پہنچنے کے بعد پلاٹ تیزی سے ارتقا کے مراحل طے کرتا ہے۔ جولین اور فلورنڈا کے رویے میں تبدیلی کی حقیقت آشکار ہوتی ہے اور عیسیٰ کے فیصلے کے بعد فلورنڈا انتقام کے پہلوؤں پر سوچنے لگتی ہے۔ عیسیٰ کمک لے کر سپین چلا جاتا ہے، مریم بھی وہاں اس سے جا ملتی ہے، لیکن سپین میں فلورنڈا نئے روپ میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنے حسن کا سہارا لے کر لوگوں کو مریم او عیسیٰ سے انتقام لینے کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ فلورنڈا کی بدنیتی کا بھید میدان جنگ میں کھلتا ہے جب وہ مردانہ لباس میں ایک نائٹ ڈانڈولو کے ساتھ مل کر عیسیٰ پر حملہ آور ہوتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے اور ڈانڈولو زخموں سے چور نیم مردہ حالت میں بے ہوش پڑا ہوتا ہے۔

پلاٹ میں تجسس کا عنصر اس مرحلے پر پھر ابھرتا ہے جب مریم اپنے باپ سے ملنے سینٹ مارٹن کی خانقاہ میں جاتی ہے۔ فلورنڈا اسے فریب دے کر قید کر دیتی ہے پھر اسے خوفناک منظر میں جہاں ہر طرف ہڈیوں کے ڈھانچے اور صلیبیں ہیں روحوں کے دربار میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں ڈانڈولو بھی آتا ہے اور روح کی حیثیت سے مریم کو خوفزدہ کرتا ہے۔ چند لمحوں بعد جب عیسیٰ اور اس کے سپاہی وہاں جا پہنچتے ہیں تو فاری اور مریم دونوں پر اس ڈرامے کا سارا طلسم کھلتا ہے۔ مریم کی سفارش پر فلورنڈا اور ڈانڈولو کو دوبارہ معاف کر دیا جاتا ہے۔

اب پلاٹ کا ارتقا صرف اس نکتے سے وابستہ ہے کہ مریم اور عیسیٰ کی محبت کا کیا انجام ہوتا ہے اور اسی سلسلے میں قلعہ قلطرادہ کے محاصرے اور پھر عیسائیوں کے فریب میں آ کر صلح کر لینے کے واقعات بھی آتے ہیں اور وہیں مریم کے باپ ڈان پڈرو سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ مریم نے عیسیٰ سے شادی کا مسئلہ باپ کی رضامندی پر ٹھہرا رکھا تھا۔ یہاں جو تجسس تھوڑی دیر کے لیے ابھرتا ہے وہ جلد ہی ختم ہو جاتا ہے ڈان پدرو عیسیٰ سے مریم کی شادی کر دینے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک بار پھر فلورنڈا کو معافی دی جاتی ہے۔

اس مرحلے پر ناول کا پلاٹ تقریباً مکمل ہو چکا ہے، اب تجسس کے ایسے نمایاں پہلو باقی نہیں رہے جن کی خاطر پلاٹ کو آگے بڑھایا جائے لیکن چونکہ شرر کو موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کی اندلس سے واپسی اور دربار خلافت میں حاضری کے واقعات بیان کرنے منظور ہیں اس لیے وہ عیسیٰ اور مریم کو دمشق کی طرف محو سفر دکھاتے ہیں اور اس کا جواز یہ ہے کہ مریم شاہ وٹزا کی پوتی ہونے کی حیثیت سے جولین سے زیادہ مراعات کی حقدار ہے۔ دربار خلافت سے مریم کے حق میں احکام صادر ہو جاتے ہیں لیکن شرر پھر بھی ناول کو آگے چلاتے ہیں۔ اب ناول میں دلچسپی کا عنصر کمزور پڑنے لگتا ہے۔ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کی معیت میں مریم اور عیسیٰ کا سفر حج اور واپسی وغیرہ چنداں دلچسپی کا عنصر نہیں رکھتے ماسوا اس کے کہ شرر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ حج کے موقع پر اسلامی یگانگت اور اصولوں کا روح پرور منظر دیکھ کر مریم متاثر ہوئی اور اس نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیا۔ شرر نے ناول کو یہیں پر ختم نہیں کیا بلکہ مریم کو واپس پہنچا کر اس کی عزت و تکریم کے منظر دکھائے ہیں اور آخر میں عیسیٰ بن مزاحم کے بارے میں یہ عقدہ کھلا ہے کہ وہ دراصل ڈان پڈرو کا بھتیجا اور وٹزا کا پوتا تھا۔ اس کا باپ افریقہ کی جنگ میں مارا گیا اور اسے غلام بنا لیا گیا تھا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، کہ اس ناول میں تجسس کا عنصر کم ہے اور ناول غیر ضروری طور پر پھیل گیا ہے جس میں پلاٹ کا ارتقا خصوصاً آخری تہائی حصے میں، مفقود ہے۔

کردار :

اس ناول کے اہم کرداروں میں فلورنڈا، مریم، کاؤنٹ جولین، طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر، عیسیٰ بن مزاحم، عبدالعزیز بن موسیٰ، راڈرک اور ڈان پڈرو شامل ہیں۔ فلورنڈا کا ابتدائی تعارف کراتے ہوئے شرر نے دوسرے باب میں اس کا سراپا اس طرح بیان کیا ہے :

"ابھی نہایت ہی کمسن تھی چودہ پندرہ برس سے زیادہ نہ ہوگی اور عین اس حالت اور اس زمانے کی پر امید اور پر حوصلہ راتیں بسر کر رہی تھی جبکہ عنفوان شباب اپنا پہلا جوش دل میں پیدا کرتا ہے

اور بچپن کی لا پروائی اور بے باکی میں ایک نئی جھجک پیدا ہو جاتی ہے ۔ وہ نازک کلی جو پوری پختگی کو پہنچ کے اس بات کی منتظر ہے کہ نسیم سحر یا شام کے ٹھنڈے اور آہستہ خرام ہوا کے جھونکے آئیں اور شگفتہ کریں ۔ یا وہ نو خیز و سادہ مزاج و بے تکلف و خود فراموس نازنین تھی جو بچپن کے میدان سے نکل کے جوانی کے ترو تازہ اور دلفریب و دلربا باغ میں قدم رکھتی ہے ۔ قد میانہ اور بوٹا سا تھا اور تناسب اعضا نے وہ دلربائی کی شان پیدا کر دی تھی کہ کبھی بے باک ہو جانے والی اور کبھی شرم کے فوری جذبات سے جھک جانے والی آنکھوں کا بھولا پن نشانہ انسان کے از خود رفتہ سا دینے کے لیے کافی تھا ۔ اس کے ریشم کے سے نرم نرم بال آبنوس کے سیاہ رنگ میں رنگے ہوئے تھے مگر نہیں آبنوس رو کھا اور بے لطف ہے اور اس کی سیاہ تاب زلفوں میں عقیق البحر کی سی آب و تاب اور چمک تھی ۔ یہ زلفیں ایک بے تکلفی سے لہراتی خم کھاتی اور ایک دوسری سے الجھتی ہوئی آ کے اس کے شانوں اور پیٹھ پر لوٹنے لگتی تھیں اور گویا خود اس کے مزاج کی سادگی اور غیر مصنوعی شوخی کی سچی تصویریں تھیں ۔ رنگ صاف اور بہت ہی گوری بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بلور کی سی شفاف تھی اس لیے کہ مختلف جذبات جلد کے نیچے نیا استر دے دے کے اس گورے چہرے کی رنگت کو وقتاً فوقتاً اور جلد جلد بدلتے رہتے تھے ۔ کبھی خوف اور مایوسی کی زردی ہوتی تھی اور کبھی پیار سے جھجھلا اٹھنے کی سرخی، کبھی یکایک شرما جانے کا پسینہ ہوتا تھا اور کبھی ذرا سی بات میں خوش ہو جانے کی چمک دمک ۔ ناک نہایت ہی سیدھی سڈول تھی اور دونوں نازک اور مدور بھووں کو بہت ہی صفائی اور نمایاں طریقے سے جدا کر رہی تھی ۔ آنکھیں بڑی بڑی، سیاہ اور مست، اور معلوم ہوتا تھا کہ گویا دو وحشی ہرنیوں کو قدرت نے پلکوں کی دو نازک و نرم زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے ۔ ان مست آنکھوں کو جب کسی کی طرف جا کے دیکھتی تو ان میں ایک عجیب قسم کا جادو نظر آتا تھا ۔ یہ پیاری آنکھیں نہایت ہی خوشنما تھیں اور عجب بے زبانی کی زبان سے فصاحت و بلاغت کے ساتھ دلبری اور دل ربائی کے راز کہہ دیا کرتی تھیں ۔ گال کسی قدر معمول سے زیادہ پھولے ہوئے تھے اور ان کے درمیان میں چھوٹا سا دہانہ ہر وقت یہ شان دکھایا کرتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا یا تو منہ تھوتھائے ہوئے ہے یا ہنسی کو بڑی کوششوں سے روک رہی ہے ۔ گویا ڈرتی ہے کہ کہیں پتلے پتلے ہونٹ کھل نہ پڑیں، موتی کے سے آبدار دانت نمایاں نہ ہو جائیں اور وہ بجلی نہ چمک جائے جو آن واحد میں بہت سے دلوں کو پگھلا دیتی ہے یا جلا کے خاک کر دیتی ہے ۔ چھوٹی اور کسی قدر آگے کو ابھری ہوئی ٹھڈی نے چہرے کی بیضاویت کو عجب رعنائی و دلفریبی کے ساتھ نباہا تھا ۔ سینے کا نیا نیا ابھار، شانوں سے کمر تک بدن کا نہایت ہی مناسب ڈھلاؤ کے ساتھ اترنا، پتلی اور بار بار بل کھا جانے والی کمر، بلور کی ترشی ہوئی پنڈلیاں اور کنوار پن کی نزاکت ظاہر کرنے والے چھوٹے چھوٹے نازک پاؤں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس سراپا کے ساتھ جس میں شرر نے زور قلم صرف کر دیا ہے وہ ہمیں فلورنڈا کے کردار کی ان صفات سے متعارف کراتے ہیں کہ وہ باپ کی طرح نڈر اور باہمت ہے ، غیرت مند اور عفت مآب ہے ۔ جولین اسے مسلمانوں کے خوف سے راڈرک کے پاس بھیجنا چاہتا ہے تو وہ وہاں جانے سے ہچکچاتی ہے ۔ اسے راڈرک کی ہوس پرست طبیعت کا علم ہے ۔ چوتھے باب میں فلورنڈا کے کردار کا یہ پہلو اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے ۔ اس باب میں فلورنڈا کے کردار کی عظمت کے ساتھ ساتھ راڈرک کی سفلگی اور ہوس پرستی بھی نمایاں ہوتی ہے ۔ چونکہ فلورنڈا کے کردار میں آگے چل کر نمایاں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اس لیے یہاں ابتدائی کردار اور حالات کی کچھ جھلکیاں بیان کرنی ضروری محسوس ہوتی ہیں تاکہ کردار کا ارتقا واضح ہو سکے ۔

چوتھے باب میں جب فلورنڈا طلیطلہ پہنچی تو راڈرک خود استقبال کو شہر کے باہر آیا اور :

"ٹالیڈو کے پھاٹک کے باہر فلورنڈا کی صورت دیکھتے ہی رادرق پر پہلے تو ایک محویت طاری ہوئی

پھر اپنے آپ کو سنبھال کے تعظیم کے لیے جھکا اور بولا : مجھے نہایت ہی بے صبری سے انتظار تھا کہ نامور اور بہادر جولین کی بیٹی میرے قصر شاہی کو کب روشن کرتی ہے ، فلورنڈا نے مسکرا کے اور اس کے ساتھ ہی ناگواری کی جھلک چشم و ابرو سے دکھا کے جواب دیا : ''یہ شہنشاہ کی قدر افزائی ہے مگر لونڈی اس حیثیت سے نہیں آئی ہے جس طرح سے اندلس کی عام امیر زادیاں آیا کرتی ہیں ۔''

اسی باب میں فلورنڈا کی یہ ذہنی کیفیت بھی بیان ہوئی ہے کہ وہ :

''تنہا کمرے میں ایک گدے پر بیٹھی دل میں کہہ رہی ہے ، رادرق کی نسبت جو کچھ میں نے سنا تھا صحیح تھا اور جیسا خیال کرتی ہوں ویسا ہی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ پاتی ہوں ۔ ہمارے خاندان سے اس نے سلطنت ہی نہیں چھینی بلکہ ہم لوگوں کی عزت و آبرو کا بھی دشمن ہے . . . . ملنے کو تو اس وقت نہایت ہی تعظیم و تکریم سے ملا ہے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے ہر طرح قدر و منزلت کرنے کو تیار ہے مگر دل میں بغض و حسد بھرا ہوا ہے اور نہیں چاہتا کہ وٹرا کے خاندان کا ایک شخص بھی عزت و آبرو کے ساتھ باقی رہ جائے ۔ اس کے تیوروں سے خون کی بو آتی ہے ، اس کے ہر اخلاق میں مکر و فساد چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ کاش اس کے محل میں رہنے کی بجائے اپنے چچاؤں اور پھوپھیوں کے پاس فرانس میں جا کے رہتی اور ایسے بدکار اور شہوت پرست ظالم کا سامنا نہ ہوتا . . . .''

راڈرک نے ایک دن جب تخلیے میں فلورنڈا سے اظہار عشق کیا تو وہ شرمانے کی بجائے کبیدہ خاطر ہو کر مہیب صورت بنا کر بولی :

''آپ بادشاہ ہیں اور ہم لوگ آپ کی رعایا ہیں ۔ بادشاہ کا یہ کام نہ ہونا چاہیے کہ ان لوگوں کی عزت و آبرو لینے کا ارادہ کرے جن کی قسمت کا مالک ہو ۔'' رادرق نے کہا وہ اسے زیادہ عزت دے کے ملکہ بنانے کا تو فلورنڈا نے جواب دیا : ''یہ عزت جس کے لیے تھی اسے مل گئی ۔'' رادرق نے جب یہ کہا کہ : ''فلورنڈا مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ تو ایسی اور اتنی بڑی سنگدل ہے ، میں نے اس وقت تک کسی کی زبان سے ایسے جملے نہیں سنے اور میری درخواست کبھی اس ذات کے ساتھ رد نہیں کی گئی ۔'' فلورنڈا : ''اسی لیے لونڈی نے اشارتاً پہلے ہی ظاہر کر دیا تھا کہ ایسی درخواستوں کو ہر شخص کا مذاق و حالت دیکھ کے پیش کرنا چاہیے ۔ ہر عورت یکساں نہیں اور ہر لڑکی حضور کے شوق پر اپنی عزت قربان نہیں کر سکتی ۔'' رادرق : ''میں بھول گیا تھا کہ تو وٹرا کے خاندان سے ہے اور اس نالائق فرمانروائے سپین کی پوتی (نواسی) ہے . . . تیرا غرور توڑنے کے لیے میں تجھے دکھا دوں گا کہ تجھ سے اچھی اور بدرجہا حسین و نازنین عورتیں میرے ایک ادنیٰ اشارے پر حاضر ہو جاتی ہیں اور یہ بھی بتا دوں گا کہ معزز سے معزز خاندان کی لڑکیوں کے مقابلے میں میں کس طرح اپنی آرزو پوری کر سکتا ہوں ۔'' ''یہ دل میں آگ لگا دینے والے اور کلیجے کو پاش پاش کر دینے والے الفاظ سن کے قریب تھا کہ فلورنڈا آپے سے باہر ہو جائے اور رادرق پر حملہ کر بیٹھے مگر دل میں خیال آیا کہ بالکل بے بس اور دشمن کے ملک میں ہوں ، ضبط کیا ۔''

اس کے بعد فلورنڈا نے اپنے غلام کے ہاتھ باپ کو خط بھیج کر حالات سے مطلع کرتے ہوئے صاف صاف زبانی بھی کہا کہ اگر اس کی جلد خبر نہ لی گئی تو وہ خودکشی کر لے گی ۔

اس باب میں مریم (فلورنڈا کی ماموں زاد بہن) راڈرک کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچنے کے لیے فلورنڈا کے پاس پناہ لیتی ہے لیکن فلورنڈا کی مداخلت کے باوجود راڈرک مریم کو زبردستی کھینچ لے جاتا ہے ۔ اسی رات راڈرک کے محل سے فلورنڈا کے فرار کی کوشش بھی اس کے کردار کے پہلو کو اجاگر کرتی ہے ۔ دوسری صبح جب مریم فلورنڈا کے پاس واپس پہنچتی ہے تو :

''مریم سامنا ہوتے ہی مسکرانے کو تھی مگر فلورنڈا کا افسردہ چہرہ ، رونے سے سوجی ہوئی آنکھیں اور خشک ہونٹ دیکھ کے یکایک بولی : کیوں بہن خیریت تو ہے ۔' فلورنڈا : ہاں خیریت ہے تم اپنی کہو کہ رات کو کیا گزری ۔' اس کے جواب میں مریم نے مسکرا کے آنکھیں جھکا لیں اور زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا ۔ فلورنڈا (حیرت سے اور کسی قدر غضبناک ہو کے) : بے حیائی اور ذلت کی ہنسی ۔''

اس کے بعد فلورنڈا ہر لمحہ پریشانی میں گزارتی رہی - وہ آنے والی رسوائی کے بارے میں سوچ سوچ کر خود اپنے آپ سے الجھتی رہتی ہے اور ہر لحظہ منتظر رہتی ہے کہ کسی صورت وہ عزت و آبرو بچا کر وہاں سے نکل سکے -

دوسرے باب میں ہی جب ایک شب راڈرک فلورنڈا کے کمرے میں چلا آیا تو اس نے پوچھا :

''اس وقت آپ نے کیوں تکلیف کی ؟ ، رادرق : تم خود سمجھ سکتی ہو کہ اس وقت اور ایسے سناٹے کی گھڑی میں سوا دل کی بے تابی اور الجھن کے اور کوئی چیز نہیں لا سکتی -' یہ الفاظ گویا زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے کہ فلورنڈا کے دل پر پڑے - بیتاب ہو کے تڑپ گئی اور ملامت کے لہجے میں بولی : 'افسوس میں نہیں سمجھتی تھی کہ ابا جان مجھے ایسے ظالم کے محل میں بھیجتے ہیں - یہی خیال کیجیے کہ میں آپ کی مہمان ہوں اور مہماں کے ساتھ دغا کرنا اور بیکس پا کے اس کی عزت لینا دنیا میں سب سے بڑا ظلم ہے -'
رادرق (ہنس کے) : ایسی خوشگوار دلچسپیاں ظلم ہی کی صورت میں زیادہ مزے دار ہوتی ہیں ، جس عزت کو میں تمہارے لیے تجویز کر چکا ہوں، چاہو خوشی سے قبول کرو یا ناراضی سے ضرور دوں گا -' یہ کہہ کے پہلے اس نے کمرے کے دروازے اندر سے بند کیے پھر آ کے پلنگ پر بیٹھا اور فلورنڈا کا ہاتھ پکڑ کے اپنی طرف کھینچا - یہ کیفیت دیکھ کے سبطہ کی شہزادی پسینہ پسینہ ہو گئی -''

ان واقعات کے بعد فلورنڈا کے کردار میں تدریجی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں - کچھ دن وہ رنج و ملال اور مظلومی و بے کسی کی تصویر بنی رہتی ہے - وہ تقریباً اپنے حواس میں دکھائی نہیں دیتی ، پھر نارمل ہونے لگتی ہے - سرر نے ان نفسیاتی کیفیتوں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے - اب وہ چاہتی ہے کہ راڈرک کی ہی ہو رہے ، اس لیے وہ باپ کے ساتھ واپس نہیں جانا چاہتی لیکن راڈرک اسے بہلا پھسلا کے ، مجبور کرکے واپس بھیج دیتا ہے - اب اس کی شخصیت میں اس تبدیلی کا پیدا ہونا فطری امر ہے کہ کوئی باعزت فرد اسے قبول کرے گا یا نہیں - اس بنا پر اب وہ خود بخود عیسیٰ کی طرف جھکتی ہے بلکہ اس حد تک کہ اس کی پہلی شخصیت اور موجودہ رویے میں نمایاں تضاد نظر آتا ہے - وہ ہر طرح سے اشاروں کنایوں سے اور بالآخر زبان سے کہہ کر عیسیٰ کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہتی ہے کہ وہ اسے قبول کر لے لیکن وہ اپنی کوشش میں ناکام رہتی ہے اور ناکامی کی اصل وجہ مریم کے وجود کو تصور کرتی ہے - اب وہ اپنے حالات سے مجبور ہو کر انتقام پر اتر آتی ہے اور خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتی ہے - عیسیٰ اور مریم سے انتقام لینے کے لیے اب وہ ہر طرح کی بے حیائی بھی قبول کرتی ہے - نائٹوں سے سرعام عشق کرتی ہے - اس طرح اس کا کردار تیسرے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے -

اس ناول کا دوسرا اہم کردار مریم کا ہے - مریم کا سراپا بیان کرتے ہوئے شرر لکھتے ہیں :

''نہایت ہی کم سن، نازک اندام اور حسین و خوبرو تھی - حسن و جمال کے ساتھ اس میں بلا کی پھرتی اور چالاکی بھی پائی جاتی تھی اور اپنی شوخ اور بے قرار طبیعت کے ہاتھوں گھڑی بھر بھی ایک جگہ قرار نہ لے سکتی تھی - اس کی سیاہ چمکدار زلفیں ایک سادی نیلی اور نیلوفر کے پھول کی سی ٹوپی کے نیچے سے نکل کے پیٹھ اور شانوں پر بکھری ہوئی تھیں - گوری اور چاند کی ایسی چمکدار پیشانی کے نیچے پتلی اور قوس نما بھوویں عاشق کشی کے لیے ہر وقت کھنچی رہتی تھیں اور ان بڑی بڑی نیلی اور دلستاں آنکھوں پر سایہ کیے رہتی تھیں جنھوں نے صبح کے اور شبنم سے دھوئے ہوئے آسمان کی رنگت اڑائی تھی - لمبی

نوکدار پلکیں یوں تو ریشم سے بھی زیادہ نرم و نازک تھیں مگر ابرو کی کمانوں کے تیر بنتے اور دل میں چبھتے وقت ہیرے کی کنی سے بھی زیادہ سخت اور تیز بن جاتی تھیں ، ان آنکھوں سے شرم و ندامت کے جذبات بار بار ظاہر ہوتے اور فوراً پاکدامن دوشیزگی کا ثبوت دے کے غائب ہو جاتے ۔ گورے گلابی گال اپنی خوش رنگی اور نزاکت کی وجہ سے گلاب کے پھول بنے ہوئے تھے اور اُن سے قریب بلند اور سانچے میں ڈھلی ہوئی ناک گویا یاسمین کی ناشگفتہ کلی تھی ۔ یوں تو پھول معمولاً کڑی دھوپ میں کملانے لگتے ہیں مگر یہ اس قدر نازک تھے کہ نظر شوق کی بھی تاب نہ لا سکتے تھے اور کسی سے چار آنکھیں ہوتے ہی ایک عجیب لطف کے ساتھ کمھلا جاتے تھے اور خصوصاً ان کی وہ نرم و نازک پنکھڑیاں جو دنیا میں ہونٹوں کے لفظ سے یاد کی جاتی ہیں اور جو دانتوں کے موتیوں کو شبنم کے قطروں کی طرح اپنے دامن میں چھپائے رہتی تھیں ۔ اس دلربا صورت کے ساتھ اس کا لباس بھی ایسا مناسب اور دلفریب واقع ہوا تھا . . . " (چھٹا باب) ۔

شرر نے مریم کے لباس کی جو تفصیلات بیان کی ہیں انھیں خوف طوالت سے یہاں نقل نہیں کیا جا رہا ۔

مریم کے کردار میں پاک دامنی ، احسان مندی ، وفاداری اور خلوص کی صفات بدرجہ اتم ہیں ۔ ان صفات کو برقرار رکھنے کے لیے وہ شدید الجھنوں میں مبتلا ہوتی ہے اور اس کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش ان مراحل پر صاف اجاگر ہے ۔ گیارھواں باب مریم کی ذہنی کشمکش کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتا ہے ۔ مریم کے کردار میں شرم و حیا کا عنصر بھی نمایاں ہے ، وہ عیسیٰ سے اپنی محبت کے اقرار میں ایک لفظ بھی زبان سے ادا نہیں کرتی ۔ گیارھویں اور اٹھارھویں باب میں شرم و حیا کی یہ کیفیتیں مریم کے کردار کی نسوانیت کو جلا بخشتی ہیں ۔ مریم کے دل میں عیسائیت اور اس کے طفیل راہبوں کی بڑی قدر ہے ۔ اکیسویں باب میں خانقاہ میں مریم پر جو تشدد کیا گیا، اس کے بعد اسے عیسائیت سے متنفر ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس نے اپنے عقیدے کو برقرار رکھا نیز اس تشدد کے بعد اس کا ذہنی توازن کھو بیٹھنا ضروری تھا لیکن عیسیٰ نے اس کا نفسیاتی علاج کیا اور اس کے سامنے راہبوں اور ننوں سے وہی خوفناک ڈرامہ دوبارہ کرایا جسے پہلی بار مریم روحوں کا دربار سمجھ کر بے ہوش ہو گئی تھی ۔ باپ بیٹی کی ملاقات کے موقع پر بھی مریم کے کردار کی عظمت اور اس میں زندگی کی چمک صاف جھلکتی ہے ۔ مریم تمام تشدد سہنے کے باوجود اور جولین اور فلونڈا کی بدسلوکی کے باوصف ہر بار فلورنڈا کی جان بخشی کی سفارش کرتی ہے ۔

کاؤنٹ جولین کا تعارف کراتے ہوئے شرر لکھتے ہیں :

"بڑے بڑے بال شانوں اور پیٹھ پر پڑے، داڑھی منڈھی ہوئی، بڑی بڑی مونچھیں گالوں پر اڑ رہی تھیں ۔ مذہبی خوش اعتقادی یعنی راہبوں کی تقلید میں چندیا منڈی تھی اس پر ایک سادہ اونی ٹوپی چپکی تھی ۔ بھویں باہم جڑی ہوئی ، کسی دلی جوش یا غصے کے موقعے پر دونوں دو مستقیم خطوں کی طرح مل کے ناک پر ایک زاویہ منفرجہ پیدا کر دیتی تھیں جس کے نیچے دونوں طرف عقاب کی سی چھوٹی اور روشن و تیز آنکھیں دلوں پر نہایت ہی گہرا اور مہیب اثر ڈالتی تھیں ۔ ناک معمول سے زیادہ اونچی تھی، اوپر کا ہونٹ نیچے کے ہونٹ سے بہت بڑا تھا اور عام ہسپانیہ والوں کی طرح چہرے کے تمام خط و خال زیادہ ابھرے، نمایاں اور متاثر تھے ۔"

جولین بہادر ، شجاع اور غیور تھا ۔ اس نے مسلمانوں کی یلغار کو عرصے سے روک رکھا تھا ۔ وہ مسلمانوں کے حملے سے ہرگز ہراساں نہیں تھا لیکن یہ خبر اس کے لیے باعث پریشانی بن

گئی کہ عیسیٰ کا اس جنگ میں مطمح نظر فلورنڈا کا حصول ہے ۔ جولین راڈرک کے اخلاق کو بھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتا تھا لیکن فلورنڈا کی حفاظت کے لیے وہ اسے راڈرک کے پاس بھیجنے پر مجبور تھا ۔ اس موقع پر اس کی نفسیاتی کشمکش نمایاں ہے ۔ جولین تمام نامساعد حالات کے باوجود موسیٰ بن نصیر کے لشکر کے مقابلے پر ڈٹا رہا لیکن طلیطلہ سے فلورنڈا کا پیغام ملتے ہی اور مریم سے حالات سنتے ہی وہ راڈرک سے انتقام پر آمادہ ہوگیا ۔ اس نے موسیٰ سے نہ صرف صلح کر لی بلکہ شہر اس کے حوالے کر دیا اور سپین پر حملے میں ہر مدد کا یقین دلایا ۔

نویں باب میں جولین کے کردار میں بہت اہم تبدیلی رونما ہوتی ہے ۔ اگرچہ اس تبدیلی کا بنیادی محرک فلورنڈا کا راڈرک کے ہاتھوں بے حرمت ہونا ہے لیکن یہ تبدیلی شرر نے کچھ اس انداز میں پیدا کی ہے کہ جولین کا کردار مسخ ہو کر رہ گیا ہے ، غیرت مند اور شجاع جولین فلورنڈا کے سبتہ پہنچنے کے بعد موسیٰ سے مل کر بیٹی کے حسن کی جس انداز میں تعریف کرتا ہے اسے سن کر موسیٰ شرم سے سر جھکا لینے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ جولین نہ صرف یہ کہ فلورنڈا کے حسن کی مدح اور اس کے جسم کے ہر ہر عضو کی تعریف بہت عریانی کے ساتھ کرتا ہے بلکہ مصر ہے کہ عیسیٰ مریم سے دستبردار ہو کر فلورنڈا کو اپنائے ۔ شرر نے جولین کے کردار کو پستی کی طرف دھکیلنے میں اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لکھا کہ اس نے مریم اور فلورنڈا دونوں کو بلا کر موسیٰ کے سامنے کھڑا کیا اور ان کے حسن کا موازنہ کرنے لگا ۔ اتنی بڑی تبدیلی کے لیے شرر کوئی جواز نہیں پیش کر سکتے اور وہ سارے نفسیاتی محرکات جو اس ضمن میں بیان کیے گئے ہیں اس تبدیلی کے مقابلے میں بہت کم دکھائی دیتے ہیں ۔ موسیٰ بن نصیر کے کردار کا بہت سا حصہ بھی اس باب میں اجاگر ہو جاتا ہے ۔ شرر نے اس تاریخی شخصیت اور اسلام کے نامور جرنیل کو بہت کم سامنے لا کر اسے اپنی رنگ آمیزی سے بچا لیا ہے ۔ یہی کیفیت طریف اور طارق بن زیاد کے کرداروں کی ہے ۔ ان کی شخصیتیں صرف جنگوں اور بعض تنظیمی امور کے سلسلے میں سامنے آتی ہیں اور پھر پس منظر میں چلی جاتی ہیں ۔ طریف کی پہلی مہم پر جب جولین موسیٰ سے گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک غلام نے مٹھی بھر سپاہیوں سے کتنی آسانی سے مہم سر کر لی ہے تو موسیٰ بن نصیر کے چہرے پر تکدر کے آثار فوراً ابھر آتے ہیں اور وہ جولین کی بات کی تردید کرتے ہیں ۔ عبدالعزیز بن موسیٰ کا کردار بھی صرف اہم جنگی مہمات سے وابستہ رکھا گیا ہے اور تاریخی ناول کے فن کے نقطہ نظر سے تاریخی کرداروں کو اس سے زیادہ چھیڑنا مناسب بھی نہیں تھا ۔

عیسیٰ بن مزاحم کا کردار شرر کے تاریخی ناولوں کے روایتی ہیرو کا کردار ہے ۔ فلورنڈا کے حسن کا شہرہ سن کر غائبانہ عاشق ہونا ۔ شجاعت کے کارنامے سرانجام دینا ، فلورنڈا کے دھوکے میں مریم سے ملنا ، مریم کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو جانا ، فلورنڈا سے ملنا اور اس کے برملا اظہار عشق کے باوجود اسے ٹھکرا دینا وغیرہ روایتی عاشقانہ شان ہے البتہ فلورنڈا اور مریم دونوں کی اصلیت جاننے کے سلسلے میں وہ تذبذب سے دو چار ہے اور جس ذہنی الجھن اور نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہے اس سے اس کے کردار میں تھوڑی بہت جان پیدا ہو جاتی ہے ۔

ڈان پڈرو عیسائیت میں پختہ عقیدہ رکھتا ہے اور سینٹ مارٹن سے اسے گہری عقیدت ہے ۔ مریم اور ڈان پڈرو کی باہمی گفتگو ڈان پڈرو کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے لیکن آخری باب میں شرر نے ڈان پڈرو کی زبان سے بھی مریم کے لیے ایک ویسا ہی فقرہ ادا

کروا دیا ہے جیسا وہ ورجنا کے لیے صلاح الدین کی زبان سے اور بلغان خاتون کے لیے اس کے بھائی منقو خان کی زبان سے ادا کروا چکے ہیں ، ڈان پڈرو کو جب پتہ چلتا ہے کہ عیسوا اس کے مرحوم بھائی کا بیٹا ہے تو وہ برملا کہہ دیتا ہے : "الحمد للہ کہ میری بیٹی کسی غلام کی بی بی نہیں بلکہ اپنے ابن عم کی معشوقہ ہے - - - -" (چھبیسواں باب)

زبان و بیان :

ناول کے مکالمے بحیثیت مجموعی کرداروں اور واقعات سے ہم آہنگ ہیں ماسوائے ان مقامات کے جن کا ذکر جولین اور ڈان پڈرو یا فلورنڈا کے سلسلے میں کیا گیا ہے - مکالمے برجستہ اور بر محل ہیں ، کرداروں کی تکمیل اور واقعات کے ارتقا میں ممد ثابت ہوتے ہیں -

منظر نگاری کے معاملے میں اس ناول میں بھی وہی رنگ ہے جو اس سے پہلے ملک العزیز ورجنا اور دیگر تاریخی ناولوں کے سلسلے میں پایا جاتا ہے بالخصوص ایسے ناول جن میں اسلامی لشکر عیسائیوں سے نبرد آزما ہے - اس ناول میں خصوصیت کے ساتھ سبتہ کے قلعے اور قلعہ بندی کے مناظر ، طارق اور راڈرک کی فوج کے مقابلے کے مرقعے اور سینٹ مارٹن کی خانقاہ کے ہولناک منظر کی تصویریں بہت جاندار ہیں - نائٹوں کے عشق اور لڑائی کی تصویریں بھی دلچسپ اور جاندار ہیں - یہ ناول اپنے پلاٹ ، ان مرقعوں اور کرداروں کے باعث شرر کے مقبول ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے -

۹- یوسف و نجمہ

یہ ناول اپنے قصے کے اعتبار سے سیدھا سادہ پلاٹ رکھتا ہے - قصے کا خلاصہ چوتھے باب میں دیا جا چکا ہے - ناول چونکہ خود ہیرو کی زبان سے بیان کیا گیا ہے اور تکنیک کے اعتبار سے گویا یہ ہیرو کی آپ بیتی ہے ، اس لیے ہم شروع قصہ سے ہی ناول کے انجام سے باخبر ہو جاتے ہیں صرف پلاٹ کی درمیانی کڑیوں کا جاننا باقی رہ جاتا ہے - اس تکنیک سے لکھے گئے ناولوں میں تجسس کے عنصر کو برقرار رکھنا دیگر ناولوں کی نسبت قدرے مشکل ہوتا ہے اسی لیے شرر نے اس میں تجسس کا عنصر پیدا کرنے کے لیے افراد قصہ کی تعداد کافی بڑھائی ہے اور دیگر فنی ذرائع بھی اختیار کیے ہیں -

شرر نے اس ناول کے پلاٹ کی ترتیب میں فنی چابکدستی سے کام لیتے ہوئے جگہ جگہ ایسی پیچیدگیاں پیدا کی ہیں جو پلاٹ کا نقطہ عروج قرار دی جا سکتی ہیں مثلاً کیونسیر پہنچنے کے بعد بظاہر یوسف کی مشکلات کا خاتمہ ہوتے دکھائی دیتا ہے لیکن یوسف کی کارگزاری کا اصل نقطہ آغاز وہی ہے - شرر نے "یوسف و نجمہ" میں اتفاقات و مقدرات کا سہارا بہت کم لیا ہے اور پورا پلاٹ مسلسل جدوجہد ، کامرانیوں اور ناکامیوں سے عبارت ہے ، ناول کے کردار بے جان پتلیاں نہیں بلکہ گوشت پوست کے زندہ اور فعال انسان ہیں - پلاٹ نہایت مربوط ہے اور شروع سے آخر تک اس میں کوئی خلا نہیں -

ناول کا آغاز چونکہ یوسف اپنی تین سال کی عمر کے واقعات کے بیان سے کرتا ہے اس لیے اس کے والدین کے بارے میں جاننے کا تجسس ہوتا ہے لیکن وہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کون تھے - اس کے بیان کردہ واقعات سے یہ بات تو کھل جاتی ہے کہ اس کی ماں حملہ آور ڈاکوؤں

کے ہاتھوں ماری گئی لیکن اس کا باپ کون تھا ؟ وہ بھی مارا گیا یا بچ نکلا ؟ وہ کہاں جا رہا تھا ؟ اس واقعے کے بعد اس کے باپ پر کیا بیتی وغیرہ قسم کے سوال فوراً ذہن میں ابھرتے ہیں ۔ دوسرے باب میں اس جانئے وقوعہ سے گزرنے والے مسلح دستے اور اس نوجوان کے بارے میں تجسس پیدا ہوتا ہے جو ماں کی لاش سے چمٹے ہوئے اس تین سالہ بچے کو اٹھا لاتا ہے ۔ بچہ نئے گھر میں کچھ نئے اشخاص سے متعارف ہوتا ہے ، لیکن یہ کون لوگ ہیں اور یہ کون سی جگہ ہے ؟ یہ نئے سوال سامنے آتے ہیں ۔

چھٹے باب میں مولوی جلال الدین کے قتل کا واقعہ تجسس کا عنصر لیے ہوئے ہے ۔ وہ شخص کون تھا جس نے مولوی صاحب کو قتل کیا ؟ کیوں قتل کیا ؟ قتل سے پہلے وہ مولوی صاحب کے پاس بیٹھا ان سے کیا باتیں کر رہا تھا ؟ وہ گفتگو غالباً یوسف کے متعلق تھی لیکن کیا گفتگو تھی ؟ مولوی صاحب کے قتل کے بعد وہ شخص یوسف کو کیوں اٹھا لے جانا چاہتا تھا ؟ اور اس نے جاتے ہوئے یوسف سے یہ کیوں کہا تھا کہ ایک دن یوسف کو اس کے ساتھ چلنا پڑے گا ؟ اس قسم کے بہت سے سوال تجسس کا باعث بنتے ہیں ۔

ساتویں باب میں جہاں یوسف کے اس نئے گھرانے کے لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں وہاں یہ نیا واقعہ تجسس پیدا کرتا ہے کہ ان کے گھر پر حملہ آور ہونے والا کون تھا ؟ یوسف ، نجمہ ، قاسم مرزا ، اماں جان اور کلثوم تو بچ نکلے لیکن ملک نصیرالدین افتخار الملک کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا ۔ ان کے بارے میں جس طرح اہل خانہ متردد ہیں اسی طرح قاری بھی متجسس ہے ۔ خانماں برباد قافلہ دکھ اور مصیبتیں جھیلتا بڑھتا جا رہا تھا کہ پھر ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا ۔ دسویں باب میں مرزا ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہوا اور باقی سب قید ہو گئے ۔ اب پلاٹ میں نشیب و فراز بڑھتے جاتے ہیں ، دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے ۔ کئی سوال پیدا ہوتے ہیں ۔ کیا ڈاکوؤں سے انھیں رہائی مل سکے گی ؟ وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکیں گے اور یوسف کے منہ بولے باپ کا کچھ پتہ چلے گا ؟ بارھویں باب میں ڈاکوؤں کی باہمی گفتگو سے کچھ عقدے کھلتے ہیں اور پہلے باب میں ابھرنے والے بعض سوالات کا جواب مل جاتا ہے ۔ ڈاکوؤں کا سردار خان اور حبشی مراد دو ایسے فرد ان ڈاکوؤں میں موجود ہیں جنھیں ان کی گفتگو سن کے یوسف نے پہچان لیا ہے کہ وہی اس کی ماں کے قاتل ہیں ۔ یوسف کے والد کے بارے میں بھی کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ زندہ ہے یا نہیں ۔

تیرھویں باب میں خان ڈاکو نے نجمہ کو یوسف وغیرہ سے الگ کر لیا ہے جس سے ناول میں تجسس کا ایک اور عنصر ابھرا ہے لیکن چودھویں باب میں حالات یک دم بدل جاتے ہیں ۔ پلاٹ میں موڑ واقع ہوتا ہے اور پھر سکون پیدا ہو جاتا ہے ۔ نہ صرف نجمہ بلکہ وہ سب ڈاکوؤں کے ایک رحم دل ساتھی نصرت خاں کی کوشش سے رہائی حاصل کر لیتے ہیں اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر افتاں و خیزاں چلتے ہوئے کیونسیر کے راجا کے پاس جا پہنچتے ہیں ۔ راجا ان کی میہانداری کرتا ہے ، اور تسلی دیتا ہے اور دہلی جانے والے ایک لشکر کے ہمراہ دہلی بھجوانے کا وعدہ کرتا ہے ۔ اب پلاٹ میں ٹھہراؤ پیدا ہو چلا تھا کہ کچھ اور واقعات رونما ہوئے ۔ ڈاکوؤں میں سے ایک جوگیوں کے روپ میں ان کے مکان تک جا پہنچا ۔ کسی نے رات کو مکان کی دیوار پھاندنے کی کوشش کی ۔ ان کے مسلمان میزبان سراج الدین اور راج کنور کو بھی مکان

کی دیوار کے ساتھ باتیں کرتا سنا گیا ۔ راج کنور کے ارادے بھی نجمہ کے بارے میں اچھے نہیں۔ یہ سب کیا ماجرا ہے اور آگے کیا ہوگا ؟ یہ سوالات دلچسپی بڑھاتے ہیں ۔

اٹھارہویں باب میں یوسف اپنے ساتھیوں سمیت جودہ پور جا پہنچا ہے جہاں سے وہ کنور کے عظیم الشان لشکر کے ہمراہ دہلی کے لیے روانہ ہوں گے ۔ بظاہر اب معاملات سمٹ رہے ہیں لیکن انیسویں باب میں پھر پلاٹ میں فراز شروع ہوتا ہے ۔ حاجی محمد صالح نامی ایک شخص یوسف سے مل کر اپنے ساتھیوں سمیت اس کا مہمان بنتا ہے اور پھر کنور رگھبیر کے ہمراہ سب دہلی کو روانہ ہوتے ہیں لیکن بائیسویں باب میں محمد صالح کی شخصیت سے پردہ اٹھتا ہے اور پلاٹ میں پھر ایک موڑ واقع ہو جاتا ہے ۔ حاجی صالح ٹھگ تھا جو موقع ملتے ہی نجمہ کو اغوا کر لے گیا ۔ کنور کی ہدایت پر یوسف کے ہمراہ کئی اور سپاہی بھی جوگیوں اور سادھوؤں کے لباس میں نکلے اور کئی افسر سپاہی ان کی نگہداشت پر مامور ہوئے ۔ ایک اور سادھو کے ملنے سے انھیں نجمہ کے بارے میں کچھ علم ہوتا ہے اور وہ پیچھا کرتے ہیں ۔ تئیسویں باب میں نجمہ کا سراغ ملتا ہے ، چوبیسویں باب میں یوسف اور اس کے ساتھی نجمہ کو حاصل کر لیتے ہیں لیکن اچانک ایک نئی افتاد آ پڑتی ہے ۔ تجسس پیدا ہوتا ہے کہ یوسف اور اس کے ساتھیوں کو اس طرح اچانک آ کر گرفتار کر لینے والے کون لوگ ہیں ؟ یہ سوال ابھی برقرار ہی ہوتا ہے کہ ایک اور واقعہ رونما ہوتا ہے اور اب یوسف وغیرہ کو قید کرنے والے خود بھی قید ہو جاتے ہیں ۔ اب حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ یوسف اور ساتھیوں کو قید کرنے والے خان ڈاکو اور ساتھی تھے اور اب وہ خود بھی یوسف وغیرہ کے ہمراہ کنور رنبیر سنگھ کے لشکر کے ہاتھوں میں اسیر ہیں ۔ ابھی تذبذب کی یہ کیفیت باقی ہوتی ہے کہ ملک نجم الدین ضیاء الملک لشکر لیے آ پہنچتا ہے اور تمام قیدیوں ، سادھوؤں ، ڈاکوؤں اور رنبیر سنگھ سمیت اس کے لشکر کو سلطان فیروز شاہ کے حکم کے مطابق اپنی حراست میں دہلی لے جاتا ہے ۔ سلطان کے دربار میں سب بچھڑے مل جاتے ہیں اور مختلف لوگوں کی شخصیت سے پردے اٹھتے ہیں جن کا ذکر قصے کے خلاصے میں چوتھے باب میں ہو چکا ہے ۔ اس طرح ناول کا اختتام ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے اس سارے نشیب و فراز کے بعد اطمینان کی کیفیت ابھرتی ہے ۔

کردار :

ناول کا ہیرو یوسف ہے جس کی تربیت اس زمانے کے شریف زادوں کی طرح ہوتی ہے ۔ تحصیل علم کے بعد اس نے فنون حرب کی تعلیم حاصل کی ۔ یوسف اگرچہ مصائب و آلام کے باعث اوائل عمر ہی سے سنجیدہ اور پختہ کار ہو گیا ہے لیکن وہ فطرتاً سادہ مزاج ہے اسی لیے وہ حاجی محمد صالح سے فریب کھا جاتا ہے اور سراج الدین خان کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے ۔ اس کی طبعی شرافت اس غلط فہمی پر اسے خود ہی نادم کرتی ہے اور وہ اپنی بدگمانی کا ذکر خود ہی کرکے سراج الدین خان سے معافی مانگ لیتا ہے ۔ محبت میں وہ تہذیبی قدروں اور مشرقی شرافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا ۔ یوسف کے کردار کی بڑی خوبی یہ ہے کہ شرر نے اس کے بیان میں اس کی مختلف ادوار کی عمر سے مطابق ذہنی سطح ، نفسیاتی کیفیت اور انداز بیان پر کڑی نظر رکھی ہے ۔ مثلاً پہلے باب میں یوسف اپنی تین برس کی عمر کے واقعات بیان کر رہا ہے تو انداز بیان اسی عمر کی یادداشت اور سطح کے مطابق ہے کہ :

''جو شخص مجھے گود میں لیے ہوئے ہے اس کی داڑھی چڑھی ہوئی ہے اور مونچھیں بڑی ہونے کے ساتھ ہر وقت چڑھی رہتی ہیں ۔ اس کی مونچھیں مجھے کبھی نہ بھولیں گی اس لیے کہ بار بار جب وہ پیار کرنے کے لیے اپنی طرف دباتا تھا تو وہ ظالم مونچھیں اپنی سختی اور کرختی کی وجہ سے مجھے اپنے بچپن کے نرم گالوں پر نہایت ناگوار معلوم ہوتی تھیں . . . . اس کی کمر میں ایک تلوار تھی ، ایک پیش قبض یا چھری (جو کچھ ہو) ناف کے پاس اس کے چادرے کے اندر اڑسی ہوئی تھی اور اس کا قبضہ اوپر نکلا ہوا تھا جو بار بار میرے پاؤں میں گڑتا تھا لیکن چھگل کا خوف اس قدر غالب تھا کہ اس قدر مانوس تکلیفوں کا خیال بھی نہ کرتا تھا ۔''

اسی باب میں جب یوسف کو ایک ہمدرد مل جاتا ہے تو اس کے متعلق یوسف کا بیان بھی عمر کی اس سطح سے بڑی مطابقت رکھتا ہے کہ :

''اپنے ان حقیقی ہمدردوں کے بعد اب مجھے کوئی اپنا ہمدرد اگر ملا بھی تو وہ یہی شخص تھا ۔ اس کے یکایک نے کہیے چلے جانے پر مجھے ایسا صدمہ ہوا کہ یکایک میں گھبرا کر رونے لگا ۔ وہ اجنبی شخص جس کے پرتلے سے میں کھیل رہا تھا اس نے دیکھ کے مجھے تسلی دی اور کہا ''روؤ نہیں وہ آتے ہی ہوں گے ۔''

پہلے باب میں یوسف نے اپنے بچپن کی یادداشت کے زور پر اپنی ماں کی لاش کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں ان میں اس واقعے کے وقت اس کی عمر کی مناسبت سے بچپن کا بھولاپن جھلکتا ہے ۔

شرر نے یوسف کی نفسیاتی کیفیتوں کو بھی بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے ۔ جب ڈاکو نجمہ کو ان سے الگ قید کرنے کے لیے لے جانا چاہتے ہیں تو نجمہ اشارے سے یوسف کو بتاتی ہے کہ وہ اپنی عزت کی خاطر خودکشی کر لے گی ، اس موقع پر یوسف کی اندرونی کیفیت کا اظہار اس طرح کیا ہے :

''نجمہ کا یہ وفاداری کا جوش دیکھ کے مطمئن ہوں ۔ اس قید خانے میں بھی دل ہی دل میں خوش ہو رہا ہوں ۔ اس بات پر مسرور ہوں کہ وہ مر جائے گی اور یہ نہیں پسند کیا جاتا کہ وہ زندہ رہے اور کسی کی معشوقہ بنے ۔'' (گیارھواں باب)

یوسف کے کردار میں انسانی شرافت کی عظمت کے جوہر چودھویں باب میں کھلتے ہیں اور اس کا کردار فن کی بلندیوں پر دکھائی دیتا ہے ۔ اب اس کی نفسیات شناسی اور فہم و فراست بھی پختگی کی درجوں میں داخل ہو گئی ہے اور سوچ و فکر کا انداز بھی ایک جیتے جاگتے انسان کا سا دکھائی دیتا ہے ، اس ناول میں یوسف کا کردار دیگر کرداروں سے زیادہ اہم دکھائی دیتا ہے اور روزمرہ کی انسانی زندگی سے زیادہ قریب ، انسانوں کی دنیا کا ایک عام کردار ۔

نجمہ کا کردار اپنے عہد کی شریف زادیوں کا نمائندہ کردار ہے ۔ لڑکپن سے آخر تک یوسف کے بارے میں اس کا رویہ بہت معتدل ، ہمدردانہ اور سماجی معاشرتی حدود و قیود کے اندر ہے ۔ محبت کے بارے میں اس نے اپنی دلی کیفیت کو ظاہر ہو کر رسوا نہیں ہونے دیا ۔ اس میں ایک مشرقی عورت کی جملہ روایتی اقدار موجود ہیں ۔ نجمہ کا کردار گیارھویں اور تیرھویں باب میں اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے اور وہ گوشت پوست کی ایک ایسی لڑکی دکھائی دینے لگتی ہے جس کے دل کی دھڑکنوں اور احساس کی کیفیت کو محسوس کیا جا سکتا ہے ۔

خان ڈاکو کا کردار اپنے عہد کے ایک مخصوص گروہ کا نمائندہ ہے، لوٹ مار، قتل و غارت، سفاکی اور بربریت ان کی بنیادی صفات ہیں اور ان صفات کو اپنی عظمت سمجھنا ان کی

سرنست ہے - خان صاحب کا یہ سفاک کردار بارھویں باب میں پورے طور پر اجاگر ہے - اس کردار کا انجام فطرت کے اصولوں کے عین مطابق ہے اور حبشی مراد ان لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جن کی بدفطرتی، شقی القلبی خان ڈاکو جیسے لوگوں کو اُن کے مقاصد میں کامیاب کرتی ہے - یہ لوگ خان ڈاکو جیسے لوگوں کے آلہ کار بنتے ہیں اور اُن کی بدقماشی میں اُن کے دست و بازو ثابت ہوتے ہیں -

حاجی صالح کا کردار ٹھگوں کے گروہ کی نمائندگی کرتا ہے - ایسے کردار میں جس قسم کی عیاری و مکاری ہونی چاہیے، وہ شرر نے اس میں پیدا کر دی ہے - چاپلوسی، چرب زبانی مکر و فریب کی وہ ضروری صفات جو اس گروہ کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں حاجی صالح کے کردار میں بدرجہ اتم موجود ہیں - اس قسم کے لوگ جن ہتھکنڈوں سے کام لیتے ہیں، حاجی صالح ان سے بھی پوری طرح لیس ہے - اس کا حلیہ، وضع قطع، بول چال بھی اس کے مشن کی تکمیل میں اس کے ممد ہیں -

نصرت خاں ایسے لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو اتفاق سے بری راہوں پر چل نکلتے ہیں اور برے لوگوں کے آلہ کار بن جاتے ہیں، لیکن اُن کا ضمیر مردہ نہیں ہوتا وہ کسی وقت بھی بیدار ہو کر انہیں کچوکے دے سکتا ہے - ضمیر کے بیدار ہو جانے پر ایسے لوگ تلافی مافات کرتے ہیں - نصرت خاں کا کردار بھی اپنی اسی ضمیر کی زندہ داری کے باعث قابل توجہ کردار بن گیا ہے - بارھویں باب میں اس کا خوابیدہ ضمیر جاگ کر کشمکش سے گزرتا ہے اور چودھویں باب میں نصرت خاں کا کردار اپنی بلندیوں پر دکھائی دیتا ہے -وہ تمام نتائج سے بے خطر یوسف اور اس کے خاندان کو ڈاکوؤں کی قید سے رہائی دے دیتا ہے -

افتخار الملک اور ضیاء الملک شاہی امراء کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی بے جان کردار دکھائی دیتے ہیں - افتخارالملک کا کردار نسبتاً دوسرے کردار سے بہتر ہے - ابتدائی حصے میں اس میں زندگی کی ہلکی سی چمک دکھائی دیتی ہے لیکن بالآخر وہ شرر کی بے توجہی کا شکار ہو کر بجھ جاتی ہے - دونوں اپنے عزیز و اقارب سے بیوی بچوں سے جدا ہو چکے ہیں لیکن ان میں کوئی تڑپ نہیں دکھائی دیتی - اُن کے افعال بس مشینی ہیں جن کی کل سلطان کے ہاتھ میں ہے -

مہاراجہ رگھبیر سنگھ کا کردار ان لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو عزت و ناموس پر سب کچھ قربان کر دیتے ہیں - چندرا وتی کے کھو جانے پر مہاراجہ راج پاٹ چھوڑ کر اس کی جستجو میں سنیاسی بن جاتا ہے اور برسوں جنگلوں صحراؤں کی خاک چھانتا پھرتا ہے - اس کے برعکس افتخارالملک اور ضیاء الملک بہت اطمینان سے دربار داری کرتے ہیں - رگھبیر سنگھ کا بھائی کھڑک سنگھ راجپوتوں کی آن نباہتا ہے - وہ یوسف وغیرہ کو اپنی پناہ میں لے کر اُن کی پوری اعانت کرتا ہے اور اپنا وعدہ ہر طرح نباہتا ہے -

سراج الدین کی شخصیت میں فہم و فراست نمایاں ہے، پندرھویں باب میں اس کی دانش مندی کے جوہر کھلتے ہیں اور اٹھارھویں باب میں اس کا کردار اپنے اندر ایک اچھے انسان کی صفات لیے ہوئے ہے - افتخار الملک کی بیوی مسلمان شریف زادیوں کی نمائندہ ہے، وہ پردہ نشین ہے، کمزور دل ہے، جوہر شرافت کی قدر دان ہے - برا وقت آنے پر بھی خاندانی وقار کا پاس رکھتی ہے اور اپنا نسب بیان کرکے خاندان کی پشت ہا پشت کی نیک نامی کو داغدار نہیں

کرنا چاہتی ۔

کنور کا کردار بھی نوجوان، دلیر راجپوتوں کی نمائندگی کرتا ہے ۔ اس میں احسان مندی کا جذبہ بھی ہے اور آن نباہنے اور وعدہ ایفا کرنے کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کی ہمت بھی ۔ اس میں خلوص بھی ہے اور شجاعت بھی ۔ کنور کے کردار کی ابتدائی جھلک باپ بیٹے کے اس مکالمے میں ملتی ہے جو دہلی کے لیے روانہ ہوتے وقت یوسف کے ایک مکالمے کے جواب میں ادا ہوتا ہے، راجہ جودھپور مسکرا کے کہتا ہے :

"چھتری کے لڑکے کو ایسی دعا نہ دیجیے ۔ وہ خطروں میں پڑنے کے لیے ہی پیدا ہوا ہے اور دنیا کے فتنوں اور نازک جھگڑوں میں اس کا جوہر کھلتا ہے ۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ میرا بیٹا بغیر اس کے کہ کسی سخت اور ہولناک میدان میں پڑے جیسا جاتا ہے ویسا ہی واپس چلا آئے ۔ میری تو آرزو ہے کہ بہت بڑا رن پڑے اور ایسی لڑائی ہو کہ رگھبیر سنگھ یا تو مارا جائے اور اس کا نام میرے اور میری قوم کے لیے اچھی یادگار ہو یا میدان مار کے اور ناموری کے تمغے سینے پر لگا کے آئے اور یقین ہے کہ رگھبیر سنگھ کو بھی اس بات کی تمنا ہو گی (یہ کہہ کے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا) کیوں ہے نا ؟

رگھبیر سنگھ : (دوبارہ باپ کے قدم چوم کے) مہاراج اگر میرے دل میں یہ آرزو نہ ہو تو میں چھتری درن نہیں ۔" (انیسواں باب)

مکالمے اور بیان :

"یوسف و نجمہ" میں مکالمے سیدھے سادے، کرداروں کی فطرت اور نفسیات کے عکاس اور ان کی ذہنی سطح کے عین مطابق ہیں ۔ مکالموں کا انداز بیان، الفاظ اور لب و لہجہ بھی کرداروں کی شخصیت کی پوری پوری عکاسی کرتا ہے ۔ سطور بالا میں درج مکالمہ اس کی ایک مثال ہے، کرداروں کی شخصیت کی مناسبت سے اس میں الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں اور ان کے جذبات کی عکاسی بھی کی گئی ہے ۔ پانچویں باب میں کلثوم اور خالہ کے مکالمے بھی ایک اچھی مثال ہیں ۔ شرر نے کرداروں کی شخصیت کو ان کے مکالموں کے ذریعے پیش کرنے کی اچھی کوشش کی ہے اور اسی انداز میں جذبات نگاری بھی کی گئی ہے ۔ گیارھویں باب میں جذبات نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں ۔

منظر نگاری :

منظر نگاری اور بیان کے بھی بعض اچھے نمونے ملتے ہیں ۔ اس ناول میں شرر کی منظر نگاری دیگر ناولوں کی نسبت مختلف ہے ۔ یہاں شرر کی ادبیت کا رنگ زیادہ گہرا نہیں کیونکہ یہ امر ان کے پیش نظر ہے کہ تمام ناول خود یوسف کی زبانی بیان ہو رہا ہے اس لیے انھوں نے بیانیہ حصے کو بھی یوسف کے انداز فکر اور شخصیت کے تابع کیا ہے ۔ بیانات مذکورہ کردار کی شخصیت سے مطابقت رکھتے ہیں اس لیے دیگر ناولوں کی نسبت یہاں منظر نگاری میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے ۔

یوسف، نجمہ، قاسم اور مرزا کی بچپن کی لڑائیوں اور کھیل کے دلچسپ مرقعے ہیں۔ یوسف کے نئے سرپرستوں کے مکان کے بارے میں بیان جملہ جزئیات لیے ہوئے ہے۔ بعض اہم موقعوں سے متعلق بیانات جزئیات کے ساتھ ساتھ خود ہیرو کی جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں کا پرتو بھی لیے ہوئے ہیں ۔ تشبیہات وغیرہ موقع محل سے مناسبت رکھتی ہیں ۔ منظر نگاری کے دو تین نمونے

درج ذیل کیے جاتے ہیں :

"اندھیری رات اور اس پر طرہ یہ کہ ہمارے ساتھ روشنی بھی نہیں ۔ تاروں کی شعاعیں تلواروں پر جگنوؤں کی طرح چمک جاتیں اور بار بار ہماری قسمت پر ہنس دیتیں ۔" (پچیسواں باب)

"سفیدۂ صبح نمودار ہوا تھا ، درختوں کی ہری ہری پتوں کو مشاطہ شب نے شبنم کا مرصع زیور پہنا کے دلہنوں کی طرح سجایا سنوارا تھا ۔ ابتدائی صبح کی روشنی نے اس زیور کو چمکا چمکا کے دکھانا شروع کیا اور اب آفتاب کی شعاعیں آنے والی تھیں کہ اس بناؤ کو بگاڑیں ۔ طیور نے آنکھ کھلتے ہی شب زندہ دار کا وظیفہ اور مرتاض برہمن کی جپ سنی اور ان کے ساتھ وہ بھی اٹھ اٹھ کے وظیفہ صبح پڑھنے لگے ۔" (چوبیسواں باب)

ویران جنگل میں رات کے وقت کی کیفیت کی بھرپور عکاسی سطور ذیل میں ملتی ہے :

"ہم گھنے جنگل میں تھے ، ماہتاب اس قدر نشیب میں نمودار ہوا تھا کہ ہمیں سوا شام کی خفیف اور تاریکی آمیز روشنی کے اور کسی چیز سے اس کی موجودگی کا پتہ نہیں لگتا تھا ۔ جنگلی درختوں پر بسیرا لینے والے طیور کے رہ رہ کے چہچہا اٹھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ مہتاب نکل رہا ہے اور ٹھیک عشا کا وقت ہے ۔ مصیبت کے وقت انسان میں رقت قلب اور خدا کی یاد زیادہ پیدا ہو جاتی ہے ۔ اماں جان اگرچہ اکثر نماز پڑھتی تھیں ، لیکن اس گرمی اور جوش دل سے شاید زندگی بھر میں کبھی نماز پڑھنے کو نہ اٹھی ہوں گی جس طرح اس وقت ۔ اس جنگل میں ، پانی کہاں مل سکتا تھا ایک پاک حصہ زمین پر انھوں نے تیمم کیا اور ان کے ساتھ کلثوم اور ہم سب نے بھی تیمم کیا اور نماز میں مشغول ہوئے ۔ ہر بوڑھا اور بچہ نہایت ہی خلوص دل سے خدا کی طرف متوجہ تھا ۔ فرض کے بعد ہم سب نے بڑی ہی رقت قلب سے درگاہ الٰہی میں دعا مانگی ۔ فرض کے بعد ہم سنتیں پڑھ رہے تھے کہ ہمیں اپنی پشت کی طرف سے کچھ آہٹ معلوم ہوئی ۔ میرا خیال جو ہمہ تن خدا کی طرف متوجہ تھا ، اس آہٹ کے پاتے ہی اس کی طرف متوجہ ہو گیا ، دل میں طرح طرح کے خیالات گزرنے لگے ۔ شاید ابا جان آ گئے یہ خیال تیقن کے درجے کو پہنچ گیا تھا اور قریب تھا کہ میں سجدۂ شکر کے لیے زمین پر گر پڑوں یا نیت توڑ دوں لیکن فوراً ہجوم یاس نے ڈرایا کہ کوئی دشمن نہ آ گیا ہو ۔ سارے بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے اور نماز میں جو سورتیں پڑھ رہا تھا ان کو ہر ہر لفظ پر بھولنے لگا ، الغرض میں نے خدا خدا کر کے نماز ختم کی اور سلام پھیرتے ہی ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ یہ کیسی آہٹ تھی اور سب ابھی نماز ہی میں مشغول تھے ۔ میں نے اٹھ کے چاروں طرف غور سے دیکھا لیکن سوا جنگل کی بھیانک تاریکی اور مہیب سناٹے کے اور آواز آ رہی ہے اور سوکھے سکڑے پتے جو ہوا نے مرجھا مرجھا کے درختوں سے زمین پر گرا کے سکھا دیے ہیں ان پر کوئی آہستہ آہستہ چل رہا ہے ۔ دل میں بہت ہی ڈرا لیکن جی کڑا کر کے ارادہ کیا کہ ادھر جا کے دیکھوں آخر یہ کیا ہے ؟ اس ارادہ سے میں نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ ناگہاں یکایک مجھے پیٹھ کی طرف سے کسی نے آ کے پکڑ لیا ، میں نہیں کہہ سکتا کہ خلاف معمول کسی کے روک لینے سے میرے دل کی کیا کیفیت ہوئی اور ایک قوی ہیبت ناکی نے میرے دل پر آناً فاناً کتنے خیالات خوف پیدا کر دیے ۔ میری آواز رک گئی اور ہزار چاہا کہ منہ سے اتنا لفظ "کون ہے" نکالوں مگر نہ نکل سکا ۔ یہ سمجھیے کہ جیسے ہی وہ ہاتھ مجھ پر پڑا ویسے ہی زور سے میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا ۔ گھبرا کے میں نے منہ پھیر کے دیکھا اور ایک عجیب حیرت انگیزی کے جوش سے دل ہی دل میں میں نے اپنے اوپر بہت لعنت ملامت کی ۔ آہ ! اماں جان تھیں ۔ مجھ پر خوف اس پوری سرعت سے طاری ہوا تھا کہ اب تک میرے منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی اور نہ اتنا پوچھا جاتا تھا کہ آپ نے مجھے کیوں پکڑ لیا ۔" (ص۸۹-۹۱)

ان مثالوں اور پلاٹ کی بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ شرر نے تمام جزئیات کو مد نظر رکھا ہے اور اپنی ذمہ داریوں کو فنی چابکدستی سے پورا کیا ہے ۔ لیکن معلوم نہیں ایک دو جگہ تضاد اور سہو کس طرح پیدا ہو گیا ۔ ایک تضاد تو یوسف کے پالنے والے افتخار الملک اور اس کی بیوی کی عمروں کے سلسلے میں ہے ۔ تیسرے باب میں منہ بولی ماں کی عمر ۲۵ سال ہے اور ساتویں باب میں ابا جان کی عمر ۳۰ سال اور دو سال پہلے شادی ہوئی ہے ۔ غالباً سہو

کتابت سے تیسرے باب میں ۱۵ سال کی بجائے ۲۵ سال بن گیا ہے - دسویں باب میں اور پھر اس کے بعد مجمہ کی بیان کردہ عمروں میں بھی مطابقت نہیں - پانچویں باب میں لکھا ہے کہ "جنوب کی طرف ہم لوگ جا رہے تھے کہ ڈوبنے والا آفتاب ہمارے بائیں ہاتھ کی طرف تھا -" یہ بیان اصل مشاہدے سے مطابقت نہیں رکھتا ڈوبنے والے سورج کو دائیں ہاتھ ہونا چاہیے تب سمت جنوب ہو سکتی ہے -

۱۰- شوقین ملکہ

پلاٹ :

شوقین ملکہ اپنے موضوع کے اعتبار سے دوسری صلیبی جنگ سے متعلق ہے - اس کے قصے کا خلاصہ چوتھے باب میں دیا جا چکا ہے - پلاٹ کے اعتبار سے یہ ناول چنداں پیچیدہ نہیں البتہ شرر نے بعض واقعات کی ترتیب سے اس میں اتار چڑھاؤ پیدا کیا ہے - پلاٹ تو مختصراً اسی قدر ہے کہ صلاح الدین نامی نوجوان اپنے دادا کے ہمراہ سلطان اتابک زنگی کے پاس پہنچتا ہے - صلاح الدین کا والد اور رشتے کے دیگر تمام مرد حج کو جاتے ہوئے فرنگیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے اور خاندان کی تمام عورتیں لونڈیاں بنا لی گئی تھیں -

صلاح الدین سلطان کے ہمراہ رہا کے معرکے میں شرکت کرتا اور بہادری کے جوہر دکھاتا ہے - سلطان اتابک زنگی کی شہادت کے بعد وہ اس کے بیٹے نورالدین زنگی کے ساتھ مہمات میں حصہ لیتا ہے اور پھر اپنے خاندان کی خواتین کی تلاش میں راہبوں کے روپ میں یورپ چلا جاتا ہے - راہبوں کے اس گروہ کے ساتھ وہ بھی شامل ہے جو سینٹ برنارڈ کے پاس پہنچتا ہے - برنارڈ جب صلیبی جہاد کی تلقین کرتا ہے تو وہ بھی ہمراہ ہے - برنارڈ سے وہ فرانس کی ملکہ ایلی نر کے پاس مصاحب خاص کی حیثیت سے چلا جاتا ہے - ملکہ اور لشکر کے ساتھ مشرق کی طرف بڑھتا ہے - ملکہ کی عیاش طبیعت اسے صلاح الدین کے ساتھ کھل کھیلنے پر مجبور کرتی ہے، وہ اسے اپنی اصلیت بتاتا ہے - جب ایلی نر اور لوئی میں اختلاف بہت بڑھ جاتا ہے تو لوئی ایلی نر کو زبردستی ساتھ لے جاتا ہے - صلاح الدین کچھ بدوؤں کی مدد سے رات کے وقت ملکہ کو لشکرگاہ سے نکال لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے - اسی واپسی کے سفر میں اسے ایک خانہ بدوش قبیلے میں اپنے خاندان کی تمام خواتین مل جاتی ہیں - ایلی نر کی مدد سے وہ انہیں رہائی دلواتا ہے - ان میں زمرد بھی ہے - ایلی نر اس سے حسد کرنے لگتی ہے لیکن صلاح الدین ایلی نر کی وہ چال ناکام بنا دیتا ہے جس کے تحت وہ زمرد کو زہر دینا چاہتی تھی - ان خواتین کو گھر پہنچانے کے بہانے وہ ملکہ سے اجازت طلب کرتا ہے اور دادا کے پاس پہنچتا ہے - سب کو وہاں چھوڑ کر دادا سے رقم لے کر ایلی نر کو بھجوا دیتا ہے اور پھر کبھی اس سے نہیں ملتا - زمرد سے صلاح الدین کی شادی ہو جاتی ہے -

اس پلاٹ اور واقعات کو شرر نے مرتب کرتے ہوئے دلچسپی کا عنصر بھی پیدا کیا ہے اور تجسس کا بھی - مثلاً متی (صلاح الدین) کی شخصیت بہت دیر تک پردے میں رہتی ہے - زمرد وغیرہ کا اچانک ملنا بھی حیرت آمیز دلچسپی لیے ہوئے ہے -

کردار :

"شوقین ملکہ" کے بڑے کرداروں میں صلاح الدین (متی) ، ملکہ ایلی نر، شاہ لوئی، سلطان اتابک زنگی، سلطان نورالدین زنگی، کونراڈ، ایلی نر کا ماموں، صلاح الدین کا دادا زین الدین اور زمرد وغیرہ شامل ہیں۔ ناول کا ہیرو صلاح الدین ہے اور شروع سے آخر تک ناول میں موجود دکھائی دیتا ہے۔ صلاح الدین ترک ہے، کم عمری میں ہی وہ بہادر، باہمت، بے باک اور فنون سپہ گری میں پختہ کار دکھائی دیتا ہے۔ پہلی ملاقات میں ہی سلطان اتابک زنگی جب اپنے سرداروں سے خطاب کرکے کہتا ہے کہ کل تم میں سے کون رہا کے دروازے پر میرا ساتھ دے گا تو سب پر سناٹا طاری ہو جاتا اور صرف ایک سردار اور نو عمر صلاح الدین حامی بھرتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ وہ سلطان کے ساتھ موجود ہوں گے۔ صلاح الدین نے جس ہمت اور بے باکی سے یہ دعویٰ کیا تھا وہ سب کو حیرت میں ڈال دیتا ہے لیکن نو عمر صلاح الدین نے جو کہا تھا اسے سچ کر دکھایا، اس نے نہ صرف سلطان کا ساتھ دیا بلکہ جب سلطان کی تلوار نے قلعہ رہا کے سردار کی زرہ کاٹی تو اس سے پہلے کہ وہ آہن پوش نائٹ سلطان پر گرز کا وار کرتا صلاح الدین کا نیزہ اس زرہ کٹی جگہ سے داخل ہو کر دوسری طرف نکل چکا تھا۔

صلاح الدین کا کردار متی کے مسیحی روپ میں بھی نوعمری کے باوجود متانت لیے ہوئے ہے۔ پادریوں کی موجودگی میں بھی بعض اوقات وہ اپنے خیالات کا اظہار بے باکی سے کر دیتا ہے۔ کونراڈ سے اس کی گفتگو اس کی شخصیت کی بڑی عمدہ ترجمانی کرتی ہے۔ جس بے باکی سے وہ کونراڈ سے گفتگو کرتا ہے لوئی اور کونراڈ کو اس سے ایسی گفتگو کی توقع نہیں تھی۔ انطاکیہ میں قیام کے دوران جب ایلی نر بہت حد تک جذبات سے بے قابو ہو جاتی ہے وہاں بھی صلاح الدین کی شخصیت میں متانت کا عنصر برقرار رہتا ہے۔ وہ جب تنہائی میں ایلی نر کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کی شخصیت کی داخلی کشمکش اور نفسیاتی کیفیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ صلاح الدین کے کردار میں وہ مرحلہ بھی اہم ہے جب وہ اپنے خاندان کی خواتین کا پتہ پاتا ہے اور ان کی رہائی کی کوشش کرتا ہے اور پھر آخری باب میں جب وہ ایلی نر کے منصوبے کو ناکام بنا کر اپنے اہل خاندان کو وہاں سے موصل پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ایلی نر کا کردار سارے ناول میں ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ شرر نے اسے اچھی صفات کی خاتون کے روپ میں نہیں پیش کیا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے اس کے کردار کی تشکیل پر کافی توجہ صرف کی ہے۔ وہ لباس اور آرائش و زیبائش میں جدت پسند دکھائی دیتی ہے۔ شرر نے ساتویں باب میں ایلی نر کو پہلی مرتبہ قارئین سے متعارف کراتے ہوئے اس کی جو سراپا نگاری کی ہے اس میں اس کے لباس کے بیان کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس کی شکل و صورت کے بیان میں حسب معمول شرر نے شاعرانہ نثر نگاری، تشبیہات و رنگین الفاظ سے کام لیا ہے۔ جلسہ عام میں اس کی آمد کی شان بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس وضع اور اس لباس میں اور اس شان و آن بان سے ملکہ ایلی نر اپنے لٹکتے ہوئے لبادے کے دامنوں کو مہ وشان ہند کے پائنچوں یا کسی بڑی بھاری دولائی کے آنچلوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے اٹھائے اور ناز و انداز سے قدم رکھتی ہوئی خیمہ میں آئی اور اپنی کرسی پر شاہانہ داب و تمکنت سے جلوہ افروز ہوگئی۔"

دسویں باب میں ایلی نر اور لوئی دونوں کا بھید ایک دوسرے پر کھل جاتا ہے۔ اس موقع پر دونوں کی کردار نگاری پر شرر نے خصوصی توجہ دی ہے۔ ایلی نر یہاں شوہر پر چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اس کی گفتگو میں طنز، بے حیائی، بے باکی اور شوہر پر برتری کا رنگ صاف نمایاں ہے۔ دونوں محفل میں یک جا بیٹھے ہیں، ایلی نر اسے شراب پلاتی ہے لیکن محفل کے برخواست ہوتے ہی لوئی سے کہتی ہے:

''میں نے اس وقت آپ پر بہت کچھ ظلم و جور کیا ہے۔ میری زبردستیوں کو برداشت کرنے کے لیے آپ کو بہت بڑی نفس کشی بھی کرنا پڑی ہوگی، مگر اب آپ پر احسان بھی کرنا چاہتی ہوں۔''

اور پھر لوئی کے استفسار پر کہتی ہے:

''وہ یہ کہ آپ کو تنہا چھوڑ کے جاتی ہوں اور آپ کی دلچسپی اور آپ کے لطف کے لیے سبیلہ کو آپ کے پاس چھوڑے جاتی ہوں تاکہ اس کو پہلو میں بٹھا کے آپ اپنی آج رات کی کلفتوں کو دور کرایں۔''

لوئی کے اس استفسار پر کہ وہ خود کہاں جا رہی ہے ایلی نر جواب دیتی ہے:

''اس سے آپ کو کیا مطلب؟ میرا جہاں جی چاہے گا جاؤں گی۔ اب میرا آپ کا برتاؤ یہی رہے گا کہ ظاہر میں ہم دونوں ایک دوسرے کے دوست، اور ایک دوسرے کے عاشق زار رہیں گے اور باطن میں غرض نہیں کہ کون کیا کرتا ہے۔ نہ آپ کے خلوت گاہ میں گھس کے میں آپ کو ستاؤں گی اور نہ میرے خلوت گاہ میں آ کے آپ مجھے پریشان کیجیے گا۔''

گیارہویں باب میں ایک جشن منایا جا رہا ہے اور ایلی نر لوئی کے پہلو میں بیٹھی ہے۔ لوئی نے بے قرار ہوکر ملکہ سے سرگوشی میں اس کے حسن کی تعریف کی جس کے جواب میں ایلی نر نے کہا:

''شاید بے خودی میں آپ کو وہ عہد یاد نہیں رہا جو مجھ میں اور آپ میں ہو چکا ہے۔ ہم دونوں صرف تھیٹر کے بادشاہ اور ملکہ ہیں۔ اگر آپ کو اس قسم کی باتیں کرنا ہوں تو سبیلہ سے کیجیے۔ آپ کو خود کہتے شرم آتی ہو تو میں کہہ دوں کہ سبیلہ آپ کے پہلو میں بیٹھے؟ اور شراب اس کے عوض آپ کو کوئی اور پلائے۔''

بارھویں باب میں جب اسے یہ خبر ملتی ہے کہ کونراڈ کا لشکر تباہ ہوگیا تو وہ اپنے دلی جوش کو نہیں دبا سکتی اور بے اختیار کہہ دیتی ہے کہ اچھا ہوا اب فتح یابی کا سہرا جرمنوں کی بجائے فرانسیسیوں کے سر ہوگا۔ اس کے کردار میں ہرجائیت اور عیاشی کا پہلو مزید اس وقت ابھرتا ہے جب وہ کونراڈ کی دل دہی کے لیے پہنچتی ہے۔ وہ کونراڈ کو بھی شیشے میں اتارنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کی طرف سے سرد مہری دیکھ کر برہم ہو جاتی ہے۔ انطاکیہ میں اس کی شخصیت کا یہ پہلو پورے عروج پر ہے۔ متی کی اصلیت معلوم ہونے کے باوجود اس کی پیش کش، لوئی کے ساتھ سوال و جواب اور طلاق کی دھمکی اور آخر میں زمرد کو زہر دینے کی کوشش وغیرہ اس کے کردار کے ان پہلوؤں کو مزید نمایاں کرتے ہیں۔ ایلی نر کا کردار ذہن پر دیرپا نقش چھوڑتا ہے۔

لوئی کی شخصیت میں تذبذب اور کشمکش کی کیفیت اس کے کردار میں جان ڈال دیتی ہے۔ دسویں باب میں لوئی کی سبیلہ سے گفتگو، اس کی اندرونی کیفیت، الجھن اور کشمکش کی مظہر ہے۔ وہ اپنی آگ میں خود ہی سلگ رہا ہے لیکن بے بس ہے۔

سلطان زنگی کے کردار کو پیش کرتے ہوئے شرر نے اس کی تاریخی شخصیت کو پورے

طور پر پیش نظر رکھا ہے اور یہ کوشش کی ہے کہ اس کے کردار کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ اس کی تاریخی شخصیت مسخ نہ ہونے پائے۔ سلطان زنگی کی شجاعت، عیسائیوں کے خلاف جہاد، دشمن پر میلوں کا سفر کرکے اچانک جا پڑنا، جنگی مہارت، انصاف، سپاہیوں کی سہولتوں کی نگہداشت وغیرہ تاریخی حقیقتیں ہیں جنھیں شرر نے خوبصورتی کے ساتھ ناول میں سلطان کے کردار میں سمویا ہے۔ برنارڈ کا کردار بڑی وسعت کا حامل ہے اور بڑی با اثر شخصیت رکھتا ہے۔

ان کے کرداروں کے علاوہ زین الدین، نورالدین، زمرد، کونراڈ، نواب مورین، ریمنڈ اور سبیلہ وغیرہ کے کردار اہم ہیں۔ "شوقین ملکہ" کے کرداروں میں شرر نے ان کی شخصیت اور نفسیات کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس بنا پر اس ناول کے کردار شرر کے کئی دیگر ناولوں کے کرداروں کی نسبت بہتر دکھائی دیتے ہیں۔

منظر نگاری اور زبان و بیان :

ناول میں زبان و بیان موقع محل سے مناسبت رکھتی ہے۔ مکالمے بھی کرداروں کی شخصیت سے ہم آہنگ ہیں۔ سطور بالا میں ملکہ ایلی نر کے بعض مکالمے درج ہوئے ہیں جو ناول میں مکالموں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دسویں باب میں لوئی اور ایلی نر کے مکالمے اور لوئی اور سبیلہ کے مکالمے اس ناول میں مکالمہ نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ یہ مکالمے کرداروں کی شخصیت، ان کی جذباتی اور اندرونی کیفیت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ مکالموں کی زبان بھی کرداروں کی شخصیت سے ہم آہنگ ہے۔ اسی طرح بارھویں باب میں متی اور ایلی نر کے مکالمے اور ایلی نر اور کونراڈ کے مکالمے بھی اچھے نمونے ہیں۔ سولھویں باب میں ایلی نر اور متی کے مکالمے موقع محل اور شخصیتوں کی داخلی کیفیات کے مظہر ہیں۔

"شوقین ملکہ" میں منظر نگاری اور مرقع کشی کے بھی عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ پہلے باب میں سلطانی لشکر کے پڑاؤ اور موصل میں جنگی تیاریوں کے منظر، دوسرے باب میں رہا پر حملے، جنگ اور محاصرے کے منظر، چوتھے باب میں قلعہ جعبر کے محاصرے کے مناظر، پانچویں باب میں پوپ کی سواری اور وطربو میں اس کے استقبال کا منظر، چھٹے باب میں برنارڈ کی خانقاہ اور شامی اسقفوں کی حاضری کا منظر، وزیلے کے جلسہ عام کا مرقع، جلسہ عام میں لوئی اور ملکہ ایلی نر کی حاضری کا منظر، زنانہ کیمپ کے عنوان سے ایلی نر کے کیمپ میں عیاشیوں اور رنگینیوں کے مرقعے اور انطاکیہ کی رنگین محفلوں کی تصویریں بہت جان دار دکھائی دیتی ہیں۔ شرر نے اس مرقع نگاری میں جزئیات کی طرف بھی پوری توجہ دی ہے جس کی بنا پر مناظر چشم تخیل کے سامنے حقیقت بن کر ابھرتے ہیں۔ آخری تین ابواب میں جزئیات نگاری پر خصوصی توجہ دکھائی دیتی ہے۔

شوقین ملکہ اپنے پلاٹ کی ترتیب، کردار نگاری کے فنی حسن، کرداروں اور موقع محل سے ہم آہنگ مکالموں اور بھرپور سراپا نگاری، مرقع کشی اور منظر نگاری کی بدولت شرر کے عمدہ ناولوں میں سے ایک شمار کیا جا سکتا ہے۔

۱۱- قیس و لبنیٰ

قیس و لبنیٰ کے عشق کے پہلی صدی ہجری کے اس تاریخی واقعے کو ناول کی شکل میں پیش کرتے ہوئے شرر نے اس کے پلاٹ میں دلچسپی کے عنصر کو برقرار رکھنے کے لیے نشیب و فراز پیدا کیے ہیں ۔ مختلف ابواب کا آغاز اور اختتام ایسے واقعات سے اور ایسے مراحل پہ کیا ہے کہ تجسس برقرار رہتا ہے ۔ واقعات کی ترتیب میں بھی اس پہلو کو مدنظر رکھا ہے کہ ان کے ذریعے پلاٹ میں ایک مسلسل ارتقا قائم ہو سکے اور ناول کی دلچسپی کا عنصر بھی متأثر نہ ہونے پائے ۔

ناول کا آغاز ایک ایسے منظر سے ہوتا ہے جو قاری کی توجہ کو فی الفور اپنی طرف مبذول کرکے اس کی تمام تر دلچسپی کو ان حالات پر مرکوز کر لیتا ہے ۔ لق و دق صحرا میں دو نوجوانوں کا سفر، ریت کے طوفان میں ان کا بچھڑ جانا اور ایک کا ریگ رواں کے تودوں میں دفن ہو جانا ، قیس کا زندہ بچ نکلنا لیکن تشنگی کے باعث جاں بلب ہونا ، زندگی کے لیے اس کا جد و جہد کرنا ، یہ ایسے واقعات ہیں کہ قاری مکمل طور پر ناول نگار کی گرفت میں آ جاتا ہے اور اس نوجوان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے پوری دلچسپی سے ناول نگار کا ہم سفر ہو جاتا ہے ۔ قیس کا بنی کعب کے خیموں تک جا پہنچنا ، لبنیٰ سے ملاقات، لبنیٰ کے خیمے میں قیام، اس کے والد کی طرف سے ہمدردی وغیرہ کے واقعات اور قیس کا رخ لبنیٰ کا شیدائی ہو جانا پلاٹ کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بنتے ہیں ۔

دوسرے باب میں قیس بنی کعب کے خیموں سے رخصت ہوتا ہے اور وہ سن چکا ہے کہ بنی کعب دو دن کی مسافت پر واقع بنی عامر کے تالاب سے ہر پندرھویں دن پانی لاتے ہیں ۔ دو چار روز میں لبنیٰ اپنے قبیلے کی لڑکیوں کے ساتھ اس تالاب پر پانی لینے جائے گی، تیسرے باب میں قاری قیس کا ہم سفر ہے ۔ قیس نے بنی لخم کے خیموں میں ایک دن قیام کیا جو بنی کعب کے خیموں سے ایک منزل پر تھا ۔ یہاں پہنچتے پہنچتے لبنیٰ کی محبت اب دل سے نکل کر اس کی زبان پر آ چکی ہے اور چوتھے باب میں وہ بنی لخم کے سردار ابو عامر اور ام عامر کی مہمان نوازی سے لطف اٹھا کر کچھ معلومات حاصل کرکے بنی عامر کے تالاب تک جا پہنچا ہے اور تالاب سے ہٹ کر اس نے پہاڑ میں ایک پناہ گاہ تلاش کر لی ہے جہاں سے وہ تالاب کا منظر دیکھ سکتا ہے ۔

پانچویں باب میں ایک اتفاق واقعہ رونما ہوتا ہے ۔ بنی کعب سے پہلے بنی کلب کی عورتیں وہاں پانی لینے پہنچتی ہیں ۔ ان میں بھی ایک لڑکی لبنیٰ نامی ہے ۔ قیس اس کا نام سنتے ہی ازخود رفتہ ہوکر اس کے حسن و عشق کے اشعار پڑھنے لگتا ہے ۔ چھٹے باب میں لبنیٰ کی ماں اور بنی کلب کی دیگر عورتیں قیس کو شدید زد و کوب کرکے نیم مردہ حالت میں تالاب کے قریب پھینک جاتی ہیں ۔ تجسس کا عنصر عروج پر ہے، دوسری صبح بنی کعب کی عورتیں آ پہنچتی ہیں ۔ لبنیٰ قیس کو بے ہوش اور نیم مردہ پاتی ہے ۔ یہ واقعہ قیس و لبنیٰ کے قرب کا ذریعہ بن جاتا ہے اور پلاٹ میں ایک منطقی ارتقا دکھائی دیتا ہے ۔ ساتویں باب میں قیس و لبنیٰ میں باہم اقرار و پیمان محبت بندھتا ہے اور لبنیٰ سے یہ معلوم کرکے کہ اس کا والد حباب کعبی حضرت امام حسینؓ کا معتقد خاص ہے اور ان کی کسی بات کو رد نہیں کرتا، مدینہ منورہ کی طرف چل کھڑا ہوتا ہے قیس حضرت امام حسینؓ کا رضاعی بھائی ہے اس لیے اسے یقین ہے کہ حضرت امام حسینؓ حباب سے اس کی سفارش ضرور فرمائیں گے ۔ آٹھواں باب مدینہ منورہ کی جانب سفر ہے اور نویں باب

میں قیس روضۂ اقدس پر فریاد کر رہا ہوتا ہے کہ حضرت امام حسینؓ تشریف لے آتے ہیں۔ وہ قیس کو پہچان کر ساتھ لے جاتے ہیں ۔ ماجرا سنتے ہیں، اس کی آرزو پوری کرنے کے لیے اس کے ہمراہ بنی کعب کے خیموں کی طرف سفر اختیار فرماتے ہیں ۔ اب ناول میں تجسس اور دلچسپی کا عنصر کافی بڑھ گیا ہے ۔ قاری جلد از جلد نتائج سے با خبر ہونا چاہتا اور شور قاری کی اس نفسیاتی کیفیت سے باخبر ہیں اس لیے وہ اسے زیادہ دیر منتظر نہیں رکھتے۔ کئی منزلوں کا سفر چند جملوں میں ختم ہو جاتا ہے، حباب لبنیٰ کی شادی کر دینے کے لیے تیار ہے اور اس نے دبی زبان میں اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ اگر قیس کے والدین رشتہ مانگنے آتے تو بہتر ہوتا ۔ قیس کو معلوم ہے کہ اس کے والدین آمادہ نہیں ہوں گے کیونکہ وہ اس کی شادی اپنے قبیلے میں کرنا چاہتے ہیں ۔ حضرت امام حسینؓ انھیں بھی آمادہ کرنے کا ذمہ لیتے ہیں اور قیس کو لیے ہوئے اس کے قبیلے میں جا پہنچتے ہیں اور یہ مرحلہ اطمینان بخش طریق پر طے ہو جاتا ہے ۔

دسویں باب میں قیس کا باپ اور چند معززین بنی عذرہ حضرت امام حسینؓ اور قیس کے ہمراہ بنی کعب کے خیموں میں جا پہنچے، مہر کی رقم ادا کرنے کی ذمے داری حضرت امام حسینؓ نے لی اور قیس و لبنیٰ کا عقد ہو گیا ۔ اس طرح ناول کے پلاٹ کا ایک مرحلہ منتہیٰ سے گزر کر پھر ٹھہراؤ پر آ پہنچا ہے ۔ گیارھویں باب میں قیس اپنی دلہن کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچا اور بارھویں باب میں وہ حضرت امام حسینؓ سے رخصت ہو کے اپنے باپ اور لبنیٰ کے ساتھ اپنے قبیلے میں چلا گیا ۔

تیرھویں باب سے پلاٹ میں از سر نو اٹھان پیدا ہوتی ہے ۔ واقعات رخ بدلتے ہیں، نئی الجھنیں پیدا ہونے لگتی ہیں ، لبنیٰ سے کوئی اولاد نہ پیدا ہونے کے باعث قیس کی ماں اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتی ہے ۔ پلاٹ تیزی سے آگے بڑھتا جاتا ہے ، تجسس مزید گہرا ہونے لگتا ہے اور پلاٹ ایک بار پھر اس منتہیٰ پر پہنچ جاتا ہے کہ قیس کی ماں کی زندگی یا لبنیٰ کی رفاقت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے ۔ چودھویں باب میں قیس ماں کی ضد کے سامنے بے بس ہو گیا ہے اور اس نے لبنیٰ کو طلاق دے دی ہے ۔ لبنیٰ اپنے قبیلے کی طرف روانہ ہو گئی اور قیس صحراؤں کی خاک چھاننے لگا ۔ پندرھواں باب اس کی دیوانگی کی کیفیتوں کا بیان ہے اور سولھویں باب میں پلاٹ میں پھر ایک بار اٹھان شروع ہوتی ہے ۔ سترھویں باب میں حکیم کے مشورے پر قیس مختلف قبائل کی فرودگاہوں کا دورہ کر رہا ہے اور اسی سلسلے میں بنی فزارہ میں پہنچا ہے کہ واقعات نے پھر ایک بار رخ بدلا ہے ۔ یہاں لبنیٰ فزاریہ سے ملاقات ہوئی اور واقعات تیزی سے ارتقا کے مراحل طے کر کے یہاں تک پہنچ گئے کہ قیس کی لبنیٰ فزاریہ سے شادی ہو گئی ۔ اٹھارھویں باب میں بظاہر واقعات میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے لیکن انیسویں باب میں حالات پھر رخ بدلتے ہیں ۔ قیس لبنیٰ فزاریہ کو وہاں چھوڑ کر والدین کو لانے روانہ ہوا راستے میں اسے معلوم ہوا کہ امیر معاویہ نے حباب کی درخواست پر قیس کا خون حلال قرار دے کر لبنیٰ کی شادی خالد بن خلدۂ غطفانی سے کر دینے کا حکم جاری کیا ہے ۔ یہ سنتے ہی اس کی دیوانگی پھر عود کر آتی ہے اور وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ پہلے مدینہ منورہ جا کر حضرت امام حسینؓ سے ملے اور پھر خود کو مروان کے سپرد کر دے ۔ لیکن بیسویں باب میں واقعات میں پھر موڑ پیدا ہوتا ہے۔ راستے میں اسے ابن عباسؓ ملتے ہیں اور ان کے کہنے پر وہ ان کے قافلے کے ہمراہ پہلے فریضہ حج ادا کرنے کے لیے مکہ معظمہ کا رخ کرتا ہے ۔

اثنائے سفر میں اسے معلوم ہوتا ہے کہ لبنیٰ کعبیہ نے خالد سے شادی کر لی ہے اور اسی قافلہ کے ہمراہ مکہ معظمہ جا رہی ہے۔ دونوں کی ملاقات ہوتی ہے ، ایک دوسرے سے شکوے شکایت ہوتے ہیں اور اکیسویں باب میں واقعات پھر نیا رخ بدلتے ہیں ۔ قس عذری ، قیس عامری کے حالات سن کر چپکے سے قافلے سے نکل کھڑا ہوتا ہے اور صحرانوردی کرتا اس سے جا ملتا ہے ۔ بائیسویں باب میں وہ پھر مدینہ منورہ کی طرف عازم سفر ہے ۔ راستے میں اسے ایک شیخ قبیلہ نے ایک اونٹ دیا ، مدینہ کے باہر پہنچ کر یہ اونٹ اس سے خالد نے لے لیا اور اسی سے آگے پلاٹ میں شرر نے ایک پیچیدگی اور ڈرامائیت پیدا کی ہے ، اس باب میں حضرات حسنین رض کے کہنے پر خالد نے لبنیٰ کو طلاق دے دی ہے ۔ اب حباب کی آمد کا انتظار ہے لیکن تئیسویں باب میں پلاٹ پھر اچانک موڑ مڑتا ہے ۔ قیس مدینہ منورہ سے غائب ہو جاتا ہے ۔ مروان نے اسے خفیہ طریق پر گرفتار کرکے امیر معاویہ کے پاس دمشق بھجوا دیا ہے ۔ چوبیسویں باب میں سارے واقعات ڈرامائی انداز میں بخیر و خوبی سر انجام پا جاتے ہیں ۔ امیر معاویہ باعزت طور پر قیس کو مدینہ بھجواتا ہے اس کے لیے خاص مراعات کا حکم دیتا ہے ۔ لبنیٰ فزاریہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ آ پہنچی ہے اور حباب کی رضامندی پر لبنیٰ کعبیہ کی دوبارہ قیس سے شادی ہو گئی ہے ۔ دونوں لبنائیں خوشی خوشی قیس کے ساتھ اس کے قبیلے میں چلی گئیں ہیں ۔

کردار ، زبان و بیان اور پیشکش :

اس ناول میں لبنیٰ کعبیہ ، لبنیٰ کلبیہ ، لبنیٰ فزاریہ ، قیس عذری ، قیس عامری ، حباب کعبی ، ابو عامر لخمی ، ذریح ، قیس کی ماں ، حکم ، لبنیٰ فزاریہ کا بھائی ، حضرات حسنین رض اور خالد کے کردار ہیں ۔ دیگر کئی کردار بہت تھوڑے تھوڑے وقفوں کے لیے سامنے آتے ہیں ۔ لبنیٰ کعبیہ اور لبنیٰ فزاریہ کے کردار روایتی عرب حسیناؤں کے کردار ہیں اور قیس عذری اور قیس عامری روایتی عرب عشاق کی شان رکھتے ہیں ۔ شرر نے ان کرداروں میں عرب روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں ۔

شرر نے اس ناول میں زبان و بیان اور مرقعوں کے ذریعے فضا سازی کی کوشش کی ہے تاکہ ناول کا ماحول عرب کا ماحول معلوم ہو ۔ پہلے باب میں بگولوں کے اڑنے کا منظر ، قیس کا اس طوفان ریگ میں زندگی کے لیے جدوجہد کرنے کا مرقع ، بنی کعب کی ضیافت کا منظر اور ماحول ، بنی لخم کی ضیافت کا منظر اور ماحول ، بنی عامر کے تالاب کے کنارے عرب قبائل کی عورتوں کا پانی لینے آنا اور دو تین روز قیام اور اس قسم کی دیگر تفصیلات سے انھوں نے ناول کی فضا سازی کی ہے ۔ اس ضمن میں شرر نے مکالموں میں مختلف الفاظ ، قسموں ، ضرب الامثال اور مختلف جانوروں کی عربی کنیتوں کا استعمال کرکے بھی اس رنگ کو نکھارا ہے ۔ مختلف قبائل عرب کے باہمی اختلافات ، قبائل کی خود داری ، مہمان نوازی اور دیگر اسی نوع کی صفات کے ذریعے اور اشعار کے ذریعے بھی انھوں نے ناول کے تاثر کو گہرا کیا ہے ۔ قیس عذری اور مجنون عامری کی ملاقات کا مقصد بھی صرف فضا سازی ہے ورنہ اس واقعے کے بغیر بھی پلاٹ کا ارتقا مکمل ہو سکتا تھا ۔ طوالت کے خوف سے ہم یہاں مکالموں اور مرقعوں کے نمونے دینے سے اجتناب کر رہے ہیں ۔

۱۲- ماہ ملک

پلاٹ :

ماہ ملک کے پلاٹ میں شرر نے اپنی قوت متخیلہ سے بہت سے نشیب و فراز پیدا کیے ہیں۔ اس ناول میں قدم قدم پر تجسس کا عنصر ملتا ہے۔ ناول کے آغاز سے ہی بعض سوالات ذہن میں ابھر آتے ہیں اور ان کے بارے میں تذبذب کی کیفیت بڑھتی جاتی ہے۔ ذوق جستجو شوق کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ پہلا باب شہزادی ماہ ملک کے شکار کے منظر سے شروع ہو کر یہ تجسس لیے ہوئے ختم ہو جاتا ہے کہ ہرن کی بجائے تیر نوجوان کی پنڈلی میں کیسے پہنچ گیا۔ وہ نوجوان اس شکارگاہ میں کیسے پہنچا۔ وہ کون تھا اور جب شہزادی نے حبشی غلاموں کو طلب کیا تو وہ اچانک کس طرح اور کہاں غائب ہو گیا۔ دوسرے باب میں یہ تجسس ابھی موجود ہی تھا کہ وہی نوجوان قلعے کے اندر پھر شہزادی کے سامنے آیا اور پھر اچانک غائب ہو گیا۔ اس کا وہاں پہنچنا اور غائب ہونا فطری طور پر شہزادی کو اس وہم میں مبتلا کرتا ہے کہ وہ شخص کوئی مافوق الفطرت مخلوق ہے۔ تیسرے باب میں کچھ نئے واقعات رونما ہوتے ہیں اور پلاٹ کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ باب بھی کئی سوالات چھوڑ کر ختم ہو جاتا ہے۔ چوتھا باب لشکر کی تیاری اور روانگی سے متعلق ہے۔ پانچویں باب میں وہی شخص پھر شہزادی کے سامنے آتا ہے لیکن یہاں بھی اس کی اصلیت پردۂ راز میں ہی رہتی ہے۔ چھٹے باب میں شرر نے میدان جنگ سے متعلق ناقابل یقین اور حیرت انگیز واقعات جمع کیے ہیں۔ دو نوجوانوں کا پورے لشکر پر حملہ آور ہونا، تاج الدین یلدز کا سر کاٹ لینا اور پورے لشکر کا ان کے مقابلے میں بھاگ نکلنا یہ ناقابل یقین واقعات ہیں لیکن ان سے زیادہ پراسرار وہ دونوں نوجوان ہیں۔ قاری ان کی اصلیت کے بارے میں متجسس ہے۔ یہ دو نوجوان اس باب میں اتنی ہی اہمیت اختیار کر گئے ہیں جتنی پچھلے ابواب میں شہزادی کے پراسرار عاشق کو حاصل تھی۔ ساتویں باب میں یہ گتھی تو کھل جاتی ہے کہ ان دو نوجوانوں میں سے ایک تو وہی شہزادی کا پراسرار عاشق ہے اور دوسرا اس کا دوست، لیکن یہ مسئلہ پھر بھی باقی ہے کہ یہ دونوں اصل میں کون ہیں۔ آٹھویں باب میں واقعات کچھ اور آگے بڑھتے ہیں اور اس نوجوان کی شخصیت اور بھی پراسرار ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنا اور اپنے ساتھی کا جو نام مزر اور مزب بتایا ہے وہ بھی عجیب و غریب ہے۔ نویں، دسویں باب میں ان دونوں نوجوانوں سے اور بھی حیرت انگیز کارنامے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف علاء الدین قباج کو آسانی سے شکست دے دی بلکہ فخر الدین کو بھی بہت سہولت سے رام کر لیا۔ گیارھواں باب پلاٹ سے غیر متعلق ہے۔ شرر نے اسے پلاٹ کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود یہ باب پلاٹ میں بالکل اکھڑا اکھڑا اور انمل بے جوڑ لگتا ہے۔ بارھویں باب میں خوارزم شاہ کی طرف سے ماہ ملک کے رشتے کے لیے پیغام واقعات میں نیا موڑ پیدا کرتا ہے اور واقعات مزید دلچسپ بن جاتے ہیں۔ تیرھویں باب میں ماہ ملک کی دو خادماؤں رزم اور بزم کی شخصیت پراسرار بن جاتی ہے، ان کی معلومات اور رویہ حیرت انگیز ہے۔ اس کے بعد کے تین ابواب میں ان کی شخصیتوں کے بارے میں الجھن اور تحیر کا عنصر مزید بڑھ جاتا ہے۔

سترھویں اور اٹھارھویں باب میں سعد الملک اور شرف الملک کی جرأت اور کارگزاریوں

کے کچھ اور حیرت انگیز شواہد سامنے آتے ہیں اور یہ امر ایک سوال بن جاتا ہے کہ سعدالملک ایک طرف تو خوارزم شاہ کے مقابلے پر موجود ہے ، وہاں سے اس کے خطوط فیروز کوہ آ رہے ہیں اور دوسری طرف شہاب الدین کے کہنے کے مطابق سعد الملک نے ہندوستان میں میدان کارزار میں اس کی جان بچائی - یہ امور سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ آیا واقعی سعد الملک مافوق الفطرت صلاحیتوں کا مالک ہے - انیسویں باب میں سعدالملک اور شرف الملک کی اصلیت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں لیکن ایک بات خاص طور پر کھٹکنے لگتی ہے کہ جب بھی سعد الملک اور شرف الملک فیروز کوہ سے باہر چلے جاتے ہیں تو رزم و بزم بھی شہزادی کی خدمت سے غائب ہوتی ہیں ، اور جب کبھی یہ دونوں دوست شہزادی کی خدمت میں ہوتے ہیں ، رزم و بزم نہیں دکھائی دیتیں - قاری اس نقطہ نظر سے ایک بار پھر گزشتہ واقعات پر نظر دوڑاتا ہے تو شروع سے آخر تک اسے یہی دستور نظر آتا ہے۔ اس طرح رزم و بزم کے بارے میں قاری کے ذہن میں شکوک ابھرنے لگتے ہیں کہ کہیں وہ ان دونوں نوجوانوں کا بہروپ تو نہیں - بیسویں ، اکسویں باب میں بھی یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے - سعد الملک اور شرف الملک سلطان شہاب الدین کے لشکر کے ہمراہ ہندوستان جا رہے ہیں تو رزم و بزم بھی شہزادی سے اجازت لے کر لاہور کے لیے پا برکاب ہیں - اس کے بعد چار ابواب میں پلاٹ آگے بڑھتا ہے - جنگ کے دوران ان کی کارگزاری اور بعض دیگر وجوہات کی بنا پر شہاب الدین کو ان دونوں سے خاص انس پیدا ہو گیا ہے اور اسے یقین ہو چلا ہے کہ وہ دونوں اس کے عزیز غوری شہزادے ہیں - ستائیسویں باب میں ان کی شہزادگی کا ثبوت مل جاتا ہے، انتیسویں باب میں عزیز الدین ، فتنہ اور رشید الدین کے بارے میں بھی انکشاف ہوتا ہے کہ وہ بھی شاہی خاندان سے ہیں ، بعد کے دو ابواب انہیں انکشافات کے رد عمل کا نتیجہ ہیں - بتیسویں باب میں سعد الملک اور ماہ ملک، شرف الملک اور فتنہ کی شادی کا فیصلہ ہوتا ہے اور تینتیسویں باب میں رزم و بزم شہزادی کو چھوڑ کر چلی جاتی ہیں - چھتیسویں باب میں پھر واقعات میں موڑ پیدا ہوتا ہے - شہزادی سعد الملک کے سامنے تین شرائط پیش کرتی ہے - ایک شرط کے پورے ہونے کا منظر تو سینتیسویں باب میں قاری کے سامنے ہے اور باقی دو شرائط کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ یہ بھی پوری ہو چکی ہیں - اڑتیسویں باب میں پلاٹ اور تجسس پورے عروج پر پہنچ کر ڈرامائی انداز میں ختم ہوتا ہے - سعد الملک خود ہی خوارزم شاہ تھا اور خود ہی رزم بھی اور شرف الملک اس کا چچا زاد بھائی بزم کے بہروپ میں تھا - انتالیسویں باب میں تمام معاملات بخیر وخوبی انجام پذیر ہو جاتے ہیں - اس ناول کے پلاٹ میں جو چیز سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ اس کا زمانی پھیلاؤ ہے - ناول کے آغاز کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ صرف چند ماہ کے اندر غیاث الدین نے متحدہ دشمن کو شکست دی اور پھر شہاب الدین ہندوستان کی مہم پر روانہ ہو گیا - لیکن ناول کا آغاز کرتے ہوئے شرر اسے ۵۶۴ھ کا زمانہ قرار دیتے ہیں اور رائے پتھورا سے جنگ کے زمانے کو ۵۸۸ھ - لیکن ناول میں وہ ان چوبیس برسوں کو چشم زدن میں اس طرح گزار دیتے ہیں کہ گویا صرف چند دن میں سب کچھ ہو گیا - یہی اس کے پلاٹ کا سقم ہے - ۲۴ برس تک گویا سعد الملک اور شرف الملک رزم بزم کا بہروپ بھرے رہے اور ان کی اصلیت نہ کھلی اور عشق جاری رہا -

کردار و زبان و بیان :

ناول میں سعد الملک، شرف الملک، ماہ ملک، غیاث الدین، شہاب الدین، جوہر ملک، رشید الدین، فتنہ، گوہر اور رزم و بزم کے کردار اہم کردار ہیں لیکن شرر نے اس ناول میں پلاٹ کو پر تجسس بنانے پر اتنی زیادہ توجہ دی ہے کہ وہ کردار نگاری کی طرف چنداں توجہ نہیں دے سکے۔ ماہ ملک، شہاب الدین، غیاث الدین کے کرداروں کے کچھ اوصاف نمایاں ہیں لیکن انھیں بھی کردار نگاری کا کوئی عمدہ نمونہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس ناول میں منظر نگاری اور مرقع کشی کے کافی مواقع موجود تھے۔ شرر نے شکار گاہ، شکار، میدان جنگ، جشن طرب اور شادی بیاہ کے مناظر بڑی خوبصورتی سے پیش کیے ہیں۔ بعض مرقعے تو واقعی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ شرر نے ایسے مواقع پر جزئیات پر کڑی نظر رکھی ہے۔ مکالمے اور زبان و بیان شرر کا مخصوص رنگ اور انداز لیے ہوئے ہیں۔ ناول اپنی تمام تر دلچسپی اور تجسس آمیز پلاٹ کے باوجود شرر کے درجہ اول کے ناولوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

۱۳۔ فلپانا

پلاٹ :

یہ ناول حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت سے متعلق ہے اور اس کا قصہ فتح طرابلس کے واقعات پر محیط ہے۔ اس ناول کے ہیرو تاریخ اسلام کی نامور شخصیت حضرت عبداللہ بن زبیر ہیں۔ ناول کا پلاٹ بہت سیدھا سادہ ہے۔ افریقہ میں اسلامی افواج کے سپہ سالار عبداللہ ابن ابی سرح فرمانروائے طرابلس گریگوری کے خلاف نبرد آزما تھے۔ اس کی ایک خوبصورت بیٹی میدان جنگ میں اپنی فوج کی قیادت کیا کرتی تھی۔ حضرت عثمان غنیؓ نے ابن ابی سرح کی کمک پر جو فوج بھیجی اس کے سردار حضرت عبداللہ ابن زبیر تھے۔ انھیں طرابلس پہنچ کر معلوم ہوا کہ گریگوری نے اشتہار دے رکھا ہے کہ جو کوئی مسلمان سپہ سالار کا سر لائے گا وہ اس سے اپنی بیٹی بیاہ دے گا۔ ابن ابی سرح اس اشتہار سے اپنے خیمے میں محصور ہو بیٹھے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے پہنچ کر یہ اعلان کروا دیا کہ جو کوئی گریگوری کا سر لائے گا، فلپانا اور طرابلس کی حکومت اسے دی جائے گی۔ اس اعلان سے گریگوری مشکل میں پڑ گیا، اسے نہ صرف مسلمانوں کی طرف سے بلکہ اپنی فوج کے بعض افسروں سے بھی خطرہ لاحق ہوگیا۔ جنگ ہوتی رہی، آخر حضرت عبداللہ ابن زبیر کی جنگی منصوبہ بندی سے مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور گریگوری خود انھیں کے ہاتھوں قتل ہوا اور فلپانا گرفتار ہو کر مدینہ منورہ پہنچی جہاں حضرت عثمانؓ نے اسے ابن زبیرؓ کے سپرد کر دیا۔ انھوں نے فلپانا کو آزاد کر دیا لیکن اس نے اپنی خوشی سے ابن زبیرؓ سے نکاح کرنا پسند کر لیا۔

ناول کے واقعات کا خلاصہ چوتھے باب میں درج کیا جا چکا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرر نے اس سیدھے سادے پلاٹ میں بھی اپنی قوت متخیلہ سے کام لے کر کس قدر زیر و بم اور اتار چڑھاؤ پیدا کیے ہیں۔ پہلے باب کا آغاز چونکا دینے والے واقعے سے ہوتا ہے۔ تیسرے

باب میں میدان جنگ کا نقشہ اچانک بدل جاتا ہے اور گریگوری کا پانسہ پلٹنے لگتا ہے ۔ اب فلپانا اور اس کی سہیلیوں کی سکیمیں تجسس پیدا کرتی ہیں اور زینب ان سکیموں میں اہم رول ادا کرتی ہے ۔ چھٹے باب میں یہ سکیم عملی جامہ پہننے لگتی ہے لیکن منصوبہ مکمل نہیں ہو سکتا ۔ ساتویں باب میں بھی تجسس برقرار رہتا ہے ۔ آٹھویں باب میں زینب کی بدولت مسلمانوں کا ایک منصوبہ ناکام ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی نویں باب میں زینب خود بھی گرفتار ہو جاتی ہے۔ دسویں باب میں زینب پھر چکمہ دیتی ہے اور اس کا انجام معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے ۔ گیارہویں باب میں زینب کا مکر کھل جاتا ہے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتی ۔ بارہویں باب میں اسقلیبیوس کی جوابی کارروائی کی وجہ سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور تیرہواں چودہواں باب یہی تجسس لیے ہوئے ہیں ۔ چودہویں باب میں ڈرامائیت کا عنصر کافی ہے اور پندرہواں باب اسی ڈرامائیت کے ساتھ ختم ہوتا ہے اور واقعات کی اٹھان ختم ہو جاتی ہے۔ سولہویں باب میں پھر نئے واقعات ابھرتے ہیں اور آخر تک پہنچتے پہنچتے پھر سکون پیدا ہو جاتا ہے ۔ فلپانا اور اس کی سہیلیاں وفا کیش خادمہ کی بدولت رہائی پانے میں کامیاب ہو گئیں ۔ سترہویں باب میں واقعات ایک دم موڑ مڑتے ہیں اور ابن زبیرؓ زخمی ہوکر گرفتار ہو جاتے ہیں، لیکن انھیں واقعات کے سلسلے میں اسقلیبیوس کی نئی سکیم کے تحت خود شہزادی بھی گرفتار ہو جاتی ہے ۔ یہ دونوں ابواب بھی تجسس کا وافر عنصر رکھتے ہیں ۔ اب ناول میں خصوصی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور پلاٹ منتہیٰ پر پہنچ چکا ہے کہ انیسویں اور بیسویں باب میں ابن زبیرؓ اور فلپانا الگ الگ منصوبوں کے تحت آزاد ہو جاتے ہیں اور پلاٹ میں ایک بار پھر ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے ۔ آخری تین ابواب میں پلاٹ میں پھر تدریجی ارتقا ہوتا ہے اور ڈرامائی انداز میں ناول منتہیٰ پر پہنچ کر اختتام پذیر ہوتا ہے ۔ انجام قاری کے جذبات سے ہم آہنگ ہے ۔

شرر نے اس ناول میں پلاٹ کی ترتیب اور پیشکش میں جزئیات پر بھی گہری نگاہ رکھی ہے جس سے ناول میں فطری عنصر اور حقیقت کا رنگ ابھر آیا ہے ۔ چھٹے باب میں جب فلپانا اور اس کی سہیلیاں مردانہ بھروپ بھرکر اسلامی کیمپ میں جانے کا پروگرام بناتی ہیں تو ان کا باہم مذاق فطری رنگ رکھتا ہے ۔ ایک دوسرے کے لیے ناموں کی تجویز میں جزئیات اور حقیقت کو مد نظر رکھا گیا ہے ۔ ایسے نام نہیں تجویز کیے گئے جن کا تلفظ طرابلسی صحیح طور پر ادا نہ کر سکیں مثلاً عبداللہ، طلحہ وغیرہ بلکہ ہاشم، جابر اور فرید نام تجویز کیے گئے ۔ اس باب میں ان سے باہم گفتگو میں بار بار فطری طور پر یہ لغزش سرزد ہوتی ہے کہ وہ اپنے لیے صیغۂ تانیث استعمال کر بیٹھتی ہیں ۔ شرر نے چونکہ جزئیات پر نگاہ رکھی ہے اس لیے زینب انھیں تاکید کرتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے تعظیمی القاب و الفاظ کا استعمال ترک کر دیں کیونکہ عرب سب ایک دوسرے کو بھائی سمجھتے ہیں ۔ قلعے سے نکلتے ہوئے بھی منصوبے کی راز داری کے لیے جملہ جزئیات و تفصیلات کو مد نظر رکھا گیا ہے ۔ اس طرح ناول میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ حقیقت کا رنگ ابھر آیا ہے ۔

کردار نگاری :

فلپانا میں جن تاریخی شخصیتوں کے اسمائے گرامی آئے ہیں اُن میں حضرت عثمان غنیؓ،

حضرت زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، اور عبداللہ بن ابی سرح شامل ہیں۔ دیگر تاریخی کرداروں میں گریگوری، اس کی بیٹی فلپانا کے نام نمایاں ہیں۔ امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ کی شخصیت ناول کے آغاز میں اور اختتام پر تھوڑی دیر کے لیے سامنے آتی ہے۔ حضرت زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، اور عبداللہ بن عمرؓ کی شخصیتیں بھی پہلے باب میں چند لمحوں کے لیے سامنے آتی ہیں۔ ناول کے اہم تاریخی کرداروں میں عبداللہ ابن زبیرؓ، عبداللہ بن ابی سرح، گریگوری اور فلپانا ہیں جب کہ دیگر کرداروں میں نو مسلم مصری اسقلیبیوس، فلپانا کی دو سہیلیاں ہیلنا اور جوزفینا، خادمہ جولیانہ، غسانی عورت زینب وغیرہ شامل ہیں۔

پہلے باب میں حضرت عبداللہ ابن زبیر کی شخصیت ایک درد دل رکھنے والی ہستی کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ انھیں نو مسلم مصری سے ہمدردی ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ کی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے وہ اسے تسلی دیتے ہیں کہ اس کے معاملے میں انصاف کے لیے امیر المومنین فوری توجہ فرمائیں گے۔ ابن زبیرؓ اپنے دیگر رفقا کے ساتھ گفتگو میں بعض انتظامی معاملات کے بارے میں تشویش کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کی گفتگو بہت محتاط اور ذمے دارانہ ہے۔ شرر نے دوسرے باب میں جہاد پر روانگی کے وقت عبداللہ ابن زبیرؓ کی زبان سے گریگوری کی بیٹی کے حصول کے لیے نبرد آزمائی کا اظہار کیا ہے جو ابن زبیرؓ کی شخصیت سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اگرچہ بعد میں شرر نے اس فقرے سے پیدا ہونے والے تاثر کو مٹانے کی کوشش کی ہے لیکن شخصیت تاریخی اعتبار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔

عبداللہ ابن زبیرؓ نے میدان کار زار تک پہنچنے کے لیے مدینہ سے طرابلس تک کا سفر جس سرعت سے کیا ہے اس سے ان کا جوش جہاد، جذبہ اور ہمت بخوبی آشکارا ہوتے ہیں۔ عبداللہ ابن ابی سرح گریگوری کے اعلان سے جس مشکل میں مبتلا تھے اس کا حل ابن زبیرؓ نے چند لمحوں میں تجویز کر دیا۔ اس سے ان کی شخصیت میں زیرکی اور دانشمندی کا پہلو اجاگر ہوتا ہے۔ ابن زبیرؓ نے میدان جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے اور جس حوصلہ مندی سے کثیر دشمن کا مقابلہ کیا وہ ان کی شجاعت، فنون حرب میں کاملیت اور جنگی منصوبہ بندی میں مہارت کا پتہ دیتا ہے۔ گریگوری کے قتل کے بعد آن کا خاموش رہنا اور فلپانا کے لیے از خود دعویداری نہ کرنا بھی آن کے کردار کی عظمت کا مظہر ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ جنگ حصول فلپانا سے کہیں زیادہ اعلائے کلمتہ الحق کے لیے لڑی۔ مدینہ منورہ پہنچنے پر جب حضرت عثمان غنیؓ نے فلپانا انھیں بخش دی تو انھوں نے کمال دریا دلی اور فیاضی سے آسے آزاد کر دیا۔ ان اوصاف کو ابن زبیرؓ کی شخصیت میں جمع کرنے کے باوجود شرر کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ابن زبیرؓ کے کردار سے انصاف نہیں کیا اور عوامی دلچسپی کی خاطر بعض مقامات پر آن کی شخصیت کو ایسا رنگ دیا ہے جو مناسب نہیں۔

فلپانا کی شخصیت میں حسن، شجاعت، فنون سپہ گری سے واقفیت، حوصلہ مندی اور زیرکی کے عناصر کو جمع کیا گیا ہے۔ وہ میدان جنگ میں اپنی فوج کی قیادت کرتی ہے، جس کا فوج پر نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر کے طرابلس پہنچ جانے پر جب سپہ سالار عساکر خلافت کی طرف سے یہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ گریگوری کا سر لانے والا ایک لاکھ

اشرف انعام کے علاوہ طرابلس کی حکومت اور فلپانا کا بھی حقدار ہوگا تو گریگوری پریشان ہو جاتا ہے۔ فلپانا بھی اگرچہ مشوش ہے لیکن وہ حوصلہ مندی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ وہ باپ کی ڈھارس بندھاتی ہے۔ سہیلیوں کے ساتھ مل کر ابن زبیرؓ کی گرفتاری اور سپہ سالار لشکر اسلام کے قتل کا منصوبہ بناتی ہے اور باپ کو بتائے بغیر پوری راز داری سے اس پر عمل کر بیٹھتی ہے۔ وہ میدان جنگ میں اسلامی لشکر کے جنگی حربوں کا رد سوچتی ہے۔

مسلمانوں اور عربوں کے مقابلے میں وہ خود کو برتر تصور کرتی ہے اور جذبۂ افتخار رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک عربوں میں حسن اور عربی میں فصاحت کا فقدان ہے۔ وہ قید ہو جانے پر بھی کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتی بلکہ عبداللہ ابن ابی سرح پر بڑے سلیقے سے طنز کر جاتی ہے کہ وہ گریگوری کے اشتہار سے خوف زدہ ہو کر خیمے میں چھپ کر بیٹھ گیا جب کہ گریگوری مسلمانوں کے اعلان سے خوفزدہ ہوئے بغیر بدستور روزانہ جنگ میں آتا ہے۔ چودھویں باب میں اس کی تقریر ظاہر کرتی ہے کہ وہ ایک شعلہ بیان مقررہ ہے جو انسانی نفسیات سے پورے طور پر با خبر ہے اور اس کی تقریر اس نفسیات شناسی اور انداز بیان سے براہ راست دل پر اثر کرتی ہے۔

فلپانا میں یہ جملہ اوصاف مردانگی ہیں لیکن نسوانیت کا رنگ بہت کم ابھرتا ہے جو صحیح معنی میں کردار کو زندگی بخش سکتا تھا۔ ایک آدھ مقام ایسا آتا ہے جہاں یہ نسوانیت کی جھلک لمحے بھر کے لیے نگاہوں کے سامنے آتی ہے لیکن پھر فوراً غائب ہو جاتی ہے۔ ان میں ایک مرحلہ وہ ہے جب وہ رومی فوج کے دھوکے میں اپنی سہیلیوں سمیت مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتی ہے اور ابن زبیرؓ اسے عزت و احترام کے ساتھ اسلامی لشکرگاہ میں ایک خیمے میں ٹھہراتے ہیں، رات کے وقت جب جولیانہ اسے چھڑانے کے لیے دبے قدموں اس کے خیمے میں داخل ہونے لگتی ہے تو ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں جو شکوک و شبہات اور خیالات پیدا ہوتے ہیں وہ اس میں نسوانیت کی چمک پیدا کر دیتے ہیں لیکن یہ بہت کم وقفے کے لیے ہے۔ آخری باب میں ایک بار پھر یہ چمک اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مدینہ منورہ میں ابن زبیرؓ اسے آزاد کر کے خاموشی سے اپنے گھر چلے جاتے ہیں اور وہ خود ہی سوچ بچار کر کے ان سے شادی کا فیصلہ کر لیتی ہے۔

گریگوری اپنے کثیر التعداد لشکر کے باوجود عبداللہ ابن زبیرؓ کے اعلان کے بعد خوف زدہ دکھائی دیتا ہے۔ میدان جنگ میں اس کی بوکھلاہٹیں اسے ایک بزدل انسان کے روپ میں پیش کرتی ہے۔ اسے اپنی اکلوتی بیٹی سے بے پناہ محبت ہے۔ شاید فلپانا ہی اس کی ہمت بھی ہے اور عقل بھی۔ فلپانا کے بغیر وہ خود کو انتہائی بے بس اور شکست خوردہ محسوس کرتا ہے۔ یہ صفات اس کے کردار میں قدم قدم پر نمایاں ہیں۔

عبداللہ ابن ابی سرح کے کردار کے ساتھ بھی اس ناول میں انصاف نہیں کیا گیا۔ اسقلیبیوس نو مسلم اور اس کی بھتیجی جولیانہ کے کردار دیگر کرداروں کی نسبت زیادہ جاذب نظر اور زندہ دکھائی دیتے ہیں۔ اسقلیبیوس حساس بھی ہے اور دھن کا پکا بھی۔ وہ اپنے محسن کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتا۔ جولیانہ کا کردار فطری رنگ اور زندگی کا عنصر نسبتاً زیادہ رکھتا ہے۔ اسقلیبیوس جب اس محل میں پادری کے روپ میں ملتا ہے اور بے تکلفی کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ اسے اپنے چچا کی حیثیت سے نہ پہچان سکتے ہوئے اس کے ساتھ جو رویہ اختیار کرتی ہے اس

میں نسوانیت کی بھر پور جھلک موجود ہے ۔ چچا کے کہنے پر وہ شاہزادی کو سہیلیوں سمیت رومی لشکر کے استقبال پر آمادہ کرتی ہے لیکن اس کے بعد جب وہ خود اسلامی لشکرگاہ میں پہنچتی ہے تو اس کا ضمیر اسے محسن سے غداری پر شدید ملامت کر رہا ہوتا ہے ۔ اس کی اندرونی کشمکش اس کے کردار کو نکھراتی ہے اور اس وقت وہ اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے جب جولیانہ چچا کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی جان پر کھیل کر شہزادی کو سہیلیوں سمیت نکال کر لے جاتی ہے ۔ شہزادی جب دوسری بار گرفتار ہوتی ہے تب بھی جولیانہ کمال ہمدردی اور جاں سپاری کا مظاہرہ کرتی ہے ۔ اس میں حوصلہ مندی کے ساتھ ساتھ زیرکی اور چالاکی کی صفات بھی موجود ہیں ۔

زینب کا کردار عیاری اور مکاری کا ترجمان ہے ۔ وہ عبداللہ ابن زبیرؓ کی گرفتاری کے لیے سکیم تیار کرتی ہے اور فلپانا کا ساتھ دیتی ہے ۔ اسلامی لشکرگاہ میں مردانہ لباس میں قیام کرکے ابن زبیرؓ کا قرب حاصل کرتی ہے اور ان کی جنگی منصوبہ بندیوں سے باخبر ہو کر اپنی جان پر کھیل کر فلپانا کو مطلع کرتی ہے ۔ وہ اگرچہ عیسائی ہے اور مسلمانوں کے خلاف طرابلس والوں کی ہر ممکن خدمت پر آمادہ ہے لیکن اس کی قومی عصبیت برقرار ہے ۔ وہ عربی اور بالخصوص قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت کا برملا اظہار کرتی ہے ۔ دسویں باب میں اس کی عیارانہ فطرت پورے طور پر آشکارا ہے ۔

مکالمے اور منظر نگاری :

ناول کے مکالمے موقع محل سے گہری مناسبت رکھتے ہیں اگرچہ ایک دو موقعوں پر فلپانا اور ابن زبیرؓ کی گفتگو ابن زبیرؓ کی شخصیت سے ہم آہنگ نہیں ۔ بحیثیت مجموعی یہ مکالمے اپنے اندر کرداروں کی ترجمانی اور چاشنی کا وصف رکھتے ہیں ۔ انیسویں باب میں فلپانا اور عبداللہ ابن ابی سرح کے مکالموں میں موقع محل اور کرداروں کی شخصیت کی مناسبت سے تیکھا پن ہے ۔ اکیسویں باب میں عبداللہ ابن ابی سرح اور عبداللہ ابن زبیرؓ کے مکالمے فطری مکالموں کی عمدہ مثال ہیں ۔ جولیانہ اور گریگوری کے مکالمے کرداروں کی شخصیت سے ہم آہنگی کا اچھا نمونہ ہیں ۔

ناول میں بعض مواقع کی مرقع کشی بھی عمدگی سے کی گئی ہے ۔ مرقع کشی کے ان عمدہ نمونوں میں اسلامی لشکر میں عبادت گزاری، شب بیداری اور سحر خیزی کے مناظر، سادگی اور خلوص کے مرقعے اور سترہویں باب میں معرکۂ کارزار کے مرقعے خوبصورت اور جاندار ہیں ۔ نائٹوں کی جنگ اور قریشیوں کے عزم و بہادری کے مناظر بھی خوبصورتی سے پیش کیے گئے ہیں ۔

۴۱۔ زوال بغداد

پلاٹ :

زوال بغداد کا پلاٹ شرر کے دیگر ناولوں کی طرح مربوط اور چست پلاٹ نہیں ۔ شرر کے پیش نظر چونکہ زوال پذیر بغداد کی تصویر کشی تھی جس میں ہر طرف انتشار برپا تھا ، فرقہ وارانہ فسادات تھے ، طبقاتی نفرت اور عصبیت کارفرما تھی ، سازشیں اور خود غرضیاں تھیں جن کا ایک لامتناہی سلسلہ عوامی سطح سے لے کر درباری امراء تک پھیلا ہوا تھا ۔ خلیفہ کی نااہلیت ، امور سلطنت سے غفلت ، طوائف الملوکی اور وزیر ابن علقمی کی ریشہ دوانیاں سلطنت

کی جڑوں کو کھوکھلی کر چکی تھیں ۔ جرائم پیشہ افراد کے حوصلے اور تخریبی کارروائیاں حد سے بڑھ چکی تھیں ۔ شرر اس بغداد کی تصویر کشی کرنا چاہتے تھے اور ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کی درد انگیز تباہی کو اس کی اصل وجوہات سمیت پیش کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے پیش نظر چونکہ قاری کی دلچسپی کا مسئلہ بھی تھا اس لیے انھوں نے زبیدہ اور یوسف کی داستان عشق کو بھی ناول کا جز بنا لیا اور اسی داستان عشق پر اپنے ناول کے پلاٹ کا ڈھانچا کھڑا کرکے بغداد کے مختلف النوع واقعات کو ان سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ چنداں کامیاب نہیں ہو سکے ۔

ناول کا پلاٹ ان مختلف النوع واقعات اور موضوع کے پھیلاؤ کی وجہ سے اکھڑا اکھڑا لگتا ہے ۔ یوسف اور زبیدہ کی محبت زوال بغداد کی اس حقیقت میں ایسی مرکزی حیثیت نہیں رکھتی کہ تمام دیگر واقعات اس کا تتمہ بن کر پلاٹ کا جزو بن سکیں اور نہ ہی ہیرو ہیروئین ایسی شخصیت کے مالک ہیں کہ وہ براہ راست زوال بغداد کی خونچکاں داستان سے متعلق ٹھہریں ۔ یہی وجہ ہے کہ شرر کو ناول میں تسلسل پیدا کرنے کے لیے کبھی ایک کردار کے سہارے آگے بڑھنا پڑا ہے اور کبھی دوسرے کے سہارے ، کبھی کسی ضمنی واقعے کے ذریعے انھوں نے برائے نام ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور کبھی کرداروں کے مکالموں کے ذریعے ۔

زوال بغداد کے پہلے دو ابواب میں ایک تسلسل ہے ، تیسرا اور چوتھا باب پہلے دو ابواب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ۔ پانچویں باب کے واقعات کا پہلے اور دوسرے باب کے واقعات سے تعلق ہے ، چھٹا باب پلاٹ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اس کے واقعات اپنی جگہ پر انفرادی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا ناول کے پلاٹ سے کوئی کمزور سا ربط بھی نہیں پیدا ہو سکا ۔ ساتواں باب پلاٹ سے متعلق اور آٹھواں پھر غیر متعلق ، نواں ، دسواں باب پلاٹ سے متعلق ہیں اور گیارہواں پھر تقریباً غیر متعلق ہے اگرچہ اس کے ربط کے لیے ایک جواز پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ ربط پلاٹ کو مزید بوجھل بنا رہا ہے ۔ یہی کیفیت بارہویں باب کی ہے ۔ تیرہواں باب پلاٹ سے بالکل ہی غیر متعلق ہے چودھواں باب پھر پلاٹ سے متعلق ہے اور پندرہواں قطعاً غیر متعلق ۔ پھر چھ ابواب میں ربط ہے اور آخری دو ابواب زبردستی پلاٹ کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں ۔

زوال بغداد کو دوہرے پلاٹ کا ناول بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ واقعات جو اصل پلاٹ سے متعلق نہیں انھیں آسانی سے کسی دوسری لڑی میں بھی نہیں پرویا جا سکتا ۔ اس اعتبار سے زوال بغداد پلاٹ کے اعتبار سے شرر کا ایک کمزور ناول ہے اگرچہ انھوں نے اس میں تجسس اور دلچسپی کے لیے عیاروں کے حیرت انگیز کارنامے اور جنت عنقود کے پراسرار مناظر کو شامل کیا ہے لیکن یہ تمام واقعات اپنی تمام تر سنسنی خیزی اور تحیر آمیزی کے باوجود پلاٹ کو بوجھل بنانے کا باعث بن گئے ہیں ۔ پلاٹ اکھڑا اکھڑا ، بے ربط اور ڈھیلا ڈھالا ہے ۔

کردار :

زوال بغداد میں جس طرح واقعات کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہے اسی طرح کرداروں کی تعداد بھی بڑھی ہوئی ہے ۔ اس ناول کے متعدد کرداروں میں اہم کردار یوسف ، زبیدہ ، ام زغول ، ملاح ابوالعنقوق ، عنقودہ ، ام عنقودہ ، طقطقی ، شقشقی ، خلیفہ المستعصم باللہ ، نجم الدین باذرائی ،

رکن الدین دواتدار ، شاہزادہ امیر ابوبکر ، وزیر ابن علقمی ، مجاہدالدین ایبک ، نسم السحر ، سوسن ، افتگین اور ہلاکو خان کے ہیں ۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ناول نگار جب کرداروں کی تعداد کو بڑھا دیتا ہے تو اس کی توجہ بھی اسی نسبت سے بٹ جاتی ہے اور وہ کسی ایک کردار کی طرف بھی پوری توجہ نہیں دے سکتا ۔ اس کے نتیجے میں تقریباً سبھی کردار عموماً بے جان ہوکر رہ جاتے ہیں۔ ایسے کردار بالعموم صرف بعض صفات یا کسی ایک صفت کی نمائندگی کے لیے تخلیق ہوتے ہیں ، ان میں انسانی جذبات و احساسات اور زندگی کا فقدان ہوتا ہے ۔ یہی کیفیت اس ناول کے کرداروں کی ہے ۔ ابوالعنقوف شر پسندوں اور عیاروں کے گروہ کا ایک کارکن ہے ، ام زغول بھی ان کی ایک اہم رکن ہے ۔ ان دونوں نے اپنی شخصیتوں پر معصومیت کے خول چڑھا رکھے ہیں ۔ وہ بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ عیاروں کے مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہیں ۔

طقطقی اور شقشقی اپنے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ بعض اوقات کسی مقصد کی خاطر اور بعض اوقات محض تفریحاً ہنگامہ پیدا کرا دینا ، لوگوں کو باہم لڑوا دینا اس گروہ کے عزائم ہیں تاکہ بے اطمینانی اور انتشار کی فضا قائم رہے ۔ اس گروہ کے افراد میں جس قسم کی صفات ہونی چاہییں اور مقصد براری کے لیے جو حربے انہیں اختیار کرنے چاہییں یہ دونوں ان میں کامل ہیں لیکن پلاٹ کی نوعیت ، واقعات کے پھیلاؤ اور کرداروں کی کثرت کی وجہ سے شرر ان کی طرف بھی پوری توجہ نہیں دے سکے ۔ مسعود ان کا سرگروہ ہے جو عورتوں کے سامنے عنقودہ کے روپ میں آتا ہے ۔ اپنے گروہ کے کارکنوں کی بدولت اس نے اپنی شخصیت کو پراسرار بنا لیا ہے ۔ ام عنقودہ مسعود کی ماں ہے اور وہ خود بھی انہیں عیاروں کے گروہ میں شامل ہے لیکن اس کا ضمیر زندہ ہے جس کی بنا پر وہ زبیدہ کی موجودگی میں اسے برا بھلا کہتی ہے اور ان کا سارا راز آشکار ہو جاتا ہے ۔ شرر چونکہ مسعود اور عنقودہ کی شخصیت اور جنت العنقود کے بارے میں تجسس کے عنصر کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اور اچانک سارا بھید کھولنا چاہتے تھے اس لیے ام عنقودہ کے مسعود پر اچانک برہم ہو جانے کا ڈراما پیدا کیا ہے، اگر وہ ڈرامائیت کے اس عنصر کو کم کرکے ام عنقودہ کی داخلی کشمکش اور ضمیر کی ملامت کے عنصر کو پیش کرکے اس کا رد عمل ظاہر کرتے تو شاید ام عنقودہ میں زندگی کی رمق پیدا ہو جاتی لیکن یہ کردار زندہ ہوتے ہوئے شرر کی بے توجہی کا شکار ہوگیا ۔

مجاہدالدین ایبک ، نجم الدین باذرائے اور رکن الدین دواتدار سلطنت کے خیرخواہ امراء میں شامل ہیں ۔ شرر نے ان کے کردار کے صرف انہیں پہلوؤں کو پیش کیا ہے ۔ وہ خلیفہ کی غفلت شعاری ، امور سلطنت سے بے توجہی اور ابن علقمی کی ریشہ دوانیوں پر شاکی ہیں لیکن خلیفہ ابن علقمی کے خلاف ان کی کسی شکایت پر کان نہیں دھرتا ۔ وہ اپنی نیک دلی اور نیک نیتی کے باوجود بے بسی کا شکار ہیں اور حالات کی نا مساعدت پر کڑھتے ہیں ۔ وہ سب خلیفہ کے وفادار اور اسلامی سلطنت کے جان نثار ہیں لیکن ابن علقمی کی سازشیں ان کی راہ میں حائل ہیں ۔

شاہزادہ امیر ابوبکر شجاع ہے لیکن اس کی جذباتیت تدبر پر غالب دکھائی دیتی ہے ۔ وہ بھی ابن علقمی سے نالاں اور خلیفہ پر وزیر کے اثر کا شاکی ہے لیکن ان حالات میں وہ شیعوں کے خلاف لشکر کشی کا جو اہتمام کرتا ہے وہ تدبر اور رعایا پروری کی صفات کے منافی ہے ، اس کا ردعمل ذہنی شکست اور اس کے نتیجے میں چڑچڑے پن کا مظہر ہے ۔

خلیفہ المستعصم باللہ کا کردار عقل و شعور سے عاری دکھائی دیتا ہے۔ وہ ابن علقمی کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ دولت کے لالچ میں اندھا ہے۔ اسے اندرون خانہ کی مصروفیات اور راگ رنگ کی محفلوں سے فراغت ہی نہیں۔ وہ کوئی فیصلہ اپنی سوجھ بوجھ سے نہیں کرتا۔ ترک لشکر کی برطرفی کا اہم فیصلہ اس نے محض ابن علقمی کے اشارے پر اور اس کی خوشنودیٔ مزاج کے لیے کر دیا۔ وہ دربار منعقد کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس میں بھی اس کی اپنی مرضی کو کوئی دخل نہیں بلکہ نسیم السحر کی ترغیب کارفرما ہے۔ جواہرات کے صندوق کے مل جانے کی اطلاع پر اس کا بازار میں دوڑا جانا ایک خلیفہ کے شایان شان نہیں تھا۔

نسیم السحر کے کردار پر بھی چنداں توجہ صرف نہیں ہوئی۔ شرر نے اس کی محض ایک جھلک پیش کی ہے اور وہ بہت کم وقفے کے لیے ہمارے سامنے آتی ہے۔

ابن علقمی کا کردار دیگر کرداروں کی نسبت زیادہ جاذب نظر ہے۔ وہ موقع شناس ہے، بات بنانی جانتا ہے، مکار و عیار ہے۔ دلی کیفیات کو چھپا لیتا ہے۔ اپنے انتقام کے لیے وہ بڑے سے بڑا قدم اٹھا سکتا ہے۔ ضرورت کے تحت خوشامد بھی کر لیتا ہے۔ وفاداری اور خلوص اس کے نزدیک بے معنی الفاظ ہیں۔ سازش میں پختہ کار ہے۔ بدفطرت، بدطینت اور متعصب شخص ہے۔ اپنی کیادت اور شقی القلبی کے باوجود وہ کرخ کے شیعوں کے قتل عام پر رو پڑتا ہے، لیکن اس کے برعکس وہ بغداد کی تباہی پر ایوان خلافت کے کھنڈرات میں گھومتا ہوا شکر خدا کرتا ہے کہ اس کا انتقام پورا ہو گیا۔ یہ انتقام کس قدر بھیانک تھا کہ بغداد کی چہار دیواری کے اندر اٹھارہ لاکھ انسان تہہ تیغ ہوئے۔

زبیدہ سادہ لوح دوشیزہ ہے، مکر و فریب سے نا آشنا، اس لیے وہ عیاروں کے چنگل میں پھنس جاتی ہے۔ ضعیف الاعتقاد ہے۔ باوفا اور مخلص ہے، یوسف کو حاصل کرنے کے لیے وہ ہر قربانی دینے کو تیار ہے۔ یوسف کی صحت یابی کے لیے وہ قصر سیدوک کے خوفناک مقام تک جا پہنچتی ہے۔ یوسف کی بے وفائی کا جو منظر اسے دکھایا گیا ہے اس پر اس کے سینے میں حوش رقابت ابھر آتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھاتی۔ یوسف اگرچہ ناول کا ہیرو ہے لیکن ناول کے مختلف النوع واقعات میں اس کی شخصیت کو ابھرنے کا بہت کم موقع ملا ہے اور وہ بھی ناول کے عام کرداروں کی صف میں شامل ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن زبیدہ کے کردار پر زیادہ توجہ صرف ہوئی ہے۔ وہ باوفا بھی ہے اور باحیا بھی۔ عنقودہ سے یوسف کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے حیا سے اس کی زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ وہ مستقل مزاج ہے۔ عنقودہ کی دھمکیاں اور ترغیبات اس کے دل سے یوسف کی محبت کو نہیں نکال سکتیں۔ مختلف نفسیاتی مواقع پر اس کی ذہنی کشمکش اور داخلی کیفیت پورے طور پر اجاگر ہوتی ہے۔ نویں باب میں یوسف سے اس کی ملاقات کے دوران اس کا کردار چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے، یوسف اس سے اپنی بدگمانی کا اظہار کرتے ہوئے کرخت لہجہ اختیار کرتا ہے لیکن وہ بے گناہ ہونے کے باوجود اور خود یوسف سے گلے شکوے رکھنے کے باوجود نرم لہجے میں گفتگو کرتی ہے۔

شرر نے اس ناول میں ہجوم کی نفسیات کو ملحوظ رکھا ہے، تیسرے اور دسویں باب میں اس کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ یوسف کو گرفتار کرانے کے لیے طقطقی اور شقشقی جو طریق کار اختیار کرتے ہیں وہ بھی ہجوم کی نفسیات سے فائدہ اٹھانے کا ایک طریقہ ہے اور حنبلیوں کی ایوان خلافت پر یلغار بھی اسی نفسیات کے تابع ہے۔

مرقع کشی اور زبان و بیان :

زوال بغداد میں پلاٹ اور کردار نگاری کے نقائص کامیاب مرقعوں کی بدولت زیادہ ابھرنے نہیں پائے۔ قاری ان مرقعوں اور مناظر کی طلسماتی فضا میں کھو جاتا ہے۔ پہلے باب میں بغداد کا محل وقوع ، اس کی شاندار عمارات ، دجلہ اور اس کے ارد گرد کے مناظر خوبصورتی سے پیش کیے گئے ہیں۔ رات کا پرہول سناٹا اور اس میں قصر سیدوک کی طرف دجلہ میں ایک کشتی کا سفر ، برامکہ کے کھنڈرات اور شب زندہ دار صوفیوں کا ویرانے میں ذکر و اذکار میں مصروف ہونا بھرپور انداز میں پش کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں جنت العنقود کی طلسماتی فضا ، وہاں کے باغات اور جنوں کا تلاوت کلام پاک میں مصروف ہونا کامیاب انداز میں پش کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں بغداد کی شام کی رونقوں کے مرقعے ہیں اور چوتھے باب میں ایوان خلافت کے قصر الشجر کا مرقع۔ اس مرقعے کا ایک نمونہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں :

''اس وسیع قطعہ زمین میں جس کا طول و عرض سو سو گز کے قریب تھا دیبا و حریر کا مرصع فرش بچھایا گیا تھا جس میں بیش بہا موتیوں سے گل بوٹے بنائے گئے تھے اور فرش کی قطع بالکل ایک شاداب تر و تازہ اور سدا بہار چمن کی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس جواہرات کے نقلی چمن میں عمدہ ترتیب اور قرینہ سے دو دو تین تین گز کے اونچے سونے چاندی کے سینکڑوں درخت نصب تھے جن کے پتے کارچوبی تھے اور پھول خوش رنگ جواہرات کے لگائے گئے تھے، جو اس کثرت سے تھے کہ پتوں پر غالب آ گئے تھے۔ نظر جدھر جاتی تھی جواہرات اور موتیوں کے خوش رنگ اور آبدار پھولوں ہی پر پڑتی تھی۔ ان درختوں پر جا بجا زمرد اور دیگر جواہرات کے خوبصورت طیور بٹھائے گئے تھے۔ چمن کے صدر میں خلیفہ کا تخت زمردیں نصب تھا جس پر چار طرف سے جواہرات کے نہایت ہی اعلیٰ درجے کے چار خوش قطع درخت سایہ کیے ہوئے تھے اور ان درختوں کے اوپر کمخواب کا ایک پرتکلف شامیانہ کھنچا ہوا تھا جس کی چوبیں سونے کی تھیں۔ اسی چمن میں خلفائے بغداد نے فرانس کے سفیروں یا دنیا کے کسی نامور فرماں روا کے ایلچیوں سے ملاقات کی تھی۔ یہاں کا ساں دیکھ کر وہ اس قدر محوحیرت ہوگئے تھے کہ ان کے بیانات آج تک پریوں کے ملک کے افسانوں کی طرح پڑھے جاتے ہیں۔

جواہرات کے اسی چمن میں اس وقت مستعصم باللہ بیٹھا ہوا ہے۔ صد ہا پری تمثال نازنین و صاحب جمال جادو نگاہیں مغرق لباس پہنے چمن میں پھیلی ہوئی ہیں جو جواہرات کے درختوں کے آس پاس ٹہلتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جنت آسمانی میں حوریں مصروف خرام ناز ہیں۔ آفتاب کی آخر وقت کی کرنیں اسی گھڑی اس چمن میں ایک آگ سی لگائے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر پھول پتی سے شعلے اٹھ رہے ہیں جو خود آفتاب کے خرمن حسن کو جلا کر خاک کر دیں گے۔ تخت کے سامنے تیس محشر خراموں کا ایک گروہ رقص و سرود میں مصروف ہے جن کے نور کے گلے اپنی دلکش تانوں سے خلیفہ اور تمام لوگوں پر ایک عالم مدہوشی طاری کیے ہوئے ہیں۔''

پانچویں باب میں رات کی تاریکی کا ایک منظر ہے لیکن وہاں شرر ادیب سے زیادہ خطیب و واعظ بن گئے ہیں ، اگرچہ تشبیہات و استعارے حسین ہیں لیکن موضوع بہت سنجیدگی اختیار کر گیا ہے البتہ نویں باب میں رات کا منظر دلچسپ ہے۔ تیرہویں باپ میں ایک کے گھر کا مرقع اور اس کی سراپا نگاری قابل توجہ ہے۔ پندرہویں باب میں حریم خلافت کے ایک دیوان کا پر شکوہ منظر اور تکلفات ، غلاموں کے لباس وغیرہ جاذب نظر ہیں۔ آخری دو ابواب میں بغداد کی ویرانی اور تباہی کے مناظر بھی متاثر کرنے والے ہیں۔

۱۵- رومتہ الکبریٰ

پلاٹ :

یہ ناول پانچویں صدی عیسوی کے روما کے حالات سے متعلق ہے جب وزی گاتھوں کے بادشاہ الارق نے رومتہ الکبریٰ پر حملہ کر دیا تھا ۔ ناول کا پلاٹ سیدھا سادا ہے ۔ واقعات کا خلاصہ ہم چوتھے باب میں بیان کر چکے ہیں ۔ شرر نے پلاٹ کی تعمیر میں کوشش کی ہے کہ واقعات اس انداز سے مرتب کیے جائیں کہ ان میں دلچسپی اور تجسس کا عنصر بھی پیدا ہو سکے اور پلاٹ کا منطقی ربط اور ارتقا بھی موجود ہو ۔ تجسس کے عنصر کی خاطر شرر نے اڈولفوس کو دوہرے روپ میں پیش کیا ہے ، ایک اوڈلفوس کا روپ اور دوسرا ارسطوبلوس کا روپ ۔ پہلے روپ میں وہ الارق کا جانشین اور قیصر ہونوریوس کا حریف ہے ، پلاقیدیا کا عاشق ہے ۔ دوسرے روپ میں وہ پلاقدیا کے پاس بطور قاصد خود اپنے ہی پیغام پہنچاتا ہے ۔ اس کے یہ دونوں روپ آخر تک قائم رہتے ہیں اور ناول کے اختتام سے ایک باب پہلے شہزادی پلاقیدیا پر یہ راز کھلتا ہے ۔ قاری بھی بہت دیر تک انھیں دو الگ الگ شخصیتیں تصور کرتا رہتا ہے اگرچہ شرر کے بعض جملوں سے یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ارسطوبلوس خود ہی اڈولفوس بھی ہے ۔ اڈولفوس کا ذکر عموماً صیغہ غائب میں ہوتا ہے ، صرف آخری دو تین ابواب میں ہی وہ براہ راست قاری کے سامنے آتا ہے ۔ ناول میں وہ ہمارے سامنے زیادہ تر ارسطوبلوس کے روپ میں ہی آتا ہے ۔ اس کی شخصیت کے اس دوہرے روپ سے ہی ناول میں تجسس اور دلچسپی کا عنصر قائم ہے ورنہ پلاٹ بذات خود بہت سیدھا سادا ہے اور اس میں زیادہ نشیب و فراز یا سوز موجود نہیں ۔

اس ناول کے پلاٹ میں جو نقص شدت سے کھٹکنے لگتا ہے وہ اس کا زمانی پھیلاؤ ہے ۔ پہلے باب کا آغاز کرتے ہوئے شرر نے اسے ۴۰۴ء کا زمانہ قرار دیا ہے ۔ ہم چوتھے باب میں ذکر کر چکے ہیں کہ یہ سنہ تاریخی اعتبار سے صحیح ہے ۔ اسی سال الارق کو ہونوریوس کے لشکر کے ہاتھوں شکست ہوئی اور قیصر نے ٹرائمف کا اہتمام کروایا ۔ گیارھویں باب میں شرر نے روما کے محاصرے کی سنہ ۴۳۰ء بتائی ہے ۔ یہ امر بھی تاریخی اعتبار سے صحیح ہے کہ ۴۳۰ء میں الارق نے روم پر حملہ کیا اور تباہی مچا دی ، لیکن ناول کے پلاٹ کے اعتبار سے یہ زمانی پھیلاؤ اس لیے کھٹکتا ہے کہ شرر اڈولفوس کی پلاقیدیا سے محبت کا آغاز ۴۰۴ء میں کرتے ہیں ۔ وہ ارسطوبلوس کے روپ میں خود ہی اپنا نامہ بر بن کر آتا ہے ، شہزادی دو تین برس سوچ کر جواب دینے کا وعدہ کرتی ہے ۔ پلاٹ کے اعتبار سے ۴۰۴ء میں الارق اور ہونوریوس کے درمیان صلح کا معاہدہ ہو گیا لیکن ہونوریوس نے چونکہ الارق کو سالانہ اخراجات کی رقم ادا نہیں کی ، تین سال گزر گئے اس دوران اسٹلی شو بھی قتل ہو گیا اس لیے چوتھے برس الارق نے رومہ پر حملہ کر دیا ، لیکن حملے کا یہ سن تاریخ کی رو سے بھی اور خود شرر کے بیان کے مطابق ۴۳۰ء ہے ۔ یہ تضاد کھٹکتا ہے ۔ علاوہ ازیں یہ چھبیس تیس سال درمیان میں گزر گئے لیکن محبت کا وہ رشتہ برقرار ہے جو صرف یک طرفہ ہے اور اس میں کوئی قول اقرار نہیں ، نہ بے کلی ہے ، نہ ذوق دید۔ پلاٹ کے اس پھیلاؤ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شرر کے بتائے ہوئے زمانے کے مطابق اس "نوعمر دوشیزہ شہزادی پلاقیدیا" کی جب اڈولفوس سے شادی ہوئی ہوگی تو شہزادی کی عمر بمشکل پچاس سال ہوگی ۔

کردار نگاری :

رومتہ الکبریٰ کے اہم کرداروں میں ارسطو بلوس (اڈولفوس) ، پلاقیدیا ، اسٹلی شو ، الارق ، ہونوریوس ، سلوانوس، سرنیا، ابابوس، ساروس اور اقطاویہ اور دیگر کرداروں میں فراوٹا ، اوڈن ، سلاتفا ، ملکہ اڈولفیا ، مقتدائے نصاریٰ ، ہرقلین ، اولمپوس ، تھیوڈوسیوس ، راداگائیسوس، شہنشاہ قسطنطنیہ ارقادیوس ، باسی لیوس ، یوحنا ، لانجی نوس ، رادرق ، غالوس اور مقسمی نوس شامل ہیں ۔

فراوٹا ، اوڈن ، اور سلاتفا ارسطوبلوس کے تین ساتھی ہیں جو ٹرائمف کے موقع پر الارق کی طرف سے سفارت پر روما آئے ۔ یہ تینوں اگرچہ بہت مختصر وقفے کے لیے سامنے آئے لیکن وہ اس عہد کے وزی گوتھوں کے مزاج ، انداز فکر اور عادات کے ترجمان ہیں ۔ وہ سیدھے سادے لوگ ہیں ۔ عیش و نشاط کی پر تکلف زندگی سے ان کا سابقہ نہیں پڑا اور وہ اسے پسند نہیں کرتے ۔ عیش طلبی اور جھوٹی شان و شوکت کو وہ قوموں کی تباہی کا پیش خیمہ تصور کرتے ہیں ۔ وہ خوددار اور غیور بھی ہیں اور جری و شجاع بھی ۔ باوجودیکہ وہ روما والوں کے نزدیک غیر مہذب ہیں لیکن ٹرائمف کے موقع پر مفتوح قوم کے معزز قیدیوں کے ساتھ قیصر کے سلوک کو وہ خفیف الحرکتی تصور کرتے ہیں ۔ گویا ان کے نزدیک بھی انسانیت کی کچھ نمایاں قدریں ہیں ۔ وہ اس جلوس میں اپنی ملکہ کو اسیر اور پیادہ پا برہنہ سر چلتے دیکھ کر بڑی مشکل سے اپنے جوش پر قابو پاتے ہیں لیکن وہ انتقام کے لیے زندہ رہنے کا عہد کرتے ہیں ۔

ہرقلین ، اولمپوس اور تھیوڈوسیوس ایک آدھ مرتبہ بہت کم عرصے کے لیے ہمارے سامنے آتے ہیں ، وہ خود غرض امرائے سلطنت کے گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ وطن سے محبت کی بجائے انھیں ذاتی اغراض سے زیادہ دلچسپی ہے ۔ اپنے مفاد کی خاطر وہ وسیع تر ملکی اور قومی مفاد کو بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کرتے ۔ اسٹلی شو کے خلاف ان کی سازش ان کی بدباطنی اور حسد پر مبنی ہے ۔ وہ قیصر ہونوریوس کے مزاج پر حاوی ہونے کے لیے محب وطن ، نیک دل ، شجاع اور مدبر وزیر اسٹلی شو کو اس کے مرتبے سے گرانے کی منظم سازش کرتے ہیں ۔ سلوانوس اسی گروہ کا نمائندہ ہے ۔ وہ پلاقیدیا سے پہلی ہی ملاقات میں نہ صرف یہ کہ اسٹلی شو کے بارے میں اپنی دل کی بات بتا دیتا ہے بلکہ پلاقیدیا کو یہاں تک پیشکش کرتا ہے کہ اگر وہ سلوانوس سے شادی کر لے تو وہ اور اس کے ساتھی قیصر ہونوریوس کو بھی معزدل کرکے اسے قیصرہ بنا دیں گے ۔ سلوانوس کافی بے مغز اور احمق معلوم ہوتا ہے وہ بڑی آسانی سے اسٹلی شو کے خلاف سازش کا راز شہزادی کو بتا دیتا ہے ۔ وہ انسانی فطرت کو سمجھنے سے قاصر ، نمک حرام ، ہوس پرست اور سطحی شخصیت کا مالک ہے ۔

شہنشاہ قسطنطنیہ ارقادیوس کا کردار پس منظر میں ہے ۔ باسی لوس، یوحنا، مقتدائے نصاریٰ، رادرق ، غالوس اور مقسمی نوس کے کردار بہت معمولی وقفے کے لیے سامنے آتے ہیں ۔ وہ اپنے ٹائپ کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن انفرادی طور پر کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑتے ۔

اتالوس مصنوعی یا ڈمی بادشاہ کے رول کے لیے موزوں کردار ہے ۔ وہ کمزور دل ، موت سے خائف اور حکم کا بندہ ہے ۔ اسے جب حکم ملتا ہے کہ تاج پہن لے تو پہن لیتا ہے ۔ قصر قیصری میں ٹھہرنے کا حکم ملتا ہے تو تعمیل کرتا ، قصر خالی کرنے کا حکم ملتا ہے تو

اسے کوئی عذر نہیں ، ہونوریوس پر چڑھائی کا حکم ملتا ہے تو حاضر اور ہونوریوس کو دوبارہ تاج پیش کیے جانے کی خدمت اس کے سپرد ہوتی ہے تو وہ بلا چون و چرا اس کی بھی تعمیل کرتا ہے ۔ لانجی نوس بھی اپنے ٹائپ کا نمائندہ ہے ۔ ساروس جرأت مند بھی ہے اور چالاک بھی ۔ وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے بڑی فنکاری سے ہونوریوس سے وعدہ لیتا ہے اور موقع شناس ہے، وقت دیکھ کر آرزو بیان کرتا ہے اور قیصر کو ایفائے عہد کی ترغیب دیتا ہے ۔ بھیس بدل کر پلاقیدیا تک جا پہنچتا ہے اور اسے بہلا پھسلا کر روما سے نکال لاتا ہے ۔ اپنے رقیب کا وجود برداشت نہیں کر سکتا اور اڈولفوس کو سوتا دیکھ کر وار کر بیٹھتا ہے ۔ ہونوریوس بے تدبیر اور بے عقل ، خوشامد پسند قیصر ہے ۔ نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتا ۔ شان و شوکت اور نمود و نمائش کا خواہاں ہے ، وہ بزدل بھی ہے ۔ ملکہ اوڈلفیا کا کردار بہت مختصر عرصے کے لیے سامنے آتا ہے ، وہ ایک حساس ، غیرت مند خاتون دکھائی دیتی ہے ۔ سرنیا کمزور دل عورت ہے، خاوند کے غم کے صدمے نے اس کی ذہنی حالت کو بری طرح متاثر کیا ہے ۔ اسٹلی شو کے قتل کے بعد وہ خود بھی اپنی زندگی سے بیزار دکھائی دیتی ہے ۔ اقطاویہ زندہ دل خوش فہمیوں میں مبتلا ضعیف الاعتقاد دوشیزہ ہے ۔ بہن کے لیے دل میں قربانی کا جذبہ رکھتی ہے ۔ الارق بردبار ، غیور ، سجاع ، متین اور مستقل مزاج بادشاہ ہے ۔ وہ دوست دار اور منصف مزاج ہے ، گیارہویں باب میں اس کی سخصیت کے یہ جوہر کھلتے ہیں ۔ اتالوس کی شکست پر اس کا رد عمل بھی اس کی شخصیت کا ایک رخ ہے۔ اسٹلی شو دانا اور مصلحت اندیش شخص ہے، چھٹے باب میں اس کی یہ صفات اجاگر ہوتی ہیں اور آٹھویں باب میں اس کی حب الوطنی کا جذبہ بہت نمایاں ہے ۔ اڈولفوس ارسطوبلوس کے روپ میں انتہائی مودب ، بردبار ، گفتگو میں سنجیدگی اور نرمی کا حامل ، غیور اور عقل مند شخص نظر آتا ہے ۔ وہ مصلحت اندیش بھی ہے اور اس کی گفتگو عقلی استدلال رکھتی ہے۔ اپنی شخصیت اور محبت کو اتنی دیر چھپائے رکھنا اس کے ضبط نفس کی عمدہ مثال ہے ۔

پلاقیدیا کا کردار اس ناول کا سب سے زیادہ اور دیرپا نقوش چھوڑنے والا کردار ہے ۔ پلاقیدیا کے کردار میں زندگی کی روح رواں دواں دکھائی دیتی ہے ۔ شرر اس کا سراپا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"سواروں کے جھرمٹ میں ایک طلا کار اونچی رتھ پر ایک ملائک فریب و پری جمال نازنین عجب ناز و تمکنت کی شان سے بیٹھی ہے اور اِدھر اُدھر کے منظر کو ایسی محبت و شوق کی نظروں سے اور بشاش چہرے سے دیکھ رہی ہے جس طرح کوئی کسی مدت کے بچھڑے دوستوں کو دیکھتا ہو ۔ اس کی میگوں زلفوں کو ایک رو پہلے فیتے نے اپنی دو نازک بندشوں میں سب طرف سے سمیٹ کے پیٹھ پر ڈال دیا ہے ۔ دونوں جانب کنول سے کانوں کے اوپر گلاب اور سوسن کے پھول جو تازگی اور شادابی میں اس کی نرگسیں آنکھوں اور اس کے پھول کے ایسے رخساروں کی تصویریں ہیں اسی روپہلے فیتے میں اٹکے ہوئے ہیں ۔ لوؤں میں دونوں طرف نیلم کے آویزے لٹک رہے ہیں اور گلے میں موتیوں کا ہار ہے ۔ ایک ارغوانی ریشمی حارت جس کی کوروں پر چاروں طرف کارچوبی کام کی بھاری بیل ٹنکی ہوئی ہے محترم خاتونان روم کی وضع سے سارے بدن کو چھپائے ہوئے ہے اور اس کے نیچے ایک زرد رنگ کی اطلس کا کرتہ کندنی ڈاک کا کام دے رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (پہلا باب)

شہزادی پلاقیدیا حسن و جمال کے ساتھ انتہائی مہذب ، تعلیم یافتہ اور وضع دار ہے ۔ اسے روم کے شاہی خاندان کی عظمت کا پورا پورا احساس ہے ۔ وہ غیور ، عفت مآب اور خوددار

ہے - قدرت نے اسے اعلیٰ ذہنی صلاحتیں بھی بخشی ہیں - وہ سلوانوس سے بڑی آسانی سے اسٹلی شو کے خلاف سازش کا راز معلوم کر لیتی ہے - وہ بیدار مغز ہے اور ہونوریوس کی امور سلطنت سے بے توجہی اور امراء کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہونا اسے پسند نہیں - اپنے محسنوں کے ساتھ حسن سلوک کی روا دار ہے - پلاقیدیا کا کردار جذبانیت سے عاری ہے - ارسطوبلوس کو اسے اڈولفوس سے شادی پر آمادہ کرنے کے لیے کئی برس لگ جاتے ہیں - وہ خود مختار ہونے کے باوجود بھائیوں کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ کرنے پر آمادہ نہیں - محب وطن ہے ، اسٹلی شو کو راداگاسوس کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنا محض اس کی صلاحیتوں کا نتیجہ ہے - پلاقیدیا مافوق الفطرت باتوں کی قائل نہیں اور اقطاویہ یا ہونوریوس کی طرح حقائق سے چشم پوشی نہیں کرتی - اسے گوتھوں کی زبردست قوت کا احساس ہے اور وہ قیصر روم یا اپنی بہن کی طرح یہ عقیدہ نہیں رکھتی کہ رومتہ الکبریٰ کو کوئی دنیاوی قوت تسخیر نہیں کر سکتی - اس کی شخصیت میں اوچھے پن کا کوئی شائبہ نہیں ملتا - جب وہ اڈولفوس سے شادی کا فیصلہ کر لیتی ہے تو پھر اس کا فیصلہ اٹل ہو جاتا ہے - پلاقیدیا مستقل مزاج ہے - اسے اپنے ہم وطنوں اور خاک رومہ سے بے انتہا محبت ہے -

زبان و بیان اور مرقع کشی :

رومتہ الکبریٰ میں کرداروں کے مکالمے ان کے متعلقہ کرداروں کی شخصیت، ان کی نفسیاتی اور داخلی کیفیات کے مظہر ہیں - الارق اور اڈولفوس کے مکالمے ، ارسطوبلوس اور پلاقیدیا کے مکالمے ، سلوانوس اور پلاقیدیا کے مکالمے ، پلاقیدیا اور اسٹلی شو کے مکالمے ، اتـالوس اور ہونوریوس کے مکالمے ان کی عمدہ مثالیں ہیں - پلاقیدیا اور ارسطو بلوس کے مکالمے دونوں کرداروں کی بہت عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں - مکالمے پلاٹ کو آگے بڑھانے میں بھی ممد ہیں -

اس ناول میں شرر نے رومہ کے حسن ، عمارات اور باغات کے ، رومی شان و شوکت اور گوتھوں کی تہذیب کے بڑے کامیاب مرقعے پیش کیے ہیں - سطور ذیل میں ہم مناظر اور مرقعوں کے ایک دو نمونے درج کرتے ہیں جن سے اس نـاول میں شرر کی مرقع کشی کا جائزہ لیا جا سکتا ہے -

"پلاقیدیا کے شوق کی مناسبت سے موسم نے بھی دلچسپی اور دلکشی کا پورا سامان مہیا کر دیا ہے - کیونکہ کھیت بہار کی مشاطہ گری سے چمن زار بن گئے ہیں - خود رو گلاب کے تختے کوسوں تک زمین کو سرخ خلعت پہناتے چلے گئے ہیں اور ان میں ملے ہوئے صدہا رنگ کے جنگلی پھول ہیں جنھوں نے قدرت کے سادہ دامن میں رنگ رنگ کے گل بوٹے کاڑھ دیے ہیں - سمندر سے شہر رومہ تک امرائے روم کی کوشکوں بنگلوں اور نزہت گاہوں کا سلسلہ چلا گیا ہے، جن کے گرد پر تکلف چمن بندیاں کی گئی ہیں - بڑے بڑے درختوں میں کاٹ چھانٹ کرکے عجیب عجیب وضعیں اور طرح طرح کے جانوروں کی دلچسپ شکلیں پیدا کی گئی ہیں اور ان کے بیچ میں سنگ مرمر کی صدہا مورتیں نصب ہیں - اور چونکہ بہار کا زمانہ ہے اکثر کوشکوں سے چنگ و ارغنون اور دلکش نغموں کی آوازیں آ رہی ہیں - کیونکہ جس طرح اگلے زمانے میں رومیوں کو عیش و عشرت کی فرصت نہیں ملتی تھی اب انھیں عیش و طرب سے فرصت نہیں ملتی -" (پہلا باب)

قیصر ہونوریوس کی فتح کی خوشی میں ٹرائمف کا اہتمام ہوا، شرر نے اس مرقعے کی بھرپور مرقع کشی کی ہے اور تمام تفصیلات و جزئیات پر کڑی نظر رکھی ہے جس سے یہ بیان متحرک فلم کی صورت اختیار کر گیا ہے - اقتباس ملاحظہ ہو :

''شہر کے اس پھاٹک سے جو ملوین کے پل کے پاس واقع ہے پالاٹین کی پہاڑی تک جس راستہ سے ہونوریوس کا جلوس گزرے گا، دونوں طرف کے مکان ہاروں اور ہرے پتوں کے بندھنواروں سے خوب آراستہ کیے گئے ہیں - جابجا عالیشان مکانوں پر دولت روم کے عقابی علم لہرا رہے ہیں اور سربفلک مکانات جو سج سج کے دلہن بنا دیے گئے ہیں اُن کے لیے اسی عقابی مارکے کی ہزارہا چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں لباس عروسی بن گئی ہیں -

کوٹھوں پر تمام معزز اور دولت مند خاندانوں کی خاتونیں رنگ رنگ کی ریشمی ساریاں باندھے جلوہ افروز ہیں جن میں چوڑے لچکے اور کار چوبی بیلیں ٹکی ہوئی ہیں - اُن کے سروں اور جوڑوں پر سنہرے یا نقرئی فیتے لپٹے ہوئے ہیں اور ان پر رنگ رنگ کے شاداب اور تازہ پھول آراستہ ہیں - کانوں کی لوؤں میں الماس و یاقوت کے گوشوارے اور آویزے، پیارے گلو میں موتیوں کے ہار اور مرصع ہیکلیں، اور نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی کلائیوں میں جڑاؤ چوڑیاں اور کنگن ہیں - لونڈیاں اور خواص دونوں جانب دست بستہ کھڑی ہیں اور اُن کے درمیان میں وہ ایسی آن بان اور ایسے ناز و انداز سے اپنی مطلا و مذہب کرسیوں پر رونق افروز ہیں کہ تماشائی ان کی زیارت کے شوق میں شاہی جلوس کے دیکھنے کا خیال بھولے جاتے ہیں . . . . (تیسرا باب) -''

''(جلوس میں) سب کے پہلے شہر کے انتظامی افسر اپنے درباری لباس اور اپنی پوری جمعیت کے ساتھ تھے، جن میں آگے آگے دو کونسل سبزے گھوڑوں پر سوار تھے - ان دونوں کے درمیان میں ایک جرمنی غلام رومہ کے عقابی علم کو اٹھائے ہوئے تھا - ان کونسلوں کا لباس بالکل وہی تھا جو خود قیاصرۂ روم پہن کے دربار کیا کرتے - فرق اتنا تھا کہ ان سروں پر بجائے تاج شاہی کے اونچے اونچے خود تھے جن میں شتر مرغ کے پروں کی کلغیاں لگی تھیں - ان کے پیچھے بہت سے ٹربے یون کمیت گھوڑوں پر سوار تھے - ان کے کپڑے بھی اگرچہ اسی قطع کے تھے مگر ان میں بمقابل کونسلوں کے لباس کے سادگی تھی - ہاتھی دانت کے گزگز بھر کے عصے سب کونسلوں اور ٹربے یونوں کے ہاتھوں میں تھے جن کے اوپر شاموں کے عوض نقرئی عقاب تھے - ان کے پیچھے عدالت کے چپراسیوں کا ایک انبوہ کثیر تھا، جن میں دس لکتور (جلاد) آدم کشی کے تبر کندھوں پر رکھے اور لکڑیوں کے گٹھے بغل میں دبائے ہوئے تھے - یہ دونوں چیزیں ان دنوں انسان کے قتل کرنے میں کام آتی تھیں -

ان لوگوں کے بعد دس پریطور مع اپنے ماتحتوں کے ہرکاروں کے ایک بڑے گروہ کے ساتھ تھے جن کے ذریعے سے مقدمات دیوانی کا تصفیہ ہوتا تھا، اور روم کے قاضی تھے انہیں کی جمعیت میں ملی ہوئی قنسور (سنسر) کی جماعت تھی جن کا کام یہ تھا کہ سرکاری خراج اور محاصل کی رقموں کو مشخص کرکے وصول کریں -

اس وقت تک تو وہی عہدے دار اور اشخاص تھے جو شہر رومہ میں تھے اور استقبال کے طریقے سے شاہی جلوس کے آگے آگے تھے - ان لوگوں کے گزر جانے کے بعد طبل و قرنا بجانے والوں کا ایک بینڈ آیا اور اس کے پیچھے وہ زبردست لشکر گزرنے لگا جو جنگ پولیشیا میں ہونوریوس کے ہمراہ تھا - سب کے آگے پہلا لیجین تھا جس کا علم عقابی اس کے آگے تھا اور اس کے پیچھے بہادر رومی سپاہی زرق برق وردیاں پہنے، ڈھال تلوار اور چھوٹے چھوٹے نیزوں سے آراستہ نظریں نیچی کیے اور متانت و وقار سے قدم اٹھاتے ہوئے جا رہے تھے - سو سو سپاہیوں کی کمپنیاں جدا جدا تھیں جن کا افسر سنتورین ایک چھوٹی بیرق ہاتھ میں لیے اپنے ہمراہیوں کی بہ نسبت زیادہ اونچا خود پہنے اور برنجی بلے لگائے صف کے آگے آگے چلتا - جب پہلا لیجین گزر گیا (ہرلیجین میں چھ ہزار سپاہی ہوتے جن کی سو سو کی کمپنیاں ہوتیں اور ہر کمپنی کا افسر سنتورین کہلاتا تھا) تو دوسرا لیجین شروع ہوا جس کی وردی نیلی تھی - اس کے بعد سبز اور زرد وردیوں والے لیجین گزرے - یونہیں لیجین کے بعد لیجین گزرتے جاتے تھے اور ان کے گزرتے وقت کوٹھوں پر سے بار بار ''مرحبا'' اور ''رومیوں کی فتح'' کے نعرے بلند ہوتے - اس طریقے سے نوے ہزار پیدل فوج گزر گئی جو پندرہ لیجنوں پر بٹی ہوئی تھی -

پیدل فوج کے بعد ایکوٹ یعنی معزز اور نبرد آزما سوار گزرنے لگے - یہ اس زمانے کے نائٹ یعنی بانکے تھے، جنھوں نے اس جنگ میں بڑی بڑی کارگزاریاں دکھائی تھیں - ان میں سے ہر ایک اکڑا اکڑ

کر بیٹھتا، بن بن کے اپنا بانکپن دکھاتا اور ہم وطنان روم کو داد طلب نگاہوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یہ مخصوص و معزز سوار جو اپنے آپ کو رومی لشکر کا سرمایۂ ناز سمجھتے تھے ان کے بعد ہزار ہزار سواروں کے تیس رسالے یعنی تیس ہزار کا لشکر جرار گزرا اور فتح مند لشکر کا سلسلہ ختم ہوتے ہی لکھنئو کی براتوں کا جس اوچھے پن اور طفلانہ مزاجی سے جہیز نکالا جاتا ہے، مال غنیمت گزرنا شروع ہوا۔ اس میں ایک متحرک نمائش کی سی شان پائی جاتی تھی کیونکہ اس میں عجیب عجیب چیزیں نظر آتی تھیں۔ دشمنوں کے جھنڈے، ہتھیار، زیور اور قیمتی کپڑے، الارق کے سونے کا پلنگ، اس کے بیٹھ کے اجلاس کرنے کی کرسی، اس کا خیمہ، اس کے گھوڑے اور خدا جانے کیا کیا سامان تھا جو رومیوں کی نظروں میں غیر مانوس گنوارو اور قابل مضحکہ ہونے کے ساتھ دلچسپ بھی تھا۔

مال غنیمت کے بعد اسیران ستم یعنی وہ گوتھ سپاہی جو گرفتار کرکے لائے گئے تھے اس وضع سے گزرنا شروع ہوئے کہ طوق و سلاسل میں جکڑے ہوئے تھے۔ گلوں اور ہاتھوں پاؤں میں بھاری بھاری زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ پان پان سو کے گروہ جدا جدا تھے، اور ہر گروہ کو باضابطہ رومی فوج کی دو دو کمپنیاں ننگی تلواروں کے حلقے میں کرکے ہنکاتی ہوئی لیے جاتی تھیں۔ یہ سب بدنصیب اسیر نظریں نیچی کیے خاموش اور زندگی سے مایوس زنجیریں کھڑکھڑاتے چلے جاتے تھے۔ ہزاروں زنجیروں کی جھنکار سے ایک عجیب قسم کا ہیبتناک شور مچا ہوا تھا۔ اس لیے کہ پان پان سو قیدیوں کی بیس ٹکڑیاں آگے پیچھے تھیں جن کی زنجیروں سے شور کا ہر اپنے پرائے اور دوست دشمن پر نہایت ہی عبرت ناک اثر پڑتا تھا اور خود قیدیوں میں غالباً اتنی پرنم آنکھیں نہ ہوں گی جتنی کہ تماشائیوں میں انہیں دیکھ کے پیدا ہو جاتی تھیں۔

مرد قیدیوں کے بعد ان جوان اور کمسن عورتوں کے غول گزرنا شروع ہوئے جن میں اکثر حسین و خوبرو تھیں اور لونڈیاں بنانے کے لیے گویا اپنی قوم سے چھانٹ چھانٹ کے لائی گئی تھیں۔ ان میں بعض بڑے بڑے معزز سرداران گوتھ کی بہنیں، بیبیاں، بہویں اور بیٹیاں تھیں۔ جو اس خیال میں تھیں کہ رومی عورتوں کو اپنی لونڈیاں بنائیں گی مگر قسمت خود انہیں رومیوں کی لونڈیاں بنانے کے لیے ذلت کے ساتھ رومہ میں کھینچ لائی ہے۔ ان میں سے اکثر نالاں و گریاں تھیں اور فلک دوز آہیں کھینچتی جاتی تھیں۔ ان کے طوق و سلاسل ہلکے اور آبدار تھے جو ان کے پر درد مرثیوں کے ساتھ اپنی پر نغمہ جھنکار سے ساز کا کام دے رہے تھے۔

یہ بھی گزر گئیں اور ان سب کے آخر میں گوتھ کی ملکہ یعنی شاہ الارق کی بی بی اوڈلفیا جو پولیشیا کی لڑائی میں اسیر ہو گئی تھی، اس شان سے پا پیادہ جا رہی تھی کہ اپنی قومی وضع کے مغرق ریشمی کپڑوں اور گہنے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اپنا عجیب و غریب طلائی قومی زیور اور لباس پہنے تھی جو اہل رومہ کو بھدے اور گنوارو ہونے پر بھی شاندار معلوم ہوتا تھا۔ اس زیور کے اوپر سونے کے ہلکے طوق و سلاسل اس کے گلے میں تھے۔ اس کی سٹیج گاڑی یعنی طلائی رتھ اس کے پیچھے پیچھے خالی جا رہی تھی اور دس رومی سنتورین افسر جو تلواریں کھینچے تھے اسے اپنے حلقے میں لیے ہوئے تھے۔

ملکہ اوڈلفیا کے بعد خود قیصر ہونوریوس کی رتھ تھی جو شاہی گارد کے منتخب جوانان روم کے جھرمٹ میں تھی یہ طلائی مرصع رتھ اس قدر اونچی تھی کہ ہونوریوس کے قدم بھی پیدل جانے والوں کے سروں سے اونچے تھے۔ ایک بہت ہی بھاری طلا کار قبا اس کے جسم پر تھی، جس میں متعدد تمغوں کے گرد اور جابجا سارے جسم میں پھولوں کے گلدستہ اور ہار لگے ہوئے تھے۔ ایک نہایت ہی خوبصورت اور نازک پھولوں کا تاج اس کے سر پر تھا اور سونے کا عصائے شاہی اس کے ہاتھ میں تھا۔ ہونوریوس کی صورت دیکھتے ہی ہر طرف سے اور ہر گروہ و جماعت سے مسرت کے نعرے بلند ہوتے تھے۔ کوئی آواز لگاتا کہ قیصر کا اقبال بلند! کوئی کہتا ''رومی شوکت و عظمت برقرار'' اور اسی طرح کے بیسیوں جوش و خروش کے کلمات ہر طرف سے سنے جاتے تھے۔

ہونوریوس کے برابر رتھ میں استلی شو بیٹھا ہوا تھا جو اس کا استاد، وزیراعظم اور معتمد علیہ تھا اور دولت روم میں ان دنوں سب سے زیادہ باوقعت اور با اثر رئیس تھا۔ قیصری رتھ کے بعد اس کے شہزادوں اور شہزادیوں کی رتھیں اپنے اپنے خاص جلوس اور خاص باجوں کے ساتھ تھیں اور انہیں میں تیسرے نمبر پر پلاقیدیا کی رتھ تھی . . .'' (چوتھا باب)۔

رومۃ الکبریٰ میں اس قسم کی مرقع کشی کے اور بھی نمونے موجود ہیں جن کے اندراج سے اجتناب کیا جاتا ہے ۔ بحیثیت مجموعی اس ناول کی مرقع کشی، اس کی جزئیات، تفصیلات اور انداز بیان بہت کامیاب ہے ۔

۱۶۔ الفانسو

پلاٹ:

الفانسو میں شرر نے سیدھے سادے واقعات کی فن کارانہ ترتیب سے انھیں دلچسپ بنا دیا ہے ۔ ناول کا پلاٹ بہت مختصر ہے ۔ سسلی کے بادشاہ کارلوس کو اس کی بہن بوران نے سازش کرکے قتل کرا دیا کیونکہ وہ بوران کی آبرو باختگی کو نا پسندیدہ نظروں سے دیکھتا تھا ۔ کارلوس کے بعد اس کا بھائی مورنیا المعروف مہر جان تخت نشین ہوا جو پورے طور پر بوران کا مطیع تھا ۔ کارلوس کا بڑا بیٹا وان رادرق قصر شاہی میں اور چھوٹا بیٹا الفانسو وزیر اعظم فرنان کے قصر میں زیر پرورش تھا ۔ فرنان نے الفانسو کو بیٹوں کی طرح پالا اور اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا ۔ بوران ان دونوں بھتیجوں کو قتل کراکے اپنی بیٹی سلطانہ کو ولی عہد مقرر کرانا چاہتی تھی لیکن وزیر فرنان ہمیشہ آڑے آتا تھا ۔

الفانسو اور فرنان کی بیٹی ضیا اسیرالفت یک دیگر ہوگئے اور جب فرنان کچھ عرصے کے لیے دارالخلافہ سے باہر گیا ہوا تھا، الفانسو نے الجزائری سفیر یحییٰ کی اعانت سے پوری رازداری کے ساتھ اپنے کمرے سے ضیا کے کمرے تک ایک سرنگ بنا لی ۔ دیواروں میں ایسے دروازے لگوائے جن کا پتہ نہیں چلتا تھا اور میکانکی طریقے سے کھلتے بند ہوتے تھے ۔ اس طرح ان اسیران محبت کو ہر وقت ایک دوسرے سے مل بیٹھنے کا موقع میسر تھا ۔ تین چار سال گزرگئے کہ مہر جان اچانک مرض الموت میں مبتلا ہوگیا اس کی آخری وصیت کی رو سے الفانسو اس شرط کے ساتھ ولی عہد قرار پایا کہ وہ سلطانہ سے شادی کرے گا بصورت دیگر وان رادرق سلطانہ سے شادی کرکے تخت و تاج سنبھال لے گا ۔

الفانسو نے ولی عہدی کی خبر سنتے ہی ضیا سے اپنی محبت کا راز فرنان پر ظاہر کر دیا اور ایک سادہ کاغذ پر اپنی مہر لگا کر فرنان کے سپرد کر دیا کہ وہ ضیا سے شادی کے لیے جو شرائط چاہے لکھ دے ۔ اسی دن رسم تاج پوشی کے موقع پر وزیر نے وصیت پڑھ کر سنائی اور اس سے پہلے کہ الفانسو سلطانہ سے شادی سے انکار کا اعلان کرتا الفانسو کی طرف سے اقرار نامہ بھی پڑھ کر سنا دیا جو اسی کاغذ پر لکھا ہوا تھا جو الفانسو نے ضیا کے سلسلے میں وزیر کو دیا تھا ۔ سلطانہ کی بدکاریاں زبان زد خلائق تھیں، الفانسو اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا لیکن دربار میں یہ اقرار نامہ پیش ہونے پر وہ خاموش رہا ، ضیا کو اس صورت حال سے سخت صدمہ پہنچا ۔ سلطانہ بھانپ گئی کہ الفانسو اور ضیا کے درمیان کوئی قول و قرار ہے اس لیے اس نے اپنی مہم تیز کر دی اور دوسرے چوتھے ہی روز فرنان کو آمادہ کرکے ضیا کو مرکیس نامی ایک رئیس سے شادی کر لینے پر مجبور کر دیا اور یہ شادی بہت عجلت میں ہوگئی ۔ الفانسو ان حالات سے بے خبر تھا ۔ وہ اس رات امور مملکت سے فارغ ہوکر ضیا سے ملنے گیا ۔ ضیا کے کمرے میں مرکیس موجود تھا ۔ ضیا نے سرنگ میں قدموں کی آواز محسوس کرتے ہی چراغ گل کر دیا ۔ مرکیس

کسی دوسرے کی موجودگی کو بھانپ کر تلوار لے کر جھپٹا ۔ الفانسو نے اندھیرے میں ہی وار بچا لیا اور اس نئی صورت حال پر حیران و پریشان واپس لوٹ گیا ۔ دوسرے روز جب اسے ضیا اور مرکیس کی شادی کا علم ہوا تو اس نے مرکیس کو فوری طور پر قید کرا دیا ۔ فرنان کی منت سماجت پر اس نے دوسرے دن مرکیس کی رہائی پر غور کا وعدہ کیا ۔ مرکیس بھانپ گیا کہ الفانسو اسے جیل میں رکھ کر خود ضیا سے ملنے جائے گا اس لیے وہ بھی داروغہ سے ساز باز کر کے خفیہ طور پر ضیا کے کمرے میں جا چھپا ۔ الفانسو رات کو ضیا کے پاس گیا، گلے شکوے ہوئے، مرکیس سنتا رہا اور جب ضیا بجھی ہوئی شمع کو دوبارہ جلا لانے کے لیے کمرے سے باہر نکلی تو مرکیس اپنی کمین گاہ سے نکل کر الفانسو پر ٹوٹ پڑا، دونوں میں تلوار چلنے لگی۔ ضیا کمرے سے باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ سلطانہ اسی کے روپ میں دروازے سے لگی باتیں سن رہی ہے۔ سلطانہ نے ضیا کو بہت اصرار کر کے آمادہ کر لیا کہ ضیا کی بجائے وہ شمع لے کر اندر جائے اور الفانسو سے کچھ باتیں کر لے ۔ سلطانہ جونہی شمع لے کر اندر داخل ہوئی الفانسو کا مرکیس پر بھرپور کاری ہاتھ پڑا ۔ مرکیس نے مرتے مرتے سلطانہ کو بھی ضیا سمجھ کر قتل کر دیا ۔ اس ہنگامے پر سب جمع ہوگئے ۔ الفانسو ضیا کی موت پر شدت غم سے مغلوب ہو کر خودکشی کرنے جا رہا تھا کہ ضیا نے پیچھے سے اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ لیا ۔ سب راز کھلا ۔ ضیا ملکہ سسلی بن گئی۔ بوران اور وان رادرق الفانسو کے خلاف بغاوت کرانے میں ناکام ہوکر قتل ہوئے ۔

شـرر نے اس مختصر سے سیدھے سادے پلاٹ کو اس فن‌کاری سے ترتیب دیا ہے کہ دلچسپی اور تجسس کا عنصر پورے ناول میں برقرار ہے ۔ پلاٹ میں تین چار بار اتار چڑھاؤ اور موڑ واقع ہوتے ہیں لیکن پلاٹ کے یہ موڑ ایسے حادثاتی یا اتفاقی نہیں کہ پلاٹ غیرفطری محسوس ہو ۔ واقعات کا ایک دوسرے کے ساتھ ایک گونہ ربط پایا جاتا ہے ۔

کردار نگاری :

اس ناول کے اہم کردار الفانسو، ضیا، فرنان، سلطانہ اور مرکیس ہیں دیگر کرداروں میں بوران، مہرجان، وان رادرق، الجزائری سفیر یحییٰ، لیگانو، ساریہ، مرجانہ اور مٹلڈا شامل ہیں۔ لیگانو الفانسو کا غلام ہے اور اس میں ایک وفادار غلام کے جملہ اوصاف موجود ہیں ۔ وہ الفانسو کا رازدار بھی ہے اور جانثار بھی ۔ وہ کسی قیمت پر اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاتا ۔ اس کے برعکس مٹلڈا ضیا کی ایسی خادمہ ہے جو کسی بھی قیمت پر اس کے راز بیچ سکتی ہے، ناقابل اعتماد ہے ۔ اس نے فرنان کی طرف سے سپرد کی گئی ذمے داریوں کو پورا نہیں کیا، بلکہ اپنی ملازمت کے اصل مقصد کے برعکس وہ ضیا سے مل گئی اور الفانسو اور اس کی محبت کی رازدار بنی ۔ پھر اس نے ضیا کے راز مرکیس پر آشکار کیے بلکہ مرکیس کو خفیہ طور پر ضیا کے کمرے میں پہنچا کر چھپایا ۔ ساریہ ان خادماؤں میں سے ہے جو مالک کی خوشنودی مزاج کے لیے اس کا ساتھ تو دیتے ہیں لیکن اسے نیک و بد سے بھی آگاہ کر دیتے ہیں ۔ مرکیس سے شادی ہو جانے کے بعد ساریہ ضیا کو سمجھاتی ہے کہ اب اسے ایک حیا دار، وفادار اور شریف بیوی کی طرح زندگی گزارتے ہوئے الفانسو سے نہ صرف ملاقات ترک کر دینی چاہیے بلکہ اس کی یاد کو بھی دل سے بھلا دینا چاہیے ۔ اس اعتبار سے ساریہ کا کردار مرجانہ اور مٹلڈا سے بہتر ہے۔ بوران ہوس پرست اور خود غرض عورت ہے، وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تمام

رشتوں ناطوں کو داؤ پر لگا سکتی ہے۔ اپنی گناہ آلود زندگی کو جاری رکھنے کے لیے وہ بھائی کو قتل کرا دیتی ہے۔ حصول اقتدار کے لیے بھتیجوں کے خون کی پیاسی ہے لیکن جب وہ انھیں قتل کرانے میں ناکام ہو جاتی ہے تو الفانسو سے سلطانہ کی شادی پر اصرار کرتی ہے۔ چونکہ وہ خود ایک اوباش اور بدکار عورت ہے اس لیے اسے سلطانہ کی بد چلنیوں پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ الفانسو سے سلطانہ کی شادی نہ ہو سکنے اور سلطانہ کے قتل ہو جانے پر وہ وان رادرق کو آلۂ کار بنا کر الفانسو سے انتقام لینا چاہتی ہے۔

الجزائری سفیر وزیر یحییٰ بن سعد مرابطی ایک ہوش مند، سنجیدہ اور مستقل مزاج شخص ہے۔ وہ اپنی حکومت کی طرف سے سپرد کیے گئے فرض کو انجام دینے کے لیے پورے صبر و تحمل سے کام لیتا ہے۔ سفارتی آداب سے پورے طور پر باخبر ہے۔ اسے معلوم ہے کہ دونوں حکومتوں کے درمیان صلح کا معاہدہ فرنان کی کوششوں سے ہی ہو سکتا ہے، اس لیے وہ فرنان کی تجاویز سے اختلاف نہیں کرتا۔ مصلحت اندیش ہے، قابل اعتماد ہے۔ الفانسو کی خواہش کو اس نے پوری رازداری اور توجہ سے پورا کیا ہے۔

مہر جان کی شخصیت بوران کے زیر اثر ہے۔ وہ بادشاہ ہونے کے باوجود خود کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ اسے حکومت کے معاملات میں بھی بوران کے اشاروں پر چلنا پڑتا ہے۔

مرکیس ایک بہادر اور غیور نوجوان ہے۔ فرنان کی عدم موجودگی میں وہ الفانسو کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کرتا ہے۔ ضیا سے شادی ہو جانے کے بعد در پیش حالات میں اس کی شخصیت کی داخلی کیفیات اور اندرونی کشمکش کو شرر نے اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ وہ جیتا جاگتا انسان نظر آنے لگتا ہے۔ وہ غیرت پر کٹ مرتا ہے اور اپنی دانست میں بے وفا ضیا کو بھی قتل کر دیتا ہے۔

سلطانہ ایک آبرو باختہ اور بدنام زمانہ لڑکی ہے۔ وہ ملکہ بننے کے لیے الفانسو سے شادی کرنے کو تیار ہے۔ وہ عیار اور سازشی ہے۔ ضیا کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے وہ اس کی ہمدردیاں حاصل کرتی ہے، اس کی سادگی سے فائدہ اٹھاتی ہے، اسے الفانسو سے بدظن کرتی ہے۔ فرنان کو مرکیس سے ضیا کی شادی پر آمادہ کرکے سلطانہ کو بھی رضا مند کر لیتی ہے۔ سلطانہ کا انجام وہی ہوتا ہے جو ایسے بدفطرت اور بدنیت لوگوں کا مقدر ہے۔

فرنان نہایت ہوش مند، زیرک، باوفا اور مخلص شخص ہے۔ وہ الفانسو کو بوران کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے پوری کوشش کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہمیشہ پدرانہ شفقت سے پیش آتا ہے۔ وہ الفانسو اور ضیا کو شادی سے پہلے بھی ایک دوسرے سے دور رکھنے کی کوشش محض اس لیے کرتا ہے کہ اسے الفانسو کی عالی نسبی کا احساس ہے، ملکی مصلحت اور الفانسو سے اس کی محبت اسے مجبور کر دیتی ہے کہ وہ بیٹی کی خوشیوں کو بھی قربان کر دے۔ فرنان کا کردار ذہن پر دیرپا نقوش چھوڑتا ہے۔

ضیا پاک دامن لڑکی ہے لیکن جذباتیت کا شکار ہے۔ وہ الفانسو کو آمادہ کرنا چاہتی ہے کہ وہ دونوں اس ملک کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جائیں۔ ضیا سیدھی سادی دوشیزہ ہے۔ ناول کے ابتدائی حصے میں اس کے چہرے پر بچپن کی سادگی اور باتوں میں بھولپن کی بے تکلفی ہے، جو رفتہ رفتہ شرم و حیا، خود داری اور متانت کے سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے۔ سلطانہ اور الفانسو کی گفتگو سن کر اس پر شدید ردعمل ہوتا ہے اور اسی ردعمل سے فرنان لیک لیتی ہے اور سلطانہ

بد نیتی سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ مرکیس سے شادی ہو جانے کے بعد وہ جن تضادات کا شکار ہو جاتی ہے اس کشمکش کو شرر نے بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے اور اس کے کردار کو ٹھیس نہیں پہنچنے دی۔ وہ فرض اور محبت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس نازک مرحلے پر اس کی ذرا سی لغزش اس کے کردار کو مسخ کر سکتی تھی لیکن شرر نے اس مرحلے کو عمدگی سے نباہا ہے۔ ضیا کا کردار محبت اور فرض کی جس مسلسل آویزش اور کشمکش کا مظہر ہے وہ فطری رنگ رکھتا ہے شادی کے بعد اس کی الفانسو سے گفتگو نے اس کے کردار میں جان ڈال دی ہے، ضیا کا کردار ایک ارتقا پذیر کردار ہے۔

الفانسو نوعمری کے باوجود زیرک اور باشعور انسان ہے۔ اسے ضیا سے والہانہ محبت ہے لیکن وہ اس کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کرتا کہ وہ دونوں بھاگ کر کسی اور ملک میں چلے جائیں۔ اس موقع پر ضیا کے لیے اس کا جواب یہ ہے: "آہ! تم ایسی بے عزتی اور بدنامی کے لیے بھی تیار ہو مگر میں اس کو نہ تمھارے لیے پسند کرتا ہوں اور نہ اپنے لیے"۔ الفانسو کو محبت میں سچائی، خلوص اور پاکیزگی کا پاس بھی ہے اور اپنے عالی نسب شہزادہ ہونے کا احساس بھی ہے۔ وہ ضیا کی محبت میں تخت و تاج اور ہر شے سے دستبردار ہونے کو تیار ہے۔ الفانسو صاف دل اور صاف گو ہے، پہلے اور تیرھویں چودھویں باب میں اس کی شخصیت کھل کر اجاگر ہوتی ہے۔ پندرھویں باب میں اس کی ضیا سے گفتگو اس کی شرافت اور محبت کی مظہر ہے۔ اسی خلوص و محبت کا نتیجہ ہے کہ وہ سترھویں باب میں خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

زبان و بیان و محاکات نگاری:

الفانسو میں کرداروں کے مکالمے ان کی شخصیت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں، فرنان اور الفانسو کے مکالمے، الفانسو اور ضیا کے مکالمے ان کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اس ناول میں بھی شرر نے اپنی روایتی منظرنگاری سے حسب معمول کام لیا ہے۔ ایک دو مناظر کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

"سہ پہر کا وقت ہے اور جزیرہ صقلیہ (سسلی) کا شمال مغربی ساحل — ہوا تھمی ہوئی ہے اور سمندر ساکت و صامت۔ پھر فلک نے کسی آتشیں رخسار معسوقہ کی طرح آفتاب کو گود میں اٹھا کے اپنی ابر کی پھٹی پرانی اور جابجا سے مسکی اور نچی ہوئی رضائی اوڑھا لی ہے، جو نہایت بوسیدہ ہونے کی وجہ سے سنبھالے نہیں سنبھلتی اور یہ بے قرار معشوق آسمان کو رضائی کے سنبھالنے میں مصروف دیکھ کے بار بار اس کی درزوں سے جھانکتا، دنیا کی طرف دیکھ دیکھ کے ہنستا اور چپکے ہی چپکے پھسل پھسل کے اس کے آغوش شوق سے نکلا جاتا ہے۔

اب اس وقت اس کا نورانی چہرہ بالکل کھل گیا ہے اور اس کی سنہری کرنیں بحیرہ روم کی شوخ ادا موجوں کے ساتھ شوخیاں کر رہی ہیں۔ سمندر کا نیلگوں پانی ان شعاعوں کے اثر سے نیلم کا دریا بن گیا ہے اور موجوں کی چھوٹی چھوٹی چوٹیوں کو سمندر کے کف نے اپنی سفید سفید ٹوپیاں پہنا کے ایسا خوبصورت بنا دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے بلوبل کی گھنی بیل کو نیلگوں پھولوں نے چھپا لیا ہے اور اس میں سے جابجا گل چاندنی کے سفید پھول نکلے ہوئے ہیں۔" (پہلا باب)

ایک کیفیت کی عکاسی اس طرح کی ہے:

"ان باتوں کو سن کے نازنین لڑکی دیر تک سر جھکائے سوچتی رہی۔ چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے نازک ابھرے ہوئے سینے کے اندر شوق و حیا میں سخت لڑائی ہو رہی ہے۔ جس وقت ضیا کا چاند سا چہرہ جھکا تھا، اس وقت شرم و حیا کا غلبہ تھا، مگر چند منٹ کی اندرونی لڑائی کے بعد جب اس نے اپنا پسیجا ہوا نادم چہرہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھایا اور شرم آلود نرگسیں آنکھیں جو نوجوان کی مشتاق آنکھوں کا سامنا

کرنے کی تاب نہ لا سکتی تھیں، جذبات شرم کو دبا کے دو چار کیں اور اپنے دل از دست دادہ رفیق کی پیام عشق لانے والی نظروں کی گدگدی برداشت کر سکی تو صاف ظاہر ہو گیا کہ اس کے سینے کے میدان کار زار میں شوق محبت اور جوش الفت کو جذبات حیا و ندامت پر پوری فتح حاصل ہو گئی ہے اور اب وہ جواب دینے کے لیے تیار تھی مگر اسی طرح جیسے مسمرائز کرنے والی آنکھوں کا معمول از خود رفتہ ہو کے وہی کہا کرتا ہے جو عامل کی مرضی ہو۔" (پہلا باب)

۱۷۔ مفتوح فاتح

پلاٹ :

مفتــوح فاتح اپنے موضوع کے اعتبار سے فتح ہسپانیہ کے بعد امیر عبدالرحمن الداخل سے پہلے کے دور میں مسلمانوں کے فرانس پر حملے کے واقعات سے متعلق ہے۔ قصے کا خلاصہ چوتھے باب میں دیا جا چکا ہے۔ اپنے پلاٹ کے اعتبار سے یہ ناول شــرر کے دیگر ناولوں سے قدرے مختلف ہے۔ اس کے پلاٹ میں بلا شبہ ایک ارتقا موجود ہے لیکن مختلف ایسے واقعات کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی گئی ہے جو تمام کے تمام ناول کے ہیرو سے متعلق نہیں۔ اگر یہ واقعات صرف ہیرو سے متعلق ہوتے تو ناول کو عثمان بن ابی نسعة کی موت کے ساتھ ہی اٹھارہویں باب پر ختم ہو جانا چاہیے تھا، لیکن شــرر عثمان کی موت کے بعد ناول کو عبدالرحمن الغــافقی کے معرکوں کے سہارے آگے بڑھاتے ہیں۔ گویا اٹھارہویں باب کے بعد ناول کی مرکزی شخصیت عبدالرحمن الغافقی ہے لیکن انیسویں باب میں اسلامی لشکر کی شکست اور عبدالرحمن کی شہادت کے باوجود ناول دو باب اور آگے چلتا ہے جس میں چارلس مارٹل کی شخصیت ابھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح گویا شــرر نے ناول کو تین مختلف شخصیتوں سے وابستہ کرکے اسے چار سال کے زمانے پر پھیلایا ہے اور اس کے ذریعے اندلس کی اس دور کی حالت اور مسلمانوں کی سپین سے آگے فرانس کی طرف پیش قدمی کی تاریخ بیان کرنی چاہی ہے۔

مفتــوح فاتح کے پلاٹ میں شرر کے دیگر ناولوں کی نسبت تجسس اور اتار چڑھاؤ کا عنصر بہت کم ہے اور ایسے مقامات بہت کم آتے ہیں جہاں قاری شدت سے یہ سوچنے پر مجبور ہو کہ آگے کیا ہوگا؟ مختلف ابواب کے عنوان بھی تجسس کے عنصر کو کم کر دیتے ہیں۔ پہلے دو ابواب اس قدر زیادہ تہذیبی، جغرافیائی اور تاریخی پس منظر رکھتے ہیں کہ قصے کی اٹھان قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں نہیں لیتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ شرر نے پہلے باب میں مرقع کشی اور منظر نگاری کے خوبصورت نمونے پیش کیے ہیں جو اپنے اندر کافی حسن رکھتے ہیں لیکن یہ مرقعے صرف ناول کے ماحول کو حسین بناتے ہیں ان سے قصے کی اٹھان میں وہ رنگ پیدا نہیں ہوتا جو شرر کے دیگر ناولوں کا طرہ امتیاز ہے۔

اس قسم کے پلاٹ میں ناول کے غیر دلچسپ ہو جانے کا امکان موجود ہوتا ہے لیکن اس پہلو کو شرر نے بعض واقعات کی ابتدا اور بعض کے انجام میں ڈرامائیت پیدا کرکے بچا لیا ہے۔ اس طرح پلاٹ میں نشیب و فراز اور تجسس کی کمی سے دلچسپی کم نہیں ہو پاتی۔

کردار :

مفتــوح فاتح کے اہم کرداروں میں عثمان بن ابی نسعة، عبدالرحمن الغافقی، شہزادی مینینہ یودیز، محمد بن عبداللہ الاشجعی، قاضی زیاد بن زائدة الشیبانی، لیث، عدی بن زیان، خلف بن عباس

الغزاعی، چارلس مارٹل، ہیلنا، سلوریا، ریحانہ اور سرویطوس شامل ہیں ۔ ان کے علاوہ بعض تاریخی شخصیتوں کا ذکر پس منظر میں آیا ہے ۔ عثمان کے کردار کی ابتدائی جھلک خود اس کے مکالمے سے ظاہر ہوتی ہے ۔ پیرینیز میں الباب کی طرف سفر کرتے ہوئے عثمان ابو عامر سے کہتا ہے ۔ (پہلا باب)

''میں دنیا میں لطف اٹھانے اور ہر جائز لذت و مسرت کے حاصل کرنے کو ثواب کا کام خیال کرتا ہوں ۔ اس وادی کی بہار دیکھو ۔ اس نہر کی روانی کا خیال کرو اس کے پھولوں کی خوبصورتی پر غور کرو ۔ اس کے مرغزاروں اور اس کی روئیدگی کی شادابیوں کی طرف توجہ دو ، اور ان آزاد چالاک پھرتیلے اور خوبصورت طیور پر نظر ڈالو ، کون کہہ سکتا ہے کہ اس بہار سے مسرت حاصل کرنا کوئی برا کام ہے ۔''

تیسرے باب میں شرر نے عثمان کی رنگین مزاجی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

''ابن ابی نسعہ کی رنگین طبیعت اس فرحت بخش وادی اور اس جنت ارضی میں سوا بے فکری اور عیش کے اور کسی طرف متوجہ نہیں ہوتی تھی، وہ اکثر پر فضا وادیوں میں پھرتا ، نہروں کے کنارے بیٹھ کے شفاف پانی سے دل کی کثافت دھوتا ۔ پہاڑوں اور آبشاروں میں جا کے چرند و پرند کو اپنے جگر دوز تیروں کا نشانہ بناتا اور جب گھر میں آ کے بیٹھتا تو حسن سے حسین اندلسی کنیزوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کے صحبت نشاط گرم کرتا ۔ ان کا نغمۂ دلکش سنتا ۔ ان کے نازو کرشمہ سے دل میں محبت و الفت کی گرمی پیدا کرتا ۔''

شرر نے عثمان کا کردار ایک شاعرانہ اور رنگین مزاج کے عیش پسند نوجوان کے روپ میں پیش کیا ہے ۔ اس کی عاشق مزاجی کا یہ عالم ہے کہ وہ ہیلنا سے بھی محبت رکھتا ہے اور اُس کی زبانی شہزادی مینینہ کے حسن کا ذکر سن کے اس کا بھی نادیدہ عاشق ہو جاتا ہے ۔ ہیلنا کے ذریعے ہی وہ شہزادی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے ۔ چودھویں باب میں اس کا عاشقانہ مزاج اپنے عروج پر ہے ۔ وہ شہزادی کو پھولوں کے لباس میں دوبارہ دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے ۔ عشق کے اثر کا یہ عالم ہے کہ وہ صلح کے معاملے میں کسی کی نصیحت کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا، شہزادی کی خاطر شرائط صلح کو نرم سے نرم کرتا جاتا ہے ۔ اس کے مزاج کی عکاسی ہیلنا کی زبانی بہت عمدگی سے کی گئی ہے (آٹھواں باب) ۔ ان صفات کے باوجود وہ ایک تجربہ کار جرنیل ہے، بہادر ہے، جوش جہاد رکھتا ہے اور جنگی منصوبہ بندی میں بڑی مہارت رکھتا ہے ۔ کتب تواریخ میں اُسے باغی اور غدار کے روپ میں پیش کیا گیا ہے لیکن اس معاملے میں شرر کے یہاں عثمان کا کردار بہت بلند دکھائی دیتا ہے ۔ شہزادی سے تمام تر محبت کے باوجود وہ نہ عیسائیوں سے امیر کے خلاف مدد لینے پر آمادہ ہوتا ہے نہ اُن کا ساتھ دینا قبول کرتا ہے ۔ اُسے شہزادی کی تباہی کا خیال ، یودیز سے کیے گئے وعدوں اور قرابت کا پاس ہے لیکن وہ اپنے ہم مذہب اور ہم قوموں کے خلاف کوئی قدم اٹھانا گوارا نہیں کرتا اور اس سلسلے میں شہزادی کی تجاویز کو مسترد کر دیتا ہے ۔ یہاں پندرھویں باب میں اس کا کردار اس اندرونی کشمکش کے ذریعے زندہ کردار بن گیا ہے ۔ اس کے مرنے کا انداز بھی ایک انفرادی شان رکھتا ہے اور قاری کے ذہن پر ایک دیر پا اثر چھوڑ جاتا ہے ۔ عثمان کے کردار کے بارے میں قاضی زیاد بن زائدۃ الشیبانی کی زبانی جو رائے ظاہر کی گئی ہے وہ بہت حد تک اس کی شخصیت سے مطابقت رکھتی ہے ۔

محمد بن عبداللہ الاشجعی با اصول، زیرک اور بلند کردار شخصیت کا مالک ہے ۔ عثمان کے قاصدوں سے سوال جواب اور اُن کی اصل خواہش کو بھانپ جانا اس کی قیافہ شناسی کی اچھی مثال ہے (دوسرا باب) ۔ امیر عبدالرحمن نیک نفس تابعی بزرگ ہیں، ہر کوئی اُن کے علم کا

معترف ہے ، ان کے امیر منتخب ہونے پر سب خوش ہیں ۔ وہ معتدل مزاج اور انصاف پسند ہیں لیکن عثمان کے معاملے میں ان کا رویہ کافی سخت دکھائی دیتا ہے ۔ قاضی صاحب کا کردار صاف گوئی اور مردم شناسی کی صفت لیے ہوئے ہے ۔ لیث بہت زیرک انسان ہے ۔ وہ اپنے سفارتی مشن سے پہلی دفعہ ناکام لوٹنے پر جس سلیقے سے عثمان کو اس کی ناکامی کی خبر سناتا ہے اس میں اس کی دانائی ، فراست اور انسانی نفسیات سے باخبری کا عنصر صاف جھلکتا ہے ۔ وہ عثمان کے جذباتی فیصلوں سے اختلاف کرتا ہے اور عثمان نے شہزادی کے حسن سے متاثر ہوکر صلح کی جو شرائط مقرر کی ہیں انھیں وہ ناپسند کرتا ہے اور جنگی مصلحتوں کے خلاف سمجھتا ہے، عدی بن زیان جنگی معاملات میں امیر سے زیادہ تجربہ کار دکھائی دیتا ہے ۔ چارلس غرور اور تکبر کا پتلا ہے ۔ سرویطوس شجاع، دلیر، فرماں بردار اور دور اندیش ہے ۔ خلف بن الخزاعی کی جرأت، بہادری، بے نفسی اور مسلمانوں سے ہمدردی اپنی مثال ہے ۔

شہزادی مینینہ کا کردار جاذب نظر کردار ہے ۔ اس کا ابتدائی تعارف شرر نے ان الفاظ میں کرایا ہے :

"ان سب شوخ ادا گلبدنوں کی وضع ایک ہی سی ہے ۔ سب رنگین ریشمی سادی ساریاں باندھے ہیں ، جن کی بندش ناز آفرینان ہند کی ساریوں کی بندش سے جدا اور نرالی ہے کیونکہ نازک گردنوں سے ایڑیوں تک سارے بندے کو اس نئے انداز سے چھپائے ہوئے ہیں کہ جا بجا بہت سے جاں ستاں جھول اور دل کو الجھانے والی شکنیں پیدا ہو گئی ہیں ۔ سب کی ساریوں کے رنگ جدا ہیں ۔ سنہری زلفیں سنہرے اور رو پہلی لچکوں کے ایک خوبصورت حلقے سے روک کے پیٹھ پر بکھرا دی گئی ہیں جن کے نیچے رنگ برنگ ساریوں کی شوخ ڈاک عجب زاہد فریب آن بان پیدا کر رہی ہے ۔ طلائی اور نقرئی حلقے سب کی جبین ناز پر زریں تاجوں کا کام دے رہے ہیں لیکن وہ سیم تن مہ پارہ جس پر ہر طرف سے پھولوں کا مینہ برس رہا ہے اوروں سے امتیاز رکھتی ہے کہ اس کے سر پر زریں حلقے کے اوپر سونے کا ایک مرصع ہلال زلفوں میں اٹکا ہوا ہے جس کے الماس شعلہ باری میں اس کی چشم فتاں کے حریف ہیں ۔" (چوتھا باب)

شہزادی مینینہ میں اپنی ہم عمر سہیلیوں کی نسبت کہیں زیادہ سنجیدگی پائی جاتی ہے ۔ اسے اپنے حسن پر بھروسا ہے، خود اعتمادی ہے ۔ اپنے وطن سے ایک گونہ محبت ہے اور اس کے لیے وہ ہر قربانی دے سکتی ہے ۔ وہ عقلمند اور باہمت ہے ۔ باپ کی مشیر ہے اور نازک موقعوں پر اس کی ڈھارس بندھاتی ہے ۔ جنگی معاملات میں بھی وہ مشورہ دیتی ہے اور قلعہ بند ہو کر لڑنے کی تجویز اسی کی پیش کردہ ہے ۔ وہ زیرک بھی ہے اور نفسیات شناس بھی، اسی لیے وہ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ خود بھی میدان میں جا کر لڑے گی کیونکہ اس طرح اس کی موجودگی کے باعث ایک سپاہی بھی قدم پیچھے نہ ہٹا سکے گا اور سب فتح کے لیے جانیں لڑا دیں گے ۔ وہ اگرچہ عثمان کے لیے اپنے دل میں جگہ محسوس کرتی ہے لیکن شادی کے فیصلے میں عجلت سے کام نہیں لیتی ۔ باپ سے اپنے نظریات کا اور دلی کیفیتوں کا صاف صاف اظہار کر دیتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی تجویز اور مرضی پر عمل کرنا اپنے لیے باعث سعادت قرار دیتی ہے ۔ وہ باپ پر سے اسلامی لشکر کے خرچ کا بوجھ اتارنے کے لیے عثمان کے ساتھ جلد کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیتی ہے ۔ پندرھویں باب میں شہزادی کا کردار بھی اپنی بلندیوں پر ہے ۔ اس کی وفا داری کی صفت اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے ۔ وہ عثمان کے قتل کر دیے جانے پر زندہ نہیں رہنا چاہتی اور اس خاطر اقدام خودکشی کرتی ہے لیکن زندگی سے نجات پانے میں ناکام رہتی ہے ۔

شہزادی مینینہ کے کردار کے بعد اس ناول میں ہیلنا کا کردار جاذبیت رکھتا ہے ۔ شرر

نے آٹھویں باب میں اس کے حسن کا ذکر کرتے ہوئے سراپا بیان کیا ہے، کمسنی میں بھی وہ عقلمند اور چالاک ہے۔ اپنی سہیلی سلوریا سے زیادہ مصلحت بین ہے۔ جن حالات سے وہ دو چار ہوتی ہے اُن کے جملہ پہلوؤں پر نظر رکھتی ہے۔ وفاداری کے جذبے سے سرشار ہے۔ شہزادی کے لیے وہ خلوص اور ایثار کا جذبہ رکھتی ہے لیکن اس کے باوجود جب شہزادی اُسے عثمان کے پھانسنے پر آمادہ کرتی ہے تو وہ تذبذب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ وہ عثمان سے دغا نہیں کرنا چاہتی۔ ہیلنا با ہمت اور جگرداد بھی ہے۔ شہزادی کی خاطر وہ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتی ہے اور جہاں سلوریا سے تساہل ظاہر ہونے لگتا ہے ہیلنا وہاں بھی چاق و چوبند دکھائی دیتی ہے۔ اس کی شخصیت میں شرم و حیا کا عنصر بھی صاف جھلکتا ہے۔ وہ نیک دل بھی ہے اور اسی نیک دلی اور وفاداری کے باعث وہ عثمان کو گرفتار کرانے کی سازش میں شریک ہوتے ہوئے دلی دکھ اور ذہنی اذیت محسوس کرتی ہے۔ سلوریا شوخ مزاج اور شریر ہے لیکن ذہانت، مصلحت بینی اور خلوص میں وہ ہیلنا کو نہیں پہنچ سکتی۔

ریحانہ کا کردار اگرچہ ناول میں صرف دو بار اور بہت کم عرصے کے لیے سامنے آتا ہے لیکن اپنی صفات کی بنا پر گہرے تاثرات چھوڑ جاتا ہے۔ بالخصوص آخری باب میں وہ ایک مسلمان ہونے کے باوجود اور اس حالت میں بھی جبکہ عیسائیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا انسانی ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہو کر یودیز سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے پاس ٹھہر جاتی ہے تاکہ ایک باپ کے دل سے بیٹی کے غم کے بوجھ کو ہلکا کر سکے۔ یہ اقدام محض انسانی ہمدردی کے تحت ہے اس کا ثبوت اس کی وہ قومی حمیت ہے جس کے تحت وہ جوش میں چارلس مارٹل کو بھی اس کے بلند بانگ دعووں پر ٹوک دیتی ہے۔

یودیز کی شخصیت بھی بعض دیرپا اثرات چھوڑنے والی صفات لیے ہوئے ہے۔ وہ شجاع اور دلیر بھی ہے اور احسان شناس و غیور بھی۔ وہ بیٹی کو میدان جنگ میں جانے سے ہر قیمت پر روکتا ہے لیکن آخر اُس کی ضد کے آگے سپر انداز ہو جاتا ہے۔ یودیز مصلحت اندیش بھی ہے اور عقلمند بھی۔ پندرھویں باب میں اس کی شخصیت میں تضادات کا عنصر اور اندرونی کشمکش نمایاں ہے۔ وہ بیٹی کی آرزو اور عثمان کے احسان کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا لیکن کسی غیر مسیحی کو رشتہ دیتے ہوئے کتراتا بھی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر اپنے ہم کفو سے باہر ہی رشتہ دینا تھا تو وہ ایسے بادشاہ کو دیتا جس کے ذریعے اس کی اپنی سلطنت کو تقویت حاصل ہوتی اور اس کا داماد اس کے لیے قوت ثابت ہوتا۔ یہ کشمکش خاصی نمایاں ہے۔ یودیز نے جس ڈھب سے چارلس مارٹل کو مسلمانوں کے مقابلے کے لیے آمادہ کیا اور اپنی شخصیت کو آخر دم تک چھپائے رکھا وہ اس کی زیرکی، دانائی اور موقع شناسی پر دلالت کرتا ہے۔

منظر نگاری :

مفتوح فاتح میں شرر کو منظر نگاری اور مرقع کشی کے کئی مواقع ملے ہیں اور ان سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس ناول کے ہیرو کو چونکہ انھوں نے شاعرانہ اور عاشقانہ مزاج کے نوجوان کے روپ میں پیش کیا ہے اسی لیے منظر نگاری میں بھی وہی رنگ پیدا کرنے کا جواز پیدا کر لیا ہے جو اُن کی اپنی نثر نگاری کا طرہ امتیاز ہے۔ پہلے باب میں پیرینیز کی وادی، سربفلک پہاڑوں، کوہستانی اور برفانی علاقے کے منظر، برفانی پہاڑوں سے نکلتی ہوئی پیچ

و خم کھاتی ہوئی رواں دواں حسین پہاڑی ندیوں، پر پیچ راہوں کے منظر انھوں نے بھرپور انداز میں پیش کیے ہیں - ان مناظر کو انھوں نے موسم بہار سے مطابقت دے کر اور بھی حسین بنا دیا ہے -

پہلے باب کا آغاز ہی اس ادیبانہ اور شاعرانہ منظر نگاری سے ہوتا ہے :

"۱۱۰ھ کے آغاز ہی میں بہار کا موسم آ گیا ہے اور کشمیر مغرب یعنی کوہستان پیرینیز کی گھاٹیاں مجاہدین عرب کی نظر میں جنت الفردوس کا نمونہ بن گئی ہیں - قدرت کی بزم طرب نیرنگیاں دکھا رہی ہے اور جوانان چمن نے رنگین بہشتی حلے پہن لیے ہیں - سر بکف پہاڑوں نے اگرچہ اسلامی تہذیب کی سادگی نباہنے کے لیے برف کے سفید براق عمامے سر سے نہیں اتارے مگر موسمی نیرنگیوں کے جوش نے بھی انھیں گردن سے پاؤں تک جنتیوں کا سبز لباس پہنا دیا ہے جس میں . . . . رنگ برنگ پھولوں کے نظر فریب بیل بوٹے ٹانکے ہیں مگر خود ان کی رواں طبع نے کمال شوقینی سے اپنے مخمل سبز کے دامنوں میں جا بجا چھوٹی چھوٹی خوبصورتی سے چٹکی کا لہریا بنا کے آبشاروں کا لچکا ٹانک لیا ہے جو تبدیل اوقات کی مناسبت سے موسمی آفتاب کی کرنوں کی مدد سے کبھی رو پہلا ہوتا ہے اور کبھی سنہرا ہو جاتا ہے . . . . ہر طرف اپنی بہار پر اترانے والے پہاڑ برف کے شملے باندھے اور پیراہن گل پہنے دولھا بنے کھڑے ہیں اور ان کے درمیان میں قدرت نے گھونگھٹ دے دے کے یکے بعد دیگرے بہت سے مرغزار پیدا کر دیے ہیں -" (پہلا باب)

اس منظر میں شرر نے عربی شاہسواروں کا مرقع کھینچتے ہوئے لکھا ہے :

"عربی سواروں کا ایک غول بشکنش سے الباب کی طرف جا رہا ہے جو نہر عسیرہ کے کنارے اس کی روانی کی بہار دیکھتے ہوئے چلے جاتے ہیں - نہر عسیرہ سامنے سے شور مچاتی ، غاروں اور گڑھوں میں پھاندتی ، چٹانوں سے لڑتی ، سنگلاخ زمین پر سر پٹکتی اور دھوم مچاتی ہوئی شمال سے جنوب کی طرف آ رہی ہے اور یہ سوار اس کے مقابل جنوب سے شمال کی طرف پہاڑ کی بلندی پر چڑھ رہے ہیں -

ان سب کے سروں پر بڑے بڑے سفید عمامے ہیں جن کے آخری دو ایک پھیر تحت الحنک کی وضع سے گلے اور کلوں میں لپٹے ہوئے ہیں اور جس طرح اوپر عماموں کے بیچ میں سے فولادی خودوں کی نوکیں نکل کے چمک رہی ہیں ، ویسے ہی چہروں کے نیچے خوبصورت نوکیلی داڑھیاں تحت الحنک میں سے نکل آئی ہیں - سردی اور برف کی مضرت سے بچنے کے لیے یہ سوار پوستین کی قباؤں پر اون کے موٹے موٹے سیاہ فرغل پہنے ہیں جو بھاری زرہوں کو چھپائے ہوئے ہیں - پاؤں میں اون کے گرم پاجامے ہیں اور چمڑے کی پیٹیوں سے کمریں کسی ہوئی ہیں - ان کے مختلف رنگ کے اندلسی گھوڑے زبردست قوی ہیکل اور گٹھے ہوئے ہاتھ پاؤں کے ہیں جو کوہستانی راستوں میں بڑی بے تکلفی سے چلتے ہیں اور ان لوگوں کو بہت آسانی اور آہستگی کے ساتھ پہاڑ کی بلندی پر چڑھائے لیے جاتے ہیں - موٹے سیاہ دبیز کمبل ان کی پیٹھوں پر پڑے ہیں -" (پہلا باب)

شرر نے اپنے مخصوص رنگ کی منظر نگاری کے اور بھی کئی نمونے اس ناول میں پیش کیے ہیں جن میں ان کی ادبیت ، رنگینی اور شعریت کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے - چوتھے باب میں پیرینیز کی گھاٹیوں میں شہر انوس کے قریب یودیز کے قصر کے چمن کا منظر اسی ادبی منظر نگاری کا ایک نمونہ ہے - اس چمن میں یودیز کی بیٹی اور اس کی سہیلیاں کھیل رہی ہیں - شرر لکھتے ہیں :

"قصر کے گردا گرد اس نے وسیع اور روح افزا چمن لگایا ہے جس کے ہر پھول اور بوٹے کی پرورش متبرک نہر نیو کے پانی سے ہوتی ہے - اس لیے کہ اس میں سے چھوٹی چھوٹی نہریں کاٹ کے پانی سارے باغ میں پھرایا گیا ہے- یہ نہریں ہر وقت جاری رہتی ہیں اور باغ میں جس جگہ ٹھہر جائیے آب رواں کی زبان رفتار سے تقدیس و تمجید باری کے ساتھ حسن و عشق کے رموز الفت سن لیے جا سکتے ہیں - یوں تو کوہستان کا ہر حصہ معشوقہ قدرت کا آغوش بنا ہوا ہے مگر اس چمن میں عروس بہار کو انسانی صنعت نے اپنا زیور پہن کے ایسا آراستہ و پیراستہ کر دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے حسن کی دیوی وینس کا تخت یہیں بچھا ہوا ہے اور کیوپڈ

ہر پھول کی آڑ میں بیٹھا اپنی عشق کی کمان سے نشانہ بازی کر رہا ہے -

اسی چمن میں ہر نیو کے ایک آبشار کے قریب لالہ و نرگس کے خود رو پھولوں کے جھنڈ کے پاس پری جمال گلعذاریں پھولوں سے کھیل کھیل کے موسم بہار کے مزے لے رہی ہیں اور اس بے رحمی سے پھولوں کو نوچ نوچ کے ایک دوسرے پر پھینکتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے پھولوں کو اپنے رنگ و بو کا دعوی کرتے دیکھ کے بگڑ گئی ہیں اور چاہتی ہیں کہ دم بھر میں سارا چمن اجاڑ کے رکھ دیں - لیکن تھوڑی دیر میں اس پھولوں کی لڑائی میں تھک گئیں - سب کی سانس پھول گئی - گورے گال محبت بھری لڑائی کی اس نازک مشقت سے ارغوانی ہو گئے اور نازک پیشانیوں پر تھکن کی دلاویز پژمردگی نمایاں ہوئی ، مگر ساری وادی اور چمن کے پھول اب بھی ویسے ہی شگفتہ و شاداب ہیں اور گویا ان مہ وشوں کی بے بسی کو اپنی فتح تصور کر کے کھل کھلا کے ہنس رہے ہیں جس پر چڑ کے اور جھنجھلا کے ان طرحدار حسینوں نے پھر پھولوں کو گستاخی کی سزا دینی شروع کر دی - لیکن اب بجائے اس کے کہ پھولوں کو توڑ توڑ کے ایک دوسرے کی طرف اچھالیں، آنچلوں میں بھر بھر کے لیے جاتی اور اپنے ساتھ کی ایک ملائک فریب حوروش کے سر پر اچھال دیتی ہیں- اس مہ پارہ کا حسن و جمال ان پانچوں نازنینوں میں وہی فوقیت رکھتا ہے جو چودھویں رات کے چاند کو تاروں پر ہوتی ہے- وہ بگڑ بگڑ کے تیوریاں بدل بدل کر ڈانٹتی اور جھنجھلا جھنجھلا کے ڈھیلے ہاتھوں سے مارتی ہے مگر ساتھ والیاں ایک نہیں سنتیں اور پھولوں کا مینہ برسائے جاتی ہیں -"

زبان و بیان :

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ناول کی منظر نگاری میں شرر نے دل کھول کر نثر میں شاعری کی ہے- خوبصورت شاعرانہ تشبیہیں اور استعارے اور تراکیب استعمال کی ہیں - الفاظ میں بھی رنگینی اور چاشنی نمایاں ہے- اس مخصوص زبان و بیان نے مل کر عثمان کی شخصیت اور صفات کو اور بھی اجاگر کر دیا ہے- پہلے باب میں مختلف جانوروں کی عربی کنیتیں استعمال کرکے انھوں نے بیان کو کرداروں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے -

۱۸- بابک خرمی

پلاٹ :

"بابک خرمی" خلافت عباسیہ کے دور میں جاوداں کے جانشین بابک کے فتنوں اور شورشوں سے متعلق ہے- بابک نے خلافت عباسیہ کو تقریباً بیس برس تک آذربیجان کے علاقے میں پریشان کیے رکھا - بالآخر خلیفہ معتصم کے عہد میں بابک اپنے کیفر کردار کو پہنچا - ناول میں بیان کیے گئے واقعات کا خلاصہ چوتھے باب میں دیا جا چکا ہے - یہ ناول دو جلدوں میں شائع ہوا اور کل ۲۹ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے گیارہ باب جلد اول میں اور اٹھارہ باب جلد دوم میں ہیں -

ناول کا آغاز ڈرامائیت کا عنصر لیے ہوئے ہے - ناول بغداد کے منظر سے شروع ہوتا ہے ، خلیفہ معتصم کے جاہ و جلال کو پیش کرتے ہوئے شرر اس کی خدا خوفی اور رعایا پروری کا ذکر کرتے ہیں - پلاٹ کی اٹھان پہلے باب سے ہی شروع ہو جاتی ہے جب ایک بردہ فروش کے لائے ہوئے غلاموں اور کنیزوں میں سے ایک خاتون معتصم کے سامنے خود کو ہاشمیہ عباسیہ ظاہر کرکے بابک خرمی کے مظالم کی داستان سناتی ہے اور بتاتی ہے کہ جب بابک نے ان کے قافلے پر حملہ کیا تھا اس کی بیٹی نے "وا معتصما" پکارا تھا - خلیفہ معتصم فوراً ایک ترک سردار افشین کو بابک کی سرکوبی کی مہم پر مامور کرتا ہے - دوسرا باب پلاٹ سے متعلق نہیں بلکہ عباسی

خلافت اور اس عہد میں پیدا ہونے والی شورشوں کے متعلق تاریخی پس منظر ہے ۔ اسی باب میں بابک خرمی کی تحریک ، دعوئ الوہیت وغیرہ سے متعلق تاریخی معلومات ہیں ، نیز یہ بھی مذکور ہوا ہے کہ بیس برس تک بابک نے عباسی خلافت کو کس قدر پریشان کیے رکھا اور اس کے خلاف کتنی مہمات ناکام رہیں ۔

تیسرے باب کا آغاز بھی ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے ، واقعات کا ایک نیا سلسلہ سامنے آتا ہے جو چوتھے باب کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے پلاٹ کے اصل واقعات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے ۔ اس کے بعد ناول کے اختتام تک پلاٹ میں قدم قدم پر دلچسپی ، تجسس ، اتار چڑھاؤ کا عنصر ملتا ہے ۔ واقعات کی سنجیدگی کے باوجود شرر نے ناول کو کہیں بھی سپاٹ اور غیر دلچسپ نہیں ہونے دیا ۔ واقعات کی ترتیب ، ابواب کے آغاز و اختتام نے ناول میں حسن پیدا کر دیا ہے ۔ پلاٹ کی اس تعمیر کی وجہ سے فنی اعتبار سے یہ ناول شرر کے اچھے ناولوں میں شامل ہونے کا مستحق ہے ۔ پلاٹ میں تدریجی ارتقا موجود ہے اور اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ نہ تو اس میں غیر ضروری ٹھہراؤ ہے اور نہ ایسی عجلت جو خلا پیدا کرنے کا باعث بنے ۔ شرر نے پلاٹ کی تکمیل میں فنی ہنروری سے کام لیتے ہوئے ان تمام جزئیات کے بیان پر کڑی نظر رکھی ہے جن کے بغیر پلاٹ میں ادھورا پن محسوس ہو سکتا تھا ۔ ان جزئیات نے پلاٹ کے واقعات میں اور اس کے ارتقا میں ایک منطقی ربط و تسلسل پیدا کر دیا ہے ۔ محسوس ہوتا ہے کہ پلاٹ کا ابتدائی ڈھانچہ تشکیل دینے سے پہلے شرر نے موضوع سے متعلق مواد کا بہت وسیع مطالعہ کیا ، بڑی دقت نظر سے مواد جمع کیا اور پھر پورے غور و فکر سے اس کے لیے ابتدائی خاکہ مرتب کرکے واقعات کی کڑیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا ہے ۔

ناول کے پلاٹ میں ایسے اچانک موڑ واقع نہیں ہوئے جن کے بارے میں کہا جائے کہ ناول نگار نے محض اتفاقات اور حادثات کا سہارا لیا ہے ۔ بلکہ پلاٹ میں ہر تبدیلی پورا پس منظر اور جواز رکھتی ہے ۔ پلاٹ کی ہمواری کی بدولت کرداروں کی شخصیتوں میں بھی غیر فطری اور غیر منطقی تبدیلیاں رونما نہیں ہوئیں ۔

کردار :

"بابک خرمی" میں چھوٹے اور بڑے کرداروں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے ، جو ناول کے موضوع اور واقعات کے اعتبار سے ناگزیر تھی ۔ کرداروں کی فہرست یہ ہے : خلیفہ معتصم محمد ابو اسحق بن ہارون رشید ، ابن جلمود ، رامہرمز کا عجمی بردہ فروش ، احمد بن ابی داؤد ، معتزلہ فرقے کا سرگروہ جس کا معتصم کے دربار میں غلبہ تھا ، عالیہ—ایک عباسی خاتون جو بابک کے ہاتھوں گرفتار ہوئی اور ابن جلمود اسے لونڈی بنا کر لایا ، علی ابن فضل—عالیہ کا بھتیجا ؛ ریحانہ—عالیہ کی بیٹی ، علی بن فضل کی منگیتر ؛ اسحق بن ابراہیم—خلیفہ کا سپہ سالار جس نے ۲۱۸ھ میں بابک کو زبردست شکست دی تھی ؛ حیدر افشین بن کاؤس—بابک کی تاخت پر مقرر ہونے والا ترک سپہ سالار ؛ بابک—جاویدان کا جانشین ، خلافت کا باغی ؛ عصمت—بابک کا ایک سردار جسے قلعہ شاہی کے حاکم نے قتل کیا ؛ خورزاد—عصمت کا ایک ساتھی اور بابک کی ساقیہ محبوبہ ماہ آفرید کا بھائی ؛ فرخ چہر—عصمت کا ایک ساتھی جس نے قلعہ شاہی کے حاکم کا ساتھ دیا ۔ یہ علی بن فضل تھا جس نے ریحانہ کی تلاش میں بابکیوں کا بہروپ اختیار کر رکھا

تھا ؛ بہروز—عصمت کا ایک ساتھی جو عصمت کے ساتھ ہی قتل ہوا ؛ ماہیار—عصمت کا ساتھی جو اس کے ساتھ ہی قتل ہوا ؛ محمد بن عبدالملک الزیات—معتصم کا وزیر اور مشہور شاعر ؛ شبل بن بہمنیار—قلعہ شاہی کا دربان ؛ محمد بن مغیث—حاکم قلعہ شاہی ؛ ابن حوقل—حاکم قلعہ شاہی کا ایک فوجی افسر ؛ طیار—قلعہ شاہی کا ایک جاسوس جو افشین کی آمد کی خبر لایا ؛ افشین کی فوج کے کچھ افسر محمد بن یوسف ، ہیثم غنوی ، علویہ اعور ، ابن حوشن ، جناح اعور، ابن ہشام ، ابن سعید وغیرہ ؛ بغا کبیر—ترک سردار جو دربار خلافت سے افسین کے لشکر کے لیے خزانہ وغیرہ لے کر آیا ؛ شیریں—افشین کی بیوی ؛ کیوان دخت—شیریں کی کنیز ؛ فضیل بن کاؤس—افشین کا بھائی ؛ ماہ آفرید—بابک کی ساقیہ محبوبہ ؛ طر خان—بابک کا ایک سردار ؛ ہرمزیار—طر خان کا ساتھی ؛ ماہویہ—فرخ چہر کا ساتھی اور اسحق بن ابراہم کا غلام ؛ فرخ زاد ، کیوان دوست ، بوذرخسنان اور مہر دوست بابکی ہیں جنھوں نے عالیہ اور ریحانہ کو گرفتار کرنے کی کوشش کی ؛ نوشکین ، قباد ، مہر زاد ، اور غانم علی بن فضل کے چار ساتھی ؛ جعفر الخیاط—خلافت کا ایک سردار جو افشین کی کمک پر لشکر لے کر آیا ؛ ایتاخ ترکی—خلافت کا خزانچی ؛ اذین—بابک کا مشہور سپہ سالار جو گرفتار ہوا ؛ نشیر ترکی ، ظفر بن علا سعدی اور مظفر بن کندر مسلمان سردار ؛ عثمان بن نعمان موصلی—مجاہدین کا سرگروہ ؛ تائبہ—بابک کے حرم کی داروغہ خاتون جاویدان پرست جو بعد میں مسلمان ہوگئی ؛ ماہک—بابک کا بھائی ؛ شاہک—بابک کا بھائی ؛ برجیس دخت—بابک کی ماں ؛ توفیل بن میخائیل—فرمانروائے قسطنطنیہ ؛ ابوالساج—اسلامی سالار جس نے جنگل کی ناکہ بندی کرکے بابک کی ماں اور بھائی کو گرفتار کیا ۔ ابن سنباط—ارمنی مسیحی حاکم جس نے بابک کو بہلا پھسلا کر گرفتار کروایا ؛ معویہ—ابن سنباط کا بھائی ؛ عیسیٰ بن یونس—ارمن کے ایک قلعے کا حاکم جس کے پاس بابک کا بھائی ٹھہرا ہوا تھا ۔

ان کرداروں کے علاوہ بعض تاریخی شخصیتوں کے نام بھی ناول میں آئے ہیں جو ناول کے زمانے سے پہلے مر چکے تھے یا مختلف واقعات کے سلسلے میں ان کے صرف نام آئے ہیں وہ خود سامنے نہیں آئے ۔ ان میں امین الرشید ، مامون الرشید ، قثم بن عباس ، خاقان ، ابو مسلم خراسانی ، سنباذ ، استاذ سیس ، ابن مقنع ، مراجل ، یوسف برم ، امام علی رضا ، جاویدان ، عیسیٰ بن محمد بن ابی خالد ، علی بن صدقہ (زریق) ، ابراہیم بن لیث ، احمد بن جنید اسکافی ، محمد بن حمید طوسی ، اسحق بن ابراہیم بن مصعب وغیرہ کے نام شامل ہیں ۔

ناول کے بڑے کرداروں میں بابک ، افشین ، عالیہ ، ریحانہ ، علی بن فضل ، معتصم ، ماہ آفرید شامل ہیں ۔ معتصم ناول میں پہلے باب اور آخری باب میں سامنے آتا ہے لیکن یہ قلیل عرصہ بھی اس کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر کافی حد تک روشنی ڈالتا ہے ۔ معتصم جری ، بہادر اور غیور ہے ۔ معتصم کا جاہ و جلال اس کے ترکی غلاموں کی شان و شوکت اور خود اس کی وضع قطع اسے بارعب خلیفہ کے روپ میں دکھاتے ہیں ۔ وہ چونکہ خود زیادہ پڑھا لکھا نہیں اس لیے علمی بحث کے معاملات سے گریز کرتا ہے ۔ اسی وجہ سے قاضی احمد بن ابی داؤد کے سامنے معتصم دبا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ معتصم کے کردار میں خدا خوفی کا عنصر بھی صاف جھلکتا ہے ، وہ رعایا پرور ہے اور ان کی آہوں سے ڈرتا ہے ۔

افشین ترک غلام تھا لیکن اپنی صلاحیتوں کی بنا پر اس نے ترقی کے انتہائی مدارج طے

کیے ۔ معتصم نے اسے حدر کا لقب دیا ۔ افشین ایک پختہ کار اور دانا سپہ سالار ہے ، وہ آذربیجان کے علاقے میں پہنچ کر سب سے پہلے مختلف ذرائع سے علاقے کے مستند نقشے مرتب کروانا ہے پھر آمد و رفت کے راستوں کو محفوظ بنانے کے لیے ضروری اقدامات کرتا ہے ۔ بابک کے جاسوسوں کو اپنے ساتھ ملاتا ہے ۔ ان تدابیر سے اس کی جنگی مہارت کا پتہ چلتا ہے ۔ میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب ، مورچہ بندی وغیرہ سے بھی اس کی پختہ کاری آشکارا ہے ۔ افشین نے جس حکمت سے ماہ آفرید جیسی چالاک اور عیار عورت سے بابک کے متعلق بہت کچھ اگلوایا اس سے اس کی زیرکی ، نفسیات شناسی کی صفات اجاگر ہوتی ہیں ۔ اس کے کردار میں تحمل اور بردباری کا عنصر بھی بدرجہ اتم موجود ہے ۔ وہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کا عادی ہے ۔ اپنی جنگی مہمات کو مرتب کرتے ہوئے وہ ہر قسم کے حالات کے بارے میں سوچتا ہے ۔ تمام جزئیات کو نگاہ میں رکھ کر متوقع اور غیر متوقع حالات سے نپٹنے کے لیے انتظامات کرتا ہے ۔ اذین کے خلاف ایک مہم میں اس نے جھنڈیوں کے ذریعے پیغام رسانی کا جو طریقہ ایجاد کیا وہ اس کی زیرکی پر دلالت کرتا ہے ۔ اس نے تحمل اور بردباری سے بابک کی کمین گاہوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں حالانکہ بعض اوقات اس کے ساتھی سردار اس کی جنگی حکمت عملیوں سے پورے طور پر باخبر نہ ہوتے ہوئے اس سے الجھے بھی اور بالخصوص مجاہدین کو بہت عجلت تھی لیکن افشین نے تدبر اور حکمت عملی سے تمام معاملات پر قابو پا لیا اور اسی لیے وہ بابک کے دارالبغاوت بذ کو مکمل طور پر مسمار کرا دینے میں کامیاب ہو سکا ۔

بابک انتہائی چالاک ، ہوشیار اور مستقل مزاج کردار کا مالک ہے ۔ اس نے اپنے عقاید کو پھیلانے کے لیے اپنی شخصیت کو ایسے سانچے میں ڈھالا ہے جو اس کے معتقدوں کو ہر حال میں متاثر کرتی ہے ۔ عساکر خلافت کے ساتھ اس کا برسوں برسر پیکار رہنا اس کی شجاعت اور ہمت کی دلیل ہے ۔ اس کا کردار ہمارے سامنے صحیح معنوں میں اس وقت اجاگر ہوتا ہے جب وہ بذ سے فرار اختیار کرتا ہے ، کس مپرسی کے عالم میں بھی وہ اپنے معتقدوں کے سامنے خود کو بے بسی کے روپ میں نہیں پیش کرتا ۔ آخری چار پانچ ابواب میں شرر نے اس کردار پر پوری توجہ دی ہے ۔ بغداد پہنچ کر جس انداز میں اس نے خلیفہ سے گفتگو کی اور جس استقامت کا مظاہرہ اس نے قتل کے وقت کیا اس سے اس کردار کی پوری پوری عکاسی ہوتی ہے ، وہ ایک مضبوط دل والا شخص دکھائی دیتا ہے ۔ اپنی شخصیت کے بھرم کو قائم رکھنے کے لیے وہ عزیز سے عزیز فرد کی بھی قربانی دے سکتا ہے ۔ دو تین نازک مواقع کو شرر نے اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ بابک گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان معلوم ہوتا ہے ۔ عالیہ کو اس نے اپنی طرف سے قتل کرا دیا تھا لیکن پھر دوبارہ جب وہ عالیہ کو دیکھتا ہے تو بھوت بھوت چلا اٹھتا ہے ، یہ ایک نفسیاتی مرحلہ تھا اور شرر نے اسے کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے ۔

عالیہ ایک حوصلہ مند ، زیرک اور غیور خاتون ہے ۔ اس نے مشکلات کو بڑی حوصلہ مندی سے جھیلا ہے ۔ معتصم کے ہاتھوں ابن جنمود کو قتل سے بچایا اور اصل مجرم بابک کو قرار دیا ۔ وہ بیٹی سے والہانہ محبت رکھتی ہے اور اس تک پہنچنے اور اسے آزاد کرانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتی ۔ ایک بار جب انھیں آزادی مل جاتی ہے تو وہ گڈریے سے دودھ حاصل کرتے ہوئے بڑی سلیقہ مندی سے اس سے معلومات حاصل کرتی ہے ۔ دوسری بار بذ میں پہنچ کر وہ بہت رازداری سے کام لیتی ہے اور ریحانہ کو بھی خاموش رہنے کی تاکید کرتی ہے کہ کہیں

بھید نہ کھل جائے۔

ریحانہ ایک باعفت دوشیزہ ہے لیکن اس کے کردار پر شرر نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ ریحانہ کی نسبت ماہ آفرید کا کردار زیادہ جاندار محسوس ہوتا ہے۔ ماہ آفرید سے جو لغزشیں سرزد ہوتی ہیں وہ اسے ایک زندہ عورت کے روپ میں پیش کرتی ہیں۔ علی بن فضل کا کردار بھی تساہل اور بے توجہی کا شکار ہوگیا ہے۔ اس میں شجاعت، غیرت، زیرکی وغیرہ کی صفات موجود ہونے کے باوجود زندگی کی بھرپور روح نہیں اجاگر ہوئی، اگرچہ ایک دو مقامات پر جب ریحانہ سے اس کا آمنا سامنا ہوتا ہے اور وہ ریحانہ کے بارے میں بدگمانی کے باعث اسے قتل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کے کردار میں ایک لمحے کے لیے زندگی کی جھلک پیدا ہوتی ہے لیکن یہ رمق دیرپا نہیں۔

مکالمے اور زبان و بیان :

ناول کی زبان و بیان اور مکالمے کرداروں کی شخصیت سے، ان کی اندرونی کیفیات سے بڑی ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ ماہ آفرید سے پہلی ملاقات پر افشین کے مکالمے، دوسری ملاقات پر مکالمے، پھر جب ماہ آفرید گرفتار ہو کر افشین کے سامنے آخری بار آتی ہے اس وقت کے مکالمے موقع محل اور کرداروں کی شخصیت سے مناسبت کی عمدہ مثال ہیں، بابک خرمی کے اپنے معتقدوں سے مکالمے، قاضی احمد بن ابی داؤد کے شاگرد سے مکالمے اور ابن سنباط سے بابک کے مکالمے بھی ایک اچھی مثال ہیں۔

شرر نے ناول میں موقع محل کی مناسبت سے بعض مرقعے بھی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ ان میں معتصم کے جاہ و جلال، قلعہ شاہی کے باہر عصمت کے قیام، بابک سے معرکوں وغیرہ کے مرقعے بہت متناسب اور عمدہ مرقعے ہیں۔ اس ناول میں شرر کی زبان ان کے عام انداز کی رنگینی نہیں رکھتی بلکہ اس میں سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ اس لیے مناظر کی تصاویر میں بھی شاعرانہ رنگ آمیزی یا تخیلی عنصر کی نسبت حقیقت کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔

۹۱- لعبت چین

پلاٹ :

لعبت چین کا پلاٹ سیدھا سادا ہے اگرچہ شرر نے دو تین مقامات پر اس میں اتار چڑھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں زیادہ نشیب و فراز نہیں، تدریجی ارتقا ہے۔ موسیٰ اپنے والد عبداللہ بن خازم والی خراسان کے مشورے پر اسلامی سلطنت کے علاقے سے نکل آیا۔ سمرقند کے والی طرخون نے اسے پناہ دی لیکن جشن نوروز کی ایک رسم کے مطابق موسیٰ نے سپہ سالار اور وزیراعظم کا شمشیر بازی کا چیلنج قبول کر لیا۔ مقابلے میں وزیراعظم نوشگین موسیٰ کے ہاتھوں مارا گیا اور موسیٰ نے قتلق خانم کو جیت لیا۔ چند دن بعد طرخون کے بیٹے ارسلان کی چین کی شہزادی نوشین سے شادی طے پائی۔ شادی کی رسم کے مطابق شہزادی کو میدان میں زیر کرکے پکڑنا تھا۔ طرخون اور اس کے امراء نے موسیٰ کو بھی بدنیتی سے مقابلے میں حصہ لینے والوں میں شامل کر دیا، لیکن بجائے اس کے کہ ارسلان کے فرضی رقیب موسیٰ کو قتل کرنے میں کامیاب ہوتے موسیٰ نے شہزادی کے گھوڑے کو پکڑ لیا اور رسم جیت گیا۔

فساد کا خطرہ تھا اس لیے موسیٰ طرخون کے مشورے پر اپنے ہمراہیوں سمیت قتلق خانم اور شہزادی نوشین کو لے کر نکل گیا ۔

موسیٰ مختلف والیان قلعہ جات کے پاس پہنچا لیکن جب کسی نے ٹھہرنے نہ دیا تو اس نے کتی پر زبردستی قبضہ کر لیا ۔ ابھی چند دن ہی قیام کیا تھا کہ طرخون ارسلان اور کئی والیان نے مل کر اس پر لشکر کشی کی ۔ موسیٰ نے مقابلہ کیا اور بالآخر عافیت اسی میں سمجھی کہ لڑ بھڑ کر اپنے ہمراہیوں سمیت نکل جائے ۔ اس طرح موسیٰ کو پھر ایک بار خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کرنی پڑی ۔ اب کی بار اس نے ترمذ پر قبضہ کر لیا ۔ موسیٰ کو ترمذ سے نکالنے کے لیے کئی لشکر مل کر آئے ۔ نئے والیٔ خراسان نے بھی دو بار ارسلان کی مدد کو لشکر بھیجے لیکن کامیابی نہ ہوئی ۔ اب موسیٰ کی قوت اور زیر تصرف علاقے میں کافی اضافہ ہو گیا تھا ۔ آخر لاکھوں کا اسلامی اور ایرانی لشکر ایک بار پھر مقابلے پر آیا، زبردست جنگ ہوئی، موسیٰ اپنے غلام کے لباس میں بچ نکلا اور نوشین کو لے کر چین چلا گیا جہاں جا کر اس نے اپنا نام بدل کر عیسیٰ رکھ لیا اور نوشین کے ہمراہ کشمیر میں جا کر بقیہ زندگی گزار دی ۔

اس سیدھے سادے پلاٹ میں اگرچہ نشیب و فراز زیادہ نہیں لیکن شرر نے تجسس کا عنصر پیدا کیا ہے ۔ ناول کے شروع ہو جانے کے بعد شرر نے دو بار تاریخی پس منظر بیان کیا ہے ۔ ایک بار خود موسیٰ کی زبانی اس کے والد کے واقعات ہیں جو اس دور کی سیاسی حالت، خلافت کے لیے رسہ کسی اور قبائل کی باہمی آویزش کو بیان کرتے ہیں اور دوسری بار اس کے والد کے قتل کے واقعات ہیں ۔ یہ تاریخی پس منظر اگرچہ ضروری تھا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس ناول میں اسے موزوں انداز اور مناسب موقع محل پر پیش نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے ان دو مقامات پر پلاٹ اکھڑا اکھڑا سا محسوس ہونے لگتا ہے ۔

کردار :

ناول کے اہم کرداروں میں موسیٰ بن عبداللہ بن خازم، طرخون، ارسلان، نوشین، قتلق خانم، حریث و مغیث شامل ہیں ۔ دیگر کرداروں میں موسیٰ کا دوست قدامہ، عمرو بن خالد، موسیٰ کا ساتھی مالک بن عوف سلمی، ثابت بن قحطبہ لیثی، موسیٰ کے بھائی نوح، سلیمان اور خازم، بھتیجا نضر بن سلیمان، کنیز جلاجل، نوشگین، بہرام، شاہ ترمذ، خزاعی، بلال، یزید بن ہذیل، یزید بن مہلب اور مدرک شامل ہیں ۔ ایسے تاریخی کردار جو ناول میں سامنے نہیں آئے اور اُن کا صرف ذکر ہوا اُن میں عبداللہ بن زبیرؓ، مروان بن حکم، مہلب بن ابی صفرہ، امیہ بن عبداللہ بن خالد، سلمان بن مرثد، بکیر، شماس، حریش، اوس بن ثعلبہ، مفضل بن مہلب کے نام آتے ہیں ۔

ناول چونکہ واقعاتی ہے اس لیے کردار نگاری کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی صرف بعض کرداروں کی بعض صفات اجاگر ہو سکی ہیں اور ایسے کردار صرف چار پانچ ہی ہیں ۔ ان میں طرخون، ارسلان، نوشین، موسیٰ، حریث و مغیث اور یزید بن مہلب نمایاں ہیں ۔ سوائے نوشین کے دیگر کردار جامد دکھائی دیتے ہیں ۔ نوشین کے کردار میں بھی نمایاں ارتقا موجود نہیں ۔

موسیٰ کا سراپا بیان کرتے ہوئے شرر لکھتے ہیں :

''نہایت ہی خوش رو اور سبزہ آغاز نوجوان ہے جو دمشق کے نیلگوں حریر کی قبا پہنے ہے ۔ تنگ مہری کا ڈھیلا ڈھالا پھولدار پانجامہ پاؤں میں ہے ۔ آبدار فولادی خود کے گرد سفید بانکا عمامہ سر پر بندھا

ہے ۔ اصفہان کی بنی ہوئی دھاریدار چادر کندھے پر پڑی ہے۔ ایک سفید لمگی کمر میں لپٹی ہے ، جس میں پیش قبض کھڑسی ہوئی ہے۔ تلوار لٹک رہی ہے اور تیروں سے معمور ترکش دوسری طرف بندھا ہے ۔ کمان کندھے پر ہے اور ڈھال پیٹھ پر ۔ اس کی چال ڈھال سے امیرانہ، چشم و ابرو سے بہادرانہ رعب داب، وضع قطع سے سرداری کی شان و آن بان اور چہرے سے جلال آمیز حسن و جمال نمایاں ہے . . .“ (پہلا باب)

ناول میں موسیٰ کا کردار ایک بہادر، شجاع، زیرک اور احسان مند نوجوان کے روپ میں پیش کیا گیا ہے لیکن پہلے باب میں شرر نے عوامی پسند کی خاطر اس سے ایسے فعل سرزد ہوتے دکھائے ہیں جنھوں نے موسیٰ کے کردار کے بارے میں اچھا تاثر نہیں پیدا ہونے دیا ۔

طرخون کا کردار اس اعتبار سے ایک لمحے کے لیے نمایاں ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے قول کا پکا ہے ۔ اس نے چونکہ موسیٰ کو پناہ دی تھی اور اسی کے کہنے پر موسیٰ نوشین کے لیے مقابلے میں شریک ہوا تھا اس لیے موسیٰ کے جیت جانے پر وہ دل میں ازحد ملول ہونے کے باوجود ضبط سے کام لیتا ہے، ارسلان اور اس کے ساتھیوں کو ہنگامے سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے لیکن رات کے وقت موسیٰ کو خط بھیج کر مشورہ دیتا ہے کہ وہ خاموشی سے اپنے ہمراہیوں سمیت صغد کے علاقے سے نکل جائے۔

ارسلان بزدل، مکار اور بے حمیت شخص ہے ۔ اس کے کردار کی یہ صفات پورے طور پر نمایاں ہیں ۔ یزید بے وقوف اور ہوس پرست ہے ۔ ارسلان یزید کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے ۔ مہلب بن ابی صفرہ نے اپنے بیٹے یزید کو ارسلان کی فطرت سے آگاہ بھی کر دیا تھا لیکن یزید پھر بھی باز نہ آیا ۔

نوشین کا کردار دو تین صفات کی وجہ سے نمایاں ہے ۔ شادی کے لیے مقابلے کی رسم کے موقع پر وہ ہر ممکن کوشش کرتی ہے کہ ارسلان کے سوا وہ اور کسی کے ہاتھ نہ لگے لیکن جب وہ موسیٰ کے ہاتھ لگ جاتی ہے تو ہیبت اور صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے ۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ انتہائی پریشان اور سہمی ہوئی ہے ۔ رفتہ رفتہ کئی دن میں وہ موسیٰ سے مانوس ہو جاتی ہے لیکن اب اس کے دل میں موسیٰ سے محبت اور وفا کے سوا اور کسی چیز کی جگہ نہیں۔ ایک دن شکار کے دوران اس کی ارسلان سے ملاقات ہوتی ہے ۔ اس موقع پر ارسلان، نوشین اور قتاق خانم کے مکالمے ان تینوں کی شخصیت کو واضح کرتے ہیں ۔ ارسلان کے مکالموں میں دھونس اور بزدلانہ دھمکی ہے، نوشین کے مکالموں میں اس کی شخصیت کی پوری جھلک ملتی ہے ۔ اس کے مکالموں میں وفاداری، خلوص، شرافت اور خود اعتمادی کا گہرا رنگ موجود ہے ۔ ارسلان اور نوشین کے کرداروں کے اس تقابلی جائزے کے لیے ان مکالموں کا درج کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

ارسلان جب نوشین کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ خفیہ طور پر بھاگ چلے تو وہ جواب دیتی ہے :

نوشین : میں اس ذلیل طریقہ سے آزادی نہیں چاہتی ۔ میں ترکن ہوں اور چینی دلہن اور اسی کی ہو سکتی ہوں جو شریفانہ انداز سے بہادری دکھا کے مجھے حاصل کرے ۔ میں چوروں کی طرح لے بھاگنے اور چرا لے جانے کی چیز نہیں ہوں۔ میرا عشق ہے، مجھے چاہتے ہو اور میرے شوق میں بے تاب ہو تو بہادری سے مقابلہ کر کے مجھے لو ۔ اس طرح حاصل کرو جس طرح قوم مغل کے شریف زادے دلہن کو حاصل کیا کرتے ہیں ۔

ارسلان : تم میرے پاس آ جاؤ گی تو پھر میں پوری بہادری دکھا دوں گا اور کسی کی مجال نہ ہو گی کہ تم کو میرے آغوش شوق سے چھین سکے ۔

نوشین : میں اس کو نہیں مانتی ۔ میرے لیے بہادری دکھاؤ ۔ مجھے چوروں کی طرح چرا کے بہادری

دکھائی تو کیا ؟ جس شخص نے ایک دفعہ مقابلہ کر کے مجھے تم سے چھین لیا وہ دوبارہ بھی چھین سکتا ہے ۔ دنیا کو صاف نظر آ گیا کہ موسیٰ تم سے اور تمھارے تمام ساتھیوں سے زیادہ بہادر اور ساری دنیا کے لوگوں سے بڑھ کے زبردست ہے ۔ اس نے مقررہ رسوم کے مطابق مجھے بزور شمشیر تم سے چھین لیا اور میں شرفا کے آئین کے مطابق اس کی ہو چکی ۔ اس کے پاس آنے کے بعد مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ تم سے زیادہ میرا عاشق شیدا ہے ۔ غرض میں اس کی ہو گئی اور وہ میرا ہو گیا اور جو منہ میں اسے دکھا چکی اس کو اب اور کوئی نہیں دیکھ سکتا ۔''

نوشین کی زبان سے یہ جواب سن کے قتلق خانم مبہوت رہ گئی اور اس سے زیادہ حیران ارسلان تھا ، جو چند منٹ کی مضطربانہ حیرت کے بعد بولا ۔ ''تو تم میرے مقابلے میں ایک ناجنس غیر مذہب شخص کو پسند کرتی ہو ۔''

نوشین : ہاں میں اسی کو پسند کرتی ہوں ۔ اس لیے کہ تمھاری بزدلی نے مجھے اس کے ہاتھ بیچ ڈالا اور میں اس کی ہو گئی ۔

شاہزادی کاشغر اور پری جمال لعبت چین کے ان جوابوں کا قتلق خانم پر عجیب اثر پڑا ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ موسیٰ کو چھوڑ کے اپنے گھر جائے اور اپنے ماں باپ سے ملے ۔ نوشین کو بھی وہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی ۔ بولی ''شاہزادی ! سمرقند میں چلنے اور شاہزادہ ارسلان کی محبوبہ بن کے رہنے سے آپ کی جو عزت ترکستان میں ہو سکتی ہے اس عرب سردار کے پاس رہنے میں نہیں ہو سکتی ۔ پھر یہ بھی تو خیال کیجیے کہ وہاں آپ اپنے ماں باپ اور عزیزوں سے مل سکیں گی ۔ اپنے میکے جا سکیں گی مگر یہاں ترمذ میں آپ گھر بار ، ماں باپ ، بہن بھائیوں اور سارے دوستوں اور عزیزوں سے دور اور جدا رہیں گی ۔ یہ آپ کو پسند ہے ؟''

نوشین : تم جو کچھ کہتی ہو سچ ہے مگر اس کا کیا جواب کہ اپنے کیش و آئین اور اپنی قوم و وطن کے رسم و رواج کے مطابق میں موسیٰ کی بیوی ہو چکی اور اب کسی کا مجھ پر حق نہیں ۔ موسیٰ میرے شوہر ہیں اور ان کے سوا اب اور کسی کے پاس رہنا میرے لیے حرام ہے ۔

ارسلان : (برہمی کے لہجے میں) یوں نہ مانو گی تو میں زبردستی تم کو لے جاؤں گا اور قتل و خونریزی کے ذریعہ سے تم کو لوں گا ۔

نوشین : یوں لے سکتے تو اب تک لے چکے ہوتے ۔ اسی کا تو مجھے افسوس ہے کہ تم مجھ کو نہ لے سکے اور جب نہ لے سکے تو اب کیا لو گے ؟

ارسلان : میں سارے ترکستان کو چڑھا لاؤں گا اور ایسی زبردست قوت سے حملہ کروں گا کہ موسیٰ کو نہ ترمذ کے قلعے میں بیٹھتے بنے گی اور نہ بھاگنے کا راستہ ملے گا ۔

نوشین : یہی تمھارے امکان میں ہوتا تو تم ایک دریوزہ گر فقیر بن کے یہاں نہ آتے اور تمھارا یہ ارادہ نہ ہوتا کہ چوروں کی طرح مجھے چرا لے جاؤ ۔

ارسلان : یہ صورت میں نے فقط اس اندیشہ سے اختیار کی کہ علانیہ مقابلہ کروں گا اور ترمذ کا محاصرہ کر کے موسیٰ کو عاجز کروں گا تو میرے دل کو آزار پہنچانے کے لیے وہ تم کو قتل کر ڈالے گا تاکہ میری آرزو ہمیشہ کے لیے خاک میں مل جائے ۔

نوشین : موسیٰ سے ایسی حرکت نہیں ہو سکتی وہ بہادر اور شریف ہے اور تم سے بڑھ کے مجھے چاہتا ہے ۔

قتلق خانم : شاہزادی تم زبردستی الجھ رہی ہو مانا کہ موسیٰ تمھیں قتل نہ کریں گے مگر ہمارے شاہزادے ارسلان جب ایسی قوت سے چڑھائی کریں گے تو تم کو ان کے دست ستم سے چھین لیں گے ۔ اس سے یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خونریزی ہونے سے پہلے ہی ہم تم ان کے ساتھ بھاگ چلیں ۔

نوشین : تم بھاگو میں نہیں بھاگ سکتی ۔ بھاگنے کا لفظ میرے لیے ننگ ہے ۔ میں اسی کی ہوں جو سپہ گری اور دلیری سے مجھے حاصل کرے ۔

قتلق خانم : اس کے لیے بھی تو ہمارے شاہزادے ارسلان تیار ہیں ۔

نوشین : جب ایسی تیاری دکھائیں گے تو دیکھا جائے گا ۔''

اسی طرح کی گفتگو جاری رہتی ہے اور ارسلان کی دھمکیوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ موسیٰ واپس لوٹ آتا ہے۔ اس وقت ارسلان کی بزدلی کا پول کھلتا ہے اور نوشین کے کردار کی عظمت بھی واضح تر ہو جاتی ہے، نوشین، قتلق خاتم کی بے وفائی موسیٰ پر ظاہر نہیں کرتی لیکن بعد ازاں جب قتلق خاتم ارسلان کے لیے جاسوسی کا کام سر انجام دینے لگتی ہے تو نوشین کو مجبوراً موسیٰ کو آگاہ کرنا پڑتا ہے۔

زبان و بیان :

اس ناول کے مکالموں کا ایک نمونہ سطور بالا میں درج کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکالمے کرداروں کی شخصیت سے ہم آہنگ ہیں اور ان کی شخصیت کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ انداز بیان سلیس ہے لیکن جہاں کہیں مرقع کشی اور منظر نگاری کے مواقع شرر کو ملے ہیں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں مرقع کشی کی ہے۔ اس کی مثالیں پہلے باب، دوسرے باب اور آخری دو ابواب میں ملتی ہیں۔ اس ناول میں مرقع کسی اور منظر نگاری کے زیادہ مواقع انہیں نہیں ملے۔

لعبت چین کو بحیثیت مجموعی شرر کے دوسرے درجے کے ناولوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس ناول میں اُن کا فن چنداں نکھرا ہوا نہیں ہے۔

۲۰- عزیزہ مصر

پلاٹ :

عزیزہ مصر کا پلاٹ مختصر اور اکہرا ہے۔ واقعات کا خلاصہ چوتھے باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔ ناول کا پلاٹ صرف اسی قدر ہے کہ احمد بن طولون جب والی مصر مقرر ہوا تو ابن مبرد مصر کا حاکم خراج تھا۔ وہ بہت ظالم اور بدکار شخص تھا۔ اس نے ابن طولون کو مٹھی میں لینے کے لیے اپنے سابق آقا اور مصر کے سابق والی منصور کی بیوی جولیانا کو طلب کرکے روپے کا تقاضا کیا، سخت کلامی ہوئی۔ جولیانہ کو اس نے قید کرا دیا لیکن چند لمحوں بعد ابن طولون نے جولیانہ کو برآمد کرا لیا اور اپنے بیٹے خمارویہ کی نگرانی میں آسے اس کے گھر بھیج دیا اور ابن مبرد کو عوامی حراست میں دیتے ہوئے ایک تاجر ابوالحوقل کے سپرد کر دیا۔ خمارویہ پہلی ہی ملاقات میں عزیزہ مصر کا شیدائی ہو گیا۔ اس نے اپنے مصاحبوں کے ذریعے خفیہ طور پر ابن مبرد کو اس شرط پر آزاد کرا دیا کہ وہ منصور کی گرفتاری اور جولیانہ سے خمارویہ کی شادی کا اہتمام کرے گا۔ ابن مبرد نے آزاد ہوکر بغداد سے امداد حاصل کرکے ایک رات جولیانہ کے قصر پر حملہ کیا اور آسے اُس کی کنیزوں سمیت گرفتار کر لے گیا۔ منصور بچ نکلا۔ ابوالحوقل جولیانا کو لے کر مصر واپس پہنچا کیونکہ ان کے مخالفین کے ایک گروہ نے موقع پا کر ابن مبرد کو قتل کر دیا تھا۔ اس دوران ابن طولون کا انتقال ہوگیا اور خمارویہ والی بن گیا۔ خمارویہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود جولیانا کی محبت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اس دوران ابن مبرد کے قاتلوں نے منصور کو افریقہ میں ڈھونڈ نکالا۔ خمارویہ کو عساکر خلافت سے ایک جنگ لڑنی پڑی جس میں آسے فتح حاصل ہوئی۔ فتح کے بعد اس نے جشن منایا اور اسی شب جولیانا سے زبردستی نکاح پڑھوا لیا لیکن حجلۂ عروسی میں جولیانا کی بجائے خمارویہ کی ایک کنیز

جو جولیانا کی ہمدرد بھی جولیانا کے روپ میں تھی جس نے موقع پا کر خماریہ کو قتل کر دیا۔ کنیز قہرمانہ اور جولیانا غلاموں کے لباس میں لشکرگاہ سے باہر نکل آئیں جہاں منصور اور من کے ساتھی اُن کے منتظر تھے۔ اس طرح خماریہ اور ابوالحوقل کے قتل پر یہ قصہ ختم ہو گیا۔

شرر نے پلاٹ میں دلچسپی اور تجسس پیدا کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے بعض واقعات میں ڈرامائیت بھی پیدا کی ہے اور بعض ضمنی واقعات کو بھی پلاٹ کے ساتھ شامل کیا ہے۔ انھوں نے خوبصورت مرقعوں اور جزئیات کے بیان کے ذریعے بھی ناول کو پر کشش بنایا ہے۔ ناول میں بلاٹ کے بعض موڑ اتفاقات کے مرہون منت ہیں، مثلاً جولیانا کی گرفتاری کے موقع پر ابن طولون کا آ جانا، ابن مبرد کے قاتلوں کا مصر لوٹنا لیکن راستے میں انھیں ابن طولون کا جنازہ نظر آنا، بیت المقدس میں ابن مبرد کے قاتلوں کا ایک راہب سے معلومات حاصل کرنا وغیرہ۔

کردار :

"عزیزہ مصر" کے کرداروں میں احمد بن مبرد، اس کے مصاحبین سفبان اورکیدر، قحطبہ حاجب، جولیانا، منصور، احمد بن طولون، خماریہ، اس کا مصاحب جمیل، ابن دغنہ کوتوال، ابوالحوقل، اس کا غلام کافور، باغر، وصیف، یحییٰ بن موسیٰ حبرانی حاکم عسقلان، ابوالہول، ابن الغلیون، ابن شمسون، قہرمانہ، ابوالعساکر بن خماریہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی تاریخی شخصیتوں کے نام ناول کے تاریخی پس منظر میں بیان ہوئے ہیں۔

ابن مبرد امیر خراج ایک ظالم، ہوس پرست، حریص، احسان فراموش اور کمینہ فطرت شخص ہے۔ پہلے چار ابواب میں اس کی شخصیت کے بہت سے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ پہلے باب میں شرر نے اس کے سراپا اور حرص کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے :

"ایک پچاس برس کا مغرور و متکبر شخص عجمی ریشمی قالین پر عجب و نخوت کے انداز سے زرنگار گاؤ تکیے سے لگا بیٹھا ہے۔ یہ ایک حبشی خط و خال کا سیاہ فام بڈھا ہے۔ گنجے سر پر زریں عمامہ ہے جس کی بندش قدیم‌الایام کے ساسانی وزرائے عجم کے عماموں کی سی ہے۔ غیر مسطح اور پرشکن پیشانی کے نیچے چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہیں جو نیچے دیکھتے وقت گداز اور بھرے بھرے پپوٹوں میں اس طرح چھپ جاتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے بند ہیں لیکن جب وہ انھیں کھول کے کسی کی طرف گھورنے لگتا ہے تو اُن سے یک بیک سنگدلی، شقاوت، کیادی، بے وفائی، نفس پروری، بدکاری اور حرص و طمع کے جذبات ایسی بری طرح نمایاں ہو جاتے ہیں کہ دیکھنے والے ڈرنے لگتے ہیں۔ حبشی خون کی آمیزش کے ثبوت میں ناک پھیلی اور بیٹھی ہوئی ہے اور ہونٹ موٹے ہیں۔ ڈاڑھی مونچھوں کے بل کھائے ہوئے بالوں میں نیل کا خضاب ہے جس کی سیاہی میں روغن بلسان نے چمک پیدا کر دی ہے۔ حریر سبز کی رومی قبا اس کے جسم میں ہے، کمر میں مرصع و مغرق پٹکہ ہے اور اس میں ایک پیش قبض گھرسی ہوئی ہے۔

اس کے قریب مگر قالین کے باہر دو خوشامدی مصاحب بیٹھے ہیں جو اس کی ہاں میں ہاں ملاتے اور اس کی بدکاری و حرص کے جذبات کو بڑھاتے رہتے ہیں اور ان مصاحبوں کے پیچھے دونوں جانب پچاس پچاس نوعمر و نوخیز خوبرو کمان ابرو ترکی غلام سروں پر آسمانی رنگ کے زرنگار شملے باندھے، کانوں میں بڑے بڑے موتیوں کے گوشوارے ڈالے، حریر سرخ کے لمبے لمبے دامنوں کی قبائیں پہنے، چوڑے چوڑے مطلا و مرصع پٹکے باندھے اور بھاری بھاری فولادی گرز شانوں سے لگائے، جن کی چوٹیوں پر نقری لٹوہیں، خاموش و مؤدب کھڑے ہیں۔ یہ سو ترکی غلاموں کا دلکش اور رعب ڈالنے والا گروہ اس شخص کو بہت ہی عزیز ہے۔

ان دنوں اس کی بدکاریوں اور سخت گیریوں سے رعایا سخت نالاں ہے - اس گھڑی اس کا منہ دریائے نیل کی طرف ہے . . . . (وہ دریا میں چلنے والی کشتیوں کو دیکھ کر کہتا ہے) ''دیکھتے ہو یہ کشتیاں کس آزادی کے ساتھ بے روک ٹوک یہاں سے گزر جاتی ہیں - میرا زور چلتا تو ان میں سے ایک بھی جب تک مقررہ شرح محصول سے چوگنی رقم نہ ادا کرتی نہ جانے پاتی . . . . ابھی تک یہاں کے والی مزاحم تھے جن کے منہ پر میں ایک اذیت رساں زخم کی طرح ہمیشہ روپے کا پھاہا چڑھاتا رہا . . . . ابن طولون کو ایک لاکھ دینار نذر کرنے کا وعدہ کر لوں . . . . تو اسی خوبصورت عزیزہ مصر جولیانا سے جس کے رگ و پے میں روم و قبط کے شاہی گھرانوں کا خون دوڑ رہا ہے اس (   ) کی آتش ہوس بجھائی جا سکتی ہے - اس کی عمر ابھی چودہ سال سے زیادہ نہ ہوگی ، اور جو دلربائیاں اس میں ہیں ، شام و مصر کی کسی لڑکی میں نہیں ہو سکتیں - . . لوگ مجھے ظالم اور سخت گیر کہتے ہیں ، ہر شخص کی زبان پر ہے کہ میں نے ملک کو لوٹ لیا ، مگر میری مجبوریوں کو کوئی نہیں دیکھتا . . . رعایا سے جس قدر میں نے وصول کیا آج تک کوئی نہیں کر سکا تھا - مگر بقول تمھارے یہ میری خوش انتظامی اور خوش تدبیری کی برکت ہے، ورنہ کوئی جان کے روپیہ نہیں چھوڑتا . . ''

اس طرح پہلے باب میں کچھ تو شرر کی زبانی اور کچھ خود ابن مبرد کی گفتگو سے اس کا کردار اور شخصیت بہت حد تک واضح ہوتی ہے - دوسرے باب میں جہاں ابن مبرد کے کردار پر مزید روشنی پڑتی ہے وہاں عزیزہ مصر جولیانا کے کردار کی صفات بھی نمایاں ہوتی ہیں- ابن مبرد عزیزہ مصر کو طلب کرتا ہے اور اس کے آنے سے پہلے اپنے حواریوں سے کہتا ہے :

. . . . اس عورت کو سامنے لاؤ ، اس کے پھول سے رخسارے اور اس کی فتان اور نرگسیں آنکھیں دیکھنے کے قابل ہیں - (مصاحبوں سے) تم سب اسے دیکھ کر خوش ہو گے . . . . آج موقع ہے کہ میں اس عورت کو جو کبھی شب و روز مجھے ڈانٹا ڈپٹا کرتی تھی ، ذلیل کروں اور اس طرح ڈپٹوں اور گھر کوں جس طرح اپنے زمانہ حکومت میں وہ مجھے برا بھلا کہتی تھی اور لطف یہ کہ اس سے اچھی سونے کی چڑیا ہاتھ نہیں آئی کی -''

ابن مبرد کی یہ گفتگو اس کی کمینہ فطرتی اور کور نمکی کی مظہر ہے - جولیانا کے آ جانے پر ان دونوں کے مابین اس طرح گفتگو ہوتی ہے :

ابن مبرد : ''خوبصورت نازنین تم حسینہ و جمیلہ بھی ہو اور دولتمند بھی ، واقعی عزیزہ مصر ہو -''
جولیانا نے حیرت سے اپنے مغرور غلام کی صورت دیکھی ، اس کے الفاظ سن کر نقش حیرت بن گئی ، پھر تمام جذبات کو دل میں دبا کر بولی ''خیر یہ تو معلوم ہو کہ مجھے کیوں بلایا ہے -''

ابن مبرد : ''ہاں میں بھول گیا تھا تم اگلے خاندان شہریاری مصر کی شاہزادی اور خلافت کے گھرانے کی بہو ہو -'' یہ کہہ کر تمسخر کے انداز سے ہنسا اور کہا ''پری رخ عزیزہ مصر میرے پاس آؤ اور برقعہ اتار کر مجھے اپنا رخ زیبا دکھاؤ -''

وہ بجائے قریب جانے کے فاصلے پر بیٹھ گئی اور جوش کی آواز میں پوچھا : ''کیا یہ میری شرافت اور عزت مجھے بے آبرو کرنے کے لیے بیان کی گئی اور ابن مبرد سا ذلیل فرومایہ حبشی غلام مجھے اپنے پاس بٹھا کر میری صورت دیکھے گا -''

ابن مبرد : خدا کی قسم میں اس سخت کلامی کو نہیں برداشت کر سکتا -

جولیانا : میری زبان سے یہ الفاظ تیرے لیے نئے نہیں ہیں ، مگر میں دیکھتی ہوں کہ تو اپنی ہستی بھول گیا ہے ، اگر تجھے اپنی موجودہ آزادی اور عہدہ داری کا غرہ ہے تو سن لے کہ جو جیسا کہے گا ویسا سنے گا -

ابن مبرد : تم نہیں دیکھتیں کہ میرے بس میں ہو اور قید ہو کر میرے سامنے آئی ہو -

جولیانا : (کمال غیظ و غضب سے) قید ! تیری بھی اتنی مجال ہوئی کہ مجھے قید کر لے - تیرے آدمیوں کی کیا طاقت تھی کہ مجھے زبردستی لاتے . . . .

ابن مبرد : (سفیان کی طرف دیکھ کر) یہ تو تکار کے ساتھ نہایت گستاخی اور بے ادبی سے بات کرتی ہے تو پھر میں بھی اسی لہجے میں جواب دیتا ہوں، تم لوگ جانتے ہو کہ میں کوئی ذلیل شخص نہیں۔ مصر کا عہدہ دار خراج ہوں ۔

اس کے بعد وہ منصور کی گرفتاری کی دھمکی دیتا ہے تو جولیانا کہتی ہے : ''اگر ان کو پا سکتا ہے اور تیری اتنی مجال ہے کہ ان کو اسیر کرے تو پھر تامل کیا ہے ۔''

ابن مبرد : پھر وہی توہین و تحقیر کے کلمات ، تیرے حسن و جمال اور تیری شرافت کا جو پاس لحاظ کیا جاتا ہے تو تو اور شیر ہوئی جاتی ہے کیا ان ترک نوجوانوں سے بھی تو نہیں ڈرتی جو گرز لیے کھڑے ہیں کہ دریدہ دہن گستاخ کا سر پاش پاش کر دیں ۔

جولیانا : ایسے تماشی جلوس پر تجھ ذلیل و فرومایہ غلام کو غرہ ہو سکتا ہے ۔ میں ایسے بہت سے تماشے دیکھ چکی ہوں ۔

پھر ابن مبرد مختلف طرح کی دھمکیاں دے کر روپے کا مطالبہ کرتا ہے اور جب سب رائیگاں نظر آتی ہیں تو جولیانا کو لونڈی بنا کر ابن طولون کے حوالے کرنے کی دھمکی دیتا ہے ۔ اس پر جولیانا طیش میں آ جاتی ہے اور نیمچے کے وار سے ابن مبرد کا ایک کان اڑا دیتی ہے ۔ اتنے میں ابن طولون کی آمد کی اطلاع ہوتی ہے تو ابن مبرد گھبراہٹ کے ساتھ کہتا ہے : غضب ہو گیا ، یہ ظالم بہت برے وقت آیا ۔ اچھا فوراً اس عورت کو نیچے لے جا کے نیچے والے تہہ خانے میں بند کر دو ، اس میں قفل ڈال دو ، دیکھو خبردار بھاگنے نہ پائے ۔ جس کے پہرے میں سے نکل گئی اس کو قتل کے سوا اور کوئی سزا نہ ہو گی اور ہاں میرے کان پر بھی پٹی باندھ دو ۔'' (دوسرا باب)

اسی باب میں ابن طولون کی شخصیت کے بعض پہلو بھی نمایاں ہوتے ہیں ۔ ابن طولون اور ابن مبرد کی گفتگو سے ایک طرف ابن مبرد کا کردار مزید کھل کر سامنے آتا ہے اور دوسری طرف ابن طولون کی منصف مزاجی، رعایا پروری، شرافت اور پاکبازی کی صفات اجاگر ہوتی ہیں ۔ ان دونوں کے درمیان گفتگو کا ایک اقتباس درج ذیل ہے :

ابن طولون : (ناچتی ہوئی کنیزوں کی طرف اشارہ کرکے) اب ان چیزوں کو ہٹائیے مجھے ان کا شوق نہیں ۔

ابن مبرد : (ابن طولون کے شراب سے انکار پر) ایں آپ نبیذ نہیں پیتے ۔ فقہائے عراق نے تو اس کی حلت کا فتویٰ دیا ہے ۔

ابن طولون : میرے نزدیک اس میں سکر ہے اور مسکر چیز نہ علمائے عراق حلال بتا سکتے ہیں اور نہ کوئی اور ۔

ابن مبرد : مگر حکمرانی کے ساتھ ایسے اتقا کا نبھنا ذرا دشوار ہے ۔

امیر : خدا توفیق دے تو سب باتیں نبھ جاتی ہیں ۔

ابن مبرد : خیر اب ارشاد ہو رعایائے مصر کو آپ نے کیسا پایا ۔ ان لوگوں میں شورش اور سرکشی کا مادہ بہت ہے ۔

امیر : میری رائے تو یہ ہے کہ کہیں کی رعایا ہو شورش و بغاوت ہمیشہ حکام کے غلط طرز عمل سے ہوا کرتی ہے ۔ حکام اگر ان کی شکایتوں کو وسیع الخیالی سے سنیں اور ان کے جذبات و خواہشات کا خیال کریں تو رعایا سے ہرگز سرکشی نہیں ہو سکتی ۔ حضرت عمر فاروق رضؓ کا معمول تھا کہ رعایا کی شکایت پر اچھے سے اچھے والی کو ہٹا دیتے تھے مگر اب خرابی یہ ہو گئی ہے کہ سلطنت اپنے والیوں کے سوا اور کسی کی آواز نہیں سنتی اس سے ناراضی پیدا ہوتی ہے اور رعایا کو جب موقع ملتا ہے حکومت کا جوا گردن سے اتار کر پھینک دیتی ہے ۔

ابن مبرد : یہ آپ نے عجیب بات فرمائی ۔ اگر رعایا کی آواز پر حکومت اپنے والیوں اور عہدہ داروں کو ہٹا دیا کرے تو چند ہی روز میں رعایا ایسی شیر ہو جائے کہ اس پر حکومت کرنا دشوار ہو جائے ۔

امیر : مگر حکومت کیا چیز ہے شاید آپ کے نزدیک شداد و نمرود اور فرعون و ہامان کی طرح لوگوں

سے اپنی پرستش کرانا اور ان کو بجبر اپنا غلام بنائے رکھنا حکومت ہے ۔ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں شاید ایسی ہی ہوں گی مگر اسلامی خلافت کی اصطلاح میں تو امارت رعایا کی سرداری نہیں خدمت گزاری و حفاظت کا نام ہے ۔ ہمارا تو شعار یہ ہے کہ سید القوم خادمہم ، اور اس خیال سے ہمارے خلفا کو پہلے رعایا کی آواز سننی چاہیے ، پھر والی ملک کی ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ رعایا کی شکایت سنتے ہی بے سوچے سمجھے والی معزول کر دیے جائیں ۔ مگر ہاں رعایا کی فریاد و شکایت پر پوری طرح آزادی و غیر جانبداری سے تحقیقات کی جائے اور جیسا ثابت ہو ویسا کیا جائے ۔

ابن مدبر : خیر آپ والی ملک ہیں ۔ آپ سے شاید یہ طرز حکمرانی نبھ سکے ، مجھ سے تو غیر ممکن ہے ، میں اس اصول پر عمل کروں تو نہ جزیے کی ایک کوڑی وصول ہو اور نہ خراج کی ۔

امیر : ہاں میں نے سنا ہے کہ آپ سرکاری رقموں کے وصول کرنے میں رعایا پر سختی کرتے ہیں ، جس کو میں اپنے زمانے میں ایک گھڑی کے لیے بھی گوارا نہ کروں گا ۔ یہ بھی در اصل سلطنت کی غلطی ہے کہ افسران مال کو حاکمانہ اقتدارات دے دیے ہیں ، جس کے نتیجے میں بے انتہا مظالم ہوتے ہیں ۔ حکومت یا عدالتی اقتدارات کو فقط والی اور اس کے ماتحت عہدیداروں قاضیوں اور محتسبوں تک محدود رہنا چاہیے ۔ افسران مال کو اگر رعایا سے غیر وصولیابی کی شکایت ہو تو ان کو انہیں حکام عدالت کے اجلاس میں چارہ جوئی کرنی چاہیے ، اور میرا یہی طرز عمل رہے گا ۔

ابن مدبر : (گھبرا کے) تو پھر مجھ سے کام نہ ہو سکے گا ۔

امیر : مضائقہ نہیں ، جتنے عہدیداران مال بغیر جبر و تشدد کے وصول نہ کر سکیں ان کو اپنی خدمت سے سبکدوش ہو جانا چاہیے تاکہ ان کی خدمتیں ایسے لوگوں کو دی جائیں جو بغیر سختی کے وصول کرنے کا اقرار کریں ۔

ابن مدبر : مگر آپ کو کم از کم مجھے اس سے مستثنیٰ کرنا پڑے گا اس لیے کہ میرا تقرر خاص امیر المومنین کی منظوری سے ہوا ہے ۔

امیر : میں بھی جو کچھ کروں گا امیر المومنین کی منظوری اور اجازت سے کروں گا ۔ اپنی طرف سے نہ کروں گا ۔

ابن مدبر : مگر اس معاملہ میں آپ غلطی پر ہیں ۔ رعایائے مصر کو دیکھ کر آپ کو خود ہی اپنی رائے بدلنی پڑے گی . . . . ابھی آپ اس اصول پر عمل کرنے میں جلدی نہ کریں ۔ میں دو ہی چار روز میں حاضر ہو کر وہ نذرانہ کی رقم بھی پیش کروں گا جو ہر والی مصر کی خدمت میں ان کے ورود کے وقت پیش کرتا رہتا ہوں ۔

امیر : (ہنس کر) آپ کتنا نذرانہ ہر والی کو دیتے ہیں ۔

ابن مدبر : اوروں کو تو کم ہی دیا ہے مگر آپ کے لیے میں نے ایک لاکھ دینار کا بندوبست کیا ہے ۔

ابن طولون : ایک لاکھ دینار (ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کے) یہ رقم آپ کے پاس موجود ہے ۔

ابن مدبر : موجود تو نہیں مگر دو ایک روز میں فراہم ہو جائے گی ۔

امیر : کہاں سے ؟ دو ہی صورتیں ہیں یا آپ سرکاری روپیہ سے مجھے دیں گے اور یا رعایا سے بجبر وصول کریں گے ۔

ابن مدبر : آپ کو اس سے کیا بحث ۔ مجھے جہاں سے ملے گا لا دوں گا ۔

ابن طولون : (نہایت متین صورت بنا کے) بے شک مجھے آپ کے انتظامات میں دخل دینے کا حق نہیں ہے مگر دربار خلافت کو اس کی اطلاع تو کرنی ہے کہ آپ کا کیا طرز عمل ہے اور رعایا کے ساتھ آپ کیسا سلوک کر رہے ہیں ۔

ابن مدبر : (ذرا عاجزانہ انداز سے اور ابن طولون کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے) ہم دونوں کو اتفاق و یکجہتی سے رہنا چاہیے اور اسی رقم پر منحصر نہیں میں وقتاً فوقتاً اور خدمت بھی کرتا رہوں گا یا آپ کو اصرار ہو تو اسی نذرانے کو دونا کر دوں ۔

ابن طولون : جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ آپ مجھے یہ رقم کہاں سے فراہم کر کے دیں گے میں کسی

نذرانے کو نہیں قبول کر سکتا ۔ (دوسرا باب)

اس کے بعد تیسرے باب میں ابن طولون اور بلوائیوں کے مکالموں سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی امیرانصاف پسند ہے اور چوتھے باب میں اس کا فیصلہ اس کی رعایاپروری اور دانشمندی کا مظہر ہے ۔ اسی طرح چودہویں باب میں امیر کی نیک دلی اور انسان دوستی کا مظاہرہ ہوتا ہے جب وہ خمارویہ کو یہ سمجھاتا ہے کہ انسانوں کوشیروں کا شکار بنانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی ۔ ابن طولون ایک اچھا منتظم، دانشمند اور شجاع حاکم تھا ۔

خمارویہ کے کردار میں تدریجی ارتقا ہے ۔ وہ چوتھے باب میں جولیانا کے حسن کو دیکھ کر متاثر ہوتا ہے لیکن خاموش رہتا ہے ۔ اس کے اندر مسلسل کشمکش جاری ہے، وہ ایک شادی شدہ شریف عورت پر بری نظر ڈالنا گناہ سمجھتا ہے ۔ اُسے جولیانا کی خاندانی عظمت کا بھی پاس ہے ۔ وہ باپ کی پر شکوہ حکومت اور دبدبے سے بھی خائف ہے لیکن اس کا بد باطن، شریر مصاحب جمیل اُسے ان جملہ باتوں پر آمادہ کرتا ہے ۔ خمارویہ کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر وہ اُسے بھکاتا ہے ۔ جمیل انتہائی سازشی ذہن کا مالک ہے ۔ ساتویں باب میں اس سے پہلی بار ملاقات ہوتی ہے ۔ آٹھویں نویں دسویں اور گیارہویں باب میں جمیل چھایا ہوا ہے ۔ تیرہویں باب میں وہ خمارویہ کو اپنے ڈھنگ پر لے آتا ہے ۔ اور پھر خمارویہ کاکردار ارتقا کے مرحلے طے کرتے کرتے اس منتہیٰ تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ جولیانا سے زبردستی نکاح کر لیتا ہے ۔ فنی ارتقا کے نقطہ نظر سے خمارویہ کا کردار اچھا نمونہ ہے ۔ عزیزہ مصر کا کردار اپنی استقامت اور پاک دامنی کے باعث آخر تک ناول میں ابھرا ہوا ہے، وہ ایک وفا شعار بیوی ہے جس کی وفا کسی قیمت پر نہیں خریدی جا سکتی ۔

دیگر کردار نوعی نوعیت کے ہیں اور کسی خاص جذبے کی عکاسی کرتے ہیں ۔

زبان و بیان :

اس ناول کے مکالمے اچھی مکالمہ نگاری کی مثال ہیں ۔ ہر کردار کی شخصیت اس کے مکالموں میں نمایاں ہے ۔ مکالمے نہ صرف موقع محل اور کرداروں کی شخصیت سے ہم آہنگ ہیں بلکہ پلاٹ کی پیش رفت میں بھی خصوصی طور پر معاون ثابت ہوتے ہیں ۔ مکالموں کی بہت سی مثالیں کردار نگاری کے ضمن میں سطور بالا میں آ چکی ہیں ۔

ناول میں منظر نگاری کے بھی عمدہ نمونے ہیں ۔ ابن مبرد کے غلاموں کی شان و شوکت ابن طولون کے دربار کا منظر، جولیانا کے قصر کا منظر، خمارویہ کے پارے کے حوض اور باغ کا منظر، اس کے پالتو شیروں کے مرقعے وغیرہ ۔ راہبوں اور راہبات کے جلوس کا منظر بھی پوری جزئیات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور کافی جاذب نظر ہے ۔

۲۱۔ جویائے حق

پلاٹ :

جویائے حق اپنے پلاٹ اور قصے کے اعتبار سے اپنے دور کے ناولوں میں ایک انفرادیت رکھتا ہے ۔ شرر نے مختلف النوع موضوعات اور کم و بیش پچاس ساٹھ برس کی اسلامی تاریخ، عرب کی معاشرت، سیاسی حالات اور آنحضرتؐ کی سیرت کو فنی ہنروری اور چابکدستی سے اس ناول

میں سمویا ہے - مختلف النوع موضوعات اور خصوصاً ہزاروں مربع میل پر بکھرے ہوئے مختلف قبائل کی برسوں کی تاریخ کو ایک لڑی میں پرو دینا اور وہ بھی اس رنگ میں کہ ناول کی فنی تکنیک کے علاوہ پلاٹ کا ارتقا اور قاری کی دلچسپی برقرار رہے انتہائی مشکل اور آزمائش کا کام ہے - شرر ان ذمے داریوں سے ایک فن کار اور مورخ کی حیثیت سے کماحقہ عہدہ برا ہوئے ہیں۔

حضرت سلمان فارسیؓ، بحیرا اور استفانوس کی شخصیتیں اس ناول کے پلاٹ میں ربط اور ارتقا کا کام کرتی ہیں - نیز اگر اس ناول کے لیے خطوط کا انداز اختیار نہ کیا جاتا تو اس کی دشواریاں اور بھی بڑھ جاتیں - ناول نگار کو ایک تو واقعات کے بیان میں ان کی زمانی تاریخی ترتیب کا پابند ہونا پڑتا اور دوسرے ہر ہر قدم پر اس کا امکان ہو سکتا تھا کہ ناول نگار دلچسپی کے عنصر کو کھو بیٹھے - علاوہ ازیں دوسری صورت میں اس امر کا خدشہ بھی رہتا کہ جہاں ناول نگار اسلامی تاریخ سے ہٹ کر کسی قبیلے کا تاریخی پس منظر بیان کرتا ناول کا پلاٹ معدوم ہونے کی حد تک مخدوش ہو جاتا، لیکن موجودہ صورت میں پلاٹ کے ارتقا کو مذکورہ شخصیتوں کے ساتھ اس طرح منسلک کیا ہے کہ ہر قسم کے واقعات کے بیان کی گنجائش نکل آئی ہے اور تاریخی واقعات اس جواز کے ساتھ آگے پیچھے بیان ہوئے کہ کچھ تو سلمان فارسیؓ کو اپنی غلامی کے زمانے میں مختلف جگہوں کے باشندوں سے مختلف اوقات میں معلوم ہوتے رہے اور کچھ بحیرا اور استفانوس کو مختلف ذرائع سے ان کی معلومات کے مطابق پتہ چلے - شرر نے اس ناول میں پلاٹ کے سلسلے میں ایک نیا تجربہ کیا ہے اور اس میں وہ کامیاب رہے ہیں -

کردار:

ناول کے کرداروں میں سلمان فارسیؓ کا کردار نمایاں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ سے بحث یہاں نہیں اٹھائی جاتی - آپ کی سیرت کا بیان بھی اس ناول میں ہمارے سامنے زیادہ تر سلمان فارسیؓ کی زبانی ہے - اس لیے اس ناول کا نام سلمان فارسیؓ کی جستجوئے حق کی مناسبت سے "جویائے حق" ہی زیادہ موزوں رہا ہے - حضرت سلمان فارسیؓ کے کردار میں حق کی جستجو کے لیے پامردی، مستقل مزاجی، اور لگن کا عنصر سب سے زیادہ نمایاں ہے - حق کی جستجو میں وہ کڑے سے کڑے مراحل سے گزرے، در در اور شہر شہر کی خاک چھانی، ریاضتیں کیں، جن لوگوں کو خدا رسیدہ سمجھا برسوں ان کی خدمت کی، جہاں کہیں راہ نجات ملنے کی توقع ہوئی، گرتے پڑتے وہاں پہنچے، ضعیفی میں بھی سینکڑوں میل کے صحرائی سفر پر کمر ہمت باندھی، پیرانہ سالی میں بھی غلامی اور بالخصوص یہود کی غلامی کی سختیاں سہیں، لیکن حق بات کہنے اور حق کا جویا رہنے سے منہ نہ موڑا - ان کا استقلال اور سچا جذبہ ہی بالآخر انھیں منزل مقصود تک پہنچانے کا باعث بنا۔

حضرت سلمان فارسیؓ سے ناول میں ہماری پہلی ملاقات بصریٰ میں بحیرا کی خانقاہ کے باہر ہوتی ہے - شرر ان کا سراپا اور شان بےنیازی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"اتنے میں ایک نیا شخص جو کہیں دور کے سفر سے گرمی کا مارا اور لوہ کے لوگوں سے جھلسا ہوا چلا آتا ہے، ایک خرجین کندھے پر ڈالے ہانپتا اور پسینہ پوچھتا ہوا اس باغ میں داخل ہوا . . . . ایک بڑے بھاری زیتون کے درخت کے نیچے جا کے خرجین کندھے سے اتار کر زمین پر رکھی، کمر سے ایک کمبل کھول کے بچھایا، نعلین یعنی چمڑے کے تلے جو کھڑاؤں کی طرح تسموں کے ذریعے پاؤں میں اٹکا لیے جاتے تھے، اتار کے اور جھاڑ کے درخت کی جڑ میں رکھ دیے اور کمبل پر خاموش بیٹھ گیا۔ یہ ایک

بہت ہی سن رسیدہ اور معمر شخص ہے ۔ سفید گھنی ڈاڑھی ناف تک پہنچی ہوئی ہے جس نے چہرے کی سفید کھلتی رنگت میں غیر معمولی نورانیت پیدا کر دی ہے ۔ اپنے بڑے سفید بالوں کو اس نے جوگیوں کی طرح لپیٹ کے اور بل دے کے اُن سے چندیا پر ایک جوڑا سا بنا لیا ہے اور پھر اس جوڑے کو ایک سیاہ عمامے میں چھپا لیا ہے جس کے نیچے سیاہ اور چمکنے والی آنکھیں اس کی روحانی قوت اور سچی جستجو کا ثبوت دے رہی ہیں ۔ گلے میں انطاکیہ کے دبیز گاڑھے کا ڈھیلا ڈھالا زرد کرتہ اور پاؤں میں دمشقی ٹاٹ کا تہمد ، اس کے چہرے سے ریاضت کے جلال کے ساتھ بلا کی متانت ظاہر ہوتی ہے . . . . (راہب کے آنے پر بھی بے توجہی برتی تو) آخر راہب نے اپنے انتظار میں تھک کے خود ہی سوال کیا ''کیا آپ یہاں ٹھہریں گے ؟'' (ذرا تامل سے) ہاں جہاں ٹھہرنا تھا ٹھہر گیا ۔ راہب : یہ تو ٹھہرنے کی جگہ نہیں مہمان خانے میں چل کر ٹھہرے ۔ جواب : کیا یہاں ٹھہرنے کی ممانعت ہے ۔ راہب : ممانعت تو نہیں مگر آپ کو تکلیف ہوگی ۔ جواب : مجھے تکلیف نہ ہوگی ۔ راہب : اچھا تو کھانے پینے یا کسی چیز کی ضرورت ہو تو حاضر کروں ؟ جواب : کسی چیز کی ضرورت نہیں . . . . راہب نے پھر کچھ سوچ کر : آپ کا وطن کہاں ہے ؟ جواب (کمال لاپروائی سے) : یاد نہیں ۔ سوال : اور ارادہ کہاں کا ہے ؟ جواب : معلوم نہیں ۔''

اس ابتدائی تعارف سے ہی حضرت سلمان فارسیؓ کی شخصیت کے یہ پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہر چیز سے بے پروا، اپنی کسی فکر میں غلطاں، کسی لگن میں منہمک ہیں ۔ ان پر خود فراموشی کی کیفیت غالب ہے اور جسمانی آسائش و راحت سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں ۔

اس ناول میں مذکور دیگر عظیم تاریخی شخصیتوں صحابہ کبار حضرت ابوبکر صدیقؓ ، حضرت عمر فاروقؓ ، حضرت علیؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ اور دیگر سپہ سالاران اسلام کی شخصیات سے متعلق بحث میں جانا ہم غیر ضروری تصور کرتے ہیں ۔ ان سے متعلق ناول میں بیان کردہ واقعات اُن کی شخصیات کو اسی طرح اجاگر کرتے ہیں جو پہلے سے ایک صحیح عقیدہ رکھنے والے مسلمان کے تصورات میں موجود ہیں ۔ ان شخصیات کے علاوہ اس ناول میں سینکڑوں کردار آئے ہیں جن میں دشمنان اسلام بھی ہیں اور جان نثاران شمع رسالتؐ بھی ۔ مہاجرین اول و انصار بھی اور منافق و فتنہ پرور یہود بھی ۔ ان جملہ کرداروں سے اگر اختصار سے بھی بحث کی جائے تو بھی ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے ۔ ناول کے اعتبار سے شرر نے بحیرا، استفانوس، شمعون ہرڈویہ، سفانہ بنت حاتم، اور عدی بن حاتم طائی کے کرداروں کو زیادہ اجاگر کیا ہے اور یہ کردار اپنی شخصیتوں اور معاشرتی پس منظر کے ساتھ زندہ کردار دکھائی دیتے ہیں ۔

ناول میں چونکہ بیشتر حصہ جنگوں سے یا عربوں کی معاشرت سے متعلق ہے اس لیے مرقع کشی کے مواقع بکثرت موجود تھے اور شرر نے زیر نظر ناول کی تکنیک کے مطابق انھیں خوبصورتی سے پیش کیا ہے ۔ بحیرا کی خانقاہ کا محل وقوع اور منظر، بصریٰ کی گہما گہمی، بحیرا کی خانقاہ پر سالانہ مذہبی میلہ، صحراؤں میں کاروانوں کا سفر، میدان کار زار میں معرکہ آرائیاں، غزوات وغیرہ ہر جگہ ان مرقعوں میں حقیقت، رنگینی اور تابناکی موجود ہے ۔

۲۲۔ طاہرہ

پلاٹ :

طاہرہ کا پلاٹ شرر کے دیگر ناولوں کے پلاٹ کی نسبت سیدھا سادا ہے ۔ اس میں نشیب و فراز کی زیادہ بہتات نہیں، اگرچہ تجسس کا اتنا عنصر ضرور موجود ہے کہ ناول کے پڑھنے کے لیے

قاری کا تجسس بیدار رہے - پہلے باب میں ایک آٹھ سالہ بچے کا رسالہ نادری کا رسالدار بننے کا واقعہ دلچسپی رکھتا ہے اور پڑوس میں رہنے والی بیگم صاحبہ کے حالات جاننے کے لیے تجسس پیدا ہوتا ہے، جو کسی سے نہیں ملتیں لیکن لیلی گارڈ سے بعض انگریز عورتیں کبھی کبھی ان سے ملنے آتی ہیں - دوسرے باب کا آغاز چنداں دلچسپی سے نہیں ہوتا لیکن آگے چل کر جب لائق الدولہ بہادر کی والدہ اسے بیگم صاحبہ کے یہاں آنے جانے سے منع کرتی ہیں اور اس کی خبر طاہرہ بیگم کو ہو جاتی ہے تو وہ اس کی والدہ کو دعوت دیتی ہیں اور اس دعوت کے بعد اسے اپنی داستان سناتی ہیں ، اس مرحلے پر قصے میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور پلاٹ ارتقا پذیر دکھائی دینا ہے، مثلاً طاہرہ کے چچا کا ریذیڈنسی میں ملازم ہونا ، انگریزی خوان ہونے کی بدولت عزیزوں کا قطع تعلق، طاہرہ کی والدہ اور بہن بھائیوں کا طاعون میں مر جانا اور اس کا چچا کی ولایت میں آنا ، لیڈی مکنتاش کا اس کے حال پر مہربان ہونا ، تعلیم دینا، ولی اللہ کا طاہرہ سے شادی سے انکار، تذبذب کی کیفیت اور ولی اللہ کا گھر چھوڑ جانا، والدین کا ولی اللہ کے غم فراق میں مر جانا اور طاہرہ کا کپتان مکنتاش کی کفالت میں آ جانا -

ان واقعات تک پلاٹ کی اٹھان ہے اور چونکہ طاہرہ خود یہ داستان سنا رہی لیکن اپنے لیے ننھی کا لفظ استعمال کر رہی ہے اس لیے داستان میں دلچسپی کا خاص رنگ موجود ہے، اگرچہ ایک جگہ طاہرہ ننھی کی جگہ اپنا نام طاہرہ بھی لیتی ہے لیکن وہ بات رواروی میں نکل جاتی ہے - اس کے بعد پلاٹ میں پھر اٹھان شروع ہوتی ہے - کپتان مکنتاس کی کفالت میں آنے طاہرہ کو پانچ برس گزر گئے تھے کہ کپتان مکنتاس ریٹائر ہو کر اپنی بیگم سمیت کلکتہ چلے گئے اور اب طاہرہ کی نگہداشت مسٹر و مسز گمین کے سپرد ہوئی - اس دوران نبی اللہ کا واقعہ، جو جعلی بھائی بن کر آتا ہے، تجسس اور دلچسپی کا عنصر پیدا کرتا ہے- نبی اللہ یا نواب عالم جب اپنے کیفر کردار کو پہنچنے لگتا ہے تو پھر پلاٹ میں ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے لیکن شرر زیادہ دیر اس ٹھہراؤ کو برقرار رکھ کر ناول کو پھیکا نہیں بنانا چاہتے اس لیے دو تین پیراگراف کے بعد ہی ولی اللہ واپس آ جاتا ہے، اب پھر یہ تجسس ابھرنے لگتا ہے کہ دیکھیے طاہرہ اس سے شادی کرتی ہے یا نہیں - ولی اللہ اپنی داستان سناتا ہے جو محض ایک سیاحت نامہ ہے اور چونکہ اس میں چنداں رنگینی نہیں اس لیے شرر نے اسے بھی جلد جلد لپیٹنے کی کوشش کی ہے اور قاری اپنی خواہش کے مطابق انجام دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہے -

ناول کا پلاٹ مختصر اور سیدھا سادا ہے لیکن اس کے باوجود واقعات کی کڑیاں مربوط ہیں - ایک دو مقامات جو ناول کے زمانی پھیلاؤ سے تعلق رکھتے ہیں شرر کی زود نویسی کا شکار ہو کر کھٹکنے لگتے ہیں - مثلاً تیسرے باب میں جب لائق الدولہ بہادر کی عمر آٹھ سال اور کچھ ماہ ہے طاہرہ خانم اس کی والدہ کو پہلی بار اپنے گھر بلاتی ہے - اس موقع پر ایک انگریز خاتون کے آ جانے پر شرر لکھتے ہیں:

''اب اسی جان نے طاہرہ بیگم سے کہا، ''ان میم صاحب کی تعریف کیجیے کہ یہ کون ہیں'' انھوں نے بتایا کہ یہ ریذیڈنٹ بہادر سرجان لو کے مددگار کپتان مکنتاش کی بیوی ہیں میرے حال پر بڑی مہربان ہیں اور میری استانی بھی ہیں - اکثر آ کر میرا دل بہلاتی ہیں اور انھیں کی وجہ سے لوگ مجھے کرانی کہتے ہیں -''

لیکن اس کے چند لمحے بعد طاہرہ بیگم کھانے سے فارغ ہو کر داستان کا بقیہ حصہ سناتی ہے تو اس کا اختتام نہ صرف یہ کہ کپتان مکنتاش کے ریٹائر ہو جانے بلکہ لیڈی و کپتان مکنتاش کے

کلکتہ جا کر تقریباً ساڑھے تین سال قیام کرنے کے بعد کپتان صاحب کے انتقال اور لیڈی کے انگلستان چلے جانے کے بعد کے واقعات پر ہوتا ہے۔ یہ سہو چونکا دینے والا ہے۔ علاوہ ازیں شروع میں شرر جب لائق الدولہ کو طاہرہ بیگم کے گھر لے جاتے ہیں تو طاہرہ کی عمر ۲۰ سال بیان کرتے ہیں لیکن بعد ازاں جب طاہرہ لائق الدولہ کی امی کو اپنی داستان سناتی تو شادی بیاہ کے جھگڑوں کے وقت اپنی عمر اٹھارہ سال بیان کرکے بتاتی ہے کہ اس کے بعد وہ پانچ سال کپتان صاحب کی نگرانی میں اس مکان میں رہی اور ان کے کلکتے چلے جانے کے بعد تین سال سات ماہ مسز گفھین کی نگرانی میں گزر چکے ہیں۔ اس طرح گویا اس وقت اس کی عمر تقریباً ۲۷ برس ہے۔ یہ تضاد بھی کھٹکتا ہے۔ اسی طرح لائق الدولہ جب پہلی مرتبہ طاہرہ کے گھر گئے تو ان کی عمر ۸ سال ایک ماہ تھی پھر خود لائق الدولہ کے قول کے مطابق طاہرہ کے یہاں آتے جاتے انھیں پانچ سال بت گئے کہ طاہرہ کے مزاج میں تبدیلی رونما ہوئی اور چند دن بعد ولی اللہ واپس آ گئے۔ گویا ولی اللہ کی واپسی کے وقت لائق الدولہ کی عمر چودہ سال پوری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن یہاں شرر لکھتے ہیں کہ ولی اللہ نے آنے کے دوسرے چوتھے روز لائق الدولہ کے بارے میں پوچھا جس کی عمر اس وقت اٹھارہ سال سے زیادہ تھی۔ یہ تضاد غالباً زود نویسی یا بسیار نویسی کا نتیجہ ہے۔

کردار:

اس ناول کے بڑے کردار طاہرہ بیگم، ولی اللہ، مولوی عزیزاللہ، لیڈی اور کپتان مکنتاش ہیں۔ دیگر کرداروں میں لائق الدولہ، ان کی امی، ولی اللہ کی ماں، نبن (نبی اللہ یا نواب عالم)، مسٹر اور مسز گفھین، سر جان لو، مولوی محمد معین اور شاہ منعم بخش شامل ہیں۔

شرر نے طاہرہ بیگم میں سلیقہ مندی، نفاست اور بردباری کی صفات جمع کی ہیں۔ انگریزی تعلم اور انگریز خواتین سے ملنے جلنے کے باوجود اس کی مشرقیت اور مذہبی عقاید بدستور قائم ہیں۔ لیڈی مکنتاش سے اس نے نفاست اور صفائی میں گہرا اثر قبول کیا ہے۔ صابر و شاکر پردہ دار خاتون ہے لیکن ناول کا پلاٹ ایسا ہے کہ اس کا کردار زیادہ نکھر نہیں سکا۔ اپنے محسنوں کے لیے اس کے دل میں گہری محبت اور عقیدت ہے۔ صاحب دولت و ثروت ہونے کے باوجود وہ ولی اللہ کے سوا کسی اور سے محض وضع داری کی بنا پر شادی کرنے پر آمادہ نہیں۔ نیکی کے کاموں میں دلچسپی رکھتی ہے اور اپنے خرچ خاص میں سے محتاجوں کی امداد کرتی رہتی ہے۔

عزیزاللہ ایک طرف تو عزیزوں سے منقطع زندگی گزارتے ہیں اور شادی کے معاملے میں ولی اللہ پر دباؤ ڈالتے ہیں لیکن اس کے روٹھ کے چلے جانے پر ان کی شخصیت یک سر بدل جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سب سے الگ تھلگ زندگی گزارنے کے نفسیاتی محرکات ہوں کہ وہ بیٹے کی جدائی سے بالکل نروس دکھائی دیتے ہیں اور بیوی کے مرنے پر اس کا صدمہ چند دن کے لیے بھی نہیں سہار سکتے۔ مولوی عزیزاللہ کا کردار شرر کی بے توجہی کا شکار ہوگیا ورنہ بعض مراحل پر توجہ دینے سے یہ کردار ذہن پر دیرپا اثرات قائم کرنے کا اہل ثابت ہو سکتا تھا۔

ولی اللہ کا کردار بھی ایسے ہی تضادات کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ ابتدائی مراحل پر اس کا رد عمل مولوی محمد معین کے زیر اثر ہے۔ یہ عام نوجوانوں کا ترجمان ہے جو تعلیم حاصل

کرنے کے باوجود اپنی عقل نہیں استعمال کرتے اور آخری حصہ سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی کے زیر اثر ہے ۔ ولی اللہ کا کردار فعال کردار نہیں اور تقریباً بے جان ہو کر رہ گیا ہے ۔

کپتان مکنتاش کا کردار سب سے زیادہ جاذب نظر ہے ۔ مولوی عزیزاللہ کے لیے اس کی شفقت و ہمدردی، ولی اللہ کو قائل کرنے کے لیے ان کی اس سے بحث ، صبر و تحمل ، مولوی عزیزاللہ کی پریشانی میں ان کا تسلی آمیز رویہ ، طاہرہ کے لیے پدرانہ شفقت ، وضع داری اور مرتے وقت ساری جائداد جس کی مالیت پچاس لاکھ نقد ہے طاہرہ کے نام کر دینے کا بلند حوصلہ، کپتان صاحب کی اعلیٰ انسانی صفات کا مظہر ہے ۔ یہی کیفیت لیڈی مکنتاس کے کردار کی ہے ۔ اس کے مادرانہ شفقت و محبت کے جذبات قاری کو متأثر کرتے ہیں ۔

مولانا محمد معین کا کردار ایک رجعت پسند مولوی کا کردار ہے جو اپنے محدود علم کی دنیا سے باہر نہیں نکلنا چاہتا ۔ اگرچہ شرر نے ناول کے آخری حصے میں اس سے فتوے کا رجوع کرا کے اس کے کردار میں زندگی کی ایک ہلکی سی رمق پیدا کی ہے لیکن یہ چنداں جاذب توجہ نہیں ۔ ولی اللہ کی ماں کا کردار ہندوستانی ماؤں کے کردار کی نمائندگی کرتا ہے ۔

زبان و بیان :

ناول کی زبان سادہ و سلیس ہے اور مکالمے کرداروں کی شخصیتوں سے ہم آہنگ ہونے کے علاوہ پلاٹ سے بھی مکمل طور پر مربوط ہیں ۔ ولی اللہ اور عزیزاللہ کے مکالمے، ولی اللہ اور کپتان مکنتاش کی گفتگو، عزیزاللہ اور مولوی محمد معین کے مکالمے، شاہ منعم بخش اور مولوی عزیزاللہ کے مکالمے مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ ان مکالموں میں فطری رنگ جھلکتا ہے اور چونکہ کہیں عاشقانہ مکالمے بازی کی گنجائش نہیں تھی اس لیے مکالموں میں ثقاہت کا عنصر اور بے تکلفی کا رنگ موجود ہے ۔

منظر نگاری اور مرقع کشی کے مواقع ناول کے پہلے حصے میں بہت کم تھے ۔ لیکن آخری حصے میں ولی اللہ کی سیاحت میں جہاں ان کی گنجائش تھی وہاں منظر نگاری کی بدولت پلاٹ کے غیردلچسپ اور سپاٹ ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لیے شرر نے ان مواقع سے استفادہ نہیں کیا ۔ البتہ جہاں جہاں ناول کی فنی قیود میں رہ کر منظر نگاری ہو سکتی تھی انھوں نے مرقع کشی کی ہے ۔ مثلاً پہلے، دوسرے اور تیسرے باب میں طاہرہ بیگم کے مکان اور رہن سہن کے طریقے کی مرقع کشی کی ہے ۔ ولی اللہ کی سیاحت کے دوران بابل کے کھنڈرات اور قاہرہ کے بعض پہلوؤں کے مناظر کھینچے ہیں ۔

ناول کے پلاٹ کی بندش کی وجہ سے شرر کو اس ناول میں اپنی مخصوص ادیبانہ و شاعرانہ سراپا نگاری کے مواقع بھی نہیں ملے ۔ اس ناول کی اگر کوئی انفرادیت ہے تو یہی کہ اس میں شرر نے داستان عشق و محبت کا عنصر شامل نہیں کیا ۔

۲۳۔ مینا بازار

پلاٹ :

اس ناول کا پلاٹ بہت مختصر ہے ، واقعات کا خلاصہ چوتھے باب میں بیان کیا جا چکا ہے ۔ شرر نے اس مختصر پلاٹ کو ناول کی شکل دینے کے لیے مختلف تفصیلات ، جزئیات ، بحثوں

اور مرقعوں کا سہارا لیا ہے ، اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ ناول واقعاتی کم اور کرداری زیادہ ہے ، اس ناول میں واقعات چونکہ بہت کم ہیں اس لیے شرر نے کرداروں کی شخصیت ، ان کی اندرونی کیفیات وغیرہ کو اجاگر کرنے پر زیادہ توجہ دی ہے ، ناول کا پلاٹ صرف اس قدر ہے کہ شاہجہان نے بھی درباریوں کے مشورے سے مینا بازار کے لیے عمارت تیار کروائی ، مینا بازار کا افتتاح ہوا ، بادشاہ خود بھی سیر کو گیا اور اسے جمال خان نامی ایک عہدے دار کی بیوی گلرخ بیگم کا حسن اور شوخ ادائیں پسند آ گئیں اسے محل میں طلب کر لیا ، تین دن کے بعد رخصت کیا ، جمال خان نے بدگمانی کے عالم میں طلاق دے دی ، شاہجہان کو علم ہوگیا ، گلرخ کو پھر محل میں منگوا لیا اور جمال خان کو قید کر دیا گیا ۔ شاہجہان نے گلرخ کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ اس سے شادی کر لے لیکن وہ اس پر آمادہ نہ ہوئی آخر اس نے جمال خان کے قتل کا حکم دیا، اس فیصلے پر گلرخ بیگم نے جمال خان کی جان بخشی کی خاطر بادشاہ سے شادی کر لی ۔

ناول کے پلاٹ میں نشیب و فراز کے مرحلے زیادہ نہیں اور نہ ہی بہت زیادہ موڑ ہیں ، اس کے باوجود دلچسپی کا عنصر برقرار ہے ۔ پلاٹ میں نمایاں ارتقا موجود ہے اور واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں ، ان میں منطقی تسلسل موجود ہے ۔

کردار :

اس ناول کے اہم کرداروں میں شہنشاہ شاہجہان ، ملکہ تاج محل ممتاز الزمانی ارجمند بانو بیگم ، گلرخ بیگم ، جمال خان پنج ہزاری اور جان سپار خان شامل ہیں ۔ دیگر کردار جو مختلف وقفوں کے لیے سامنے آئے ان میں رکنائے کاشی شاعر ، سعیدائے گیلانی شاعر ، برہمن داتا رام شاعر ، ملاء عطا الملک میر ساماں ، سعداللہ خان وزیر ، مسیح الزمان ، علامی افضل خان، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شوکت آرا شامل ہیں ۔

ناول کے آغاز میں شہنشاہ شاہجہان انتہائی علم دوست اور شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے بادشاہ کے روپ میں دکھائی دیتا ہے ۔ وہ شاعروں کی سرپرستی کرتا ہے ۔ رکنائے کاشی کو سونے میں تلوا کر سونا اس کے حوالے کر دیتا ہے ۔ شاہجہان خدا ترس ہے ، وہ قصیدوں میں بھی اپنی تعریف سن کر دل میں نادم ہوتا ہے اور خوف خدا سے لرز اٹھتا ہے اس کا عقیدہ ہے کہ تعریف کے لائق صرف ذات خداوندی ہے ، اسلام سے متعلق ذرا سی بھی غیر محتاط اور غیر ذمے دارانہ بات سن کر وہ برہم ہو جاتا ہے ۔ داتا رام کا ایک شعر جس میں مذہبی امور سے ہلکا سا مذاق کا شائبہ موجود تھا اس کے مزاج کو مکدر کر دیتا ہے ۔ مذہب کے بارے میں شہنشاہ اکبر کے رویے اور اس کی کمزوری کو وہ ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتا ہے اگرچہ وہ اس کی توجیہ کرتا ہے کہ اکبر کی آزاد منشی در اصل ہندو مسلم کو قریب لا کر دین اسلام کو ہندوؤں میں مقبول بنانے کی خاطر تھی ۔ اسی سلسلے میں درباری اس سے اکبر کے مینا بازار کا ذکر کرتے ہیں اور وہ تفصیلات معلوم کرکے حیرت کا اظہار کرتا ہے کہ عورتیں دکانیں سجاتی تھیں اور امراء اور شہزادے خریداری کرتے تھے ۔ شاہجہان کو اس امر پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنی عورتوں کی بے پردگی کس طرح گوارا کرتے تھے ۔ درباری اس کا جواز پیش کرتے ہیں اور اس پر بھی مذہبی خدمت کا ملمع چڑھا کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ شاہجہان

بھی مینا بازار کے احیا پر آمادہ ہو جاتا ہے گویا مذہبی امور میں شاہجہان کی زیادہ دلچسپی اس کی ایک کمزوری بن چکی ہے جسے کوئی بھی چالاک امیر وزیر اپنے مقصد کی خاطر استعمال کر سکتا ہے۔

دوسرے باب میں شاہجہان کے کردار کی یہ صفت سامنے آتی ہے کہ وہ ملکہ ممتاز محل سے بے انتہا محبت کرتا ہے اور اسے اعتماد ہے کہ ملکہ بھی اس کی دلدہی کے لیے کسی امر سے گریز نہیں کرے گی۔ وہ بعض اوقات خود بھی ملکہ کی بعض باتوں کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے اور چوتھے باب میں اس کی مثال موجود ہے۔ پانچویں اور ساتویں باب میں شاہ جہان کے کردار میں تبدیلی نظر آنے لگتی ہے۔ ساتویں باب میں گلرخ بیگم کی شوخی اور اس کا حسن اگرچہ فطری طور پر بادشاہ کو متاثر کرتا ہے لیکن بادشاہ کے رویے کی یہ تبدیلی چونکا دیتی ہے کہ وہ گلرخ بیگم کا ہاتھ تھام کر رات شاہی محل میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ دعوت دیتے ہوئے وہ قطعاً اس امر کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ گلرخ کے اہل خانہ اسے پسند کریں گے یا نہیں اور ممکن ہے وہ شادی شدہ ہو اور خاوند کی اجازت کے بغیر اس کا شاہی محل میں رات کو جا پہنچنا اس کی ازدواجی زندگی کو تلخ کر دے۔

آٹھویں باب میں شاہ جہان کا کردار انسانی عظمتوں سے گرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ گلرخ بیگم کی پریشانی پر کہتا ہے کہ اگر اس کا شوہر جمال خان بدگمانی کرے گا تو اسے سزا دی جائے گی۔ اس باب میں گلرخ بیگم سے اس کی گفتگو عاشقانہ لب و لہجہ اختیار کرتی جاتی ہے جو اس کی شخصیت کے اول الذکر نقوش سے متصادم ہے۔ نویں باب میں گفتگو میں مزید عامیانہ رنگ جھلکنے لگتا ہے وہ جمال خان سے سر دربار یہ کہتا ہے کہ اسے گلرخ بیگم کی باتیں پسند آئی ہیں، ملکہ اور گلرخ سے بار بار یہ کہتا ہے کہ ابھی طبیعت سیر نہیں ہوئی۔

گیارہویں باب میں شاہ جہان کے کردار کا یہ عجیب رخ سامنے آتا ہے کہ اسے اس امر کا تو کوئی احساس نہیں کہ اس نے ایک شریف آدمی کی بیوی کو اپنے یہاں بلوا کر تین دن ٹھہرائے رکھا تو اس کی بھی کچھ رسوائی ہوئی ہوگی لیکن اس امر پر اسے غصہ آ گیا کہ جمال خان نے اپنی بیوی کو اس طرح جو طلاق دے دی ہے تو بادشاہ پر الزام آیا ہے۔ وہ غیرت اور عزت کو صرف اپنے حوالے سے دیکھتا ہے۔ گلرخ کی درخواست کے باوجود وہ اس پر مصر ہے کہ گلرخ چاہے جمال خان کو معاف کر دے لیکن وہ جمال خان کو ضرور سزا دے گا کیونکہ یہ ایک شخصی یا ذاتی معاملہ نہیں بلکہ سیاسی معاملہ ہے۔

بارہویں باب میں اس کا کردار اور بھی پست ہوگیا ہے۔ وہ ایک عام خود غرض آدمی کی طرح انتقام پر اتر آیا ہے، علماء سے فتویٰ حاصل کرنے کے لیے استفتا میں بھی وہ غلط بیانی کرتا ہے کہ خلیفہ نے بعض امور دریافت کرنے کے لیے زید کی بیوی کو بلایا ۔۔۔۔ پھر علماء سے بہ اصرار دستخط لیے گئے اور علماء کو جتایا گیا کہ بادشاہ یہی چاہتا ہے۔ گلرخ بیگم بار بار جمال خان کی جان بخشی کے لیے درخواست کرتی ہے لیکن شاہجہان خود مدعی بنا ہوا ہے۔ گلرخ دوسری شادی سے انکار کرتی تو وہ اسے مجبور کرتا ہے۔ تیرہویں باب میں وہ گلرخ کو صاف لفظوں میں کہہ دیتا ہے کہ اگر وہ اس سے شادی سے انکار کرے گی تو جمال خان کو سزائے موت دے دی جائے گی۔ اس باب میں بادشاہ کی ہر حرکت سے خود غرضی ٹپکتی ہے اس کے احکامات عدل و انصاف کی بجائے ذاتی خود غرضی پر مبنی ہیں۔

چودھویں باب میں شاہ جہان نے جاں سپار خان کو جو سزا دی اس میں بھی انصاف سے زیادہ انتقام کا رنگ جھلکتا ہے۔ غرض شرر نے اس ناول میں شاہ جہان کے کردار کو انتہائی پست کر کے دکھایا ہے اور تاریخی اعتبار سے یہ کردار بہت حد تک مسخ ہو گیا ہے۔

تاج محل ممتاز الزمانی ارجمند بانو بیگم کا کردار دوسرے باب میں سامنے آتا ہے۔ ملکہ زیرک اور ہوشمند خاتون ہے۔ اسے خاوند سے بے پناہ محبت ہے۔ وہ مینا بازار سے پیدا ہونے والی متوقع خرابیوں پر غور کرتی ہے۔ بادشاہ سے بحث بھی کرتی ہے لیکن پھر بادشاہ کی خوشی کی خاطر خاموش ہو جاتی ہے۔ شاہجہان جب گلرخ بیگم کو مینا بازار سے محل میں طلب کر لیتا ہے تو ملکہ بادشاہ کے اس فیصلے سے پیدا ہونے والے نتائج کو بھانپ لیتی ہے اور اس کے اندر کی کشمکش صاف اجاگر ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ لیتی ہے کہ بادشاہ گلرخ بیگم پر فریفتہ ہو چکا ہے اور اسے اپنانا چاہتا ہے تو اس خلاف مرضی بات کو بھی وہ بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر قبول کر لیتی ہے۔ شرر نے ملکہ کے کردار کے اندرونی پہلوؤں کو اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ وہ ایک زندہ کردار بن گئی ہے۔ دوسرے باب میں جب بادشاہ ملکہ سے مینا بازار کی تجویز پر تبادلہ خیال کرتا ہے تو مینا بازار سے پیدا ہونے والی خرابیوں کے تصور سے ملکہ کا تذبذب صاف نمایاں ہے۔ پانچویں باب میں مینا بازار کے افتتاح کے موقع پر ملکہ کی ذہنی کشمکش بڑی خوبصورتی سے اجاگر کی گئی ہے۔ شرر اس کی اندرونی کیفیات، محسوسات اور تذبذب کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

ملکہ ''ماہ طلعت بیچنے والیوں'' ان کے فروخت کے مال اور پری جمال گاہکوں کو غور سے دیکھتیں اور دل میں حیران ہوتیں کہ ہندوستان دولت و حسن دونوں چیزوں سے کس قدر مالا مال ہے۔ بیچنے والیاں مسکرا کے سودا پیش کرتیں تو ملکہ اس پس و پیش میں پڑ جاتی کہ ان کے در دنداں کو دیکھیں یا در شہوار کو، وہ لعل بے بہا کو دکھاتیں اور ملکہ کی متحیر نظر بجائے اس لعل کے ان کے لعل لب پر جم جاتی۔ کوئی مرصع زیور نہ تھا جو ناز آفرینوں کے چہرے کی آب و تاب کے سامنے ماند نہ پڑ جاتا ہو۔ (اس سیر کے بعد ملکہ خاموشی سے اپنی کوشک میں بیٹھی سوچتی ہیں) ''اس بازار حسن کو ان کے صاحب تاج و سریر شوہر نے دیکھا تو خدا ہی ہے جو دل ہاتھ میں رہے اور نیت ڈانوا ڈول نہ ہو جائے۔ عورتیں جب ان خوبرو پری جمالوں کو دیکھ کے حیران ہیں تو مردوں کا دل کیسے قابو میں رہ سکتا ہے؟ پھر ان کے ساتھ تمام شہزادے اور امراء اس جلوہ گاہ حسن کی سیر کریں گے تو ان کا کیا حال ہو گا۔ ایسا تو نہ ہو گا کہ یہ مینا بازار جس کو میں نے کھولا ہے دنیا کے لیے ایک بڑا بھاری فتنہ فساد بن جائے اور میں خواہمخواہ کو گنہگار ہوں۔ میرے با وفا شوہر نے مجھ سے عہد کیا ہے کہ ان کے قدم کو لغزش نہ ہو گی۔ ممکن ہے وہ اپنے اس عہد و پیمان کا خیال کریں مگر ان کے ساتھ جو شہزادے اور امراء آئیں گے ان میں سے کس نے پاک نگاہی کا اقرار کیا ہے؟ ان میں سے اکثر کی یہ حالت ہو جائے گی کہ اس بازار حسن کو دیکھتے ہی اپنی بیویوں کو بھول جائیں گے۔ سوچتے سوچتے دل میں کہا کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ میں ان سب دکان دارنیوں کو ایک ایک سے مل کر تاکیدی حکم دے دوں کہ جس وقت جہاں پناہ اور ان کے رفقاء آئیں چہروں پر خوب اچھی طرح نقاب ڈال لیں، اور کسی کو اپنی صورت نہ دکھائیں، مگر میں ہزار حکم دوں اس پر عمل کوئی نہ کرے گا۔ برقع کی اجازت عام طور پر دے ہی دی گئی ہے مگر عورتوں کی عجیب حالت ہے، حسین عورت کو اپنا حسن دکھانے کا شوق ہوتا ہے۔ پردہ شرعی چیز ہے اور اس حکم کی وجہ سے عورتیں گھروں سے باہر نہیں نکلتی ہیں مگر اس شرعی حکم کی پابندی اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک عورتیں گھر کے اندر بند ہیں۔ باہر نکلنے میں ہمیشہ یہ عجیب تماشا نظر آتا ہے کہ اس شرعی حکم کی وجہ سے بوڑھی عورتیں تو خوب گہرا پردہ کرتی ہیں اور ممکن نہیں کہ کوئی ان کی صورت دیکھ لے مگر جوان عورتیں اور کمسن لڑکیاں اپنی شوخ مزاجی اور چلبلے پن سے بیتاب ہو ہو کر ہر طرف جھانکتی اور اپنی صورت دکھاتی رہتی ہیں اور کسی سے

چار آنکھیں ہو کے جو منہ چھپاتی ہیں تو چھپنا صورت دکھانے سے زیادہ کرشمہ خیز اور خطرناک ہوتا ہے۔ لہذا اگر پردے کا تاکیدی حکم ہوا بھی تو . . . . جوانوں سے ممکن نہیں کہ کسی نہ کسی انداز سے اپنی صورت نہ دکھا دیں اور وہ منہ دکھانا بے نقاب رہنے سے زیادہ اندیشہ ناک ہوگا۔ علاوہ بریں ایسا حکم جاری کرنا حضرت جہاں پناہ کے خلاف بھی ہوگا۔ چاہے میرے خیال سے ظاہر نہ کریں مگر دل میں ضرور برا مانیں گے۔ مینا بازار خاص ان کی تحریک اور ان کے شوق سے کھولا گیا ہے اور اس میں عورتوں کا مالی اور اخلاقی جو کچھ فائدہ ظاہر کیا جاتا ہے فقط بات بنانے اور دھوکا دینے کے لیے ہے۔ اصلی منشا ان کا یہی ہے کہ حسن و جمال کا تماشا دیکھیں اور اندازہ کریں کہ ملک میں کیسی کیسی حسین و نازنین عورتیں موجود ہیں۔" (پانچواں باب)

مینا بازار کی افتتاحی تقریب سے واپسی پر ملکہ اور شاہجہان کے درمیان گفتگو بھی ملکہ کے تذبذب، بدگمانی اور خدشات کو ظاہر کرتی ہے۔ ملکہ کی واپسی پر بادشاہ کا اس سے پہلا سوال یہی ہے کہ:

"بتاؤ افتتاح کس شان سے ہوا، کتنی عورتیں آئیں، کیسی اور کس درجے کی تھیں؟ دکانداروں کا کیا حال ہے؟ مال کتنا اور کس قسم کا ہے؟ دکان رکھنے والیوں کی شکلیں اور صورتیں کیسی ہیں؟ جو عورتیں سیر کو آئی ہیں وہ کیسی ہیں؟" ملکہ نے تفصیل بتائی تو بادشاہ نے پوچھا "اب بتاؤ میں نے کیا پوچھا تھا؟"

ملکہ: اس کے بعد جو کچھ حضرت نے پوچھا تھا اس کو میں کبھی نہ بھولوں گی۔ حضرت نے پوچھا تھا کہ دکانیں رکھنے والیوں کی شکلیں اور صورتیں کیسی ہیں؟ بھلا یہ بھولنے والی بات تھی! اگرچہ اس کو میں گزشتہ باتوں کے سلسلے میں بیان کر چکی ہوں مگر آپ کا شوق پورا کرنے کے لیے پھر بتاؤں گی۔ ایک سے ایک بڑھ کے پری جمال و حور خصال ہے۔ اسے مینا بازار یا جواہرات کا بازار نہ کہنا چاہیے، اصل میں وہ حسن کا بازار ہے اور پر شوق آنکھیں خریدار ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ یہی حضرت کا اصل مقصد بھی تھا جو بہت ہی اچھی طرح اور امید سے زیادہ پورا ہوا۔ جہاں پناہ دیکھیں گے تو حیرت میں رہ جائیں گے۔

جہاں پناہ: لیکن اگر میری یہی نیت ہو تو کیا اس میں کچھ مضائقہ ہے! کیا اچھی صورتیں دیکھنا گناہ ہے؟

تاج محل: گناہ تو دیکھنے والی کی نگاہ اور اس کے دلی خیالات سے تعلق رکھتا ہے، جو بری نگاہ سے دیکھے گا اور بری نیت رکھے گا گنہگار ہوگا۔ اور جس کی نیت پاک ہو اس کے لیے کوئی گناہ نہیں۔ مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایسے حسینوں کے مجمع اور پری جمالوں کے جھرمٹ میں انسان کہاں تک اپنے دل پر قابو رکھ سکتا ہے۔

بادشاہ: تو کیا تم کو کسی قسم کی بدگمانی ہے؟

ملکہ نے کہا چونکہ بادشاہ اقرار کر چکے ہیں کہ کسی پر بری نگاہ نہ ڈالیں گے لیکن دوسروں لوگوں کی کیا ذمہ داری ہے اور اس کے بعد ملکہ نے پھر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

ساتویں باب میں ملکہ اور بادشاہ کی گفتگو ملکہ کی بدگمانیوں کو مزید اجاگر کرتی ہے۔ بعض اوقات ملکہ کی گفتگو خود بادشاہ کو بھی طنز معلوم ہونے لگتی ہے، ملکہ کا کردار ان مکالموں کے ذریعے زندہ ہو جاتا ہے۔ ان مکالموں میں سے چند نموتاً درج ذیل کیے جاتے ہیں:

ملکہ: حضرت کو بازار کی سیر میں بڑی دیر ہو گئی۔

جہاں پناہ: اور اس دیر ہونے میں بھی آدھے بازار کی سیر کر سکا، وہ کوئی معمولی سیر کی جگہ نہیں ہے۔ ہر قدم پر یہ حالت تھی کہ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست، ہر دکان اور ہر بیچنے والی میں ایسی دلربائی اور دلکشی تھی کہ بڑے جبر سے قدم آگے بڑھایا جاتا تھا۔ وہ تو ایسا مقام ہے کہ جس دکان میں جائیے بس وہیں کے ہو جائیے۔

تاج محل : اور سارے گھر بار کو چھوڑ دیجیے ۔

جہاں پناہ : (ہنس کر) میرا منشا یہ نہ تھا بلکہ یہ کہنا مقصود تھا کہ جس دکان میں جائیے دن بھر وہیں کی خوبیاں دیکھتے رہیے اور دکان میں جانے کا نام نہ لیجیے یعنی دن بھر میں انسان ایک کے سوا دوسری دکان کی سیر نہیں کر سکتا ۔

تاج محل : تو پھر کیا ہے ۔ بارہ سو دکانیں ہیں اور سال میں کتنے دن ہیں ؟ ہاں تین سو ساٹھ دن ۔ تو کچھ کم اڑھائی برس تک ان دکانوں کی سیر میں مصروف رہیے ۔ سلطنت اور گھر بار کا خدا حافظ ہے ۔

جہاں پناہ : کیوں ؟ کیا رات کو بھی گھر نہ آؤں گا ۔

تاج محل : تو یہ میرے حال پر مہربانی ہوئی ۔ سلطنت کا انتظام کیسے چلے گا ؟

جہاں پناہ : اس کام کو وزرائے سلطنت انجام دیں گے ۔ میں کہتا ہوں تمھیں بات بات پر بدگمانی کیوں ہوتی ہے ؟ ایک بات کہی تھی کہ تمھاری کوشش سے یہ بازار ایسا پرلطف اور دلکش ہو گیا ہے کہ جہاں ٹھہر جائیے وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا ۔

تاج محل : حضرت فرماتے ہیں کہ بازار پر لطف اور دلکش ہو گیا ہے ۔ پر لطف ہونے میں مضائقہ نہیں ۔ حضرت کے لیے ہر چیز کو پر لطف ہونا چاہیے مگر دلکش نہ کہیے ، یہ بڑا خطرناک لفظ ہے ۔

جہاں پناہ: اس لفظ کو میں نے ان معنوں سے نہیں کہا تھا جن میں تم لیتی ہو ، اس لیے کہ میرے خیال میں پر لطف اور دلکش کا ایک ہی مطلب ہے لیکن اگر تم کو یہ لفظ ناپسند ہےتو لو میں اسے چھوڑے دیتا ہوں۔

تاج محل : بس میرے اطمینان کے لیے یہ کافی ہے خیر اب یہ بتائیے کہ آج حضرت کو ان تمام مہ جبینوں میں سے جو وہاں جمع ہیں کون زیادہ پسند آئی ۔

جہاں پناہ : یہ بڑا مشکل سوال ہے ۔ فقط اتنا کہہ سکتا ہوں کہ سب ہی زیادہ پسند آئیں اور کوئی نہیں ہے جو کم پسند آئی ہو ۔

تاج محل : یہ بڑے اطمینان کی بات ہے ؟ جہاں پناہ : کیوں ؟

تاج محل : خطرہ جب ہی ہوتا ہے کہ سب کے مقابل میں کوئی ایک پسند آئے . . . .

جہاں پناہ : . . . . ہر ایک دلہن بنی ہوئی تھی مگر میں اجمالی نظر ڈالنے کے سوا انھیں اچھی طرح نہیں دیکھ سکا ۔ بعض ایسی خوبرو اور شوخ ادا نظر آئی تھیں کہ جی چاہتا تھا ان سے کچھ باتیں کروں ، مگر خلاف مصلحت نظر آیا ۔

تاج محل : افسوس امرائے دربار کے ساتھ ہونے کی وجہ سے میں حضرت کے ہمراہ نہ جا سکی ورنہ جہاں پناہ کے اس شوق کو بھی پورا کر دیتی ۔ میں انھیں بلا کے پاس کھڑا کر دیتی اور جب تک جی چاہتا حضرت ان سے باتیں کرتے ۔

جہاں پناہ : مگر تمھاری موجودگی میں غیر ممکن تھا کہ میں انھیں آنکھ بھر کے دیکھتا ۔

تاج محل : تو یہ بہت اچھا ہوا کہ میں نہ تھی اور حضرت نے جیسے دل چاہا جی بھر کے دیکھا اور خوش ہوئے ۔

جہاں پناہ : تمھارے اس فقرے میں بھی طعنے کی بو آتی ہے ۔

یہ گفتگو اسی طرح آگے بڑھتی جاتی ہے اور اس سے ممتاز محل کی اندرونی کیفیات اجاگر ہوتی ہیں ۔ آٹھویں باب میں اس کے کردار کا یہ پہلو ابھرتا ہے کہ وہ شوہر کی خوشنودی کے لیے سب کچھ برداشت کرنے کو تیار ہے ۔ شاہجہاں نے گلرخ کے بلوانے کا جو جواز پیش کیا اگرچہ ملکہ اس سے مطمئن نہیں لیکن چونکہ اس پر ناپسندیدگی کے اظہار کا موقع ختم ہو چکا تھا اور جس بات کا اسے خدشہ تھا وہ ہو چکی تھی اس لیے اب اس نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی اور شاہجہاں کو گلرخ کے ساتھ تنہائی میں ملنے کے زیادہ مواقع دیے ۔ بارھویں اور تیرھویں باب میں ملکہ کا کردار اپنی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے ، وہ تذبذب اور کشمکش کے تمام مراحل طے کرکے بالآخر ایک وفا شعار بیوی کی طرح خاوند کی خوشنودی کی خاطر اس کی خواہشات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتی ہے اور اسے گلرخ سے شادی کی اجازت دے دیتی ہے ۔

گلرخ بیگم کا کردار بھی اس ناول کا ایک زندہ کردار ہے ۔ شرر نے اس کے کردار کو

بڑے سلیقے اور توجہ سے پیش کیا ہے۔ گلرخ کے کردار کی داخلی کیفیات ، خاوند سے محبت ، وفا شعاری ، مظلومی و مجبوری اور اندرونی کشمکش نے اس کے کردار کو انتہائی جاذب نظر اور زندہ کردار بنا دیا ہے۔ گلرخ بیگم سے ہمارا تعارف ساتویں باب میں ہوتا ہے۔ شاہجہان سے اس کی ابتدائی گفتگو میں انتہائی شوخی اور بے باکی ہے لیکن شاہجہان جب وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے اسے رات محل میں آنے کی دعوت دے جاتا ہے تو اس کی تمام شوخی رخصت ہو جاتی ہے۔ آٹھویں باب میں شرر نے اس کے تذبذب اور کشمکش کی کیفیت کی بڑی حسین تصویر پیش کی ہے۔ وہ ایک شوہر پرست اور وفا شعار عورت ہے۔ اسے اپنے خاوند سے محبت ہے۔ وہ اس کی اجازت کے بغیر کہیں آتی جاتی نہیں لیکن بادشاہ کا حکم ایک مجبوری ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ جمال خان اس کے محل میں جانے کا سن کر کیا محسوس کرے گا اور اس کا کیا رد عمل ہوگا۔ کردار کی یہ کشمکش اس عمدگی سے پیش کی گئی ہے کہ اس میں جان پڑ گئی ہے۔ محل سے واپس جانے کے بعد اس کی گفتگو میں مظلومی جھلکتی ہے لیکن جب جمال خان اسے طلاق دے دیتا ہے تو وہ جان سپار کے اکسانے میں نہیں آتی اور بادشاہ سے محض اس لیے شکایت نہیں کرنا چاہتی کہ وہ جمال خان کو سزا دے گا۔

تیرھویں باب میں گلرخ کا کردار اپنے عروج پر ہے، اس کی ذہنی الجھن، اندرونی کشمش کی بہترین عکاسی ہوئی ہے۔ وہ طلاق ہو جانے کے باوجود جمال خان سے بے پناہ محبت رکھتی ہے ، اس کے دل میں جمال خان کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ وہ دوسری شادی پر تیار نہیں لیکن بادشاہ کا نہ صرف شادی پر اصرار ہے بلکہ انکار کی صورت میں جمال خان کے لیے سزائے موت کا حکم ہو چکا ہے۔ مجبوری ، بے بسی ، محبت ، ایثار اور تذبذب کی ان ملی جلی کیفیات نے اسے گوشت پوست کا انسان بنا دیا ہے۔ شرر کی فن کاری بھی یہاں اپنے عروج پر ہے۔ گلرخ کا کردار ذہن پر دیرپا نقوش چھوڑتا ہے۔

جمال خان کا کردار بھی اس ناول میں عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ بیوی کے محل میں چلے جانے کی خبر سن کر اس پر جو کچھ بیتتی ہے شرر نے اس کی عمدہ عکاسی کی ہے ، اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے مختلف شکوک ، بدگمانیاں، بیوی کی وفاداری، لوگوں کے طعنوں کا خیال اس قسم کے مختلف خیالات اس کے ذہن کو پریشان کر رہے ہیں اور شرر نے اس کیفیت کی مصوری سے جمال خان کے کردار میں حقیقت کے رنگ بھرے ہیں۔ دربار میں طلبی اور دربار سے واپسی کے بعد اس کا انداز فکر ، گلرخ کی محل سے واپسی پر اس کا رد عمل اور سزائے موت سننے کے بعد اس کا رویہ خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

دیگر کردار نوعی ہیں اور صرف مخصوص صفات کو پیش کرنے کے لیے دکھائے گئے ہیں۔ وہ اپنی نوع کی ترجمانی کرتے ہیں۔

زبان و بیان :

ناول میں با مقصد اور با موقع زبان اور بر محل مکالمے استعمال ہوئے ہیں۔ مکالموں کے نمونے کرداروں کے سلسلے میں پیش ہوئے ہیں۔ مکالمے چست اور کرداروں کی شخصیت سے ہم آہنگ ہیں۔ مینا بازار کے مرقعے بھی بڑے جان دار اور حسین ہیں۔ شرر نے تفصیلات اور جزئیات کے ذریعے مینا بازار کو متحرک فلم بنا دیا ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے مینا بازار کا نقشہ قاری کی چشم تخیل کے سامنے اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ پھر جاتا ہے۔

کتابیات

۱- ابن اثیر: تاریخ الکامل، ترجمہ محمد عبدالغفور خان، مطبع اعجاز محمدی، حیدرآباد دکن۔

۲- ابن اثیر: تاریخ عروج اسلام، ترجمہ تاریخ کامل، محمد عبدالغفور خان، مفید عام پریس، آگرہ۔

۳- ابن اثیر: خلافت بنو امیہ، ترجمہ سید ہاشم ندوی، طبع انیس اکیڈمی، کراچی۔

۴- ابن اسفندیار: تاریخ طبرستان۔

۵- ابن بطوطہ: رحلۃ و اردو ترجمہ «سفر نامہ»، نفیس اکیڈمی، کراچی۔

۶- ابن الجوزی: مراۃ الزمان۔

۷- ابن حجر عسقلانی: فتح الباری۔

۸- ابن حزم: الفصل فی الملل و الاہواء و النحل، قاہرہ۔

۹- ابن خلدون: تاریخ، ترجمہ عنایت اللہ، لاہور۔

۱۰- ابن خلدون: تاریخ، ترجمہ حکیم احمد حسین عثمانی، نفیس اکیڈمی کراچی و یونانی دوا خانہ، الہ آباد ۱۹۲۲ء۔

۱۱- ابن الخطیب بغدادی: تاریخ خطیب، (تاریخ بغداد)۔

۱۲- ابن الخطیب بغدادی: تاریخ غرناطہ، ترجمہ مطبوعہ نفیس اکیڈمی، کراچی۔

۱۳- ابن خلکان: وفیات الاعیان۔

۱۴- یاقوت حموی: الاسلام۔

۱۵- یاقوت حموی: مراصد۔

۱۶- ابن شداد: النوادر السلطانیہ والمحاسن الیوسفیہ، مصر، ۱۳۱۷ھ۔

۱۷- ابن العذاری المراکشی: البیان المغرب فی اخبار المغرب، ترجمہ جمیل الرحمن، کواپریٹو سٹیم پریس، لاہور، ۱۹۲۲ء۔

۱۸- ابن عربی: محاضرۃ الابرار۔

۱۹- ابن القوطیہ: تاریخ افتتاح اندلس۔

۲۰- ابن قتیبہ: قصہ فتح الاندلس۔

۲۱- ابن ہشام: سیرت، ترجمہ عبدالجلیل صدیقی و غلام رسول مہر، مطبوعہ لاہور۔

۲۲- ابو الفداء: تاریخ۔

۲۳- ابو الفرج اصفہانی: کتاب الاغانی۔

۲۴- ابو ظفر ندوی: تاریخ سندھ، معارف اعظم پریس، اعظم گڑھ۔

۲۵- احمد بیلی: فاتح بیت المقدس۔

۲۶- احسن فاروقی: اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، اردو اکیڈمی، لاہور۔

۲۷- ادریسی: ذکر الاندلس۔

۲۸- ارادت خان واضع: مثنوی مینا بازار۔

۲۹- اعزاز علی دیوبندی: سلمان فارسی اور ان کا اسلام۔

۳۰- اکبر شاہ خان نجیب آبادی: تاریخ اسلام، مطبوعہ نفیس اکیڈمی، کراچی۔

۳۱- برنی: تاریخ فیروز شاہی۔

۳۲- بلاذری: فتوح البلدان، ترجمہ سید ابوالخیر مودودی، نفیس اکیڈمی، کراچی۔

۳۳- جلال الدین سیوطی: تاریخ الخلفاء، ترجمہ مطبوعہ ملک غلام محمد اینڈ سنز، لاہور۔

۳۴- جواد علی، الدکتور: تاریخ العرب قبل الاسلام، مطبوعہ عراق، ۱۹۵۰ء۔

۳۵- چارلس سی آدم: اسلام اور عربیک تجدد مصر میں، ترجمہ عبدالمجید سالک، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۳۶- حتی: تاریخ شام، ترجمہ غلام رسول مہر، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔

۳۷- حمداللہ مستوفی قزوینی: تاریخ گزیدہ۔

۳۸- حمداللہ مستوفی قزوینی: نزہۃ القلوب۔

۳۹- دائرہ معارف اسلامیہ: اردو انسائیکلوپیڈیا اسلام، دانش گاہ پنجاب، لاہور۔

۴۰- دائرہ جغرافیائی ستاردانش: فرہنگ جغرافیہ ایران۔

۴۱- دارالمصنفین۔

۴۲- دلان ژون کیر پکتھال: تاریخ دولت عثمانیہ، جامع عثمانیہ، ۱۹۳۹ء۔

۴۳- ڈوزی: عبرت نامہ اندلس، ترجمہ عنایت اللہ، مطبوعہ نفیس اکیڈمی، کراچی۔

۴۴- رادھے لال: تاریخ فرماں روایان اودھ، مرتبہ محمد فدا علی طالب، ۱۸۷۸ء، مطبوعہ نولکشور۔

۴۵- رشید اختر ندوی: صلاح الدین۔

۴۶- رشید الدین فضل اللہ : جامع التواریخ، تہران، ۱۳۷۷ -

۴۷- رشید الدین فضل اللہ : تاریخ غازانی -

۴۸- ریاست علی ندوی : تاریخ سسلی -

۴۹- سراج الدین عفیف : تاریخ سندھ -

۵۰- سکاٹ سی - پی : اخبار الاندلس، ترجمہ محمد خلیل الرحمن -

۵۱- سکسینہ، رام بابو : تاریخ ادب اردو -

۵۲- سلمان منصور پوری : رحمۃ للعالمین -

۵۳- سہیل بخاری : اردو ناول نگاری، مکتبہ جدید، لاہور -

۵۴- سید احمد خان، سر : اسباب بغاوت ہند -

۵۵- شبلی : سیرت النبیؐ -

۵۶- شرر، عبدالحلیم : مفتوح فاتح، سلطان حسین، کراچی -

۵۷- شرر، عبدالحلیم : مقدس نازنین، سلطان حسین، کراچی -

۵۸- شرر، عبدالحلیم : فلور، فلورنڈا، سلطان حسین، کراچی -

۵۹- شرر، عبدالحلیم : منصور موہنا، ملک ممتاز احمد، لاہور -

۶۰- شرر، عبدالحلیم : خوفناک محبت، دلگداز پریس، لاہور -

۶۱- شرر، عبدالحلیم : دربار حرام پور، دلگداز پریس، لاہور -

۶۲- شرر، عبدالحلیم : دلچسپ (کامل)، گلزار بک ڈپو، لاہور -

۶۳- شرر، عبدالحلیم : رومۃ الکبریٰ، دلگداز پریس، لکھنئو -

۶۴- شرر، عبدالحلیم : فلپانا، سلطان حسین، بمبئی -

۶۵- شرر، عبدالحلیم : فلورا فلورنڈا، گلزار بک ڈپو، لاہور -

۶۶- شرر، عبدالحلیم : غیب دان دلہن، سلطان حسین، بمبئی -

۶۷- شرر، عبدالحلیم : قیس و لبنیٰ، سلطان حسین، بمبئی -

۶۸- شرر، عبدالحلیم : لعبت چین، سلطان حسین، بمبئی -

۶۹- شرر، عبدالحلیم : مینا بازار، سلطانی پریس، بمبئی -

۷۰- شرر، عبدالحلیم : ملک العزیز ورجنا، مجلس ترقی ادب، لاہور -

۷۱- شرر، عبدالحلیم : نیکی کا پھل، سلطانی پریس، بمبئی -

۷۲- شرر، عبدالحلیم : یوسف و نجمہ، سلطانی پریس، بمبئی -

۷۳- شرر، عبدالحلیم : فردوس بریں، مکتبہ خیابان ادب، لاہور -

۷۴- شرر، عبدالحلیم : حسن کا ڈاکو، سلطان حسین، بمبئی -

۷۵- شرر، عبدالحلیم : ایام عرب، سلطان حسین، بمبئی -

۷۶- شرر، عبدالحلیم : بابک خرمی، سلطان حسین، بمبئی -

۷۷- شرر، عبدالحلیم : جویائے حق، سلطان حسین، بمبئی -

۷۸- شرر، عبدالحلیم : آغا صادق کی شادی، دلگداز پریس، لکھنئو -

۷۹- شرر، عبدالحلیم : الفانسو، دلگداز پریس، لکھنئو -

۸۰- شرر، عبدالحلیم : افسانۂ قیس، دلگداز پریس، لکھنئو -

۸۱- شرر، عبدالحلیم : آغا صادق کی شادی، مطبع سلطانی، بمبئی -

۸۲- شرر، عبدالحلیم : صقلیہ میں اسلام، دلگداز پریس، لکھنئو -

۸۳- شرر، عبدالحلیم : شاہکار شرر، قومی کتب خانہ، دہلی -

۸۴- شرر، عبدالحلیم : سکینہ بنت الحسین، دلگداز پریس، لکھنئو -

۸۵- شرر، عبدالحلیم : سیر العلماء، دلگداز پریس، لکھنئو -

۸۶- شرر، عبدالحلیم : ابو الحسنین، دلگداز پریس، لکھنئو -

۸۷- شرر، عبدالحلیم : بیان سلف و کمالات سلف، قومی پریس، دہلی -

۸۸- شرر، عبدالحلیم : صد پارۂ دل، قومی پریس، دہلی -

۸۹- شرر، عبدالحلیم : مخدرات، مہتاب پریس، دہلی -

۹۰- شرر، عبدالحلیم : سفرنامہ امام شافعی، دلگداز پریس، لکھنئو -

۹۱- شرر، عبدالحلیم : بدرالنساء، الناظر پریس، لکھنئو -

۹۲- شرر، عبدالحلیم : حسن بن صباح، قومی پریس، دہلی -

۹۳- شرر، عبدالحلیم : درگیش نندنی، (ترجمہ) قومی پریس، دہلی ۔

۹۴- شرر، عبدالحلیم : عصر قدیم ، دلگداز پریس، لکھنئو ۔

۹۵- شرر، عبدالحلیم : تاریخ سندھ ، دلگداز پریس ، لکھنئو ۔

۹۶- شرر، عبدالحلیم : عرب قبل از اسلام ، (تاریخ ارض مقدس، حصہ سوم)، دلگداز پریس، لکھنئو ۔

۹۷- شرر، عبدالحلیم : تاریخ اسلام ، جامعہ عثمانیہ پریس، دکن ۔

۹۸- شرر، عبدالحلیم : تاریخ خلافت، دلگداز پریس ، لکھنئو ۔

۹۹- شرر، عبدالحلیم : قرۃ العین ، دلگداز پریس ، لکھنئو ۔

۱۰۰- شرر، عبدالحلیم : حسن انجلینا ، دلگداز پریس، لکھنئو ۔

۱۰۱- شرر، عبدالحلیم : قیس و لبنیٰ، دلگداز پریس، لکھنئو ۔

۱۰۲- شرر، عبدالحلیم : فتح اندلس، دلگداز پریس، لکھنئو ۔

۱۰۳- شرر، عبدالحلیم : شوقین ملکہ ، دلگداز پریس، لکھنئو ۔

۱۰۴- شرر، عبدالحلیم : ماہ ملک، دلگداز پریس، لکھنئو ۔

۱۰۵- شرر، عبدالحلیم : فلپانا ، دلگداز پریس، لکھنئو ۔

۱۰۶- شرر، عبدالحلیم : زوال بغداد، دلگداز پریس ، لکھنئو ۔

۱۰۷ شرر، عبدالحلیم : عزیزۂ مصر، دلگداز پریس، لکھنئو ۔

۱۰۸- شرر، عبدالحلیم : طاہرہ ، دلگداز پریس، لکھنئو ۔

۱۰۹- شرر، عبدالحلیم : تاریخ حروب صلیبیہ ، دلگداز پریس، لاہور ۔

۱۱۰- شرر، عبدالحلیم : ماہنامہ دلگداز کے شمارے، دلگداز پریس، لکھنئو ۔

۱۱۱- شرر، عبدالحلیم : دل افروز کے شمارے، دلگداز پریس، لکھنئو ۔

۱۱۲- شرر، عبدالحلیم : مضامین شرر، مطبوعہ مبارک علی شاہ گیلانی، (تمام جلدیں) ۔

۱۱۳- شرر، عبدالحلیم : گذشتہ لکھنئو، نسیم بک ڈپو، لکھنئو ۔

۱۱۴- شرر، عبدالحلیم : ثانی اثنین، دلگداز پریس، لکھنئو ۔

۱۱۵- شرر، عبدالحلیم : صقلیہ میں اسلام، دلگداز پریس، لکھنئو ۔

۱۱۶- شرر، عبدالحلیم : تاریخ بغداد، ورما پریس ، امین آباد، لکھنئو ۔

۱۱۷- طبری، ابن جریر : تاریخ، جامعہ عثمانیہ دکن و ترجمہ سید محمد ابراہیم و سید حیدر علی طباطبائی، مطبوعہ نفیس اکیڈمی، کراچی ۔

۱۱۸- طفیل احمد منگلوری : مسلمانوں کا روشن مستقبل ۔

۱۱۹- عبدالاحد رابط : وقائع دلپذیر ۔

۱۲۰- عبدالسلام: تخلیق و تنقید، اردو مرکز لاہور ۔

۱۲۱- عبدالقدوس ہاشمی : تقویم تاریخی، مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی، کراچی، ۱۹۶۵ء ۔

۱۲۲- عطا ملک جوینی : تاریخ جہانکشای ، مرتبہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی ، شائع کردہ گب میموریل سیریز ۔

۱۲۳- عظمت علی خان : مرقع خسروی ۔

۱۲۴- علی عباس حسینی: ناول کی تنقیدی تاریخ ، اردو اکیڈمی، لاہور ۔

۱۲۵- غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر : اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ۔

۱۲۶- فرشتہ : تاریخ ، نولکشور، لکھنئو ۔

۱۲۷- فصیح الدین احمد : سوانح سلطان صلاح الدین اعظم ۔

۱۲۸- فیض بخش، منشی : چشمہ فیض ۔

۱۲۹- کمال الدین حیدر : تاریخ اودھ ، حصہ دوم ، نولکشور ۱۸۷۷ء، ۱۸۹۶ء ۔

۱۳۰- کندی : کتاب الولاۃ ۔

۱۳۱- لی سٹرینج : خلافت بلاد مشرق ، (ترجمہ) مطبوعہ جامعہ عثمانیہ، دکن ۔

۱۳۲- لی سٹرینج : بغداد خلافت عباسیہ کے عہد میں، (ترجمہ) مطبوعہ جامعہ عثمانیہ، دکن ۔

۱۳۳- لی سٹرینج : فلسطین و شام (بعہد حکومت اسلامی)، ترجمہ سید ہاشمی فرید آبادی ۔

۱۳۴- لین پول : مسلمان اندلس میں، ترجمہ حامد علی صدیقی ۔

۱۳۵- لین پول : صلاح الدین ایوبی، ترجمہ نصیب اختر

۱۳۶- مجیرالدین : انس الجلیل ۔

۱۳۷- محمد ابوالحسن: تاریخ آئینہ اودھ، نظامی پریس، کانپور ۱۳۰۳ھ-

۱۳۸- محمد تقی احمد: آخری تاجدار اودھ-

۱۳۹- محمد ذکاء اللہ: تاریخ ہندوستان، مرتضوی پریس، دہلی ۱۸۸۰ء و شمس المطابع، دہلی ۱۸۹۷ء-

۱۴۰- محمد صادق حسین: تاریخ عالم اسلام-

۱۴۱- محمد عزیز: دولت عثمانیہ، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء-

۱۴۲- محمد عنایت اللہ: اندلس کا تاریخی جغرافیہ، جامعہ عثمانیہ دکن، حیدر آباد ۱۹۲۷ء-

۱۴۳- محمد فرید ابو حدید: صلاح الدین، ترجمہ محمد عبدالقدوس قاسمی-

۱۴۴- مسعود کیہان: جغرافیہ مفصل ایران، کتاب خانہ ابن سینا، تہران، ۱۳۱۱ھ-

۱۴۵- مسعودی: مروج الذہب، طبع باربرڈی مینارڈ-

۱۴۶- مسعودی: کتاب التنبیہہ-

۱۴۷- مسعود عالم ندوی: ایک مظلوم اور بدنام مصلح، خدام ملت، کراچی ۱۹۴۹ء-

۱۴۸- مسعود عالم ندوی: ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مکتبہ ملیہ، راولپنڈی-

۱۴۹- معین الدین احمد ندوی: تاریخ اسلام، دارالمصنفین، اعظم گڑھ-

۱۵۰- مقری، شہاب الدین ابو العباس: نفح الطیب، ترجمہ محمد خلیل الرحمن، انجمن ترقی اردو، ۱۹۲۱ء-

۱۵۱- منہاج سراج: طبقات ناصری (فارسی)، مرتبہ کپتان ناسیولسن فورث، ولم کالج، کلکتہ ۱۸۶۲-

۱۵۲- مراکشی: المعجب فی تلخیص الاخبار المغرب-

۱۵۳- مقریزی: خطط-

۱۵۴- نبی بخش بلوچ: چچ نامہ سندھی، مرکزی اردو بورڈ، لاہور-

۱۵۵- نکولائی منوچی: داستان مغلیہ، ترجمہ ملک راج شرما، مطبوعہ لاہور-

۱۵۶- ہیرلڈ لیمب: صلاح الدین ایوبی، ترجمہ یوسف عباس-

۱۵۷- یاقوت حموی: معجم البلدان-

۱۵۸- یاقوت حموی: مراصد-

۱۵۹- یعقوبی: تاریخ، طبع ہوتسما-

۱۶۰- یوسف حسین: تاریخ، دستور حکومت ہند-

1. Alfred Tresidder Sheppard: The Art and Practice of Historical Fiction, London, 1930.
2. Alfred Duggan: The Story of the Crusades, London, 1963.
3. Allen, W E.D. and Paul Muratoff: Caucassian Battle-fields, Cambridge University Press, 1953.
4. Arnold, Hottinger: The Arabs—their History, Culture and Place in the Modern World, Thames and Hudson, London, 1963.
5. Archer, T.A.,: The Crusades; T. Fisher Union, London, 1963.
6. Archer, T.A.,: The Crusades of Richard I, (English History from Contemporary Writers), London, 1906.
7. Ameer Ali, Syed,: A Short History of the Saracens; MacMillan & Co., London, 1955.
8. Aziz S. Atiya: Crusades, Commerce and Culture, Oxford University Press, London, 1962.
9. Browne, E.G ,: A Year Amongst the Persian, 1893.
10. Barthold: Turkistan.
11. Dram—Encyclopaedea of Religion and Ethics.
12. Edward Gibbon: The History of the Decline and Fall of Roman Empire. Thomas Devison, London, 1828.
13. Encyclopaedea Britanica.
14. Eversley, Lord: The Turkish Empire—its Growth and Decay, 1857.
15. Francis Henry Skrine: Expansion of Russia, Camb. Historical Series, 1915.

16. Fazlullah, Rashid-ud-Din : Jami-et-Tawanekh, Edited by E. Blochet, Lyden, 1911.
17. Freya Stork : The Valley of the Assassins, London, 1914.
18. Hitti, Philip K. · History of the Arabs, MacMillan & Co., Lodon, 1957.
19. Hitti, Philip K. · History of Syria, MacMilian & Co , London, 1957.
20. Halida Adeeb Conflict of East and West in Turkey, Muktaba Jamia Millia Islamia, Delhi.
21. Hamdullah Mustawfi : Tarikh-i-Guzida, Edited by E.G. Browne, 1910.
22 Hamdullah Mustawfi · Nuzhat-al-Qulub, Translated by G. Le-Strange (Gibb Memorial Series), Cambridge University Press, London, 1919
23. Henry Smith, Williams : Historian History of the World, London, 1907.
24. H. Howarth : History of the Mongols.
25. Harvard . Historical Atlas of Muslim People, Djambatan Amesterdam, 1957.
26. Harfard John Brydges A Brief History of the Wahhabys.
27. Ibn Battuta : Travels in Asia and Africa 1325-1354, Translated and Selected by H.A R. Gibb, Broadway Travellers, London, 1967.
28. Ivanow, W . Some Ismaili Strongholds in Persia, Islamic Culture 1938, Lahore.
29 Ibn Isfandeyar History of Tabristan, Edited by E.G. Browne, Gibb Memorial Series, 1905.
30. J W Hamilton . Aldine World Atlas, J M. Dost & Sons, Canada.
31 John Shearman : The Lands of People of Iran, Adam & Charles Black, London, 1962.
32. Lane-Poole, Stanley : The Moors in Spain, Publishers United. Lahore, 1953.
33. Lane-Poole, Stanley : Saladin and the Fall of Kingdom of Jerusulam, G. P. Putnams Sons, London, 1898.
34. Lane-Poole, Stanley : Turkey, Khoyats Beruit, 1966
35. Le-Strange, G : Lands of the Eastern Caliphate, Cambridge University Press, London.
36 Le-Strange, G : Baghdad during the Abbassid Caliphate, Oxford University Press, London, 1924.
37. Le-Strange, G : Palestine under the Moslems, London, 1890.
38. L. Lockhart : Hasani Sabbah and the Assassins.
39. Leopold von Ortick, Capt. : Travels in India.
40. Minhajuddin · Tabkati Nasri, English Translation by Major H.G Raverty, London, 1881.
41. Morco Polo : The Book of Sir Morco Polo, Edited by Col. Henry Yule, John Murray, London.
42. May, L S. . The Evolution of Indo Muslim Thought after 1857.
43. Nicolson : A Literary History of the Arabs, London, 1907
44. Percy Sykes : A History of Persia, 1915.
45. Peter Willey . The Castles of the Assassins, George Harrap & Co., London.
46. Robinolli Bargomali : The Persian Caspian Provinces.
47. Roolvink, R. Dr. : Historical Atlas of the Muslim People, Amasterdam.
48. Runciman, Steven : History of the Crusades, 2 Vols., Cambridge University Press, 1954.

49. Scott, S P.: History of the Moorish Empire in Europe.
50. Saksaina: The History of Shah Jehan.
51. Shiel, J.: Itinerary from Tehran to Alamut and Khurram Abad in May, 1837.
52. Stadard: The New World of Islam.
53. Smith, Wilfred Cantwell: Islam in Modern History.
54. William Auseley: Travels in the Lands of East.
55. Yaqut: Yaquts Dictionary of Learned Men, Edited by D.S. Margoliouth 1907, 1910.